جلد ۵۸ | جنوری ۱۹۳۲ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

تصاویر پیام محبت (رنگین) مہاراجہ پرتھی راج چوہان ہند بادشاہ دہلی
رائے بہادر بابو آنند سروپ مرحوم

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت فی پرچہ ۱۲

قیمت سالانہ ممالک غیر سے ۔ ششماہی ۔ ہندوستان سے ششماہی تین روپیہ

۶

زمانہ بک ایجنسی کی دلچسپ و قابل دید کتابیں

نصائح جہانگیریہ

یعنی ناموس ہند جہانگیر کے مشہور و معروف وصیتی کا ترجمہ از جناب پنڈت بسنت داس صاحب مددگار خزانہ سرکار عالیہ گورنمنٹ نظام دام اقبالہ۔ قیمت ۴ر

گلکدہ

لسان الملک حضرت عزیز لکھنوی کا مجموعہ کلام جس کا ہر صفحہ ایک چمن زار اور ہر شعر ایک خوشنما گل ہے قیمت عہ

لسان الغیب

شیخ دیوان حافظ مع مفصل سوانح عمری ملک کے مشہور اہل قلم حضرات کی رائے ہے کہ یہ شرح یکتائی کے رتبہ تک پہنچ گئی ہے قیمت جلد اول ۱۲ر

کاس الکرام

شرح رباعیات عمر خیام مع مفصل سوانح عمری تمام ارباب سخن کا اس پر اتفاق ہے کہ اس موضوع پر اس سے زیادہ مکمل اور مبسوط کتاب ابتک شائع نہیں ہوئی۔ قیمت تین روپیہ ۳ےر

قومی نمبر رسالہ زمانہ

جس میں ۲۲ قابل دید مضامین نظم و نثر اور رنگین و سادہ تصاویر اور مہاتما گاندھی اور لالہ لاجپت رائے۔ ڈاکٹر بیسنٹ۔ مسز نائیڈو۔ ڈاکٹر اقبال کے خاص پیغامات اور بہت سے قابل دید مضامین نظم و نثر شائع ہوئے ہیں۔ قیمت عہ

اختر ستان

ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علی خاں اختر لکھنوی کا دیوان جس کا ہر مصرعہ پر تاثیر اور ہر شعر تیر و نشتر ہے قیمت عہ

مکمل عورت

معاشرتی کی تعلیمی و سوشیل حالات کا مقابلہ۔ ایک یوروپین اسکول اور دوسری کو کنیا ودیالیہ میں داخل کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کنیا ودیالہ کی لڑکی تعلیمی و سوشیل حالت میں بہتر ہے قیمت ۸ر

روٹھی رانی

جس میں حسن و عشق کی سچی داستان راناؤں کا دلچسپ معرکہ اور ترنیا بیت کی دلکش مثال موجود ہے ۶ر

پریم بتیسی

یعنی اردو کے مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند بی۔ اے کے بہترین قصوں کا مجموعہ۔ زبان کی لطافت اور بیان کی صفائی قابل دید ہے حصہ اول ۱۲ر دوم ۱۱ر

دنیائے راز

از ابوالفضل راز چاندپوری قدیم و جدید طرز کی دلکش نظموں کا مجموعہ ہے۔ ہر نظم بلحاظ موضوع مکمل و نتیجہ خیز ہے مع تصویر مصنف قیمت صرف ایک روپیہ

یادگار قومی

جس میں ملک کے مشہور ترین انشا پردازوں کے ۱۵ مضامین اور چار عکسی تصویریں ہیں کاغذ لکھائی چھپائی صاف ہے قیمت عہ

ترجمہ رامائن منظوم

بال کانڈ کا اصلی حصہ ہے دوہے اور چوپائیاں ہندی ترجمہ اردو اشعار میں مترجمہ سورج پرشاد تصور قیمت ۱۲ر

بزم احباب

اخلاقی کہانیوں کا مجموعہ ۸ر

سیر المصنفین

اردو انشا پردازی کی مکمل تاریخ از جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب بی۔ اے۔ شعرا کی طرح نثاروں کا جامع تذکرہ قیمت ۶ر

طریق دولتمندی

یہ کتاب ہر شخص کے قابل خرید ہے دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے کم لوگ واقف ہیں اس کتاب میں دولت حاصل کرنے کے طریقے نہایت خوبی سے بتائے گئے ہیں قیمت ۳ آنے

اردو مضمون نویسی

مضمون لکھنے کے متعلق بابو نانک پرشاد بی۔ اے۔ پروفیسر کی نہایت عمدہ کتاب ہے اس سے بہت جلد اردو لکھنے کی مہارت پیدا ہو جاتی ہے۔ قیمت ۸ر

حیات بیوہ

جس میں مصنف نے بیوگان کی حالت زار کا سچا فوٹو کھینچا ہے اور انکی جانکاہ مصیبتوں کا دلگداز سین پیش کیا ہے قیمت ۵ر

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے طلب فرمایئے

پیام محبت

عہد مغلیہ آخر اٹھارھویں صدی کے مصوری کا نمونہ

زمانہ

جلد ۵۸ جنوری ۱۹۳۲ء نمبر ۱

انگریزی ادبیات اور ہندوستان

(از قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی)

ممالک مشرقیہ میں قدامت کے لحاظ سے ملک ہندوستان کو جو عظمت اور فضیلت حاصل ہے وہ اس کے مذاہب، سلطنتوں، تہذیب و تمدن، اور آثار قدیمہ سے صاف ظاہر ہے، قدیم الایام میں دنیا کی مختلف اقوام کا تعلق ہند اور اہل ہند سے رہ چکا ہے، جس کے آثار اُن قوموں کی تواریخ اور ادبیات میں موجود ہیں۔ چنانچہ قرونِ وسطیٰ میں انگلستان کا جو تعلق ہندوستان کے ساتھ رہا ہے اُسکی نسبت کئی جزئی اور تفصیلی اشارات انگریزی ادبیات میں پائے جاتے ہیں۔ قاعدہ کی بات ہے کہ دنیا کے اہم واقعات کا اثر معاصر اہل قلم پر زیادہ ہوتا ہے۔ مگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انگریزی ادب میں ہندوستان کا اثر بہت قلیل مقدار میں پایا جاتا ہے۔

متعدد انشا پردازوں اور شاعروں نے ہندوستان کے سحر اور شعبدہ بازی کی نسبت کچھ حالات لکھے ہیں، اور ہندوستانی زندگی کے مختلف مناظر پیش کئے ہیں۔ مثلاً عورتوں کا رنگین اور زریں ملبوسات میں ندی کے کنارے پانی بھرنا، سفید پوش مقتدایانِ مذہب کا کسی مذہبی جلوس کے سامنے پنکھے ہلانا۔ زربفت کی جھولوں سے لدے ہوئے ہاتھیوں اور ہودہ والے اونٹوں کا بازار سے گزرنا، بازار کا شور و شغب، صحرا کی خاموشی اور سکوت، یہ اور اس طرح کی کئی باتوں کا نقشہ انھوں نے اپنی تحریروں میں کھینچا ہے۔ ان مصنفین میں زیادہ تر مؤرخین اور محققین ہیں، اور اگر ان کو علٰحدہ کر دیا جائے تو صرف

چند ایسے مصنف نکلیں گے جنھوں نے ہندوستان کا موضوع خاص طور پر اپنے لئے پسند کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ولایت سے آنے والے سیاحوں کا مقصد ہندوستان آنے سے محض سیر عجائبات اور تفریح طبع تھا، یا تحصیلِ مال و زر، سیاحوں کا کام ادھر ادھر چکر لگانا یا روپیہ پیدا کرنا ہوتا ہے، تخیل سے کام لینے اور شاعری سے بہرہ ور ہونے کی نعمت بہت کم لوگوں کو عطا ہوتی ہے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا تھا تو ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے انگریزی ادیبوں کی صف اول میں جگہ دی جا سکے، اور بالفرض اُن میں سے کوئی بالکل ہندوستانی طرز پر ہندوستان کی نسبت کچھ لکھتا بھی تو انگریزی داں طبقہ اس سے مستفید نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ہندوستان ممالک مغرب سے ایک دُور ترین ملک ہے اس لئے اِس ملک کے اندرونی حالات، مذاہب، عوائد و رسوم اور طرز معاشرت سے اُن لوگوں کو برائے نام بھی آگاہی نہیں ہو سکتی تھی۔

ادب قدیم انگریزی ادب کا دار و مدار تمامتر رومی (لاطینی) اور یونانی ادبیات پر ہے، اس لحاظ سے وہ قدیم رومی اور یونانی روایات کا حامل ہے۔ لہذا ہندوستان کے متعلق ابتدائی معلومات کا سرچشمہ تمامتر یونانی اور رومی مصنفین کے وہ بیانات ہیں جو ہندوستان کی فتوحات اسکندری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس بنا پر بعض معلومات یونانی اور رومی ذرائع سے انگریزی ادب میں داخل ہو گئیں۔ قدیم شعرا میں چاسر نے (جو انگریزی شاعری کا باوا آدم ہے) اپنے بعض منظوم قصوں[1] میں ہندوستان کے متعلق بعض امور کا ذکر کیا ہے، چنانچہ Knights' Tale (قصۂ رئیس) میں اُس نے امیر تیوس اعظم بادشاہ ہندوستان کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی طرح Pardoners' Tale (قصۂ خطا بخش) میں بیدپا برہمن کی کلیلہ و دمنہ سے ایک حکایت نقل کی ہے، جو ابن المقفع کے عربی ترجمہ کے ذریعہ یورپ میں پہونچی تھی[2]۔ اس سے زیادہ چاسر کے کلام میں ہندوستان کے متعلق کچھ نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح پندرھویں صدی کے ایک اور فسانۂ منظوم میں جس کا نام Geste of Alekander (کارنامۂ سکندر) ہے، ہندوستان کی نسبت ایک اور اشارہ پایا جاتا ہے، اس کا مصنف غالباً انگلستان کے جنوب مشرق کا باشندہ تھا جو ۱۳۰۰ء میں گزرا ہے۔ وہ ہندوستانی فوج کے ہاتھیوں اور دیگر عظیم الجثہ حیوانات کے خیال سے بہت دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ نیز اُن جواہرات کے نام بھی اس نے گنوائے ہیں جو اسکندر کو ہندوستان سے ہاتھ لگے تھے۔ سونے کے منقش ستون جن میں جواہرات، مروارید، زمرد اور یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ ہاتھی دانت کی تراشی ہوئی ہندو دیوتاؤں کی مورتیں، جامہائے بلوریں، صدف کے پھول اور پرندے۔ اس طرح اُن تمام

---

[1] قصص کنٹربری Canterbury Tales

[2] ابن المقفع کے عربی ترجمہ کا عبرانی میں ترجمہ ہوا تھا، اسی کا لاطینی ترجمہ جان آف کپو آنے ۱۲۷۰ء میں کیا (ادبیات ایران جلد ۲ ص ۳۵۰) اسی لاطینی ترجمہ کی بدولت کلیلہ و دمنہ کی حکایات یورپ میں پہونچیں۔

بیش بہا خزانوں کا اس نے ذکر کیا ہے جو اسکندر اعظم کو ہندوستان سے ہاتھ لگے تھے۔

اس کے سو سال کے بعد ایک اور نظم لکھی گئی جس کا نام King Alysaunder (اسکندر بادشاہ) ہے۔ اس میں ہندوستان کو ایک متمول اور کثیر آبادی والا ملک بتایا گیا ہے، جس میں کئی شہر اور قلعے ہیں۔ دریائے گنگ کے ذکر میں تین سو فٹ کی مچھلی کا اس میں ہونا بتایا گیا ہے۔ بہرحال سولھویں صدی کے آغاز تک ہندوستان کے متعلق انگریزی ادب کے دامن میں ان چند خزف پاروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

تعلقات کی ابتدا انگلستان کا تعلق ہندوستان سے جب کبھی قائم ہوا ہو، لیکن یہ امر یقینی ہے کہ چودھویں صدی میں انگریزوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہو گئی تھی، پھر بھی صحیح طور پر یہ تعلقات اس وقت سے شروع ہوئے جب سولھویں صدی میں انگریزوں کے دلوں میں ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کرنے کی تحریک پیدا ہوئی، چنانچہ اسی دھن میں انھوں نے بحری سفر کی تیاریاں کیں، اور کولمبس اور واسکو ڈگاما جیسے اولوالعزم سیاحوں نے ہندوستان کے جزائر کا رخ کیا۔ اول الذکر کی نسبت کہا جاتا ہے کہ دراصل وہ جزائر ہند کی تلاش کو نکلا تھا، مگر غلطی سے امریکہ پہونچ گیا، اور اسی وجہ سے وہاں کے "سرخ رو وحشیوں" کو اس نے "ریڈ انڈین" کا لقب دیدیا۔[1] بہرحال اور مہتم بالشان تحریکات کی طرح ہندوستان پر قبضہ کرنے کی یہ تحریک خاص طور پر قابل لحاظ ہے جس کا اثر انگریزی ادبیات پر پڑنا لازمی تھا۔ جب ڈگاما نے نہر سویز میں داخل ہو کر ہندوستان کا بحری راستہ معلوم کر لیا تو اہل انگلستان کو ہندوستان کی نسبت مزید معلومات حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ اس کے بعد انگریز سیاح یکے بعد دیگرے ہندوستان آنے لگے۔

عہدِ الزابیتھ انگلستان کے حکمرانوں میں الزابیتھ ایک نامور اور شان و شوکت والی ملکہ گزری ہے، جس کا عہد ادب کے لئے عہدِ زریں سمجھا جاتا ہے۔ اس کے عہدِ حکومت میں پانچ سیاح اسٹیونس، نیوبری، لیڈز اسٹوری اور ریچ ہندوستان کے جواہرات خریدنے اور یہاں کے عجائبات دیکھنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ ہندوستان میں اس وقت عہدِ اکبری کا دور دورہ تھا۔ ملکۂ انگلستان نے اپنے معاصر بادشاہ کے نام رقعہ لکھکر نیوبری کے حوالہ کیا جس کا مضمون یہ تھا۔[2]

"چونکہ ہماری رعایا کو دنیا کے دور دراز ممالک کی سیر و سیاحت کا بیحد شوق ہے جس سے ان کا مقصد حتی الامکان تمام اقوام عالم کے ساتھ تجارتی تعلقات پیدا کرنا ہے تاکہ اس ذریعہ سے باہمی دوستانہ

---

[1] تاریخ امریکہ ص ۱، از مولوی محمد یحیٰی تنہا، مطبوعہ الناظر پریس۔

[2] مسٹر ونسنٹ اسمتھ اپنی محققانہ تاریخ "اکبر" میں (ص ۲۲۹) لکھتے ہیں کہ ملکہ کا اصلی خط بعینہٖ محفوظ نہیں ہے، صرف اس کے بعض فقرے ملتے ہیں۔ مندرجہ بالا خط کے الفاظ جو اصل تحریر کا مفہوم ادا کرتے ہیں، سیاحوں کے بیانات سے لئے گئے ہیں۔

روابط قائم کئے جاسکیں۔ اسی لئے حامل رقعۂ ہذا جان نیوبری مع اپنے رفقا کے نہایت ادب اور دیانت داری کے ساتھ آپ کی حدودِ مملکت میں داخل ہونے کی جرأت کر رہا ہے۔"

انہی سیاحتوں کا یہ نتیجہ تھا جس کا اثر انگلستان کے شعرا اور مصنفین کے تخیل پر پڑا۔ اس عہد کے ابتدائی شعرا میں اسپنسر (Spencer - ۱۵۹۹ء)............ نے اپنی مشہور نظم Faerie Queene (پری جمال ملکہ) میں تقریباً سات جگہ ہندوستان اور اس کے دریاؤں گنگا اور سندھ کا ذکر کیا ہے، اور گو اس فسانۂ منظوم میں مشرقی تخیل کا اثر بہت بڑی حد تک پایا جاتا ہے، تاہم ہندوستان کے متعلق اس میں مزید حالات نہیں ملتے۔ اسی طرح اس عہد کے نامور شاعر اور ڈراما نویس ولیم شیکسپیئر نے ہندوستان کی نسبت بعض اشارات اپنے ڈراموں میں کئے ہیں، مثلاً:۔

"بوقتِ تبسم اس کے چہرے پر کئی لکیریں نمودار ہو جاتی ہیں جتنی کہ جدید نقشہ میں باضافۂ ہندوستان موجود ہیں[۵۱]"

"وہ جس کے ہاتھ نے ایک بدتر ہندوستانی کی طرح ایک موتی کو پھینک دیا[۵۲]"

سترھویں صدی کا نامور ادیب اور شاعر جان ملٹن جو بقول ڈرائیڈن اپنی بلند خیالی اور بلند نظری کے لحاظ سے انگریزی کے تمام قدیم و جدید شعرا اور انشا پردازوں پر فوقیت رکھتا ہے، اس کے کلام میں ہندوستان کے متعلق بعض حوالے ملتے ہیں، مگر اس کی معلومات کا تمام تر سرمایہ اُن سیاحوں کے بیانات ہیں جو عہد الزابیتھ میں ہندوستان آئے تھے۔ چنانچہ اپنے شاہکار "Paradise Lost" (فردوس گم شدہ) میں لکھتا ہے:۔

"کسی دور ترین سمندر میں ایک جہاز جو خاموش پڑا ہوا، معتدل ہواؤں کی وجہ سے بادلوں میں لٹک رہا ہے، بنگالہ سے چلتا ہوا، یا جزائر ٹرینیڈ اور ٹائیڈور سے، جہاں سے تاجر مسالہ دار ادویہ لاتے ہیں[۵۳]"

ہندوستان کے شہروں میں آگرہ اور لاہور کا ذکر سلاطین مغلیہ کے پایۂ تخت کے طور پر کیا گیا ہے[۵۴]۔ ملیبار اور دکن کا نام بھی لیا گیا ہے[۵۵]۔ دریائے گنگا اور سندھ کے نام بھی بعض اشعار میں ملتے ہیں[۵۶]۔

---

۵۱ ہنری ہفتم ایکٹ ۵-۳ ۵۲ آتھیلو ایکٹ ۵-۲
۵۳ پیراڈائز لاسٹ، باب ۲ (کلیات ملٹن صہ ۱۱۶ چندوس کلاسکس) ۵۴ ایضاً باب ۱۱ (کلیات صہ ۲۳۴
۵۵ ایضاً باب ۹ (کلیات صہ ۲۹۰) ۵۶ ایضاً باب ۹ (صہ ۲۶۴)

عہد الزابیتھ کے مشاہیر شعرا میں سے کسی نے ہندوستانی موضوع پر کوئی مستقل چیز نہیں لکھی البتہ مارلو (Marlow) نے اپنے ایک ڈرامے کے لئے فاتح اعظم امیر تیمور کو پسند کیا اور اُسکا نام بھی Tamburlaine (تیمور لنگ) رکھا، گو ہندوستان سے اس کو کوئی خاص تعلق نہیں ہے، تاہم اس میں تیمور کی زبانی ایسٹ انڈیا اور بعد کے انکشاف شدہ جزائر کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ سورت میں انگریزوں کا کارخانہ قائم کرنے کا خیال مارلو کے دل میں بھی موجود تھا۔

سترھویں صدی کے آخر میں انگلستان کے ملک الشعرا ڈرائیڈن Dryden (۱۶۳۱ء تا ۱۷۰۰ء) نے "اورنگ زیب" کے نام سے ایک ڈراما لکھا، یہ پہلا ادیب ہے جس نے اپنے ڈرامے کے لئے خالص ہندوستانی پلاٹ پسند کیا۔ لیکن اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی ہندوستان کی نسبت انگریزوں کی معلومات بہت محدود تھیں۔ بعض باتیں تو اس میں اس قدر غلط اور مضحکہ انگیز لکھی گئی ہیں کہ اگر خود اورنگزیب یہ ڈراما دیکھتا تو وہ اپنے تئیں بھی مشکل سے پہچان سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈرائیڈن نے مغلیہ سلطنت کی نسبت چند باتیں سنی ہونگی۔ انھیں کی بنیاد پر اس کے تخیل نے ایک مشرقی تاجدار کی نسبت ایک من گھڑت پلاٹ تیار کر کے رکھدیا۔ اس کی معلومات کی غلطیوں کا اندازہ صرف اسی بات سے ہوسکتا ہے کہ وہ ہندو مذہب کو اسلام کے ساتھ گڈمڈ کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس نے مراد کی چتا پر اس کی بیگم ملیسندا کا (یہ نام بجائے ہندوستانی کے یونانی معلوم ہوتا ہے) ستی ہونے کے لئے جانا بیان کیا ہے، اسے کیا معلوم تھا کہ مردہ جلانے اور بیوہ عورت کے ستی ہونے کی رسم خاص ہندوؤں کی ہے اور مسلمانوں کو اس سے قطعاً کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح اس نے اورنگ زیب جیسے پکے مسلمان بادشاہ کے منہ سے یہ الفاظ کہلوائے ہیں جن سے اس کا مسئلہ تناسخ کا قائل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

"تناسخ ہو اگر آئندہ روح غیر فانی کا بنے تو بچہ یا شیر اپنی پچھلی زندگانی کا[۱]"

ایسی اہم غلطیوں کے بعد اگر اس ڈرامے میں عالمگیر اور شاہجہاں یونانیوں کے علم الاساطیر کا ذکر کرتے ہوئے دکھائی دیں تو کیا تعجب کیا جاسکتا ہے۔

ملکہ این کا عہد اس عہد میں انگریزی ادب نے نیا چولا بدلا، اگرچہ اس وقت تک سفرناموں اور روزنامچوں میں ہندوستان کے متعلق کافی مواد مہیا ہو چکا تھا تاہم پوپ اڈیسن جیسے مشرقی تخیل کے ادیب کے ہاں بھی چند معمولی باتوں کے سوائے اور کچھ نہیں پایا جاتا۔ ٹامسن (Thomson) شاعر نے اپنی نظم (Seasons) "سال کے موسم" میں دو ایک جگہ ہندوستان کا ذکر کیا ہے[۲]۔ اسی طرح Issac Watts

[۱] کلیات ڈرائیڈن (ڈراما اورنگ زیب) [۲] موسم بہار اور موسم گرما میں ہندوستان کے غروب ہونے والے سورج اور ہندوستانی انجنر کا ذکر ہے۔

آرزک والٹس (۱۷۴۸ء) نے ہندوستانی فلسفی (Indian Philosphher) کے نام سے ایک نظم لکھی ہے۔ انگریزی میں یہ پہلی نظم ہے جس میں ہندوستان کا مذہبی اثر پایا جاتا ہے۔

اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان کی نسبت اس سے زیادہ انگریزی ادبیات میں کچھ نہیں پایا جاتا کہ وہ ایک گرم ملک ہے جہاں ہاتھی، چیتے اور کیلے کے درخت کثرت سے ہوتے ہیں، نیز یہ کہ یہاں کے بادشاہوں کے درباروں میں ہر وقت موتی، زمرد اور سونا ہی چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ انگریزی کا مشہور ادیب Johnson (جانسن) تو ہندوستانیوں کو "وحشی" کا لقب عطا کرتا ہے جو بجائے ان کے افریقہ کے غلاموں کے لئے زیادہ موزوں ہو سکتا ہے، لیکن انگلستان سے آنے والے سیاحوں میں بعض ایسے علما اور مورخ بھی تھے جن کے سفرناموں اور روزناموں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان جواہرات اور درندوں سے بھرا ہوا ایک گرم ملک ہی نہیں ہے بلکہ اس میں "عقل و مذہب اور بلند تخیل رکھنے والے انسان بھی بستے ہیں"۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اٹھارھویں صدی کے وسط تک انگلستان کی نمایندگی کرنے والی ایک تجارتی کمپنی کے ذریعہ ہندوستان کے حالات انگریزوں کو معلوم ہوتے رہے۔ مگر جب لارڈ کلائو بہت بڑی دولت لیکر وطن پہونچا اور اس کے بعد اور لوگ بھی ہندوستان سے مالا مال ہو کر جانے لگے تو لوگوں کی نگاہیں عام طور پر ہندوستان کی طرف اٹھنے لگیں، باوجود اس کے اس زمانہ میں ہندوستان کے ساتھ انگلستان والوں کے رسل و رسائل اور تجارت کی بدولت مستحکم روابط قائم ہو گئے تھے، تاہم ہندوستان کی اندرونی زندگی کی نسبت اہل انگلستان کو کچھ معلوم نہ ہوا اور وہاں کے امرا یہاں کے دولتمند انگریزوں کو نفرت ہی کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ عام اہل انگلستان بھی رشک کی وجہ سے اُن کو بُرا بھلا ہی کہتے رہے، اس لئے کہ انھوں نے ہندوستان میں رہکر "تباہ شدہ صوبجات" اور متعدد مقتولین سے اپنی ناجائز دولت حاصل کی تھی اور "ہزاروں کے کھنڈروں" پر اپنی عمارتیں تعمیر کی تھیں[۱]۔

آخر کار مظلوم ہندوستان کے ساتھ ہمدردی کا زمانہ آیا۔ اور Burke (برک) جیسے آتش بیان مقرر اور مقنن نے دارالعوام میں وارن ہیسٹنگز پر طرح طرح کے سنگین الزامات قائم کرتے ہوئے ایک جذبات انگیز تقریر کی، اور ان تمام مظالم کی تشریح کی جو ہیسٹنگز اور اس کے ساتھیوں نے ہندوستانیوں پر کئے تھے "برک کی تقریر وارن ہیسٹنگز کے الزام پر"[۲] انگریزی ادبیات کا ایک شہپارہ ہے، اور اگرچہ یہ تقریر محض وقتی دلچسپی کی چیز بھی

---

[۱] یہ دو فقرے ہیں جو دراصل برک کے ہیں جو اس نے اپنی تقریر میں استعمال کئے ہیں۔
[۲] دیکھو تصانیف برک (Burke's Works) جلد چہارم و پنجم ص ۲۲۰ تا ص ۵۳۳۔ اور ص ۹۶ (طبع جارج بیل ۱۹۱۰ء) برک نے اپنی رپورٹ ۴-۱ اپریل ۱۷۸۶ء کو دارالعوام میں پیش کی تھی۔

تاہم انگریزی ادب کی ادبی حیثیت سے یہ تقریر بہترین پیرایہ میں ذاتیات پر سخت ترین حملہ کرنے کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اور نہ صرف موقع کی اہمیت کے خیال سے بلکہ زبان کی شوکت اور بلاغت کے لحاظ سے بھی وہ ایک غیر فانی چیز ہے۔

فتوحات ہند کے بعد اگرچہ ہندوستان کی فتوحات سے انگریزی ادب میں کوئی مہتم بالشان اضافہ نہیں ہوا تاہم اس کی بدولت مشرقی مباحث پر لکھنے والوں کی ایک خاصی جماعت ضرور پیدا ہوگئی۔ مگر ہندوستان کی اندرونی زندگی کا راز سربستہ ہی رہا اور اس کی نسبت کسی نے کچھ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ انگلستان والوں نے ہندوستان سے جو دلچسپی لینی شروع کی تو وہ خاص ہندوستان اور اس کے باشندوں کے دلی جذبات و خیالات سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے نہ تھی، بلکہ ان کا مقصد تمامتر Anglo Indian (ہندوستانی انگریزوں) سے واقف ہونا تھا۔ اگرچہ اکثر انگریز سیاحوں نے ہندوستان کے حالات اپنی کتابوں میں صحیح اور معتبر درج کئے ہیں، لیکن بعد کے مصنفین کی طرح انھوں نے بھی ہندوستانیوں کے دلی جذبات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسی وجہ سے عرصہ دراز سے ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان اجنبیت کا پردہ حائل ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی خود ہندوستان کے انگریزوں (یعنی اینگلو انڈین طبقے) میں بھی لکھنے والے پیدا ہوگئے۔ اور انھوں نے ہندوستان کی نسبت بہت ٹھوس مواد اکٹھا کرکے عام معلومات میں اضافہ کیا۔ اسی زمانہ میں سر ولیم جونس (Jones) جیسا علوم مشرقیہ کا متبحر عالم وائسرائے بنکر ہندوستان آیا[۵] جس نے اس کے رخ روشن سے ناواقفیت اور جہالت کے تاریک پردہ کو اٹھا دیا۔ اور اس کے حسن اصلی کا جلوہ اپنے ہم قوموں کو دکھایا۔ چنانچہ اس کی محققانہ تحریرات اس کی شاہد ہیں، با ایں ہمہ اُن کا شمار کسی طرح انگریزی ادبیات میں نہیں ہو سکتا۔ بہرنوع اس طرح انگلستان والوں کو ہندوستان کے صحیح اور معتبر حالات معلوم ہونے لگے جس سے دونوں ملکوں کے درمیان صحیح مفاہمت کے ذرائع پیدا ہوگئے۔

لارڈ میکالے ہندوستان کے متعلق لکھنے والے انگریز مصنفین میں لارڈ میکالے مستثنیٰ قابلیت کا مسلّمہ انشاپرداز ہے جو اپنی پرزور اور رواں طرز تحریر کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔ اور ہندوستان میں قیام کی بنا پر ہندوستانی مباحث پر اس کی تحریریں مستند سمجھی جانے لگیں۔ کلائو اور ہیسٹنگز پر اس کے

---

[۵] سر ولیم سنہ۱۷۸۳ء میں فورٹ ولیم کی عدالت عالیہ کا جج بنکر ہندوستان آیا، یورپی السنہ کے علاوہ فارسی اور سنسکرت زبانوں پر کافی عبور رکھتا تھا۔ سنہ۱۷۸۴ء میں اس نے کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جو آجتک قائم ہے۔ اس علمی انجمن کے رسالہ (جرنل) میں ہندوستان کی ادبی، تاریخی اور اثری تحقیقات پر بہت بلندپایہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

مضامین[51] آج بھی "کلاسیکل" شمار کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ مابعد کی تحقیقات نے ان کی تاریخی اہمیت کو بہت کچھ گھٹا دیا ہے۔ تعجب ہے کہ ہندوستان سے اس قدر دلچسپی رکھنے کے باوجود میکالے ایک جگہ ہندوستانی ادب کی تحقیر کرتا ہے جس سے اس کو برائے نام بھی آگاہی نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک یونانی شاعر Horace (ہوریس) کی ایک نظم تمام مہابھارت سے کہیں بڑھ چڑھکر ہے، اور انجیل کی کتاب پیدائش رگ وید اور قرآن مجید سے کہیں زیادہ وقعت رکھتی ہے[52]۔

اس میں شک نہیں کہ میکالے نے ہندوستان کے انگریزی تخیل پر جو اثر ڈالا ہے وہ بہت کم لوگ ڈال سکے۔ تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کے اثرات تمامتر اچھے ہی تھے۔ اسی شاندار طرز تحریر کی بدولت اس کو وہ پایۂ استناد ملا جس کا وہ مستحق نہ تھا۔ ہندوستان سے اس کی سچی ہمدردی صرف اس موقعہ پر ظاہر ہوئی جبکہ اس نے دار العوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

"انگلستان کے لئے وہ دن نہایت قابل فخر ہوگا جب وہ اعتماد اور رضامندی کے ساتھ ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ سپرد کر دیگا[53]۔"

کمپنی کے عہد تک ہندوستان کا حصہ انگریزی ادبیات میں صرف یہی تھا کہ چند سفرنامے، بعض تاریخی مضامین، نثر و نظم میں بعض حوالہ جات و اشارات پائے جاتے ہیں۔ برک اور میکالے کے بعد اسکاٹ اور تھیکرے کے ناولوں میں اور ٹینی سن کی نظموں میں ہندوستان کا صحیح تخیل پایا جاتا ہے جو براہ راست حاصل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ خود ہندوستان میں جو کچھ لکھا گیا وہ بھی اس موضوع پر بہت صحیح اور ضخیم تھا۔ مستشرقین کی تحقیقات نے انگریزی شعراکو صحیح ہندوستانی تخیل بہم پہونچایا تھا۔ چنانچہ رابرٹ ساوتھے (Southey) نے سر ولیم جانس کی تصانیف کو پڑھکر[54] The Curse of Kehama (کہامہ کی بد دعا) کے نام سے ایک نظم لکھی جس میں افسانہ کے پیرایہ میں ہندو اساطیر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح Byron (بائرن) نے اپنی نظموں Giaour (گیاور) اور Bride of Abydos[55] (عروس عبیدوس) میں، اور Shelley (شیلی) نے Alaster[56] (الاسٹر) میں ہندوستانی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نیز اپنی ایک مختصر نظم To an Indian air (نسیم ہند) میں اس نے خاموش اور ساکن چشمہ کو

---

[51] ملاحظہ کیجئے Historical Essays by Macaulay [52] قدیم روم کے گیت (لیز آف انشنٹ روم)
[53] تقاریر میکالے۔ [54] و [55] یہ دونوں ترکی قصے ہیں جن میں مشرقی خصوصاً اسلامی خیالات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ دو ایک جگہ ہندوستان کی نسبت بعض اشارے پائے جاتے ہیں۔ دیکھو کلیات بائرن (چنڈوس کلاسکس) صفحات ۱۷۷ تا ۱۸۷۔ اور صفحات ۱۹۶ تا ۲۰۰۔ [56] یہ نظم بھی مشرقی تخیل کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں دریائے سندھ اور وادیٔ کشمیر کا ذکر ہے۔
(کلیات شیلی ص ۱۲ (چنڈوس)

ہواؤں کا چھیڑنا، چمپا کی خوشبوئیں مہکنا، بلبل کے زار و نالے وغیرہ کا نقشہ کھینچا ہے[۵۱]۔ آئرلینڈ کے مشہور شاعر طامس مور نے "لالہ رخ" نام کی ایک طویل نظم لکھی ہے[۵۲] جس کا پلاٹ پنجاب اور کشمیر کی سرسبز و شاداب سرزمین ہے۔ اس منظوم فسانہ کی ترکیب میں بہ نسبت ہندوستانی کے مشرقی عناصر زیادہ ہیں، اور اگرچہ مور کے زمانہ کے سیاحوں کے روزنامچوں اور مؤرخین کی تصانیف میں ہندوستانی تاریخ اور جغرافیہ کے متعلق کافی ذخیرہ موجود تھا۔ تاہم اس نے ان سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ اس کے بیانات میں بجائے اصلیت کے زیادہ تر افسانویت کا رنگ بھر گیا ہے اور غیر ہندی عناصر اس میں شامل ہو گئے ہیں، اور اگرچہ ادبی لحاظ سے یہ ایک شاہکار کہی جا سکتی ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ مشرقی تخیل نے اس کی وقعت کو مغربی نقادوں کی نظروں میں گرا دیا ہے۔ چنانچہ اس کی نسبت یہ قول مشہور ہے کہ "اس کو نہ پڑھنے سے کوئی زیادہ تہی مایہ نہیں ہو جاتا۔" اسی طرح "کہامہ کی بددعا" بھی ایک روکھی پھیکی نظم خیال کی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ والٹر اسکاٹ جیسے کامیاب افسانہ نویس کا ناول Surgeon's daughter (جراح کی لڑکی) جو ایک اینگلو انڈین افسانہ ہے، اس کی دیگر شاہکار تصانیف کے مقابلہ میں بہت پست سمجھا جاتا ہے۔

مسیحی مبلغین کی ادبی کوششیں

عیسائی مشنریوں نے جو مذہبی اور مناظرانہ لٹریچر پیدا کر دیا ہے اس کو انگریزی ادبیات میں جگہ نہیں دی جا سکتی، لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انھوں نے لسانی تحقیقات کے ذریعہ سے ہندوستانی معاملات کو جاننے اور سمجھنے کا راستہ نکالا۔ اور گو مسیحی مبلغین کی ان ادبی کوششوں کا نتیجہ کچھ زیادہ قابل تحسین نہیں نکلا، تاہم ہندوستانی خیالات پر مسیحی اثرات کے پیدا کرنے میں ان کی کوششیں رائگاں نہیں گئیں۔ ان کی سب سے قابل قدر کوشش انگریزی زبان کی اشاعت و ترویج تھی اور اس لحاظ سے انھیں اولیت کا شرف حاصل ہے۔

مورخین

ان سے بھی زیادہ انگریزی ادبیات میں اضافہ کرنے کا باعث وہ مورخین ہوئے ہیں جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ لکھی ہے۔ اور اگرچہ ان کی تصانیف انگریزی کے نامور مورخین کے ہم پلہ نہیں سمجھی جاتی ہیں تاہم وہ مستند تصانیف تسلیم کر لی گئی ہیں۔ ان مورخین میں مل، ہنٹر، الیٹ اور الفنسٹن نے ہندوستان کی تاریخ کے متعلق مفصل اور ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ کننگھم نے سکھوں کی تاریخ اور ٹاڈ نے راجستان

---

[۵۱] کلیات شبلی صفحہ ۱۵ (ہینڈ ورس کلاسکس)

[۵۲] اس نظم کا پہلے اردو میں نادر کاکوروی نے ترجمہ کیا جو ان کے مجموعہ منظومات جذبات نادر حصہ دوم کے ساتھ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا ترجمہ نثر میں لطیف احمد صاحب اکبرآبادی نے کیا ہے جو پہلے نگار میں باقساط اور پھر مستقل کتابی طور پر شائع ہوا ہے۔

کے حالات لکھے ہیں۔ مالیسن، ایڈورڈیز کے سوا کئی اور مورخین کا نام بھی اس سلسلہ میں لیا جا سکتا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ شعرا کے خیالی افسانوں اور سیاحوں کے سفرناموں کی جگہ علمی تحقیقات اور تاریخی تفتیش نے لے لی تھی۔

فنون | ہندوستانی فنون لطیفہ کی طرف بھی توجہ کی گئی، ہندوؤں کی شاعری اور فن ڈراما پر انگریزی زبان میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ چنانچہ سر ولیم جونس کی تصانیف اور ایشیاٹک ریسرچز کی جلدیں اس کی شاہد ہیں۔ اس سلسلے میں ہندو ڈراما پر ولسن کی زبردست تصنیف خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اور غالباً اسی کتاب کے مطالعہ نے زمانۂ حال کے سنسکرت کے سب سے بڑے ماہر فرانسیسی مستشرق سلوین لیوی کو ہندوستانی آرٹ کے متعلق طولانی تحقیقات پر آمادہ کیا۔ مشہور انگریزی ادیب اور ماہر فنون لطیفہ جان رسکن بھی ہندوستان کے آرٹ سے ناواقف نہیں تھا۔ مگر اس کی حالت بالکل میکالے کی سی ہے جو استاد ماہر کی حیثیت سے لکھنے کا تو مدعی ہے مگر اس فن سے ذرا بھی واقف نہیں ہے۔

ادب اور افسانہ | ہندوستان سے اس قدر واقفیت، میل جول، اور سیاسی و تمدنی تعلقات کے باوجود اہل انگلستان نے اہل ہند کے متعلق جو قصے اور ناول لکھے اُن میں وہ ہندوستانی معاشرت کا کوئی قابل قدر نمونہ پیش نہ کر سکے۔ ان فسانہ نگاروں نے اپنے ناولوں کو زیادہ تر ہندوستانی انگریزوں ہی تک محدود رکھا ہے۔ جن میں کبھی کبھی ایک آدھ ہندوستانی کیرکٹر پیش کر دیا جاتا ہے۔ اسکاٹ اور تھیکرے نے اس کو بہت ترقی دی مگر ان کے بعد کے مصنفین نے صحیح ہندوستانی زندگی کا کوئی مرقع پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ رڈیارڈ کپلنگ ابتدا میں اینگلو انڈین قصے لکھتا رہا لیکن اس نے اپنے مشہور ناول Kim (کِم) میں حسن زبان و بیان کے علاوہ ہندوستانی زندگی کی صحیح تصویر کھینچی ہے Mrs. Diver (مسز ڈائیور) اور Mrs. Dell (مسز ڈیل) خاصکر اُن افسانہ نگاروں کے طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں جو اپنے قصوں میں ایک آدھ ہندوستانی بھی داخل کر دیتی ہیں۔ اور مسز فلورا اسٹیل کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے پر ان کی تصویریں اکثر غیر صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ غرض انگریزی افسانوں میں ہندوستان کی نسبت صحیح معلومات نہیں حاصل ہو سکتی ہیں، حالانکہ آئے دن ہندوستان پر تصانیف کا سیلاب اُمڈا چلا آ رہا ہے۔

صنعت | صنائع لطیفہ خصوصاً تعمیرات ہند پر سر جان مارشل اور مسٹر ہاویل اس گروہ کے نمایندے کہے جا سکتے ہیں جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ کا صنعت اور تعمیرات کے ذریعہ مطالعہ کیا ہے۔ ہندوستان کی بعض خاص اقوام کی نسبت لکھنے والوں میں آسام کی ناگا قوم پر مسٹر ہوٹن نے ایک کتاب بطور مونوگراف لکھی ہے جو اس موضوع پر پہلی کتاب کہی جا سکتی ہے۔

تاریخ وسیاسیات سیاسیات کے دائرہ میں زمانۂ حال کے مصنفین میں سر ویلنٹائن شرول کا نام کافی طور پر گوش آشنا ہوچکا ہے۔ ان کی کتاب "ہندوستان میں سیاسی اضطراب" بہت مشہور ہے، اسی طرح قدیم ہندوستان کی تاریخ پر ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ بہت مستند مانے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کی کتابیں اکبر اور اشوک کے متعلق ہندوستانی حکمرانوں کے سلسلہ میں بہت محققانہ اور مستند مانی جاتی ہیں۔

ان بے شمار ناموں میں سے جنھوں نے ہندوستان کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا ہے یہ چند نام خاص طور پر مشہور ہیں، اور اگر اب مصنفین کی مکمل فہرست پیش کی جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائیگی، اس لئے اس مختصر سے مضمون میں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

ہندوستانی مصنفین اس سلسلہ میں خود ہندوستانی مصنفین اور انشاپرداز بھی "واسطۃ العقد" سمجھے جاسکتے ہیں، خصوصاً پچھلے چند برسوں میں ہندوستانیوں نے اپنے ملک کی نسبت انگریزی ادب میں معتد بہ اضافہ ہے۔

شاعری اور ادب میں بہت کم ہندوستانیوں نے نام پیدا کیا ہے، اس لئے کہ ایک غیر زبان میں شعر اور اچھے شعر کہنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ تاہم اس فہرست میں طبقۂ رجال میں سر ٹیگور اور طبقۂ نسواں میں مس تورودت اور مسز سروجنی نائیڈو نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ حیدرآباد کے ایک مسلمان بزرگ "نظامت جنگ" بھی انگریزی شعر کہنے پر قدرت رکھتے ہیں، گو اُن کی نظمیں عموماً بہت مختصر ہوا کرتی ہیں۔

ہندوستان کے انگریزی ادیبوں میں ایس۔ ایم۔ مترا[۱]، بابو رومیش چندر دت[۲] (آنجہانی) سردار جوگیندر سنگھ[۳] اور اقبال علی شاہ[۴] افسانوی ادب میں امتیاز حاصل کرچکے ہیں۔ ہندوستان کے مشاہیر اہل قلم ابھی تحقیقات کے میدان میں سرگرم خرام ہیں، اور اہم ہندوستانی موضوعات مثلاً ویدوں کی قدامت آریوں کا خروج، ہندوستانی تاریخ کا آغاز، عہد گپتا کی شان وشوکت، اشوک اور سری ہرش کی سلطنتیں، مرہٹوں

---

[۱] انھوں نے "ہندوپوز" نام کا ایک نیم سیاسی ناول لکھا ہے جو انگریزی حلقوں میں بھی بہت مقبول ہوا ہے۔
[۲] بنگال کا یہ نامور مصنف اپنے تمام معاصرین میں بہت ممتاز تھا، وہ نہ صرف ایک قابل ادیب تھا بلکہ ایک سیاسی، تاریخی، قانونی اور ادبی انشاپرداز بھی تھا۔ اس وقت متعدد تصانیف انکی یادگار ہیں جن میں ایک ناول "لکنز آگرہ" ہندوستان کا قدیم تمدن، راماین اور مہابھارت کے انگریزی تراجم ہیں۔ مس تورودت انہی کی بھتیجی تھیں۔
[۳] کسی وقت یہ "ایسٹ اینڈ ویسٹ" کے اڈیٹر تھے۔ تین چار ناول ان کے قلم سے نکلے ہیں جو انگلینڈ میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان میں "نسرین" پنڈت رتن ناتھ در کے "جام سرشار" کا چربہ ہے۔ ان کا ایک اور ناول "نورجہاں" کے نام سے بھی شائع ہوچکا ہے
[۴] انگریزی رسائل میں انکے مختصر قصے چھپتے رہتے ہیں، دو ایک کتابیں ان کی تصنیف سے ہیں۔

اعروج، ہندوستان قرون وسطیٰ میں، عہد مغلیہ کی تاریخی تحقیقات، وغیرہ میں جنھوں نے جیسوال
ور تلک، بھنڈارکر اور کرشن سوامی آئنگر، جدوناتھ سرکار، اور عبد اللہ یوسف علی جیسے مشہور انشاپردازوں
دا اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں آنریبل سید امیر علی مرحوم (رکن پریوی کونسل)
نگریزی کے ایک نامور انشا پرداز تھے۔ چنانچہ لنڈن یونیورسٹی نے آپ کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی سند
یکر آپ کی ادبی قابلیت کا اعتراف کیا تھا۔ آپ کی تصنیف سے کئی ضخیم کتابیں ہیں جن میں اسپرٹ آف
سلام، ہسٹری آف ساراسین بہت مشہور ہیں۔ قانون پر ان کی کتابیں بہت "مستند" مانی جاتی ہیں سیاسیا
رعلیم پر لکھنے والوں میں نواب عماد الملک بلگرامی اچھے انگریزی انشاپرداز تھے۔ قرآن مجید کے چند پاروں
ترجمہ بھی آپ نے انگریزی میں کیا تھا۔ اسلامی موضوعات پر مسٹر صلاح الدین خدابخش (مرحوم) کی تصانیف
ر تراجم بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

دنیائے صحافت میں مولانا محمد علی مرحوم (سابق مدیر کامریڈ) سید حسین (سابق مدیر کرانیکل) مسٹر عبد اللہ
یلوی، بابو راماnند چٹرجی (اڈیٹر ماڈرن ریویو) مسٹر چنتامنی (اڈیٹر انڈین ریویو) خاص طور پر قابل ذکر
ہیں۔ جنھوں نے پچھلی ربع صدی میں ہندوستانی صحافت کی بہت بڑی خدمات انجام دی ہیں۔

اسی طرح فلسفہ، اقتصادیات، معاشیات وغیرہ پر ہمارے ہندوستانی علما نے مغربی تعلیم سے
ستفادہ کر کے لکھنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن ان چند ناموں سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ملک میں دوسرے
نگریزی زبان کے اچھے لکھنے والے نہیں ہیں، یہ صرف چند مشہور نام ہیں جو ہم نے پیش کئے ہیں۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ اس معاملہ میں اہل مغرب ہی ہمارے رہنما ہیں وہی آرنلڈ اور ڈرائیڈن
لغویات سے اٹھا کر برک اور میکالے کی محدود معلومات سے گزرتے ہوئے ہمیں اس وسیع النظری اور
بصیرت کی طرف لے گئے ہیں جس سے ہم ہندوستانی فلسفہ، ہندوستانی ڈراما اور اسلامی تاریخ و تمدن
عظمت سمجھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اب یہ برادران وطن کا کام ہے کہ وہ اہل مغرب کو اپنے صحیح علوم
و تاریخ اور صحیح تہذیب و تمدن سے آگاہ کریں اور بتا دیں کہ دنیا کے تمام ممالک میں ہندوستان
حیثیت سے علوم و فنون سے مالا مال ہے اور اس کے باشندے ہر لحاظ سے دنیا کی تمام بڑی بڑی
رمتمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑے ہونے کے قابل ہیں۔

قدیم افغانستان اور اسکے باشندے

(از ٹھاکر جے۔آر۔ رائے۔ جرنلسٹ۔ لاہور)

موجودہ افغانستان کا رقبہ کم وبیش ڈھائی لاکھ مربع میل اور آبادی اسی لاکھ کے قریب ہے۔ قریب قریب سارا ملک پہاڑی ہے۔ مگر شمال اور مشرق میں ہندوکش کی عظیم الشان سدسکندری حائل ہے اندرون ملک کوہ بابا اور کوہ سفید کابل سے مغرب میں ہرات اور کابل کے مابین واقع ہے۔ کوہستان سلیمان اور کوہ سیاہ بھی ہے۔ ہندوکش چودہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہے۔ باقی پہاڑیاں چار ہزار فٹ سے لیکر سات ہزار فٹ تک اونچی ہیں۔ جانب جنوب اور جنوب مغرب میدان ہے جہاں زیادہ تر ریت ہے۔ مغرب میں ایران ہے جس کی سرحد ہرات سے سیدھے خط میں پچاس میل کے قریب آگے ہے۔ پرانے زمانہ میں ہرات سرحدی شہر تھا۔ شمال میں روسی علاقہ ترکستان کا ہے اور مشرق میں آزاد اور فتنہ پرداز سرحدی قبائل کا ملک ہے پرانے زمانہ میں ہندوکش افغانستان اور ایشیائے وسط کے درمیان حدِ فاصل تھا۔ بخارا، سمرقند وغیرہ کا علاقہ کلیتہً علیحدہ تھا۔ مشہور ماہر سر ایچ۔ جے۔ مکنزی رقم طراز ہیں:۔

"ہندوکش شمال مغرب کی جانب ملک ہند کی طبعی سرحد ہے۔ اس کی فطری بند سکندری شمال مغرب میں ملک ہند کی شہر پناہ کا کام دیتی ہے۔ اسے انگریز مدبر سائنٹیفک فرانٹیر (Scientific Frontier) کے نام سے پکارتے ہیں جسے حاصل کرنے کے لئے پچھلی صدی میں انگریزوں نے ہرچند کوشش کی مگر ناکام رہے لیکن تاریخ میں ایک مرتبہ ایسا بھی آیا تھا جبکہ ہندوکش فی الحقیقت اور قدرتی سرحد ہند بنا تھا۔ چوتھی صدی قبل از سنِ عیسوی کے آخری ربع کے دوران میں ہندوکش سلطنت موریہ اور سیلیوکس کی سلطنت کے مابین حدِ فاصل[1] کا کام دیتا تھا۔"

اگر ہندوکش ہندوستان کی فطری اور بہترین سرحد ہے تو اس سے اِدھر کا علاقہ ملک ہند کا جزو اصلی شمار ہونا چاہیئے۔ ماہران جغرافیہ اور تاریخ کی رائے میں سرحدی قبائل اور افغانستان کا علاقہ ہندوستان کا جزوِ لازم ہے۔

پرانے وقتوں میں افغانستان کو اس امر سے خاص اہمیت حاصل تھی کہ مغربی اور وسطی ایشیا اور

---

[1] ملاحظہ ہو "کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" جلد اول مرتبہ پروفیسر ریپسن صفحہ ۳۲-۳۳۴-مطبوعہ ۱۹۲۲ء

ملک ہند میں آنے جانے کا راستہ اسی ملک سے گزرتا تھا۔ کابل ان سڑکوں کا مرجع تھا مشہد سے ہرات اور ہرات سے کابل تک سڑک آتی تھی۔ جہاں سے ایک تو وادیٔ کابل سے ملک پنجاب میں اور دوسری وادیٔ پنج شیر سے ہوکر ہندوکش کو چیر کر سمرقند، بخارا اور مشرقی ترکستان سے چین کو جایا کرتی تھی۔ سکندر سیستان سے قندھار آیا اور قندھار سے کابل پہونچا۔ پھر وادیٔ پنج شیر سے وسطی ایشیا میں پہنچ گیا، بعدازاں لشکر دریائے کابل اور خیبر کے راستہ سے پشاور کے علاقہ میں وارد ہوا تھا۔

بلخ کے ہندو حکمران پرانے زمانہ کا علاقہ باختریہ بہت مشہور ہے، تاریخ سلف میں اس کا بار بار ذکر آتا ہے مگر سکندر کے ہمرکاب یونانی حکما، کی تحریروں کے سبب سے اسے بہت شہرت حاصل ہوئی تھی۔ اس علاقہ کا محلِ وقوع افغانی ترکستان ہے جس کا بڑا شہر بلخ ہے۔ جو کابل کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ کابل اور بلخ کے درمیان تقریباً پونے دوسو میل کا فاصلہ ہے۔ پُرانے زمانہ کے باختریہ میں آریہ ہندو آباد تھے۔ اور وہاں پر آریہ ہندوؤں کی حکومت تھی۔ سویڈن کا مشہور محقق کونٹ بجرن جرن لکھتا ہے:۔ "باختری نسخہ جو دبستان کے نام سے مشہور ہے اور جسے کشمیر سے سر ولیم جونز یورپ لائے تھے۔ اس میں حکمرانوں کی جامع فہرست مندرج ہے۔ جو مہابدرنی کے خاندان کے راجاؤں کی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ملک میں اس خاندان کا پہلا راجہ حملۂ سکندر سے (۵۶۰۰) سال پہلے گذرا ہے۔" مل نے اپنی مشہور تاریخ ہند[1] میں بھی یہ بیان کیا ہے کہ باختریہ میں آریہ ہندو راج تھا۔ تازہ تاریخی تحقیقات سے دبستان اور مل کے بیانات کی کس حد تک تائید ہوتی ہے یہ کہنا محال ہے۔ ڈاکٹر ایچ۔ ایچ۔ ولسن نامی ماہر سنسکرت نے اب سے سو سال پہلے افغانستان کے آثار قدیمہ کی تحقیقات کر کے یہ رائے ظاہر کی تھی: "یونانی حملہ سے پہلے افغانستان میں آریہ ہندو آباد تھے جو سِدی قوم کے حملہ سے دب گئے مگر جب اسے زوال لاحق ہو گیا تو آریہ[2] ہندوؤں نے پھر زور پکڑ لیا۔"

ویدک قوموں کی باہمی جنگ آرائی رگ وید سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم کے ہندو آریہ لوگ مشرقی افغانستان سے خوب واقف تھے۔ دریائے کابل (کُبھا) اور سوات (سُواس ت و) اور قرم (کرُمہ) اور گومل (گومتی) کا ذکر ملتا ہے۔ علاوہ ازیں رگ وید (کے ساتویں منڈل) میں ایک عظیم معرکہ کا بھی حال درج ہے راجہ سداس بھارت قوم کا راجہ تھا۔ اس کے باپ دادا بڑے نامی حکمراں نہ تھے دس قوموں اور راجاؤں نے

[1] "تاریخ ہند" جلد دوم صفحہ ۲۲۷-۲۲۸۔

[2] سنہ ۱۹۳۰ہجری "افغانستان آف دی افغانز" صفحہ ۱۹ مصنفہ سردار علی شاہ۔

اس کے خلاف ایک شاندار جتھا بنایا، جس میں شمو، ترکیشہ، دروہو، گبشہ، پورو، انو۔ ترے کرنہ، جادو، متیہ، پکتھ، بھلانہ۔ الینہ، وشانی۔ شبی۔ آج۔ اور یک شنو قومیں اور ان کے قبائل شامل تھے۔ علاوہ ازیں راجہ تمبر اور راجہ بھید بھی تھا۔ پروفیسر نارائن چندا بندوپادھیا ان قوموں کے دیس کی نسبت حسب ذیل حالات لکھتے ہیں:۔

"ترکشہ قوم کا رگ وید میں اکثر ذکر آتا ہے اور ان کا جادو، انو۔ پورو اور دروہو قوموں سے بہت گہرا ربط ضبط تھا۔ اور یہ دریائے پرشنی (راوی) کے کناروں پر آباد تھی۔ زمانۂ مابعد میں مشرق کو نقل مکان کر گئی۔ انویا، آنب قوم بھی پرشنی کے کنارے پر آباد تھی، اور جادو وغیرہ قوموں کے ساتھ جتھے میں شریک تھی۔ آج قوم کے ٹھکانے کا کوئی پتہ نہیں۔ آلنہ قوم کا ذکر پکتھ اور بھلانہ شبی اور وشانی کے ساتھ آتا ہے۔ دروہو قوم کا حال جادو، ترکیشہ، انو اور پورو کے ساتھ شامل ہے۔ پکتھ کا بھی رگ وید میں ذکر ہے۔ بھلانہ کا دیس بعض ماہروں نے مشرقی کابلستان قرار دیا ہے۔ متیہ کا ذکر رگ وید میں تھوڑا ملتا ہے۔ مگر بعد کے زمانہ میں اس نے بڑا عروج پکڑا، اس کے ایک تاجدار نے اشومیدھ جگ کیا تھا۔ جادو قوم بہت مشہور ہے۔ رگ وید میں اس کا ذکر بہت پایا جاتا ہے۔ یہ بڑی بہادر اور جفاکش قوم تھی؛ سداس کے خلاف جتھا اسی قوم کی کوشش سے مرتب ہوا تھا۔ ترے کرنہ کے کئی قبائل تھے جو جتھے میں شامل تھے۔ اسی طرح شیگرو اور شمو اور شبی قوم کے لوگ بھی سداس کے مخالفوں میں شریک تھے۔ اٹک کے پار منتہائے مغرب میں کمبوج، گندھاری۔ الِنہ پکتھ، بھلانہ اور وشانی قومیں رہتی تھیں۔ اٹک کے مشرق میں منجملہ دیگر اقوام کے شبی اور جادو قومیں بھی تھیں جن کا ملک جہلم (وتستا) اور اٹک (سندھو) کے مابین تھا۔ جہلم کے مشرق کے پہاڑی علاقے میں تین اور زبردست قومیں تھیں، اسکنی (چناب) اور پرشنی (راوی) کے درمیان نیچے کے خطہ میں دروہو، ترکشہ اور انو قومیں رہتی تھیں۔ شتدری (ستلج) کے مشرق میں بھارت اور ترت سو قومیں آباد تھیں جو راجہ سداس کی ہم نسل اور نزدیکی رشتہ کے سبب سے معاون تھیں اور ان کے ہمسایہ میں پورو قوم تھی جو جتھے میں شریک تھی۔"[1]

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ راجہ سداس زمانہ حال کے اضلاع لدھیانہ، انبالہ، سہارنپور وغیرہ کا حکمراں تھا، اس کے خلاف غالباً اس کے بڑھتے ہوئے عروج کے سبب سے پندرہ بیس چھوٹی بڑی قوموں اور ان کے راجاؤں نے ایکا کیا جو سرحدی قبائل کے علاوہ افغانستان تک آباد تھیں۔ متواتر معرکہ آرائیوں

[1] ملاحظہ ہو "ڈیولپمنٹ آف ہندو پالیٹی" حصہ اول فصل ۱۰ مطبوعہ ۱۹۲۰ء

میں سداس نے اپنے مخالفوں کو مغلوب کر لیا۔ ڈاکٹر یو۔ این۔ گھوشال کا بیان ہے کہ الینہ قوم کافرستان کے شمال مشرق میں رہتی تھی، بھلانہ اور پکتھ درۂ بولان کے خطہ میں آباد تھی، افغان اپنے کو پکھتون[۱] پکارتے ہیں۔

پکتھ قوم کی اصلیت پروفیسر ہندو پادھیا کا بیان ہے کہ دریائے اٹک کے بہت آگے انتہائے مغرب میں کمبوج، گندھاری، الینہ، پکتھ، بھلانہ اور وشانی قومیں آباد تھیں۔ جرمن ماہر سمر کی رائے یہ ہے کہ گندھاری قوم دریائے کابل کے کناروں پر رہتی تھی۔ پکتھ قوم کا رگ وید (۷ منڈل) میں ذکر آتا ہے پروفیسر ہندو پادھیا اور گھوشال کا بیان ہے کہ وہ درۂ بولان کے خطہ اور مشرقی کابلستان میں آباد تھی راجہ سداس کے زمانہ کا تعین دشوار ہے۔ کیونکہ رگ وید کے زمانہ کی نسبت سخت اختلاف رائے ہے، مگر ماہروں کی اکثریت کا یہ اندازہ ہے کہ رگ ویدکی رچائیں سنہ عیسوی سے دو ہزار اور پندرہ سو سال[۲] پہلے بنی تھیں، بہر حال پکتھ عرصہ تک اسی سرزمین میں رہی۔ ہیرداطوس یونان کا مشہور سیاح اور مورخ گزرا ہے جو سن عیسوی سے پانچ سو برس پہلے پیدا ہوا تھا۔ دارا کے حملۂ ہند (انڈیا) کے تذکرے میں وہ پک تیکی[۳] قوم کا ذکر کرتا ہے۔ مشہور ماہر سنسکرت پروفیسر رالپسن "پک تائیک" (Paktyike) کی تشریح یوں کرتے ہیں "اس سے مراد پکھتو[۴] یا پشتو یعنی پٹھانوں کا ملک ہے"۔ پھر آپ ہیرداطوس کے بیان کا حوالہ دیتے ہیں کہ کشپ پور اور پکھ تو دیس کے لوگ گورے اور شستہ آریہ تھے جیسے باختریہ (بلخ) کے باشندے، ایرانی ان کے بھائی بند تھے"۔ (ور جنوبی ہند کے باشندوں کو حبشیوں کے مانند سیاہ فام لکھا ہے، ہیرداطوس کی پک تائیک قوم رگ وید کی پکتھ کے مشابہ ہے اور یہ آریہ تھی جس کا رنگ گورا تھا اور وہ شایستہ تھی۔ نامی ماہر سر ٹامس ولزلے ہیگ کی رائے ہے کہ ۵۰۰ ق م (قبل مسیح) سے پہلے افغانستان سلطنت ایران کا ایک صوبہ تھا جس کے حصے آریہ (ہری رود) باختریہ (بلخ) درنگیانہ (سیستان) دریائے ہلمند کی وادی، ارکوشیا (قندھار) خطۂ ہندوکش اور کابل تھے۔ شمال کی طرف ایرانی نسل کے لوگ آباد تھے اور جنوبی اضلاع میں ہندو نسل کے لوگ رہتے تھے، قندھار میں پکتی قوم آباد تھی، اس سے مراد پختن یعنی پشتن[۵] ہے۔ افغان اپنے کو اسی نام سے ملقب کرتے اور پکارتے ہیں۔" مولانا سید سلیمان صاحب عرب سیاح و جغرافیہ نویس ابوالحسن علی مسعودی کے حوالہ سے لکھتے ہیں

---

[۱] "انشنٹ انڈین کلچر ان افغانستان" صفحہ ۵ مطبوعہ ۱۹۲۸ء

[۲] ملاحظہ ہو "پولیٹیکل ہسٹری آف انشنٹ انڈیا" صفحہ ۱۲۳ مصنفہ پروفیسر رائے چودھری ۱۹۲۳ء

[۳] "انڈیا اینڈ دی ویسٹرن ورلڈ" صفحہ ۱۲-۱۰-۲۱

[۴] "انسائیکلو پیڈیا برٹانیکہ" جلد ۱۲ صفحہ ۲۰۷ مطبوعہ ۱۹۲۹ء

"عجیب بات یہ ہے کہ اس نے قندھار کو رہبوط (راجپوتوں[1]) کا ملک بتایا ہے۔" اور یہ سیاح ۳۰۳ھ میں گزرا ہے اور یہ ۹۲۵ء کے مطابق ہے۔ مشہور انگریز ماہر میجر جنرل سر جارج گریے اسٹن کی رائے ہے کہ "پٹھان لوگوں کی شریعت رواج عام ہے جو راجپوت دستور سے حیرت انگیز مشابہت رکھتا ہے..... پٹھانوں کے ایک گروہ کے سر کی مساحت (۷۸۰۸) پائی گئی ہے جو ہندوستان کے راجپوتوں[2] کے سوا اور کسی قوم کے سر کی گولائی سے لگا نہیں کھاتی۔" اس اجمالی بحث سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ رگ وید میں مذکور ملیچھ قوم جو درۂ بولان اور مشرقی کابلستان میں آباد تھی ہیروڈوٹس کی "پک تائیک" یعنی پکھتو یا پشتون ہے۔ سر ٹامس ولزلے ہیگ اسے پکتی بیان کرتے ہیں جو علاقہ قندھار میں آباد تھی، مسعودی نے وہاں پر رہبوط یعنی راجپوت تسلیم کیا ہے۔ نندو لال ڈے۔ نامی بنگالی ماہر کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ کمبوج افغانستان کا مترادف ہے۔ مارکنڈے پران اور منوسمرتی کی رو سے کمبوج سے مراد افغانستان کا شمالی حصہ ہے۔ ممتاز ماہر ڈاکٹر اسٹائن کی رائے میں کمبوج سے مراد افغانستان کا مشرقی حصہ ہے۔ مہابھارت کے بیان کی رو سے کمبوج دیس گھوڑوں کے لئے بہت مشہور تھا۔ اور فی زمانہ کابل کے گھوڑے اپنی نرالی خوبی کے لئے ضرب المثل ہیں۔ ہندوکش کی سیاہ پوش قوم اسی کمبوج قوم کی اولاد خیال کی جاتی ہے کرنیل ولفرڈ کی تحقیقات کے رو سے کمبوج غزنی کے پہاڑ کے ساتھ شمار اور مذکور ہوتا ہے۔ گندھار دریائے کنار اور دریائے اٹک کے مابین اور دریائے کابل کے دونوں جانب تھا، اضلاع پشاور، راولپنڈی علاقہ سوات، یوسف زئی کا علاقہ وادی کا علاقہ پرانے گندھار میں شامل تھا۔ کرنیل رالنسن محقق آثار قدیمہ کا بیان ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں خطۂ اٹک کے گندھاری لوگ قندھار میں جا کر آباد ہو گئے، اس وجہ سے غالباً ابوالحسن علی مسعودی نویں صدی میں قندھار میں راجپوتوں کی آبادی کا ذکر لکھتا ہے۔ اب افغانستان اور افغان کی اصلیت ملاحظہ ہو:۔ افغانستان کا پرانا نام کمبوج ہے جس کا ذکر مہابھارت میں آتا ہے، وہاں کے گھوڑے مشہور تھے۔ افغان کا سنسکرت مترادف آو (آپ) گان ہے جس کا ذکر برہت سنگھتا میں آتا ہے۔ اشوکان دوسرا لفظ ہے، اشو سے مراد گھوڑا ہے اور کان یونانی مورخ ایرین اشوکان کو اسکنوئی لکھتا ہے جس سے مراد آشش وانکہ ہے۔ اب کاپشا کا ذکر ملاحظہ ہو جس کا ذکر یونانی اور لاطینی مورخین کرتے ہیں۔ کشان اس کا موجودہ محل وقوع قرار دیا گیا ہے جو ہندوکش کے ڈھلوان پر ہے، اوپیان سے دس میل جانب مغرب تھا، اس سے مراد دریائے کابل کے شمالی ملک تھا۔ جو لین لکھتا ہے

---

[1] "عرب و ہند کے تعلقات" صفحہ ۳۷

[2] "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" جلد ۱۸ صفحہ ۲۸۴

کہ پنج شیر اور نگاؤ کا خطہ کاپشا تھا، جو کوہستان کی شمالی سرحد ہے۔ طالمی کے بیان کی رو سے کاپشا کابل سے ڈھائی درجے شمال کو تھا۔ سر آر۔جی۔ بھنڈارکر کی تحقیقات کی رو سے افغانستان کے شمال میں کاپشا واقع تھا۔ اور گندھار کا صدر تھا، راپسن کی رائے میں افغانستان ہی پرانے زمانہ کا کاپشا تھا۔ اگر ان مختلف بیانات کو یکجا جمع کیا جائے تو تکبھہ اور پشتن کی یکسانیت تسلیم کرنے میں چنداں دقت پیش نہیں آسکتی۔

یونانی مورخوں کے بیانات

اب یونانی مورخوں کے بیانات ملاحظہ ہوں، استرابو کا بیان ہے کہ سلطنت ایران کے دلاور بانی قرش (Cyrus) نے جس کا ۵۲۹ق م میں انتقال ہوا تھا بلوچستان کے رستے سے ملک ہند پر چڑھائی کی مگر سارا لشکر برباد ہوگیا، دوسری مرتبہ وادیِ کابل سے لشکر کشی کرکے شاندار کامیابی حاصل کی۔ پلائنی کا بیان ہے کہ قرش نے شہر کاپشا برباد کر دیا۔ ایرین کا بیان ہے کہ "اٹک کے مغربی خطہ میں دریائے کابل تک ہندی اقوام اشّ واتکہ اور اشّ مکہ آباد تھی۔ یہ پرانے زمانہ میں پہلے آسوریہ اور بعد میں ماریہ والوں کی محکوم رہیں آخر کار قرش کو خراج دینا منظور کر لیا۔ استرابو کا یہ بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایرانیوں نے شداکہ قوم کے نوجوانوں کو انعام کا لالچ دیکر اپنی لشکروں میں بھرتی کر لیا، یہ شدرکہ وہی قوم ہے جو حملۂ سکندر کے وقت موجودہ ملتان کے شمال میں آباد تھی، اس کی ہمسایہ بہادر قوم مالوا تھی، دونوں نے سکندر کے دانت کھٹے کئے تھے سکندر کے مہلک زخم لگا تھا۔ اشّ واتکہ قوم کا مہابھارت میں ذکر لکھا ہے، نقش رستم میں جہاں دارا (۴۸۶ق م میں انتقال ہوا تھا) کا مقبرہ ہے، ایک سنگلاخ کتبہ میں گندھار اور علاقہ آن روئے اٹک جسے ہیروڈوٹس "انڈیا" پکارتا ہے سلطنت ایران میں شامل تھا، یہ اس کے بیان کی رو سے سب سے دولتمند اور گنجان آباد صوبہ تھا۔ ۲۵۹ من سونا سالانہ خراج میں جایا کرتا تھا، جب دارا کے بیٹے خشتی یارشا (Xerces) نے جس نے ۴۸۶ق م سے ۴۶۲ق م تک حکومت کی یونان پر فوج کشی کی تو اس کی سپاہ میں گندھار اور آن روئے اٹک کی ہندو فوج بھی شامل تھی۔ تاریخ سلف کا دنیا کا سب سے بڑا محقق جرمن ماہر ایڈورڈ مائیر (Meyer) اس کی رائے نہایت قیمتی سمجھی جاتی ہے، وہ لکھتا ہے کہ قرش نے سن عیسوی سے ساڑھے پانچ سو برس پہلے ہندوکش کے قبائل زیر کئے، پھر وادیِ کابل کے ہندو قبائل گاندھاری اور ستگیادی جنھیں اس زمانہ کے ایرانی اپنی زبان میں تھتہ گو پکارتے تھے مغلوب کئے۔ اس بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ چھٹی صدی قبل از مسیح میں وادی کابل اور ہندوکش کے خطہ میں آریہ ہندو اقوام آباد تھیں۔

سلہ۔ ملاحظہ ہو "پولیٹیکل ہسٹری آف انشنٹ انڈیا" صہ ۱۲۲۔۱۲۳

سلہ۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا جلد اول صہ ۳۴۳

حملۂ سکندر کے وقت کے حالات

افغانستان اور اس کے مشرق میں گندھار، زار (ہزارہ کے لوگ) کا کپش (شمالی افغانستان کے لوگ) آن روے اٹک کے علاقہ میں سکندر کے حملۂ ایشیا (پہلے ایران، پھر افغانستان و ترکستان) کے وقت بھی جو سن عیسوی سے ۳۲۶-۴۹ ق م کا واقعہ ہے وہاں پر ہندو آباد تھے، اور ان کے اپنے سردار اور فرمانروا تھے، جس وقت سکندر نے کابل سے وسطی ایشیا کی طرف کوچ کیا تو ہندوکش میں ایک چھوٹی حکومت ہندوؤں کی تھی جس کا راجہ ششی گپت تھا۔ اور ہندو فوجی دستے باختریہ والوں کے حسب طلب ان کی معاونت کے لئے باختریہ میں موجود تھے۔ سکندر ششی گپت کو اپنے ہمراہ وسطی ایشیا کو لے گیا اور پھر پنجاب کی لشکر کشی کے وقت بھی اسے اپنے ساتھ ہی لایا۔ اس کا یہ گمان ہوگا کہ اس کے ذریعہ سے ہندوؤں سے معاملہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

• اُس وقت پشاور کے شمال کا سارا پہاڑی علاقہ ہندوؤں سے آباد تھا جن کے اپنے چھوٹے بڑے کئی راجے تھے جنھیں زیر کرنے میں سکندر کو کئی مہینے لگے۔ ان میں قابل ذکر حسب ذیل ہیں جن کا ذکر سکندر کے ہمرکاب یونانی حکمانے قلمبند کیا تھا۔

(۱) اسپینی کا ملک۔ یہ دریائے کابل کے شمال میں تھا، اس کا صدر دریائے کنار کے کنارے پر تھا جہاں راجہ رہا کرتا تھا اور دو بڑے شہر بھی تھے جن کے نام اندکہ اور آرگٹم تھے۔

(۲) گرائین کا راج۔ یہ دریائے پنج کورہ کی سرزمین میں اسپنی اور آشن مکہ کے ملک کے درمیان واقع تھا۔

(۳) آشن مکہ کی حکومت۔ اس کی راجدھانی مساگہ (مزاغہ) تھا جس کا قلعہ بہت مستحکم تھا جو ملاکنڈ کے درہ کے قریب تھا۔ آشن وکہ یا آشن مکہ قوم کا ذکر پانینی نے لکھا ہے۔ اس کا ایک گروہ دکن میں بھی تھا جس کی مشہور آشنکہ مہاجن پد مشہور ہے۔ راجہ اشنکہ کے پاس بیس ہزار رسالہ تیس ہزار پیدل اور تیس ہاتھی تھے، اس نے سکندر کا بہادری سے مقابلہ کیا مگر تین چار روز بعد مارا گیا۔ تورانی نے ناامید ہو کر سکندر سے صلح کی درخواست کی، ہزارہ کے علاقہ کے کئی ہزار جوان انعام کی لالچ سے راجہ مساگہ کے پاس لڑنے کو جمع تھے، سکندر نے انھیں لالچ دیا کہ ہمارے ساتھ چلو، اُنھوں نے پہلے آمادگی ظاہر کی پھر خیال آیا کہ اپنے بھائی بندوں سے لڑنا دھرم نہیں ہے چنانچہ رات کو کھسک جانے کی صلاح ٹھہری جس کا سکندر کو پتہ لگ گیا، پندرہ بیس ہزار سپاہیوں نے ان کا کیمپ گھیر لیا خوب گھمسان کا معرکہ ہوا، جب کوئی مرد مرتا تو اس کی عورت اس کے ہتھیار لے کر لڑتی جس سے یونانیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔

(۴) پُس کلاوتی کا راج۔ جہاں اب چارسدہ ہے وہاں پر اس حکومت کا صدر تھا، سکندر کے وقت راجہ ہستی حکومت کرتا تھا، سکندر کے ایک لشکر سے خوب لڑا مگر مارا گیا۔

اس مختصر بیان سے واضح ہے کہ سکندر کے وقت ہندوکش سے لیکر پشاور تک ہندو قومیں آباد تھیں یونانیوں نے وزیرستان وغیرہ کا حال نہیں لکھا ہے کیونکہ وہ اُدھر نہیں گئے۔ مگر گمان غالب ہے کہ اس ملک میں اور اُس سے آگے غزنی وغیرہ کے علاقے میں وہی پُرانے گروہ آباد تھے جو دو سو سال پہلے سے شاہِ ایران کو خراج دیا کرتے تھے اور ان میں پکتھ قوم بھی تھی۔

عظیم الشان سلطنت موریہ

سکندر دل شکستہ ہوکر جہلم کے دریائی راستہ سے سندھ پہونچا اور وہاں سے مکران کے راستہ سے سوزہ (ایران) ۳۲۴ق م میں چلا گیا۔ اور ۳۲۳ ق م میں شہر بابل میں مرگیا۔ وہ سندھ سے چلا ہی تھا کہ اقوام و سرداران کا زبردست جتھا نوجوان چندرگپت موریہ کی کوشش اور ہوشیاری سے مرتب ہوگیا، جس نے سکندر کے وائسرائوں کو جو بیاس سے لیکر پشاور تک مع زبردست یونانی سپاہ کے تعینات تھے جنگ آرائی کا اعلان کردیا۔ واضح ہو کہ مفتوحہ ملک پنجاب کے انتظام اور یونانی تسلط کے قیام کے لئے سکندر نے اپنے نہایت ہوشیار دلاور اور آزمودہ کار جرنیل اور آزمودہ کار یونانی سپاہ کا بھاری لشکر تعینات کردیا تھا۔ جنگ شروع ہوئی، ہر میدان میں یونانی جرنیل شکست کھاتے رہے، چندرگپت نے ہزیمت پر ہزیمت دے کر یونانی سپاہ کا ستیاناس کردیا، انھوں نے اطاعت قبول کرکے جان بچائی، اس طرح پر سکندر کا کام جو سال ڈیڑھ سال میں سرانجام ہوا تھا، دلاور چندرگپت نے جس کی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ نہ تھی اتنے ہی عرصہ میں خاک میں ملادیا، شاندار یونانی سلطنت نقش برآب ثابت ہوئی۔ آخرکار چندرگپت بیاس سے لیکر پشاور تک فرمانروا ہوگیا۔ بعد میں اس نے مگدھ کے مہاراجہ پدم نندا کو سخت معرکہ میں شکست فاش دی جس میں اُس زمانہ کا سب سے بڑا ہندو فرمانروا کام آیا اور چندرگپت عظیم سلطنت مگدھ کا جو برہم پتر سے لیکر الہ آباد تک ادھر ہمالہ کے دامن سے لیکر بندھیاچل تک پھیلی ہوئی تھی تاجدار بن گیا، نندا کی بھاری فوج اور بے قیاس دولت جس کے لئے وہ بہت ہی مشہور تھا چندرگپت کے ہاتھ آئی، پھر اس نے رفتہ رفتہ اپنی سلطنت مغرب میں گجرات کاٹھیاواڑ اور سندھ تک پھیلائی اور جنوب میں ریاست میسور کے شمالی اضلاع تک اپنا تسلط بٹھالیا۔ چندرگپت اعظم صرف فاتح ہی نہ تھا بلکہ وہ بڑا عجیب و غریب منتظم بھی تھا، خوش قسمتی سے اُسے چانک کوٹلیہ ایسا عالی دماغ مدبر وزیراعظم مل گیا تھا جو ہندو فنِ حکومت کا سب سے بڑا اُستاد سمجھا جاتا ہے۔ موجودہ نظامِ حکومت چندرگپت کے نظم و نسق کی ہوبہو نقل ہے۔ مغربی محقق اسے "بہت پیچیدہ قسم کی دفتر شاہی حکومت" بتلاتے ہیں۔ ملک کے چاروں طرف سڑکیں تھیں جو پشاور سے برہمپترا اور کوشان بی (الہ آباد کے قریب) سے سندھ، گجرات اور دکن کی طرف جاتی تھیں، دونوں طرف درخت، جابجا کنوئیں اور سرائیں تھیں، چوراستوں پر تختے لگے ہوئے تھے جن پر مختلف مقامات کے نام اور فاصلے درج تھے اور سڑکوں پر کوسوں کے نشانات تھے

مردم شماری، خانہ شماری، خسرہ گرداوری اور رجسٹر ملکیت مکانات (قصبات اور شہروں کے لئے) محصول کی چنگیاں، مسافروں کی نگرانی اور جاسوس اور بیسیوں باتیں تھیں جن کا تفصیلی ذکر کسی اور موقع کے لئے اُٹھائے رکھتے ہیں۔

سکندر کے مرنے کے بعد اس کے ایشیائی مقبوضات پر اس کے جرنیل قابض ہوگئے، افغانستان اور بلوچستان تک اُن میں تقسیم ہوگیا، سلیوکس نے بابل لے لیا اور آسوریہ کے یونانی حریف سے معرکے شروع کردیئے۔ ۳۱۱ء ق م میں وہ شہنشاہ بن گیا تو فوراً پنجاب پر از سرِ نو یونانی تسلط بٹھانے کی کوشش شروع کردی، چار پانچ سال کی تیاریوں کے بعد ۳۰۵ء ق م میں بہت بھاری لشکروں اور سامانوں کے ساتھ کوچ کا حکم دے دیا۔ مصر تک کی فوجیں اور حکمرانانِ یونانی اس کے ہمرکاب تھے۔ ۳۰۴ء ق م میں وہ جہلم کے کنارے اسی جگہ خیمہ زن ہوا جہاں مئی ۳۲۶ء ق م میں سکندر نے ڈیرے ڈالے تھے، کیونکہ سلیوکس کا منشا سکندر کی طرح شاندار فتح حاصل کرکے پنجاب کو یونانی حکومت میں شامل کرنے کا تھا، ادھر چندر گپت اعظم تھا جو یونانی دھاوے کی اہمیت سے خوب آگاہ تھا، اُس نے ہر قسم کی سپاہ اور سامان عین اسی میدان میں جمع کردیئے جہاں پورو کی مٹھی بھر فوج سکندر کی مزاحمت کے لئے تعینات کی گئی تھی۔ یونانی بیان کی رو سے چندر گپت کی ہر قسم کی چھ لاکھ فوج تھی، معرکے شروع ہوئے، سلیوکس کے منصوبے برباد ہوگئے، جب کامیابی کی امید نہ دیکھی تو صلح کی استدعا کی، چندر گپت رضامند ہوگیا، سلیوکس نے افغانستان اور بلوچستان سلطنت موریہ سے ملحق کردیا اور اس کے علاوہ اپنی بیٹی بھی چندر گپت کو بیاہ دی۔ یہ معاہدہ ۳۰۳ء ق م میں طے پایا تھا جس کے باعث سلطنت موریہ کی حد ہندو کش کے جنوبی ڈھلوان سے لیکر ہرات، ہری رود اور سیستان تک جا پہونچی۔ نئے علاقوں میں چندر گپت اعظم نے اپنے وائسرائے اور گورنر مقرر کردیے، کوئی سو سال تک موریہ کی حکومت رہی۔

یونانی مورخ پولی بوس کا بیان ہے کہ ۲۰۶ء ق م میں کابل میں راجہ سوبھاگ سین حکمراں تھا، جس سے ملنے کو انطیاکس اعظم آیا تھا۔ یونانی حملہ اس سے کچھ عرصہ بعد ہوا تھا جس سے افغانستان پر باختریہ کے یونانی تاجدار کا تسلط جم گیا اور دیر تک رہا، مگر ہندو شستگی کا اثر کوہستان ہندوکش تک بدستور سابق رہا۔ اس زمانہ کے یونانی سکے جو برآمد ہوئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ باختریہ کے حکمران خالص یونانی سکے مضروب کراتے تھے۔ مگر جب وادی کابل اور قندھار اور گندھار پر دمطریاس کا پورا قبضہ ہوگیا تو سکے کے ایک طرف یونانی اور دوسری خروشتی خط میں پراکرت ہوتی تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں پراکرت بولنے اور جاننے والے ہندو لوگ آباد تھے۔ مگر دو یونانی تاجداروں (پنطلیاس اور اگستہ قلس) نے ٹھیٹھ ہندی

نمونے کے سکے رائج کئے جو مربع نما تھے۔ اور ان پر براہمی حروف کندہ تھے۔ افغانستان کے مختلف حصوں سے یہ سکے برآمد ہوئے ہیں جس سے یونانی سلطنت کی وسعت ظاہر ہوتی ہے۔ قندھار بھی یونانیوں ہی کے زیرنگیں تھا۔ اگراتی دس نے ایک تانبہ کا سکہ رائج کیا تھا جس کے ایک طرف خروشتی حروف میں "کاپشئے نگر دیوتا" کندہ ہے[1]، اس سے بھی یہی ثابت ہے کہ اُس زمانے میں پراکرت بولنے والے لوگ وادیِ کابل اور علاقہ سرحد اور گندھارو کاپشا میں آباد تھے۔

اِس کے بعد سِتھی قوم آئی جس کا بڑا نامی بادشاہ موگہ تھا، پھر پارتھی قوم آئی جس کا سیستان اور قندھار پر قبضہ ہوگیا۔ ۵۰ء میں کشان قوم کے مختلف گروہ ہندوکش سے گزر کر آئے اور کابل اور قندھار پارتھیہ والوں سے چھین لئے۔ کدفس ثانی نے پنجاب چھوڑ بنارس تک ہندوستان زیر کرلیا، کنشک کے زمانہ میں کشان قوم کا عروج انتہائی درجہ پر پہونچ گیا جس میں کشمیر کے علاوہ کاشغر اور یارقند اور ختن کے علاقے بھی شامل تھے۔ کنشک نے بدھ مت قبول کرکے اس کی اشاعت کے لئے بڑی کوشش کی۔ تمام علاقہ سرحد جہاں اب شورہ پشت آزاد قبائل رہتے ہیں بدھ مت کا پیرو ہو گیا۔ افغانستان اور ترکستان کے علاوہ مشرقی ایشیا تک جا پہونچا، اس نے افغانستان میں ٹوپ اور دہار تعمیر کرائے جو اب تک اِس ملک میں کئی جگہ موجود ہیں۔ بالائی وادیِ کابل میں جو ٹوپ ہیں ان میں سے بھوج پتر کی پُرانی تحریریں برآمد ہوئی ہیں، جن کی زبان پراکرت اور رسم الخط خروشتی ہے، ترکستان کے صحرا سے سنسکرت نسخے گیتا کے زمانہ کے رسم الخط میں اور پراکرت کے خروشتی حروف میں دستیاب ہوچکے ہیں۔ سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں کے کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغانستان کی پراکرت اور ختن کی خروشتی رسم الخط کی زبان ایک ہی ہے، وادی قرم سے بھی ایک کتبہ برآمد ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں پر بھی پراکرت کا رواج تھا۔

دوسری صدی عیسوی میں ہندوستان کی سرحد بہت وسیع ہوگئی تھی۔ کدفس اور اُس کے جانشینوں کے زمانہ میں گندھار یعنی پشاور کے مشرق اور شمال کا علاقہ۔ خطہ آن روئے اٹک سے بالکل جدا تھا۔ مگس تھینز کے بیان کا تتبع کرکے استرابو اور ایرین نے ملک ہند کی سرحد اٹک قرار دی تھی مگر دوسری صدی مسیحی میں طالمی یونانی سیاح جغرافیہ لکھتا ہے کہ ہند کی مغربی سرحد پر کابل، قندھار اور بلوچستان ہے جس سے یہ ظاہر ہے کہ تمام موجودہ علاقہ سرحد ملکِ ہند میں شامل تھا، اور طالمی کے بیان کی چینی جاتری ہیون تسنگ نے جو ساتویں صدی میں آیا تھا اپنے بیان سے تائید کردی ہے، اور نویں صدی میں نگرہار (جلال آباد) اترا پتھ کا ہیرا[2] قرار دیا گیا تھا

---

[1] انشنٹ انڈین کلچر ان افغانستان" ص۱۵ [2] ملاحظہ ہو" انشنٹ انڈین کلچر ان افغانستان" صفحہ ۲۰

بودھ آثار قدامت بدھ مت کی قبولیت کے سبب سے افغانستان میں ہزاروں ٹوپ اور دہار تعمیر ہوئے تھے، اور یہ سب زیادہ تر اس بڑی سڑک کے آس پاس پائے جاتے ہیں جو شمال مغربی ہند اور وادیِ کابل کے درمیان تھی اور ہندوکش سے ہوکر مغربی اور مشرقی ایشیا کو جاتی تھی۔ جلال آباد (ننگرہار) کے میدان میں اتنے ٹوپ اور دہار ہیں کہ ان کا بیان محال ہے۔ کوہستان کابل میں پرانی شاہراہ سے کچھ دور اور ایک پرانے بدھ شہر کے نشانات نظر آتے ہیں جو سیہہ توپان، کامری اور شیوکی کے محلات و قورع میں منتشر ہیں۔ کالپشا کی وادی میں بھی ایک مٹھ کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ وادی بامیان ہندوکش اور کوہ بابا کے مابین واقع ہے۔ وہاں پر بے شمار گپھائیں ہیں اور مہاتما بدھ کی سنگلاخ کوہ پیکر مورتیاں ہیں، چھوٹی پینتیس ۳۵ چالیس گز اور بڑی پچاس ساٹھ گز اونچی ناپی گئی ہیں۔ ان کی صنعت کاری قابل تعریف سمجھی جاتی ہے۔ ابوالفضل نے سترھویں صدی میں ان کا شمار بارہ ہزار لکھا تھا جس سے ظاہر ہے کہ وہاں پر بودھ لوگوں کا کتنا بڑا زور تھا۔ بامیان میں رنگین تصاویر حجروں کے اندر پائی جاتی ہیں جیسے اجنٹا میں ہیں۔ پرانے زمانہ میں یہ مقام بڑا مقدس سمجھا جاتا تھا، ہزارہا جاتری ترکستان مشرقی، بخارا، بلخ اور دیگر ملکوں سے وہاں آتے تھے افغانی ترکستان کے اندر بھی ٹوپ وغیرہ پرانی عمارتیں پائی جاتی ہیں۔ چھٹی صدی میں وحشت کے شیدا ہن آگئے، ساتویں صدی میں ترکی شاہیہ کا کابل میں تسلط ہوگیا جسے نویں صدی میں ہندوؤں نے زیر کرکے اپنی حکومت قائم کرلی، اس کا کچھ مدت زور رہا مگر سبکتگین نے کابل کے ہندو راج کو مٹا دیا، ساتویں صدی میں مغربی افغانستان نے اسلام قبول کرلیا اور سلطنت خلیفہ میں ملحق ہوگیا، مگر کابل جو ترکی شاہیہ اور ہندو شاہیہ کے ماتحت تھا اسلام سے دیر تک متاثر نہ ہوا۔

ڈاکٹر گھوشال کا بیان ہے کہ بلخ میں ویسے تو سو کے قریب بودھ مٹھ تھے مگر نودہار (نوبہار) بہت ہی بڑا تھا جسے مسلمانوں نے برباد کیا تھا، اس کے پجاری برمک نے اسلام قبول کرلیا پھر وہ خلیفہ کا وزیر بن گیا، البرامکہ خاندان کا اقتدار بہت شاندار سمجھا جاتا ہے۔ کاپشا میں سو مٹھ تھے جن میں چھ ہزار بھکشو رہتے تھے۔ لمپاکہ اور ننگرہار اور گندھار کا راجہ قوم کا کشتری مگر بدھ مت کا بڑا بھاری حامی تھا، کابل کا ہندو شاہیہ فرمانروا، گندھار، اُدیان اور پنجاب کے شمالی خطہ پر حکومت کرتا تھا۔ گویا خیبر کے شمال کا سارا پہاڑی ملک جس میں سوات، دیر، چترال وغیرہ کی ریاستیں ہیں اس کے زیر نگیں تھا۔ ڈاکٹر گھوشال لکھتے ہیں کہ پاشائی زبان جو اب دریائے کابل کے شمالی علاقہ ہی میں محدود ہے دیسی زبانوں میں بہت بلند مرتبہ پر شمار ہوتی ہے۔ اگلے وقتوں میں اس وادی کے بالائی اور درمیانی حصے میں بہت مقبول تھی۔ شمال مشرقی افغانستان کی کافر بولیاں جن پر شمال مغربی سرحد کی قوموں

کے راہ ورسم کا بہت اثر پڑا ہے ہندی اصل سمجھی جا سکتی ہیں. کیونکہ ان کا تعلق ایرانی زبان سے نہیں بلکہ ملک ہند کی زبانوں سے ہے۔

اس بحث سے ظاہر ہے کہ نہایت پرانے زمانہ میں افغانستان میں کون لوگ آباد تھے، رگ وید سے واضح ہے کہ الینہ، بھلانہ اور گندھاری اور پکتھ قومیں جو آریہ تھیں اس ملک کے مشرقی، وسطی اور جنوبی خطہ میں آباد تھیں۔ شورہ پشت قبائل کا علاقہ بھی آریہ قوموں سے آباد تھا، اور ملک ہند شمالی کا ضروری حصہ شمار ہوتا تھا۔ گویا ظہور اسلام سے ہزار ہا سال پہلے افغانستان میں ہندو آریہ رہتے تھے۔ البتہ شمال مغرب یعنی باختریہ میں ایرانی آباد تھے۔ اسلام کا ظہور نویں دسویں صدی میں مشرقی حصوں میں ہوا تھا۔ سرحد اور افغانستان کے موجودہ باشندوں کا بڑا حصہ ان ہی پرانے آریہ لوگوں کی نسل سے ہے۔

بہترین انسان

میں نے ایک پھلدار درخت کو دیکھا اس کی شاخیں بار سے جھکی ہوئی تھیں اور بیشمار خوشنما پرندے اُن پر بیٹھکر پھلوں کو کھا رہے تھے اور خوشی سے چہچہا رہے تھے۔

درخت کے نیچے چند بڑے اور ذو عمر بچے بھی تھے جو پھلوں کو لکڑی اور پتھروں سے توڑ رہے تھے۔

میں نے درخت سے کہا کہ اے درخت یہ لوگ اس بیدردی سے تجھے لکڑی پتھروں سے مار رہے ہیں اگر تجھ میں پھل نہ لگتے تو اچھا ہوتا۔

درخت نے کہا کہ اے بندۂ خدا یہ لوگ صرف اسی پر بس نہ کریں گے بلکہ جب میرے پھل ختم ہو جائیں گے تو مجھے کاٹ کر آگ میں جھونک دینگے۔ لیکن میں ہوں کہ ان سب مصائب پر شکر کرتا ہوں۔ تو نے مجھ سے مہربانی کی باتیں کی ہیں اس لئے میں تجھے بعض ایسی باتیں بتاتا ہوں جو آج تک میں نے کسی نہیں بتائیں خدا نے مجھے اس لئے پیدا کیا ہے کہ انسان مجھے دیکھکر سبق حاصل کرے، یعنی جب تمہارے پاس کچھ ہوگا تو بہت سے لوگ تمہارے عزیز و اقارب بن جائیں گے اور اگر کچھ نہ ہوگا تو یگانے بھی بیگانے بن جائیں گے۔ جس طرح میں کچھ عرصہ تک پھل دیکر فنا ہو جاتا ہوں اُسی طرح دنیا بھی کچھ عرصہ کے بعد فنا ہو جائیگی۔ جس طرح میں لوگوں کو باوجود اُن کی بدسلوکی کے لذیذ پھل دیتا ہوں اسی طرح تم کو چاہیئے کہ اگر لوگ تم سے بدسلوکی بھی کریں تو تم اُن کو نفع پہونچاؤ۔ کیونکہ بہترین انسان وہی ہے جس سے دوسروں کو فائدہ پہونچے۔

(ماخوذ)

مرقع دربار مہاراجہ پرتھوی‌راج چوہان ہندو بادشاہ دہلی

ہندوستان میں بودھ مذہب کا مستقبل

(از بابو گنگا چرن لال صاحب بی اے)

کچھ عرصہ سے برما اور سیلون کے بودھ بھکشوؤں کا دھیان ہندوستان کی طرف لگا ہوا ہے، بھگوان بدھ کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی، یہیں اُنھوں نے چھ برس سخت ریاضت کی اور روشن ضمیری حاصل کر کے اپنے عالمگیر مذہب کی تلقین شروع کی، دنیا بھر کے بودھ عقیدتمند اس ملک کے لئے وہی عظمت رکھتے ہیں جو اہل اسلام مکہ و مدینہ اور مسیحی و یہودی بیت المقدس کے لئے رکھتے ہیں۔ یہ ملک اُن کی روحانی امیدوں کے ساتھ وابستہ ہے اور اُن کی دلی خواہش ہے کہ ایک بار پھر اس ملک میں بودھ مذہب پھیل جائے۔

یہ کہنا دشوار ہے کہ کس حد تک یہ اُمیدیں بر آئیں گی، ابھی تک ہندوستانیوں کی طرف سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا مگر چند سال کے عرصہ میں اور بے سر و سامانی کی حالت میں غیر ملک کے فقرا جو کچھ بھی کام کر پائے ہیں اس سے یہ امید ضرور ہوتی ہے کہ ان کی کوششیں بیکار نہ جائیں گی۔ اس میدان میں موجودہ زمانہ میں جو لوگ کام کر رہے ہیں وہ قابل ذکر ہیں کیونکہ کچھ عرصہ کے بعد وہ لوگ بھی جو ان کی پے در پے کوششوں سے مستفیض ہونگے اُن کو بھول جائیں گے۔ ہر ایک پہلے کام کرنے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے

ان کارکنوں میں سیلون کے زندہ جاوید بودھ بھکشو دیومتر دھرمپال ہوا نگاریکا دھرمپال کے نام سے سارے عالم میں مشہور ہیں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اشوک اور کنشک کے بعد شاید ہی کسی بودھ نے ہندوستان میں بودھ دھرم پھیلانے کی اتنی کوشش کی ہوگی جتنی دھرمپال کر رہے ہیں۔ آپ سیلون کے ایک مشہور متمول خاندان سے ہیں جنھوں نے دنیا کے عیش و آرام کو چھوڑ کر فقیری جامہ زیب تن کیا اور تھوڑی سی عمر ہی میں کرنل آلکاٹ کے ساتھ ہو لئے جو ایک عقیدتمند بودھ اور تھیاسوفیکل سوسائٹی کے بانی مبانی تھے۔ آپ چالیس برس سے اس میدان میں کام کر رہے ہیں اور آپ کی زندگی کا کوئی دن اس کوشش سے خالی نہیں رہا۔ آپ نے مہابودھی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس کی شاخیں سیلون۔ برما۔ ہندوستان۔ انگلستان اور امریکہ کے دور دراز ملکوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ آپ نے کئی بار ان دور دراز ٹھنڈے ملکوں کا سفر کیا جو آپ کی صحت کے لئے نہایت مضر ثابت ہوا۔ اور وہاں کے باشندگان کا دھیان بھگوان بدھ کی بے نظیر

زندگی اور بدھ مذہب کے اعلیٰ اصولوں کی طرف رجوع کیا۔ ہندوستان میں آپ نے پے درپے کوششیں اس امر کی کیں کہ گیا کا بودھ مندر پھر بودھ لوگوں کے ہاتھ میں آجائے۔ مگر اہل ہنود کی ضد کی وجہ سے اس میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ تاہم آپ نے کئی ہزار کے صرف سے گیا میں ایک دھرم شالہ تعمیر کرادیا ہے جس کی وجہ سے دور و دراز کے بودھ یاتریوں کو بڑی سہولیت ہوتی ہے اور ایک آرام گاہ گیا اسٹیشن کے پاس بنوائی ہے۔ ان کے علاوہ کلکتہ میں ایک لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے ایک عالی شان دہار (بودھ مندر) بنوایا اور اس میں بھگوان بدھ کے پاکیزہ جسم کی ہڈیاں رکھیں۔ کلکتہ سے آپ کی سرپرستی میں ایک انگریزی رسالہ "مہابودھی" کے نام سے شائع ہوتا ہے جو بودھ مذہب کے رسالوں میں ممتاز درجہ رکھتا ہے ہفتہ وار بودھ دھرم اور بھگوان بدھ کی سیرت پر لیکچر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بہت سے ہندوستانی بودھ دھرم سے خاص دلچسپی رکھنے لگے ہیں۔ آجکل دھرمپال جی سارناتھ میں مقیم ہیں جہاں آپ نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ کے خرچ سے ایک نہایت خوبصورت اور عالیشان دھار تعمیر کرایا ہے جس میں بھگوان بدھ کے پاکیزہ جسم کی ہڈیاں مدفون کی ہیں۔ آپ اپنی زندگی کا بقیہ حصہ اسی جگہ گزارنا چاہتے ہیں جہاں بھگوان نے اپنا پہلا وعظ دیا تھا اور جہاں آپ ایک بودھ درس گاہ کے قائم کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

بلرامپور سے سات میل کے فاصلہ پر اودھ کی راجدھانی سروستی کے کھنڈرات ہیں۔ اس مقام پر ایک ہندوستانی تاجر اناتھ پنڈک نے بھگوان بودھ کے واسطے نہایت عالی شان دھار بنوایا تھا جس میں بھگوان پچیس ۲۵ برسات میں مقیم رہے۔ اس جگہ ایک برمی بھکشو نے جن کا نام مہندر بابا ہے دو دھرم شالے بنوالئے ہیں جس کی وجہ سے بودھ یاتریوں کو بڑا آرام ملتا ہے، آس پاس کے دیہاتوں میں اس فقیر کی بڑی عزت ہے اور وہ اپنی پاکیزہ زندگی سے بھگوان بودھ اور اُن کی تعلیم کی عزت بڑھا رہا ہے۔

خاص بلرامپور میں ایک برمی بھکشو اسیا ایک اعلیٰ پیمانہ پر عمارت بنانے کا کام کر رہا ہے اور اگر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوگیا تو بلرامپور میں ایک بودھ درسگاہ قائم ہو جائیگی۔

راجگرہ وہ مقام ہے جہاں پہلی بودھ کونسل منعقد ہوئی تھی، بھگوان بدھ کے زمانہ میں یہ مگدھ کا دارالخلافہ تھا اور بھگوان کے معتقد مہاراجہ ببساریہاں حکومت کرتے تھے، یہاں گرم پانی کے کئی چشمے موجود ہیں اور پانچ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں جن پر جینی اور اہل ہنود کے مندر بنے ہوئے ہیں۔ اس میں سے ایک پہاڑی پر جس کو گدرکوٹ کے نام سے پالی کتابوں میں یاد کیا گیا ہے بھگوان بدھ اکثر آکر قیام کرتے تھے۔ اس مقام پر غیر ملکوں سے سینکڑوں بودھ یاتری آتے ہیں اور ایک نیک برمی بھکشو نے نہایت خوبصورت چھوٹا سا دھرم شالہ بنا کر سکونت اختیار کرلی ہے۔ اس کی زندگی گزشتہ بودھ زمانہ کی یاد دلاتی ہے جس کو یاد کرکے عقیدتمند بودھ آبدیدہ ہوجاتے ہیں

اس مقام سے چند میل کے فاصلہ پر نالندہ یونیورسٹی کے کھنڈرات برآمد ہوئے ہیں جو گزشتہ عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔

کسی نگر ضلع گورکھپور میں تحصیل کسیا سے چند میل کے فاصلہ پر وہ مقام ہے جہاں بھگوان بدھ نے رحلت فرمائی تھی۔ اس مقام پر پرانے زمانہ کے کھنڈرات برآمد ہوئے ہیں اور ایک نہایت لمبا چوڑا لیٹا ہوا بت بھگوان بدھ کا دستیاب ہوا ہے جو اس بات کا شاہد ہے کہ اسی جگہ بھگوان بدھ نے سال کے دو درختوں کے بیچ میں لیٹے ہوئے اس دار فانی سے کوچ فرمایا تھا۔ ایک عرصہ ہوا کہ صوبہ بہار کے ایک معزز راجپوت گھرانے کا ایک لڑکا غدر کی بربادی کے بعد سیلون چلا گیا اور وہاں کی خانقاہوں میں تعلیم پانے کے بعد بدھ مذہب میں داخل ہو گیا اور بھکشو بن گیا۔ اپنے وطن میں واپس آنے کے بعد اس فقیر نے کسی نگر میں سکونت اختیار کر لی اور یہاں ایک دھرم شالہ بنوایا۔ اس ہندوستانی بھکشو کی آس پاس کے دیہاتوں اور غیر ممالک کے یاتریوں میں بڑی عزت تھی اور برما و سیلون میں مہاویر بھکشو کا نام کافی طور سے مشہور تھا۔ اب اُن کی جگہ چندرمنی بھکشو کام کر رہے ہیں جتنے برمی بھکشو ہندوستان میں موجود ہیں وہ آپ کو اپنا گرو مانتے ہیں اور برما کے یاتری لوگ بھی خاص طور سے آپ کی عزت کرتے ہیں۔ قرب و جوار کے دیہاتوں میں آپ کی بہت عزت ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ بیساکھ پورنما کے دن سات روز متواتر بھگوان بدھ کی یادگار میں یہاں ایک میلہ کیا جاتا ہے جس میں ہزارہا آدمی حصہ لیتے ہیں۔ آپ ہندو مذہب اور سنسکرت کے بھی ماہر ہیں

دھرمپال جی کے ساتھ جو دو اور ہستیاں کام کر رہی ہیں اور جن سے آئندہ کی بہت کچھ اُمیدیں وابستہ ہیں اُن میں سے ایک سری دیو پریہ وال سنہا ہیں، آپ بھی سیلون کے باشندے ہیں اور اوائل عمر ہی سے دھرمپال جی کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ ایک سال کا عرصہ ہوا کہ آپ ولایت سے واپس آئے ہیں، وہاں آپ مہابودھی سوسائٹی کے منیجر تھے اور جب سے واپس آئے ہیں نہایت ہمت اور جانفشانی سے دھرمپال جی کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ آپ کی ذہانت، محنت اور جانفشانی اس بات کی شاہد ہے کہ آپ آئندہ بہت کام کریں گے

دوسرے صاحب ایک گجراتی ہیں آپ کا بودھ نام سوگتا کانتی ہے، ابھی آپ نوعمر ہی ہیں مگر آپ نے پالی اور انگریزی زبان میں کافی مہارت حاصل کر لی ہے۔ آجکل آپ لندن میں بودھ مذہب کی اشاعت کا کام کر رہے ہیں مگر عنقریب ہندوستان میں واپس آ کر یہاں کام کریں گے۔

ان لوگوں کے کام میں کچھ ہندوستانیوں نے بھی ہاتھ بٹایا ہے۔ مہاویر سوامی اور سوگتا کانتی جی کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ مراد آباد کے ایک فقیر بابا دیبی صاحب بھی قابل ذکر ہیں۔ آپ کا تعلق رائے بہادر بابو سالگرام جی صاحب رادھا سوامی مت کے دوسرے گرو سے تھا مگر تھوڑے ہی دنوں کے ست سنگ کے بعد آپ نے ایک علیحدہ ست سنگ "سنت مت" کے نام سے قائم کیا۔ آپ بودھ بھگوان کے بڑے عقیدتمند تھے اور اُن کو ہندوستان

کا سب سے بڑا سنت مانتے تھے۔ آپ نے کوشش کر کے مشہور بودھ کتاب "دھمپد" کا اردو اور ہندی میں ترجمہ کرایا اور مفت تقسیم کیا۔ آپ کے ست سنگ کے آدمیوں میں جن کی تعداد صوبہ بہار کے ضلع پورنیا اور اُس کے آس پاس تقریباً پانچ ہزار اور مرادآباد کے نواح میں تقریباً ایک ہزار ہے پنچ شیل یعنی بودھ مذہب کی پانچ ممانعتوں کی پابندی لازمی ہے اور دھمپد کی بڑی عظمت ہے۔

ان کے علاوہ لاہور کے مشہور ایڈووکیٹ اور کشمیری پنڈتوں کے رکن رائے بہادر پنڈت شیونراین صاحب شمیم بھی بڑے عقیدتمند بودھ ہیں۔ بودھ دھرم کے متعلق آپ نے کئی رسالے لکھکر مفت تقسیم کئے ہیں اور گزشتہ زمانہ میں کوئی بودھ تحریک ایسی نہیں ہوئی جس میں آپ نے دل کھول کر مدد نہ دی ہو۔ آپ نے اپنی کوٹھی کا نام بھی "کپل وستو" رکھا ہے اور اس میں کئی پرانی بودھ مورتیاں اور کتابیں اکٹھا کی تھیں جو اب سارناتھ دھار کو نذر کردی ہیں۔ بودھ برادران کی خاطر و مدارات آپ بڑی فراخ دلی سے کرتے ہیں جس کا اندازہ وہی شخص کرسکتا ہے جو ڈلہوزی یا لاہور میں آپ کا مہمان رہا ہو۔ وہ پندرہ دن جو میں نے آپ کے پاس ڈلہوزی میں گزارے مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

بمبئی کے ڈاکٹر نائر جنھوں نے اپنے خرچ سے ایک میڈیکل اسکول، خیراتی اسپتال اور بودھ دھار قائم کیا ہے۔ بھگوان بدھ کے بڑے عقیدتمند ہیں اور وہاں کی بودھ سوسائٹی کے روح رواں ہیں، آپ بڑے شوق سے بھگوان کی پیدایش کا دن مناتے ہیں جس میں ہندوستان کے مشہور لیڈر شرکت فرماتے اور جلسہ کی صدارت کرتے ہیں

مدراس میں پروفیسر لکھشمی نرا سو بودھ دھرم کے بڑے محقق اور سرگرم کارکن ہیں۔ آپ کی کتابیں مستند سمجھی جاتی ہیں اور جس طرح آپ کی کوششیں بارآور ہوئی ہیں اگر ہر ایک کی کوششیں اتنی ہی کامیاب ہوں تو بودھ مذہب کا مستقبل امید افزا نظر آتا ہے۔

صوبہ جات متحدہ میں بابو شیوچرن لال بی اے ایل ایل بی لکھنوی بودھ دھرم کے روح رواں تھے آپ نے طالب علمی کے زمانہ ہی میں بھگوان بدھ کی ایک سوانح عمری انگریزی زبان میں لکھی تھی اور بدھ دھرم کے متعلق سینکڑوں مضامین لیڈر اور دیگر اخبارات میں شائع کرائے تھے۔ افسوس کہ آپ کی زندگی نے زیادہ وفا نہ کی اور اس وقت کہ وہ عنقریب سارناتھ جاکر زندگی کا بقیہ حصہ بدھ مذہب کی خدمت میں گزارنے کا ارادہ کر رہے تھے ۲۔ جون ۱۹۳۱ء کو پچاس سال کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ لکھنؤ میں دو بودھ مندر ہیں جن میں سے ایک میں ایک ہندوستانی بھکشو سوامی بودھا نند اچھوت ذاتوں میں کام کر رہے ہیں۔

کلکتہ اور دارجلنگ میں بہاڑی بودھوں کے درمیان تبلیغی دھرم چار یہ نہایت جانفشانی سے کام کررہے ہیں۔ اور برما لوگوں کے بھکشو بھی بودھ مذہب کے موجودہ پیروؤں میں جوش کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ اعلیٰ قوموں اور اچھے گھرانوں کے بعض نوجوان بھی بودھ بھکشو ہوگئے ہیں اور ان کی ذات سے ہندوستانی بودھوں کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ بھکشو آنند، راہل اور سنکیرتن کا نام شاید آئندہ کے بودھ عقیدتمند عظمت کے ساتھ لیا کریں گے۔ کیونکہ یہ لوگ بڑی محنت اور جوش سے کام کررہے ہیں۔

محبّت

محبت مثل ایک ریگستانی پھول کے ہے۔

یہ عرب کے "عود" کی طرح ہے جو صرف ایک مرتبہ پھوٹتا ہے اور مرجھا جاتا ہے، یہ پھول زندگی کے ریگستانی ویرانے میں کھلتا ہے، اور اس کے حسن کی طلعت اس ریگستان میں ایسی معلوم ہوتی ہے جیسا گرد آلود آسمان میں ستارہ اس کے اوپر روحانیت کا سورج ہے اور اس کے گرد اس کے تقدس کی ہوا چلتی ہے۔

ایک قدم کی گونج سے محبت کا پھول کھل جاتا ہے اور اپنے حسن کی رعنائیوں کے ساتھ اپنا رخ قریب سے گزرنے والے کی طرف کردیتا ہے۔

وہ اسے توڑ لیتا ہے اور اپنے ساتھ بہت دور لیجاتا ہے اتنی دور کہ پھول مرجھا جاتا ہے

زندگی کے ویرانے میں صرف ایک مکمل پھول ہے اور وہ محبت ہے۔

ہماری وحشت نوردی کے دھندلکے میں صرف ایک مستحکم روشنی ہے اور وہ محبت ہے۔

ہماری مایوسی کی تاریکی میں صرف ایک امید ہے اور وہ محبت ہے۔

محبت کے علاوہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب باطل و فانی ہے۔

کون بتا سکتا ہے کہ محبت کا وزن اور پیمانہ کیا ہے؟

یہ گوشت سے پیدا ہوتی ہے، روح میں رہتی ہے اور دونوں سے اپنے لئے آسایش مہیا کرتی ہے۔

حسن کے لئے یہ ایک ستارہ ہے۔

اس کی شکلیں بہت ہیں اور سب حسین ہیں مگر کوئی اس جگہ کو نہیں جانتا، جہاں سے یہ ستارہ طلوع ہوا۔ اور نہ اس افق کو جہاں یہ غروب ہوگا۔

(ترجمہ از انگریزی)

(فلک شیر صدیقی)

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

(از بابو انت پرشاد نگم، بی۔اے، ایل ایل، بی۔ ایڈوکیٹ چیف کورٹ اودھ)

ہندوستان کی سیاسی زندگی میں گزشتہ چند ماہ کا زمانہ مقابلۃً خاموشی کا زمانہ تھا۔ مہاتما گاندھی اور لارڈ ارون کا سمجھوتہ نان کوآپریشن کی جنگ کے لئے ایک عارضی التوا سمجھا جانے لگا تھا، عزیزانِ وطن یہ طے کر چکے تھے کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے آنیوالے اجلاس میں مہاتما گاندھی کی شرکت ہندوستان اور انگلستان کی دائمی مفاہمت اور امن کا سامان فراہم کر دیگی۔ مہاتما جی کے عزم سفر کے پہلے بھی کئی مرتبہ فضا بگڑی، ان کے راستے میں روڑے اٹکے ایسے واقعات پیدا ہوئے جن کی وجہ سے کانگریس کے نمایندگان کی شرکت امر محال ہونے لگی، لیکن رفتہ رفتہ سب رکاوٹیں دور ہوتی گئیں، مہاتما گاندھی اور دیگر اصحاب قوم لنڈن پہونچے اور ہمارے ملک کی آئندہ قسمت کے متعلق گفت وشنید ہوئی، لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ نشستند وگفتند و برخاستند۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم نے کانفرنس کا اجلاس برخاست کرتے ہوئے فرمایا کہ موجودہ گورنمنٹ برطانیہ نے پورے طور سے یہ منظور کر لیا ہے، کہ ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کا اعلان اس کی پالیسی کے عین مطابق ہے۔ کانفرنس کے کام کی تکمیل کے لئے چند کمیٹیاں قائم کی جائیں گی جو آیندہ سال (۱۹۳۲ء) کے شروع میں ہندوستان میں کام کریں گی، اور تمام اسکیم پر آخری تجزیہ کرنے کے لئے ہمیں ایک بار پھر اکٹھا ہونا پڑیگا۔ غرض کانفرنس کی نشست کا یہ نتیجہ نکلا کہ کانفرنس آئندہ کے لئے ملتوی ہوگئی۔

گول میز کانفرنس کی کامیابی میں شکوک کے بادل شروع ہی سے چھائے ہوئے تھے ہندوستان کی آزادی کا اہم سوال پیچھے پڑ گیا۔ اقلیتوں کا مسئلہ دیگر کارروائی کے راستہ میں حائل ہوگیا۔ اکثر اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اقلیتیں کانفرنس کا تختہ ہی الٹ دینگی۔ برطانوی مدبران نے اسی کو ہندوستان کا کمزور ترین پہلو سمجھ رکھا ہے، انھوں نے پہلے اسی کی آڑ لی، عزیزان وطن نے ذرا قدم آگے بڑھایا بس اقلیتوں کو شہ دیگئی۔ اس مرتبہ اچھوتوں نے مسلمانوں سے سبقت لے جانے کی کوشش کی، مخالفین کی تائید نے سمند شوق پر ایک اور تازیانے کا کام کیا۔ مسلم جماعت اس بات پر قائم ہوگئی کہ اگر ان کے مطالبات منظور نہ کر لئے جائیں گے تو وہ دوسرے نازک اور اہم مسائل پر مباحثہ ہی نہ ہونے دینگے۔ محبانِ وطن نے گتھیوں کو سلجھانے کی کوششیں

کیں، مختلف [illegible] کئے لیکن جداگانہ نیابت کے حامی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بالآخر ہمارے پرانے رفیق مسٹر
[illegible] غریب قوم پر شفقت اور عنایت کا دم بھرتے ہوئے اقلیتوں کا مسئلہ حل کرنے پر
آمادہ [illegible] اس شرط سے کہ جملہ شرکایانِ کانفرنس اس امر پر اپنے دستخط ثبت کردیں کہ جو فیصلہ آنجناب
کردینگے اس کو سب لوگ بلا چون وچرا منظور کرلیں گے۔ اس میں بھی ناکامیابی ہوئی تو حکومت کی جانب سے
یہ وعدہ کیا گیا کہ اچھا ہم ایک موقعہ باہمی صلح کا اور دیتے ہیں ورنہ گورنمنٹ اس معاملہ میں بھی اپنا فرضِ منصبی
ادا کرے گی اور عارضی طور پر اس مسئلہ کو حل کردیگی۔ وزیر اعظم نے یقین دلایا کہ گورنمنٹ کا منشاء یہ نہیں ہے
کہ مسئلہ اقلیت کی دقت کو ہندوستان کی سیاسی ترقی کے راستہ میں سدِ راہ ہونے دے، مگر جداگانہ
نیابت کے نتائج اس حد تک خوفناک ثابت ہوچکے ہیں کہ اہلِ وطن وزیر اعظم کے اس بیان کو بالکل خاموشی
کے ساتھ ماننے میں ذرا تامل کریں گے، آخر ہماری سیاسی فضا میں فرقہ وارانہ اختلافات کی وبا پھیلانے کا
ذمہ دار کون ہے۔ اس سلسلہ میں مسٹر کرٹس کے مندرجہ ذیل الفاظ خالی از دلچسپی نہ ہونگے:۔

"ہندوستان کے جمہوری طرزِ حکومت میں چند سال ہوئے جداگانہ انتخاب کے اصول کو جگہ دے کر برٹش گورنمنٹ نے اہم ترین غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ اصول قائم رہا تو ہندوستان میں فرقہ بندی کا ایک انوکھا سسٹم قائم ہوجائیگا جو ہمیشہ اس کی زندگی کی بیخ کنی کرتا رہے گا۔ جب تک یہ سسٹم قائم ہے ہندوستان کبھی قومیت کی معراج تک نہیں پہونچ سکتا، اور جتنا ہی زیادہ عرصہ تک یہ رہیگا اتنی ہی زیادہ دقت اس کے دور کرنے میں ہوگی، حتیٰ کہ بالآخر اس کا خاتمہ محض خانہ جنگی کے ہاتھوں ہی سے ہوسکے گا۔ ہمارے اوپر ہندوستان کو ایک قوم بنانے کی ذمہ داری ہے۔ جداگانہ نیابت کے اصول کو مان کر ہم اپنے اس فرضِ منصبی میں کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس سسٹم نے اب بھی قومی زندگی کو اس قدر بیخ کنی کرلی ہے کہ اس کا خاتمہ ایکدم ناممکن ہوگیا ہے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر اس شکنجہ کو جس سے ہم نے ہندوستان کو جکڑ رکھا ہے ڈھیلا نہ کیا گیا تو ہم ایسے جرم کے مرتکب ہونگے جو ناقابلِ معافی ہے۔"

حکمران قوم کے ایک فاضل اور صاحبِ اقتدار اہلِ سیاست کا یہ اقبال جرم اُن مدبرانِ برطانیہ کے لئے سبق آموز ہونا چاہیئے جو آئے دن ہندوستان کی آزادی کی قابلیت کے مقابلہ میں فرقہ وارانہ اختلافات کی دلیل پیش کیا کرتے ہیں۔ فرقہ وارانہ ذہنیت کے بانی ہوتے ہوئے اس وعظ پر کہ ایمانداری سے کام لو، واقعات کا مقابلہ کرو اور تفرقات کو مٹادو، بے اختیار شاعر کا مصرعہ زبان سے نکلتا ہے کہ ہر عیب کہ سلطاں بپسندد ہنراست
پہلے طرزِ حکومت میں جداگانہ نیابت کا اصول داخل کیا جس نے فرقہ وارانہ مخالفت کی آگ مشتعل کی۔ اب ہم سے

توقع کی جاتی ہے کہ اگر ہم واقعی ترقی کے خواہاں اور جویاں ہیں تو پہلے اس آگ کو بجھا کر دکھائیں۔

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردئی ... بازمیگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

مگر باوجود اس کے کہ یہ آگ غیر نے لگائی ہم کو اپنا گھر بچالنے کی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے۔ اہلِ وطن اگر وسیع النظری سے کام لیں اور یہ سمجھ لیں کہ باہمی تفرقہ ہر فریق کے لئے نقصان دہ ہوگا تو یہ مشکل فوراً حل ہو سکتی ہے۔ حقیقتاً اسی وقت ہم مکمل سوراج کے اہل ہونگے جب باہمی نفاق کو مٹا کر اہلِ حکومت کے دلوں پر یہ اثر قائم کر دیں گے کہ ہم واقعی طور پر طیار ہیں۔

اقلیتوں کا مسئلہ ہماری کامیابی کے راستہ میں حائل ضرور تھا، مگر یہ واقعہ نہیں ہے کہ اگر یہ دقت نہ ہوتی تو ہمارے مطالبات پورے ہو جاتے۔ مطالبات سے اس جگہ پر مراد ان حقوق سے ہے جن کو مجموعی طور سے ہم ڈومینین اسٹیٹس (Dominion Status) یا درجۂ نوآبادیات کہتے ہیں، عام طور پر ہندوستان میں درجۂ نوآبادیات سے وہ سیاسی حیثیت سمجھی جاتی ہے جو کناڈا، آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ وغیرہ کی ہے۔ یعنی صرف اندرونی نظامِ حکومت نہیں بلکہ حفظِ مملکت اور افواج پر پورا اختیار ہونا اور خارجی اُمور میں پورا دخل۔ اس کے بارے میں وزیر اعظم نے یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو اپنے اعلان میں کیا کہا، صرف اس قدر کہ جنوری ۱۹۳۱ء کا اعلان اب بھی قائم ہے، ہاں اتنا اور ہے کہ اس اعلان میں جو پالیسی واضح کی گئی ہے اس کو موجودہ گورنمنٹ نے جو تمام برطانوی پولیٹیکل پارٹیوں کی متحدہ گورنمنٹ ہے منظور کر لیا ہے۔

اس آخری امر سے اس حلقہ میں ضرور خوشی منائی جائیگی جس کو جنوری کے اعلان کی تکمیل میں شبہ تھا کہا جاتا ہے کہ جس وقت وزیر اعظم نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ موجودہ گورنمنٹ نے انھیں اختیار دیا ہے کہ وہ اس بات کو واضح کر دیں کہ ۱۹ جنوری کے اعلان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی ہے، اُس وقت حاضرین نے خوشی کی تالیاں بجائیں۔ ہم لوگ اس قدر ضعیف الاعتقاد ہوگئے ہیں کہ کانفرنس میں کچھ کھو نہ بیٹھنے کی خوشی مناتے ہیں۔ کثیر تعداد اُن حضرات کی ہے جو اس اعلان سے مطمئن نظر آتے ہیں۔ صرف چند ہی لوگ ایسے ہونگے جن کی امیدوں پر پانی پڑ گیا۔ ان کا خیال ہے کہ کانفرنس نے اگر ۱۹ جنوری کے اعلان میں اضافہ نہ کیا تو کانفرنس بیکار رہی، کیونکہ ۱۹ جنوری کے اعلان میں ہندوستان کی توقعات کے پورا کرنے کا سامان نہیں ہے، اس اعلان میں جو حکومت کی پالیسی شامل ہے اس کی بنا پر درجہ نوآبادیات کا دعویٰ کس طور سے کیا جا سکتا ہے، ذرا اس کے الفاظ پر غور کیجئے:۔

"حکومت ہند کی ذمہ داری مرکزی اور صوبجاتی قانونی کونسلوں پر رہیگی، مگر ان شرائط کے ساتھ جو تبدیلی کے زمانہ میں ... ضروری ہونگی ... تبدیلی کے زمانہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جو شرائط عاید

کی جائیں گی ان کے لئے محفوظ اختیارات کی ترتیب اس طور پر دی جائیگی کہ وہ ہندوستان کو ذمہ دار حکومت کی آخری منزل تک پہونچنے میں سدِّراہ نہ ہوں۔ موجودہ حالات میں حفظ مملکت اور امورات خارجیہ کے صیغہ جات گورنر جنرل کے ہاتھ میں رہیں گے۔"

ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ حفظ مملکت اور امورات خارجیہ کے صیغہ جات محض تبدیلی کے زمانہ تک گورنر جنرل کے سپرد نہ ہونگے بلکہ صورتِ حال میں یعنی اس اعلان کے حدود کے اندر۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گورنمنٹ کی آئندہ پالیسی یہ ہوگی کہ اندرونی نظام مملکت میں اہل ہند کو بتدریج ترقی کے ساتھ ذمہ داری دی جائیگی لیکن تحفظ ملک اور امورات خارجیہ میں ذمہ دار حکومت کو کوئی دخل نہ ہوگا۔ درحقیقت یہ اعلان کوئی نیا اعلان نہ تھا۔ اس کے پہلے لارڈ ارون سابق وائسرائے ہند نے بھی آخر اکتوبر ۲۹ء میں گورنمنٹ کی پالیسی کو واضح کیا تھا۔ وائسرائے کے الفاظ حسب ذیل تھے:۔

"ملک معظم کی گورنمنٹ کی رائے میں ۱۹۱۷ء کے اعلان میں یہ منشا شامل ہے کہ ہندوستان کی آئینی ترقی کا قدرتی نتیجہ ڈومینین اسٹیٹس ہوگا۔"

اِن الفاظ کے بعد کوئی شبہ اس امر میں نہیں ہوسکتا کہ لیبر گورنمنٹ نے کوئی جدید پالیسی اختیار نہیں کی بلکہ ۱۹۱۷ء کی پالیسی کو دوسرے الفاظ کا دلفریب جامہ پہنا کر اہل ہند کو گرویدہ کرلیا۔ عزیزانِ وطن عرصہ سے ڈومینین اسٹیٹس کی چیخ وپکار مچائے ہوئے تھے۔ گورنمنٹ نے اس طوفانِ عظیم کو فرو کرنے کے واسطے لفظ "ڈومینین" کا حلقۂ معنی زیادہ وسیع کردیا اور اس میں ایسا طرز حکومت بھی شامل کردیا جس میں محض اندرونی نظام ملکی کا اختیار دیا گیا ہو۔ انگریزی زبان کے الفاظ کے صحیح معنی اور مطلب لگانے کا پورا اختیار انگریزوں کو ہے جو اس کے اہل زبان ہیں۔ اس معاملہ میں اہل ہند کی دخل اندازی محض ان کا تکبر اور گھمنڈ ظاہر کرتا ہے۔ جس پر توجہ دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ۱۹۱۷ء کے اعلان کے متعلق اگر کسی کو شک ہو تو اس کے بارے میں صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ اس میں برٹش انڈیا میں ذمہ دار حکومت کی بتدریج ترقی کا اعلان کیا گیا تھا۔ ذمہ دار حکومت کی وسعت کا پورا اندازہ اس شاہی فرمان سے ہوتا ہے جو اس اعلان کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو نافذ کرتے وقت جاری کیا گیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ہم نے ہندوستان کو ان تمام بخششوں سے جو قدرت نے ہم کو عطا فرمائی ہیں مستفید کرانے کی کوشش کی ہے، لیکن ایک تحفہ ہنوز باقی ہے جس کے بغیر کسی ملک کی ترقی پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکتی۔ یعنی اہل ملک کا اپنے ملکی معاملات کے انتظام کرنے کا حق۔ بیرونی حملہ جات سے ہندوستان

کا تحفظ شاہی اختیارات اور فرائض کے متعلق ہے۔ اس کے اندرونی معاملات کے نظام کا بار البتہ اہلِ ہند بجا طور پر اپنے اوپر لے سکتے ہیں۔ یہ بار اس قدر گراں ہے کہ جب تک وقت اور تجربہ پوری قوت پیدا نہ کرلے ایکدم اُٹھ نہیں سکتا۔ لیکن اب موقعہ دیا جائیگا کہ تجربہ میں اضافہ ہو اور جوں جوں قوت پیدا ہوتی جائے ذمہ داری بڑھ سکے"

غرضیکہ ۱۹۱۷ء سے اب تک گورنمنٹ کی پالیسی یہ رہی ہے کہ اندرونی نظام ملکی میں ذمہ دار حکومت قائم کی جائیگی، لیکن یہ سفر منزلیں لیتے ہوئے طے کیا جائیگا، جہاں تک کہ خارجی امور اور حفظ مملکت کا تعلق ہے اس فرض سے برٹش گورنمنٹ نے ہنوز سبکدوشی حاصل نہیں کی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے البتہ آپ کو اختیار ہے کہ اسکو محدود قسم کی ذمہ دار حکومت کہیئے یا کامل حکومت خود اختیاری، مکمل آزادی کہیئے یا ڈومینین اسٹیٹس۔

آپ کہیں گے کہ اگر یہی بات تھی تو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی کیا ضرورت تھی۔ کانگریس کی جد وجہد سے کیا نتیجہ نکلا۔ لبرل لیڈروں کی چیخ وپکار ہی بیکار ہوگئی۔ یہ سب کچھ سہی مگر اہل انگلینڈ میں اگر ہندوستانیوں کی تسخیر قلوب کی قابلیت نہ ہوتی تو سمندر پار سے حکومت کرنا اور باوجود عالمگیر مخالفت، ناراضگی اور بےچینی کے داب حکومت قائم رکھنا کیا کوئی مذاق تھا۔ وزیر اعظم نے کمیٹیاں قائم کرکے طوالت دینے کا طریقہ ضرور اختیار کیا مگر اس بات کا اطمینان ہمارے دلوں سے جانے نہ دیا کہ گفت وشنید کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ اور اہل حکومت ایک نہ ایک دن ہماری حالتِ زار پر ضرور ترس کھائیں گے۔ مہاتما گاندھی کا رویہ اب کیا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ان پر برطانوی تدبّر کا جادو نہیں چل سکا۔ ان کے قلب کی موجودہ حالت کا نقشہ شاعر کے الفاظ میں یوں ادا ہوسکتا ہے۔

نشہ میں مست سمجھتا ہے مجھ کو کیوں واعظ
وہ اپنا وعظ کہے جائے ہوشیار ہوں میں

منشی سوہن لال حقیر

(از منشی شیام موہن لال جگر بریلوی، بی۔اے)

دنیا کی رونق و عظمت جو کچھ بھی ہے، اربابِ کمال کی بدولت ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اربابِ کمال ہی کی طرف دنیا کو کم توجہ ہوتی ہے دوسرے ملکوں میں یہ بات ہو یا نہ ہو مگر ہمارے ملک میں اہلِ علم و ادب جس کس مپرسی اور عدم التفاتی کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ نہ صرف قابلِ افسوس بلکہ علم و کمال کے فنا کر دینے کی ایک زبردست وجہ ہے۔ بیشمار اربابِ فضل ایسے گزرے ہیں جن کی ساری عمر تحریر و تصنیف میں بسر ہوئی لیکن آج اُن کا نام تک کسی کو یاد نہیں۔ کیا وہ دن کبھی آئیگا جب یہ داغ قوم کے دامنِ تہذیب سے دُور ہوگا۔ اور ہم اپنے اربابِ ہنر کی قدر شناسی سیکھیں گے اور اُن کے جواہرات کی حفاظت ایک قومی فرض سمجھیں گے۔

منشی سوہن لال حقیر بھی ایسے ہی باکمال بزرگوں میں تھے جن پر ایک مہذب قوم کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ اور جن کے دم سے فارسی مذاق کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی روشنی قائم تھی۔ آپ کا کچھ کلام دیوانِ حقیر کے نام سے کنور کاشی کرشن نراین رئیس لکھنؤ کی حوصلہ مندی سے آپ کی حیات ہی میں طبع ہو گیا تھا لیکن اس کی طباعت و کتابت جس طریق پر ہوئی اُس سے تصنیف کا مقصد اولین یعنی یہ کہ مطالعہ خوشگوار ہو فوت ہو جاتا ہے، خیر یہی غنیمت ہے کہ ایک صاحبِ کرم نے ایک اہلِ کمال کی یادگار باقی رکھنے کی ہمت کی۔

حقیر مرحوم کے ذاتی حالات صرف اس قدر دریافت ہو سکے ہیں کہ آپ سکسینہ کایستھ تھے ستمبر سنہ ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے اور مارچ سنہ ۱۹۱۶ء میں وفات پائی۔ شاہجہانپور مسکن تھا اور غالباً وطن بھی۔ محافظ دفتر کلکٹری کے عہدے پر ممتاز تھے۔ آپ کے والد منشی ہزاری لال وکالت کرتے تھے۔ آپ کا خاندان علم و فضل، عرفان و فقر کا مخزن تھا آپ بھی سنسکرت اور فارسی کے عالم متبحر تھے۔ عربی میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے، دولتِ فقر میراث میں پائی تھی۔ چنانچہ اپنے ایک بزرگ خاندان کے متعلق دیوانِ حقیر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"جد امجد فقیر حقیر مسمی دولھہ رائے عرف امر داس کہ در معقول و منقول عالم متبحر بود از عنفوان شباب

ترک تاج نمودہ در تلاش علم الٰہی و مرشد کامل بریاضت شاقہ دوراز عمرانات بویرانہ ہا وصحرا گزرانید
آخر کار بمقام جیساری صوبہ اودھ بہ بزرگوارے کہ آفتاب سپہر عرفاں بود دوچار شد..........
آخر بر شاخ لاہوت آشیانہ گزید۔ ہنوز مدفن یعنی جائے سمادھی آں برگزیدہ مقام موضع کوریالی کہ از لکھنؤ
بہ فاصلہ ہفت کروہ است مع خانقاہ موجود است............ پدر بزرگوارم منشی ہزاری لال
صاحب کہ بعہدہ وکالت عدالت دیوانی ممتاز بود حسب ہدایت بہ مراقبہ ومکاشفہ تاحیات با اہل وعیال
گزرا یند فقیر حقیر بہ جادۂ بزرگاں پا در طریقت میدارد۔"

اسی طرح ایک غزل میں فرماتے ہیں:۔

دستگیر و مرشد و پیرم جد ما بودہ است   فقر میراث است در دستِ من از آبائے من
مالکِ خم بود از خمخانۂ شیخ کبیر   جرعۂ بر خاندانم ریخت وبر لبہائے من
بادۂ لاہوت اندر جام ناسوتی مراست   آسماں رقصد ز بوئے پنبۂ مینائے من

سترہ اٹھارہ سال ہوئے کہ راقم حروف کو اپنے والد مرحوم ومغفور کے ہمراہ حقیر مرحوم کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ میانہ اندام بزرگ تھے، پیرانہ سالی سے جسم ضعیف پر پوست واستخوان ہی باقی رہ گئے تھے۔ کشادہ لوح پیشانی ریاضت ومعرفت کے اثر سے منور تھی عجب ذوق کے ساتھ اپنے اشعار سناتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ کسی حدیث، قرآن کی آیت یا سنسکرت کے اشلوک بھی پڑھ دیتے تھے۔ دیوان حقیر میں اکثر ان کے حوالے ملتے ہیں۔ راقم حروف کے ایک قومی مسدس پر آپ نے اصلاح بھی فرمائی تھی۔ آپ کا سرمایۂ راحت زیست ایک ہی فرزند تھا جو ذہانت وذکاوت میں اپنے پدر عالی مقام کے قدم بقدم تھا اور ایم۔اے کی سند حاصل کرنے کے بعد منصفی کے عہدے پر فائز ہوا تھا مگر عین عالم شباب میں پیر وضعیف باپ کو داغِ مفارقت دے گیا۔ سچ ہے ؎

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست   کس را مجال نیست بہ چون وچرائے ما

دیوان حقیر کی ابتدا چند چھوٹی چھوٹی مثنویوں سے ہوتی ہے، اس کے بعد غزلیات ہیں اور آخر میں چند رباعیاں اور قصائد ہیں۔ تمام کلام رموزِ حقائق وعرفان سے مملو ہے۔ طلب صادق واذکار صالح واشغال صوفیہ کا آئینہ ہے۔ رنگِ کلام قدیم فارسی گویانِ ہند کا سا ہے۔ بہ اعتبار کیفیت تمام وہ خوبیاں کلام میں موجود ہیں جو اعلیٰ پایہ شعرا کا امتیاز ہے۔ ہر صنف کا کچھ نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

مثنوی

الٰہی پردۂ اسرار بردار   شکیبد تا بکے مشتاق دیدار

چہ پاے ما چہ دست و دستگاہے　　اگر لطفت نباشد خضر راہے

اگرنے را نباشد یارِ دمساز　　نخیزد از لبِ نے گاہ آواز

نہ مطرب گر زند مضراب بر تار　　نہ سازد سازِ خود اظہارِ اسرار

اگرچہ تیر را پر ہست و سوفار　　کند پرواز از دستِ کماندار

تو ہرجائی و از چشم نہانی　　زمن ارنی و از تو لن ترانی

بدہ چشمے کہ نورِ جلوہ بیند　　زہجران و غمش یکسو نشیند

بدہ عشقے کہ آتش بر فروزد　　متاعِ ماسوا را پاک سوزد

ضمیرم را بدہ پروازِ لاہوت　　زبان و پر بریزم گردِ ناسوت

زنورِ احدیت پُر کن چراغم　　مےِ توحید ریز اندر ایاغم

رحیقے مشکبوے کاں طہور است　　ہمہ سرمایۂ سور و سرور است

لبالب ساغرم کن تا خطِ جور　　کہ آسایم زجور و فتنۂ دَور

زبانم را زحرفِ بد نگہ دار　　لبم را جوششِ استغفار بسیار

رہا از بندِ فکرِ آن و ایں کن　　بروں از دل خیالِ کفر و دیں کن

مثنویات کے آخر میں ایک قصیدہ ہے، طول وطویل، نہایت شاندار اور پُرمغز ـــــ

احدیت آمد بذوقِ عشق پدیدار شد　　بحر در آمد بجوشش موج نمودار شد

نیست بجز ذاتِ آب در کف و موج و حباب　　نام چو شد فرد فرد وہم زاغیار شد

ظلمتِ کثرت زدل نور و ضیا در ربود　　آنکہ رسن بودہ است صورتِ او مار شد

کثرتِ ظرفِ پُر آب شمس نماید ہزار　　آنکہ سوے قرص خورد دید خبردار شد

قدرتش افسوں بخواند گشت حصارِ طلسم　　کرسی و عرشِ بریں ثابت و سیار شد

فکر بہ قدرت نمود حیرتِ دل بر فزود　　ہرکہ بقادر رسید از ہمہ بیزار شد

... ...

دیدنِ او ممکن است کو بود از خویش غیر　　دیدنِ چشمے زچشم مشکل و دشوار شد

ہرچہ تصور کند ذہنِ بماہستیش　　پے بحقیقت نہ بُرد لبستۂ پندار شد

اسم ندارد خبر فعل نہ سازد اثر　　رابطہ کند حرف اگر مہمل و بیکار شد

تا نشود سلب جس صورتِ ایجاب نیست　　بحث بہ معقول و نقل منتج آزار شد

ہست ز منطق بری علمِ الٰہی حقیر　　حجت و اثبات و نفی جملہ درو خوار شد

جزو چو گم شد بہ کل صورت کلی گرفت　　قطرہ چو در بحر رفت قلزمِ زخار شد

جز تو ترا یار نیست مونس و غمخوار نیست　　حاجتِ اظہار نیست وہم ز پندار شد

گرچہ نہان ست ذات جلوہ کند در صفات　　تخم نہاں شد بہ نخل نخل پدیدار شد

غزلیات

ہست سرورا بد بادۂ عرفانِ ما　　چرخ زندہ خم بخویش از مے جوشانِ ما

ہمچو نجوم سپہر پیش رخِ آفتاب　　نیست کند ہستیم جلوۂ جانانِ ما

گہ چو جدا می نہم پیرہنِ تن ز خویش　　جلوہ کند در دلم شاہدِ عریانِ ما

... ...

نالہ مرغِ چمن می برد از من مرا　　خندۂ گل می درد جیب و گریبانِ ما

چاکِ گریبانِ ما خندۂ صبحِ طرب　　عرصۂ عرشِ بریں گوشۂ دامانِ ما

آبِ سرشکم بچشم ساغرِ صہبائے عیش　　سوز و گداز دلم شمع شبستانِ ما

از خمیرِ سنگ بود شیشۂ صہبائے ما　　آں قدر بالید انگورم کہ شد مینائے ما

دام گستر دی بہ پستی دانہ افگندی بخاک　　قلۂ قاف است جائے مسکنِ عنقائے ما

منہ دمے ز کیفِ خویش ساغرِ مے را　　غنیمتے شمر ایامِ بہمن و دے را

گماں مبر کہ دو انگشتِ چوب نغمہ زند　　نوازشِ لبِ دیگر بود لبِ نے را

بسوئے شہرِ خمیشاں بیا بعبرت بیں　　عروجِ تختِ سلیمان و حشمتِ کے را

ز رنگِ مختلف آراست چہرۂ ہر گل　　ز برگ و بار نگر صنعتِ چمن پیرا

ز مور تا بہ سلیماں ز پشہ تا نمرود　　ببیں بہ صورت و بنگر درونِ ہر شے را

حقیر نکتہ بگویم اگر ز دل شنوی

ہمیں بس است کہ بسیار خویشتن وے را

از دلِ دریا حباب سر بکشید و برفت　　بر سرِ شاخِ چمن غنچہ دمید و برفت

کافر و دیندار را ختم نشد قیل و قال　　پیکِ اجل در رسید آہ کشید و برفت

بیخ یکے نخل را آب دہد باغباں   از سر نخلِ دگر شاخ بُرید و برفت
صورتِ لیلےٰ ندید عشق بہ محمل گزید   انچہ بود دیدنی ہیچ ندید و برفت
نقدِ دل و جاں بداد سود و زیاں را ندید   بر سرِ بازارِ غم جنس خرید و برفت

آہ دمے خندہ کرد گل بگلستاں حقیر
بادِ خزاں در رسید جامہ درید و برفت

بہ دلق و صوف مقلد ز اہلِ عرفاں نیست   خروس تاج چو بر سر نہد سلیماں نیست
فروغِ کرمک شب تاب تا دمے ماند   کہ بر فرازِ فلک آفتاب تاباں نیست

حقیر مذہب و ملت ز اختلافِ دل است
کسے کہ محو غمش نیست اہلِ ایماں نیست

اے جز تو در رہِ تو کسے سنگِ راہ نیست   گر کفر و دیں نماند دگر جز الٰہ نیست
ایمان و کفر و شرک و دوئی عشوۂ دلست   گر دل نماند ہیچ سپید و سیاہ نیست

تا کے حقیر در رہ چون و چرا روی
در خویشتن بیا کہ جز ایں شاہراہ نیست

کیف از بادۂ گلرنگ ہماں بر دارد   کہ بکف جام و در آغوش گل اندامے ہست
نور از نورِ درون ست نہ از رنگِ بروں   مردمک را بنگر گرچہ سیہ فامے ہست

گردشِ چرخ بیک رنگ نماندست حقیر
گاہ روز ست گہے صبح گہے شامے ہست

خیر و شر اندر جہاں ز اقرار و انکارِ دلست   اے خوشا کانرا نظر بر طرز و رفتارِ دلست

نشہ از صہبا و بو از مشک چیدن مشکل است   جاں ز عشقم عشق از جانم کشیدن مشکل است
در ہوا ساکن نباشد شعلۂ شمع و چراغ   نفس تا پرواز دارد آرمیدن مشکل است
گرد خود چوں شعلۂ جوالہ گرداں سہل شد   چوں شرر از سنگ خود بیروں جہیدن مشکل است

بحر باز بخیر موج اندر محیط آمد حقیر
در تعلق ماندن و از خود رمیدن مشکل است

سحر چو نالۂ مرغِ چمن بگوشش آمد   دگر دلم بہ ہوائے تو در خروش آمد

چو گل بہ ضبطِ فغاں کوش بلبلِ نالاں ہزار زخم جگر دارد و خموش آمد
بیا بنوش مئے لالہ گوں بہ صحنِ چمن کہ ہر گل از مے رنگیں سبو بدوش آمد
زخم نمود و بیفزود اضطرابِ دلم محیط از مہِ کامل دگر بجوش آمد
نشاں دہد ز رخ آفتاب ہر ذرہ کہ در مجاز مئے معنوی بجوش آمد
بیا بحسنِ عمل کوش و عذرِ طاعت کن اگرچہ خواجہ خطا بخش و جرم پوش آمد
ز عقل و وسوسۂ او حقیر شد بیزار
ز مدرسہ بدرِ پیرِ مے فروش آمد

دلِ آسودہ ندارد خبرِ دل شدگاں دردِ فرہاد کجا در دلِ خسرو گیرد

بہارِ سبزۂ نو گرچہ بر عذار آمد ولے بہار بدوشِ خزاں سوار آمد

ز دل بیدار شو تا لعبتانِ غیب را بینی بہ بیداری چو می بینی ہمہ خوابِ گراں باشد

کفرست شکایت جفایش شد ملتِ عاشقاں رضایش
پروانہ بسوخت و شمع بگداخت اے وائے ز عشق و ماجرایش
فریاد و خروشِ بلبل از چیست گل گوش شدہ است بر نوایش
دل را سرِ شکوۂ عدو نیست شد دشمنِ جاں خود آشنایش
صبر و خرد و قرار دل سوخت فریاد ز شعلۂ حنایش

یک گوشۂ دل صد فکرِ باطل محمل گراں شد دورست منزل
انہار کوثر حوران و غلماں بگزار بہرِ پیرانِ جاہل
صوفی ز صورت معنی تواں یافت گنجے ست مخفی مدفونہ در گل
ناموسِ تقویٰ بر باد دادن بیعت بدست پیرانِ جاہل
از عقل بگذر در عشق رو کن تا پاک گردی از فکرِ باطل
بر نقشِ صورت مجنوں چہ باشی لیلیٰ حقیر ست پنہاں بہ محمل

خاک شو اے جزوِ خاک آتش سوزاں مشو　　سر بہ زمیں نہ چو آب بادِ پریشاں مشو
حشمتِ دنیا مخواہ سرکشی از سر بنہ　　سبزۂ پامال باش سروِ گلستاں مشو
صامت و ناطق زماں گر نبود مالکِ تو　　صبر و قناعت گزیں شاکیِ دوراں مشو
از ہمہ بیزار شو و از ہمہ تنہا نشیں　　جملہ بحق واگزار طالبِ ساماں مشو

آنچہ بجوئی بہ دلِ خویش جو　　اے دل تو جوے ز دریائے ہو
آہوئے دیوانہ بہ پوست شد　　وحشتِ دل میکشدش چار سو
چوں بخود آید ز رہِ راستی　　نافہ شکست بہ پہلوے او
جان و دلم مسکنِ محبوبِ ما　　وائے ز آوارگی ام کو بہ کو
رخ بنما عشوہ مکن از حقیر　　نیست تمنا نہ دگر آرزو

اندر کجاست آنچہ تو دیدی در آئینہ　　تہمت زعکسِ خویش نہادی بر آئینہ
پاک ست ذات بحت ز صوری و معنوی　　گر صورتے بود بنماید ہر آئینہ
اے آب آئینہ ہمہ آب رواں شود　　از عشوہ گر نظر فگند اندر آئینہ
نمود نقشِ غیر بجز نقشِ خویشتن　　ہر چند غور کردم و دیدم در آئینہ
ہرگز نمیرد آنکہ نشانے نکو گزاشت　　یاد آورد ہنوز ز اسکندر آئینہ

ز جہل تست نظر گر بہ بیش و کم داری　　بحکم آنکہ چو داری خدا چہ غم داری
عروس و بانوے سلطان باش ورنہ چہ شد　　کنیز وار اگر دخل در حرم داری
فقیر و شاہ برابر بود بکنجِ لحد　　چہ فخر و ناز بگنجینہ و حشم داری

قصیدہ

تابِ حسنت از نقاب آتش بجاں انداختہ　　صبر را در زینہار و الاماں انداختہ
عالمے بنہفتہ در ما و طینے لبس فراخ　　لامکانے راز حکمت در مکاں انداختہ
تا چہ بے پایاں بود بحرِ کمالِ شانِ تو　　قطرۂ زاں بحر در کون و مکاں انداختہ
کس ز سباحی نہ بیند سوے ساحل ہیچگاہ　　او محیط از دستِ موجش بر کراں انداختہ

مرحبا کلکِ مصور کو ز رنگِ یک صدف — طرحِ رنگِ مختلف در بوستاں انداختہ
یاسمین و یاسمن را چادرِ سادہ سپید — معجرِ رنگیں بدوشش ارغواں انداختہ
بر سرے سودائے دیگر ہر لبے شورِ دگر — در دلِ ہر دور اسرارِ نہاں انداختہ

خوشا دلیکہ بود محو در تصورِ یار — خبر ز خویش ندارد نہ یاد از اغیار
ز مہر و کینہ و از خیر و شر بر آساید — نہ با کسے بہ مدارا نہ با کسے پیکار
ز نورِ دل چو قمر گردِ خویش ہالہ کشید — نشستہ بے حرکت ہمچو نقطۂ پرکار
ز چار و پنج حسن و طبع یافت آزادی — ز بادِ نفس نہ جنبد چو دامنِ کہسار
ز نیک و بد ز سیاہ و سپید بے خبر است — نہ نورِ روز شناسد نہ ظلمتِ شبِ تار
ز حرف و صوت برون نغمۂ برانگیزد — چہ نغمۂ کہ بوجد آورد در و دیوار
نہد کلاہ ز غفلت بفرقِ ہشیاری — بروئے خلق بخواب و بحق دلش بیدار
ز تحت و فوق و نشیب و فراز مستغنی — ز راس و چپ نہ شناسد نہ از یمین و یسار
ز صلحِ کل برہِ کفر و دیں زند گامے — دو منزل ست ز دیر و حرم دیرِ دلدار

مطلعِ ثانی

صبا رساند بگوشِ دلم نویدِ بہار — کشاد مرغِ گلستاں بہ تہنیت منقار
خوش ست سبزۂ بستاں ز قطرۂ شبنم — چو سبزہ زارِ فلک از ثوابت و سیار
نسیمِ مروحہ جنباں صبا عبیر افشاں — فضائے عرصۂ گیتی چو تختۂ گلزار
ز بسکہ سبزۂ بستاں طراوت انگیز ست — ز دردِ چشم شفا یافت نرگسِ بیمار
فلک ز پیرہنِ نیلگوں خجل می شد — شفق بدوشِ وے افگند چادرِ گلنار
ز شبنم از پئے تزئینِ عروسِ گلشن را — رساند نامیہ صد دانۂ در شہوار
ز ریکہ نامیہ در جیب و دامنِ گل ریخت — گل از وفورِ طرب کرد بر بہار نثار

... ...

رائے بہادر بابو انند سروپ صاحب مرحوم

(از منشی جوالا پرشاد صاحب بی-اے، ایل ایل بی- کانپور)

رائے بہادر بابو انند سروپ کی وفات سے جو ۱۰- نومبر ۳۱ء کو واقع ہوئی نہ صرف کانپور بلکہ ہمارے صوبہ متحدہ کی پبلک لائف کو بڑا نقصان پہونچا ہے - افسوس جو جگہ اُن کے انتقال پُرملال سے خالی ہوگئی ہے اُس کا پُر ہونا دشوار ہی نظر آتا ہے- اُنھوں نے اپنی محنت، قابلیت اور خداداد ذہانت کی بدولت نہ صرف پیشہ وکالت میں نمایاں شہرت حاصل کی بلکہ رفاہ عام کے مختلف شعبوں میں اس قدر سرگرمی اور دلچسپی کا اظہار کیا جس سے صوبہ متحدہ میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی-

بابو انند سروپ صاحب علیگڈھ میں ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے تھے، لیکن بچپن ہی میں وہ مع اپنے والد منشی ہنومان پرشاد صاحب اپنے ماموں منشی شیام لال صاحب وکیل کانپور کے یہاں چلے آئے- اور کانپور ہی میں اُنھوں نے تربیت اور تعلیم پائی- فارسی کی تعلیم اُنھوں نے اپنے والد سے حاصل کی جو اس زبان کے اچھے عالم تھے- انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہ کانپور گورنمنٹ اسکول میں داخل ہوگئے جہاں اُنھوں نے دوسری زبان کی حیثیت سے سنسکرت بھی پڑھی- ابتدا ہی سے وہ اس قدر ذکی اور جفاکش واقع ہوئے تھے کہ درجہ بھر میں ہمیشہ اول رہتے تھے- سنسکرت کے امتحان میں بھی اپنے تمام ہم جماعتوں میں سے زیادہ نمبر حاصل کرتے تھے- ۱۸۸۵ء میں اُنھوں نے انٹرینس کا امتحان کلکتہ یونیورسٹی سے پاس کیا- یونیورسٹی کے تمام کامیاب طلبا میں اُن کا نمبر تیسرا تھا- یہ وہ زمانہ تھا جب الہ آباد یونیورسٹی قائم بھی نہیں ہوئی تھی اور صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے طلبا کو بھی کلکتہ یونیورسٹی کا امتحان دینا پڑتا تھا- اس کے دوسرے ہی سال اُنھوں نے نججی کی وکالت کا امتحان پاس کیا اور تمام کامیاب طلبا میں اُن کا نمبر اول رہا-

<u>وکالت</u> | بابو انند سروپ نے ۱۸۸۶ء سے وکالت شروع کی، اُس وقت کانپور بار میں بڑے بڑے قابل وکلا موجود تھے جن میں سے منشی شیام لال، پنڈت پرتھی ناتھ، منشی گور سہائے، بابو بنسل مادھب، لالہ درگا ہی لال، مولوی عبدالجلیل، مسٹر گرینوے خاص طور پر قابل ذکر ہیں- وکالت شروع کرنے کے بعد بھی آپ نے ہی سخت محنت جاری رکھی اور قانونی نظائر پڑھنے میں اپنے وقت کا بڑا حصہ صرف کرنے لگے اور اپنی خداداد

ذہانت کی بدولت اصول قانون و نظائر پر آپ کو بہت جلد وہ عبور حاصل ہو گیا جس کو دیکھ کر لوگ عش عش کرتے تھے۔ ۱۸۹۳ء میں بابو ہرنام سنگھ اڈیٹر کانپور گزٹ پر ایک سب انسپکٹر پولیس نے فوجداری مقدمہ چلایا تھا اُس میں آپ نے صفائی کی طرف سے بلا کسی فیس کے اس قابلیت سے پیروی کی کہ جس سے آپ کی بہت شہرت ہو گئی، اِسی دوران میں ایک اور واقعہ پیش آیا جس سے عوام میں بھی آپ کی قانونی قابلیت کا اعتراف ہونے لگا۔ پنڈت پرتھی ناتھ صاحب وکیل سے اور سید اکبر حسین صاحب (مشہور شاعر اکبر) سب جج سے مساۃ نولا کنور کے مقدمہ کے دوران میں کچھ تیز اتیزی سے گفتگو ہو گئی اور سب جج موصوف نے پنڈت صاحب کے خلاف اپنی تجویز میں کچھ ریمارک لکھدیے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ پنڈت صاحب نے مقدمہ مذکور کے سلسلہ میں کچھ بدعنوانیاں کی ہیں۔ اِس مقدمہ میں بابو انند سروپ نے پنڈت پرتھی ناتھ کو بڑی قیمتی امداد دی۔ اور بالآخر مسٹر میکلین ڈسٹرکٹ جج کانپور کی عدالت میں اس کا اپیل ہوا جس میں پنڈت پرتھی ناتھ صاحب کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ مسٹر میکلین نے نہ صرف سید اکبر حسین کے فیصلہ ہی کو منسوخ کر دیا بلکہ اُن تمام الزامات کو بیجا قرار دیا جو سب جج موصوف نے پنڈت پرتھی ناتھ کی وکالت کے سلسلے میں اُن پر کئے تھے۔ اس فیصلہ کے بعد ہی پنڈت پرتھی ناتھ اکثر دیوانی کے پیچیدہ مقدمات میں بابو انند سروپ کو شریک کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ بابو انند سروپ صاحب دیوانی کے سب سے مشہور وکیل متصور ہونے لگے۔ آپ کو قدرت کی طرف سے ذہن رسا کے علاوہ حیرت انگیز حافظہ بھی عطا ہوا تھا جس کی بدولت آپ کو پیشۂ وکالت میں غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ منشی شیام لال آپ کے ماموں کی ذہانت کا یہ حال تھا کہ باوجود اس کے کہ وہ انگریزی داں نہ تھے لیکن ہائی کورٹ کے جملہ نظائر اُن کے نوک زبان رہتے تھے۔ اور جب کسی عزیز یا دوست کو کسی نظیر کے دریافت کرنے کی ضرورت ہوتی تو وہ فوراً فریقین کا نام اور کتاب کا حوالہ بقید صفحہ زبانی بتلا دیا کرتے تھے، خواہ وہ اُس وقت کسی دوسرے کام میں بہت زیادہ مصروف بھی کیوں نہوں۔ بابو انند سروپ بھی بلا کے ذہین تھے اور پنڈت پرتھی ناتھ صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ منشی شیام لال کی ساری ذہانت بابو انند سروپ نے لے لی ہے۔ بابو انند سروپ کو بھی سارے نظائر ازبر تھے اور جب کبھی کسی وکیل کو کسی نظیر کے دریافت کرنے کی ضرورت ہوتی تو بابو انند سروپ صاحب نہایت خوشی سے نہ صرف نظیر ہی معہ حوالہ بتلا دیتے تھے بلکہ یہ بھی بتا دیتے تھے کہ اس کے خلاف کون کون سی نظیریں ہیں اور صحیح رائے اس مسئلہ کے متعلق کیا ہے۔ اُن کا دماغ ایسا سلجھا ہوا واقعہ ہوا تھا کہ پیچیدہ

سب کا جواب تیار کر لیتے تھے۔ اس میں اُن کو بہت محنت کرنا پڑتی تھی لیکن محنت سے وہ کبھی نہیں گھبرائے روزانہ بارہ بجے رات تک کام کرنا اُن کا معمولی مشغلہ ہو گیا تھا۔ ذہانت کے ساتھ ساتھ ان کی طبیعت میں جدت طرازی کا مادّہ بھی تھا، یعنی قانون و نظائر کی تعبیر کرنے میں وہ غیر معمولی ذکاوت دکھاتے تھے اور ایسی ایسی باریکیاں نکالتے تھے جو اور لوگوں کے ذہن میں مشکل سے آ سکتی تھیں۔ غور و فکر اور جدت طرازی کی قوت منشی گور سہائے اور منشی شیام لال[۱] میں بھی زیادہ تھی۔ کانپور کے ایک مشہور قانون داں بنگالی سب جج مسٹر بپن بہاری مکرجی اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر منشی شیام لال و لالہ گور سہائے انگریزی داں ہوتے تو ہائی کورٹ میں بھی ان کا جواب نہ ہوتا۔ آجکل کے وکلا میں جدت کی صفت بہت کم پائی جاتی ہے، اور ان کا زیادہ تر دارومدار کتابوں اور قانون کی شرح ہی پر رہتا ہے۔ بابو آنند سروپ میں یہ وصف بدرجۂ اتم موجود تھا، انھیں ہمشکل نظائر کے نازک فرق نکالنے میں بڑا ملکہ تھا۔ اپنے پیشہ میں وہ ہمیشہ دیانت کا اعلیٰ ترین معیار اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ قابلیت اور ذہانت کے علاوہ ایمانداری، متانت اور سنجیدگی کے لحاظ سے بھی اُن کا درجہ بڑا اونچا تھا۔ انھوں نے کبھی کسی جونیر وکیل کے مقابلہ میں بھی کوئی بیجا فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کی اور نہ وہ فریق ثانی کی بحث یا شہادت کے دوران میں خواہ مخواہ دخل دینے یا ٹوکنے کے عادی تھے۔ وہ طبعاً کم سخن واقع ہوئے تھے۔ شاید یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ وہ فضول گو نہ تھے۔ اُن کی تقریریں ہمیشہ مختصر مگر جامع اور قانون و واقعات سے پُر ہوا کرتی تھیں جس کی وجہ سے حکام اُن کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کی بحث بڑی وقعت کی نگاہ سے سُنا کرتے تھے۔ جونیر وکلا کو امداد و اعانت کے لئے وہ ہر وقت مستعد رہتے تھے بلکہ اکثر خلاف عادت اپنے معمولی کاموں کو بھی چھوڑ کر وہ ان کی طرف رجوع ہو جاتے تھے۔

تقریر کے علاوہ بابو آنند سروپ صاحب تحریر کے بھی بڑے دھنی تھے بلکہ اس پہلو میں شاید تمام صوبۂ متحدہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ عرضی دعویٰ جواب دعویٰ دستاویزوں کے مسودے وہ اسی قابلیت سے لکھتے تھے کہ پنڈت سندر لال و پنڈت موتی لال جیسے وکلا بھی ان کی تحریروں میں ایک شوشہ کے ردّ و بدل کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ انھیں باتوں سے اُن کو اپنے پیشہ میں بہت فروغ حاصل ہوا چنانچہ عرصہ تک وہ کانپور بار ایسوسی ایشن کے پریسیڈنٹ رہے اور جب اُنھوں نے اس پیشہ کو خیرباد کہا تب بھی وہ اس معزز عہدہ پر سرفراز تھے۔

چیرمین امپروومنٹ ٹرسٹ تیس برس سے کچھ زائد عرصہ تک وکالت کرنے کے بعد بابو آنند سروپ نے امپروومنٹ ٹرسٹ کانپور کی چیرمینی کا عہدہ قبول کر لیا۔ اس سے پہلے اس عہدہ پر سابق کلکٹر کانپور مسٹر اسٹالف آئی سی ایس

---

[۱] منشی شیام لال صاحب راقم مضمون کے والد ماجد اور منشی گور سہائے صاحب ایڈیٹر زمانہ کے جدِّ بزرگوار تھے۔ (ا۔ز)

فارغ تھے اور اُن کے وقت میں ٹرسٹ کے کاموں پر بہت زیادہ روپیہ صرف ہو چکا تھا اس کے معمولی مصارف
بھی بہت بڑھے ہوئے تھے۔ یہ کام بابو صاحب کے لئے بالکل نیا تھا لیکن بابو صاحب نے اس کام کو بھی
بڑی محنت سے انجام دیا۔ انھوں نے کوشش بلیغ سے اس کے روزمرہ مصارف کم کئے اور ٹرسٹ کے کام
کو عمدگی سے چلایا۔ مگر اس سلسلے میں جو دماغی محنت کرنا پڑی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی صحت خراب ہو گئی
اور (High Blood Pressure) کا مرض لاحق ہو گیا جس کے باعث آپ کو بالآخر ۱۹۲۶ء میں
اس عہدہ سے مستعفی ہونا پڑا۔

آریہ سماج | آریہ سماج کی تحریک سے آپ کو اوائل عمر ہی سے دلچسپی تھی۔ ان کے ماموں منشی شیام لال
نے سوامی دیانند کا وہ مشہور مباحثہ دیکھا تھا جو سوامی جی موصوف اور پنڈت ہلدر اوجھا کے درمیان ۱۸۶۹ء
میں منشی درگاہی لال صاحب وکیل کے تعمیر کردہ بھیروں گھاٹ میں ہوا تھا، چنانچہ وہ اکثر اس کا ذکر کیا
کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی سوامی جی کے اوصاف بھی بیان کیا کرتے تھے۔ بابو انند سروپ کو شروع ہی
سے مذہبی واقفیت کا شوق تھا۔ چنانچہ انھوں نے بچپن ہی میں سوامی دیانند کی مشہور تصنیف ستیارتھ
پرکاش پڑھی تھی اور ۱۸۸۳ء میں وہ کرنل آلکٹ بانی تھیاسوفیکل سوسائٹی کے اُس لیکچر کو بھی سننے گئے تھے
جس میں کرنل صاحب نے سوامی دیانند کی وفات کی خبر اہل کانپور کو سُنائی تھی اور یہ کہا تھا کہ سوامی جی کی
وفات سے ہندوستان میں سنسکرت کی وِدّیا کا آفتاب غروب ہو گیا۔ راقم کو اپنے بچپن کی باتوں میں سے
ابتک یہ بات یاد ہے کہ بابو انند سروپ نے اُس لیکچر سے لوٹ کر سوامی جی کی وفات کا ذکر ہم لوگوں سے
کیا تھا، بابو صاحب ہر روز شام کو ستیارتھ پرکاش یا پنڈت لیکھرام کی کتابیں گھر کے عزیزوں اور دوستوں
کو سنایا کرتے تھے، اس طرح اُن کی ذات سے اکثر مذہبی مضامین کا چرچا رہتا تھا۔ اس وقت کانپور میں آریہ
سماج قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ سماج کے اکثر اصحاب بابو انند سروپ سے صلاح و مشورہ لینے آیا کرتے تھے۔ راقم
کے بڑے بھائی منشی دیبی پرشاد مرحوم کو بھی آریہ سماج کی تحریک سے بڑی دلچسپی تھی۔ چنانچہ اُن کی اور بابو
انند سروپ کی تحریک سے ۱۸۹۰ء میں فخرِ قوم لالہ لاجپت رائے صاحب کانپور تشریف لائے اور اُنھوں
نے شیخ ولایت علی کی کوٹھی میں پنڈت بشمبھر ناتھ صاحب ٹھل ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ اسکول کانپور کی صدارت
میں آریہ سماج کے متعلق ایک زبردست تقریر کی۔ اُسی موقع پر بابو انند سروپ صاحب نے بھی ایک موثر لیکچر
دیا تھا اور اپنی ایک نظم نالۂ دل بھی سنائی تھی جس کا سامعین پر بہت اثر ہوا تھا۔ اسی موقع پر منشی دیبی پرشاد
صاحب وکیل اور ان کے خاندان کے چند دیگر اصحاب نے آریہ سماج کی ممبری کا فارم بھرا تھا۔ منشی دیبی پرشاد
بعد کو کئی برس تک آریہ سماج کانپور کے پریسیڈنٹ بھی رہے۔ بابو انند سروپ صاحب اگرچہ اُس وقت تک

سماج کے باقاعدہ ممبر نہیں بنے تھے لیکن سماج کے متعلق ہر کام میں وہ شریک رہتے تھے اور جب کبھی کسی بحث مباحثہ یا جوابی تحریر و تقریر کی ضرورت ہوتی تھی تو ممبران سماج کی نگاہ انھیں پر پڑتی تھی۔ اُن کی سنسکرت کی لیاقت اور مذہبی واقفیت سے سماج کو بڑا فائدہ حاصل ہوا۔ بعض مذہبی مباحث پر اُنھوں نے متعدد ٹریکٹ لکھکر آریہ سماجک سدھانتوں کے پرچار میں بڑی امداد دی۔ سناتن دھرم مہا منڈل کے مشہور اُپدیشک پنڈت گوری شنکر اور پنڈت دین دیال شرما کے لیکچروں کے جواب میں اُن کی کتب "سرمۂ چشم" "دیدۂ بصیرت" "دائرۂ حقیقت" اور "کرشن لیلا" بہت مقبول ہوئیں۔ اس باب میں ان کی سرگرمی کا یہ حال تھا کہ شام کو پنڈت دین دیال وغیرہ سناتن دھرمی پنڈتوں کے لیکچر ہوتے تھے اور دوسرے دن صبح تک آریہ سماج کی طرف سے اُن کی تردید بابو آنند سروپ کی لکھی ہوئی شائع ہو جاتی تھی ایک قابل مقرر کی حیثیت سے بھی اُن کا درجہ بڑا اونچا تھا۔ انگریزی، سنسکرت، فارسی اور اردو میں اُن کو پوری دستگاہ حاصل تھی، اُنھیں کے اثر سے پنڈت پرتھی ناتھ صاحب وکیل اور شہر کے اکثر معززین آریہ سماج کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ کانپور کے عظیم الشان آریہ سماج مندر کی تعمیر میں بھی بابو انند سروپ صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس مندر پر ایک لاکھ روپیہ سے زائد صرف ہو چکا ہے اور نہ صرف اس صوبہ میں بلکہ سارے ہندوستان میں کوئی دوسرا سماج مندر مشکل ہی سے اس کا مقابلہ کر سکتا ہے اس کے متعلق کچھ دوکانات اور مکانات بھی ہیں جن سے سماج کو دو سو روپیہ ماہوار سے زائد مستقل آمدنی کی سبیل ہو گئی ہے۔ غرض تقریباً چون [۵۴] برس تک متواتر بابو انند سروپ نے آریہ سماج کی قابل قدر خدمات انجام دیں ۱۹۰۳ء سے نومبر ۱۹۳۱ء یعنی اپنی وفات کی تاریخ تک وہ اس کے پریسیڈنٹ رہے اور اُن کی رہنمائی میں آریہ سماج کانپور نے ایک نمایاں درجہ حاصل کیا۔ نہ صرف ممبروں کی تعداد میں اضافہ ہوا، نہ صرف سماج کا عالی شان مندر بنکر تیار ہو گیا اور ایک خیراتی اسپتال اور ریڈنگ روم قائم کیا گیا، نہ صرف انفلوئنزا اور سیلاب وغیرہ مصیبت کے موقعوں پر سماج کے ممبروں نے اصحاب شہر کو امداد پہونچائی بلکہ بابو انند سروپ نے آریہ سماج کے کام کو اس طریق پر انجام دیا کہ جس سے سناتن دھرم مہا منڈل، عیسائی و مسلمان اصحاب کو بھی کبھی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ سماج کے سالانہ جلسوں کے موقع پر جو مذہبی کانفرنس منعقد ہوتی تھی اُس میں ان جماعتوں کے نمائندے بخوشی شریک ہوتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی جب اصول کا سوال آیا یا جوابی تقریر اور بحث و مباحثہ کی ضرورت پڑی تو بابو انند سروپ نے کبھی راضی نامہ نہیں کیا۔

سوامی دیانند کی وفات ۱۸۸۳ء میں ہوئی جس کے بعد پنجاب کی طرح اس صوبہ میں بھی ان کی یادگار قائم کرنے کی تحریک شروع ہوئی چنانچہ ۱۸۸۳ء میں ڈی۔ اے۔ وی کالج سوسائٹی کی رجسٹری کرائی گئی

اور اسی سلسلہ میں میرٹھ میں ایک مڈل اسکول بھی قائم ہوا، لیکن اس تحریک کو اُس وقت تک کوئی قابلِ قدر درجہ حاصل نہیں ہوا جب تک کہ بابو انندسروپ اُس کے سکریٹری منتخب نہیں ہوئے۔ ڈی اے. وی. ہائی اسکول کانپور، ڈی۔اے۔وی انٹرمیڈیٹ کالج دہرہ دون اور ڈی۔اے وی کالج کانپور کے قائم کرنے اور ترقی دینے میں بابو انندسروپ کا سب سے بڑا حصہ ہے اور جب تک یہ انسٹی ٹیوشن قائم ہیں اُن کا نام امر رہیگا۔ بحیثیت سکریٹری و پریسیڈنٹ ڈی۔اے۔وی۔کالج سوسائٹی بابو انندسروپ نے جو نمایاں خدمات انجام دیں اس کے لئے تمام صوبہ اُن کا زیر بار احسان ہے۔ ڈی۔اے وی۔ہائی اسکول کانپور آج کانپور کا بہترین اسکول سمجھا جاتا ہے جس میں چھ سو سے زائد طلبا تعلیم پاتے ہیں۔ ڈی۔اے۔وی انٹرمیڈیٹ کالج دہرہ دون نے بھی بہت اچھی ترقی کی ہے اور وہ اس وقت آٹھ سو سے زائد طلبا کو تعلیم دے رہا ہے۔ ڈی۔اے۔وی کالج کانپور کو قائم ہوئے اگرچہ صرف گیارہ بارہ سال ہی ہوئے ہیں لیکن اس قلیل عرصہ میں بھی اس کا شمار صوبہ کے ممتاز کالجوں میں کیا جاتا ہے اور اس میں طلبا چھ سو سے زائد طلبا تعلیم پاتے ہیں۔ کالج اور بورڈنگ ہوس کی عالی شان عمارتوں اور امتحانات میں کالج کے عمدہ نتیجوں نے اُسے بہت مشہور کر دیا ہے۔ ابھی حال ہی میں کالج کے قابل پرنسپل لالہ دیوان چند صاحب آگرہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے ہیں بہرحال اس کالج کی روزافزوں ترقی بھی سب سے زیادہ رائے بہادر بابو انندسروپ ہی کی کوشش اور محنت کا ثمرہ ہے۔

پنجاب کی طرح اس صوبہ میں بھی یہ خوف تھا کہ کہیں کالج پارٹی اور گروکل پارٹی میں خانہ جنگی نہ شروع ہوجائے لیکن بابو انندسروپ صاحب کی دُور اندیشی اور اُن کے ہم خیال اصحاب کی کوشش سے ایسا نہیں ہونے پایا۔ اور صوبہ متحدہ کے آریہ سماجیوں میں اس قسم کی گروہ بندی نہیں ہونے پائی۔ بلکہ گروکل بندرابن اور ڈی۔اے۔وی۔کالج سوسائٹی کے کارکنوں میں ہمیشہ خوشگوار تعلقات رہے اور انھوں نے ایک دوسرے کو امداد دینے سے دریغ نہیں کیا

بابو انندسروپ نے ۱۹۲۹ء میں آریہ سماج کانپور کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر جو تقریر کی تھی وہ اُن کی زندگی کی آخری تقریر تھی، اُس کے خاتمہ پر انھوں نے فرمایا تھا:۔

"اگرچہ مجھے یہ امید نہیں کہ میں سماج کی آئندہ ترقی کی بہار زیادہ دنوں تک دیکھ سکوں گا کیونکہ میں بمثل اُس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے ہوں جس چراغ کا تیل اور بتی قریب قریب ختم ہوگیا ہو اور وہ اپنے گل ہونے کے لئے کسی بادِ سحری کے جھونکے کا منتظر ہو۔ میں سبھی اونچ نیچ عیش و غم بھلائی بُرائی دیکھ

چکا ہوں، اب دل میں سوائے یاد رفتگاں کے کوئی آرزو باقی نہیں، میرے بہت سے رفیق اور عزیز اس دنیا سے مجھے تنہا چھوڑ کر چل بسے اور ہر چلنے والا میرے دل کو پاش پاش کر گیا

لختے بردار دل کہ رود ہر کہ زپیشم — من قاش فروش دلِ صد پارۂ خویشم

لیکن مجھے قوی امید ہے کہ گو میں اس سماج کی آئندہ ترقی دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہوں لیکن چونکہ یہ سماج نہایت قابل عہدہ داروں کے ہاتھ میں ہے اس کی روز افزوں ترقی ہوگی ع

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

افسوس اس کے دو ہی برس بعد بابو انند سروپ اس دنیا سے کوچ کر گئے اور جن کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے اُن میں سے بھی کئی

کمر باندھے ہوئے چلنے کو اب تیار بیٹھے ہیں

جہاں بابو انند سروپ کی یہ کوشش تھی کہ سماج کے کاموں میں پبلک کو کسی شکایت کا موقع نہ ملے وہاں وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ خواہ مخواہ حکام کو بھی کسی شکایت کا موقع نہ دیا جائے لیکن کبھی انھوں نے کسی کی خوشامد یا خوشنودی مزاج کی خاطر اصول کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ ایک مرتبہ جب سماج کا نگرکیرتن مسٹر ٹرتھوے کلکٹر کانپور نے روک دیا تھا تو اُنھوں نے اس وقت تک چین نہیں لیا جب تک صوبہ کے لفٹنٹ گورنر سے کلکٹر کانپور کا حکم منسوخ نہیں کرا لیا۔ ایک دفعہ وہ اور منشی دیبی پرشاد کرائسٹ چرچ کالج کے احاطہ سے ایک کایستھ خاندان کو بچا لائے تھے جو عیسائی ہونے والا تھا، اور اس طرح اُن کو اپنے آبائی دھرم میں قائم رکھا۔ ۱۹۰۷ء میں جب لالہ لاجپت رائے جلاوطن کئے گئے تھے تو آریہ سماج کانپور ہی پہلا سماج تھا کہ جس نے سب سے پہلے ایک پبلک جلسہ میں صدائے احتجاج بلند کی تھی اور اُس موقعہ پر جو زبردست تقریر بابو انند سروپ نے کی تھی وہ بڑے معرکہ کی تھی، یہ وہ وقت تھا جبکہ پنجاب کی سبھا میں اس قسم کی کارروائی کرنے میں پس و پیش کرتی تھیں۔ آریہ سماج اور اس کے انسٹی ٹیوشنوں کے ساتھ اون کی دلچسپی آخر وقت تک قائم رہی، اور اپنی آخری علالت کے زمانہ میں بھی جو ساڑھے تین برس سے کچھ زائد عرصہ تک رہی سماج کے ہر کام میں وہ بڑی سرگرمی کا اظہار کرتے رہے اور اپنی صائب رائے و مفید مشورہ سے فائدہ پہونچاتے رہے۔ پنجاب کے بعض برگزیدہ آریہ سماجی لیڈر اُن کو یو۔ پی کا لال چند کہا کرتے تھے یعنی جس طرح جسٹس لال چند ایم۔ اے پریسیڈنٹ کالج سوسائٹی لاہور پنجاب میں اپنی اعلیٰ دماغی قابلیت کے لحاظ سے ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے وہی درجہ بابو انند سروپ کو صوبۂ متحدہ میں حاصل تھا۔

رفاہ عام سوشل رفارم ودیگر خدمات | رفاہ عام اور سوشل رفارم کے کاموں میں بابو انند سروپ کو بڑی دلچسپی تھی

چنانچہ جب کانپور میں سنہ ۱۹۰۱ء میں رفاہ عام ایسوسی ایشن پنڈت پرتھی ناتھ و دیگر اصحاب کی کوشش سے قائم کی گئی تو منشی شیام لال اُس کے پریسیڈنٹ اور بابو انند سروپ اُس کے سکریٹری مقرر کئے گئے۔ کانپور کا ہندو یتیم خانہ، بالکا ودیالہ، پرتھی ناتھ اسکول، کلومل پاٹھ شالہ، ایجوکیشن کمیٹی میونسپل بورڈ، ہندو سبھا کالیستھ سبھا بدھوا آشرم وغیرہ کانپور کا ہر ایک انسٹی ٹیوشن جس کی غرض رفاہ یا سوشل اصلاح یا ترقی تعلیم ہے بابو انند سروپ کی خدمات کا زیر بار احسان ہے۔ تعلیم نسواں، بدھوا بواہ، اچھوت اودھار، شدھی و سنگٹھن وغیرہ تحریکوں کے وہ زبردست حامی تھے اور اُن میں ہمیشہ سرگرمی سے حصہ لیا کرتے تھے۔ میونسپل بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے بھی جو خدمات انھوں نے شہر کانپور کی انجام دیں اُس کا اعتراف پبلک اور گورنمنٹ دونوں طرف سے ہوا۔ بورڈ مذکور کے بائی لاز انھیں کے مرتب کئے ہوئے ہیں جو ماڈل بائی لاز متصور کئے جاتے ہیں۔ موجودہ میونسپل ایکٹ کے متعلق آپ نے ایک معرکۃ الآرا نوٹ لکھا تھا جس کی گورنمنٹ اور رعایا دونوں نے بڑی قدر کی۔ کانپور میونسپل بورڈ کی تعلیمی کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے آپ نے کانپور میں ابتدائی تعلیم کی توسیع میں بڑی کوشش کی اور اس صوبہ میں یہ پہلا شہر تھا جس میں بابو صاحب کی تحریک اور توجہ سے جبریہ ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔

انھیں پبلک خدمات کے سلسلہ میں گورنمنٹ نے اُن کو "رائے بہادر" کا خطاب عطا فرمایا تھا۔

پالیٹکس بابو انند سروپ پالیٹکس میں لبرل خیالات کے حامی تھے، وہ طبعاً بھی انتہا پسندی کے خلاف رہا کرتے تھے۔ اُن کی طبیعت کا رجحان ہمیشہ اعتدال کی طرف تھا۔ ہندوؤں کے جائز حقوق کے تحفظ کا اُن کو بڑا خیال رہتا تھا چنانچہ جب کونسل میں جہانگیر آبادی ترمیم پیش کی گئی جس کی رو سے میونسپل بورڈ وغیرہ لوکل باڈیز میں مسلمانوں کو جداگانہ نیابت کا حق دیا گیا تو انھوں نے اُس کی بڑی مخالفت کی تھی اور اس کے متعلق کانپور کے ایک پبلک جلسہ میں زبردست تقریر کی تھی جس کو اخبار لیڈر الہ آباد کے قابل اڈیٹر مسٹر چنتامنی نے شائع کرا کے عوام میں تقسیم کیا تھا۔ وہ صوبہ کی کونسل میں تقریباً سات برس تک پہلے نامزد و بعد کو منتخب شدہ ممبر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ جبریہ ابتدائی تعلیم کے قانون کا مسودہ اُنھیں نے کونسل میں پیش کر کے منظور کرایا تھا۔ کونسل کی مختلف سب کمیٹیوں میں انھوں نے ہمیشہ نہایت قابلیت سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ وہ کونسل کے پہلے ڈپٹی پریسیڈنٹ منتخب کئے گئے اور اس عہدہ کے فرائض بھی انھوں نے بڑی خوبی سے انجام دیئے۔ بقول مسٹر چنتامنی اڈیٹر لیڈر ان کے دوست اور مداح بھی اُن کی اس واقفیت کو دیکھکر حیران و ششدر رہ جاتے تھے جو وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران میں برٹش پارلیمنٹ کے عملدرآمد کے متعلق ظاہر کیا کرتے تھے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ اگر بابو انند سروپ کونسل میں پہلے غیر سرکاری پریسیڈنٹ کے انتخاب کے وقت ممبر ہوتے تو وہی اُس کے پہلے پریسیڈنٹ بھی منتخب کئے جاتے۔

شاعری منشی شیام لال وکیل کو شاعری کا بھی شوق تھا، اُنھوں نے وکالت کا امتحان دیتے وقت کئی قانون نظم کرڈالے تھے۔ ان کے یہاں شام کو اکثر شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا جس کا اثر بابو انند سروپ پر بھی پڑا اور وہ بھی کبھی کبھی اشعار کہنے لگے۔ ان کا تخلص یاؔس تھا، انھوں نے دو منظوم رسالے "نالۂ دل" اور "سرمۂ چشم" بھی لکھے جو بہت دلچسپ اور پراثر ہیں۔ ایک مرتبہ منشی کرشن سہائے صاحب وحشیؔ نجوکاپوری کے ایک مشہور شاعر ہیں اپنے یہاں ایک بزم مشاعرہ منعقد کی۔ بابو انند سروپ کو بھی انھوں نے خاص طور پر مدعو کیا تھا مصرعہ طرح حسب ذیل تھا

رہنما آج مری لغزشِ مستانہ ہے

مشاعرہ سے کچھ دیر قبل ہی بابو صاحب نے چند اشعار موزوں کئے جو حاضرین کی ضیافت طبع کے لئے درج ذیل ہیں۔

دل یہی چاہتا ہے بزم میں پہونچوں لیکن — رہنما آج مری لغزشِ مستانہ ہے
کون ہوتا ہے رفیق اس سفر ہستی میں — ہم قدم اپنا یہ دردِ دل دیوانہ ہے
بزمِ رنداں میں جو جانا تو ادب سے جانا — ایک شیشے میں بھری حرمتِ میخانہ ہے

کبھی کبھی وہ فارسی میں بھی شعر کہا کرتے تھے، ذیل میں اُن کے فارسی اشعار کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

دیدہ را بر نوکِ مژگاں میزنم — تختِ دل را بر نمکداں میزنم
از دہانِ زخمہائے بے شمار — خندہ بر خارِ مغیلاں میزنم
از فراموشیِ اہلِ کان پور — نشترِ غم بر رگِ جاں میزنم
تا کنم بیدار مستِ خواب را — نالہ با مرغِ سحر خواں میزنم
یاؔس چوں سخنم نمی شنود کسے — با دلِ مظلوم دستاں میزنم

عادات واطوار بابو انند سروپ میں قدرت نے بہت سے اوصاف جمع کردئے تھے، اُن کا مزاج سنجیدہ واقع ہوا تھا، طبیعت سادگی پسند تھی، تکلف و تصنع کو مطلق دخل نہ تھا۔ بقول منشی دیا نراین صاحب اڈیٹر زمانہ اُن کا مزاج بناوٹ اور خوشامد سے کوسوں دُور تھا اور اعلیٰ درجہ کی خودداری اور دیانت داری اُن کی طبیعت ثانی بن گئی تھی۔ ہر معاملہ کے متعلق وہ کافی غور و فکر کے بعد رائے قائم کرتے تھے اور کسی کام میں وہ زیادہ عجلت کو پسند نہ کرتے تھے، ہر کام کو قاعدہ کے ساتھ انجام دینے کے عادی تھے، چنانچہ کھانے پینے کے معاملہ میں بھی وہ ہمیشہ وقت مقررہ کی پابندی کیا کرتے تھے اور ناوقت کوئی چیز نہیں کھاتے تھے۔ جس کام کو وہ ایک دفعہ شروع کرتے تھے اُس کے درمیان میں دوسرا کام نہیں اُٹھاتے تھے، غصہ تو انھیں آتا ہی نہ تھا

اعتدال پسندی ان کی طبیعت کا خاصہ تھا، پبلک معاملات کے متعلق کئی دفعہ ایسے اصحاب نے ان کی مخالفت کی جن سے اُن کو مخالفت کی توقع نہ تھی لیکن اس کے باوجود ان اصحاب کے ساتھ بھی ان کے تعلقات برابر دوستانہ رہے۔ استقلال اُن کی ذات کا جوہر تھا اور سخت مخالفت اور جانکاہ موقعوں کے وقت بھی بڑے صبر و تحمل سے کام لیتے تھے اور اُن کی آخری طویل علالت میں بھی انھوں نے بڑی مستقل مزاجی سے کام لیا۔ کانپور میں اُن کی ذات ایک ایسی ذات تھی جس پر اہل شہر کو بڑا اعتماد اور بھروسہ تھا اور ان کی وفات سے جو ۱۸۔ نومبر ۱۹۳۱ء کو واقع ہوئی کانپور و نیز صوبہ متحدہ کو جو نقصان عظیم پہونچا اس کی تلافی مشکل ہے۔

زرّیں اقوال

(۱) انسان اپنی فطرت کو بمشکل بدلتا ہے، اگر موچی کو بادشاہ بنا دو تو بھی وہ اپنے پیشہ کو نہیں چھوڑیگا

(۲) جسمانی اور دماغی اصلاح لازم و ملزوم ہیں، دونوں الگ الگ نہیں ہو سکتیں۔ اگر ایک سے غفلت کرو تو دوسری خراب ہو جائیگی	(واشنگٹن)

(۳) انسان دھرم کو کبھی ترک نہ کرے، نہ کسی آرزو، نہ خوف نہ لالچ اور نہ جان کی خاطر۔ سکھ دکھ چند روزہ ہے۔ دھرم ہمیشہ ہے اسلئے دھرم کی پابندی لازم ہے۔	(مہا بھارت)

(۴) جو شخص غصہ کو پی جاتا ہے، خدا قیامت میں اُسے عذاب سے بچا لیتا ہے اور جو خدا سے معذرت کرتا ہے خدا اُس کی معذرت قبول کر لیتا ہے۔	(پیغمبر اسلام)

(۵) ادنیٰ سے ادنیٰ شخص بھی کمال کو پہونچ سکتا ہے بشرطیکہ وہ مصروفیت کو صلاحیت اور طاقت کے اندر محدود رکھے	(وکیلیہ)

(۶) مصیبت کے وقت رونا فضول ہے بلکہ ایسی کوششیں کرنی چاہیئے کہ مصیبت دور ہو	(سقراط)

(۷) انسان کی روح سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کرنے کی پوری طاقت رکھتی ہے۔	(سوامی دیانند)

(۸) دوسروں کا اعتماد کرنا چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر دنیا کے کام نہیں چلتے۔	(ٹینی سن)

(۹) انسان کو اپنی ذاتی بھلائی یا نجات کی اتنی خواہش نہیں کرنی چاہیئے جتنی کہ ہر جگہ اور ہمیشہ تمام دنیا کی بھلائی اور نجات کی کوشش کرنی چاہیئے۔	(مہاتما بدھ)

(ماخوذ)

میری شہسواری

(از مرزا عظیم بیگ چغتائی، بی۔اے۔ایل ایل۔بی)

حماقت پر حماقت تو میری ملاحظہ ہو!.... میری شادی کو مشکل سے بیس پچیس ہی روز ہوئے ہونگے کہ کمرہ میں آیا تو خانم نے اپنی دانست میں ایک عجیب واقعہ سنایا، کہ ایک دفعہ ایک نہایت شریر گھوڑا آیا جس پر کسی سے چڑھا نہ گیا، بھائی صاحب نے کہا کہ ہم چڑھیں گے اور کوشش بھی انھوں نے بہت کی مگر کامیاب نہ ہوئے بالآخر اس کو ایک چبوترے کے پاس لاکر غڑاپ سے زین پر پھاند پڑے لیکن گھوڑے نے جو ٹاپیں ماریں تو بس دیکھتے ہی بنا، الف ہو گیا، بل کھائے، دولتیاں چلائیں، چرخ کھایا اور کیا کیا تلملایا ہے کہ خدا کی پناہ مگر بھائی صاحب نے اُسے نہ چھوڑا۔ دیکھنے والے اُن کی شہسواری کو دیکھ کے واہ واہ کرنے لگے۔ بالآخر بجلی کی طرح وہ ایک دم سے بنگلہ کی دیوار کود گیا اور اُنھیں ایسا لے بھاگا کہ لوگ گھبرا اُٹھے کہ خدا معلوم کہاں لیجا کر پھینکے، غرض سب کے چہرے فق تھے۔ بھابی جان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، نانی اماں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں البتہ والد صاحب کھڑے ہنس رہے تھے کہ ایک آدھ گھنٹہ بعد کیا دیکھتے ہیں کہ بھائی صاحب ہنستے ہوئے چلے آرہے ہیں، گھوڑے کو اُنھوں نے بالکل شل کر دیا تھا۔

میں کیا عرض کروں کہ خانم نے شہسواری کی یہ کیفیت کس طرح بیان کی۔ میرا دل کڑھنے لگا کہ ہائے میں بھی کیوں نہ ایسا شہسوار ہوا، جب چھوٹا تھا تو عموماً ٹٹو پر سوار ہونے کی اپنی باری بھائی صاحب کے ہاتھ ایک پیسہ میں فروخت کر ڈالتا تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ تجارت اور یہ منفعت کچھ کام نہ آئیگی۔ خانم نے تمام کیفیت بیان کرکے مجھ سے میری شہسواری کا حال پوچھا تو میں نے پہلے تو خانم کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر اس خیال سے کہ ان کی دلشکنی نہ ہو جائے میں نے کہہ دیا کہ "ہاں مجھے گھوڑے پر چڑھنا آتا ہے" اس کے ساتھ ہی دو تین واقعات بھی سنا ڈالے، گھٹنہ پر چوٹ کے نشان تھے وہ دکھلائے کہ دیکھو اسی شوق کی بدولت یہ چوٹیں آئی ہیں ایک دفعہ ایک بدمعاش گھوڑے نے گرا کر زخمی کر دیا تھا، حالانکہ اصل واقعہ تو یہ تھا کہ ایک نالائق کتے نے

بھونک بھونک کر مجھے گرا دیا تھا

کوئی وجہ نہ تھی کہ خانم میرے جھوٹ کو سچ نہ مان لیتیں، خدا کے فضل سے سارا گھر شہسواری کا دلدادہ تھا

والدصاحب کی یہ بات بہت اچھی ہے کہ وہ اپنی سواری کا گھوڑا کسی کو نہیں دیتے، گھر میں لے دیکر اب صرف یہی ایک گھوڑا رہ گیا تھا اس لئے کہ انھیں سواری کی ضرورت پڑا کرتی تھی، بہرحال مجھے معلوم تھا کہ نہ کبھی والدصاحب گھوڑا دیں گے اور نہ میری شہسواری کا امتحان ہوگا، اگر کبھی ایسا کوئی موقعہ آیا بھی تو اس کو ٹال دینا کوئی مشکل بات نہ تھی۔

مجھ سے بھابی جان سے کوئی لڑائی نہیں پھر نہ معلوم کیوں انھوں نے میری شہسواری کے افسانوں کو جمنے ہی نہیں دیا، اور میرے لئے ایک مصیبت یہ تھی کہ خانم اکثر میری شہسواری کے قصے لے بیٹھتیں اور بھابی جان ہنس ہنس کر ان کی پرزور تردید کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتی تھیں۔ اور خانم کا یہ حال ہوگیا کہ بھابی جان کی تردید وں کو وہ اپنے دق کرنے اور مذاق اڑانے کا بہانہ تصور کرکے آگ ہو جاتی تھیں۔ ان کے دل میں یہ یقین ہوگیا تھا کہ بھابی جان انھیں اپنے مذاق کا تختۂ مشق بنا رہی ہیں۔

میں بھی کس سادگی سے بھابی جان کے منہ پر یہ کہدیتا تھا کہ "کیوں مذاق کرتی ہو؟" مگر وہ حقیقت سے واقف تھیں، ہنسی کے مارے دوہری ہو جاتیں اور آنکھیں پھاڑ کر کہتیں "غضب کرتے ہو! ایسا سفید جھوٹ! آخر یہ جھوٹ کے دن چلے گا؟" بھائی صاحب اس بارہ میں کبھی نہ بولے بلکہ جب ذکر آیا فوراً تسلیم کرلیا کہ میں ان سے کہیں اچھا شہسوار ہوں، وہ بھی اس پیرایہ میں کہ کبھی پتہ نہ چلا کہ مذاق کرتے ہیں یا سچ کہتے ہیں، نتیجہ اس بحث مباحثے کا یہ ہوا کہ خانم اور بھابی جان نے شرط بدی، بھابی جان نے یہ شرط کی کہ جس گھوڑے پر میں کہوں اگر بھائی چڑھ لیں تو دس روپیہ ہاروں گی ورنہ تمہیں دینا پڑینگے۔ خانم نے تیہے میں آکر فوراً یہ شرط پختہ کرلی اس کے بعد دو تین دفعہ میری شہسواری کے امتحان کا موقعہ آیا لیکن ہر دفعہ بہانہ کرکے ٹال گیا، ادھر والد صاحب قبلہ کا یہ حال کہ آئے دن چھانٹ چھانٹ کر بگڑے تگڑے اور بدمعاش گھوڑے منگواتے، بہرحال کچھ عرصہ تک میری ٹالم ٹول مزہ سے چلتی رہی۔

بھابی جان تو جانتی ہی تھیں کہ میرے لئے کسی گھوڑے پر چڑھنے کی ہمت کرنا ناممکن ہے۔ انھوں نے ایفائے شرط کے لئے خانم سے موٹی موٹی قسمیں لے رکھی تھیں

میں لحاف میں لیٹا ہوا مزے سے ایک کتاب پڑھ رہا تھا اور سگرٹ کا دھواں اڑا رہا تھا کہ آواز آئی "اے میاں منن ...."

جلدی سے میں نے سگرٹ دیوار سے رگڑ کر بجھایا اور اٹھ بیٹھا کہ پھر آواز آئی:۔

"کیا کر رہے ہو؟...."

میں باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ والد صاحب قبلہ اس بلا کی سردی میں صرف ایک قمیص پہنے چبوترہ پر کھڑے ہیں اور سائیس ایک گھوڑا لئے سامنے کھڑا ہے، مجھے دیکھتے ہی والد صاحب بشاش ہو کر بولے:-

"کہو کیسا گھوڑا ہے؟"

میں نے کہا "کیا آپ لیں گے؟"

"یہی سوچ رہا ہوں" مسکرا کر کہا۔

میں نے کہا "کیا کیجئے گا ضرورت تو نہیں ہے" پھر میں نے سائیس سے کہا کہ "لیجاؤ یہاں کسی کو گھوڑا ووڑا نہیں لینا ہے"

والد صاحب اس پر ہنس پڑے اور کہنے لگے "میاں ٹھہرو بھی، لے تھوڑی رہے ہیں، ذرا دیکھنے تو دو" میں نے لاکھ کہا کہ دیکھکر کیا کیجئے گا مگر وہ کاہیکو مانتے۔ کہنے لگے "ذرا انھیں ہاتھ پر لیکر دوڑا تو سہی"۔

اب سائیس تو لگا گھوڑا دوڑانے اور میں نے والد صاحب قبلہ کو لکچر دینا شروع کیا۔ وجہ دراصل یہ تھی کہ آپ خود ہی غور فرمائیں کہ آپ کے والد یا کسی اور بزرگ کو ساٹھ ستر برس کی عمر میں یہ مرض لگ جائے کہ چلبلا سا گھوڑا پکڑ پائیں تو اچھل کر اُس کی پیٹھ پر ہولیں اور روزانہ دس بارہ میل تک کا چکر لگا آئیں، آپ ہی بتائیے کہ وہ کہاں تک حق بجانب ہونگے۔ جب تک ملازمت پر رہے چار چار پانچ پانچ گھوڑے رکھتے رہے جب پنشن ہوئی اور آمدنی میں کمی ہو گئی تو وہی ایک پر اکتفا کی مگر ہم لوگوں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ صرفہ محض بے ضرورت اور لغو ہے۔ کیونکہ بدقسمتی سے ادھر گھوڑا عمر پر آیا اور اُدھر انھوں نے اُسے الگ کر کے پھر کوئی دوسرا نہایت شریر گھوڑا ڈھونڈھنے لگے۔ ان باتوں سے مجھے گھوڑے سے نفرت ہی نہیں بغض ہو گیا ہے، آپ بھی غور فرمائیے کہ کس قدر نالائق جانور ہے، دانہ کھلاؤ، گھاس کھلاؤ اور موقعہ پا جائے تو لات مار دے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ کون حضرت تھے جنھوں نے گھوڑے ایسے نامعقول جانور کو سواری کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ یہ میں بھی جانتا ہوں کہ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہوتا ہے، جب کوئی بہتر سواری کو میسر ہی نہ تھی تو گھوڑے کا سواری میں رکھنا حق بجانب تھا مگر آج کل گھوڑے کی کیا حیثیت رہ گئی، اگر کسی موٹر سائیکل، ریل، ٹریم یا کسی دوسری سواری میں یہ بات پیدا ہو جائے کہ ادھر مسافر اُس کے قریب آیا اور اُدھر اُس کا پہیہ ٹوٹ کر مسافر کی پسلی میں لگنے لگے تو وہ کہاں تک سواری کے قابل سمجھی جائیگی، گھوڑے میں یہ عیب موجود ہے پھر بھی وہ سواری کی تعریف میں داخل ہے! یا اگر آپ کی موٹر سائیکل میں ایسا انجن لگا دیا جائے جو آپ

کے قبضہ میں نہ ہو اور جب زور پہ آئے تو جہاں جی چاہے لیکر چلدے مثلاً اگر آپ اسے سڑک کے بیچ میں چلانا چاہیں اور وہ کنارے کسی کھڈ میں لیجاکر ڈال دے اور روکنے پر بھی نہ رُکے تو یہ کوئی سواری ہے۔ گھوڑے میں یہ سب عیب موجود ہیں اور جب کبھی اس کے جی میں آتا ہے تو اس زور سے دوڑتا ہے کہ روکے رکتا ہی نہیں، اور آپ کو لئے بھاگا جاتا ہے، اگر آپ زیادہ روکیں اور راس تانیں تو وہ کوشش کرکے آپ کو ہوا میں اُچھال دیگا اور گرتے گرتے اوپر سے دولتی بھی جڑ دے گا اور خود ایسا بے تحاشا بھاگے گا جیسے کوئی ریل چھوٹی جارہی ہے۔ آپ کہیں گے کہ تم اناڑی سوار کی طرح باتیں کر رہے ہو، مجھے یہ نامعقول سواری واقعی پسند نہیں ہے مگر بھائی صاحب کو اکثر گھوڑے سے گرتے دیکھا ہے اور جب کبھی انھوں نے آسن جما کر بیٹھنے کی کوشش کی تو گھوڑے نے دوسری ترکیب نکالی، یعنی تھوڑا سا اُلٹا چلا، گھوما اور پھر الف ہوگیا! والد صاحب قبلہ کی ہدایت ہے کہ جب گھوڑا الف ہوجائے تو آگے کو جھکو، یوں راس جھٹکو، یوں زین پر جمو وغیرہ وغیرہ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آخر یہ مصیبت مول ہی کیوں لی جائے، بہرحال اگر آپ بیحیائی سے زین پر جمے رہے تو گھوڑا آپ کو اُلٹا پلٹا کر اور جھٹکا دیکر نت نئی حرکتیں کریگا اور اگر خدا خدا کرکے چلا بھی تو عجیب شان سے چلیگا، اگر منہ پورب کی طرف ہوگا تو دُم پچھم کی طرف ہوگی مگر وہ خود جائیگا دکھن کی طرف! یعنی آڑے آڑے کودتے ہوئے چلے گا۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ اس معصوم کا کوئی قصور نہیں، ان کی رائے میں یہ کھڑ کا اور گھوڑے کو بدکنے کا حق حاصل ہوگیا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ والد صاحب نے کسی نہ کسی بہانہ سے اپنے گھوڑے کو علٰحدہ کر دیا اور علٰحدہ کیا کر دیا، ڈاکٹر صاحب نے انھیں ڈرا دیا کہ اگر آپ کچھ دنوں کے لئے گھوڑے کی سواری ترک نہ کریں گے تو آپ کے اعضا کو نقصان پہونچے گا۔ بہرحال گھوڑا بھی بڈھا تھا بیچ ڈالا جب تک دوسرا خریدا جائے کوچوان بھی جو بتیس برس کا ملازم تھا کہیں چلدیا۔ غرض اس طرح کچھ عرصے تک گھوڑے کی خریداری کی نوبت نہ آئی، اور والد صاحب ٹینس میں گھوڑے کی کسر نکالنے لگے، روز جاکر کھیلتے تھے مگر جناب بڑھاپا بری چیز ہے، اڑسٹھ سال کی عمر میں اس قسم کی کود پھاند میں ضرور کسی نہ کسی دن نقصان اٹھانا پڑیگا۔ چنانچہ ایک روز جست وخیز کرنے میں گھٹنے میں چک پیدا ہوگئی اور دوڑنے کی سکت باقی نہ رہی، اب تانگے پر آنے جانے لگے، مگر تانگے والے بھی بڑے باتونی ہوتے ہیں، ان سے گھوڑوں کی باتیں ہوتے ہوتے ایک روز گھوڑا لانے کو کہدیا گیا۔ بس پھر کیا تھا وہ یہ شریر گھوڑا دکھانے کو لے آیا۔ جب اس کو دوڑایا جاچکا تو مجھے بھی حکم ملا کہ "ذرا تم بھی چڑھ کے اس پر دُلکی نکالو"

یہ وہ جانتے تھے کہ نہ کبھی میں گھوڑے پر چڑھا ہوں اور نہ چڑھ سکتا ہوں، ایسی صورت میں ان کا یہ کہنا کہ "لو بھئی اب تم چڑھو" محض ایک طنز آمیز اور مزاحیہ فقرہ تھا، بھائی صاحب تو ابھی سو کر بھی نہ اُٹھے تھے

اور میں بھی حشر تک کمرے سے نہ نکلتا اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ باہر گھوڑا آیا ہوا ہے، مگر اب تو پھنس گیا ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے کی طرف خانم اور بھابی جان بھی کھڑی ہیں، دل میں سوچا کہ آج ہی بھانڈا پھوٹا، میں بت کی طرح ساکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ یہ نازک پوزیشن جلد ہی نازک تر ہو گئی، کیونکہ خانم اور بھابی جان میں نہایت زور و شور سے بحث ہو رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی دونوں نے اشارے سے بلایا، چار و ناچار جانا پڑا مگر میں گھبرایا ہوا پہونچا۔ دم بھر کے لئے دل کو مضبوط کر کے نہایت ہی لاپروائی کے ساتھ دونوں کی باتیں سننے لگا۔ کس اطمینان اور بھروسے کے ساتھ خانم مجھ سے شرط جیتنے کی فرمائش کر رہی تھیں اور بھابی جان کے چہرہ پر گویا انبساط و شادمانی کا دریا لہریں مار رہا تھا وہ جانتی تھیں کہ میرے فرشتے بھی کبھی گھوڑے پر نہیں چڑھے، مگر خانم کا جوش قابل دید تھا وہ خود بھی میری شہسواری کے کرتب دیکھنے کے لئے بیچین تھیں

بہرحال خوش و بشاش ہو کر خانم نے مجھے چبوترے پر ڈھکیل دیا اور کہنے لگیں کہ "جلدی جاؤ چڑھو اور تھکا کر اس کو شل کر دو، بڑی تیزی دکھا رہا ہے، سب بھول جائے تو بات ہے۔" میں ان الفاظ کو سنکر سمجھا کہ موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔ مگر یہ سوچ کر کہ مرنا برحق ہے، خیال کیا کہ چاہے جو کچھ ہو ایکدفعہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ ہی جاؤں، پھر راس کھینچے رہونگا، چمکارتا رہونگا اور تھوڑی دیر میں روک راک کر کسی نہ کسی بہانہ سے اُتر پڑونگا، یہ خیال کر کے ایک دم سے ہمت کی، مڑ کر خانم کے باغ باغ چہرہ کو دیکھا تو اور بھی ہمت ہو گئی۔ پھر کیا تھا سائیس کو حکم دیا کہ "لاؤ جی ادھر لاؤ ادھر"۔ والد صاحب دیکھکر مسکرائے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ میں کبھی چڑھا نہیں ہوں مگر میری لیے گھوڑے کی سواری کو اس قدر ضروری سمجھتے تھے کہ خواہ میں گر کر مر ہی کیوں نہ جاؤں لیکن چڑھوں ضرور، بلکہ گھوڑے سے گر کر مرنے کو وہ شہادت سے کم نہ خیال کرتے تھے۔

خیر جب میں گھوڑے کے قریب پہونچا تو ایسا معلوم ہوا کہ میں میدان جنگ میں کود پڑا، گھوڑا کمبخت الگ بگڑ رہا تھا مگر میرے بدن سے جرأت کے فوارے چھوٹ رہے تھے یعنی انتہائی جرأت کے باعث سارے بدن میں پسینہ آ رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کو چمکارنے کی کوشش کی مگر منہ سے آواز نہ نکل سکی، شاید سردی کی وجہ سے! پھر کپکپائے ہاتھوں سے اُس کی باگ پکڑی، گھوڑے کے بائیں طرف کھڑا تھا، دل میں خدا کو یاد کر رہا تھا، گھوڑا بدمعاش خواہ مخواہ تھرتھرا رہا تھا۔ میں بیٹھنے کو ہوا، نصر من اللہ کہنے سے مجھ میں ایک دم سے تمام جسم کی روحانی قوت عود کر آئی، پھر یاد آیا کہ ایک روز ایک مولوی صاحب نے وعظ کے دوران میں کہا تھا کہ ہر مہم کو بسم اللہ سے شروع کرنا چاہیئے اور جب کہیں

کوئی کام کرنا ہو تو بسم اللہ کہکر سیدھا پیر رکھے انشاء اللہ فتح ہوگی، چنانچہ بسم اللہ کہکر میں نے بھی سیدھا پیر رکاب میں رکھا، مگر پیر رکھتے ہی ادھر پیچھے سے والد صاحب اور بھائی صاحب نے بھی (جواب آگئے تھے) زور سے للکارا اور ہیں ہیں! کرکے قہقہہ لگایا، میں بیٹھ ہی گیا ہوتا مگر گھوڑا چلدیا لہذا مجھے پیر نکالنا پڑا۔ والد صاحب ہنس ہنس کر کہنے لگے کہ "تم بالکل گدھے ہو، سیدھا پیر رکھکر کیا دُم کی طرف منہ کرکے بیٹھتے؟ گدھے کہیں کے۔"

میں نے اپنی حماقت کو محسوس کیا مگر واہ ری حاضر جوابی میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ، خواہ مخواہ آپ میرا مذاق اُڑاتے ہیں، میں تو تنگ کو دیکھتا تھا کہ کھسکتا تو نہیں ہے۔"

انھوں نے کہا "اچھا اب چڑھو، جلدی چڑھو۔"

میں نے پھر گھوڑے کو چمکارا اور بسم اللہ کہکر بایاں پیر اُس کی رکاب میں رکھا مگر پیر رکھا ہی تھا کہ وہ پھر چمکا جس پر میں نے جلدی سے پیر نکال لیا، لیکن دم بھر بعد پھر چمکار کر پیر رکھا مگر گھوڑا چلدیا اور مجھے پھر پیر نکالنا پڑا، دو تین دفعہ یہی ہوا، والد صاحب کھڑک کر مجھ سے کہتے لگے "پاؤں میں رکاب مار کے ایک دم سے اوچھل کر پیٹھ کیوں نہیں جاتے ہو، یہ بھی کوئی بیل گاڑی ہے کہ تمہارے لئے کھڑی رہیگی" بھائی صاحب بھی لپک کر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ "تم بھی عجب آدمی ہو، آخر تم انتظار ہی کیوں کرتے ہو، ہلکے پھلکے آدمی ہو پیر رکھتے ہی بجلی کی طرح چمک کے غڑاپ سے زین پر بیٹھ جاؤ۔"

اوہو ہو! اب تو مجھے بھی گر معلوم ہوگیا، لاحول ولا قوۃ، میں بھی واقعی عجیب آدمی ہوں۔ یہ خیال کرتے ہی میں نے بھائی صاحب سے کہا کہ "ہٹئیے مجھے چڑھنے دیجئے گا یا نہیں، میں یہ سب باتیں جانتا ہوں" میں نے یہ فقرہ زور سے کڑک کر کہا تاکہ خانم بھی سن لیں۔

یہ کہکر میں نے بچکچا کر ہونٹھ دبا کر اور جست کرنے کی پوری تیاری کرکے بایاں پاؤں رکاب میں رکھ ہی تو دیا، مگر مشکل سے پیر رکھ پایا تھا کہ تڑپ کر بجلی کی طرح اُس پار گرا اور اس طرح اوندھے منہ گرا کہ لگام ہاتھ سے چھوٹ کر پیر میں اُلجھ گئی۔ ادھر اس موذی گھوڑے نے جو دیکھا کہ میری پیٹھ پر بجلیاں کوندگئیں تو وہ طرارہ بھر کے یہ جا وہ جا، میرا پیر جھٹکے کے ساتھ بلند ہوا اور اس طرح گھوما گویا میں پھرکی ہوگیا۔۔۔۔۔۔ میں کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھوڑا بنگلہ کے احاطہ کو طے کرکے سرپٹ اُڑا جا رہا ہے، اور والد صاحب اور بھائی صاحب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہے، بھابی جان کی کیفیت تو بیان سے باہر، مارے ہنسی کے دوہری ہوگئیں، حلق میں پھندا پڑ گیا، آنسو نکل آئے۔ خانم کی حالت البتہ قابل رحم تھی، رنج و یاس کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھیں، میں نے کہا "ہیں۔۔۔۔ دیکھتی کیا ہو۔۔۔ گرتے ہیں شہسوار ہی میدان

جنگ میں، کون گھوڑے پر سے نہیں گرتا"۔

خانم کا چہرہ ایکدم سے بشاش ہوگیا۔ بھابی جان کی طنزآمیز تکلیف دہ ہنسی پردہ بگڑ کھڑی ہوئیں، جب ذرا بھابی جان کے ہوش ٹھکانے ہوئے تو ہنسی کو روکتی ہوئی آئیں اور بولیں:۔

"لاؤ بہن میری شرط کے روپیے"

"واہ۔ واہ" خانم نے کہا۔ "خوب! شرط تم ہاریں یا میں۔"

ادھر میں نے کہا کہ "اگر اتفاق سے گھوڑا اکھڑ کر نکل جائے تو کوئی کیا کرے"۔ اس کے بعد میں نے دنیا کے مشہور شہسواروں کے گرنے کے واقعات بیان کرنا شروع کئے، اور والد صاحب اور بھائی صاحب کے گرنے کے بھی واقعات بتلائے تو بھابی جان تو کیا قائل ہوتیں ہاں خانم کو البتہ اطمینان ہوگیا اور دونوں میں بڑے لطف کی بحث ہونے لگی۔ ایک طرف بھابی جان کہتی تھیں کہ میری شرط کے روپیے مار لئے اور قسمیں کھاتی تھیں، دوسری طرف خانم بھی کہتی رہیں کہ میری شرط کے روپیے تم کو ہضم نہ ہونگے۔

بھابی جان پھر شرط لگانے کہتی ہیں مگر میں نے خانم سے کہہ دیا ہے کہ جب تک پہلی شرط کے روپیے ادا نہ ہوجائیں تم ہرگز ہرگز شرط نہ بدنا، اور میں دعا مانگتا ہوں کہ خدا نہ کرے بھابی جان کبھی شرط کے روپیے ادا کریں۔

بہرصورت میں بھی ایک دفعہ گھوڑے پر چڑھا ہوں، کب اور کس طرح، یہ آپ نے خود دیکھ لیا۔

عمدۃ القواعد مؤلفہ مولوی حافظ جلال الدین احمد جعفری۔ کراون سائز۔ ۲۵۵ صفحات۔ قیمت عہ
ملنے کا پتہ: مطبع انوار احمدی، الہ آباد

گزشتہ چند سال میں اُردو زبان کی متعدد قواعد لکھی گئیں جن میں مولوی عبدالحق بی۔اے آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو کی قواعد بہت مشہور و مقبول ہوئی مگر اُردو زبان جس تیزی سے ترقی کر رہی ہے اس کی بنا پر قواعد میں ترمیم و تنسیخ بھی لازمی ہے اور ہر زبان کا یہی قاعدہ ہے کہ ایک مدت کے بعد قواعد میں ترمیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی ضرورت کو پیش نظر رکھکر یہ قواعد مرتب کی گئی ہے جابجا مستند شعرا کے اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے اور مختلف فیہ مسائل کے متعلق دہلی اور لکھنؤ کے استعمال کو یکجا کر دیا ہے اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی لکھدیا ہے کہ آجکل کسکو زیادہ ترجیح ہے۔ چونکہ اس قواعد سے دوسرے شائقین کے علاوہ زیادہ تر طلبہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اس لئے اصطلاحات قواعد کے انگریزی مترادف بھی بریکیٹ میں درج کردئے گئے ہیں۔ غرض مجموعی حیثیت سے یہ قواعد مکمل و مفید معلوم ہوتی ہے۔

تنقید کتب

مرقع دہلی

از نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں سالارجنگ خانِ دوران مرحوم۔ رائل سائز حجم تقریباً ۱۶۰ صفحات۔ قیمت ۳؎ ۔

ملنے کا پتہ: مہتمم خزینۂ یوسفیہ، ڈیوڑھی نواب مستقیم الدولہ مرحوم۔ چھتہ بازار، حیدرآباد دکن۔

نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں سالارجنگ حضرت مغفرت مآب نظام الملک آصف جاہ اول کے دربار کے ایک رکن خاص تھے اور حضرت مغفرت مآب کے ہمراہ ۱۱۵۱ھ میں دہلی تشریف لے گئے تھے۔ اس کتاب میں نواب مرحوم نے دہلی کے معاشری و تمدنی حالات، مجالس و محافل وغیرہ کا مختصر تذکرہ ایک دلکش انداز میں تحریر فرمایا تھا جس کے مطالعہ سے اب سے دو صدی پہلے کی دہلی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ تذکرہ اگرچہ مختصر ہے مگر اس میں علما و مشائخ، شعرا و رؤسا، قوال و مرثیہ خواں، مشاعرے اور جلسے، ارباب نشاط وغیرہ سب کا ذکر ہے۔ زبان فارسی ہے مگر سلیس و شگفتہ، انداز تحریر دلکش و موثر ہے۔

کتاب کے شروع میں حکیم سید مظفر حسین حیدرآبادی نے ایک بسیط مقدمہ اردو میں لکھا ہے جس میں نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں کے ذاتی و خاندانی حالات، مراتب و مناصب نیز تذکرۂ ہذا کے محاسن پر قابل قدر تبصرہ کیا ہے۔ واقعی یہ تذکرہ اہل بینش و ذوق کے لئے نہایت دلچسپ ہے۔ فارسی زبان کا مذاق رکھنے والے حضرات کو یہ تذکرہ ضرور پڑھنا چاہیئے۔ مصنف تذکرہ اور ان کے خاندان کے دوسرے چند بزرگ نیز باغ و مقبرہ وغیرہ کی تصویریں بھی کتاب کی ظاہری زینت کو بڑھا رہی ہیں۔

فروغ بیان

از جناب شاد صابری، کراؤن سائز۔ ۱۲۴ صفحات۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ: حضرت مصنف (اوورسیر میونسپلٹی) کراچی

حضرت شاد موجودہ زمانہ کے ان سخنوروں میں ہیں جو قدیم طرز سخن کے ساتھ جدید رنگ میں بھی

شعر کہتے ہیں۔ آپ صوبہ متحدہ کے باشندے ہیں اور فن شعر میں مولانا غریب سہارنپوری مرحوم اور حضرت انسر صدیقی امروہوی کے شاگرد ہیں۔

فروغ بیان شاد صاحب کے کلام کا ایک دلکش مجموعہ ہے جس میں غزلیات، رباعیات، قطعات کے علاوہ جدید طرز کی دس نظمیں بھی ہیں۔ شروع میں مولانا قمر بدایونی کا لکھا ہوا ایک مختصر مگر لطیف مقدمہ ہے اور مصنف کی تصویر بھی شامل مجموعہ ہے۔ جہاں تک غزلیات کا تعلق ہے شاد صاحب کا کلام سادہ و موثر معلوم ہوتا ہے۔ البتہ نظموں میں دلکشی کسی قدر کم نظر آتی ہے۔ چند اشعار بطور نمونۂ کلام درج ذیل ہیں:

سعیِ لاحاصل بھی قسمت سے مجھے حاصل نہیں — وائے بدبختی کہ علمِ دوریِ منزل نہیں

اے غمِ پنہاں الٹ دے پردۂ سوزِ دروں — شمع در فانوس وجہ گرمیِ محفل نہیں

پوچھتی ہیں عشق سے اکثر مری مایوسیاں — اے تموّج خیز دریا کیا ترا ساحل نہیں

حسن میں موجود ہے پیرایۂ دلبستگی — قابلِ عنواں مگر ارمانِ اہلِ دل نہیں

منزلِ مقصود ہے ہر منزلِ راہِ طلب — دامنِ رہرو پہ داغِ حسرتِ منزل نہیں

ہوشیار بیخودی کو عقل دیتی ہے سبق — واقفِ معنی نہیں اپنے سے جو غافل نہیں

شاد تھک کر بیٹھنے کا قصد جب میں نے کیا
شوق نے بڑھکر ندا دی یہ تری منزل نہیں

باخبر ہوں ہستیِ موہوم کے انجام سے — صبح کا آغاز ہوتا ہے سوادِ شام سے

چھوڑیئے یا قید کیجیے آپ خود مختار ہیں — میں وہ مجرم ہوں جسے مطلب نہیں انجام سے

کائناتِ باغِ عالم ہو اسیرِ ذوقِ دید — کاش واقف ہو کوئی حالِ اسیرِ دام سے

اب مرا حسنِ نظر تصویرِ خلوت خانہ ہے — بے حجابی اٹھ چکی ہے جلوہ گاہِ عام سے

شاد یہ سمجھو مآلِ خلقتِ دنیا و دیں
انجمن کی انجمن موسوم ہے اک نام سے

کلامِ جوہر

از رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم۔ چھوٹا سائز ۱۵۶ صفحات۔ قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

یہ مولانا محمد علی مرحوم کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں دردِ دل اور جوش و خروش پورے طور پر موجود ہے۔ شروع میں مولانا عبدالماجد بی۔ اے۔ دریابادی کا لکھا ہوا ایک دلچسپ مقدمہ ہے۔ مولانا مرحوم کے

کلام کا ایک مختصر مجموعہ پہلے بھی شایع ہوا تھا مگر اس مجموعہ میں ابتدائی اور آخری زمانہ کا قریب قریب کل کلام موجود ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہیں۔

اسکو کیا خوف رہ ظلمات ہے — جس کی رہبر خود خدا کی ذات ہے
قید تنہائی کا لذت آشنا — کیسے کہدے دل تارک لذات ہے
دل سے ہوتی رہتی ہیں سرگوشیاں — اب یہی اک مشغلہ دن رات ہے
قید تنہائی میں بھی چھوڑا نہ ساتھ — نفس موذی بھی بڑا بد ذات ہے

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا — کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہگئی

میرے لہو سے خاک وطن لالہ زار دیکھ — اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ
کیا عشق نا تمام کی بتلاؤں سرگزشت — دار و رسن کا اور ابھی انتظار دیکھ

اے دل تجھی کو صبر جو پروردگار دے — تکلیف کیوں یہ کشمکش انتظار دے
ہم اسکے ہولئے تو پھر اب اس سے کیا غرض — وہ جیت اپنی فوج کو دے یا کہ ہار دے
تو کس خیال میں ہے یہ وہ عشق ہی نہیں — اے بوالہوس جو فرصت بوس و کنار دے
مے نقد جاں تو بادۂ کوثر ابھی ملے — ساقی کو کیا پڑی ہے کہ یہ مو ادھار دے
کٹتی ہے شغل عشق میں پل بھر میں عمر خضر — یہ دن ہی کیا ہیں قید کے ایدل گزار دے
رہبر تھا راہ عشق کا منزل کو پالیا — اب اور کیا نشان مری لوح مزار دے
ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

ماہتاب

(از لسان الہند مولانا عزیز لکھنوی)

یہ کس لئے برجِ زمرّد سے منہ نکالا ہے
ہر اک طرف شبِ تاریک میں اُجالا ہے

شرابِ نور اُبل آئی آفتاب سے
تجلیوں کا سمندر بہا قرابے سے

تڑپ اُٹھا اثرِ چشمِ مستِ ساقی سے
چھلک گیا ہے جو پیمانہ دستِ ساقی سے

چمک ہے ماہ سبک سیر کی سواری میں
چھپا ہوا ہے کوئی بدر کی عماری میں

مگر ہے لیلیٰ شب کا محافۂ سیمیں
دکھا رہا ہے جھلک اپنی کوئی پردہ نشیں

اُبل پڑا ہے شب آتے ہی چشمۂ پُر جوش
ہر ایک چیز زمانے کی ہے تجلی پوش

ہزار نقش طراز جہاں حجاب میں ہے
فروغِ رُخ کا اثر کشتِ ماہتاب میں ہے

چڑھا ہے ایک روپہلا ورق زمانے پر
برس رہا ہے تجلی کا ابر خوش منظر

لباس نور کا پہنے ہوئے ہے پیاری رات
سحر کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے ساری رات

کوئی حسین ہے مصروف دشت گردی میں
ترنج نور ہے یا طشت لاجوردی میں

تجلیوں سے زمانہ ہوا ہے مالا مال،
بغور دیکھ یہی ہے مآلِ کسبِ کمال

یہ عکس جب ہے تو وہ محوِ ناز کیا ہوگا
یہ آئینہ ہے تو آئینہ ساز کیا ہوگا

دکھا رہا ہے گلِ یوسف اپنی تابانی
چمک اُٹھا ہے جو دامانِ پیرِ کنعانی

ہر اک طرف سر و سامانِ ناز پھیلایا
سمٹ کے نور نے دامانِ ناز پھیلایا

یہ کس کی ضو سے ستاروں کی بزم تاباں ہے
یہ کون شاہدِ زیبائے گوہرستاں ہے

کہاں سے پھول یہ آیا ہے دستِ گلچیں میں
یہ کس نے شمع جلائی رواقِ رنگیں میں

ردائے نور ہے اور بزمِ عالمِ اسباب
زمانہ اوڑھے ہوئے سر سے چادرِ مہتاب

یہ وقت اور مرا شیشہ و سبو خالی
سنوں زمانے سے آواز اشربوا خالی

ہر ایک بحر میں غوطے لگائے ماہِ تمام
مگر نہ ہو تو نہ ہو غرق بادۂ گلفام

مستقبلِ دہر

ازبابو شیام موہن لال جگر بریلوی، بی۔اے۔

جب بگڑنے لگا جہاں کا نصیب — پھیلی دنیا میں مغربی تہذیب
مادیت کا زہر پھیل گیا — عظمتِ روح کی ہوئی تخریب
دین و اخلاق ہو گئے برباد — نفس مانا گیا عمل کا ادیب
ہو گئیں بے حجابیاں مطبوع — رقصِ عریاں تھا زینتِ تہذیب
اس پہ قہرِ خدا ملوکیت — چیرہ دستی بڑھی بعید و قریب
اہلِ سرمایہ نے کئے وہ ظلم — آ گئے تنگ زندگی سے غریب
ٹھہرے سامانِ امن توپ و تفنگ — رزم سے بزم کی ہوئی ترتیب
جنگ سمجھی گئی بنائے بقا — یہ بھی منطق ہے کیا عجیب و غریب
رفتہ رفتہ ہوا جہاں تاریک — نظر آتا تھا یومِ حشر قریب

روحِ عالم کی بے قرار ہوئی
حالتِ جنگ ناگوار ہوئی

ہوئے اصلاح کے بہم ساماں — پھر چمکنے لگا نصیبِ جہاں
پھر تجلی ہوئی زمانہ میں — ہوا خورشیدِ ہند میں تاباں
مٹیں گمراہیاں جہالت کی — پھر ہوا خضرِ راہ ہندستاں
آئے دنیا میں حضرتِ گاندھی — ولی پوشیدہ ظاہرا انساں
سادگی راستی ہے جن کا ضمیر — اور اہنسا ہے جن کی روحِ رواں
جن کا ایمان نیاز و خدمتِ خلق — جن کا مذہب محبتِ انساں
مسلکِ زیست جن کا راست روی — اور تہذیبِ نفس مایۂ جاں

جن کے خدمات وجہ نازِ عمل | اور اعمال زینتِ دوراں
نازشِ دہر و فخرِ عالم ہے | آج یہ ہستیٔ عظیم الشاں

فیضِ گاندھی تمام جاری ہے
پرتوِ حق کی جلوہ باری ہے

دہر میں انقلاب آئیگا | آئیگا اور شتاب آئیگا
ورقِ حال الٹ گیا یعنی | اب کوئی تازہ باب آئیگا
ظلمتیں دُور ہونگی عالم کی | چرخ پر آفتاب آئیگا
مقصدِ زیست ہوگا راست روی | کج روی سے حجاب آئیگا
ہوگی آخر شکست باطل کو | اور حق فتحیاب آئیگا
آہِ مظلوم مستجاب ہوئی | ظالموں پر عتاب آئیگا
انتزاعِ ملوکیت ہے قریب | دورِ راحت مآب آئیگا
ہوگا حاصل سکون قلب و جگر | ختم پر اضطراب آئیگا
غیب سے لطفِ زیست کا ساماں | بیحد و بے حساب آئیگا

ہم نئے ہونگے اور نیا عالم
زندگی ہوگی راحتِ باہم

عشق

(از سید احمد اللہ قادری نایب ایڈیٹر رسالہ "تاریخ")

تیرے جلوے فطرتِ کونین میں روپوش ہیں | تیرے نغمے نبض کی جنبش سے ہم آغوش ہیں
تیری آبادی میں اِک دنیائے آباد ہے | کچھ دِنوں مسرور ہے اور کچھ دنوں ناشاد ہے
زندگی اور موت لذت میں تری مستور ہیں | تجھ پہ مر مٹنے کو ساری فطرتیں مجبور ہیں
تو سراپا سوز بھی ہے اور ساز انگیز بھی | تو ہے لذت بخش بھی تو ہے مصیبت خیز بھی

تو وہ منزل ہے جہاں کوئی سنبھل سکتا نہیں
ابلقِ شام و سحر اس رہ میں چل سکتا نہیں

فلسفۂ حیات

از جناب برقؔ دہلوی، بی۔ اے

تجھے نخلِ بندِ حیات نے تری کاوشوں کے یہ پھل دیے
کیا خلق باغِ جہاں میں جب تو ثمر بھی حسبِ عمل دیے

کوئی ڈھونڈے لیکے چراغ بھی، نہ ملے گا کوئی سُراغ بھی
کہیں اُن کا نام و نشاں نہیں جو عدم کو قافلے چل دیے

نہ بہارِ خندۂ گل ہے اب، نہ وہ دورِ ساغرِ مل ہے اب
نہ وہ باغ ہے، نہ وہ میکدہ کہ خزاں نے رنگ بدل دیے

یہ طلسم خانۂ دہر ہے وہ نظر فریب کہ قہر ہے
ہمیں کیا حیاتِ دو روزہ دی جو ہزار اُس میں خلل دیے

جو مآلِ کار یہ ہے نظر، دل و جاں سے خدمتِ خلق کر
کہ یہ عقل و ہوش یہ دست و پا تجھے بہرِ حسنِ عمل دیے

یہ غرورِ حسن یہ بیرخی، یہ رمیدگی یہ کشیدگی
کبھی مل گئے سرِ راہ بھی تو نگاہ پھیر کے چل دیے

یہ روا روی کا مقام ہے یہ اجل کا شیوۂ عام ہے
جو لباسِ زیست کہن ہوئے تو وہ دم زدن میں بدل دیے

جو کسی نے ہمتیں صرف کیں تو دلی مرادیں اُسے ملیں
جو شکم میں خاک کے تھے نہاں وہ دفینے اُس نے اُگل دیے

یہ گلہ ہے ربِّ کریم سے، ملا کچھ نہ فیضِ عمیم سے
جو دیے ہیں چند نفس ہمیں وہ برائے نذرِ اجل دیے

مرے قلب پر جو یہ داغ ہیں، نہیں انکو گل یہ چراغ ہیں
مری جان شوق سے لے مگر نہ بجھا یہ بادِ اجل دیے

نہ غرض متاعِ جہاں سے کچھ نہ ہمارا مال ہے نقدِ جاں
تہیدست آئے تھے ہم یہاں تہیدست دہر سے چل دیے

تو ہی شش جہت میں ہے ضو فشاں نہیں ماسوا کا کہیں نشاں
پسِ پردہ ہو کے عبث نہاں یہ فریبِ حسنِ ازل دیے

یہی برقؔ چرخ سے ہے گلہ ہمیں گردشوں نے مٹا دیا
جو ہمارے روزِ نشاط تھے وہ شبِ الم سے بدل دیے

لطفِ سخن

(از لسان الملک جناب صفی لکھنوی)

تو بھی مایوس تمنا مرے انداز میں ہے
جب تو یہ درد پپیہے! تری آواز میں ہے

شوخیِ حُسن حسینوں کے ہر انداز میں ہے
کبھی چتون میں کبھی پردۂ آواز میں ہے

اُف ری ناسازیِ دل گو کہ زمانہ گزرا
ضعف اب تک وہی ڈوبی ہوئی آواز میں ہے

کعبۂ دل کا ہمارے ہے خدا ہی حافظ
اختیارِ صنمِ خانہ برانداز میں ہے

بلبلیں شور مچائیں نہ چمن میں کہہ دو
بسترِ گل پہ کوئی خوابگہِ ناز میں ہے

نو اسیرانِ چمن کے کوئی دل سے پوچھے
وہ اذیت جو شکستِ پرِ پرواز میں ہے

دیکھ یوں تھک کے نہ بیٹھ اے دلِ حسرت انجام
قدمِ سعی ابھی سرحدِ آغاز میں ہے

کہیئے یہ رمز و کنایات کوئی کیا سمجھے
اُن کی جو بات ہے وہ سلسلۂ راز میں ہے

کوئی آزاد ہے لذت کشِ گلگشتِ چمن
کوئی محبوسِ قفس حسرتِ پرواز میں ہے

بے خطا کون ہوا ہے ہدفِ ناوکِ ظلم
ایک رعشہ سا کمانِ قدر انداز میں ہے

اسے خاموش ہی رہنے دو صفی کیوں چھیڑو
اثرِ سوزِ تپِ غم دلِ ناساز میں ہے

(از بابو ہرگوبند دیال سریواستو نشتر)

ہمصفیرو رہنے دو افسانۂ ابرِ بہار
آپ ہی دیوانہ ہے دیوانۂ ابرِ بہار

ایک مدت سے قفس کی زندگی ہے اور ہم
کیا سناتے ہو ہمیں افسانۂ ابرِ بہار

جب تصور بندھ گیا اُس کا ہیں مخمور ہیں
میکشوں کے ساتھ ہے میخانۂ ابرِ بہار

دَیر سے مطلب نہ کچھ ہم کو حرم سے واسطہ
ہم تو ہیں بس ساجدِ بتخانۂ ابرِ بہار

دیکھئے گلشن کی سرسبزی و شادابی کا رنگ
پتی پتی کہتی ہے افسانۂ ابرِ بہار

ایک دن وہ تھے کہ ہم تھے اور چمن کی سیر تھی
اب تو ہم ہیں اور فقط افسانۂ ابرِ بہار

اب تو نشتر کو جہاں دیکھا کہ سب کہنے لگے
لیجئے وہ آ گیا دیوانۂ ابرِ بہار

(مسٹر دھیریہ پرکاش بھٹناگر رعنا سکندر آبادی)

جفا پر وہ جفا، بیداد پر بیداد کرتا ہے
ستم ایجاد ہے، ہر دم ستم ایجاد کرتا ہے

کہوں کیا کس طرح رہ رہ کے وہ بیداد کرتا ہے
کبھی آباد کرتا ہے، کبھی برباد کرتا ہے

زمانے نے کسی کو اس طرح مٹتے نہیں دیکھا
مجھے جو چاہتا ہے ہر طرح برباد کرتا ہے

دلِ حسرت زدہ کی خو سے تم واقف نہیں شاید
یہ اپنے بھولنے والے کو اکثر یاد کرتا ہے

قفس میں روز رکھ دیتا ہے کچھ تنکے نشیمن کے
کرم کی شکل میں مجھ پر ستم صیاد کرتا ہے

مرے آتے ہی چھوڑی زمزمہ سنجی اسیروں نے
مجھے صیاد اس الزام میں آزاد کرتا ہے

وفا کا ہے اثر یا ضبط کی تاثیر ہے رعنا
کہ مجھ کو وہ ستمگر ہر جفا پر یاد کرتا ہے

(قاضی اختر جوناگڈھی)

نکلے وہ بزمِ ناز سے منہ اپنا پھیر کر
گردن پہ اپنی خونِ تمنّا لئے ہوئے

آغازِ عشق سے ہوئی اپنی نمود و بود
آئے ازل سے ہم دلِ شیدا لئے ہوئے

یہ دل جلوں کی آہِ شرربار کا اثر
ہے داغ دل پہ لالۂ صحرا لئے ہوئے

موسیٰ کی طرح محوِ نظارہ ہوں میں اِدھر
وہ ناز سے اُدھر یدِ بیضا لئے ہوئے

ایمن کی وادیوں میں ابھی ہے شرارِ برق
آئے تو کوئی شوقِ تمنّا لئے ہوئے

اسرارِ کائنات کو اختر وہ پا سکے
آئے یہاں جو دیدۂ بینا لئے ہوئے

ازجناب سرشار (خیرپور سادات)

وہ شمع ہوئی روشن وہ آ گئے پروانے
آغاز تو اچھا ہے انجام خدا جانے

یہ محفلِ عشرت کا انجام ہے دیوانے
اجڑی ہوئی محفل ہے ٹوٹے ہوئے پیمانے

یا آپ ہی آ جاتے یا دم ہی نکل جاتا
رکھا نہ کہیں کا بھی اس وعدۂ فردا نے

دولت سے قناعت کی گر دل کو غنی کر لے
رسوائی سے در در کی کیوں خاک کوئی چھانے

جذبات کی دنیا نے طوفان اُٹھایا ہے
مرنے کی ضرورت نے جینے کی تمنا نے

یاد آتے ہیں رہ رہ کر تڑپاتے ہیں رہ رہ کر
وہ عشق و محبت کے بھولے ہوئے افسانے

جو عشق میں مرتے ہیں موت اُن کو نہیں آتی
سمجھا ہی نہیں اب تک اس راز کو دنیا نے

سرشار محبت کے آئین نرالے ہیں
فرزانے ہیں دیوانے، دیوانے ہیں فرزانے

علمی خبریں اور نوٹ

گذشتہ مئی میں ہند کے شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹگور کی عمر کے ستر سال ختم ہو گئے ہیں، چنانچہ اس مبارک واقعہ کے اعزاز میں بابو رامانند چٹرجی ایڈیٹر ماڈرن ریویو کی ایڈیٹری اور مہاتما گاندھی موسیو رومان رولینڈ سر جے۔ سی۔ بوس، پروفیسر البرٹ اسٹین اور موسیو کاسٹی پلاس کی سرپرستی میں "ٹیگور کی سنہری کتاب" کے نام سے ایک ہتم بالشان یادگاری مجموعہ زیر طبع ہے۔ جس میں ٹیگور کے متعلق برطانیہ۔ فرانس۔ اسپین۔ اٹلی پولینڈ۔ روس۔ سوئڈن۔ ترکی۔ امریکہ۔ افریقہ۔ آسٹریا۔ عراق۔ مصر۔ لنکا۔ برما۔ چین۔ جاپان۔ جاوا۔ غرض تمام مہذب دنیا کے مشاہیر اہل قلم اور اہل الرائے اصحاب کے مضامین درج ہونگے حجم تقریباً چار سو صفحات ہوگا اور ہندوستان۔ چین و جاپان کے مشہور مشہور مصوروں نے اس کے لئے خاص تصویریں اور مرقع بنائے ہیں خود شاعر اعظم کے مختلف نئے فوٹو اس میں ہدیۂ ناظرین ہونگے۔ غرض لکھائی چھپائی، مضامین ہر اعتبار سے یہ ایک نادر مجموعۂ مضامین ہوگا۔ قیمت اٹھارہ روپیہ تجویز کی گئی ہے۔ غالباً اس ماہ کے آخر تک شائع ہوجائیگی۔

بنارس یونیورسٹی کے نامور بانی پنڈت مدن موہن مالویہ صاحب کی ستترھویں سالگرہ کی تقریب میں بھی دار العلوم بنارس کے اہتمام سے اسی قسم کا ایک یادگاری مجموعہ زیر طبع ہے جو ممدوح کی خدمت میں آیندہ بسنت پنچمی کو جو یونیورسٹی مذکور کی سالگرہ کا دن ہے پیش کیا جائیگا۔ اس مجموعے میں بھی ملک کے ہر قوم اور ہر جماعت کے مشاہیر نے مضامین لکھے ہیں۔

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی ہر سال اردو ہندی پنجابی زبان کی بہترین تصانیف کے صلہ میں بیش قرار انعامات دیا کرتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ع کی اعلیٰ تصانیف کے جن مؤلفوں اور مصنفوں کو انعامات تقسیم کئے گئے ہیں انکے نام نامی یہ ہیں

مولوی فیروز الدین شرف مصنف "سنہری کلیاں"	مبلغ	۷۵۰	روپیہ
پروفیسر سری کانت شاستری ایم۔ اے۔ ایچ۔ او۔ ایل	"	۷۵۰	"
لالہ موہن لال سیٹھی۔ ایم۔ ایس۔ سی ہوشیارپوری	"	۵۰۰	"
خانصاحب مولوی فیروز الدین اینڈ سنز لاہور پبلشر فیروز اللغات فارسی	"	۵۰۰	"
مسٹر کے۔ ایل۔ رلیارام مصنف "موسیقی ہند"	"	۵۰۰	"

پنڈت رام نریش صاحب ترپاٹھی لئی سال سے نہایت عرقریزی کے ساتھ صوبہ متحدہ کے مشرقی اضلاع کے عام ہندی گیتوں کو یکجا کر رہے ہیں۔ آپ کی پانچ سال کی محنت شاقہ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہندی مندر الہ آباد نے ان گیتوں کا قابل قدر مجموعہ شائع کیا ہے۔ ان گیتوں سے ملکی رسم و رواج اور عوام کے خیالات پر غیر معمولی روشنی پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ اہل بصیرت ان کی قدر کر رہے ہیں مسٹر شیرف کلکٹر مرادآباد نے ان میں سے بعض گیتوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے جو شائع ہو چکا ہے اور انگریز صاحبان قدیم انگریزی اور اسکاچ گیتوں سے انکا مقابلہ کر رہے ہیں۔

مزار انیس کی مرمت کا مسئلہ عرصہ سے چھڑا ہوا ہے، مگر ابھی تک اسکا خاطر خواہ حل نہیں ہو سکا مولانا محمد علی مرحوم نے بھی اس کی کوشش کی تھی اور شاید کچھ چندہ بھی جمع کیا تھا مگر اسکی تکمیل انکی حیات میں نہ ہو سکی، اب ہمصر سرفراز لکھنؤ نے قدر دانانِ انیس سے مالی امداد کی اپیل کی ہے۔ قریب ساڑھے تین سو روپیہ جمع بھی ہو چکا ہے، کیا اچھا ہو کہ انجمن ترقی اردو اس کام کو اپنے ذمہ لیلے یا سرپرستانِ اردو مثلاً سرکار نظام نواب صاحب رامپور یا نواب صاحب بھوپال میں سے کوئی اس طرف توجہ فرماکر ضروری سرمایہ کا انتظام کرے۔

پچھلے دنوں گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں ڈاکٹر اقبال بھی انگلستان تشریف لے گئے تھے، چنانچہ لندن کے ادبی حلقوں نے انکی بہ حیثیت شاعر اچھی خاصی عزت افزائی کی۔ "اقبال ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک جدید علمی انجمن بھی آپ کی تشریف آوری کی یادگار میں قائم ہوئی۔ آپ کے خیر مقدمی جلسہ میں منجملہ دیگر اصحاب کے مہاتما گاندھی، سر آغا خاں، مسز سروجنی نیڈو اور مسٹر عبداللہ یوسف علی وغیرہ شریک تھے۔

معلوم ہوا ہے کہ لندن میں ڈاکٹر اقبال نے ایک ملاقات کے دوران میں فرمایا کہ اب انھوں نے اردو میں شعر کہنا ترک کر دیا ہے اور اسلامی دنیا کی خاطر آیندہ صرف فارسی زبان میں اپنے شاعرانہ خیالات و جذبات کو قلمبند کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ اہل ملک علمی حیثیت سے کئی سال سے اس فیصلہ سے واقف ہیں تاہم وہ اس پر اپنے افسوس اور مایوسی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ اردو کی سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ جو لوگ اسکی توسیع و ترقی میں سب سے نمایاں حصہ لے سکتے ہیں وہ اسکے ساتھ انتہائی سرد مہری کا برتاؤ کرتے ہیں ڈاکٹر ٹگور نے شروع سے ابتک بنگالی زبان ہی کو اپنے شاعرانہ جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اسی زبان میں انکی بہترین تصانیف ہیں اور دنیا کی جن جن زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے ہیں وہ سب بنگالی زبان سے کئے گئے ہیں مگر ڈاکٹر اقبال اردو کو اپنی شاعری کے قابل نہیں سمجھتے ہیں۔ افسوس!

ہندوستانی اکیڈیمی کی تیسری ادبی کانفرنس مارچ سنہ ۱۹۳۲ء میں الہ آباد میں منعقد ہونے والی ہے۔ اس

کانفرنس میں اردو ہندی کے ماہرینِ ادب کو ان زبانوں کے وسائل ترقی پر تبادلۂ خیال کرنے اور مختلف مباحث اور موضوعات علمی پر مضامین پڑھنے یا تقریر کرنے کی دعوت دیگئی ہے، مفصل پروگرام بعد کو شائع ہوگا۔

سال ڈیڑھ سال سے ہمارے مکرم مسٹر حامد اللہ افسر میرٹھی فن تنقید کے متعلق ایک اہم کتاب لکھ رہے تھے، شکر ہے کہ اب وہ ختم ہوگئی ہے اور انشاء اللہ مارچ آئندہ تک شائع ہوجائیگی، اسکا نام نقد الادب تجویز کیا گیا ہے

"صحیح نستعلیق ٹائپ" کے نام سے مسٹر ایس۔ ایچ۔ قریشی صاحب (پوسٹ نمبر ۲۰، ۴ بمبئی) نے ایک نستعلیق ٹائپ مکمل کیا ہے، جسکی نسبت اُن کا دعویٰ ہے کہ یہ حیدر آباد کے نو ایجاد سرکاری ٹائپ سے بھی زیادہ مکمل اور خوبصورت ہے۔ آپ نے ہمارے پاس اس کے بعض نمونے بھی بھیجے ہیں۔ جن صاحبوں کو اُردو ٹائپ سے دلچسپی ہو وہ آپ سے پوسٹ بکس نمبر ۲۰، ۴ بمبئی کے پتے سے خط و کتابت کریں۔ آپ نے تجارتی اغراض کے لئے اس ٹائپ کو کافی مقدار میں ڈھلوا لیا ہے اور ضرورتمند اصحاب کی فرمائشیں پوری کرنے کا انتظام بھی کر لیا ہے۔

حال میں جرمنی کے مشہور فلسفی و شاعر گوئٹے کے مشہور ڈرامے فاسٹ کا ترجمہ اُردو نثر میں ڈاکٹر عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے کیا ہے۔ یہ ترجمہ جس کے شروع میں جرمن لٹریچر، گوئٹے کے سوانح حیات اور شاعرانہ کمال پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کے اہتمام سے شائع ہوگیا ہے

حال میں منشی پریم چند صاحب کا جو ایک طویل ناول "پردۂ مجاز" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس طرف "غبن" نام سے ہندی میں بھی آپ کا ایک ناول طبع ہوا ہے۔

ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد نے اس سال بھی اردو و ہندی کی بہترین تصانیف نظم و نثر کے صلے میں پانچ پانچ سو روپے کے چار انعامات دینا تجویز کئے ہیں، دو انعامات ہندی کتابوں کے لئے اور دو انعامات اردو کتابوں کے لئے منظور کئے گئے ہیں، نثر کی انعامی کتاب کا موضوع دماغی اور اخلاقی سائنس ہونا چاہیئے نظم کے لئے کوئی خاص قید نہیں رکھی گئی ہے مگر نظم و نثر دونوں مصنفین کی طبعزاد ہونا چاہیئے۔

نظم کے لئے طولانی مسلسل نظم کے علاوہ ایک ہی مصنف کی مختلف نظموں کے مجموعے بھی مقابلے میں شریک کئے جائیں گے۔

مقابلے میں شریک ہونے کے لئے مصنف حضرات کو اپنی کتابوں کی سات سات جلدیں ۲۶ اگست ۱۹۳۲ء سے قبل جنرل سکریٹری صاحب ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی خدمت میں بھیجنا چاہیئے۔

آخری ہفتہ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں نامور ادیب و فلسفی مرزا رسوا لکھنوی کی وفات حسرت آیات سے اُردو ادب کو جو نقصانِ عظیم ہوچکا ہے اسکی تلافی ناممکن ہے۔ شاعری، افسانہ نگاری، ترجمہ و فلسفہ غرض ہر صنفِ ادب میں

مرحوم کو جو کمال حاصل تھا اسکی مثال ڈھونڈھے سے بھی نہیں مل سکیگی۔ کئی سال سے آپ علالت کے باعث بہت کچھ معذور و مجبور ہو چکے تھے تاہم موت سے غالباً دو تین دن قبل تک آپ جامعۂ عثمانیہ کے دار الترجمہ کی خدمات انجام دیتے رہے پچھلے اکتوبر کے وسط میں راقم الحروف کو نستعلیق ٹائپ کمیٹی کے سلسلہ میں حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ چنانچہ ایک دوست کی ہمراہی میں مرزا صاحب مرحوم کی خدمت میں بھی کئی دفعہ حاضری کی نوبت آئی، مرزا صاحب علیل تھے اور ہر دفعہ اُن کو دیکھکر یہی خیال دل میں آتا تھا کہ اب یہ صورت دیر تک قائم رہنے والی نہیں ہے، چنانچہ صاحب مرحوم کے گردوپیش جو احباب و اعزّا تھے اُن سے آپکے فوٹو کا انتظام کرنے اور سوانحی حالات لکھنے کی بار بار استدعا کی گئی۔ ان حضرات نے اسوقت تو از راہِ لطف و کرم بڑے بڑے وعدے کر لیئے لیکن ان کی تکمیل تک ان صاحبوں کو موقع نہیں ملا۔ افسوس اب یہ کامل الفن ادیب ہمیشہ کیلئے ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا، مگر اُردو کی جو اہم خدمات مرحوم اپنی زندگی میں انجام دیگئے ہیں انکا احسان قدر دانانِ ادب پر ہمیشہ قایم رہیگا اور انکی تصانیف انکے نام نامی کو زندہ جاوید بنا دینگی۔ آپکا ناول امراؤجان ادا اُردو کا ایک بہترین ناول ہے۔ "شریف زادہ" بھی ایک بہترین افسانہ ہے جسکا ہر صفحہ ہمیشہ نوجوانانِ ملک کیلئے چراغ ہدایت کا کام دیگا۔ مرزا صاحب جس کامیابی سے روزمرہ کے معمولی معمولی واقعات زندگی قلمبند کر سکتے تھے اسی خوبی و خوش اسلوبی سے ادق فلسفانہ مضامین پر عالمانہ بحث کر سکتے تھے۔ آپکی زندگی محبت مروان مرد خدا کی صداقت کا عملی نمونہ تھی۔ عربی فارسی میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ کو انگریزی علم ادب سے واقفیت حاصل کرنے کا خیال آیا تو آپ نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی سند بھی حاصل کرلی۔ زبان اُردو کے آپ بہت بڑے ماہر تھے۔ فلسفہ کے ادق سے ادق مباحث کو دلنشین پیرائے اور سلیس زبان میں ادا کرنے میں آپکو ید طولیٰ حاصل تھا۔ سیرت نگاری میں آپکو خاص کمال حاصل تھا۔ صاف، سلیس اور بامحاورہ اُردو کے آپ مالک تھے۔ نظم میں آپ حضرت اَوج کے شاگرد اور غالبؔ کے پیرو تھے۔ آپکی شاعری بیجا تصنع اور فضول مبالغہ سے پاک نیچر کے مطابق ہوتی تھی۔ آپکی خاص تصانیف میں مثنوی نوبہار، امید و بیم، خونِ عاشق، شریف زادہ، ذات شریف، اُمراؤجان ادا، خاص طور پر مشہور ہیں۔ دار الترجمہ کی سرپرستی میں آپنے بعض ادق کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا، لیکن اس خدمت سے طبعزاد اور تخیل تصانیف کا سلسلہ بالکل ختم ہوگیا۔ افسوس موت نے اس خدمت کو بھی قائم نہ رہنے دیا۔

خوشی کا مقام ہے کہ خطابات سال نو کے سلسلہ میں گورنمنٹ ہند نے ہمارے دیرینہ کرمفرما منشی ابن علی صاحب ایڈیٹر نیر اعظم مرادآباد کو "خانصاحب" کا خطاب عطا فرمایا ہے۔ خدا کرے موصوف کو یہ عزت مبارک ہو۔

تصاویر اس نمبر کی رنگین تصویر عہد مغلیہ کی اٹھارھویں صدی کی مصوری کا ایک دلکش نمونہ ہے اسکی اصل برٹش میوزیم میں ہے۔ دوسری تصویر مہاراجہ پرتھی راج چوہان کے دربار کی ہے اسکی اصل ریاست جودھپور کے نامور مصنف و مورخ منشی دیبی پرشاد صاحب مرحوم سے دستیاب ہوئی تھی اسکے ساتھ کی ایک اور تصویر بھی مرحوم نے بھیجی تھی یعنی مہاراجہ جے چند کا دربار جو آئندہ پیش کیجائیگی

فہرست مضامین زمانہ جلد ۵۷ بابتہ جولائی لغایتہ دسمبر ۱۹۳۱ء

تصاویر: سترھویں صدی کی ایرانی مصوری کا نمونہ۔ عہد مغلیہ کی ہندوستانی مصوری کا نمونہ۔ ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال۔ مسٹر وجے راگھواچاریہ۔ لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند اور مہاتما گاندھی۔ اعلیٰ حضرت نظام دکن اور لارڈ ارون۔ مرحوم مہاراجہ صاحب بنارس۔ مسٹر پی۔ سی۔ راما سوامی لا ممبر گورنمنٹ ہند ہز ہائینس سر آغا خاں۔ عبدالرحیم خان خاناں (عہد اکبری) مسٹر کے۔ سی۔ رائے مرحوم۔ پنڈت وشنو دگمبر گائن آچاریہ۔ مہاتما گاندھی کے سفر لندن کی دو تصویریں۔ گول میز کانفرنس میں سیاستہائے ہند کے قائم مقام۔ شاہنشاہ جہانگیر اور چوگان بازی۔ جعفر بیگ وزیر شاہجہاں۔ ایک مغل شہزادہ منشی رام دیال سکسینہ مرحوم۔ منشی جے دیال سکسینہ مرحوم۔ شریمتی چاندرانی مرحومہ۔ شریمتی ہیرا کنور دیوی

نثر

نظم

پچاس سالوں سے ہندوستانی پیٹنٹ دواؤں کے بے مثل موجد

بچوں کا پیارا!

لال شربت (REGD)

بچے۔ لڑکے اور پرسوتی کے لئے مثل آبحیات اکسیر ہے میٹھا اور خوش ذائقہ ہونے کی وجہ سے بچے بڑے شوق سے پیتے ہیں اس سے ان کی ہڈی مضبوط، جسم قوی اور خون گاڑھا ہو کر کف۔ کھانسی، بدہضمی و لاغری رفع ہوتی ہے۔ ہر کی کمزوری اور ان میں دودھ کی کمی کو رفع کرنے کی اس میں بے مثل طاقت ہے۔

قیمت فی شیشی تیرہ آنہ ۱۳/ محصول ڈاک دس آنہ ۱۰/ نمونہ کی شیشی دو آنہ جو صرف ایجنٹوں سے مل سکتی ہے۔

(REGD) "دب۔ دمہ"

لاکھوں مریضوں پر آزمودہ یہ دوا ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مشہور ہے۔ دمہ خواہ کتنے ہی روز کا اٹھا ہو دے ایک خواہ دو خوراک پیتے ہی دب جاتا ہے۔ دمہ کے جو مریض اور دوائیں کھا کر نا امید ہو چکے ہوں ان کو اس دوا کی بھی آزمائش کرنی چاہیئے۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ چھ آنہ ۱؎ ڈاک محصول سات آنہ ۷/

نوٹ: ہماری دوائیں سب جگہ دواخانوں میں فروخت ہوتی ہیں۔ ڈاک خرچ بہت زیادہ ہو گیا ہے اس لئے اس کی کفایت کے لحاظ سے اپنے مقامی ہمارے ایجنٹ سے خریدیں۔

صیغہ نمبر (۶۷) پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴۔ کلکتہ (ایجنٹ کانپور نیا گنج مین محمد حفیظ محمد نصیر صاحبان)

علمی ذوق رکھنے والے حضرات مندرجہ ذیل کتابیں ضرور منگائیں

بزم خیال

اس میں اُردو اور فارسی شعرا کی مجالس کے لطائف و ظرائف اور برجستہ گوئی و حاضر جوابی کے نمونے جمع کئے گئے ہیں جو خوش مذاق حضرات کی تفریح کا بہترین سامان ہے۔

قیمت صرف ایک روپیہ عہ

ہندو تیوہاروں کی اصلیت

اس کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب بی۔اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بستی نے ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور انکی جغرافیائی کیفیت نہایت واضح اور آسان زبان میں لکھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی اور تمدنی انتظام اور ہندو تیوہاروں کی ضرورت پر بھی اظہار خیال کیا ہے

قیمت فی جلد ۹/

خاک پروانہ

منشی پریم چند کی تازہ ترین چودہ منتخب مضامین کا مجموعہ۔ پریم چند صاحب کے افسانے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

قیمت ایک روپیہ عہ

انتخاب اودھ پنچ

اخبار اودھ پنچ لکھنؤ کے ان مضامین کا مجموعہ جو ۱۸۷۷ء میں اس میں شایع ہوئے تھے علاوہ اس کے بہت سا تفریح کا سامان بھی موجود ہے

قیمت صرف ایکروپیہ آٹھ آنہ عہ

بہرام کی رہائی

نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری کے بعد اس کا پڑھنا نہایت ضروری ہے قیمت ۸/

خیالات عزیز

مجموعہ مضامین مولوی عزیز مرزا صاحب جسکی باضابطہ رجسٹری ہو گئی ہے حجم ۲۰۰ صفحات ہر ورق پر مصنف کی تصویر ٹائیٹل خوشنما بہترین لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت صرف ۲ روپیہ

گلزار داغ

فصیح الملک جناب داغ دہلوی کا مشہور و مقبول دیوان ہے جو حال میں حسن و خوبی کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ داغ صاحب کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ قیمت بلحاظ دیوان صرف ایکروپیہ آٹھ آنہ عہ

مثنوی سحر

یعنی شگفتہ و دلنشین منظوم حضرت سحر ہتگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز اول اڈیشن کی قیمت ۶ روپے اڈیشن کی قیمت جس کی مصنف نے نظر ثانی بھی کی ہے صرف ۴/

مرقع ادب

حصہ اول و دوم مرتبہ جناب صفدر مرزا پوری اس میں ہندوستان کے مشہور انشاپردازوں شعرا کے خطوط جمع کئے گئے ہیں جو انھوں نے اپنے احباب وغیرہ کو لکھے ہیں قیمت

حصہ اول ۱۲ حصہ دوم ۱۲

مینیجر زمانہ بک ایجنسی کانپور سے طلب فرمایئے

ہاف ٹون عکسی تصاویر
یہ تصاویر ہاف ٹون بلاک سے عمدہ آرٹ پیپر پر شایع ہوئی ہیں اور انکو عام پسندیدگی کا فخر حاصل ہے
تصاویر رنگین
نئی تصویر
مسیح ابن مریم
نغمۂ محبت
موسم سرما
جادو بہاری
انتظار
ہدایت
خواب راحت
گل بیج روز
رفیق طفلی
شکنتلا و دشینت
مشعل ہدایت
تار شکستہ
صبح نوروزی
فن تصویر کے نمونے
کثرت میں وحدت
وقت نزع
رام بن باس
کرشن اجودھیا جی
نقلید کا انکار
راجہ آج کا ملاپ
بھکارنی
گنگا اور بھیشم
سمندر سا شن
امید وفاداری
مہاراجہ پرتھی راج
شیواجی اور رامداس
قدیم زمانہ کا طریق جنگ
یورپ کا ایک معرکہ
ایک قدیم مشرقی مدرسہ
مصطفے کمال پاشا کی ترکی کونسل
غسل کی تیاری
سیتہ وان اور کرتری
راجہ کمانڈ کے بیٹے کا قتل
باسدیو اور دیوکی قید
زوجہ کپتش متعلق بیگ
دوت کالیداس
گوتم بدھ
اکبر اعظم
راجہ مان سنگھ
اکبر اور چیتے کا شکار
دربار شاہجہاں
عہد مغلیہ شاہی سواری کا جلوس
محاصرہ چیتوڑ
پیدائش شاہزادہ سلیم
دربار جہانگیر میں سفیر فارس
داراشکوہ کا سر اورنگزیب کے سامنے پیش ہوتا ہے
میرن صاحب میر جعفر
ٹیپو سلطان
دربار مادھو راؤ پیشوا
دربار شاہ عباس
موسمی تصاویر
ماہ چیت بیساکھ
جیٹھ اساڑھ
بھادوں ماگھ
پھاگن ساون
مشہور انشا پردازان اردو
مولانا شبلی
شمس العلماء ذکاء اللہ
شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد
میر تعشق علی
حضرت انیس مرحوم
حضرت سرور
مولوی عزیز مرزا صاحب
بابو بالمکند گپتا
اڈیٹر بھارت مترا
مشاعرہ کیننگ کالج منعقدہ ۱۹۱۱ء
منشی احمد علی شوق
مرزا سلطان احمد
مرزا محمد رفیع سودا
مرزا اسد اللہ خاں
مولانا عبد الرزاق
مولانا آزاد دہلوی
مسٹر رام بابو سکسینہ
منشی نوبت رائے نظر
جناب چکبست
حضرت صفی
ڈاکٹر اقبال
مولانا حسن نظامی
لیڈران ہندو
نامورانِ ملک
راجہ رام موہن رائے
مسٹر دادا بھائی نوروجی
سر سالار جنگ
ڈاکٹر نذیر احمد خاں
اراکین دیانند کالج
مسٹر تلک
جسٹس محمود
بابو سریندر ناتھ بنرجی
مسٹر کالیچرن بنرجی
سر رام کرشن بھنڈارکر
بابو گنگا پرشاد ورما
سوامی دیوکانند
نواب محسن الملک
مسٹر رس بہاری
ڈاکٹر ستیش چندر بنرجی
پنڈت لیکھرام
بابو پرتاپ چندر بنرجی
جسٹس للہ ینڈم رائے
آنریبل مسٹر گوکھلے
انجمن خادمان ہند
مسٹر داس
مہاتما گاندھی
پنڈت مالوی
کرنل بھولاناتھ
پنڈت موتی لال نہرو
لالہ لاجپت رائے
ڈاکٹر تیج بہادر سپرو
سر ابراہیم رحمت اللہ
لالہ ہنسراج
راجہ صاحب محمود آباد
لارڈ سنہا
سر آغا خاں
مولانا محمد علی
مسٹر سچدانند سنہا
مسز سروجنی نائیڈو
مسٹر وی پی مادھو راؤ
مہاتما منشی رام
سوامی شردھانند
سر بندر ناتھ بنرجی
ٹیگور
بابو بھگوان داس
سید امیر علی
نواب سید حسن بلگرامی
نواب سید محمد
زمانہ بک ایجنسی کانپور سے منگائیے

مکتبہ جامعہ ملیہ — **ہمزاد** (ڈراما) — قرول باغ۔ دہلی

اشتیاق حسین قریشی صاحب ایم۔ اے کا وہ دلچسپ ڈراما جس میں کم عمر بیوی اور بزرگوار "شوہر" کے معاملات قدرے ظرافت آمیز پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ انجمنوں سوسائٹی میں اسٹیج کرنے کیلئے یہ ڈراما بہت مناسب ہے طباعت کتابت، کاغذ بہت اعلیٰ یہ جامعہ کی اُن کتابوں میں سے ہے جو تمام لوازم اشاعت سے آراستہ ہوتی ہیں۔ ۶ر

گناہ کی دیوار (ڈراما)

مصنفہ اشتیاق حسین قریشی صاحب ایم۔ اے۔ گناہ بُری چیز ہے لیکن شقاوت قلب اور تکبر بدتر ہیں۔ گناہ کی دیوار ڈھائی جا سکتی ہے لیکن شقاوت قلب اور تکبر کے بتوں کو توڑنا بہت دشوار ہے۔ یہ ایک باعصمت خاتون کا قصہ ہے جسے کچھ وقت تک مجبوراً عصمت فروشی کی زندگی گزارنی پڑی لیکن بالآخر خدا نے اُس کی گریہ وزاری سُن لی اور اس زندگی سے نجات دلائی۔ قیمت ۸ر

کھیتی (ڈراما)

مصنفہ محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن) مسلمانوں کی ذہنی اور قومی رہنمائی کے لئے ایک دلچسپ ڈراما مذہب اور اخلاق کس رستے پر چلانا چاہتے ہیں۔ زمانے کی مصلحتیں قوم وملت کی ضروریات سب پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ اور ایک معیار بھی تجویز کیا گیا ہے جو رہنمائی کے دعویداروں کو پرکھنے میں کام آسکتا ہے

قیمت صرف ۶ر

پردۂ غفلت

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا وہ ڈراما جو انھوں نے قیام جرمنی میں لکھکر وہیں چھپوایا تھا۔ مسلمان خاندانوں کی معاشرت کی سچی تصویر۔ تعلیم نسواں، آزادی نسواں اور پردہ پر مفید بحث۔ دلچسپ ظرافت آمیز اور نتیجہ خیز قصہ۔ عمدہ طباعت۔ قیمت ایک روپیہ عہ

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم بی۔ اے

نمبر ۲	فروری سنہ ۱۹۳۲ء	جلد ۵۸

فہرست مضامین

تصاویر: سورداس، پنڈت مدن موہن صاحب مالویہ، آنریبل سر محمد شفیع مرحوم

قیمت فی پرچہ ۱۲؍

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت سالانہ ۵؍

قیمت سالانہ ممالک غیر سے ۵؍ ششماہی ۳؍ ہندوستان سے ششماہی قیمت تین روپیہ

ALETRIS
CORDIAL RIO

THE WOMAN'S TONIC

الٹرس کارڈیال یعنی اکسیر نسوان

ڈاکٹر اس کو جسمانی صحت کے لئے بہترین دوا قرار دیتے ہیں
ہر گھر میں اسکا رہنا نہایت ضروری ہے
ماں بیٹی و بہن کے واسطے بہترین دوائی

Rio Chemical Co;
79. BARROW STREET
NEW YORK (U.S.A)

ہندو شعراء

خواجہ عشرت لکھنوی کی جدید تالیف چارسو پچاس گزشتہ و موجودہ ہندو شعراء کے حالات معہ تذکرہ دلکش قابل دید چیدہ

شمار		قیمت
تذکرہ آب بقا گذشتہ موجودہ شعراء کے حالات		عہ
شاعری کا مکمل سٹ چار جلدوں میں		عہ
لغات اُردو مکمل سٹ		عہ
مآل اُردو ہندی اور اُردو کی حقیقت الفاظ کا فرق		۶ر
اصلاح زبان اُردو ۔ متروکات کی تشریح		۶ر
ترجمان پارسی اُردو سے فارسی بنانے کی آسان ترکیب		۶ر
زباندانی ۔ اُردو کے مستند قواعد		۶ر
اصول اُردو ۔ صرف و نحو کے مختصر قواعد		۶ر

المشتہر
منیجر عشرت بک ڈپو ۔ احاطہ خانساماں لکھنؤ

انقلاب زندہ باد

انتخاب لاجواب

زندگی میں آسودگی اور آرام اچھا نام اور اچھے کام نہ ہوئے تو زندگی ہی ناکام ہے لیکن جب آپ کی صحت ہی اچھی نہیں اور جسم میں طاقت ہی نہیں تو ان کا حاصل کرنا غیر ممکن ہے ۔ اگر آپ اپنی حالت میں انقلاب چاہتے ہیں تو اس کے لئے مقویات سرتاج عالم آتنک نگرہ گولیاں کا انتخاب لاجواب ہوگا ۔ یہ گولیاں آپ کی جملہ شکایتوں قبض ۔ بدہضمی ۔ خون اور منی کی خرابی کمی ۔ جریان ۔ احتلام ۔ سرعت انزال ۔ دل و دماغ کی کمزوری ۔ قوت ہاضمہ اور قوت حافظہ کی کمی اور جملہ شکایتوں کو دور کرکے پورا آرام پہونچا کے آسودگی عطا کر کے اچھے اور اہم کام کے انجام دینے کی ہمت عطا کر سکے تا موربنا دیگی قیمت فی ڈبیہ ۳۲ گولیاں عہ ر ۵ ڈبیاں للعہ علاوہ محصول ڈاک ۔ اسی طرح ہمارا طلاء واجی کرن ہے ۔ تمام بیرونی نقائص دور کرکے اعلیٰ درجہ کی مردمی عطا کرنے میں پوری فتح حاصل کر چکا ہے ۔ قیمت فی شیشی بائیس روپیہ صہ صحت تندرستی کی بہتر راہ راست کی رہبر اور سب سے عمدہ مضامین سے مزین کتاب کام شاستر بالکل مفت طلب فرمایئے ۔

ویدشاستری ، جام نگر ۔ کاٹھیاواڑ

(ایجنٹ ۔ عبدالکریم اینڈ سنز ۔ مسٹن روڈ ۔ کانپور)

پیپس Peps
سانس کیساتھ استعمال ہونیوالی حیرت انگیز دوا
کھانسی۔ سردی۔ ٹھنڈ۔ حلق کی سوزش۔ برانکٹیز وغیرہ کیواسطے
کھانسی۔ سردی اور برانکٹیز کیواسطے یہ حیرت انگیز پیپس کے ٹکیوں کی دوا جن سے ایسے کیمیاوی
بخارات نکلتے ہیں جو سانس کے ساتھ براہ راست سانس کیساتھ پھیپھڑوں تک پہونچ جاتے ہیں۔
ایک بہت ہی اہم ایجاد ہے۔
ایک شیشی ہمیشہ اپنے پاس رکھئے
جیسے ہی مفید پیپس منہ میں گھلتی ہیں تو اُن سے پھیپھڑوں
کے حق میں مفید صنوبر کے درختوں کی ہوا کا جوہر بخارات
کی شکل میں نکلتی ہیں۔ پیپس حلق کی نازک جھیلوں اور گلے
کے اندر پھیپھڑوں تک سانس لینے والی نلیوں پر
ایک فوری تسکین دہ۔ صحت بخش اور جراثیم کش
اثر ڈالتی ہیں۔ پیپس خطرناک جراثیم کو مار ڈالتی ہیں
وہ سینہ کو تسکین اور طاقت دیتی ہیں اور ہر قسم کی
کھانسی۔ ٹھنڈ یا خطرناک سردی کو پورے طور
پر فوری تدارک کرتی ہیں۔
PEPs
for
COUGHS
COLDS &
BRONCHITIS
پیپس کی ہر ٹکیہ پر نقرئی غلاف ہوتا ہے
تمام انگریزی دوافروش پیپس فروخت کرتے ہیں
قیمت فی شیشی ایک روپیہ (عہ/)
ایجنٹ:- مسرز اسمتھ اسٹینسٹریٹ اینڈ کو
بانتالی کلکتہ
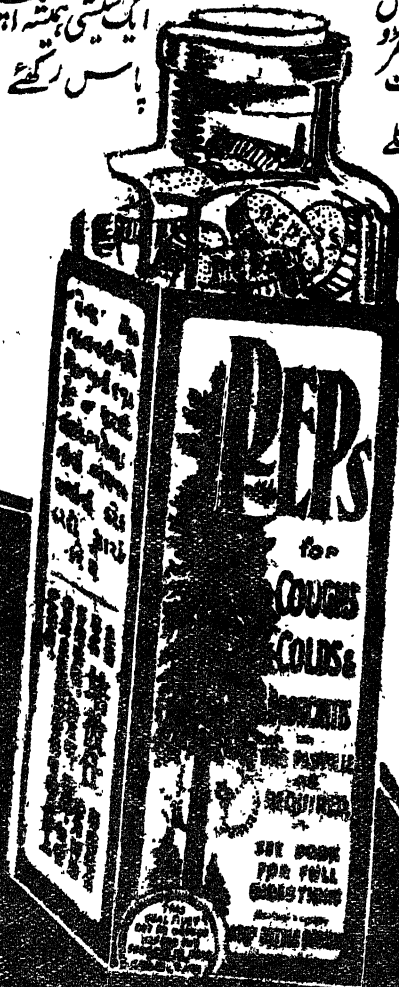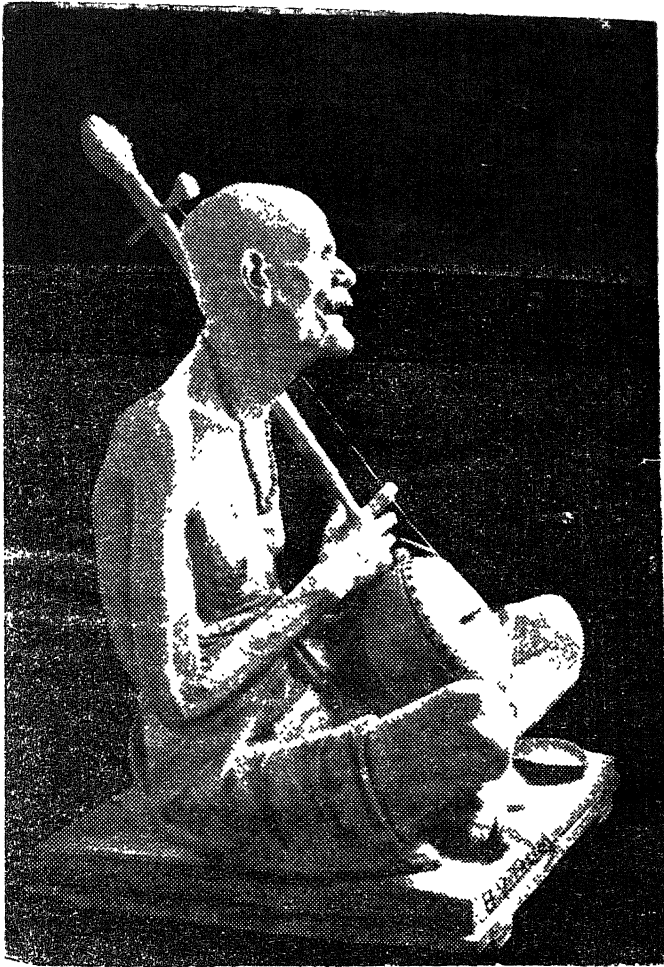
سورداس

زمانہ

جلد ۵۸   فروری ۱۹۳۲ء   نمبر ۲

مآثر العرب

از مولانا محمد عبدالرزاق صاحب کانپوری مصنف "البرامکہ" وغیرہ

جزیرۃ العرب اسلام کا گہوارہ اور مسلمانوں کا مرکز ارضی ہے، اور جو قوم اس ملک میں آباد ہے وہ اقوام عالم میں ایک عظیم الشان درجہ رکھتی ہے اور اس کی تاریخی عظمت صدیوں سے مسلم ہے۔

تاریخی تقسیم عربوں کی تاریخ دو حصوں پر تقسیم ہے، ایک قبل اسلام جس کو اصطلاحاً "عہد جاہلیت" کہتے ہیں اور دوسرا دور "عہد اسلام" کا ہے۔

واقعات کے لحاظ سے یہ دونوں دَور نہایت شاندار ہیں۔ دَور اول کی نسبت عموماً یہ خیال ہے کہ یہ عربوں کا عہدِ ظلمت تھا، اس زمانہ میں اُن کی زندگی وحشیانہ تھی اور وہ دن رات خانہ جنگیوں اور ڈکیتیوں میں مصروف رہتے تھے اور ان میں کوئی اخلاقی و تمدنی جوہر نہ تھے مگر اس خیال کی تاریخ سے تردید ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس عہد میں بھی ان میں شریفانہ اوصاف تھے جن پر وہ فخر کیا کرتے تھے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ جب عربوں میں اسلام کا ظہور ہوا تو اُن کے بعض محاسن ذمائم قرار پائے اور اسلامی شریعت نے ان کو ناجائز قرار دیا۔ چنانچہ اس مختصر مضمون میں ہم عربوں کے وہ مآثر لکھتے ہیں جن کا تعلق عہد جاہلیت سے ہے

۱۔ حُرّیت آزادی یا خود مختاری اور اپنی عزت آپ کرنا، یہ عربوں کی ایک طبعی صفت ہے، ہر عرب یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں مجھ سے زیادہ کوئی آزاد اور حریت پسند نہیں ہے۔ قدیم عربوں میں یہ خیال اس درجہ راسخ تھا کہ ہر شخص اپنے آپ کو بادشاہ وقت جانتا تھا چنانچہ واقعات سے قطع نظر کرکے اس خیال کی تائید متعدد الفاظ

اور امثالِ عرب سے بھی ہوتی ہے

علامہ زوزنی شارح سبعہ معلقہ کی رائے ہے کہ لفظ حُر (بمعنی آزاد) کے ساتھ متعدد اضافتیں ہیں جو عربوں کی خالص حریت پر دلالت کرتی ہیں مثلاً:-

۱- ارضٌ حُرّۃ   وہ زمین جس پر مالگزاری تشخیص نہ ہو۔

۲- طِینٌ حُرّۃ   وہ خالص مٹی جس میں ریت کی آمیزش نہ ہو

۳- احرار البقول اعلیٰ قسم کی ترکاریاں (بقول جمع بقل بمعنی سبزی و ترکاری)

ایامُ العرب (عربوں کی عظیم الشان خانہ جنگیوں) کے سیکڑوں واقعات اسی حریت کی بدولت یادگار ہیں اسی فطری جوہر نے ہر عرب کو سپاہی بنا دیا تھا، اسی جذبہ نے فراعنۂ مصر[1]، سلاطینِ اشوریہ[2]، خسروانِ عجم[3]، اور قیاصرۂ روم[4] سے عربوں کو لڑایا اور اُن کو کبھی اس ملک پر قابض نہ ہونے دیا، اور اگر قبضہ ہوا تو وہ بھی عارضی اور ملک کے کسی خاص حصہ پر۔

۲- بَدوِیت | عرب چونکہ آزادی پسند تھے اس لیے وہ شہروں کے اندر قید ہو کر رہنا پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ ہمیشہ جنگلوں (بادیہ) کی کھلی ہوئی فضا میں ڈیروں، خیموں کے اندر رہتے تھے، اور سکونت بادیہ کے لحاظ سے بَدوِی (جنگلی) یا اعراب کہلاتے تھے۔ اور اسی بنا پر وہ حضریوں (حضریت، شہری زندگی اور حضری، شہر کا باشندہ) کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے' اور اپنی بدویت (جنگلی پن) اور جاہلیت پر فخر کرتے تھے[5]۔

۳- شہسواری | بہادر اقوام کے لئے شہسوار ہونا لازم ہے، عرب عہد طفلی ہی سے اپنے بچوں کو سواری کی تعلیم دیتے تھے اور جوانی میں سواری کی مشق کو معیوب سمجھتے تھے، چنانچہ اسی شوق کی وجہ سے عربوں میں گھوڑ دوڑ

(۱) شام و فلسطین پر فراعنۂ مصر نے ۱۶۰۰ ق م سے ۱۱۶۶ قبل مسیح تک حملے کئے۔ تاریخ مصر میں احمسس، تحوتمس، عمسس سوم اور رعمسس چہارم (اٹھارھواں اور بیسواں خاندان) کے واقعات ملاحظہ ہوں۔

(۲) اشور یعنی شاہان بابل (کلدان) کے حملے بلاد یمن، شام اور مصر پر ۹۰۰ ق م سے ۵۶۲ قبل مسیح تک ہوئے۔ شاہان اشور کا خیال تھا کہ جزیرۃ العرب میں معدنیات بکثرت ہیں۔ ان حملہ آوروں میں تغلات[1] بلاسر ثانی، سرجون[2] ثانی، سنجاریب[3]، اسرحدون[4]، شور بنی پال[5]، بخت نصر (بخت نصر) کے حالات تاریخ میں پڑھنا چاہیئے۔

(۳) خسروان عجم، قورش (کیخسرو) نے ۵۳۹ ق م میں بابل فتح کرنیکے بعد عرب پر حملہ کیا، اور دوسرا حملہ براہ بحرین سابور ذوالاکتاف نے ۲۵۸ء میں کیا۔

(۴) قیاصرۂ روم۔ رومی صدیوں سے عرب کو فتح کرنا چاہتے تھے چنانچہ قیصر آگسٹس نے ۱۸ ق م میں والی مصر الیوس گالوس Aelius-gallus کی قیادت میں شاہان انباط کے دارالحکومت بطرا (پٹرا) پر حملہ کیا۔ یہ توراۃ کا قدیم شہر ادومیہ ہے۔ جو وادیٔ موسیٰ میں مابین تدمر (پالمائرا) و غزہ واقع تھا، غزہ سرحد مصر میں بحر احمر میں ہے۔

(۵) لم تکن الحضارۃ اعجبتہ + فای رجال بادیۃ ترانا۔ (ترجمہ) جسکو شہر میں رہنا پسند ہو وہ رہے، مگر ہم تو دیہاتی ہیں اور تو ہم کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

جاری ہوئی۔

حلبہ و رہان دوڑ کے لئے گھوڑوں کے جمع کرنے کا نام حُلبہ اور گھوڑ دوڑ کا نام رہان ہے۔ یہ رہن سے مشتق ہے۔ کیونکہ سوار، بازی لیجانے میں اپنی ذات کو گویا رہن کر دیتا ہے۔ اور جس زمانہ میں دوڑ ہوتی ہے اسکو ایام الرہان کہتے ہیں۔ یہ عربوں کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ اور اس مردانہ کھیل کو انھوں نے درجۂ کمال تک پہنچایا تھا۔ گھوڑ دوڑ میں خوب جُوا ہوتا تھا اور دل کھول کر بازی لگائی جاتی تھی، اور ذرا سی بے اعتدالی پر میدان کارزار گرم ہو جاتا تھا جس کی مثال حرب داحس اور غبرا ہے۔

مولانا حالی نے اپنی مسدس میں لکھا ہے:۔

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا — کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لبِ جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا — کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یونہی روز ہوتی تھی تکرار اُن میں
یونہی چلتی رہتی تھی تلوار اُن میں

اس کی تفصیل یہ ہے کہ داحس (نر) اور غبرا (مادہ) دو مشہور گھوڑے تھے۔ داحس کا مالک قیس بن زہیر عبسی اور غبرا کا مالک حذیفہ بن بدر فزاری تھا۔ ایک دن دوڑ میں داحس بہت تیز جا رہا تھا اور قریب تھا کہ بازی جیت جائے لیکن فریق مخالف کے ایک سوار نے آگے بڑھکر اُس کو بدکا دیا اور غبرا بازی جیت گئی اس پر دونوں قبیلوں میں جنگ شروع ہوئی۔ جو ۵۶۸ء سے ۶۱۳ء تک جاری رہی، اور اس خانہ جنگی کا خاتمہ اُس وقت ہوا جب یہ قبیلے اسلام لائے۔ چنانچہ عربوں میں یہ جنگ ضرب المثل ہے[1]

عرب ایک ساتھ دس گھوڑے بڑھاتے تھے اور رفتار کے لحاظ سے اُن کے ترتیب وار نام یہ تھے ان ناموں سے زبان عرب کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں کس قدر مادّے ہیں۔

۱۔ سابق و مجلّی ۲۔ مصلّی ۳۔ مسلّی ۴۔ تالی ۵۔ عاطف ۶۔ مرتاح ۷۔ مؤمّل ۸۔ حظی ۹۔ لطیم ۱۰۔ سکیت۔ فسکل، قاشور

سابق (نمبر۱) جب میدان جیت کر آتا تھا تو اُس کے منہ پر شفقت اور محبت سے ہاتھ پھیرنا لازم تھا جریر کا مشہور شعر ہے

اذا شئتموا ان تمسحوا وجہہ سابق
جواداً فمدوا فی الرھان عنانیا

---

[1] فلا کانت الغبراء ولا کان داحس + ولا کان یوماً حل فیہ رھان + (ترجمہ) نہ تو غبرا رہی اور نہ داحس اور نہ وہ دن رہا جس میں گھوڑ دوڑ ہوئی تھی۔

دوڑ سے پہلے ایک رسّی تانی جاتی تھی اور سب گھوڑے صف باندھ کر کھڑے ہوتے تھے اور اسی جگہ سے میدان میں چھوڑے جاتے تھے۔ اس رسّی کا نام مقوس اور مقبض تھا اور دوڑ کے راستہ میں ایک لکڑی نصب کر دی جاتی تھی جو سوار سب سے آگے نکل جاتا وہ اُسکو اُکھاڑ لیتا تھا اور یہ جیت کی دلیل تھی۔

سب سے بڑی دوڑ بارہ میل کی ہوتی تھی، اور گھوڑوں کی چال عمر کے حساب سے مقرر تھی۔ بڑی دوڑ میں صرف پانچ سال یا اس سے زیادہ عمر کے گھوڑے دوڑائے جاتے تھے۔ اہل یورپ نے یہ کھیل اندلس (اسپین) کے عربوں سے سیکھا تھا اور اسلام نے بھی گھوڑ دوڑ کو جائز رکھا البتہ بازی لگانا ممنوع کر دیا۔ دور حاضرہ میں اب یہ مستقل فن ہو گیا ہے۔

اغانی وغیرہ میں نامی شہسواروں کے حالات تفصیل سے درج ہیں، ہم صرف ناموں پر اکتفا کرتے ہیں ربیعہ بن مکدم، عنترہ بن شداد، عامر بن مالک ملقب بہ ملاعب الاسنہ، زید الخیل، عامر بن الطفیل، عمرو بن معدیکرب، دُرید بن الصمہ، زید الفوارس، اثیہ بن حرثان، عمرو بن کلثوم تغلبی، شنفری حارثی، مہلہل بن ربیعہ ان میں سے بعض عہد اسلام تک موجود تھے۔ عامر بن الطفیل بڑا مشاق شہسوار تھا اور گھوڑے کی پشت پر وزرشی عمل کرتا جس کی تکمیل اندلس کے عربوں نے کی۔ یہ ویسے ہی عمل تھے جو سرکس والے دکھلاتے ہیں شہسواری کے علاوہ پیادہ پا دوڑنے کی بھی مشق کرتے تھے اور گھوڑے سے زیادہ تیز جاتے تھے، بلکہ بعض اوقات گھوڑا پیچھے رہ جاتا تھا۔ یہ لوگ محاضیر کہلاتے تھے۔ سُلیک[1] (حرث بن عمرو تیمی) شنفری (ثابت بن جابر) عمرو بن براق، اُسیر بن جابر اور ابو زہیر ثابت یہ پانچ شخص سرعت رفتار میں ضرب المثل تھے اور اکثر ملکر چوریاں بھی کرتے تھے، اور علی الصباح بڑے دھاوے کر کے گھر آجاتے تھے۔ ان میں سلیک، زہیر شاعر بھی تھے اور شنفری تو زبردست شاعر تھا، طغرائی نے اسی کے قصیدہ کے جواب میں لامیۃ العجم لکھا ہے عہد مغلیہ میں ڈاک کے ہرکارے بھی محاضیر الہند کے خطاب کے مستحق تھے، تانتیا بھیل مشہور ڈاکو بھی بڑھاپے میں سو میل دوڑ کر دم لیتا تھا۔

۴۔ گھوڑوں کی پرورش گھوڑوں کی نسل بڑھانا اور اُن کی پرورش کرنا امارت میں داخل تھا۔ عربوں میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے زمانہ سے گھوڑے کی سواری جاری ہوئی اور وہی سب سے پہلے عرب کے شہسوار ہیں، حیوانات میں گھوڑے سے زیادہ خوبصورت اور حسین کوئی دوسرا جانور نہیں ہے۔ شرافت نفس اور علو ہمتی میں بھی وہ سب سے اعلیٰ ہوتا ہے۔ عرب کے گھوڑے بھی سب سے افضل ہوتے ہیں کیونکہ اُس[2] کی آب و ہوا گھوڑے کے حق میں آبحیات کا اثر رکھتی ہے۔ عربی گھوڑا قد و قامت میں بلند نہیں ہوتا مگر تیزی، چالاکی اور

---

[1] صناجۃ الطرب نوفل آفندی مطبوعہ بیروت
[2] انتخاب از تمدن عرب موسیو لیبان۔

ستاب روی میں اس کا جواب نہیں ہے۔ یہ بھی اپنی آزادی کے غرور میں چور ہوتا ہے۔ عربی گھوڑے کی صفت یہ ہے کہ تیز پتلیاں، پھولے ہوئے نتھنے، اونچی گردن، پتلی کمر، چھوٹا سر، پشت کسی قدر لمبی، دُم پیچھے کو اُبھری ہوئی، پانوں پتلے، نازک مزاج، غریب، تربیت پذیر، جاندار، کم خوراک، اور مہذب یہ اوصاف دوسروں میں مفقود ہیں۔

عرب میں ہنوز یہ دستور ہے کہ جب کوئی خاندانی گھوڑی بچہ جنتی ہے تو اسکی پیدائش کی تاریخ، ماں کا نام اور خاندان ایک پرچہ پر لکھکر معززین قبیلہ کی گواہی لکھائی جاتی ہے، اور یہ شجرہ ایک نلکی میں رکھکر بچہ کی گردن میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ عربوں کو گھوڑے کی محبت مختلف اسباب سے ہے، لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مصیبت کے وقت وہ اسکی جان بچاتا ہے اس لئے دشمن کی زبان سے بھی نکل جاتا ہے کہ پہلے اپنے گھوڑے کے پانوں دھو پھر پانی پی"

اوصاف کے لحاظ سے عرب اپنے گھوڑوں کے نام رکھتے تھے، مثلاً:۔

۱۔ نعامہ (شترمرغ)

۲۔ عقاب (گدھ، تیز نظر)

۳۔ جرادہ العیار (ٹڈی کی طرح تیز رفتار)

۴۔ ذات الرماح (لانبے پانو والا جیسے تیر ہوتا ہے)

۵۔ ذوالخمار (یعنی چادر کی طرح گلدار)

اجدع بن مالک کے پاس ایک مشہور گھوڑی تھی جسکا نام سکاب تھا۔ فرمانروائے وقت نے اسکو طلب کیا، لیکن اجدع نے اس کے دینے سے صاف انکار کردیا، اور یہ شعر پڑھے۔

أبیت اللعن ان سکاب علقٌ نفیس لا یعار ولا یباعُ

اے بادشاہ! خدا کرے کہ تو بُرے کاموں سے بچا رہے۔ میری گھوڑی سکاب بڑی قیمتی اور نفیس ہے۔ اس لئے وہ نہ مستعار دی جاسکتی ہے اور نہ فروخت ہوسکتی ہے۔

مفداةٌ مکرمةٌ علینا تجاع لها العیال ولا تجاع

اس پر ہماری جانیں قربان ہیں، یہ اس قدر عزیز ہے کہ اس کے مقابلہ میں بال بچے بھوکے رکھے جاسکتے ہیں مگر وہ نہیں۔

بعض عرب اپنے گھوڑوں کو اونٹنیوں کا سب دودھ پلا دیتے تھے اور اہل وعیال بھوکے رہ جاتے تھے جیسا کہ وَرد (ایک گھوڑی کا نام ہے) کا قصہ مشہور ہے، اسکا مالک بھی اونٹنی کا سب دودھ پلا دیا کرتا تھا

جب اُس کی بی بی نے شکایت کی تو اس کو مخاطب کرکے یہ شعر پڑھا۔

تلوم علی ان ا منح الورد لقحته   وما تستوی والورد ساعة تفزع

میری بی بی مجھے ملامت کرتی ہے کہ میں اونٹنی کا سب دودھ ورد کو پلا دیتا ہوں حالانکہ وہ لڑائی کے وقت ورد کی برابری نہیں کر سکتی ہے۔

منذر شاہ حیرہ نے حمل بن زید سے نسل کشی کے لئے اس کا گھوڑا طلب کیا حمل نے انکار کر دیا، جب شاہ نے زیادہ مجبور کیا تو گھوڑے کو آختہ کر دیا۔ یہ واقعہ ہے کہ عرب اپنے گھوڑوں کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے

عرب میں گھوڑوں کی مختلف نسلیں ہیں لیکن سب سے زیادہ دو مشہور ہیں، ایک کدیشیہ جو عموماً تمام عرب میں ہیں، دوسری کحیلانیہ یا اعلیٰ اصیل ہے، ان کی مائیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصطبل میں تھیں، جن کی نسل کو آج تک عربوں نے باقی رکھا ہے

گھوڑے کی تعریف میں ہزاروں اشعار ہیں لیکن ہم صرف امرا القیس کا ایک شعر لکھتے ہیں:۔

مِکَرٍّ مِفَرٍّ مُقْبِلٍ مُدْبِرٍ مَعًا   کجلمودِ صخرٍ حطّہ السیلُ من عَلِ

جب حملہ کرنا چاہو تو وہ بڑا حملہ آور ہے اور جب پیچھے ہٹنا چاہو تو تیزی سے ہٹتا ہے۔ اور تیزی سے آگے بڑھنے والا ہے، وہ بلندی سے اس طرح اُترتا ہے جس طرح سیلاب سے پتھر ڈھلک آتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ گھوڑے میں یہ تمام وصف موجود ہیں، جس وقت جو کام لینا چاہو وہ کر سکتا ہے یہ وہ شعر ہے جس کا یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اونٹ کی طرح عرب کا گھوڑا بھی کم خوراک اور صابر ہوتا ہے دس دن تک وہ روزانہ بیس گھنٹے چل سکتا ہے، اور کئی دن تک بے آب و دانہ سواری دیتا ہے، لوٹ کے موقع پر دشمن کو اپنے سُموں سے زخمی بھی کر دیتا ہے (اسکی تعلیم دیجاتی تھی) عرب کے تاریخی گھوڑوں کے کارنامے ایام العرب میں موجود ہیں۔

شکار میں جب گھوڑا ہرن پر غالب آتا اور ہرن ذبح کر لیا جاتا تو سوار جوش مسرت میں ہرن کا خون گھوڑے کے سینہ پر ملتا تھا، اس کو عربی میں خضاب النحر کہتے ہیں۔

گھوڑوں کے رنگ | رنگ کے لحاظ سے عربی گھوڑوں کے حسب ذیل اقسام ہیں:۔

۱۔ اشقر۔ مائل بہ سرخی، خصوصاً ایال اور دُم سرخ ہو، اسی کو سُرنگ کہتے ہیں، عربوں میں یہ رنگ منحوس سمجھا جاتا ہے کیونکہ شقرا و شیطان بن لاطم کے گھوڑے کا نام تھا، جب وہ میدان جنگ میں مع سوار کے مارا گیا تو یہ رنگ نحس قرار پایا۔ اور یہ مثل ہوئی کہ "اَشْاَمُ مِن الشقراء" یعنی شقرا سے زیادہ منحوس۔

۲۔ اصفر۔ زرد رنگ۔ اس کا دوسرا نام شقرا ہے۔

۳۔اخضر۔ (سبز) جس کو سبزہ کہتے ہیں

۴۔ادہم وغیہبی۔ (مشکی) جب سیاہی زیادہ غالب ہو۔

۵۔ابرش۔مذکورہ بالا رنگوں کے علاوہ۔

۶۔مُدَنَّر۔ دینار سے ماخوذ ہے جس پر اشرفی جیسے سیاہ و سفید گل بوٹے ہوں۔

۷۔اشہب۔سیاہی میں کسی قدر سپیدی ہو۔

۸۔کمیت۔جب سُرخی میں کسی قدر سیاہی ہو (خصوصاً ایال اور دم سیاہ ہو)

۹۔ورد۔اشقر اور کمیت سے ملتا ہوا جس کو فارسی میں گلگون کہتے ہیں (عربی میں گلاب کے پھول کو وَرد کہتے ہیں)

۱۰۔سمند۔زردی میں سیاہی ہو۔

۱۱۔سوسنی۔ زردی میں سفیدی ہو۔

۱۲۔احوی۔سبزی میں سیاہی ہو۔

۱۳۔ابلق۔ دو رنگ سیاہ و سفید

اوصاف | گھوڑے کے بال چھوٹے اور باریک ہوں، دُم گھنی ہو، (سبوغ الذنب) دونوں آنکھیں مستوی (برابر) ہوں، کان اور گردن لانبی ہو، سُم چھوٹے ہوں، چمڑہ نرم ہو، یہ اوصاف شرافت کی دلیل ہیں۔ اا کے علاوہ دوسری صفتیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔عُسَیب۔جس کی دم زمین پر گرتی ہو (طویل الذنب)

۲۔مجنب۔سامنے کے ایک پاؤں میں خفیف سی کجی ہو، یہ بڑی صفت ہے۔

۳۔صافن۔ جو تین پاؤں پر زور دیکر کھڑا ہو اور چوتھے پاؤں کا ایک سُم زمین سے ٹکا ہو۔

۴۔ببرقعہ۔جس کا تمام موُنہ سفید ہو اور اطراف چشم سیاہ ہوں۔

۵۔ارخم۔ سر سفید ہو، باقی تمام جسم سیاہ ہو۔

۶۔محجل۔ پاؤں سفید ہوں، مگر شرط یہ ہے کہ یہ سفیدی سُموں سے اوپر اور گھٹنوں سے نیچے ہو

۷۔مُجَیب۔سامنے کے پاؤں پر سفیدی ہو۔

۸۔یعبوب۔لانبا اور تیز رفتار۔

۹۔طوالات۔ قد و قامت کے اونچے۔

لے انتخاب از مجمع البحرین مصنفہ فاضل ادیب شیخ ناصیف الیازجی مطبوعہ بیروت

۱۰۔ الاعوجیات ۔ ایک قبیلہ میں ڈاکہ پڑا عرب کو ایک بچھیرا بہت عزیز تھا، جب وہ فرار ہوا تو اس نے اس بچھیرے کو اونٹ کی پشت پر باندھکر ڈال دیا، منزل پر پہونچکر کھولا تو اسکی پشت میں کجی آگئی تھی اس لئے اس کا نام اعوج (خمیدہ پشت) قرار پایا، اور یہ کجی اسکی نسل میں باقی رہی اور اس نسل کے تمام گھوڑے اعوجیات کہلائے۔

عہد اسلام میں جہاد اور غزوات کی وجہ سے گھوڑا بہت عزیز تھا، اور اس کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ خدا نے قرآن میں اسکی قسم کھائی تھی۔ اور احادیث نبوی بھی متعدد ہیں۔ گھوڑوں کی طرح اونٹوں کا پالنا اور اُن کی تعداد کا بڑھانا بھی فخر کی بات تھی چنانچہ لغت عرب میں اونٹ کے لئے دو ہزار لفظ ہیں، اور ایک ظریف کا قول ہے کہ "اگر تم سے کسی لفظ کے معنی دریافت کئے جائیں اور تم نہ جانتے ہو تو بلا تکلف کہہ دو کہ یہ لفظ اونٹ کے معنی میں ہے۔" یہ مضمون بھی طوالت میں اونٹ کے قد و قامت سے کم نہیں ہے لہذا تفصیل کی ضرورت نہیں قصائد سبعہ معلقہ میں طرفہ وغیرہ کے اشعار ملاحظہ ہوں جس میں اونٹ اور اونٹنیوں کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، ہم صرف ایک شعر لکھتے ہیں جو کسی عاشق مزاج شاعر کا ہے:۔

واحبّها وتحبّنی   وتحبّ ناقتها بعیری

اور میں اُسے چاہتا ہوں اور وہ مجھے چاہتی ہے   اور اُسکی اونٹنی میرے اونٹ کو پیار کرتی ہے

اس جسمانی ساخت پر اونٹنی کی عشق بازی اور بقول شخصے اونٹ کا یہ شتر غمزہ بھی حیرت انگیز ہے۔

۵۔ قتل و غارت | شجاعت و بہادری کی بنیاد پر قتل و غارت کا بھی پیشہ میں شمار تھا اور قدیم عرب اسکو حلال کی کمائی سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اپنے عزیزوں کو لوٹنا اور قتل کر دینا بھی عیب میں داخل نہ سمجھتے تھے اور یہ وصف ان میں عہد عاد (تاریخی دور سے قبل) سے تھا، چنانچہ کسی شاعر کا قول ہے:۔

۱۔ من عهد عادٍ کان معروفاً لنا   اَسرُ الملوک وقتلها وقتالها

قدیم ترین زمانہ سے شاہوں کو قید و قتل کرنا اور اُن سے لڑنا ہماری عادت ہے۔

۲۔ واحیاناً علی بکرٍ اخینا   اذا مالم نجد الّا اخانا

اور ہم (قتل و غارت کے ایسے خوگر ہیں کہ اگر مشق غارت گری کے لئے ہم کو کوئی اور نہیں ملتا) تو بسا اوقات ہم قبیلۂ بکر کو لوٹ لیتے ہیں جو ہمارے ہی بھائی ہیں۔

حماسہ میں ایسے پُر فخر اشعار بکثرت ہیں۔ لوٹ کے مال میں رہزنوں کو کمتر اونٹ اور اکثر بکریاں ملتی تھیں، اور عربی میں بکری کو غنم کہتے ہیں چنانچہ اسی لفظ سے غنیمت نکلا ہے جس کے معنی ہیں لوٹ کا مال

۶۔ اسیران جنگ کی تحقیر | عرب جب اپنے دشمن کو گرفتار کرتے تھے تو فوراً قتل کر دیتے تھے یا ناک اور کان

کاٹ کر چھوڑ دیتے تھے، اور کبھی صرف دانت توڑ ڈالتے یا پیشانی کے بال تراش کر رکھ لیتے یا غلام بنا کر بیچ ڈالتے تھے۔ اگر کوئی بڑا آدمی گرفتار ہوتا تو اظہار احسان کے لئے رہا بھی کر دیتے تھے اور ان امور پر فخر کرتے تھے۔ اشعار ذیل ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ وفککنا غلّ امرء القیس عنه   بعد ما طال حبسه والعناءُ

جب امرؤ القیس کی قید کی میعاد اور تکلیف بڑھ گئی تو ہم نے اس کی بیڑیاں کاٹ دیں۔

۲۔ فابوا بالنهاب وَ بالسبایا   وابنا بالملوك مُصفّدِ ینا

(سبعہ معلقہ)

عوام تو مال غنیمت اور قیدیوں کو لیکر پلٹے مگر ہم بادشاہوں کو ہتکڑیاں پہنا کر لائے۔

اور جس قدر عورتیں گرفتار ہو کر آتی تھیں اُن کو لونڈیاں بنا لیتے تھے۔

۷۔ قصاص و دیّت | قتل و غارت کی عادت نے عربوں کو سفاک بنا دیا تھا، اس لئے وہ انتقام کے بڑے شائق تھے۔ دادا کے خون کا بدلہ لینا پوتے پر فرض تھا، اور یہ ایسی پیاس تھی جو صرف خون سے بجھتی تھی۔ قصاص کے بعد خاندانی جھگڑوں کا تصفیہ ہو جاتا تھا، اور کبھی قصاص کے بعد بھی نئے فتنے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے اور برسوں لڑائیاں جاری رہتی تھیں، جس طرح کُلیب کے قتل کے بعد قبیلہ بکر و تغلب میں پینتالیس[۴۵] سال تک جنگ ہوتی رہی۔ بنیاد اس لڑائی کی یہ تھی کہ سعد بن شمس کی اونٹنی ایک دن کلیب کی چراگاہ میں چر رہی تھی یہ امر کلیب کو ناگوار معلوم ہوا اور اُس نے اونٹنی کے تھنوں میں تیر مارا اونٹنی زخمی ہو کر بلبلاتی ہوئی سعد کے گھر پہونچی۔ جب سعد کی پڑوسن بسوس نے اونٹنی کی یہ حالت دیکھی تو وہ بے اختیار چلائی اور چند اشعار برجستہ پڑھے جس کے سنتے ہی لوگ کلیب کے قتل پر آمادہ ہو گئے اور دوسرے ہی دن کلیب قتل ہو گیا چنانچہ اس سبب سے قبیلہ بکر و تغلب میں یہ لڑائی شروع ہوئی اور ۴۹۰ء سے ۵۳۵ء تک جاری رہی جس میں ستر ہزار آدمی مارے گئے۔ ایام العرب میں یہ لڑائی حرب بسوس کے نام سے مشہور ہے۔ خواجہ حالی مسدس میں لکھتے ہیں:۔

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی   صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی

قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی   تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی

نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ

کرشمہ اِک اُن کی جہالت کا تھا وہ

قصاص کے عوض دیّت (خون بہا) لینا باعث ننگ و عار تھا، چنانچہ شعرائے جاہلیت کا یہ ایک معرکۃ الآرا مضمون ہے، مثلاً:۔

لکن ابی قوم اصیب اخوهم رضا العار فاختاروا علی اللبن الدماء

ہم نے اس قوم کے پاس جن کا بھائی مارا گیا تھا خون بہا بھیجا لیکن انھوں نے عار کے پسند سے انکار کیا اور دیت کے اونٹوں پر قصاص کو ترجیح دی۔

اس شعر میں لبن (دودھ) سے اونٹ مراد ہیں، عربوں میں اللبن اللبن کے نعرہ سے بھی دیت مراد ہوتی تھی۔

اِس صفت میں مردوں سے زیادہ عورتیں سخت تھیں۔ چنانچہ ایک عورت کا بھائی قتل ہوا جب اس کو معلوم ہوا کہ مقتول کا ایک بھائی (عمرو) دیت لیکر صلح پر آمادہ ہے تو اس نے اپنے بیٹے کو قصاص پر مجبور کیا، کہتی ہے:۔

۱۔ ودع عنک عمروا، ان عمروا مسالم وهل بطن عمروا، غیر شبر لمطعم

عمرو کا ذکر نہ کرو، کیونکہ وہ تو صلح پر آمادہ ہے۔ عمرو کا پیٹ تو ایک بالشت کا ہے مگر پھر بھی نہیں بھرتا۔

۲۔ فان انتم لم تثاروا وتدیتم فمشوا باذان النعام المصلم (حماسہ)

پس اگر تم خون کا بدلہ نہیں لیتے ہو، بلکہ خون بہا لیتے ہو تو جاؤ اور گوش بریدہ شتر مرغ کی طرح ذلت وخواری سے مارے پھرو

یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں

۱۔ قتلنا بقتلانا من القوم عصبۃ کراما ولم ناکل بهم حشف النخل

اپنے مقتولوں کے بدلے ہم نے فریق مخالف کے بہترین لوگ مار ڈالے، اور اُن کے عوض ہم نے ناقص کھجوریں نہیں کھائیں۔ (خون بہا نہیں لیا بلکہ قصاص لیا)

۲۔ فلا تاخذوا عقلا من القوم اننی اری العار یبقی والمعاقل تذهب

وصیت کرتا ہے کہ "اگر وہ مجھے مار ڈالیں تو دیت نہ لینا کیونکہ عار باقی رہتا ہے اور دیت کا مال صرف ہو جاتا ہے۔

یہ بھی دستور تھا کہ جب تک قصاص نہ لے لیتے شراب پینا، نہانا، عطر لگانا، اور عیش وعشرت کے کام حرام تھے، تأبط شرا اپنے بھانجہ کے مرثیہ میں کہتا ہے:۔

حلت الخمر وکانت حراما وبلای ما المت تحل (حماسہ باب المراثی)

جب ہذیل سے میں نے انتقام لے لیا تو شراب جو مجھ پر حرام تھی وہ حلال ہوگئی اور مدت دراز کے بعد وہ حلال ہو کر میرے پاس آئی ہے۔

یہ بھی دستور تھا کہ اگر قاتل کا پتہ نہ چلتا تو جس قبیلہ پر شبہ ہوتا اُس کے پچاس معزز اصحاب فرداً فرداً

اپنی بے گناہی پر قسم کھاتے تھے اور اسی پر فیصلہ ہو جاتا تھا۔ سرداروں کی دیت میں ایکسو اونٹ لئے جاتے تھے۔
قصاص اور دیت کے معاملہ میں ان کی یہ بھی عادت تھی کہ وہ آسمان کی طرف ایک تیر چلاتے تھے، اگر وہ تیر خون آلود ہو کر گرتا (غالباً کسی پرندہ کے خون سے رنگین ہو جاتا ہوگا) تو پھر قود (قاتل کا قتل) کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ اور اگر تیر بے داغ ہوتا تو اس کو اپنی داڑھی سے صاف کر کے دیت پر صلح کر لیتے تھے اور یہ صلح کی علامت تھی اور اس عمل کو عقیقہ کہتے تھے اور یہ تیر سہم الاعتذار کہلاتا تھا۔
کسی شاعر کا قول ہے:-

عقوا لهم ثم قالوا صالحوا   یا لیتنی فی القوم اذا مسحوا اللحی

تیر سے عقیقہ کرتے تھے، پھر کہتے تھے کہ آؤ صلح کر لیں، کاش! میں قوم میں اس وقت ہوتا جبکہ داڑھیوں سے تیر کو صاف کرتے تھے۔

جب تک مقتول کا خون بلا بدل رہتا اور صلح نہ ہو جاتی اس وقت تک مقتول کے گھوڑے کی پیشانی اور دُم کے بال امتیاز کے طور پر کترے رہتے تھے۔ اگر قاتل گمنام ہوتا اور قتل کا الزام کسی شخص پر لگایا جاتا تو یہ شخص لوہے کے گرم ٹکڑہ کو زبان سے چاٹتا، اگر زبان نہ جلتی تو جرم سے بری کر دیا جاتا اور مدعی اس کو ایک اونٹ نذر کرتا (یہ غلط الزام کا جرمانہ تھا) بعض اوقات اہل کرم اپنی فیاضی سے دیت کو واپس کر دیتے تھے، اس سے خاندان کی شہرت ہوتی تھی۔

اگر کسی معزز قبیلہ کا غلام قتل ہوتا تو اس کے عوض آزاد کو قتل کرتے تھے، اور عورت کے بدلہ میں مرد کو اور ایک مرد کے عوض دو مرد قتل کئے جاتے تھے۔ لیکن اسلام نے ان کے اس فخر کو مٹا کر مساوات قائم کی اور حکم دیا کہ "الحُرُّ بالحرِّ والعبدُ بالعبدِ" یعنی آزاد کے عوض صرف آزاد اور غلام کے بدلے صرف غلام ہی قتل کیا جائیگا۔" اور قصاص و دیت کے قواعد مقرر کر دیئے جس کی تفصیل کتب فقہ میں ہے۔

۸۔ **دشمنی اور محبت** | عہد جاہلیت میں جس طرح عرب دوستی اور محبت میں راسخ الخیال تھے، اسی قدر دشمنی میں بھی سخت تھے۔ اور صدیوں تک عداوت نہیں جاتی تھی۔ ہر فرد دشمن سے بدلہ لینے میں دلیر تھا اور قصور کا معاف کرنا معیوب تھا۔ شعراء جب کسی بات پر ناراض ہو جاتے تھے تو اپنے ہی قبیلہ کی ہجو لکھ ڈالتے تھے۔ یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ قبیلہ بنی ذہل میں ایک شخص کے تیس[۳۰] اونٹ بنی لقیط ہانک لے گئے، اس نے اپنے قبیلہ والوں سے مدد مانگی لیکن کسی نے اعانت نہ کی، مجبور ہو کر اس نے بنی مازن سے فریاد کی، تو انھوں نے بجائے تیس[۳۰] اونٹوں کے سو اونٹ بنی لقیط کے گرفتا

۶۔ حفرۃ ۔ زمین دوز پارچہ۔ یہ شہر کے واسطے مخصوص تھا۔

۷۔ تلبید ۔ شکار کے لئے زمین پر لیٹ کر چلنا۔

۸۔ اخفاق۔ شکار سے ناکام واپس آنا۔

حلال اور حرام جانوروں میں کوئی تفریق نہ تھی، باستثنائے حرم کعبہ ہر وادی اور جنگل میں شکار کھیلتے تھے۔ فارسی علم ادب میں بھی اشارات موجود ہیں۔

تو اے کبوتر بام حرم چہ میدانی | تپیدن دل مرغان رشتہ بر پارا

عرب میں چیتے کا شکار سب سے پہلے کلیب بن وائل نے کیا۔ شکار میں گھوڑوں کے ساتھ کتے بھی دوڑائے جاتے تھے اور ان کو شکار کی تعلیم دیجاتی تھی۔ لبید بن ربیعہ کہتا ہے:۔

حتی اذا یئس الرماۃ وارسلوا | غضفاً دواجن قافلاً اعصامھا

جب تیرانداز اس گائے کے شکار سے ناامید ہوگئے تو انھوں نے اس پر شکاری کتے دوڑائے جن کے کان لٹکے ہوئے تھے اور کمر پتلی تھی۔

۱۲۔ قمار بازی اخلاقاً جو افعال مذموم ہیں دولتمندی میں وہی مستحسن ہوجاتے ہیں جیسے میخواری اور قمار بازی، چنانچہ جاہلیت میں بھی یہ دونوں شغل باعث فخر تھے، کیونکہ مفلس نہ شراب پی سکتا ہے نہ جوا کھیل سکتا ہے۔ عرب کی شاعری ان امور کی طرف اشارہ کرتی ہے:۔

نحابی بھا اکفائنا ونھینا | ونشرب فی اثمانھا ونقامر

ہم اپنے ہم پلہ اصحاب اور مہمانوں کے لئے اونٹوں کی بخشش کرتے ہیں (ذبح کرتے ہیں) اور ان کی قیمت سے شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں۔

عرب کے مختلف مقامات میں قمار بازی کے پھڑ قائم تھے جہاں مشہور جواری جمع ہوکر کھیلتے تھے، اور کھیل کے پانسوں کو ازلام (بے پر کے تیر) اور مغالق (شئے خطرناک) کہتے تھے۔ پانسے شمار میں دس تھے، ترتیب وار ان کے نام یہ ہیں:۔

فذ، توأم، رقیب، نافس، حلس، مسبل، معلی، فسیح، منیح، وغد۔

ایک نمبر سے سات تک حصے مقرر تھے جو ایک سے شروع ہوکر سات پر ختم ہوجاتے تھے، اور بقیہ تین کے حصے مقرر نہ تھے۔ ہر پانسہ پر اس کا نام لکھا ہوتا تھا، اور ایک تھیلی میں رکھے جاتے تھے اور اس کا ایک امین ہوتا تھا جو کھیل کے وقت پانسے دیتا تھا۔

قمار بازی وسیع پیمانہ پر ہوتی تھی اور کھیل کے متعدد طریقے تھے جس کی تفصیل بیکار ہے۔ نقصان بڑ

اور ابن مقبل عرب کے تاریخی جواری تھے۔ جوئے کے پانسوں سے فال بھی کھولتے تھے، اس وقت ان کا نام ازلام استخارہ تھا۔ فال کے لئے صرف تین تیر مخصوص تھے۔ ڈو پر یہ عبارت ہوتی تھی امرنی ربی (میرے خدا نے مجھ کو حکم دیا) و نہانی ربی (میرے خدا نے مجھ کو منع کیا) تیسرا تیر سادہ تھا۔ فال کے وقت یہ تیر ایک تھیلی میں ڈال دیے جاتے تھے، اور جو تیر نکلتا (امر یا نہی) اس کے مطابق کام کرتے تھے اور جب سادہ تیر نکلتا تو دوبارہ فال نکالی جاتی۔ خانۂ کعبہ میں جہاں سب سے بڑا دیوتا ہبل (بت) رکھا ہوا تھا اسی جگہ بیٹھکر فال کھولتے تھے۔

۱۳۔ مے نوشی شراب گویا عربوں کی گھٹی میں پڑی تھی اور امراء کے لئے مے نوشی مایۂ فخر تھی، خود پیتے تھے اور عورتوں کو بھی پینے پر مجبور کرتے تھے۔ شراب کی سیکڑوں قسمیں تھیں اور ایک ہزار نام ہیں چنانچہ شعرائے جاہلیت کے کلام میں تقریباً ۱۲۵ شرابوں کے نام آئے ہیں۔

انگور، کشمش، چھوہارے، سرکہ، چاول، جو، شہد اور گیہوں سے بکثرت شراب تیار کی جاتی تھی اور شراب[1] میں شہد ملا کر پیا کرتے تھے۔

فنازعني انه جاجته بعد وهن   مزجت لهم بها عسلاً وراحاً

اس نے کچھ وقفہ سے جام شراب پر چھین جھپٹ کی اور میں نے ان کے لئے شراب میں شہد ملا دیا تھا۔

امیروں کی بزم طرب میں ساقی کی خدمت کنیزیں انجام دیتی تھیں اور اس وقت وہ رنگین لباس میں ملبوس ہوتی تھیں۔ یہ فخریہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ندامای بیضٌ کالنجوم وقینةٌ   تروح الینا بین بُردٍ ومُجسَدِ

میرے ہم نشین ستاروں کی طرح روشن چہرہ ہیں اور ایک گانیوالی چھوکری دھاریدار اور زعفرانی لباس پہنکر سر شام ہمارے پاس حاضر ہوتی ہے۔

۲۔ وان تبلغني في حلقة القوم تلقني   وان تقتنصني في الحوانيت تصطد (سبعہ معلقہ)

اگر تو مجھے شرفا میں تلاش کریگا تو وہاں پائیگا اور اگر تو مجھے کلواروں کی دوکان پر شکار کرنا چاہیے گا تو شکار کرے گا۔

شراب کی دوکانوں پر جھنڈے لہرایا کرتے تھے، اور یہی امتیاز کسبیوں کو بھی حاصل تھا چنانچہ انکا لقب صاحب[2] الرایات تھا، اور شراب خانے غایۃ کہلاتے تھے۔

---

[1] اسد اللہ خاں میرزا غالب دہلوی شراب میں گلاب ملایا کرتے تھے۔ شیفتہ نے ایک غزل میں یہی اشارہ کیا ہے۔
"آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را"

قدابتُ سامرِها وغایتہ تاجر   وافیتَ اذ رعفت وعز مدا۱ کھا (لبید بن)

الیسی راتوں میں مَیں اپنے احباب کا قصہ گو رہا اور کلواروں کی دوکان پر پہنچا جبکہ جھنڈا بلند تھا اور کثرت خریداری سے شراب کا نرخ گراں ہوگیا تھا۔

اس عہد کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ کعبہ کے کلید بردار ابو غبشان نے ایک مشک شراب پر کنجیاں بیچ ڈالی تھیں، اور تمام عمر کے لئے اس حق سے محروم ہوگیا تھا۔ (عہد جاہلیت میں بھی کعبہ مقدس عبادت خانہ تھا لیکن طریق عبادت میں فرق تھا۔) شعرائے جاہلیت کے کلام میں شراب کی مدح میں ہزاروں اشعار ہیں اور اُن کے جذبات جداگانہ ہیں۔

عہد رسالت میں شراب حرام ہو چکی تھی، لیکن عہد فاروقی (خلافت دوم) تک لوگ چوری چھپے سے شراب پیا کرتے تھے سلاھ کا واقعہ ہے کہ قادسیہ میں ایرانیوں سے جنگ ہو رہی ہے، اور مسلمانوں کا نامور سردار ابو محجن ثقفی یہ ترانہ گا رہا ہے، چنانچہ اسی جرم میں گرفتار ہوتا ہے اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی جاتی ہیں[1]، جذبات ملاحظہ ہوں

اذامت فادفنی الی اصل کرمتہ   تروی عظامی بعد موتی عروقھا

جب میرا دم نکل جائے تو مجھے انگوروں کے نیچے دفن کرنا، تاکہ انگور کی جڑیں میری ہڈیوں کو موت کے بعد تر و تازہ کرتی رہیں۔

۲- ولا تدفنی بالفلاۃ فاننی   اخاف اذا مامت ان لا اذوقھا

مجھے کسی جنگل میں دفن نہ کرنا کیونکہ اس حالت میں مجھے خوف ہے کہ میں عرق انگور سے محروم رہونگا۔

عہد اسلام میں یزید بن معاویہ اور ابو نواس شراب کی مداحی میں ضرب المثل ہیں، اور فارسی علم ادب میں رضی دانش کا یہ شعر لاجواب ہے۔

تاک را سیراب دار اے ابر نیساں در بہار   قطرۂ تا مے تواند شد چرا گوہر شود

ان کے مقابلہ میں ہندوستان کے ایک رند شرابی کی محویت بھی قابل دید ہے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے   رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

شراب نوشی کے لوازمات میں کانچ کی صراحیاں اور پیالے موجود تھے۔ عنترہ کہتا ہے:۔

بزجاجۃٍ صفراء ذات اسرّۃٍ   قُرِنَتْ بازھر فی الشمال مُفدّمِ

کانچ کی زرد دھاریدار پیالی میں مَیں نے شراب پی، یہ میرے دائیں ہاتھ میں تھی اور میرے بائیں ہاتھ میں

---

[1] تجارب الامم مسکویہ مطبوعہ یورپ۔

سفید جھاگ تھی جس کے موُنھ پر کپڑا پڑا ہوا تھا۔

ہر وقت کی شراب نوشی کے لئے جداگانہ الفاظ ہیں، مثلاً صبوح (صبح کی شراب) غبوق (شام کی شراب) اور قیل (دوپہر کی شراب) اسی طرح اس انگور کی جبنی کی کنیتیں بھی متعدد ہیں، مثلاً ام عنا، ام زنبق، ام لیلیٰ، ام الخبائث، ام الدھر، بنت العنب (دخت رز) اخت المرۃ۔ خلفائے عباسیہ کے دور میں نبیذ (کھجور کی تاڑی) جاری تھی جس کی حلت کا علماء نے فتویٰ دے دیا تھا، اس کے پینے سے ہلکا سا سرور ہو جاتا تھا۔

۱۴۔ وفاداری وصفت امانت اگر یہ مقولہ سچا ہے کہ "وفاداری بشکلِ استواری عین ایمان ہے" تو عرب اقوام عالم میں سب سے زیادہ اس کے مصداق تھے۔ چھوٹے درجہ کے آدمی بڑے درجہ والوں سے وفاداری کا عہد کیا کرتے ہیں لیکن عربوں کی وفاداری اپنے سے کمزور اور برابر والوں سے ہوتی تھی۔ اعراب اپنے ہمسایہ قبائل سے جو معاہدہ کرتے تھے اس کا ایفا لازم تھا، اور وعدہ کا پورا نہ کرنا ایک قومی جرم تھا۔

سموال بن عادیہ یمنی ایک عربی النسل یہودی تھا جو تیماء کے قلعہ ابلق میں رہا کرتا تھا، چنانچہ امرؤالقیس (مشہور شاعر) شاہ کندہ جب منذر شاہ حیرہ سے شکست کھا کر قیصر روم کے پاس جا رہا تھا تو اس نے اپنے خاندان کی مشہور تاریخی زرہیں سموال کے پاس رکھدیں اور کہا کہ روم سے واپسی کے بعد ان کو لے لونگا، لیکن اتفاق سے امرؤالقیس کا روم میں انتقال ہو گیا۔ جب حارث بن ابی شمر شاہ غسان کو امرؤالقیس کی موت کا حال معلوم ہوا تو اس نے سموال سے زرہیں طلب کیں، سموال نے شاہ سے کہلا بھیجا کہ زرہیں امانت ہیں وہ واپس نہیں ہو سکتی ہیں۔ اس جواب پر شاہ نے حارث بن ظالم کی قیادت میں قلعہ ابلق پر فوج کشی کر دی۔ غریب سموال ایک فرمانروا کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا لہذا قلعہ بند ہو گیا۔ اتفاق سے سموال کا بیٹا شکار کو گیا ہوا تھا جب شام کو وہ واپس آیا تو حارث نے اس کو گرفتار کر لیا اور سموال سے کہلا بھیجا کہ زرہیں دیدو ورنہ تمہارے بیٹے کو قتل کر دونگا، سموال نے جواب دیا کہ زرہیں امرؤالقیس کے ورثاء کے سوا کسی کو نہیں دیجائیں گی اور میرے بیٹے کے حق میں تم کو اختیار ہے چنانچہ حارث نے اس نوجوان کو قتل کر دیا اور محاصرہ چھوڑ کر چلا گیا اس واقعہ پر سموال نے یہ اشعار لکھے

وفیت بأذرع الکندی انی ۔۔۔ اذا ما ذم اقوام وفیت

کندی کے زرہوں کے معاملہ میں میں نے اپنا عہد پورا کیا۔ میں وہ ہوں کہ جب کوئی قوم میرے ذمہ کوئی خدمت سپرد کرتی ہے تو میں ایفائے عہد کرتا ہوں۔

واوصی عادیًا یومًا بان لا تھدم یا سموال ما بنیت

ایک دن میرے باپ عادیہ نے مجھے وصیت کی کہ اے سموال جو عمارت میں نے قائم کی ہے اسکو منہدم نہ کرنا

سموال کے علاوہ عرب میں عوف بن معلم اور اس کی بیٹی جماعہ اور آم جمیل (از خاندان ابو ہریرہ) ابو حنبل طائی حرث بن عباد وغیرہ ایفاے عہد میں مشہور ہیں۔

۱۵۔ مہمان نوازی ۔ عرب مہمان نوازی میں ضرب المثل ہیں، ایک غریب عرب بھی اپنے ہمعصر سے بڑھ جانے کی کوشش کرتا تھا۔ دولتمند اندھیری راتوں میں ٹیلوں اور پہاڑیوں پر آگ جلاتے تھے کہ بھولے بھٹکے مسافر اس روشنی پر آئیں اور میزبان کے خوان نعمت سے سیر ہوں، اس بنا پر آگ کا ایک نام نار القری (مہمانی کی آگ) بھی ہے۔ سموال یہودی فخریہ کہتا ہے۔

وما اخمدت نارٌ لنا دون طارقٍ ولا ذمّنا فی النازلین نزیلُ

آنیوالے مہمان سے قبل کبھی ہماری آگ نہیں بجھائی گئی اور مہمانوں میں سے کبھی کسی نے ہمکو برا نہیں کہا

عربوں میں جو یہ رسم تھی کہ گھر سے نکل کر راستہ میں آگ جلاتے تھے۔ یہ بھی اسی فیاضی کی یادگار ہے اور مبارک فال تھی کہ سفر سے جلد آنا نصیب ہو بعض سردار اس قدر فیاض تھے کہ غلاموں کے آگ جلانے سے جب کوئی مہمان آجاتا تو اس خوشی میں غلام کو آزاد کر دیتے تھے۔

حاتم طائی کا قول ہے۔

اوقد! فان اللیل، لیل قرٌّ عسی یری نارک من یمرٌّ

ان جلبت ضیفاً فانت حر

او غلام! آگ جلا، کیونکہ جاڑے کی رات ہے، شاید کہ تیری آگ کو راستہ چلنے والے دیکھ سکیں۔ اس ذریعہ سے کسی مہمان کے بلانے میں اگر تو کامیاب ہوگیا تو آزاد ہے۔

اگر انتہائی سردی ہوتی اور آگ نہ سلگتی تو یہ فیاض عرب کتوں کو خیموں سے باندھ دیا کرتے تھے وہ جاڑے سے مجبور ہوکر چیختے تھے جن کی آواز پر مسافر آجاتے تھے۔ اسی بنا پر ادب عربی میں کتے کو داعی الضمیر (مسافر کو بلانے والا) بھی کہتے ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ مسافر بھی کتوں کی آواز سنکر نقلی آواز میں کتوں کی بولیاں بولتے تھے۔ اس بھیانک آواز سے کتے اور زیادہ شور مچاتے تھے اور مسافر خیمہ تک آسانی سے پہونچ جاتے تھے چنانچہ لغت عربی میں استنباح کے بھی معنی ہیں۔ کسی جاہلی شاعر کا قول ہے

ومستنبح بات الصدی یستتھہ الی کل صوتٍ فھو فی الرحل جانح

اکثر کتوں کے بھونکانیوالے مسافر نے رات بسر کی۔ اور کتوں کی ہر آواز نے اسکو حیران کر دیا تھا

اور وہ میرے قیام گاہ کی جانب مائل تھا۔

ایک عرب اپنی بی بی کو مخاطب کرکے کہتا ہے

یا ربۃ الدار قومی اغیر صاغرۃ　　　ضمی الیک رحال القوم والقربا

اے میرے گھر کی مالکہ! اُٹھ اس حال میں کہ تو میرے مہمانوں کی عزت کرنیوالی ہے اور ان کے کجاوے اور اسلحہ حفاظت سے رکھ۔

کھانے کے وقت مہمان سے گپ شپ کرنے کا بھی دستور تھا کہ وہ اطمینان سے کھانا کھائے۔ مہمان سے پہلے میزبان خواب گاہ کے ڈیرے میں نہیں جاتا تھا۔ اور مہمان کے سامنے مصائب کا تذکرہ کرنا بھی معیوب تھا، مہمان کے سامان اسلحہ اور جوتہ کی حفاظت میزبان پر فرض تھی۔ مہمانداری میں اعراب (بدوی) حضریوں (شہری) سے زیادہ فیاض تھے۔ جب کوئی مسافر اُن کے ڈیرے میں جا نکلتا تو اس کو لوٹتے نہیں تھے بلکہ بڑے احترام سے اس کا خیر مقدم کرتے تھے۔ ایک وقت بھی اگر مہمان نے کھانا کھالیا تو پھر وہ میزبان کی حمایت میں آجاتا تھا

۱۶۔ فیاضی | سخاوت اور فیاضی بڑی صفت تھی اور بخیل ہونا عیب تھا

فنحن کماء المزن ما فی نصابنا　　　کھام ولا فینا یعد بخیل

آب باراں کی طرح ہم آمیزش سے پاک ہیں اور ہماری نسل میں کوئی کند ذہن اور بخیل نہیں ہے۔

امرائے عرب میں حاتم طائی کے افسانے آج تک مشہور ہیں، حاتم کی بچپن سے یہ عادت تھی کہ وہ کبھی تنہا کھانا نہیں کھاتا تھا۔ حاتم کے باپ کو یہ معمولی فیاضی بھی ناگوار تھی اس لئے ایک لونڈی اور ایک گھوڑا دیکر حکم دیا کہ چراگاہ میں اونٹ چرایا کرے اور وہیں رہے۔ حاتم جنگل میں بھی مہمان تلاش کرلیتا تھا۔ ایک دن تین سوار نظر آئے اتفاق سے یہ تینوں عرب کے مشہور شاعر تھے اور شاہ نعمان (حیرہ) کے دربار میں جارہے تھے۔ حاتم اُن کو اپنے خیمہ میں لایا۔ اور رات کے کھانے کے لئے تین اونٹ ذبح کرڈالے۔ ایک مہمان نے کہا کہ ہم سب کے لئے ایک چھوٹی اونٹنی کافی تھی۔ حاتم نے کہا کہ یہ تو میں بھی جانتا تھا لیکن آپ کے لباس اور چہروں سے ظاہر ہے کہ آپ اعلیٰ طبقہ کے اصحاب ہیں، اس لئے تین اونٹ ذبح کئے گئے تاکہ آپ کو بھی یہ دعوت یاد رہے۔

مہمانوں نے اپنے معزز میزبان کا شکریہ ادا کیا اور تمام رات حاتم کے خیمہ میں آرام کیا، چونکہ یہ تینوں شاعر تھے اُنھوں نے حاتم کی مدح میں قصائد پڑھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حاتم کی شاعروں نے مداحی کی تھی۔ جب مہمان رخصت ہونے لگے تو حاتم نے ہر ایک کو ننانوے اونٹ انعام میں دیلے اور چراگاہ

اونٹوں سے خالی ہوگئی، یہ حاتم کی پہلی فیاضی تھی، اور یہ مہمان نابغہ ذبیانی، بشیر بن ابی حازم اور عابد الابرص مشہور شاعر تھے۔ اس فیاضی کے بعد حاتم گھر آیا۔ لونڈی نے اس کے باپ سے یہ قصہ بیان کیا تو اس نے سر پیٹ لیا اور حاتم سے کہا کہ یہ تو نے کیا کیا؟ حاتم بولا، بابا جان ! میں نے خاندان کی عزت کے لئے یہ کام کیا ہے، جو قمری کے طوق کی طرح ہمیشہ یادگار رہیگا، اور یہ شاعر آپ کی تعریف کے ہر جگہ گیت گاتے رہیں گے۔"

اس جرم پر حاتم کے باپ نے اس کو گھر سے نکال دیا، جب حاتم معاش سے مجبور ہوا تو رہزنی اختیار کی اور کچھ ہی دنوں میں امیر بن گیا۔ جس قدر مال غنیمت میں آتا وہ سب لٹا دیا کرتا تھا۔ جب حاتم کی بی بی ماویہ کو اس کی فیاضیوں سے تکلیف ہوئی تو اس نے قطع تعلق کر لیا۔ حاتم کی سب سے بڑی فیاضی یہ ہے کہ قحط کے موقع پر اس نے اپنی سواری کا قیمتی گھوڑا ذبح کر کے مہمانوں کو کھلا دیا، حالانکہ یہ گھوڑا اسکی معاش کا ذریعہ تھا۔

اونٹ کا دینا سب سے بڑی فیاضی تھی۔ چنانچہ بنی امیہ کے ابتدائی زمانہ میں انعامات میں بجائے نقدی کے اونٹ ہی دیے جاتے تھے۔ اور ان کے کوہان پر شتر مرغ کے پر لگا دیتے تھے، یہ اس امر کی دلیل تھی کہ اب اونٹوں پر سے شاہی قبضہ اٹھ گیا اور وہ غیر کے ملک ہوگئے۔

حاتم کی مدح میں سیکڑوں اشعار ہیں۔

یعیش الندی ما عاش حاتم طی   وان مات قامت للسخاء ماتم

حاتم کے دم سے سخاوت زندہ ہے اور جب وہ مر جائیگا تو سخاوت پر ماتم کئے جائیں گے۔

عربوں کا دستور تھا کہ جب ایسے فیاضوں کی قبر سے گزرتے تو احتراماً ان کی قبر پر اونٹ کی قربانی کرتے تھے جاہلیت کے مہمان نواز فیاض تین شخص ضرب المثل ہیں، حاتم طائی، کعب بن مامہ اور ہرم بن سنان۔

۱۷۔ اعانت مظلوم | اہل عرب پڑوسیوں کی حمایت اور مظلوموں کی اعانت کو بھی فرض سمجھتے تھے طرفہ نے اس مضمون کو خوب ادا کیا ہے۔

اذا القوم قالوا من فتی خلت انّنی   عُنیتُ فلم اکسل ولم ابتلّد

جب قوم یہ نعرہ لگائے کہ کون جواں مرد ہے (جو دشمنوں سے بچائے) تو میں خیال کرتا ہوں کہ قوم کا روئے سخن میری جانب ہے اس وقت نہ میں کاہلی کرتا ہوں اور نہ انکی مصیبت دور کرنے میں حیران ہوتا ہوں۔

جن قبائل میں محالفہ (باہمی اعانت کا قول و قرار) ہوتا انکی مدد کرنا حلیف پر فرض تھی۔

۱۸۔ رقص و سرود | عرب میں چاندنی راتوں میں یاران جلسہ جمع ہو کر قصے کہانیاں سنا کرتے تھے اور کنیزیں ناچ گا کر لطف صحبت کو بڑھاتی تھیں اور شراب کا دور بھی چلتا تھا۔ یہ فخریہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

افذالت کما ذالت ولیدۃ مجلس   تُری ربها اذیال سحل ممدّد (طرفہ)

وہ اونٹنی ایسے ناز و ادا سے چلی جیسے رقاصہ جھوکری بحالت رقص مجلس میں اپنے آقا کے سامنے لمبی سفید چادر کے دامن اُٹھا کر چلتی ہے۔

اُس عہد کی چادر کو زمانہ حال کی پیشواز سمجھنا چاہیے۔

۲- اذا نحن قلنا اسمعینا انبرت لنا   علی رسلها مطروفة لم تشدد

جب ہم نے اس سے گانے کی فرمائش کی تو وہ ایسی نزاکت اور شرمیلی ادا سے آئی کہ گویا اس کی آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے اور اس کے حرکات رقص میں کرختگی نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ شرمیلی اداؤں سے ناچتی گاتی ہے بھڑنگی نہیں ہے

۳- اذا رجّعت فی صوتها خلت صوتها   تجاوب اظارٍ علی رُبعٍ ردِ

جب وہ کٹکری بھرتی ہے تو اس کی آواز نرم اور غمناک ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ چند اونٹنیاں ہیں جو اپنے مرے ہوئے بچہ پر رو رہی ہیں (جو فصل بہار میں پیدا ہوا تھا)

اونٹنی کا نوحہ کیسا ہی دلکش ہو ہندی مذاق کے خلاف ہے، لیکن عرب جاہلیت کی شاعری میں یہ خوبی ہے کہ شاعر اُن چیزوں سے تشبیہ دیتا ہے جو اُس کے سامنے موجود ہوں اور خیالی تشبیہات سے گریز کرتا ہے۔

۱۹- واد البنات یا دختر کشی لغت عرب میں ولد کے زندہ دفن کرنے کو واد کہتے ہیں بعض قبائل عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینا بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی اور وہ ایسا کیوں کرتے تھے اس کے متعدد اسباب ہیں:-

(۱) بیٹوں کی محبت | عرب ایک جنگجو قوم تھی اس لئے خاندان میں بیٹوں کی کثرت باعث فخر تھی اور ان کے حق میں یہ بھی دعا کرتے تھے کہ وہ شاعر ہوں، کیونکہ شاعری کی بدولت قبیلہ اور خاندان کو بقائے دوام کی زندگی نصیب ہوتی تھی۔

(۲) قحط سالی | عرب میں اکثر قحط پڑا کرتے تھے اس لئے غریب آدمی کی نظر میں لڑکیوں کی کوئی قیمت نہ تھی، علاوہ بریں روزمرّہ کی تنگ دستی سے بھی مجبور ہو کر وہ لڑکیوں کو زندہ رکھنا نہیں چاہتے تھے جس کا اشارہ قرآن کی بھی ایک آیت میں موجود ہے۔

(۳) جنگ و جدال | میدان کارزار میں عورتیں گرفتار ہو جاتی تھیں اور لونڈیاں بنائی جاتی تھیں، جو خاندان کی دائمی ذلت کا باعث ہوتی تھیں، یہ خیال بھی دختر کشی کا موید تھا۔ اور بعض جاہل خسر اور سالہ بننے سے شرماتے تھے۔ بہر حال بعض قبائل عرب میں دس فیصدی لڑکیاں پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دی جاتی تھیں۔ اس رسم کا موجد قیس بن عاصم تمیمی تھا، اس نے دس سے زائد بیٹیاں

دفن کیں، اوراس کا سبب یہ ہے کہ جب قبیلہ بنی تمیم نے نعمان بن منذر شاہ حیرہ کو خراج دینے سے انکار کیا تو شاہی عامل قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو پکڑ لے گئے، اور جب قیدیوں کی واپسی ہوئی تو قیس کی ایک بیٹی نے گھر آنے سے انکار کر دیا، اور جو قید کر کے لے گیا تھا اس کے پاس رہ گئی۔ اس پر قیس نے قسم کھائی کہ وہ آئندہ کسی لڑکی کو زندہ نہیں رکھے گا۔ زبرقان نے بھی سات بیٹیاں دفن کیں، لیکن بعض رحم دل دختر کشی کے مخالف بھی تھے۔ چنانچہ فرزدق شاعر کا دادا صعصعہ بن ناجیہ ایک لڑکی کے فدیہ میں ایک اونٹ اور دو اونٹنیاں دیکر جان بچاتا تھا۔ اور اس انسانی ہمدردی کے صلہ میں اسکو محی الموؤدات کا خطاب دیا گیا تھا۔ نبی کریم کے دادا عبد المطلب بھی اس رسم کے مخالف تھے، کیونکہ مکہ میں بھی لڑکیاں زندہ دفن ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ جب عرب میں اسلام پھیلا اور یہ آیت نازل ہوئی وَاِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (اور جب زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائیگا کہ وہ کس گناہ میں قتل کی گئی تھی) تو تمام عرب سے دختر کشی کی رسم مفقود ہو گئی۔ تفسیر زمخشری اور رازی میں آیت مذکور کی تفسیر میں لکھا ہے کہ بعض چھ سالہ لڑکیاں بھی دفن ہوئی ہیں، اور کبھی یہ لڑکیاں پہاڑ کی چوٹی سے گرا دی جاتی تھیں، کبھی پانی میں غرق ہوتی تھیں اور بعض اوقات ذبح کر ڈالی جاتی تھیں۔"

ہندوستان کے ٹھاکروں میں بھی یہ رسم جاری تھی، اور قریب ہی زمانہ میں قانون کے ماتحت بند ہوئی ہے۔ یونان و روم میں بھی حکماء نے دختر کشی کو معیوب نہیں سمجھا، اور اگر انسانی مردم شماری کی کمی منظور ہو تو ان کے نزدیک اسقاط حمل جائز تھا۔

۲۔ خطابت و شاعری | مجمع عام میں تقریر کرنا، اور برجستہ شعر کہنا یہ دونوں وصف تمام اوصاف پر غالب تھے۔ دور تمدن میں علوم منطقیہ کے تحت میں جو علوم ایجاد ہوئے ہیں اُن میں خطابت بڑے فخر کی چیز ہے۔ لیکن عرب جاہلیت منطق سے واقف نہ تھے باوجود اس کے فنِ خطابت میں ان کا درجہ یونانیوں سے بڑھکر تھا۔ عہد جاہلیت کا سب سے نامور خطیب (الکچرار) قس بن ساعدہ تھا۔ جس نے سب سے پہلے بلند مقام پر کھڑے ہو کر اور ہاتھ میں تلوار لیکر خطبہ دیا اور اما بعد کا استعمال کیا۔ قس کے بعد سحبان وائل کا درجہ ہے۔ اس کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ دوران تقریر میں جو لفظ ایک مرتبہ کہہ جاتا تھا پھر اس کا اعادہ نہیں کرتا تھا، اسی بنا پر عربی میں یہ مثل ہے کہ "اخطب من سحبان" یعنی سحبان سے زیادہ خطیب۔ مردوں کے علاوہ عرب میں عورتیں بھی بڑی فصیح البیان گزری ہیں جس کی تفصیلی تاریخ اور ادب کی کتابوں میں ہے۔

شاعری | جاہلیت میں بلا مبالغہ ہر شخص برجستہ شعر کہنے پر قادر تھا۔ اور محض اس غرور کی وجہ سے اپنے

مقابلہ میں وہ ساری دنیا کو عجم (یعنی گونگا) کہتے تھے۔ اس عہد تک وہ علم عروض وقافیہ سے محض ناواقف تھے۔ اور یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ عہد اسلام میں جب علم عروض کی بنیاد پڑی تو شعرائے جاہلیت کے کلام سے مشہور بحریں اخذ کی گئیں۔ عرب میں سب سے اول قبیلہ قیس میں شاعری کا آغاز ہوا۔ عرب کی شاعری چار طبقات پر تقسیم ہے۔

۱۔ جاہلی۔ اس طبقہ میں وہ تمام شاعر داخل ہیں جو اسلام سے پہلے ہوئے اور اسلام سے قبل فوت ہو گئے۔ اور وہ شاعر بھی جاہلی کہلاتے ہیں جو عہد اسلام تک زندہ رہے لیکن انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔

۲۔ مخضرمی۔ یہ وہ شاعر ہیں جو عہد اسلام میں تھے اور جنھوں نے اسلام کو قبول کیا، چنانچہ دولت اُمیّہ اور عباسیہ میں جو شاعر تھے وہ مخضر الدولتین کہلاتے تھے۔ جس اونٹنی کا آدھا کان کٹا ہو وہ مخضرمہ کہلاتی تھی چنانچہ اسی سے یہ اصطلاح قائم ہوئی۔

۳۔ مولّدین۔ دوسری صدی ہجری کے خاتمہ تک جس قدر شعرا ہوئے وہ مولّدین کہلاتے تھے۔

۴۔ محدثین۔ تیسری صدی ہجری (مطابق نویں صدی عیسوی) کے آغاز سے جس قدر نئے شاعر پیدا ہوئے وہ سب محدثین ہیں۔

شعرائے مولّدین سے اخیر زمانہ تک جس قدر شاعر ہوئے یہ وہ ہیں جن میں شعر گوئی کا اصلی جوہر نہ تھا بلکہ آلہ صناعت یعنی عروض وقافیہ وبیان وبلاغت کی مدد سے شعر کہتے تھے، لہذا شعرائے جاہلیت سے یہ کم درجہ پر تھے (کیونکہ وہ مادرزاد شاعر تھے)

عہد خلافت عباسیہ میں جب کلام شعرا کی تدوین ہوئی تو طبقۂ اول، دوم اور سوم کے شعرا کا کلام سات حصوں پر تقسیم کیا گیا اور ہر صنف کلام کا ایک جداگانہ مجموعہ مرتب کیا گیا جو حسب ذیل ناموں سے موسوم ہیں:-

۱۔ معلقات ۲۔ مجمہرات ۳۔ منتقیات ۴۔ مذہبات ۵۔ مراثی

۶۔ مشنویات ۷۔ ملحمات

ان کے علاوہ وہ مختلف شعرائے کے دیوان جداگانہ ترتیب دئے گئے ہیں جن کا بڑا حصہ یورپ، مصر، بیروت اور قسطنطینیہ میں طبع ہو چکا ہے۔ ہر مجموعہ میں کثیر تعداد شاعروں کی ہے جس کی تفصیل کے لئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

سورداس

(از پنڈت ہردے نراین پانڈے ہردیش)

ہندی کے زندہ جاوید شاعر سورداس دلی کے قریب سیہی نامی گاؤں میں سنہ ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوئے
تھے، وہ ذات کے برہمن تھے اور کم سنی ہی سے اُنھوں نے بندرابن کو اپنا مسکن بنالیا تھا، اس زمانہ میں
وہاں بلبھ آچاریہ مشہور ہندو فلاسفر موجود تھے اور سورداس انھیں کے شاگرد ہوگئے۔ بلبھ اچاریہ بھگوان کرشن کے
پرستار تھے۔ چنانچہ سورداس جی کو بھی کرشن جی کی بھگتی ہوگئی، اور یہی ان کی شاعری کا موضوع ہے۔ کمال فن
کے اعتبار سے اُن کی شاعری ہندی لٹریچر میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ شعرائے ہندی میں سورداس کو خدائے سخن
کا درجہ حاصل ہے۔ ہندی ادب کی جس شاہراہ پر وہ گامزن ہوئے اسکی پیروی کرنا آج بھی ہندی زبان کے
تمام شعرا اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ سورداس جی گو آنکھوں سے معذور تھے مگر اُن کا دل انوار الٰہی سے منور ہوچکا تھا،
جس کی بدولت آدمی بظاہر کور چشم ہونے کے باوجود سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ سنہ ۱۵۶۳ء میں اسی برس کی عمر میں آپ
کا انتقال ہوگیا۔

سورداس جی کی تصانیف میں سورساگر، ساہت لہری، سورساراولی، نل دمینتی اور بیاہلو بہت مشہور
ہیں۔ ان میں سورساگر بہت ضخیم ہے جس میں ایک لاکھ پچیس ہزار اشعار ہیں۔ سورداس کو شاعری کے علاوہ
علم موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا چنانچہ کوئی راگ راگنی ایسی نہیں ہے جو سورساگر میں موجود نہ ہو۔ اس
کی نظموں میں جادو کا سا اثر ہے۔ دربار اکبری کے نورتن اور ہندوستان کے سب سے بڑے گویئے تان سین
نے ان کے پدوں (نظموں) کے متعلق ایک بار کہا تھا کہ

दो० किधों सूर को सर लग्यो-किधां सूर की पीर
किधों सूर को पद लग्यो तन मन धुनत सरीर ॥

اس دوہے میں لفظ سور تین معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ سور بمعنی بہادر اور ایک قسم کا درد شکم، اور
سورداس۔ دوہے کا مطلب یہ ہے کہ سورداس کہتے ہیں کہ یہ کیا بات ہے جو انسان اتنا بیتاب ہو رہا ہے
کیا کسی سورما کا تیر اسکے جگر کے پار ہوگیا ہے یا اُس کے سول کا درد تو نہیں اُٹھا ہے۔ اگر ان دونوں میں

سے کوئی بات نہیں ہے تو ضرور اُس نے سورداس کی نظم سُنی ہوگی جس کے اثر کی وجہ سے وہ اتنا بیتاب ہو رہا ہے۔ "تن من دُھنت سیر" کے الفاظ میں جو لطافت اور دلآویزی ہے اُس کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔

ان کی شاعری میں غضب کا سوز و گداز ہے۔ ان کی تمام نظمیں جذبۂ درد سے جو شاعری کی روح ہے لبریز ہیں۔ حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں اور ان کی باریکیوں پر جتنے پہلوؤں سے انھوں نے نظر کی ہے، اتنی کسی دوسرے شاعر نے شاید ہی کی ہو۔ ان کے کلام میں جذبات نگاری اور وسعت تخیل کے ساتھ ہی ساتھ نُدرت، ظرافت اور شوخی بیان کی خوبیاں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں حسن و عشق کی چاشنی کے ساتھ ظرافت و شوخی کا چٹخارہ بھی موجود ہے جو ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعریف ہی نہیں ہو سکتی سورداس کی شاعری کیا ہے مصوری ہے۔ انھوں نے مناظر قدرت اور جذبات انسانی کی تصویریں کھینچ دی ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں مصوری کا لطف آتا ہے۔ زبان میں وہ فصاحت و بلاغت اور سلاست ہے۔ گویا ایک نور کا دریا ہے کہ آہستہ آہستہ بہہ رہا ہے۔ ان کے کلام میں غیر فصیح الفاظ تلاش کرنے پر بھی نہیں ملتے۔ بندش کی چستی، الفاظ کی دلآویز ترکیب، عبارت آرائی، اور زبان کی سلاست اور شیرینی ان کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ درحقیقت اس وقت تک برج بھاشا کا ان سے زیادہ شیریں زبان اور فصیح بیان شاعر پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔ ذیل میں ہم ان کی شاعری کے چند نمونے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جن سے اُردو داں سخن شناس بھی اُن کے کمالِ فن کی داد دے سکیں گے۔

یہ سبھی جانتے ہیں کہ آنکھیں بڑی نعمت ہیں اور دنیائے حُسن میں تو ان کا درجہ بہت ہی بلند ہے ہر ایک زبان کے شعرا نے آنکھوں کی تعریف میں اپنا زورِ قلم دکھایا ہے۔ سورداس جی نے بھی اس پر طبع آزمائی کی ہے چنانچہ اس موضوع پر ان کی ایک نظم بہت مشہور ہے جو درج ذیل ہے:-

पद- उपमा एकन नैन गही ।

कवि जन कहत २ चलि आस सुधिकर नाहिं कही ॥

कहि चकोर, बिधु मुख बिन जीवत, मंवरनहीं उडिजाता

हरि मुखकमल-कोषते बिछुरे-ठाले कत ठहरात ॥

खंजन पंख पसारि उड़तनहिं क्यों पिय दिग नहि जात ।

जो मृगतौ कत सघन श्याम बन बिच काहे न दुरिजात

ब्रज लो चन बिनु लोचन कैसे - प्रति छ्न ऐसे बाढ़त ।

सूरदास मीनता कछू इक जल भरि संग न छांड़त ॥

(ترجمہ) آنکھوں کو کسی چیز سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ شاعروں نے جن چیزوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے اس میں عقل اور خرد سے کام نہیں لیا، انھوں نے آنکھوں کو چکور کہا مگر یہ تشبیہ غلط ہے کیونکہ اگر آنکھیں چکور ہوتیں تو محبوب کے ماہتاب جیسے چہرہ کو دیکھے بغیر زندہ ہی نہ رہ سکتیں حالانکہ یہ اس کے بغیر بھی زندہ ہیں۔ اور بھونرے سے ان کو تشبیہ دی جائے تب بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ وہ بھی روئے گل کے دیکھے بغیر چین نہیں پاتا، اگر یہ بھونرا ہوتیں تو روئے گل کے گرد ضرور گھومتیں۔ یہ کھنجن بھی نہیں ہیں ورنہ ادھر اُدھر ضرور پُھدکتیں اور اڑ کر اپنے محبوب کے پاس جا پہونچتیں۔ یہ آہو بھی نہیں ہیں ورنہ فراق دلربا میں صحرا میں دشت نوردی کرتیں اور چوکڑیاں بھرتیں۔ مندرجہ بالا مثالوں میں سے ایک بھی ان کے لئے موزوں نہیں۔ ہاں ان کے متعلق صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ مچھلیاں ہیں جو اپنے محبوب کے عشق میں ہر وقت پر آب رہتی ہیں۔ جس طرح مچھلی پانی سے علیحدہ نہیں رہ سکتی اسی طرح آنکھیں بھی کسی وقت پانی سے جدا نہیں رہتیں، پانی ہی پر ان کی زندگی کا دار و مدار ہے ورنہ یہ آتش ہجراں سے جلکر ضرور خاک سیاہ ہو گئی ہوتیں۔

بیان میں غضب کا سوز و گداز ہے، کلام میں درد اور بانکپن دونوں شیر و شکر کے مانند گھلے ملے ہیں وسعت تخیل قابل داد ہے۔ کسی انگریز شاعر کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ (Imagination is Joy) تخیل مسرت ہے۔

ہجراں نصیب عاشق کو قدرتی مناظر کا حُسن دل خوش ہونے کے بجائے تکلیف دہ ہوتا ہے چنانچہ سورداس نے بھی چاندنی رات میں فرقت نصیب عاشق کی حالت کس خوبی سے بیان کی ہے، فرماتے ہیں:-

पद - पिया बिनु सांपिनि कारी रात ।

कबहुं बामिनी होति जुन्हैया - उसि उलटी है जात

(ترجمہ) محبوب کے بغیر رات کالی ناگن ہو رہی ہے۔ کالی ناگن کی پیٹھ سفید ہوتی ہے اور اس کا یہ دستور ہوتا ہے کہ کاٹنے کے بعد وہ الٹ جایا کرتی ہے چنانچہ الٹنے پر اس کی سفید پیٹھ نمودار ہوتی ہے۔

اسی طرح چاندنی رات میں جب چاندنی بادلوں کے اندھیرے میں ڈھک جاتی ہے تو عاشق کو وہ کالی ناگن کی طرح ڈسنے لگتی ہے، پھر تھوڑی دیر بعد وہ چاندنی اپنا روئے تاباں بادلوں کے گھونگھٹ میں سے باہر نکالتی ہے۔ عاشق سمجھتا ہے کہ ناگن ڈس کر الٹ گئی ہے اور اس کی پیٹھ کی سفیدی نمودار ہو رہی ہے۔

تشبیہ اور وجہ تشبیہ دونوں نہایت لاجواب ہیں

عاشق کو ہر وقت معشوق ہی کا تصور رہتا ہے، اس وجہ سے اسے اپنے محبوب کی جدائی محسوس نہیں

ہوتی شاعروں نے اس خیال کو مختلف طریقوں پر بیان کیا ہے۔ مثلاً:۔

(مومن) تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(مصحفی) بھیجتا ہے خیال اپنا عوض لینے مدام — اس قدر یار کو غم ہے میری تنہائی کا

(میر حسن) دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار — جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

(لا اعلم) تصور سے تمہارے دل کو تسکین دے ہی لیتے ہیں — تم آؤ یا نہ آؤ کام اپنا ہو ہی جاتا ہے

سی طرح سورداس نے بھی اس خیال کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

दोहा · बांह छुड़ाए जात हो निबल जानिकै मोहिं ।

हिरदे सों जब जाइहौ सबल बदूंगो तोहिं ॥

(مطلب) اے میرے محبوب تو خواہ مجھ سے ہاتھ چھوڑا کر بھاگ جائے لیکن اگر میرے دل سے بھاگ کر کہیں اور جا سکے تو میں تجھے بہادر سمجھوں۔ اگر تجھے ہمت ہو تو اس کی کوشش کر کے دیکھ لے۔

نکھوں پر سورداس جی کا ایک اور خیال سنیئے:۔

पद- मेरे नैना बिरहा की बेलि बई

सींचत नीर नैन के सजनी मूल पताल गई ।

बिकसति लता सुभाय आपने छाया सघन भई ॥

अब कैसे निरबारौं सजनी सब तन पसरि छई ॥

نی میری آنکھوں نے ہجر کی ایک بیل لگائی ہے، یہ خود مالی کا کام کرتی ہیں۔ اور دن رات آنسوؤں سے شاداب رکھتی ہیں۔ اس بیل کی جڑیں بہت گہرائی تک نیچے پھیلتی جاتی ہیں۔ اپنی عادت کے بموجب بیل چاروں طرف چھا گئی ہے اور اب مجھے ہر طرف سے ڈھک لیا ہے۔

برسات کی اندھیری راتوں میں ساری دنیا چین سے سو رہی ہے، مگر عاشق کی آنکھوں میں نند کہاں! آدھی رات کے سناٹے میں پپیہا بول اُٹھا پی کہاں پی کہاں! اس آواز کو سنتے ہی شق کے زخمی دل کے ٹانکے ٹوٹ گئے اور زخم ہرا ہو گیا۔ اس پر سورداس جی کیا کہتے ہیں ذرا اُن ہی زبان سے سنیئے:۔

पदः- बहुत दिन जीवौ पपिहा प्यारे ।

बासर रैनि नाव लै बोलत-भयो बिरह जुर कारो ।

आपु दुखित पर दुखित जानि जिय चातक नाम तिहारो ॥

देखौ सबै बिचारि हाय जिय बिछुरन को दुख न्यारो ।

जाहि लगै सोई पै जानै प्रेम बान अनियारो ॥

सूरदास प्रभु स्वाति बूंद लगी तज्यो सिन्धु करि खारो ॥

(مطلب) پیارے پپیہے تو دنیا میں بہت دن تک زندہ رہے کیونکہ تو شب و روز اپنے پیارے کا نام لیا کرتا ہے (پی کہاں، پی کہاں، کہتا ہے) تیرا جسم آتشِ ہجر سے جلکر سیاہ ہوگیا ہے (پپیہے کا رنگ کالا ہوتا ہے) تو اپنے علاوہ دوسروں کے لئے بھی غمگین رہتا ہے، اسی لئے تیرا نام چاتک یعنی دوسروں کا شریک رنج پڑگیا ہے۔ اس دنیا میں دردِ فرقت سے بڑھکر دوسری مصیبت نہیں ہے۔ اس درد کی تلخی کو وہی محسوس کرسکتا ہے جس کے سینہ میں کبھی عشق کا تیر پار ہوا ہو۔[1] پپیہے تو نے سوانت کے بادلوں کے دو بوند پانی کے لئے سمندر کے پانی سے بھی فائدہ نہ اٹھایا۔

بادلوں کو گرجتے ہوئے دیکھکر سورداس جی کہتے ہیں:۔

पदः-बरूये बदरा बरसन आये ।

अपनी अवधि जानि नद नन्दन गरजि गगन घन छाये ।

सुनियत है सुरलोक बसत है सेवक सदा पराये ॥

चातक कुलकी पीर जानिके जहं तहं से उढि घाये ॥

पदः-किधौं घन गरजत नहिं उन देसन ।

किधौं वहि देस मोर चातक पिक बधिकन बधे बिसेसनि

किधौं वहि देस बाल नहिं झूलत गावत गीत सहे सनि ॥

(ترجمہ) دیکھئے برسات شروع ہوتے ہی اپنے محب موروں اور پپیہوں کو آرام دینے کے لئے بادل بھی آگئے۔ مگر افسوس میرے محبوب نے میری خبر نہ لی۔ یہ بادل بیچارے دوسرے کے نوکر ہیں اور دوسرے ملک یعنی آسمان پر رہتے ہیں مگر تکلیف برداشت کرکے کسی نہ کسی طرح موقعہ پر آہی گئے۔ کیا میرے محبوب کے دیار میں بادل نہیں گرجتے، کوئلیں نہیں کوکتیں، ساون کی رم جھم پھواریں نہیں پڑتیں، کیا وہاں شکاریوں نے سبھی موروں اور کوئلوں کو ہلاک کردیا۔ کیا اس دیار کی حوروش نازنین جھولے کی رسیوں کو اپنے نرم نرم گورے گورے ہاتھوں سے پکڑ کر خوشی سے اچھلتی ہوئی میٹھی میٹھی آوازمیں ساون نہیں گاتیں۔

---

[1] غالب نے بھی کہا ہے۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو ۔ یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا۔

انگریزی شاعر ورڈس ورتھ کی طرح سورداس بھی نیچر کے عاشق صادق ہیں اور نیچر ہی کے ساتھ رنج وراحت کا احساس واظہار کرتے ہیں۔ اگر ان کا دل درد وغم سے بھرا ہوا ہے تو وہ اپنے ساتھ بادلوں کو بھی روتا ہوا پاتے ہیں۔ بجلی کی کڑک میں اُن کو اپنے دل دردمند میں بھی ٹیس معلوم ہوتی ہے۔ موروں کی آواز اُن کو اپنے محبوب کی صدا سنائی دیتی ہے۔ غرض نیچر میں جس طرف بھی اُن کا دھیان جاتا ہے اُن کو اپنی دلی کیفیت و واردات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ شاعر دراصل ایک مصور ہے جو انسانی زندگی کے اُن پوشیدہ رازوں کی تصویر کھینچتا ہے جن پر عوام الناس کی نظر نہیں جاتی۔ ورڈسورتھ کا قول ہے کہ نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں انسانی جذبات کی صحیح تصویر کھینچی جائے۔[1] یہ بات سورداس کی شاعری پر بھی چسپاں ہوتی ہے۔

اخیر میں محبت کے متعلق سورداس کی ایک مشہور نظم درج کرکے اب ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

पद:- प्रीति करि काहू सुख न लह्यो ।
प्रीति पतंग करी दीपक सों आपे प्राण दह्यो ॥
अलिसुत प्रीति करी जलसुतसों सम्पति हाथ गह्यो ॥
सारंग प्रीति करी जो नादसों सन मुख बान सह्यो ।
सूरदास पिय बिन दुख दूनो नैनन नीर बह्यो ॥

(ترجمہ) اس دنیا میں محبت کرکے کسی نے آرام نہیں پایا۔ پروانہ نے شمع سے محبت کی، نتیجہ یہ ہوا کہ راہِ الفت میں جلکر خاک ہوگیا۔ بھونرے نے کنول کے پھول سے محبت کی، جب رات کو کنول کی کلی بند ہوگئی تو اُس نے سوچا کہ شبِ وصال کے لطف کو ہاتھ سے کیوں جانے دوں اُسی میں بند پڑا رہا، صبح کے وقت ایک ہاتھی تالاب میں پانی پینے آیا اور کنول کے پھول اور پتوں کے ساتھ ہی اُس بھونرے کو بھی کھا گیا، بھونرے کی محبت کا انجام یہ ہوا۔ اور ہرن شکاری کی بین سے محبت کرتا ہے اسی بین کے ذریعہ جس پر ہرن قربان ہے شکاری اُسے قید کرتا ہے یعنی ہرن کو بھی محبت میں جان کھونی پڑتی ہے۔ ان باتوں سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ دنیا میں عشق ومحبت کا دم بھرنے والوں کو کبھی آرام نہیں نصیب ہوتا۔

---

[1] The beauty of poetry is to paint the human life truly.

دھرماتما مالوی جی

(از اقبال ورما سحر ہتگامی)

بزرگ قوم پنڈت مدن موہن صاحب مالوی کے نام نامی کے ساتھ جو لقب زیب عنوان ہے وہ موجودہ
زمانہ کے عظیم ترین شخص مہاتما گاندھی کی جانب سے عطا ہوا ہے اور واقعی پنڈت جی کی نیکی و نیک نفسی صلح
ئی و اولوالعزمی، علم دوستی و حق پرستی کو مد نظر رکھتے ہوئے اُن کے لئے اس سے بہتر لقب ہو نہیں سکتا ہے۔
ھرم میں بہت بڑی جامعیت ہے۔ اور کسی شخص کا دھرماتما ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ اس کی ذات مجموعۂ
صفات ہیں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کی بدولت انسان دیوتا کہلانے کا اہل ہو سکتا ہے

پنڈت جی کے والد پنڈت برجناتھ صاحب قدیم وضع کے پنڈت تھے اور سنسکرت کے عالم و فاضل
ہونے کے علاوہ مذہبی واعظ بھی تھے۔ چنانچہ سری مد بھاگوت اور پرانوں کی کتھائیں اس انداز اور صفائی کے
ساتھ بیان کرتے تھے کہ سبھی لوگ اُن کی قابلیت سے یکساں مستفید ہوتے تھے

مالوی جی ۲۵۔ دسمبر ۱۸۶۱ء کو بمقام الہ آباد پیدا ہوئے، اوائل عمر میں وہ عام دستور کے مطابق
پاٹھ شالاؤں میں پڑھتے رہے۔ رفتہ رفتہ انگریزی تعلیم کی نوبت آئی، یہاں تک کہ ۱۸۷۹ء میں انٹرنس
کا امتحان پاس کر کے میور سنٹرل کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۸۴ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی،
س کے بعد اُنھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول الہ آباد میں بعہدہ اسسٹنٹ ماسٹری ملازمت اختیار
ر لی۔ مگر ۱۸۸۷ء میں راجہ رامپال سنگھ مرحوم والی ریاست کالا کانکر مالک اخبار ہندوستان کے
صرار سے انھوں نے دو سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پر اخبار مذکور کی اڈیٹری منظور کر لی۔ پنڈت جی کی قابلیت
ور قومی خدمت کی لگن نے اُس شعبہ میں بھی اپنا رنگ دکھایا۔ دو سال کے بعد آپ ہندوستان کی
ڈیٹری سے کنارہ کش ہو کر "انڈین یونین" نامی انگریزی اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے جو بالآخر ایڈووکیٹ (لکھنؤ)
سے ملحق ہو گیا تھا۔ آپ نے پبلک خدمات کے تعلق سے اخبار کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے "ابھیودے"
امی ہندی ہفتہ وار کا اجرا کیا جو ہنوز جاری ہے۔ ۱۹۰۹ء میں آپ نے صوبہ کے مشہور و معروف روزنامہ
یڈر کے اجرا کے لئے بھی انتہائی کوشش کی، اس معزز اخبار نے اب تک جو اہم ملکی خدمات انجام دی ہیں

اور جنکی بدولت وہ رعایا و سرکار ہردو کی نگاہوں میں مقبول ہو چکا ہے اُن کا اعتراف نہ کرنا کفرانِ نعمت

پنڈت جی نے اپنے اخباری مشاغل کو جاری رکھتے ہوئے بھی ۱۸۹۱ء میں ایل ایل۔ بی کا امتحان پاس کرلیا اور ۱۸۹۳ء سے ہائی کورٹ الہ آباد میں وکالت کرنے لگے۔ مگر پنڈت جی کو نہ اس پیشہ میں کسی غیر معمولی فروغ کے حاصل کرنے کی تمنا تھی اور نہ اُنھوں نے کوئی غیر معمولی فروغ حاصل کیا، اُن کا فطرتی رجحان رفاہ عام کے کاموں کی جانب تھا اس لئے اُن کا قدم پھر اُسی راستہ پر آجاتا تھا جو اُسی منزلِ مقصود کی طرف لیجانیوالا

تعلیمی ترقیوں کے متعلق سوچتے ہوئے پنڈت جی نے اُس دقت کو محسوس کیا جو طلبا کو الہ آباد میں قیام کے متعلق ہوتی تھی، چنانچہ اُسے رفع کرنے کی غرض سے اُنھوں نے سر سندر لال آنجہانی سے ملکر بڑی تندہی سے ہندو بورڈنگ ہوس قایم کیا اور انھوں نے چندہ کی فراہمی کے لئے اپنے صرفہ سے دور دراز کے سفر کی زحمت گوارا کی۔ مگر پنڈت جی کے تعلیمی کارناموں میں سب سے بڑی چیز بنارس ہندو یونیورسٹی ہے جس پر اُنھوں نے اپنا تن من دھن سب کچھ وار دیا ہے۔ اس عظیم الشان تعلیم گاہ کی قائمی کے لئے پنڈت جی نے برسوں تک جس سرگرمی اور مستعدی سے کام کیا وہ واقعی اُنھیں کا حصہ تھی، اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آپ کو اس جانفشانی کا جو ثمرہ ملا وہ آپ کے علمی نصب العین کے سراپا حسب حال اور علو ہمتی و اولوالعزمی کے ہر طرح سے شایان ہے۔

پنڈت جی کو تقریر میں وہ ملکہ حاصل ہے کہ باید و شاید، اُن کی جادو بیانی سامعین کے دلوں کو مسخر کرلیتی ہے. فن تقریر میں بنگال کے مشہور مقرر سر سریندر ناتھ بنرجی مرحوم کے بعد مالوی جی ہی کا نمبر ہے۔ مالوی جی کو انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ ابتدا ہی سے گہری عقیدت تھی۔ وہ اس کے دوسرے ہی اجلاس میں جو ۱۸۸۶ء میں بمقام کلکتہ منعقد ہوا تھا ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے، وہیں اُنھوں نے اپنی پہلی تقریر فرمائی تھی جس کی مسٹر ہیوم مرحوم نے اپنی کانگریس کی رپورٹ میں بڑی تعریف کی ہے۔ دوسرے سال مدراس کانگریس کے موقع پر انھوں نے جو تقریر کی وہ بھی مقبول عام ہوئی، مسٹر ہیوم، مسٹر نارٹن، سر مادھو راؤ وغیرہ نے اسکی داد دی۔ تیسرے سال مالوی جی کی کوشش سے کانگریس کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں ہوا ان سرگرمیوں اور کارگزاریوں ہی کی وجہ سے پنڈت جی کا شمار مقتدر کارکنان کانگریس میں ہونے لگا اور اُن کی شہرت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، شدہ شدہ ۱۹۰۸ء میں آپ صوبجاتی کانفرنس واقع لکھنؤ کی صدارت کے لئے منتخب کئے گئے اور اُس کے دوسرے ہی سال آپ کو لاہور کانگریس کی صدارت کا اعزاز عطا ہوا ۱۹۱۸ء میں وہ دوبارہ دہلی کانگریس کے صدر منتخب ہوئے جس میں اول مرتبہ تقریباً سات سو کسان ڈیلیگیٹوں نے بھی شرکت کی۔ پنڈت جی نے اپنی صدارتی تقریر میں ہندو مسلم اتحاد کی بھی تلقین کی تھی۔ اس کے متعلق

آپ کی بے تعصبی اور فراخدلی کا اظہار اُس خط سے ہوتا ہے جو آپ نے سنہ ۱۹۲۴ء میں موپلا ریلیف کے سلسلے میں مہاتما گاندھی کو لکھا تھا جس میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ:-

"عقلمند لوگ صرف اُسی شخص کو بھلا کہتے ہیں جو بُرائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی کرتا ہے، صرف وہی لوگ نیک ہیں جو اپنے ساتھ بدی کرنے والوں سے بھی نیکی کرتے ہیں، ایسی نیک ارواح سے دنیا کی زینت ہوتی ہے جو اُن کے وجود کی بدولت بہتر بن جاتی ہے۔"

جب سنہ ۱۹۲۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے قدیم رویہ سے منحرف ہو کر سرکار سے ترک موالات کی ٹھانی تو مالوی جی نے اس سے اپنے اختلاف رائے کا اظہار کیا مگر تحریک سودیشی سے پنڈت جی کو اُس زمانہ سے پریم ہے جب اُس کے نام سے ملک میں بہت کم لوگ واقف تھے چنانچہ آپ ہی کی کوشش سے "دیسی تجارت کمپنی" کے نام سے الہ آباد میں ایک کمپنی سنہ ۱۸۸۱ء میں قائم ہوئی۔ بہر حال پنڈت جی اُس وقت کانگریس سے علٰحدہ رہتے ہوئے بھی ملک و قوم کی جانب سے بے پروا نہیں رہے اور پیروانِ کانگریس کے نشانۂ ملامت ہونے کے باوجود وہ اپنی صلح جویانہ روش کے مطابق مصالحتی کوششوں میں مصروف رہے یہاں تک کہ سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء میں کانگریسی تحریک کے وسعت پذیر ہونے پر انھوں نے اس امر کی بار بار کوشش کی کہ کانگریس اور سرکار میں کسی طرح مفاہمت ہو جائے مگر جب چوری چورا کے افسوسناک حادثہ کے بعد تحریک نان کوآپریشن از خود بند کر دی گئی تو پھر کسی مفاہمت کی ضرورت ہی باقی نہ رہی اور ملک میں امن و سکون کا تسلط ہو گیا۔

پنڈت جی کی ہمہ گیر طبیعت کسی ایسے کام سے بے تعلق ہو کر نہیں رہ سکتی ہے جس کا کرنا آپ کے نزدیک ملکی بہبود کا باعث ہو۔ چنانچہ آپ نے کونسل اور اسمبلی کے کاموں سے بھی خاص دلچسپی لی جہاں انھوں نے سالہا سال تک مسلسل کام کیا۔ وہ سنہ ۱۹۰۲ء میں آنریبل پنڈت بشمبھر ناتھ صاحب کی جگہ ممبر منتخب ہو کر لیجسلیٹو کونسل میں داخل ہوئے تھے اور بالآخر ۲۔ اپریل سنہ ۳۰ء کو "ٹیرف بل" کی مخالفت میں لیجسلیٹو اسمبلی کی ممبری سے مستعفی ہو گئے۔ اُسی بل کی مخالفت میں اُنھوں نے سودیشی کی اشاعت شروع کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس کی تحریک ملک میں پھر زور پکڑ رہی تھی اور سرکاری تشدد کا دور بھی شروع ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اسی تشدد کی مخالفت میں کانگریس کی مجلس عاملہ کے ممبر ہوئے اور ۲۔ اگست سنہ ۳۰ء کو بمبئی کے کانگریسی جلسہ میں شامل ہو کر گرفتار ہو گئے، اُس وقت آپ پر عدالت سے سو روپیہ جرمانہ ہوا اس رقم کو نامعلوم شخص نے ۴۔ اگست کو ادا کر دیا اور پنڈت جی رہا ہو گئے۔ مگر ۲۷۔ اگست کو دہلی میں مجلس عاملہ کے ممبروں کے ساتھ وہ پھر گرفتار کئے گئے اور انھیں چھ ماہ قید محض کی سزا ہوئی۔ ۱۹۔ جنوری سنہ ۳۱ء کو وزارت

آنریبل سر محمد شفیع مرحوم

پنڈت مدن موہن مالویہ

برطانیہ کا مشہور و معروف سرکاری اعلان ہو جانے پر جب مجلس عاملہ کے جملہ ممبران رہا ہوئے تو آپ کی رہائی بھی عمل میں آئی۔

اس کے بعد ۵۔مارچ ۱۹۳۱ء کا مشہور تاریخی سمجھوتہ ہونا، کانگریسی قیدیوں کا رہائی پانا، کانگریس کا دوسری گول میز کانفرنس میں مدعو کیا جانا وغیرہ جملہ واقعات ابھی بالکل تازہ ہیں اور یہاں پر اُن کے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ مختصر یہ کہ ۲۹۔اگست ۱۹۳۱ء کو پنڈت مالوی جی بھی مہاتما گاندھی کے ساتھ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے راجپوتانہ نامی جہاز پر بمبئی سے لندن کے لئے روانہ ہو گئے۔ کانفرنس مذکور میں شامل ہو کر آپ نے اپنی مؤثر تقاریر کے ذریعہ اپنے ملک کا حق نیابت ادا کیا۔ اب آپ ۱۳ جنوری ۱۹۳۲ء کو بمبئی واپس آ گئے ہیں اور آجکل ملک کے بڑے بڑے لبرل لیڈروں کے ساتھ موجودہ سیاسی صورت حال پر غور کر رہے ہیں۔

پنڈت جی کے مزاج میں فقر و غنا کا انتہائی دخل ہے۔ مذہب کی پرستش کو تو اُن کی فطرت ثانوی کہہ دینا بیجا نہ ہوگا۔ موصوف ہی نے ۱۹۰۶ء میں سناتن دھرم مہاسبھا الہ آباد کی بنیاد ڈالی تھی۔ مگر پنڈت جی سناتن دھرمی اور قدامت پرست ہوتے ہوئے بھی اصلاح و ترقی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، اس کا پتہ اُن کے حال کے سفر یورپ سے لگتا ہے "چھوت چھات" کے متعلق بھی آپ کے خیالات میں تغیر عظیم ہو گیا ہے فی الجملہ ہم اُن کی مذہب پرستی کو حق پرستی سے موسوم کر سکتے ہیں۔ ہمارا یہ خیال عین الیقین کے درجہ پر پہونچ جاتا ہے جب ہم آپ کے اُس پیغام پر غور کرتے ہیں جسے ممدوح نے ابھی گذشتہ سفر یورپ میں "کولمبیا گراموفون کمپنی" کے رکارڈوں کے ذریعہ دنیا کو دیا ہے۔ پیغام مذکور کے دوران میں آپ فرماتے ہیں:۔

"...... کثیر التعداد انسان ایشور کے بارہ میں باتیں کرتے ہیں، اُس کے پاک نام کا ورد کرتے ہیں، اور اُس کی ہستی پر اعتقاد رکھتے ہیں، مگر چند ہی لوگوں میں یہ اعتقاد کام کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ واقعی ایشور کا وجود ہے، اس سے بھی کم لوگوں کو اس کے وجود کا تصور ہوتا ہے۔ انسانی تہذیب کو زیادہ بلند درجہ پر پہونچانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُن تمام معلومات کو یکجا کرنے کی بین الاقوامی حیثیت سے کوشش کی جائے جنھیں مذہبی عالموں، فلاسفروں اور سائنس دانوں نے حاصل کیا ہے اور ایشور کے وجود کے متعلق کوتاہ سے کوتاہ فہم والوں کو بھی سمجھایا جائے۔ ایشور کے وجود اور اس کے انسانوں کے ساتھ والے تعلق کو تمام و کمال، ہر مرد و زن کے ذہن نشین کرا دیا جائے اور ساتھ ہی اُن کو مذہب کے وہ بنیادی اصول بتلائے جائیں جن پر انسانی اخلاق کا دار و مدار ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔"

"...... تمامی خلقت میں ایک ہی ذی روح طاقت ہے جو ہر کہیں ہر شکل میں پائے جانے والے جاندار میں

موجود رہتی ہے، یہ معلوم کرنے پر نہ صرف انسانوں ہی کے مابین مساواتی تعلق قائم ہو جاتا ہے بلکہ انسانوں اور جملہ دیگر جانداروں کے مابین بھی۔ اسی قسم کے سلسلۂ خیالات سے دو بنیادی اصول اخذ کئے گئے ہیں:۔ چونکہ ایک ہی ایشور سبھی جانداروں میں موجود ہے اسلئے مجھے دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرنا چاہیئے جسے میں دوسروں کی جانب سے اپنے متعلق ہونا پسند نہیں کرتا، اور مجھے وہی کرنا چاہیئے جسے میں چاہتا ہوں کہ دوسرے میرے ساتھ کریں۔ ہزاروں برس پہلے ہندوستان کے رشیوں نے اوامر و نواہی کی صورتوں میں ان ہر دو اصولوں کا اعلان کیا تھا جنھیں مذہب و اخلاق کا خلاصہ کہنا چاہیئے ......"

پنڈت جی کی مذہب فہمی اور وسیع الخیالی کی اس سے روشن تر مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟

ابھی ۲۵۔ دسمبر ۳۱ء کو پنڈت مالوی جی کی عمر کا سترواں سال پورا ہوا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خداوند کریم اس فنانی القوم بزرگ کو عرصہ تک سلامت با کرامت رکھے اور قوم کو اس کی سالگرہ منانے کے متعدد موقعے عطا کرے۔ آمین۔

آداب معاشرت

خوش خلقی، تحمل اور انکسار انسانیت کا زیور ہیں اس لئے ان کو کبھی مت چھوڑو۔

جس طرح حد سے زیادہ درشتی و سختی بری ہے اسی طرح حد سے زیادہ نرم مزاجی بھی اچھی نہیں۔

مجلس میں بغیر پوچھے اپنی رائے نہ دو، خواہ مخواہ دخل نہ دیا کرو۔ اگر کوئی شخص بات کر رہا ہو تو درمیان میں مت بولو

محفل میں لمبی بات نہ کرو جس سے لوگ اکتا جائیں اور ایسی بات نہ کرو جس سے اہل محفل کو دلچسپی نہ ہو۔

اگر کسی سے ملنے جاؤ تو اس کے وقت کا خیال رکھو۔ اگر وہ زیادہ مصروف ہو تو مطلب کی بات جلدی ختم کر کے چلے آؤ۔

کسی کے گھر جاؤ تو اس کے سامان لباس اور دیگر اشیاء پر نکتہ چینی مت کرو۔

کسی کے عیب کو مجمع میں ظاہر کر کے اسکو شرمندہ مت کرو۔

مہمان کو کھانے پینے کی چیز دیتے وقت اسکی قیمت یا لاگت کا ذکر مت کرو۔

کسی سے کوئی چیز مانگ کر لاؤ تو عین وعدے پر یا اُس سے کچھ پہلے ہی واپس کر دو۔

وعدہ بہت کم کیا کرو لیکن جو وعدہ کرو اُسے ضرور پورا کرو۔

کسی سے ملنے جاؤ تو اس کے مذہبی عقائد یا رسم و رواج پر نکتہ چینی مت کرو۔

(ماخوذ)

چین اور دیگر ممالک کے گداگر

(از سید اظہر حیدر سہارنپوری)

دنیا کے کسی حصے میں اس قدر گداگر دیکھنے میں نہیں آتے جتنے چین میں ہیں. ملک چین میں ایک طرح پر گداگروں کی حکومت ہے اور وہ سب کے سب ایک گداگر بادشاہ کے زیر حکومت رہتے ہیں۔ ہر ایک علاقہ میں ایک حاکم ہوتا ہے جس کا فیصلہ سب معاملات میں آخری سمجھا جاتا ہے۔ ان اعلیٰ افسروں کی اجازت کے بغیر کوئی غیر شخص ان کی جماعت میں داخل نہیں کیا جاتا۔ ان بھکاریوں کا انتظام ایسا اعلیٰ ہے کہ ہر شخص عام طور پر ان کے سوال کو پورا کرتا ہے۔ اور کبھی کچھ دینے سے انکار نہیں کرتا۔ اگر کبھی کوئی شخص ایسا کرے تو اس علاقہ کے سارے فقیروں کو اس امر کی اطلاع کر دی جاتی ہے جو اسے ہر ممکن طریقہ سے تکلیف دیتے اور اُس کے کام میں خلل انداز ہوتے ہیں اور بالآخر وہ شخص مجبوراً بہت جلد اپنی ضد سے باز آ جاتا اور فقیروں کے سوال کو رد کرنا ترک کر دیتا ہے

چین میں ان فقیروں کا اس قدر زور ہے کہ اکثر دوکاندار ان کے متواتر تقاضوں سے بچنے کے لئے یہ انتظام کرتے ہیں کہ اس علاقہ کے گداگروں کے حاکم کو کوئی مقررہ رقم ماہوار دیکر اُتنے عرصہ کے لئے ان سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ رقم کرایہ دوکان کے کرایہ کے لحاظ سے قائم کی جاتی ہے اور اس طرح ہر دوکاندار اس بات کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس قدر رقم ماہوار ادا کر کے فقیروں سے پیچھا چھڑانا مفید ہے یا اس میں کسی قسم کا خسارہ ہوتا ہے۔ رقم مقررہ کی ادائیگی پر دکاندار کو ایک یادداشت ملجاتی ہے جس کی رو سے گداگروں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ آئندہ میعاد مقررہ تک اُسے دق نہ کریں۔ دُکاندار اسکو عام طور پر باہر دروازہ پر چسپاں کر دیتے ہیں جس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ گداگر باہر ہی سے اُسے دیکھکر آگے چلا جاتا ہے اور سوال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی جن دُکانداروں کے پاس یہ قیمتی یادداشت موجود ہو وہ ہمیشہ اسکی احتیاط رکھتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ گم ہو جائے تو بیشمار گداگر اُسے تنگ کرنا شروع کر دینگے اور بدقسمت دوکاندار کا یہ کہنا کہ وہ مقررہ رقم ادا کر چکا ہے کچھ مفید نہ ہوگا۔ اس صورت میں بیچارے دکاندار کو اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ گداگر حاکم کے پاس اس قسم کی رسید کے لئے درخواست کرے مگر

اسکا حافظہ ایسا تیز نہیں ہوتا کہ گزشتہ ادائیگی کو یاد رکھے، پس دکاندار اگر ان موذیوں سے نجات حاصل کرنا چاہے تو اُسے مجبوراً دوبارہ رقم ادا کر کے دوسری رسید حاصل کرنا پڑتی ہے۔

خوش قسمتی سے چین میں خیرات کی رقم کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ اگرچہ ہر شخص کو ایک دن میں کئی مرتبہ خیرات دینی پڑتی ہے مگر اس کا اندازہ عام طور پر ایک کیش مقرر ہے اور چونکہ ایک سو کیش ساڑھے تین آنہ کے برابر ہوتے ہیں اس لئے خیرات پر کچھ زیادہ رقم صرف نہیں ہوتی

چونکہ چین میں ہر چیز سستی ہے اس لئے بہت ہی تھوڑی رقم میں لوگوں کا گذر ہو جاتا ہے مثلاً پیکن میں ایک شخص نصف کیش صرف کر کے رات بسر کر سکتا ہے۔

یہاں ایک کمپنی نے ایک انسٹی ٹیوشن قائم کر رکھا ہے جس کا نام "کی مس خان" یا مرغی کے پروں کا مکان ہے۔ اس مکان میں ایک وسیع احاطہ ہے جس کے فرش پر پروں کی ایک تہہ بچھی ہوئی ہے۔ رات کے وقت گداگر اس میں داخل ہونے شروع ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک فقیر ملازم کو دروازے پر نصف کیش دیدیتا ہے اور اندر جا کر پروں پر لیٹ جاتا ہے۔ جس وقت کافی آدمی اندر داخل ہو چکتے ہیں تو ملازم دروازہ بند کر کے زور سے گھنٹہ بجاتا ہے اور پھر ایک طرف سے چرخی کو گھمانا شروع کرتا ہے، یکایک ایک بہت بڑا کمبل ان گداگروں پر آ گرتا ہے۔ اس کمبل میں متعدد سوراخ بنے ہوئے ہوتے ہیں، ہر گداگر ایک سوراخ تلاش کر کے اس میں سے اپنا سر باہر نکال لیتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ باہر والا ملازم غلطی سے اس قدر آدمی اندر داخل کر لیتا ہے جن کی تعداد کمبل کے سوراخوں سے زیادہ ہوتی ہے مگر یہ بات بہت جلد معلوم ہو جاتی ہے، کیونکہ سوراخوں کی کشمکش ختم ہو جانے کے بعد اگر اس بدقسمت کی چیخیں سنائی دیتی ہیں جس کا سوراخ نہ ملنے کی وجہ سے دم گھٹا جاتا ہو تو ملازم مذکور اس مشکل کو بڑی آسانی سے رفع کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کمبل کے نزدیک پہونچکر اس گداگر کو جو اس کے قریب ہو ٹانگوں سے پکڑ کر کمبل کے نیچے سے کھینچ لیتا ہے اور اُسے احاطہ سے باہر نکال کر اُس کا نصف کیش اس کے پیچھے بازار میں پھینک دیتا ہے اس کے بعد وہ ایک لمبے بانس کے ذریعہ سے ہر شخص کو اس کے سوراخ کا پتہ بتاتا ہے اور اس طرح پر یہ مشکل رفع ہو جاتی ہے۔

صبح کے وقت پھر گھنٹہ بجتا ہے، جس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ گداگر اپنے اپنے سر سوراخوں میں سے نکال لیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ ان میں سے بعض کمبل کے ساتھ چھت تک اُٹھ جائیں۔ اس کے بعد ان سب کو باہر نکال دیا جاتا ہے۔ چینی اس آرام گاہ کو بہت پسند کرتے ہیں اور شاذ و نادر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ کمبل کے نیچے اُترنے کے بعد اس میں کوئی سوراخ خالی رہ جائے۔

اطالیہ میں بھی گداگروں کی کثرت ہے، جس کی بعض وجوہ غالباً لوگوں کی کاہلی، افلاس اور شہر میں دولتمند اجنبیوں کا بکثرت وارد ہونا ہے۔ اٹلی میں گداگروں کو پارسائی کا جامہ پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ تھوڑا عرصہ ہوا وہاں بہت سے اس قسم کے مذہبی فرقے موجود تھے جو صرف سخی لوگوں کی خیرات پر بسر اوقات کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ آجکل یہ فرقے موجود نہیں ہیں تاہم ان کا اثر کچھ نہ کچھ باقی ہے۔

ہسپانیہ کے گداگر اپنی بدصورتی کے ذریعہ راہرووں کے دلوں میں رحم کا خیال پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ملک میں بہت سے کارخانے اچھے بھلے آدمیوں کو لنگڑا لولا بنانے کے لئے قائم ہیں۔ ان کارخانوں میں حددرجہ کے فرومایہ لوگ بچوں کے اعضا، کو موڑتے اور ان کو طرح طرح کی تکلیفیں پہونچاتے ہیں، اور جب وہ اس طرح بدنما ہوجاتے ہیں تو انھیں بازاروں میں لئے پھرتے ہیں اور لوگ ان پر ترس کھاکر خیرات دیدیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے لنگڑے بچوں کو لکڑی کی گاڑیوں میں بٹھاکر باہر بھیجا جاتا ہے، ان کے مالک ان بچوں کی سخت نگرانی کرتے ہیں، اور اگر کافی روپیہ نہ کما سکیں تو انھیں بھوکا مارتے اور بہت سی تکلیفیں دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ یقین نہیں کرسکتے کہ مہذب ملکوں میں بھی ایسی شیطانی حرکات ہوتی ہیں مگر یہ واقعہ ہے اور بہت سے لوگوں نے اس کی تصدیق کی ہے۔

برازیل کے گداگر غالباً ساری دنیا میں زیادہ بے شرم ہوتے ہیں، وہ کافی آمدنی پیدا کرلیتے ہیں اور اس بات کو چھپانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ یہاں کسی فقیر کو خچر یا گھوڑے پر سوار دیکھنا معمولی بات ہے۔ ایک سیاح بیان کرتا ہے کہ ایک دن ایک شخص نے جو ایک بانس سے لٹکے ہوئے پنگورے میں لیٹا ہوا تھا (اس بانس کو دو حبشی اٹھائے ہوئے تھے) مجھ سے سوال کیا۔ ایک ایسے شخص کو جو پنگورے میں لیٹ کر ادھر ادھر جانے کی توفیق رکھتا تھا خیرات مانگتے دیکھکر مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے اُسے ملامت کرنی شروع کی۔ مگر اُس نے بڑی نخوت سے میری طرف دیکھکر جواب دیا "جناب میں آپ سے روپیہ مانگتا ہوں، نصیحت نہیں مانگتا۔"

پیرس میں گداگروں کی کثرت زیادہ تر اس وجہ سے ہے کہ فرانس کے مختلف دیہاتی علاقوں میں بھیک مانگنا ممنوع ہے، اور اس لئے وہ لوگ جو کاہل الوجود ہیں اور کام کرنے سے گھبراتے ہیں وہ اس خیال سے دارالخلافہ میں آجاتے ہیں کہ وہاں ضرور کوئی نہ کوئی آمدنی کا ذریعہ نکل آئیگا۔ پیرس میں ایک دفتر ہے جہاں سے گداگر لوگ کچھ فیس ادا کرکے ان لوگوں کا نام اور پتہ معلوم کرسکتے ہیں جو عام طور پر خیرات دیتے ہوں۔ اس دفتر کا مالک مختلف ذریعوں سے اس واقفیت کو حاصل کرتا رہتا ہے اور پھر

اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ گداگروں کو اس حص سے حاصل نہ ہوئی واقفیت پر بھروسہ رہتا ہے اور وہ چند سخی شخصوں کا نام اور پتہ معلوم کرنے کے لئے آٹھ دس روپئے دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

آسٹریا کے بھکاری ساری دنیا میں اپنی شائستگی کے لئے مشہور ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں اس قسم کی مناسب تعلیم دیجاتی ہے۔ چنانچہ آسٹریا اور ہنگری کے بڑے بڑے شہروں میں ایک آدھ آدمی ایسا ہوتا ہے جو گداگروں کو اس قسم کے دل میں چبھتے ہوئے فقرے سکھا دیتا ہے جن سے وہ راہروؤں سے معقول خیرات حاصل کر سکتے ہیں۔ مختلف شخصوں سے مختلف طریقوں پر امداد طلب کرنیکی ہدایت کی جاتی ہے اور وہ اس نصیحت پر عمل کر کے معقول فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

ہندوستان کے بعض صوبوں میں بھیک مانگنا ایک پیشہ ہے، اور پنجاب میں بعض ذاتیں ایسی ہیں جو بھیک مانگ کر زندگی بسر کرنا باعثِ افتخار سمجھتی ہیں۔ یہاں بعض فقیر اور سادھو ایسے بھی ہیں جو جبراً خیرات مانگتے ہیں اور جب تک ان کا سوال پورا نہ کیا جائے طرح طرح کے ڈھونگ رچاتے ہیں۔ اس قسم کے فقیر بازاری زبان میں "مرچڑے" کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اکثر پیشہ ور فقیر ایسے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو مصنوعی طور پر لنگڑے۔ لولے یا اندھے بنکر اپنا مطلب نکالتے ہیں اور افیون کھانا یا چرس پینا ان کا دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے۔

(ماخوذ)

بڑی جنتری ۱۹۳۲ء یہ وہی جنتری ہے جس کو مولوی محمد رحمت اللہ رعد مرحوم مالک نامی پریس کانپور نے جاری کیا تھا اور ہر سال نہایت اہتمام سے شائع کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد چند سال تک انتظامی پریس کانپور کی جانب سے شائع ہوئی اور اب مولوی عبدالاحد صاحب نے فرخ آباد سے اسکو شائع کیا ہے

اس جنتری میں ضروری تاریخوں اور سنوں کے علاوہ بعض دوسری کارآمد باتیں بھی درج ہیں۔ مثلاً ایران کی تاریخ۔ قانونی وتجارتی ہدایات وغیرہ۔ لکھائی چھپائی صاف، ٹائیٹل رنگین اور خوبصورت۔ مولوی عبدالاحد صاحب منیجر بڑی جنتری فرخ آباد سے طلب کیجئے۔

کتب خانے اور اُن کی حفاظت

(از رائے بہادر پنڈت شیو نراین شمیم، ایڈوکیٹ لاہور)

دنیا میں بڑے بڑے کتب خانے موجود ہیں، برٹش میوزیم کی لائبریری میں بتیس لاکھ کتابیں ہیں، اگر وہ الماریاں جن میں کتابیں رکھی ہوئی ہیں ایک قطار میں لگائی جائیں تو بارہ میل لمبائی ہوگی، اُن کی صفائی اور آراستگی میں پورے تین برس لگتے ہیں۔ اس کتب خانے کی بنیاد سر ہنس سلون ایک سائینس داں نے اٹھارھویں صدی میں رکھی تھی، شاہانِ وقت بھی اپنے ذاتی کتب خانے اس کی نذر کرتے رہے ہیں اور آج کل قریب تین ہزار رسالے اور اخباروں کی ہر سال جلدیں بندھوائی جاتی ہیں۔ علاوہ برٹش میوزیم لائبریری کے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں لاکھوں کتابیں ہیں۔ انکو یہ خاص حق حاصل ہے کہ از روئے کاپی رائٹ ایکٹ جو کتاب چھپے اس کی ایک ایک جلد ان کو مفت ملتی ہے۔

جرمن کے مختلف سرکاری کتب خانوں میں کتابوں کی تعداد چار کروڑ کے قریب ہے، یہی حال اٹلی کا ہے، اٹلی میں علاوہ سرکاری لائبریریوں کے میلان میں ایک مشہور و معروف ایمبروزین کتب خانہ ہے جو سرکاری انتظام کے ماتحت نہیں، اس کی بنیاد کارڈینل بوروميو نے ۱۶۰۹ء میں رکھی تھی، اس کے علاوہ پوپ کی لائبریری بھی بہت بڑی ہے جس میں نایاب قلمی اور چھپے ہوئے نسخے بیشمار ہیں۔

فرانس کی لائبریروں میں بہ لحاظ ذخیرہ معلومات نیشنل لائبریری دنیا کے سب کتب خانوں سے فضیلت رکھتی ہے۔ شاہ فرانس جان نے اس کو قائم کیا تھا جس کو بلیک پرنس (انگریز قوم) نے گرفتار کیا تھا۔ صدیوں تک یہی لائبریری رائل لائبریری رہی۔ انقلاب عظیم کے بعد چیدہ چیدہ کتابیں جمہوری حکومت نے علیحدہ کر لیں جنمیں بہت سے قلمی نسخے بھی تھے

مندرجہ بالا کتب خانوں کے علاوہ ایک نئی لائبریری امریکہ میں قائم ہو رہی ہے جو غالباً دنیا بھر میں سب سے بڑی ہوگی۔ ایک امریکن امیر کبیر نے اتنے ڈالر کولمبیا یونیورسٹی کو دئیے ہیں جن سے ایک عظیم الشان عمارت بنوائی جائیگی جس میں چالیس لاکھ جلدیں رکھی جائیں گی۔ کولمبیا یونیورسٹی بمقابلہ ہارورڈ و ییل نامی یونیورسٹیوں کے نئی اور زیادہ عام پسند ہے یہ شہر نیویارک کے نواح میں واقع ہے۔ گویا کیمبرج یونیورسٹی

سے جو پندرھویں صدی سے کتابیں جمع کر رہی ہے کولمبیا یونیورسٹی میں پرانی کتابیں ہوں۔ لطف یہ ہے کہ امریکہ میں پہلے ہی کتابوں کی کیا کمی تھی، آزادی کے عہد سے پہلے ہی بیشمار کتابیں اس قوم کے پاس تھیں جب کانگریس کی تنظیم ہوئی تو اُس کی تحویل میں پینتیس[5] لاکھ کتابیں تھیں۔

ہمارے ملک ہندوستان کے مختلف حصوں کی آب و ہوا مختلف ہے، سندھ کے بعض حصّے اور راجپوتانہ کے صحرا کو چھوڑ کر ہندوستان میں برساتی برودت اور نمی اتنی ہوتی ہے کہ معمولی کاغذ کی کتابوں کو کیڑہ کھا جاتا ہے، ورق آپس میں جُڑ جاتے ہیں، کشمیری کاغذ بھی اس برودت کی یورش کو نہیں روک سکتا۔ ہندوؤں کے زمانہ کی کتابوں کے قلمی نسخے بھوج پتر پر لکھے جاتے تھے اور روشنائی ایسے اجزا سے بنائی جاتی تھی جو دیرپا ہوتی تھی۔ اسلامی زمانہ میں بھوج پتر کا رواج کم ہو گیا اور اُس کے بجائے کاغذ کا استعمال شروع ہو گیا جو نمی سے محفوظ نہیں رہ سکتا اسی لئے جو قلمی نسخے دریافت ہوئے وہ کرم خوردہ نکلے۔ جہاں ریگستان زیادہ ہے یا بارش برائے نام ہوتی ہے مثلاً وسط ایشیا کے بعض مقامات اور مصر کا ملک جہاں بارش برائے نام ہوتی ہے پیپارس (Paparis) پر لکھی ہوئی کتابوں کو نقصان نہیں پہونچتا۔ ہندوستان میں انگریزی زمانہ میں کتابوں کا شمار بڑھتا جاتا ہے، چنانچہ کالجوں، یونیورسٹیوں، پبلک لائبریریوں اور نج کے کتب خانوں میں کتابوں کی کثرت ہو رہی ہے لیکن جب تک احتیاط سے ان کی خبر گیری نہ کی جائے اُن کے خراب ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اب غالباً وہ غارت گر تباہ کن لوگ دنیا میں موجود نہیں جن سے کتب خانوں کی بربادی کا اندیشہ ہو۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ یورپ اور ہندوستان میں ایسا کاغذ بنایا جائے جو نمی سے اثر پذیر نہ ہو اور کیڑوں کی خوراک نہ بن سکے، کاغذ میں دافع برودت قوت پیدا کرنی چاہیئے اور ایسے کیمیاوی اجزا کاغذ کی ساخت میں شامل کئے جائیں جو کیڑوں کو نزدیک نہ آنے دیں۔ علاوہ بریں روشنائی بھی ایسی بنانی چاہیئے جو دیرپا ہو۔ شہنشاہ جہانگیر نے کشمیر میں ایسی روشنائی دیکھی تھی جو پانی سے پھیلتی نہ تھی، یہ ترکیب اب کسی کو یاد نہیں رہی اس کا فن ساخت مفقود ہو گیا۔ غالباً بھوج پتر کی زرد روشنائی کی ترکیب بھی اب کسی کو معلوم نہیں۔ کتابوں کی افراط اور قلمی تحریروں کی کثرت اس امر کی متقاضی ہے کہ کوئی تجویز ایسی نکالی جائے جس سے مدت مدید تک کتب خانے محفوظ ہو جائیں، سنا گیا ہے کہ اب اس طرف ماہرین علم کیمیا توجہ کر رہے ہیں اور کتابوں کے تحفظ کی تجویزیں سوچ رہے ہیں، لیکن ہمارے خیال میں جب تک روشنائی اور کاغذ ایسے نہیں بنائے جائیں گے جو خود بخود اپنی حفاظت کر سکیں اس وقت تک محض جھاڑنے اور صاف کرنے سے کام نہیں چل سکتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کشمیری کاغذ کی ساخت میں سنکھیا ملایا جاتا تھا مگر یہ معلوم نہیں کہ اس کی اصلیت کیا ہے۔ لیئی ہیں جس سے جلد سازی ہوتی تھی تو تیا ملایا جاتا تھا جواب

بھی ملایا جاتا ہے لیکن یہ کافی کرم کُش نہیں، جن لوگوں کے نجی کتب خانے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر ایک سال بھی کتابوں کو دھوپ میں نہ رکھا جائے اور گرد وغبار صاف نہ کیا جائے تو کتابوں کو پھپھوندی لگ جاتی ہے۔ دراصل اس ملک میں برسات کی نمی اس قدر ہے کہ فوٹوگراف تک کیڑوں کے حملے سے نہیں بچتے۔ ہمارے کالجوں کی لیبوریٹریز (معمل) بجائے عامیانہ تجربات کے اگر اس اہم معاملہ کی جانب توجہ فرمائیں تو کیا عجب ہے کہ وہ اس ملک کی آب وہوا کو مدنظر رکھکر ایسی ترکیبیں معلوم کریں جن سے کتابوں کی حفاظت ہوسکے۔

ڈائٹ آف دی انڈینس

(انگریزی) کراؤن سائز۔ ۹۰ صفحات۔ مجلد قیمت ۸ر
ملنے کا پتہ: مسٹر جے۔ سی۔ باسک نمبر ۳۶۳۔ اپر چیت پور روڈ۔ کلکتہ

جیسا نام سے ظاہر ہے اس مختصر کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہندوستانیوں کو غذا میں کس قسم کی احتیاط رکھنی چاہیئے اور کون کون چیزیں مفید ہیں اور کن کن چیزوں میں کس قدر وٹامن (مایۂ حیات) ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بعض بیماریوں میں صرف پانی کے باقاعدہ استعمال سے فائدہ ہوسکتا ہے۔ آخر میں فاقہ کے فوائد دکھائے ہیں۔ غرض صحت جسمانی قائم رکھنے کے لئے، غذا کے باقاعدہ استعمال پر زور دیا گیا ہے اور اس کے طریقے بھی سمجھائے ہیں۔

اردو ہندی مالا

مولفۂ پنڈت ہری ہر شاستری پروفیسر انچارج عثمانیہ یونیورسٹی کالج حیدرآباد دکن۔ قیمت حصۂ اول ۶ر حصہ دوم ۸ر

یہ کتاب اُردو داں حضرات کو ہندی زبان آسانی کے ساتھ سیکھنے کی غرض سے مرتب کی گئی ہے اور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں ہندی کے حروف تہجی، ماترا (اعراب) وغیرہ سمجھائے گئے ہیں اور دوسرے حصہ میں مختصر مفید سبق درج ہیں۔ دونوں حصوں میں ہندی الفاظ وعبارت کے مقابل اُردو حروف میں وہی الفاظ اور مشکل الفاظ کے معنی بھی لکھدیئے ہیں۔ غرض ان دونوں حصوں کو بغور پڑھ لینے کے بعد ایک اُردو داں آسانی کے ساتھ ابتدائی ہندی سے واقف ہوسکتا ہے۔ مؤلف صاحب اعلیٰ ہندی سیکھنے کے لئے اس سلسلہ کی اور کتابیں بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ ان کی کوشش کی پوری قدر کی جائیگی اور یہ تالیف مقبول عام ہوگی۔

تنقید کتب

کھیتی از پروفیسر محمد مجیب، بی۔اے، (آکسن) کراؤن سائز ۸۰ صفحات۔ قیمت ۶؍
ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دہلی۔

جناب محمد مجیب صاحب بی۔اے۔ آکسن کا لکھا ہوا چار ایکٹ کا ایک مختصر ڈرامہ ہے، پلاٹ یہ ہے کہ بھگوان داس مل کے سامنے افتادہ زمین پر کچھ اہل اسلام نماز پڑھا کرتے تھے بعدہٗ اس زمین کو مالک مل نے خرید کر نماز کی ممانعت کر دی۔ اس پر عبد الغفور صاحب ایک خود ساختہ لیڈر نے جو قومی مفاد کی آڑ میں اپنے فائدہ کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ اپنے ہمقوموں میں جوش پھیلا کر جہاد کا اعلان کر دیا جس سے چند جاہل مزدور موثر ہو کر مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ لیکن کچھ سمجھدار لوگوں کی وجہ سے معاملہ رفت وگذشت ہو جاتا ہے اور انجام بخیر ہوتا ہے، ڈراما جتنا دلچسپ ہے اتنا ہی سبق آموز ہے۔ درحقیقت حال کے افسانوں یا "ادب لطیف" میں اتنے مختصر حجم کی اس سے بہتر کتاب مشکل سے ملیگی۔ آجکل جب ملکی فضا فرقہ وارانہ کشمکش سے مکدر ہو رہی ہے اور ہر شئے پر تعصب کا رنگ غالب آرہا ہے۔ ایسی سبق آموز اور اثر انداز کتابیں جتنی بھی لکھی جائیں کم ہیں۔ درحقیقت حال کے مایوس کن حالات میں ایسی کتابوں کی اشاعت تاریکی میں روشنی کی شعاع کے بمنزلہ ہے۔ اس چھوٹے سے ڈرامے کی زبان نہایت شستہ اور سادہ ہے۔ اس کے جملہ افراد ناظرین کے روبرو اس خوبی سے پیش کئے گئے ہیں جیسے کوئی سچا واقعہ سامنے پیش ہو رہا یا بیان کیا جا رہا ہو۔ درحقیقت قابل مصنف نے موجودہ فرقہ وارانہ ذہنیت کا بغور مطالعہ کر کے نہایت کامیابی سے اُسکا خاکہ کھینچا ہے

گناہ کی دیوار از مسٹر اشتیاق حسین قریشی ایم۔اے، کراون سائز۔ قیمت ۸؍
ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔

یہ مختصر ڈرامہ بھی جامعہ ملیہ پریس کا مطبوعہ ہے۔ جامعہ موصوف اُن چند اُن گنے اداروں میں

سے ہے جو اردو زبان میں نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے صحیح خیالات کی اشاعت کر رہے ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے ڈراموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ ان کو آدھ گھنٹے کی فرصت میں تمام و کمال پڑھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان ڈراموں میں محض دلچسپی کی خاطر عامیانہ عشق کی داستانیں بیان نہیں کی گئی ہیں بلکہ یہ ایک خاص مقصد کو پیش نظر رکھکر لکھے گئے ہیں۔ تقریباً ہر ڈرامہ میں کسی نہ کسی معاشرتی نقص کی جانب پڑھنے والے کی توجہ راغب کی گئی ہے۔ گناہ کی دیوار میں قابل مصنف نے یہ دکھلایا ہے کہ گناہ خود بُری چیز ہے لیکن انسان گر کر پھر اُٹھ سکتا ہے۔ نیز بعض اوقات انسان اپنے حالات کا شکار ہو جاتا ہے اور واقعات سے مجبور ہو کر گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کو اگر سوسائٹی کی طرف سے موقعہ دیا جائے تو وہ پھر اُبھر سکتے ہیں، لیکن ہماری سوسائٹی عام طور پر اور خصوصاً عورتوں کے معاملہ میں اس قدر سخت گیر واقع ہوئی ہے کہ وہ اتفاقیہ غلطی پر بھی بد قسمت گمراہوں پر اپنے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیتی ہے۔ کتاب شروع سے آخر تک نہایت دلچسپ و نتیجہ خیز ہے اور اس کا دیباچہ نہایت مفید و قابل غور ہے۔ ڈرامے کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک نوجوان اپنی حسین و خوبصورت بیوی سے صرف اس وجہ سے محبت نہیں کرتا کہ وہ اُس کی فرمانبرداری و پرستش کرتی ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کو ایک شوخ و شنگ رفیق زندگی ملے۔ اس نوجوان کا ایک عیّار دوست ان حالات سے واقف ہونے کے بعد کسی حیلہ سے اس کی بیوی کو بھگا لیجاتا ہے اور بمبئی میں ایک پیشہ ور عورت کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ عورت جو عفت و عصمت کی دیوی تھی بے شرمی و بے حیائی کی زندگی پر مجبور کی جاتی ہے۔ آخر ایک ہمدرد قوم اس عورت کو اس مصیبت سے نکالتا ہے، اور اس کو بھگا کر لانے والا اپنے اس مذموم فعل کی سزا پاتا ہے۔ ان واقعات کا علم اس عورت کے شوہر کو ہوتا ہے اور وہ اس کے پاس آکر اس کو ہمراہ لیجانا چاہتا ہے مگر عورت انکار کر دیتی ہے کہ اب میرے اور تمہارے درمیان گناہ کی دیوار حائل ہو گئی ہے۔

ہمزاد از مسٹر اشتیاق حسین قریشی۔ ایم۔ اے، کراؤن سائز۔ ۴۸ صفحات۔ قیمت ۶؍

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

ایک مختصر ڈراما ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک مالدار ضعیف العمر تاجر کی نوجوان بیوی کس طرح اسکو اپنی محبت کے فریب میں مبتلا رکھتی اور ایک غیر شخص سے تعلق پیدا کر لیتی ہے مگر تاجر کا قدیم نمک خوار ملازم تمام واقعات سے اس کو آگاہ کرتا اور آخر میں اپنے حسن تدبیر سے اس کو اس خوبصورت بلا سے نجات دلاتا ہے

اس ڈرامے میں تاجر کے ملازم کا کیرکٹر ہی اس کی جان ہے ڈراما دلچسپ و ...

الحمرا کے افسانے

از مسٹر غلام عباس۔ ڈبل کراؤن سائز۔ ۱۵۰ صفحات، مجلد، قیمت ۱۲ / ؁

ملنے کا پتہ: دار الاشاعت پنجاب۔ لاہور

الحمرا سلاطین غرناطہ کا وہ مشہور و معروف قصر ہے جو آجکل بالکل تباہ و برباد ہو جانے کے باوجود اہل نظر و اہل دل حضرات کی توجہ کا مرکز ہے۔ اپنے عروج کے زمانہ میں تو یہ محل یقیناً فردوس بریں کے ہمپایہ تھا اور اس کے متعلق اکثر مضامین اردو زبان میں لکھے جا چکے ہیں۔

امریکہ کا مشہور اہل قلم واشنگٹن ارونگ نے جب الحمرا کو دیکھا ہے تو اس کے نظارہ سے کچھ ایسا متاثر ہوا کہ اُس نے اس کے متعلق متعدد افسانے لکھے جن میں الف لیلہ کی طرح طلسم و سحر کا اثر دکھایا۔ ارونگ کے ان افسانوں میں سے پانچ دلچسپ افسانے انتخاب کر کے مسٹر غلام عباس نے مناسب تغیر و تبدّل کے بعد اُردو میں لکھا ہے۔

یہ افسانے دلچسپ ہیں، زبان بالکل سادہ اور اکثر جگہ عامیانہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بوڑھی عورت بچوں کا دل بہلانے کے لئے کہانیاں کہہ رہی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباسات سے زبان کا اندازہ ہو سکے گا۔

"جب میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ وہ جگہ جہاں پہلے چاروں طرف ریت کا سمندر موجیں مار رہا تھا اب وہاں ایک عالی شان شہر کھڑا ہے۔ میں بھونچکا سا رہ گیا، بار بار اپنی انگلیاں کاٹتا تھا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ آخر میں نے اس شہر کی سیر کرنے کی ٹھان لی اور اس کے عالی شان دروازے سے گزرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔"

"مدتیں گزر گئیں، الحمرا سے لوپ کے ایکا ایکی غائب ہو جانے کے بعد اس کی کوئی خبر نہ آئی۔ لوگ اس کے گیت اور لطیفوں کو یاد کر کر کے افسوس کیا کرتے۔ ان کا یہی خیال تھا کہ آخری وقت میں بچارے کو غریبی نے ایسا کچل ڈالا تھا کہ آخر غریب اپنا منہ کالا کر کے جدھر راہ ملی بھاگ نکلا۔"

افسانوں کے متعلق متعدد سادہ و رنگین بلاک کی تصویریں اور دستی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

حشیشین

مترجمہ اہلیہ مرزا محمد سعید ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس۔ کراؤن سائز۔ حجم ۲۳۲ صفحات

مجلد۔ قیمت ۱۲ / ؁ ملنے کا پتہ: دار الاشاعت پنجاب، لاہور

یہ سرہنری شارپ کے ایک افسانہ "دی اساسنز" کا اُردو ترجمہ ہے جس کو قابل مترجمہ نے مصنف اور پبلشر کی اجازت سے صاف وسلیس زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اس افسانہ کے موضوع کے متعلق مولوی محمد عنایت اللہ (ناظم شعبۂ تالیف و تراجم، جامعۂ عثمانیہ) مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"اس موضوع پر ہماری قوم کے مشہور و معروف فسانہ نگار شرر مرحوم کے بھی دو ناول ایسے ہیں جن میں اس کہنہ مشق ناولسٹ نے حقیقت میں اپنا کمال دکھایا ہے۔ ان کی شان بیان سے بالاتر ہے۔ مگر سادگی اور نظری اثر میں یہ انگریزی قصّہ ان سے بھی بڑھا ہوا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ شرر مرحوم کے "حسن بن صباح" اور "فردوس بریں" کے بعد سرہنری شارپ کے اس ناول نے اُردو شکل اختیار کرکے ہمارے افسانوں کے دفتر میں ایک بیش قدر اضافہ کیا ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس اس ناول کے موضوع کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔ ترجمہ سادہ اور دلچسپ ہے۔ مولوی عنایت اللہ صاحب نے اس پر نظرِ ثانی کی ہے۔ جن حضرات نے مولانا شرر مرحوم کے مذکورہ بالا ناولوں کا مطالعہ کیا ہے اُن کے لئے خصوصیت سے اس قصہ کو پڑھنا تفریح طبع کا موجب ہوگا۔ ناول پڑھنے کے عام شائقین بھی اس سے کافی طور پر محظوظ ہو سکتے ہیں۔ لکھائی چھپائی وغیرہ نہایت پسندیدہ ہے

میلاد النبی پروگرام

از محمد عبدالغفار صاحب مدہولی، کراؤن سائز ۴۸ صفحات

ملنے کا پتہ:- جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ قیمت ۸ر

اس کتاب کے دیکھنے سے جامعہ کے ابتدائی مراتب کے طرز تعلیم پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ ہمیں بڑی خوشی ہے کہ اس معاملہ میں جامعہ ملک کے دیگر مدارس سے بہت آگے ہے۔ تعلیم کا مقصد خود بچوں کی قدرتی ذہانت کی نشو و نما کرنا ہے نہ کہ کتابوں کا غلاف سی کر اُن کے گرد لپیٹ دینا ہے۔ یوم میلاد النبی کے متعلق خود بچے اپنا پروگرام بناتے ہیں، عرب کے متعلق معلومات بہم پہونچاتے ہیں اور حضرت محمد کی سوانح عمری پر نظم و نثر کے مضامین لکھتے ہیں۔

انقلاب دہلی

مرتبہ مولوی نظامی بدایونی، کراؤن سائز ۱۲۰ صفحات، قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ: نظامی پریس بدایوں،

یہ ان نظموں کا مجموعہ ہے جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب عظیم کے بعد مستند شعرائے اُردو نے دہلی کی تباہی و بربادی پر لکھی ہیں۔ اس زمانہ کے شعراء نے اس واقعہ کے متعلق اپنے اپنے جذبات دلی کا جو اظہار کیا

تھا، وہ ابتک منتشر حالت میں تھا۔ جناب نظامی بدایونی نے ان ...

ہے۔ ترتیب حروف تہجی کے قاعدہ سے کی ہے، اور ہر شاعر کی نظم سے پہلے اسکا نام اور سال پیدائش وغیرہ بھی جہاں تک معلوم ہوسکا لکھدیا ہے۔ شروع میں خواجہ حسن نظامی دہلوی کا لکھا ہوا ایک مختصر مقدمہ ہے اور اس کے بعد مرتب صاحب کی مختصر تمہید۔ منظومات کے آخر میں مرزا سودا کا وہ شہر آشوب اور دو اور نظمیں بھی شامل کردی ہیں جو انھوں نے نادر شاہ کے حملہ کی تباہی کے بعد لکھی تھیں۔ غرض وہ تمام نظمیں جو دہلی کی بربادی کے متعلق لکھی گئی تھیں قریب قریب سب اس مجموعہ میں موجود ہیں۔

مرتبہ ڈاکٹر راس مسعود المخاطب بہ نواب مسعود جنگ بہادر، رائل سائز ۲۶۲ صفحات

خطوط سرسید

قیمت ۳؎، ملنے کا پتہ: نظامی پریس بدایوں

سرسید مرحوم نے ملک و ملت کی بہبودی اور خصوصاً مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان سے دنیا واقف ہے۔ یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو سرسید مرحوم نے اپنے احباب و دوسرے حضرات کو لکھے تھے۔ ان کی تعداد تقریباً دو سو پچاس ہے۔ سرسید مرحوم ایک مصلح قوم تھے ادیب و شاعر نہ تھے۔ اس لحاظ سے ان کے خطوط میں کوئی ادیبانہ و شاعرانہ نکتہ تلاش کرنا بے سود ہوگا البتہ ان کے دل میں قومی خدمت کا جو جوش تھا وہ ہر ایک خط سے عیاں ہے۔ شروع میں سرسید مرحوم کی تصویر اور عکس تحریر کے علاوہ مولوی عبداللہ جان وکیل سہارنپور کا لکھا ہوا ایک مقدمہ بھی ہے جس میں سرسید مرحوم کے مختصر حالات، خدمات اور ان کی متعدد تصانیف پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ مجموعہ اب دوسری بار طبع ہوا ہے جس سے اسکی قبولیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

از مولوی محمد خلیل الرحمٰن صاحب سابق مدیر الخلیل بجنور، کراؤن سائز ۲۱۶ صفحات مجلد

اردو گلستاں

قیمت ۱۲؎۔ ملنے کا پتہ: دفتر اردو گلستاں، بجنور، یو۔پی۔

حضرت شیخ سعدی شیرازی کی گلستاں فارسی زبان کی وہ مشہور کتاب ہے جو سیکڑوں برس گزر جانے کے بعد آج بھی مفید مانی جاتی ہے۔ چونکہ موجودہ زمانہ میں فارسی زبان سے دلچسپی کم ہوگئی ہے اور اس طرح گلستاں کے پند و نصائح کا اثر محدود ہوگیا ہے لہذا صرف اردو داں حضرات کے مطالعہ کے لئے اس کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے۔ نثر کا ترجمہ نثر میں اور نظم کا نظم میں ہے، بعض حکایات یا ایسے فقرے جو طلبا کے لئے مفید نہیں سمجھے گئے اس میں سے نکال دیے ہیں اور اب بچہ سے لیکر بوڑھے تک ہر شخص اس کی اخلاقی تعلیم سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے، اور یہی مترجم کی غرض ہے۔ ہمکو امید ہے کہ سررشتہ تعلیم اس ترجمے کو اسکولوں کی انعامی کتاب میں شامل کریگا۔

شاعر سے خطاب

(از پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی، بی۔ اے)

چاہتا ہے آج جی میرا کہ دل کو چیر کر تیرے آگے ڈال دوں اے نکتہ پرور ذی ہنر
دل میں جو ہے صاف کہدوں بے تکلف بے خطر کیونکہ میں سمجھا ہوں تجھکو اہل دل صاحب نظر
ہے یہی تو قول تیرا بے بدل شاعر ہے تو
رمز حسن و عشق کا واقف ہے اور ماہر ہے تو

آئینہ تھا اور کوئی دیکھنے والا نہ تھا دل تھا دل میں خون تھا لیکن کوئی چھالا نہ تھا
لب تو تھے لب پر مگر آہوں کا پرکالا نہ تھا تھا قمر دنیا میں گرد اس کے مگر ہالا نہ تھا
تو نے بخشے حسن کو عشوہ ادا انداز و ناز
تو نے بخشا عشق کو بے آگ جلنا اور نیاز

عرش فرسا تیری آہ آتشیں کا ہے دھواں کانپتا ہے تیرے نالوں کی دھمک سے آسماں
درد کی تیرے کھٹک سے زلزلے میں ہے جہاں عرش و کرسی تک ہے لرزے میں وہ ہے تیری فغاں
آگ دنیا بھر کی تو کہتا ہے تیرے دل میں ہے
سوز عشق و جاں نثاری تیرے آب و گل میں ہے

آسماں کو اپنے نالوں سے ہلا دیتا ہے تو جوشِ گریہ سے پہاڑوں کو بہا دیتا ہے تو
آہِ سوزاں سے زمانے کو جلا دیتا ہے تو دھجیاں دامانِ محشر کی اُڑا دیتا ہے تو
ایک اعجوبہ زمانے کی ہے یہ ہستی تری
کیوں نہو، کشافِ رازِ دہر ہے مستی تری

ہیں ترے کیا کیا نہ احساں عالمِ ایجاد پر لاکھ ایماں صدقے تیرے کفر اور الحاد پر
تیری گردن سے جلا ہے خنجرِ جلاد پر خون جم جاتا ہے تیرا نشترِ فصاد پر
ہے مداوا سے ترے معذور جالینوس تک

چپ ہے طرّاری سے تیری صاحبِ قاموس تک

زندگانی ہے تری بے موت مرنے کے لئے — ماسوائے عشق ہرگز کچھ نہ کرنے کے لئے
دل کے پُرزے پُرزے کرنے آہیں بھرنے کیلئے — غوطہ زن گرداب میں ہے پار اُترنے کے لئے

اپنی کشتی کو نہیں لاتا کبھی ساحل کے پاس
لیکے خود تیغ و کفن جاتا ہے تو قاتل کے پاس

زخم پر اپنے بدن کے خود چھڑکتا ہے نمک — تیری ایذا طلبیوں سے چرخ کو بھی ہے جھجک
تیر جب آکر لگے تو اُس کو دیتا ہے تھپک — تجھ سا زحمت آشنا پیدا ہوا کب آج تک

رقصِ بسمل ہے تجھے رقصِ پری سے خوشگوار
تو ہے جانبازی کے فن میں انتخابِ روزگار

ہے جگر چورنگ تیر اور دل تیرا دونیم — کالے کوسوں دُور تجھ سے ہو گئے امید و بیم
ہے یہ تیرے دم قدم کا دہر میں فیضِ عمیم — جو قلوبِ انبساط آگیں بھی ہوتے ہیں الیم

دم میں ہنستے کو رُلا دینا ترا اعجاز ہے
دردمندی سے سخن کو تیرے سوز و ساز ہے

گو رہی تجھ سے ہمیشہ دُور یہ خانہ خراب — تو مگر آٹھوں پہر رہتا ہے بدمستِ شراب
گلستانِ عمر کا تو نے پڑھا پنجم نہ باب — پھر بھی تو تھکتا نہیں کرتے ہوئے ذکرِ شباب

کیوں نہ ہو حیران عقل اس قوتِ احساس پر
حسِّ نامحسوس۔ جذباتِ عمل نشناس پر

دل نہیں کھینچا کبھی تیر اور رم اور دام نے — بے حقیقت دولتِ دنیا ہے تیرے سامنے
عمر بھر تجھ کو ستایا چرخِ دشمن کام نے — دل ترا افسردہ رکھا گردشِ ایام نے

جب نہ تب عیش و طرب کا نغمہ گا جاتا ہے تو
نقش کو تصویر کے بھی وجد میں لاتا ہے تو

اِک غزل میں بارہا جیتا ہے اور مرتا ہے تو — جیتے جی تو کیا خطابت مر کے بھی کرتا ہے تو
معصیت کارہ کے خود معصوم دم بھرتا ہے تو — فتنے اُٹھتے ہیں جہاں شاعر! قدم دھرتا ہے تو

جھوٹ کو سچ کر دکھانا ایک تیرا کھیل ہے
ہو کے خاکی ناریوں سے ربط ہے اور میل ہے

بے حقیقت آپ کو سمجھا ہے یہ تیری ہے بھول   تو نہ ہے ساون کا اندھا اور نہ ہے اپریل فول
روضۂ رضواں کو شرمائیں ترے کاغذ کے پھول   شاہِ عاد و ترک تخشب تیرے آگے ہیں جھول

پتا ہے جب سرسوں ہتھیلی پر جما دیتا ہے تو
اور ریگستان میں کشتی چلا دیتا ہے تو

جاگتے جیتے دلوں کو آنجہانی کر دیا   غازۂ روئے بقا کو تو نے پانی کر دیا
تو نے اس تمثیل یزدانی کو فانی کر دیا   کام کی باتوں کو بس قصہ کہانی کر دیا

ان طلسم آرائیوں سے وہ غضب ڈھائے گئے
جو رہے ابلیس سے مصئوں وہ بہکائے گئے

چارہ گر، ناصح کہ شیخ و زاہدِ لعنت نصیب   سب سے تو نافر ہے، پھر کیا محتسب، کیسا رقیب
یہ تو یہ، آجائے درماں کو اگر تیرے طبیب   تو وہ لتے لے کہ بھٹکے پھر نہ وہ تیرے قریب

اے سڑی سودائی وہ تجھ سے اماں پائے کہاں
بس خدا دے بندہ لے، آئے تو اب جائے کہاں

روح فرسا ہے جہاں کو خامہ فرسائی تری   دشمنِ تسکینِ دل ہنگامہ آرائی تری
ہے سمومِ جاں گزا یہ بادپیمائی تری   ہونے کو ننگِ شرافت ہے شناسائی تری

پیشتر اس کے کہ پہنچائے زمانہ تجھ کو رنج
تو سنبھل جا چھوڑ دے یہ بدعتیں اے نکتہ سنج

یہ نہیں میں نے کہا تخریبِ عالم تجھ سے ہے   عافیت کا قتل ہے اور نیکی کا ماتم تجھ سے ہے
یہ نہیں الزام جو دنیا میں ہے غم تجھ سے ہے   ناک میں خلقِ حمیدہ کا مگر دم تجھ سے ہے

تیری کلکِ فتنہ زا سے ہیں اہرمن سیکڑوں
ترکئے ہیں رہ کے خود بے لوث دامن سیکڑوں

سامعیں پہ ہے جو تیری یاوہ گوئی کا اثر   قارئیں پر ہے جو یہ سحر آفرینی کارگر
تیری بڑ جو کام کر جاتی ہے قلبِ سادہ پر   اے مکرّم خاک بھی تجھ کو نہیں اس کی خبر

بیٹھے بیٹھے تو نے ساحل پر ڈبو دیں کشتیاں
خود اَمر رہ کر فنا کر دیں ہزاروں ہستیاں

یہ ظریفانہ ستم تیرا غضب ہے بے پناہ   غمزۂ معصوم نے تیرے کئے لاکھوں تباہ

سحر بے پروا کی تیرے پڑ گئی جس پر نگاہ مرتے دم تک پھر ملی اس کو رہائی کی نہ راہ
تو نے جب جادو جگایا قسمتیں تک سو گئیں
قوتیں افعالِ حسنہ کی معطل ہو گئیں

واہمہ ہے برق دم تیرا تخیل تیز ہے تیری سیدھی بات بھی گویا قیامت خیز ہے
بلبلِ تصویر کو نغموں سے تیرے ریز ہے تو عمل میں خاک، گویائی میں حشر انگیز ہے
بالقوی سب کچھ ہے تو بالفعل لیکن کچھ نہیں
تیرے آگے غیر ممکن اور ممکن کچھ نہیں

تیرے منظومات کو کہنا غلط ہے واہیات تو جو چاہے کر دکھائے رات کو دن، دن کو رات
عالمِ تکوین سے باہر ہے تیری کائنات ماند دنیائے تخیل سے ہیں تیرے عادیات
ہونی ان ہونی ہے یکساں تجھکو اے شعری شعار
تیرے آگے ہے معاذ اللہ معطل کردگار

تیرے ملفوظات ہیں یہ سب زبانی چٹکلے دلنشیں تیرے تصوف کیسے ہوئی کیونکر مسئلے
معرفت کی یہ ترنگیں یہ خیالی ولولے ہو گئے گمراہ جو اس تیرے مسلک پر چلے
ہاں مگر تلقین میں رندی کی تو اُستاد ہے
کیونکہ نسیاں اور خطا انسان کی بنیاد ہے

اِک نگاہِ غیر و غائر ڈال ان ابیات پر فخر ہے جن کی بدولت تجھکو اپنی ذات پر
تو کبھی تو غور کر اے سحر کار اس بات پر کیا اثر ہوتا ہے ان کا قوم کے جذبات پر
شعر تیرا نفسیاتی زندگی کو زہر ہے
کشتیِ اخلاق کے حق میں فنا کی لہر ہے

چونکہ ہستی ہے تری مافوقِ عادت سر بسر تجھ پہ ہو سکتی نہیں تعزیرِ رسمی کارگر
دیکھکر یہ اور قدرت نے بہت کچھ سوچکر ایک فرمانِ خصوصی وضع پر ڈالی نظر
بیشتر اس سے کہ وہ فرمان ہو زیبِ نفاذ
تو بدل دے ملغر کلکی کا اے شاعر محاذ

درد تیرے دل میں ہے تیری زباں میں ہے اثر پھونک دیتا ہے زمانے کو ترا سوزِ جگر
شادی و غم کو ترے یکساں ہے دوری و حضر خرقِ عادت گر تجھے کہدے تو کہدے بے خبر

میں تو سمجھا ہوں تجھے مافوق علمِ نفسیات
ہے یہی باعث کہ کہنا چاہتا ہوں ایکبات

(۲)

حسنِ عالمگیر کا ہو گر ترے دل میں شرار   گل سے بڑھکر نوک کی لینے لگے پھر تجھسے خار
ہو خزاں میں بھی تجھے محسوس اک شانِ بہار   ہو تجھے دستِ حنائی سے سوا برگِ چنار

حُسن کا چسکا ہے تو آ حسنِ عالمگیر دیکھ
حسنِ معنی حسنِ فطرت دیکھ۔ مت تصویر دیکھ

دل کی گہرائی میں تو غوطہ لگائے گا اگر   حُسن و رعنائی کا ایسا منظر آئیگا نظر
اک نیا پائے گی تیری ہستیِ ذہنی ڈھچر   دودھ پانی سا الگ ہو جائیگا عیب و ہنر

وہ فریبِ چشم تھا یہ سرمۂ تحقیق ہے
وہ جنوں کی لکیریں تھیں یہ نستعلیق ہے

بے پیئے سرشار جامِ بادۂ صہبا نہ بن   سب کہیں ناکارہ، لے مشفق جسے ایسا نہ بن
ہو کے انساں تو غزالِ وحشیِ صحرا نہ بن   محفلِ علم و عمل کی شمع کا پروانہ بن

وہ ضرورت کونسی ہے تجھ پہ جو ظاہر نہیں
علم اپنی قوتوں کا تجھ کو اے شاعر نہیں

تو تو ہے مالک تصور کا تخیل کا ولی   کونسی شے ہے یہاں کی تیری نظروں سے چھپی
ایک اچٹتی سی نظر تو نے جب ان پر ڈالدی   واقعاتِ دہر کی تجھ پر حقیقت کھل گئی

ہو کے عامل بالیقیں بزمِ دلاسائی میں آ
اُس ہوا منزل سے دارِ خاکی و مائی میں آ

کونسے منصف کو اس کے ماننے میں ہے کلام   تجھ سے باقی ہے فصاحت اور بلاغت انصرام
ناطقہ کو ہے تری شیوا زبانی سے قیام   ہے اثر اور جذب کا دم سے ترے دنیا میں نام

تجھ سے بس کہنا یہی ہے اب خدا کا نام لے
اور اس جادو بیانی سے حقیقی کام لے

کبتک اس گلشن کو خارستاں کہے جائے گا تو   اور ادائے ناز کو پیکاں کہے جائے گا تو
بلہوس کو بندۂ جاناں کہے جائے گا تو   اور نقلی کفر کو ایماں کہے جائے گا تو

کہہ تو کس مصرف کی ہے یہ فتنہ سامانی تری
ہے کفن کس لاش کا پوشاک عریانی تری

جب تری گندم نمائی ایسی پُر تاثیر ہے — جب تری یہ صُبح خیزی داعیٔ توقیر ہے
تیری فرضی بات میں جب یہ شکر اور شیر ہے — تیرے مفروضاتِ ذہنی میں جو یہ تسخیر ہے
کیا قیامت تو نہ کر دکھلائے اے معجز بیاں
گر حقائق کی پرستش کو بنا لے حرزِ جاں

آ کمر باندھ اور میدانِ عمل میں کود پڑ — تو نہ جھگڑا کر فلک سے اور قسمت سے نہ لڑ
ہے ترا پندار ہی تیرا رقیب اس سے جھگڑ — ہے عدو تیرا یہ تیرا واہمہ اِس سے بگڑ
دل میں تیرے واقعی احساس کا گر نور ہے
کل جو سنگِ راہ تھا تجھ کو وہ کوہِ طور ہے

ہے زباں میں تیری اے شاعر بھرا ایسا فسوں — تو اگر چاہے نکالے قیس کے سر سے جنوں
دیکھنے میں آئے دنیا میں بہت سے ذو فنوں — تجھ میں اعجازِ زباں جو ہے بیاں کیونکر کروں
غور سے سُن تجھ کو پہنچاتا ہوں پیغامِ عمل
کاش دے توفیق تجھ کو ایزدِ عزّ و جَل

اپنے ان جذباتِ مزمن کی ذرا کر روک تھام — کر مؤکّد اُن پہ یہ آئینِ فطرت کا پیام
قلب کے احساسِ اصلی کا زباں کو کر غلام — دے نہ اس دُنیا کو تو بازیچۂ اطفال نام
زندگی کو عارضی اور چند روزہ مان کر
ہو عوارض سے نہ بے پروا موانع سے نہ ڈر

کھول کر آنکھیں ذرا اپنے وطن کا حال دیکھ — حال دیکھ اہلِ وطن کا اُنکے تو اعمال دیکھ
زندگانی کے کشاکش اور اضمحلال دیکھ — تو زمانے کی ہوا دیکھ اور اس کی چال دیکھ
یہ نہیں کہتا ہوں میں تجھ سے یہ کر تو وہ نہ کر
خود سمجھتا ہے تُو جو کرنا ہے اے صاحب نظر

تجھ میں ہمدردی کا جوہر ہے کر اب اسیرِ عمل — تو اخوت کی [illegible] صورت میں کر دے منتقل
ہے جو یہ ہر رنگ ہم آہنگی اس کا ہو بدل — خلق کی خدمت میں ہے خلاق کی طاعت کا پھل
رازِ یہ عشقِ الٰہی کا بتانا تھا تجھے

مستِ خوابِ لاابالی بس جگانا تھا تجھے

دیکھتا ہے جانگزا کتنا ہے دردِ بغض و کیں　　ہے یہ وہ سم جس نے بس قوموں کی قومیں مار دیں
یہ سمجھ دو ناکسوں میں جب کبھی چوٹیں چلیں　　موردِ الزام یا دونوں ہیں یا کوئی نہیں
جو شدائد واقعاتِ عہدِ حاضر کے ہیں دیکھ
جو نتائج اور عواقب اس کے ہو سکتے ہیں دیکھ

میں نے مانا تو کوئی قاضی نہیں مفتی نہیں　　قول لوگوں کو ترا آیت نہیں شرعی نہیں
ہاتھ میں تیرے رفاہِ خلق کی کنجی نہیں　　ذات پر تیری فلاحِ انس و جاں مبنی نہیں
لیکن اے شاعر تجھے وہ قوتیں قدرت نے دیں
چاہے تو کر دے وطن کو رشکِ خلدِ بریں

ہو جہاں لعنت کا موقع اور نہ استغفار کا　　ہو نہ اک کو دوسرے سے دغدغہ آزار کا
کام میں ہو ہاتھ ہر دم اور دل ہو یار کا　　نام رکھا جائے عاصی جس جگہ بیکار کا
وہ مقامِ پاک ہے اے دوست دنیا میں بہشت
شہر یا جنگل ہو وہ کعبہ ہو یا دَیر و کنشت

تو کرشمہ اپنی اس جادو بیانی کا دکھا　　گمرہوں کو سیدھے رستے پر پلٹ کر پھیر لا
جس سے بہبودی خلائق کی ہو وہ راہیں بتا　　باندھ یہ نیت مدد پر ہے تری فضلِ خدا
تیرے قبضے میں ہے فن جسکو کہیں سحرِ حلال
انقلابِ قلب میں شاعر دکھا اپنا کمال

ایک ہے تیری نظر میں تو خدائی اور خودی　　تجھکو یکساں ہے زمانے کی بھلائی اور بدی
تو نے جزو و کل میں کب تمیز اور تفریق کی　　فرقِ شخص و عکس اے شاعر نہ تو مانا کبھی
بحرِ جمعیت میں کر دے جذبِ موجِ فرد کو
تا کہ یکرنگی وحدت جلوہ گر کثرت میں ہو

ہاں وطن کو یہ نویدِ ارتباط آہنگ دے　　افتراق و عندیت کو پھر پیامِ جنگ دے
پھونک وہ منتر کہ اک سُر بین، بربط، چنگ دے　　انفرادی زندگی کو اجتماعی رنگ دے
فرد بے مصرف ہے گر شامل جماعت میں نہیں
لفظ ہے ٹکسال باہر گر عبارت میں نہیں

مسکراتی سرستی سنکر مدھر بانی تری　　گل کھلاتی دشت و صحرا میں کی نوائی تری

کشورِ دل پر مسلّم تھی قلمرانی تری　　اب بھی ہے دل کی قلمرو میں جہانبانی تری

کیوں بھلایا ہے وہ تو نے نغمۂ ہند و حجاز

دے رہا ہے آس ابھی تک یہ ترا خاموش ساز

درد تیرے دل میں ہے ایثار گھٹی میں تری　　اشکِ حسرت خاکِ ارماں جذب مٹی میں تری

ہے کلید باب نصرت بند مٹھی میں تری　　ہے ابھی تک بادۂ شیراز بھٹی میں تری

کردے اک چھینٹے سے ان مردہ دلوں کو شور بور

عشق کے جھنڈے کے نیچے ان بھٹکتوں کو بٹور

بجلیاں بھر دے دلوں میں ہیں جو حسرت انتما　　سرد مہری کے جگر میں آگ الفت کی لگا

بھر دے ہر اک سر میں خودداری و غیرت کی ہوا　　پھونک دے وہ آگ تن من میں جو ہے طور آشنا

اس طرح کا یا زمانے کی تو اے شاعر پلٹ

اور تاریخ قدیمہ کے ورق کو دے الٹ

ورنہ پھر کس کام کی ہے یہ شرر باری تری　　کام کس دن آئیگی یہ حسِ غمخواری تری

آخر اے شاعر ہے کس مصرف کی طرّاری تری　　سب وسائل رہ گئے اب آئی ہے باری تری

وقت ہے اب شاعرِ شیوا بیاں لب کھول تو

راست اور ناراست میزانِ عمل میں تول تو

چھوڑ کر ماضی کی رٹ۔ رکھ حال کو مدِّ نظر　　کیونکہ اس کا ہی اثر پڑتا ہے استقبال پر

ترجمانی واقعی احساس کی عالم میں کر　　یہ صداقت کرلے اپنے دل پہ کالنقش الحجر

خلق کی خدمت میں ہے خالق کی طاعت اے عزیز

سروری اک قوم کی ہے اسکی خدمت اے عزیز

سُن لیا تو نے جو کچھ ہے عہدِ حاضر کا پیام　　ہو چکی ہیں تجھ پہ واضح اس کی تفصیلیں تمام

صاف نیت اور ہمت سے یہ سر ہونا ہے کام　　غیر ممکن واپسی ہے تیری بے نیل مرام

یاد رکھ تو ہے یہاں حب اور احساں کے لئے

فرضِ اولیٰ خدمتِ انساں ہے انساں کیلئے

کلام اثر

(از خانصاحب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی)

قاتل کا ہاتھ کانپا، آیا عرق جبیں پر
یوں ایک ناتواں نے سر رکھ دیا زمیں پر

نازاں جبیں ہے مجھ پر، نازاں ہوں میں جبیں پر
سجدے ہیں یا ستارے بکھرے ہوئے زمیں پر

مہتاب کی ہیں کرنیں غرقِ شراب گویا
ساغر نہیں ہے ساقی کے دستِ نازنیں پر

مَیں کیا بتاؤں کیونکر عہدِ فراق گزرا
نقش و نگارِ گریہ کچھ ہیں تو آستیں پر

منظور اُن کو اپنے بسمل کا امتحاں ہے
اے اضطراب رکھ دے اِک اور دل یہیں پر

اُس نے خموش رہ کر بے موت اُن کو مارا
حسرت جنھیں تھی دینگے جاں نذرِ اِک نہیں پر

شرمندہ ہیں اجل سے، محتاج زندگی کے
وقتِ اخیر ورنہ کیسا عرق جبیں پر

سرمایۂ جراحت بے منتِ جراحت
قربان عیش و راحت اس دردِ دلنشیں پر

اِک بیگنہ کے خوں کی اللہ ری سرایت
تڑپی ہے وہ زمیں بھی ٹپکا ہے جس زمیں پر

کہتے ہیں، دل نہیں ہے، ویرانہ ہے کبھی کا
کیونکر کہوں کہ زینت موقوف ہے مکیں پر

ہم اضطراب کشتہ، اب ہیں حجاب کشتہ
یا دیکھتے تھے ان کو، یا ہے نظر زمیں پر

جب ہم سے بات کرنا، غصے سے بات کرنا
دل بھی یوہیں لیا تھا، انصاف ہے تمہیں پر

یہ میرے بعد شاید آوارۂ چمن ہوں
پرواز کے تو شایاں صیاد اب نہیں پر

لبیک کہہ رہا ہے ایک اک لہو کا قطرہ
جاری ہے رقصِ بسمل، قاتل کی آفریں پر

چھینٹیں کہیں لہو کی، سرخی کہیں شفق کی
گلکاریاں ہیں کیا کیا مقتل کی سرزمیں پر

حیران تم ابھی تھے، بیتاب تم ابھی ہو
سچ سچ اثر بتاؤ مائل ہو کس حسیں پر

نوائے محوی

از مولانا محویؔ صدیقی لکھنوی (از مدراس)

کشاکش ہے امید و یاس کی میں ہوں مرا دل ہے
کبھی جینا ہی تھا دشوار اب مرنا بھی مشکل ہے

اجل آتی نہیں حد سے سوا بیتابیِ دل ہے
سفینہ در خورِ طوفانِ غم ہے دُور ساحل ہے

اُسی کو زندگی میں کچھ سکونِ قلب حاصل ہے
خیالِ یار میں فکرِ دو عالم سے جو غافل ہے

مرادیں بیکسوں کی بھی کبھی بر آتی ہیں یا رب!
یہ ممکن ہے تو ناکامِ تمنا کیوں مرا دل ہے

مجھے بھی کاش کچھ ملجائے حصہ اُس مسرت کا
کسی کا دل دُکھانے سے جو ظالم تجھکو حاصل ہے

کسی کا جلوۂ رعنا، کسی کا چہرۂ زیبا
نویدِ راحتِ جاں ہے، پیامِ عشرتِ دل ہے

یہ ہے غارت گرِ دل، ہوشیار اے انجمن والو!
جو اس اندازِ تمکیں سے بساط آرائے محفل ہے

تمہاری کم نگاہی کا گلہ مجھ کو نہیں لیکن،
تمنا مر کے پھر زندہ نہیں ہوتی یہ مشکل ہے

پڑے یا رب نہ اُس پر صبر کچھ میری تباہی کا
جو سب کچھ جانتا ہے پھر بھی حالِ دل سے غافل ہے

محبت میں مصائب سے کبھی اے دل نہ گھبرانا
دیا ہے جس نے یہ غم وہ کب اپنے غم سے غافل ہے

تجھے کیا علم رہنے دے، عنایت چارہ گر اپنی
کہ ہر اک زخمِ دل اک سرخیِ افسانۂ دل ہے

معاذ اللہ مصیبت اور وہ بھی شامِ ہجراں کی
نہ دکھلائے خدا دشمن کو بھی وہ حالتِ دل ہے

جو پیمانِ وفا باندھا تھا اُس کی لاج ہے ورنہ
محبت میں کسی کو جان دینا کوئی مشکل ہے

کبھی جس نے نہیں دیکھا تماشا رقصِ بسمل کا
خدا کی شان دنیا بھر میں وہ مشہور قاتل ہے

یہ تنہائی کی راتیں اور یہ بیتابیاں دل کی
یہی وہ زندگی ہے جسمیں جینا سب کو مشکل ہے

کیا ہے قتل محویؔ اک نگاہِ ناز نے جس کی
خدا کی شان میرے سوگواروں میں وہ شامل ہے

علمی خبریں اور نوٹ

پچھلے مہینہ ڈاکٹر ربیندر ناتھ ٹگور کی ستر ھویں سالگرہ کے جشن کے سلسلے میں نادر و نایاب تاریخی کتابوں اور قدیم تصویروں کی ایک نمائش ٹاؤن ہال کلکتہ میں ہوئی تھی جس میں منجملہ دیگر علمی نادرات کے فارسی زبان کے نامور شاعر فردوسی کے مشہور و معروف شاہنامہ کا ایک قیمتی و مطلا قلمی نسخہ بھی رکھا گیا تھا، یہ نسخہ چار جلدوں میں ہے اور اس کو مولانا امیر علی الکاتب نے شاہزادہ عبداللہ خاں ازبک کے دربار میں ۱۰۰۰ھ میں بخارا میں لکھا تھا۔ میر علی الکاتب اپنے زمانہ میں فن نستعلیق کے استاد کامل سمجھے جاتے تھے۔ اس نسخے کے ہر صفحے کے چار کالم ہیں، حاشیہ مطلا ہے، اس میں قدیم ایرانی وضع کی تیس تصاویر بھی ہیں جن کے حاشیہ پر سنہرے نقش و نگار ہیں۔ بخارا سے یہ نسخہ جہانگیر بادشاہ کے کتب خانہ میں پہونچا جس میں چوبیس ہزار نادر و مطلا کتابیں تھیں، چنانچہ اسکے سرورق پر جہانگیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک یادداشت موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہنشاہ موصوف کو یہ نسخہ اپنے چچا سلطان دانیال کی لائبریری سے ملا تھا۔

اس نسخے میں منجملہ دیگر حضرات کے شاہ صفوی (غالباً سلطان طہماسپ اول) کے لائبریرین سلطان دانیال، شاہنشاہ اکبر کے لائبریرین ملا حبیب اللہ، جہانگیر کے مصور خاص و لائبریرین ملا صالح کے قلم کے لکھے ہوئے نوٹ موجود ہیں، اور خود جہانگیر کی شاہی مہر ہے جس میں عبدالباری مراد جہانگیر بادشاہ لکھا ہوا ہے۔ اس پر شاہ بداغ خاں ابن سلطان عبدالمطلب، ملکہ زمانیہ بیگم، لطف اللہ اور نواب مرشد آباد کی مہریں بھی ہیں۔ مرشد آباد کی لائبریری سے یہ نسخہ اس کے موجودہ مالک مسٹر بہادر سنگھ سنگھی کے ہاتھ آیا جو کلکتہ کے مشہور قلمی کتب جمع کرنیوالے ہیں اور جنھوں نے یہ نسخہ اس موقعہ پر پیش کیا تھا۔

امتداد زمانہ کے باعث اس کتاب کی بعض تصاویر خراب ہوگئی ہیں البتہ تصاویر اچھی حالت میں ہیں، مگر کتاب کا اصل متن نہایت عمدہ حالت میں ہے۔

منشی رام دیال صاحب سکسینہ فنانشیل سکریٹری ریاست جاورہ کے انتقال پُر ملال پر ہم اظہار افسوس کر چکے ہیں۔ مرحوم نے اپنی وفات سے پہلے ہمارے پاس ایک مختصر مطبوعہ رسالہ موسومہ "قصیدہ مادھو مغل" زمانہ میں شائع کرنے کی غرض سے بھیجا تھا۔ یہ رسالہ آپ کے فرزند منشی جے دیال مرحوم کو مثنوی کاشی استت مصنفہ منشی من لال (ملاحظہ ہو زمانہ بابت جولائی ۱۹۳۱ء) کی تلاش کے سلسلہ میں دستیاب ہوا تھا یہ قصیدہ جو بار دوم ۱۹۱۳ء میں نولکشور پریس میں شائع ہوا تھا آجکل کمیاب ہے۔ اس کے شائع کرانیوالے منشی بھیم سین صاحب سکسینہ ساکن اٹاوہ ہیں، انھوں نے اس کے شروع میں قصیدہ کی شانِ نزول کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ مادھو مغل ایران یا افغانستان کا باشندہ ایک مسلمان شخص تھا جو مندر ناتھ دوارہ (واقع ریاست اودے پور) کی پرتمان کے درشن کرنے کے بعد سری کرشن مہاراج کے درشنوں کا طالب ہوا اور وہاں سے متھرا گیا۔ اس کی بھگتی کو دیکھکر اس کو سری کرشن جی کے مندر کے دروازہ پر کھڑے ہو کر درشن کرنے کی اجازت دیگئی، مگر مادھو مغل نے اس کو قبول نہیں کیا اور ایک مندر کے سامنے تین روز تک بے آب ودانہ پڑا رہا، تیسرے روز کہا جاتا ہے کہ سری کرشن جی نے مندر کے پوجاریوں کو خواب میں یہ نصیحت کی کہ ہمارا ایک مسلمان بھگت مندر کے دروازہ کے سامنے بھوکا پیاسا پڑا ہوا ہے اُس کو کھانا کھلاؤ۔ پوجاریوں نے مادھو مغل کو کچھ کھلانے پلانے کی کوشش کی مگر اُس نے انکار کر دیا اور یہی کہا کہ جب تک سری کرشن جی کے درشن نہ ہو جائیں گے اُس وقت تک میں کچھ نہ کھاؤنگا۔ چنانچہ پانچ روز اور وہ اسی طرح پڑا رہا۔ آٹھویں دن سری کرشن جی نے اس کو خواب میں درشن دیے۔ درشن کر لینے کے بعد اُس نے بیساختہ یہ قصیدہ موزوں کیا جس کے چند اشعار بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہیں

تا کے زخود رانی سخن سُنے کشن گوسی کشن گو — بگذر بیا از ما و من سی کشن گوسی کشن گو

دل را بادکن مبتلا جاں ساز در راہش فدا — از غیر رو گرداں جدا سی کشن گوسی کشن گو

آں پوتنا را از جزا بنگر چیاں دادش سزا — کاندر فنا لیش شد بقا سی کشن گوسی کشن گو

مادھو منوہر مُرلی دھر پیراہنش پیتامبر — مہرش بدلہا جلوہ گر سی کشن گوسی کشن گو

مادھو مغل محو شما اے کشن جی مشکل کشا
الطاف تو شد رہنما سی کشن گوسی کشن گو

ناظرین زمانہ میں سے اگر کوئی صاحب مادھو مغل کے حالات اور اس نظم کی تاریخی حیثیت پر اظہار خیال فرمائیں تو عین نوازش ہو۔

---

[1] سری کرشن کا مخفف

ہمارے محترم دوست مولانا عزیز لکھنوی کے پاس ایک بیاض حکیم محمد شریف خاں صاحب کی ہے جس میں اُن کے مجربات اور فوائد علمیہ اور نکات ادبیہ درج ہیں اور ایک صفحہ پر شیخ ناسخ مرحوم کی دستخطی عبارت بھی لکھی ہوئی ہے۔ چونکہ یہ تحریر قدیم آثار ادبیہ میں سے ہے لہٰذا زمانہ میں شائع کرنے کی غرض سے مولانا موصوف نے عنایت فرمائی ہے جو شکریہ کے ساتھ درج کی جاتی ہے:۔

استفسار:۔ لفظ تئیں خلاف محاورۂ حال است و متروک؟ مترقب کہ صحت و سقم دستخط شود، قائلے میگوید

تیرے تئیں سنگ دل کس نے نہ جانا صنم
شیشۂ دل پر عبث سنگ لگانا صنم

جواب شیخ امام بخش ناسخ:۔ ایں چنیں الفاظ البتہ متروک بندہ است والّا کسے ترک نکرد الی یومنا ہذا اساتذہ بلفظ مذکور را یا دیگر الفاظ متروکہ جائز داشتہ اند مطلقاً عیب نیست بندہ ہم معیوب نمی دارد و سوائے ایں قباحت در شعر مرقوم بنظر نمی آید و جناب قبلہ اگر غزلے بعد مدت دریں زمین موزوں فرمایند البتہ انشراح خاطر بندہ گردد۔

(دستخط) امام بخش ناسخ

---

۱۰ جنوری کو اعلیٰ حضرت خسرو دکن نے ریاست حیدر آباد کی سرکاری لائبریری کی نئی عمارت کا جو موسیٰ ندی کے شمالی کنارے پر تعمیر ہوئی ہے باضابطہ افتتاح فرمایا۔ یہ کتب خانہ نواب عماد الملک بہادر کی کوشش سے قائم ہوا تھا اور پیشتر ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک عمارت میں تھا۔ جدید عمارت میں اس سے کثیر التعداد علم دوست اصحاب فائدہ اٹھا سکیں گے۔

مشہور انگریزی عالم سر ڈینسن راس کا خیال ہے کہ تصاویر و نقوش و اشارات کے ذریعہ تمام دنیا کے لئے ایک آسان عالمگیر زبان اختراع کی جا سکتی ہے۔ اسی اصول پر جس پر سر ڈینسن کی تجویز کا دار و مدار ہے چینی زبان کے حروف بھی مبنی ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ مختلف قوموں کے باہمی تبادلۂ خیال کے لئے ایک ہزار سے زائد الفاظ کی ضرورت نہیں ہے، اور ان میں سے ہر ایک لفظ یا خیال کے لئے تمام دنیا کے استعمال کے واسطے ایک خاص نشان تجویز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس تجویز کی تکمیل کے راستے میں کافی مشکلات ہیں اسلئے ہم اس کو قابل عمل نہیں سمجھتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ دنیا کی سب سے ضخیم کتاب تبتی زبان کی "کنجر" نامی کتاب ہے جس میں مذہب کے موضوع

پر بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب دو سو جلدوں میں ختم ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا اس کو تبت سے پیکنگ لے جانے کی ضرورت ہوئی تھی تو اس کو اُٹھانے کے لئے سو قلیوں کی ضرورت پڑی تھی۔

فخر قوم لالہ لاجپت رائے آنجہانی کی یادگار میں میرٹھ کالج نے مضمون نگاری کے مقابلہ کی بنیاد قائم کی ہے جس میں آگرہ یونیورسٹی سے ملحق تمام کالجوں کے طلبا شریک ہوسکتے ہیں۔ اس مقابلہ کا مضمون "ہندو مسلم مسئلہ اور اس کا حل" تھا، اس موضوع پر بہترین مضمون مسٹر محمد ضیاء الاسلام متعلم مہاراجہ کالج جے پور کا قرار پایا، چنانچہ انھیں کو تمغہ موسومہ "لالہ لاجپت رائے گولڈ میموریل میڈل" دیا گیا۔

دنیا کی زندہ و ترقی یافتہ قومیں اپنے علمی ادبی سرمایہ کی توسیع کے لئے کس قدر کاوش اور صرف زر کرتی رہتی ہیں اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کی تیاری میں چھبیس سال اور تین لاکھ پاؤنڈ صرف ہوئے ہیں۔ اس لغت میں انگریزی کے اُنچاس ہزار الفاظ ہیں۔

حیدرآباد دکن ایک مدت سے مشرقی علوم کی سرپرستی کر رہا ہے اور وہاں کے اہل علم و اہل قلم بھی علوم مشرقی کی توسیع و ترقی میں نمایاں حصے لے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بزم تاریخ بھی قائم ہے جس کے مقاصد میں مشہور قدیم تاریخی کتب کی تلاش، دکن کی اسلامی تاریخ کی ترتیب اور اردو میں ایسے لٹریچر کی اشاعت ہے جن کی وجہ سے مطالعۂ تاریخ میں آسانی پیدا ہوسکے۔ اس انجمن کے صدر نواب سرامین جنگ بہادر اور سکریٹری حکیم سید شمس اللہ قادری ہیں۔ اراکین میں حیدرآباد کے سرآوردہ حضرات کے علاوہ الہ آباد، پنجاب، کلکتہ، مدراس وغیرہ یونیورسٹیوں کے ہندو مسلمان قابل پروفیسر اور لندن اور لیڈن یونیورسٹیوں کے علما شامل ہیں۔ اس انجمن کی سرپرستی میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے مندرجہ ذیل تین کتابیں تبصرہ کی غرض سے ہمیں وصول ہوئی ہیں۔ یہ تینوں کتابیں ہمارے مکرم دوست حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب نے مرتب کی ہیں۔ ہر کتاب پر تنقیدی مقدمہ لکھا ہے اور دوسری ضروری باتیں بھی اضافہ کی ہیں۔

(۱) نظام التواریخ (فارسی) اس کو قاضی ناصرالدین ابو سعید عبداللہ نے ۶۷۴ھ میں تالیف کیا تھا، اس میں ملوک عجم کی تاریخ و انساب ابتدائے آفرینش سے مؤلف کے عہد تک درج ہے۔

(۲) تذکرۂ مصنفین دہلی (فارسی) حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تالیف ہے۔ اسمیں ابتدائے

فتح اسلام سے سنہ ۱۱۰۰ھ تک دہلی میں جو مصنفین گزرے ہیں اُن کے حالات ہیں۔

(۳) تحفۃ المجاہدین (عربی) شیخ زین الدین بن عبدالعزیز کی تالیف ہے جس میں پرتگال کے بعض حالات ہیں۔

دارالمورخین کے پیش نظر مقاصد بجائے خود بہت اہم و مفید ہیں، لیکن موجودہ زمانہ کے لحاظ سے اگر ان کتابوں کو اُردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا جاتا تو یقیناً زیادہ مفید ہوتا۔ موجودہ صورت میں صرف خاص خاص حضرات ہی ان کے مطالعہ سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ بہرحال مرتب صاحب کی محنت و کاوش مستحق ستائش ہے۔

تینوں کتابیں رائل سائز پر طبع کی گئی ہیں۔ کتابت و طباعت صاف اور کاغذ سفید دبیز ہے قیمت کسی کتاب پر درج نہیں۔ اہل ذوق حکیم سید شمس اللہ قادری ایڈیٹر رسالہ "تاریخ" کوٹلہ اکبر جاہ حیدرآباد دکن سے خط و کتابت کریں۔

جامعہ ملیہ دہلی نے "اُردو اکاڈمی" کے نام سے تصنیف و تالیف کا ایک خاص شعبہ قائم کیا ہے۔ جس کا مقصد اردو زبان میں مختلف علوم و فنون پر مستند کتابیں لکھوا کے یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کرا کے شائع کرنا ہے۔ چنانچہ ابتک متعدد قابل قدر کتابیں طبع ہو چکی ہیں جن میں سے اکثر کا ریویو بھی زمانہ میں ہو چکا ہے۔ اکاڈمی کی طرف سے ایک علمی رسالہ "جامعہ" اور ایک تعلیمی رسالہ "پیام تعلیم" بھی جاری ہے۔ اور جو حضرات چاہیں چوبیس روپیہ سالانہ ادا کرکے اس کے رکن ہو سکتے ہیں، مزید سہولت کے لئے یہ رقم چار قسطوں میں سہ ماہی بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ اس کے عوض میں ہر سال اسی قیمت کی کتابیں ارکان اکاڈمی کو پیش کی جائیں گی، اور رسالہ "جامعہ" اور "پیام تعلیم" جن کا مجموعی چندہ ساڑھے سات روپیہ ہے بلا قیمت نذر کئے جائیں گے۔ اکاڈمی میں اُردو کی تمام مستند کتابیں، اور دوسری انجمنوں کی مطبوعات بھی فروخت کے لئے موجود رہتی ہیں اور اُس کے ارکان کو اپنے چندہ کی مقدار تک ان کتابوں سے بھی انتخاب کرنیکا اختیار ہے۔ ہم تمام شائقین ادب سے اس اکاڈمی کی امداد و اعانت کی اپیل کرتے ہیں۔ جو صاحب اس کے رکن بننا پسند فرمائیں وہ ناظم صاحب اُردو اکاڈمی جامعہ ملیہ دہلی کو اپنے نام اور پتے سے مطلع فرمائیں۔

ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اس طرف اُردو ہندی کی کئی قابل قدر تصانیف شائع کی ہیں

تازہ اُردو مطبوعات کے نام یہ ہیں :-

ترقی زراعت (حجم ۳۲۱ صفحات) از خانصاحب مولوی محمد عبدالقیوم صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت صوبۂ متحدہ - قیمت للعہ

قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب (حجم ۲۳۴ صفحات) از رائے بہادر مہامہوپادھیائے گوری شنکر ہیرا چند اوجھا، مترجمۂ منشی پریم چند - قیمت للعہ

ہندی شاعری (حجم ۲۰۲ صفحات) از ڈاکٹر اعظم کریوی قیمت عہ

کبیر صاحب (حجم ۱۵۲ صفحات) از پنڈت منوہر لال زتشی قیمت عہ

پچھلے نمبر میں جب ہم نے رائے بہادر بابو آنند سروپ صاحب پر مکرم و محترم منشی جوالا پرشاد صاحب بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی، وکیل کانپور کا قابل قدر مضمون شائع کیا تھا تو کس کو معلوم تھا کہ خود صاحب موصوف بھی ہمارے درمیان چند ہی روز کے مہمان ہیں۔ کچھ دنوں سے آپ کی ایک آنکھ جاتی رہی تھی، ادھر دوسری آنکھ میں بھی کچھ شکایت پیدا ہو گئی تھی جس سے وہ بہت نڈھال رہنے لگے تھے، خانگی تردوات بھی تھے اور بعض اعزا میں ناچاقی تھی، غرض ان وجوہ سے وہ کچھ اس درجہ دل برداشتہ ہو گئے کہ ۴ فروری کے سہ پہر کو اپنے مکان سے چل دیے اور اب تک باوجود تلاش ان کا کوئی پتہ نہیں ملا جس سے خوف ہوتا ہے کہ شاید کسی خاص دماغی ہیجان کی حالت میں اُنھوں نے اپنی زندگی ہی کا خاتمہ کر دیا۔ زمانہ کے مضمون میں اُن کے یہ الفاظ کہ "بابو آنند سروپ صاحب تو دنیا سے کوچ کر گئے مگر ان کے بعض دوست بھی" کمر باندھے ہوے چلنے کو اب تیار بیٹھے ہیں"۔ اس وقت ہم کو خاص طور پر اہم معلوم ہو رہے ہیں۔ بہرحال جو منظور الٰہی تھا ہوا۔ آپ کی مفارقت کانپور کی پبلک لائف کے لئے ایک حادثہ عظیم ہے جس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ اہل کانپور کے لیے آپ کی ذات بابرکات ہر طرح سے باعث فخر تھی۔ ابتدائے عمر سے لیکر آخر تک ان کی زندگی پبلک خدمات ہی کے لئے وقف رہی۔ چنانچہ پچھلے تیس سال کے اندر شہر میں رفاہ عام کا شاید ہی کوئی کام ایسا ہوا ہو جس میں اُنھوں نے صدق دل اور خلوص نیت سے سرگرم حصہ نہ لیا ہو۔ آریہ سماج اور دیانند کالج اور شہر کے متعدد ٹرسٹوں کے وہ ممتاز رکن اور معزز عہدہ دار تھے۔ کالج میں پروفیسر قانون اور شہر کی آنریری مجسٹریٹی کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔ آپ طبعاً حد درجہ منکسر مزاج واقع ہوئے تھے، صبر و تحمل ان کی فطرت کے خاص جزو تھے۔ نیک نفسی اور فطری شرافت کی وجہ سے وہ ہمیشہ ہر طبقے میں ہر دلعزیز رہے،

انکی طبیعت سادگی پسند تھی۔ چنانچہ اپنے آرام و آسایش کا کبھی کوئی خاص خیال نہ رکھتے تھے۔ غرض قدیم تہذیب اور اگلی وضعداری کے وہ ایک بہترین نمونہ تھے۔ اُردو ادب سے بھی انھیں خاص شغف تھا، اخبار و رسائل کے مطالعہ اور کتب بینی سے ان کی طبیعت کبھی سیر نہ ہوتی تھی اُنکی تحریر و تقریر دونوں دلپذیر ہوتی تھی، زمانہ سے اُنھیں ہمیشہ خاص دلچسپی رہی، تقریباً دس سال تک اس کا دفتر بھی ان کے دولت خانہ سے ملحق انہیں کے ایک دوسرے مکان میں رہا۔ اس دوران میں کارکنان زمانہ کو کبھی یہ محسوس نہیں ہونے پایا کہ وہ اپنے ذاتی مکان میں نہیں بلکہ کرایہ کی عمارت میں ہیں افسوس!

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

ہم کو افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ دسمبر گذشتہ کے پرچے میں زمانہ کی توسیع اشاعت کے متعلق ہم نے اپنے معزز ناظرین سے جو اپیل کی تھی اس پر ہمارے احباب نے کوئی خاص توجہ نہیں فرمائی، نئے سال کے آغاز ہی سے عام کساد بازاری کا اثر رسالہ کی آمدنی پر محسوس ہو رہا ہے۔ درحقیقت اس وقت تک اس کی مالی حالت قابل اطمینان نہیں ہو سکی ہے، ادھر کئی سال سے اس کے آمد وخرچ کا فرق اخبار آزاد کے منافع سے پورا ہو رہا ہے، یہ بھی واضح رہے کہ زمانہ پر بہت ہی جچے تُلے ہوئے اخراجات کیے جاتے ہیں اور ذاتی محنت وجفاکشی سے جس قدر کفایت ممکن ہے کیجاتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو شاید ابتک زمانہ کی زندگی ہی قائم نہ رہ سکتی، ہمارا خیال ہے کہ زمانہ اُردو ادب کی ایک خاص خدمت انجام دے رہا ہے۔ اور اگر قدردانان رسالہ بھی ہمارے ہم خیال ہیں تو ان کو اس کی امداد سے بے فکر نہ رہنا چاہیئے۔ امداد و اعانت کا آسان ترین طریقہ توسیع اشاعت ہے، پانچ روپیہ سالانہ معزز ناظرین کے اکثر احباب کے لئے کوئی بڑی رقم نہیں ہے جسے وہ اُردو ادب کی ترقی کے لئے آسانی سے نہ دے سکیں، بہرحال ہم ایک مرتبہ پھر اپنے علم دوست احباب سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے حلقۂ اثر میں زمانہ کے سرپرستی کی سفارش فرما کر ہماری امداد فرمائیں، ہمکو بھروسہ ہے کہ ہماری اپیل بیکار نہ ہوگی اور ہمارے قدرشناس اس پر جلد ہی توجہ فرما کر ہم کو شکریہ کا موقع دیں گے۔

سر محمد شفیع آنجہانی

آنریبل محمد شفیع آنجہانی مسلمانوں کے مسلّمہ لیڈر اور ملک کی قابل ترین ہستیوں میں تھے

...ہائیکورٹ کے بیرسٹروں میں آپ کا درجہ بہت ممتاز تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ سے بھی آپ کا دیرینہ تعلق تھا اور آپ اس کے مشہور رہنما تھے۔ تمام عمر آپ ملک و قوم کی بہتری کے کوشاں ... پانچ سال سے زائد یعنی ۱۹۱۹ء لغایتہ ۱۹۲۴ء آپ وائسرائے کی کونسل کے ممبر رہے ... یز کانفرنس کے دونوں اجلاسوں میں بھی بطور ڈیلی گیٹ شریک ہوئے تھے اور اس حیثیت ... آپ نے اپنی اعتدال پسندی اور ملکی بہی خواہی کا پورا ثبوت دیا، لندن سے واپسی پر ... لنسی لارڈ ولینگڈن نے آپ کو سر فضل حسین صاحب کی جگہ اپنی انتظامیہ کونسل کا قائم مقام ... رر فرمایا تھا مگر افسوس کہ آپ اس جلیل القدر عہدے کا بار سنبھالنے نہ پائے تھے کہ ایک مختصر علالت ... عد، جنوری ۱۹۳۲ء کو ۶۳ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

طلسمِ خیال

(از منشی اقبال ورما سحر ہتگامی)

چمن میں آئے فقط موسمِ خزاں کے لئے
جہاں میں ہم ہوئے پیدا غمِ جہاں کیلئے

عدم سے لائی تو ہستی میں تیری بیتابی
اب اضطراب ہے جانِ حزیں کہاں کیلئے

ہوا پدید جو سودا تو میرے سر کی غرض
بنا جو سر تو ترے سنگِ آستاں کیلئے

ہے اپنی گردشِ بختِ سیاہ ہم پیشہ
مباح ہے یہ ستم مجھ پہ آسماں کیلئے

نہ سازگار زمانہ ہے اور نہ تو اپنا
اثر کہاں سے ہو فریادِ بیکساں کیلئے

اسیر ہو کے ہوں ممنونِ شفقتِ صیاد
جگہ ملی تو مجھ آوارہ خانماں کیلئے

ملا جو مر کے تو پھر لطف کیا رہا زاہد
جو بے قرار رہے عیشِ جاوداں کیلئے

پکے ہوئے پیر
پھوڑے پھنسی اور
پرانے زخم
زمبک سے جلد شفا اور تسکین پاتے ہیں
پھوڑوں، پرانے زخموں اور گوشت خور زخموں کی حالتیں جنمیں سخت جلن۔ درد اور سوزش ہوتی ہو
زمبک اپنی حیرت انگیز شفا بخش خاصیت کا اظہار کرتا ہے۔
اوسط پیمانہ کے زخموں یا پھوڑوں پر زمبک کو براہ راست ڈبیہ سے لیکر لگا دینا چاہیے۔ جب زخم کا دائرہ
وسیع ہو تو روئی کے پھاہے یا صاف کپڑے پر زمبک کا موٹا پرت پھیلا کر لگانا چاہیے۔ اس خالص جڑی
بوٹی کے مرہم کے زیر اثر گرمی۔ درد۔ سوزش میں جلد افاقہ ہوجاتا ہے اور امراض مکمل طور سے دفع
ہوجاتے ہیں۔
زمبک کی تسکین بخش اور تریاق صفت خاصیت کیساتھ ساتھ شفا دینے کی قوت بھی حیرت انگیز ہے
بیمار اعضاء پھر سے مستقل طور پر قوی اور تندرست ہوجاتے ہیں کیونکہ زمبک جلد کے اندرونی ریشوں اور
مسامات کی از سر نو تعمیر کرتا ہے
چھاجن۔ خارش۔ کھجلی۔ داد۔ زہریلے زخم۔ بواسیر۔ شگاف۔ چیٹ۔ جلنا۔ جھلسنا۔ درد اور موچ
وغیرہ کے لئے بھی زمبک کو استعمال کیجئے۔ تمام انگریزی دوافروش زمبک فروخت کرتے ہیں قیمت ایکروپیہ۔
بڑی ڈبیہ کی قیمت دو روپیہ ۱۲/ ۔ ایجنٹ:۔ مسرز کے۔ بی محمد سعید اینڈ کمپنی مسٹن روڈ۔ کانپور
جڑی بوٹیوں کا حیرت انگیز مرہم
زمبک
Zam-Buk

بانی
ڈاکٹر ایس-کے-برمن
ڈاکٹر ایس-کے-برمن
پیٹنٹ
کلکتہ
منعقدہ
اسٹار
ٹریڈ مارک
SKB
رجسٹرڈ
سنہ ۱۹۲۳ء
"پچاس سالوں سے ہندوستانی پیٹنٹ دواؤں کے بے مثل موجد"
REGD:
"پشٹینا"
(مقوی باہ کی گولیاں)
اِس مقوی دوا کے استعمال سے معمولی کمزوری-نامردی-جریان-ہاتھ پیروں کا کانپنا-حولی دل-حافظ کی کمی اور تکان وغیرہ رفع ہوتی ہے-دوران استعمال دوا کا ہے گاہے ہماری تیار کردہ "جلابن" جلاب کی گولی سے معدہ صاف کرنا ضروری ہے-قیمت دو ہفتوں کی خوراک تیس گولیوں کی ایک روپیہ دو آنہ
قیمت جلابن بارہ گولیوں کی شیشی دس آنہ (۱۰؍) محصول ہر دو شیشی سات آنہ
قیمت نمونہ پشٹینا ۳؍ نمونہ جلابن دو آنہ (۲؍)
REGD
کیشراج تیل
(سر میں لگانیکے تیلوں کا بادشاہ)
یہ خوشبودار تیل بالوں کی جڑوں کو مضبوط اور دماغ کی خشکی دور کرکے تر و تازہ رکھتا ہے-یہ اُن مفید اجزا سے مرکب تیار کیا گیا ہے جو دماغ و آنکھوں کے لئے نہایت مفید ہیں-اسکی خوشبو دیرپا اور نہایت دل پسند ہے-اسمیں وعائٹ آئیل وغیرہ کوئی مضر صحت چیز شامل نہیں ہے-قیمت فی شیشی پندرہ آنہ ۱۵؍ محصول دس آنہ-قیمت نمونہ
نوٹ نمبر ۱:- ہمارے یہاں کی آیورویدک دواؤں کی فہرست چھپکر تیار ہو گئی ہے-طلب کرنے پر مفت روانہ ہوگی-
عام خریداروں کو نمونے صرف ہمارے ایجنٹوں ہی سے مل سکتے ہیں-
نوٹ نمبر ۲:- ہماری دوائیں ہر جگہ دوا فروشوں اور دوکانداروں کے یہاں ملتی ہیں-ڈاک محصول بہت بڑھ گیا ہے اِس سے بچنے کے لئے اپنے مقامی ہمارے ایجنٹ سے خریدیئے-
(صیغہ نمبر ۶۷) پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ
ایجنٹ:- کان پور نیا گنج میں محمد حفیظ-محمد نصیر صاحبان

لمی ذوق رکھنے والے حضرات مندرجۂ ذیل کتابیں ضرور منگائیں:

بزم خیال

ین اردو اور فارسی شعرا
ی مجالس کے لطائف ظرائف
برجستہ گوئی و حاضر جوابی کے
جمع کئے گئے ہین جو خوش
حضرات کی تفریح کا بہترین
سامان ہے
مت صرف ایکروپیہ عہ

ہندو تیوہاروں کی اصلیت

س کتاب مین منشی رام پرشاد
احب بی اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ
سکول بستی نے ہندو تیوہارو
اصلیت اور ان کی
رقیاتی کیفیت نہایت
واضح اور آسان زبان مین
ی ہے اس کے ساتھ ہی
ہندوؤن کا اخلاقی اور تمدنی
انتظام اور ہندو تیوہارونکی
ذہنیت پر اظہار خیال کیا ہے
ت فی جلد ۱۹

خاک پروانہ

منشی پریم چند کی تازہ ترین چودہ
منتخب مضامین کا مجموعہ پریم چند صاحب
کے افسانے کسی تعارف کے محتاج نہین
قیمت ایک روپیہ عہ

انتخاب اودھ پنچ

اخبار اودھ پنچ لکھنؤ کے ان مضامین
کا مجموعہ جو ۱۸۷۷-۷۸ء مین اسمین
شائع ہوتے تھے علاوہ اس کے بہت
سا تفریح کا سامان بھی موجود ہے
قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ

بہرام کی رہائی

تیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری کے بعد
اس کا پڑھنا نہایت ضروری ہے
قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ

خیالات عزیز

مجموعہ مضامین مولوی عزیز مرزا صاحب
جسکی باضابطہ رجسٹری ہوئی ہے حجم ۲۲۰
صفحات درق پر مصنف کی تصویر
خوشنما نگین ہے لکھائی چھپائی اعلی قیمت

گلزار داغ

فصیح الملک جناب داغ دہلوی کا
مشہور و مقبول دیوان ہے جو
حال مین حسن و خوبی کے ساتھ
شائع ہوا ہے داغ صاحب کا
کلام کسی تعارف کا محتاج نہین
قیمت بلحاظ دیوان صرف ۸ر

مثنوی سحر

یعنی شگفتہ و دلچسپ منظوم
حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال
کا اعجاز اول ایڈیشن کی قیمت
۶ر دوسرے ایڈیشن کی قیمت جسکی
مصنف نے نظر ثانی بھی کی ہے صرف ۸ر

مرقع ادب

حصہ اول و دوم مرتبہ جناب
صفدر مرزا پوری اس مین ہندوستان
کے مشہور انشاپرداز شعرا کے وہ
خطوط جمع کئے گئے ہین جو
انھون نے اپنے احباب وغیرہ
کو لکھے ہین قیمت حصہ اول
۸ر حصہ دوم عار

ملنے کا پتہ:- مینیجر زمانہ بک ایجنسی

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱

زمانہ

مرتبہ: دیا نراین نگم، بی۔اے

جلد ۵۸ | مارچ سنہ ۱۹۳۲ء | نمبر ۳

فہرست مضامین

تصویریں:- مہاراجہ جے چندر راٹھور کا دربار۔ ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور۔ حاذق الملک حکیم اجمل خانصاحب مرحوم۔

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت فی پرچہ ۵/ — قیمت سالانہ صہ/

قیمت سالانہ ممالک غیر سے مع محصول ششماہی صہ/ — ہندوستان سے ششماہی قیمت تین روپیہ

ربیندر ناتھ ٹیگور کا جنم بنگال کے ایک قدیم معزز اور دولتمند گھرانے میں ہوا تھا، اُن کا سنہ ولادت ۱۸۶۱ عیسوی ہے اور مقام ولادت کلکتہ۔ اُن کے والد ماجد دیویندر ناتھ ٹیگور برہمو سماج کے مقتدر لیڈر تھے۔ اُن کے روحانی کمال کا یہ عالم تھا کہ لوگ اونھیں مہرشی کے مقدس لقب سے یاد کرتے تھے، اُن کی والدہ میں بھی وہ تمام اوصاف موجود تھے جو ایک بہترین ہندوستانی خاتون کا حصہ ہوتے ہیں۔ اِس طرح ٹیگور کو خوش قسمتی سے بہت سی پاکیزہ خصلتیں اور روحانی برکتیں اپنے والدین سے ورثہ میں ملی ہیں، مگر قدرت نے اُن کو اپنے ماں باپ کے فیضانِ صحبت سے کما حقہٗ مستفید ہونے کا زیادہ موقع نہیں دیا۔ ربیندر ناتھ ٹیگور ابھی بہت ہی کم سن تھے کہ اُن کی والدہ نے داعی اجل کو لبیک کہا، اُدھر اُن کے والد کی مذہبی مصروفیتیں مانع ملاقات ہو رہی تھیں چار و ناچار ٹیگور کا بچپن زیادہ تر مکان ہی کی چار دیواری کے اندر یا تو ایک کمرہ میں گذرا یا نوکروں چاکروں میں۔ غرض ان مجبوریوں سے وہ تنہائی پسند ہو گئے، مگر تنہائی میں بھی وہ بیرونی دنیا کی گوناگونیوں کے متعلق برابر خیال کرتے رہتے تھے جس کی بدولت اُنھیں بار بار یہ خیال آنے لگا کہ کوئی بہت ہی عزیز دوست غائبانہ طور پر ہر وقت اُن کے پاس موجود رہتا ہے۔ انھیں خیالات میں ہم کو اس شاعر اعظم کے تخیل کی پرواز کا سراغ ملتا ہے۔ انھیں کی بدولت ہم اُن قدرتی مدارج سے روشناس ہوتے ہیں جو صانع قدرت کی موجودگی کا اظہار کرتے ہوئے بالآخر اُس تک رسائی حاصل کرنے میں زینے کا کام دیتے ہیں۔

جب ٹیگور پیدا ہوئے اُس وقت بنگال میں دو انقلابات عظیم رونما ہو رہے تھے جنھوں نے آگے چلکر وہاں کی مذہبی اور ادبی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی پہلے کے بانی راجہ رام موہن رائے اور دوسرے کے پیشوا بنکم چندر چٹرجی تھے۔ ایک برہمو سماج کے ذریعہ مذہب کو زیادہ سے زیادہ قابل قبول شکل دیتے ہوئے مذہبی رواداری اور انسانی مساوات کے لئے کوشاں تھا اور دوسرا اپنے ادبی کارناموں کے ذریعہ بنگلہ زبان میں جدت و ترقی کے دَور کی بنیاد ڈال رہا تھا۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا انقلاب بھی تھا جو ملکی اور دنیوی نقطۂ خیال سے نہایت اہم تھا اور جس کا تعلق ہندوستان کی فن مصوری سے تھا جو اپنی فطری اور روحانی سادگیوں سے مغربی مصوری کی مادّی اور مصنوعی رنگینیوں کو بے رونق اور ناپسندیدہ بنانے پر تلا ہوا تھا۔ ان تینوں تحریکوں میں ٹیگور کے گھرانے والوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ بہر حال جس انقلابی ماحول میں ہونہار شاعر کا جنم ہوا تھا اس سے اس کا دل متاثر بھی ضرور ہوا، مگر ٹیگور کی زندگی پر یہ اثر خالص شاعرانہ طریقہ پر نظر آ رہا ہے، اسی کی بدولت اس کے تخیل میں روحانیت، طرز تحریر میں جدّت اور کلام میں ندرت آفرینی کا عنصر غالب آ گیا۔

ٹیگور نے ابتداءً اس وقت کے رواج کے مطابق ایک پاٹھ شالا میں پڑھنا شروع کیا، مگر وہاں کی پابندیاں اور اُستاد کی سخت گیریاں اُن کے آزادی پسند اور نازک دل پر گراں بار ہوئیں اور سب سے زیادہ یہ بات تھی کہ ان کا دل ایسی تعلیم میں کسی طرح نہ لگ سکتا تھا جو اُنھیں چاروں طرف کی دنیا سے سرد مہری کے ساتھ الگ رکھتی تھی۔" غرض جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں، "انھوں نے تیرہ سال ہی کی عمر میں اُس تعلیم سے نجات حاصل کر لی جو اُنھیں معمولی اسباق کی سنگی دیواروں میں مقید رکھنا چاہتی تھی۔" بہر نوع انھوں نے کسی اسکول یا کالج میں کبھی نہیں پڑھا اور لطف یہ کہ اس کو وہ اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں، اُن کے والد نے خانگی تعلیم کے لئے ایک ماسٹر مقرر کر دیا تھا، اس کے علاوہ سترہ سال کی عمر میں اُنھوں نے انگلستان جا کر ایک سال تک وہاں انگریزی علم و ادب کا درس لیا۔ اس سلسلے میں انھیں نامور ادیب و مصنف جان مارلے (بعدہٗ لارڈ مارلے) صاحب کے سامنے بھی زانوئے ادب تہ کرنے کا موقع ملا۔ پہلے ان کا ارادہ بیرسٹری کی سند حاصل کرنے کا تھا مگر وہ پورا نہ ہوا۔ درحقیقت قدرت تو اُنھیں ایسا شاندار کام سپرد کرنے جا رہی تھی جس سے اُس کے راز ہائے سربستہ منکشف ہو کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیں۔

ٹیگور کے خاندان کے تمام افراد کو موسیقی، مصوری اور شاعری سے گہری دلچسپی تھی، اور ٹیگور کے فطرتی رجحان نے ان کو بھی اُنھیں فنون لطیفہ کی جانب مائل کر دیا تھا، چنانچہ اُن کا کلام ہر سہ کمالات کا ایک مرقع ہے۔ اور شاعری کے علاوہ وہ مصوری اور موسیقی میں بھی کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے کتنے ہی نئے طرز کے گیت بنائے ہیں، اُن کی خوش الحانی کا یہ عالم ہے کہ سامعین اُن کی مادری زبان سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی اُن کا گانا سنکر مسرور ہو جاتے ہیں، ان کو بحیثیت فن ناچ سے بھی دلچسپی ہے، اور یہ انھیں کی تلقین کا نتیجہ ہے کہ اب معزز بنگالی سوسائٹی میں مستورات کے لئے گانا یا ناچنا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ٹیگور ڈراموں میں بھی شوق سے پارٹ لیتے ہیں اور اُسے شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے اظہار کا ایک کامیاب وسیلہ سمجھتے ہیں۔

تیئیس ۲۳ سال کی عمر میں ٹیگور کا بیاہ ہو گیا، جس کے بعد اُن کے والد بزرگوار نے اُنھیں زمینداری کی دیکھ بھال کے کام پر تعینات کیا۔ چنانچہ اس خدمت کی تکمیل کے لئے انھیں دیہات جاتے اور وہاں قیام کرنے کا موقع مل گیا۔ پہلے تو انھیں شہر کی چہل پہل سے جدا ہو کر دیہات کی نسبتاً سونی فضا میں رہنا شاق ہوا، مگر مجبوری معذوری کا معاملہ تھا۔ چند ہی دنوں کے بعد رفتہ رفتہ ان کی طبیعت دیہاتی زندگی سے بہت مانوس ہو گئی، اور بالآخر ایک دن ایسا آیا کہ دیہاتوں اور وہاں کے باشندوں

کی اصلاح کرنا ہی اُن کی زندگی کا ایک خاص مشن بن گیا جس کی تکمیل میں وہ ابھی تک ہمہ تن مصروف ہیں
۱۹۰۱ء کے قریب اُن کے پدر بزرگوار نے کلکتہ سے تقریباً سو میل کی دوری پر شانتی نکیتن آشرم کی تعمیر کرائی۔ اس میں کچھ لڑکے بھی آکر پڑھنے لگے، رفتہ رفتہ طلبار کی تعداد بڑھتی گئی جس سے آخر کار ٹیگور کو اس آشرم کو اسکول کی صورت میں منتقل کرنا پڑا، اُن کو اس کام سے بیحد دلچسپی بھی ہوگئی اور اسے اپنے مجوزہ اصلاحات کا ایک بڑا ذریعہ سمجھنے لگے۔ وہ شروع ہی سے ایسے قدرتی طریقۂ تعلیم کے دلدادہ تھے جس کے مطابق لڑکے اسی شوق اور آزادی کے ساتھ پڑھ سکیں جس طرح وہ کھیلتے ہیں۔ وہ ابھی اپنے لڑکپن کی وارداتِ قلب کو بھولے نہیں ہیں، اس لئے وہ اب تعلیم کو متعلم کی شخصیت کے ارتقا کا ایک مکمل ذریعہ بنا دینا چاہتے ہیں۔ مگر اس کے واسطے ضرورت تھی کہ وہ خود نمونہ کے طور پر ایک درسگاہ قائم کریں مگر اس کے لئے سرمایہ درکار تھا اس کے لئے ٹیگور کو ابتدا میں اپنی کتب کا کاپی رائٹ فروخت کرنے کے علاوہ اپنی اہلیہ محترمہ کا زیور بھی فروخت کرنا پڑا، طلبار کو بھی اُنھیں خود پڑھانا پڑا، مگر اُن کی دلی لگن کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی چھوٹا اسکول ترقی کرتے کرتے ۱۹۲۱ء میں بشو بھارتی نام کا دارالعلوم بن گیا۔ اب وہاں ادبی تعلیم کے ساتھ مصوری، موسیقی، زراعت، صنعت و حرفت کے سیکھنے کا پورا انتظام ہے۔ اور ان سب شعبوں کے لئے مختلف اسکول ہیں، اس کے علاوہ چند اور شعبے بھی ہیں جن میں دیہاتوں کی تنظیم، حفظانِ صحت و صفائی وغیرہ کے متعلق ضروری تحقیقات و بندوبست ہوتا رہتا ہے تاکہ عام تعلیم کی اشاعت کی غرض سے حسب ضرورت اسکول بھی کھولے جاسکیں۔ دیہاتوں میں زراعتی نمائشیں بھی کی جاتی ہیں اور بچوں کو بُنائی جلدسازی اور لکڑی و چمڑہ وغیرہ کے کام سکھائے جاتے ہیں۔ دارالعلوم میں ایک عالی شان کتب خانہ بھی ہے جس میں تقریباً ہر زبان کی بہترین کتابیں موجود ہیں ایک مطبع بھی ہے۔ اسکول کے لئے ضروری عمارتیں ہوتے ہوئے بھی طلبار کو درختوں کے نیچے زمین کے قدرتی فرش پر بٹھا کر پڑھایا جاتا ہے۔ پڑھانے والوں میں امریکہ، انگلستان، جرمنی، اٹلی وغیرہ کے علما اور پڑھنے والوں میں مغربی ممالک کے طلبار بھی ہیں، ٹیگور نے بشو بھارتی کو اسم بامسمّٰی بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ شانتی نکیتن میں رنگ، نسل، یا مذہب کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا ہے اور طلبار کے فطری رجحان کے مطابق زبان اور پیشہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہندوستان کے سبھی خاص خاص فرقوں کے تمدنی، معاشرتی اور مذہبی خصوصیات کے متعلق واقفیت پیدا کرادی جاتی ہے۔ اور لوگوں کو باہر سے بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ ٹیگور محبت کی ہمہ گیریت کے حامی ہیں اور بشو بھارتی کے ذریعہ وہ اپنے پیامِ محبت کی تمام دنیا میں اشاعت کر رہے ہیں۔
ظاہر ہے کہ ان سب باتوں کے لئے کتنے وسیع عملی تجربہ اور مشاہدہ کی ضرورت ہے۔ اسی لئے ٹیگور

نے کئی بار تمام دنیا کے خاص خاص ممالک کا سفر کیا جس سے انگلستان، فرانس، جرمنی، اٹلی، امریکہ، چین، جاپان، ملایا کے باشندوں کو بھی اُن کی درویشانہ شخصیت سے متاثر ہونے کا موقع ملا۔ اس سیر و سفر کی بدولت نہ صرف اُن کی معلومات میں اضافہ ہوا نہ صرف انکو انسانی فطرت کی گوناگونیوں اور مناظر قدرت کی بوقلمونیوں پر گہری نظر ڈالنا نصیب ہوا بلکہ انھوں نے دنیا کے کانوں کو اس پیغام سے بھی آشنا کر دیا جسے وہ بھارت کا خاص پیغام سمجھتے ہیں اور جسمیں وہ روحانیت مضمر ہے جس کی بدولت ان کو یقین ہے کہ دنیا کی حالت بہتر بن سکتی ہے۔ اُنکی بعض تقریریں جو انھوں نے ممالک غیر میں ارشاد فرمائیں اُنکی سادھن نامی کتاب میں شائع بھی ہو چکی ہیں۔

اس روحانیت کو اُن کی ذات میں کیسے فروغ ہوا؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ کس ماحول میں پیدا ہوئے تھے، وہ ابتدا ہی سے مناظر قدرت کے شیدائی تھے، دن میں نیلا آسمان، چمکتا ہوا سورج، رنگ رنگ کے بادل اور رات میں نکھرا ہوا چاند، ٹمٹماتے ہوئے ستارے، برق و باراں کا سیاہ سفید منظر، غرض سبھی اُن کی طفلانہ توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا کرتے تھے۔ ان کو دیکھتے دیکھتے اکثر ہمارے ننھے شاعر پر بیخودی کا عالم طاری ہو جاتا تھا، اُس کا دل محبت و روحانیت کے جذبات سے متحرک رہتا تھا اور وہ اسی کوشش میں رہتا تھا کہ کسی طرح اپنی چھوٹی سی ہستی کو قدرت کے اُن دلفریب مظاہر میں جذب کر دے جو اُس کے لئے بمنزلہ عجائبات تھے۔ بارہ سال کا بچہ ٹیگور اکثر اپنے والد کی الماری سے وشنو بھجنوں کی کتاب نکالکر پڑھتا اور محظوظ ہوتا تھا، آخر سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں ٹیگور نے خود نظمیں کہنا بھی شروع کر دیا، جن سے عموماً اُس عالمگیر محبت کا انکشاف ہوتا تھا جسے روحانیت کی پہلی منزل سمجھنا چاہیئے۔ پینتیس ۳۵ سال کی عمر میں اُنھیں کچھ ایسے صدمات پے در پے لاحق ہوئے جنھوں نے تیزی کے ساتھ انھیں اس منزل سے بہت آگے بڑھا دیا۔ یہ صدمات اُن کی اہلیہ محترمہ، اُن کی لڑکی اور اُن کے لڑکے کی موت تھی جن کے سبب اُن کی طبیعت ایک دم روحانیت کی جانب مائل ہو گئی اور اُن کا کلام اُسی اعلیٰ جذبہ کی خوبیوں سے معمور نظر آنے لگا۔ ہر حالت میں صابر و شاکر رہنے والے شاعر نے اُس وقت اپنے دوست مسٹر اینڈریوز سے یہ کہا تھا: "یہ موتیں مجھے گویا ایشوری بردان (خدائی برکت) معلوم ہوئیں اور میں نے سمجھ لیا کہ اب میری زندگی کی تکمیل ہو گئی ہے۔" ٹیگور کے بعد والے کلام کو اسی تکمیل کا ایک نادر نمونہ کہنا بیجا نہ ہوگا جس کا جزوی رنگ اُن کی "گیتا نجلی" میں نمایاں ہے جسے اُنھوں نے ۱۹۱۲ء میں ولایت جاکر تیار کیا تھا۔ یہ کتاب ان کی بعض بنگالی نظموں کا انگریزی ترجمہ ہے جو اُن کی بنگلہ گیتا نجلی اور دیگر کتب سے منتخب کی گئی ہیں۔ اگرچہ ترجمہ میں اصل کا لطف باقی نہیں رہتا پھر بھی اُس نے یورپ کے علم دوست اور سخن فہم حضرات کو اس درجہ متاثر کیا کہ دوسرے ہی سال ۱۹۱۳ء

میں ٹیگور کو اسی کتاب کی بدولت سوا لاکھ کا نوبل انعام ملا، جسے اُنھوں نے اپنی شاعرانہ بے نیازی اور فراخدلی سے شانتی نکیتن کے حوالہ کر دیا۔ اس انعام سے نہ صرف اُن کی شہرت چاردانگ عالم میں پھیل گئی بلکہ اُن کی حیثیت بھی بین الاقوامی حیثیت خیال کی جانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی گیتانجلی نے دنیائے شاعری میں ایک ایسی اعلیٰ شاہراہ قائم کر دی جس پر چلنا زمانۂ آیندہ کے شعرا اپنا متبرک فرض خیال کرینگے۔ اور اس طرح اُس دورِ روحانیت کے وجود میں لانے میں معین ہونگے جسے قدرت کسی نہ کسی روز دنیا میں لا کر رہے گی۔

گیتانجلی کے علاوہ نظم اور نثر میں ٹیگور نے مختلف موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں جو شائع ہو چکی ہیں۔ وہ اس قدر سن رسیدہ ہونے پر اب بھی برابر لکھتے جا رہے ہیں۔ پیرانہ سالی نے اگر اُن کے دماغ پر کوئی اثر ڈالا ہے تو یہی کہ اس میں اور زیادہ پختگی آگئی ہے۔ علم ادب کے علاوہ ناٹک، ناول، کہانی، گیت، متفرق مضامین، سبھی کے متعلق اُن کی کتابیں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ابتک وہ کئی ماہوار رسالوں کے کامیاب ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ اُن کی ذات نظری اور علمی محاسن کا ایک نادر و نایاب مجموعہ ہے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُنھوں نے محض اپنی ذاتی مساعی کی بدولت اس قدر اخلاقی عظمت اور علمی ترقی حاصل کی اور پھر اُس ترقی کو کتنے علمی کاموں کے لئے وقف کیا تو ہم حیرت سے انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں۔ اپنے مطالعہ کو انھیں وسیع بنانے کا کس قدر شوق ہے، اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے جرمنی کی ایک مشنری خاتون سے چند ماہ محنت شاقہ کر کے جرمن زبان بھی سیکھی، تاکہ جرمنی کے زندہ جاوید شاعر گیٹے کی مشہور و معروف تصنیف فاسٹ کا خاص اُس کی زبان میں مطالعہ کر سکیں۔ مگر ان سارے کمالات کے باوجود وہ اول اور آخر شاعر اور صرف شاعر ہیں۔ اُنھوں نے حال میں اپنی سترویں سالگرہ کے جشن میں خیر مقدمی ایڈریس کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے شانتی نکیتن میں فرمایا تھا کہ "کچھ لوگ مجھے فلاسفر سمجھتے ہیں اور کچھ لیڈر، کچھ لوگ مجھے تعلیمی مشنری خیال کرتے ہیں اور کچھ مجھے ماہرِ سیاسیات۔ مگر میں ان میں سے ایک بھی نہیں ہوں، میں تو صرف ایک بانس کی پوری (بانسری) ہوں۔ جسکے ذریعہ کبھی کبھی میرا خالق اپنا ترانہ سنا دیا کرتا ہے۔"

ٹیگور کو سیاسیات سے کوئی عملی دلچسپی نہیں، اگرچہ وہ آزادی کو اپنے بچپن ہی سے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ جس آزادی کو قابل قبول و حصول خیال کرتے ہیں اُس کا لگاؤ محض جسم انسانی سے نہیں۔ وہ خارجی رسم و رواج اور بیرونی پابندیوں و ظاہرداریوں سے آزادی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اُس آزادی کے موید ہیں جس کا تعلق انسان کی روح سے ہے اور جو کفارہ

و ایثار کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ بہر حال اُن کا سیاسیات سے علیحدہ رہنا اُن کی حب الوطنی کو مشتبہ نہیں بنا سکتا، کیونکہ وطن کی محبت اُن کے شاعرانہ دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بہر حال جس کام کو انھوں نے اپنی زندگی کا مشن بنا لیا ہے اُس کے پورا کرنے میں وہ تن من دھن سے لگے ہوئے ہیں۔ تاہم ملک کے اہم واقعات و حادثات سے موقعہ بموقعہ متاثر ہوتے رہتے ہیں مثلاً جلیانوالہ باغ کے واقعہ سے متاثر ہو کر اُنھوں نے گورنمنٹ کو اپنا سر کا خطاب واپس کر دیا تھا۔ اپنی اسی سالگرہ کی تقریب کے موقع پر اُنھوں نے یہ فرمایا کہ "سوراج نہ محض جھنڈا اُڑانے اور نہ مقررہ مقدار میں سوت کاتنے سے مل سکے گا، ملک کے لئے ٹھوس کام اور ہموطنوں کی واقعی خدمت کرنے سے آپ بیشک اسے حاصل کر لیں گے۔" اپنے خیالات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ٹیگور اسی خدمت اور اسی مشن کو انجام دے رہے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی طرح ٹیگور کو بھی اہنسا (عدم تشدد یا محبت) پر کامل اعتقاد ہے۔ اور بشو بھارتی کے تعلیمی پروگرام میں اہنسا پر خاص طور سے زور دیا جاتا ہے۔ اور طلبا کو بنی نوع انسان کے ساتھ محبت اور رواداری برتنے کی عملی تعلیم دی جاتی ہے۔

اُن کی صورت و شباہت اور تندرستی بھی اُتنی ہی عمدہ و مؤثر ہے جتنی کہ ایک باقاعدہ اور باریاضت زندگی بسر کرنیوالے بزرگ کی ہونی چاہیئے۔ چند سال ہوئے کہ کلکتہ کے مشہور انگریزی رسالہ ماڈرن ریویو کے نامور اڈیٹر شری جیت رامانند چٹرجی کو کچھ عرصہ کے لئے ٹیگور کے شانتی نکیتن کے قریب رہنے کا اتفاق ہوا تھا، اس کے متعلق صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ "اُس وقت اُن کی زندگی سخت محنت اور جفاکشی کی زندگی تھی، وہ صبح تڑکے ہی پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر اپنے کام میں لگ جاتے تھے اور دوپہر میں ذرا بھی آرام کئے بغیر کافی رات گئے تک کام کرتے رہتے تھے۔ شانتی نکیتن کی سخت گرمی میں بھی ان کو پنکھا جھلنے یا جھلانے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ اس طرح دن رات کی مصروفیت میں اگر کوئی وقفہ ہوتا تھا تو صرف اُن چند گھنٹوں کا جو نہانے، کھانے اور سونے میں لگ جاتے تھے۔" آگے چلکر اڈیٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "ضعیف العمری کے سبب اُن کے اطوارِ سابقہ میں تغیر ہو جانا ممکن ہے مگر اس وقت تو وہ کتنے ہی نوجوانوں سے زیادہ کام کرتے ہیں۔" دراصل اسی کام کرنے کی لگن میں اُن کی درازیِ عمر کا راز مستور ہے۔

ٹیگور بقول خود "شاعرانہ مذہب" کے پابند و پیرو ہیں۔ اس کی جامعیت کے بارہ میں صرف یہی کہنا کافی ہے کہ اس کا پیرو ہونا بڑے بڑے شاعروں کو بھی نصیب نہیں ہے۔ ٹیگور کی عملی زندگی سے ان کے اس قول کی تصدیق ہو رہی ہے۔ وہ "کرم فلاسفی" کے قائل ہیں۔ وہ دنیا اور دنیا کے کاموں

سے الگ رہتے ہوئے نجات کے طالب نہیں ہیں، بلکہ دنیا میں رہکر دنیا والوں کو اپنی بے غرضانہ خدمات سے مستفید بنانا نجات کا بہتر وسیلہ خیال کرتے ہیں۔ خدا اُن کے اس ارادہ میں برکت دے اور اُسے پورا کرنے کے لئے اُنھیں زیادہ سے زیادہ موقع عطا کرے، یہی ہماری دعا ہے۔

ٹیگور نے اپنی ایک شہرہ آفاق نظم میں اپنی مشہور درس گاہ کا اس کے قیام سے پہلے اس طرح خاکہ کھینچا تھا :-

"ہماری درس گاہ شہر کے شور وغل سے بالکل الگ تھلگ ہوگی، وہ کھلے میدان میں درختوں کے سایہ میں قائم کی جائیگی۔ اساتذہ اور طلبا امن اور خموشی کی فضا میں درس و تدریس کے کام میں مشغول رہیں گے۔ اس درس گاہ کے متعلق بہت سے باغات اور کھیت بھی ہوں گے اور درس گاہ کے طلبا زراعت کے مختلف کاموں میں مصروف ہونگے۔ وہ مویشیوں کی داشت کریں گے اور اپنے ہاتھ سے گایوں اور بھینسوں کا دودھ دوہیں گے، اپنی فرصت کے اوقات میں وہ زمین کھودیں گے اپنے ہاتھ سے پودے لگائیں گے اور اُن کی آب پاشی کریں گے۔ سایہ دار درختوں کے نیچے طلبا کو تعلیم دی جائے گی، اور وہ اپنے اساتذہ کے ہمراہ ہرے بھرے کھیتوں میں چکر لگائیں گے اور اس طور پر قدرتی مناظر سے اُن کے نہ صرف خیالی بلکہ عملی تعلقات قائم کئے جائیں گے۔"

اس کے کئی سال بعد ڈاکٹر ٹیگور کو ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے واسطے کلکتہ سے شمال مغرب میں ۱۰۰ میل کے فاصلہ پر ریلوے اسٹیشن بول پور کے قریب ایک وسیع قطعہ زمین ملگیا جو زمانۂ گذشتہ میں ایک ویران اور سنسان مقام تھا لیکن اب ساٹھ سال کے دوران میں یہ ایک زرخیز جگہ بن گئی ہے، جس میں چاروں طرف لہلہاتے ہوئے سبزہ زار، ہرے بھرے کھیت، باغات اور پھلواریاں ہیں اور گذشتہ تیس سال سے اُسی پر فضا مقام پر ہندوستان کے ہر گوشہ سے طلبا آتے ہیں اور ہر قسم کی تعلیم سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ اور اسی مقام پر درس و تدریس کا سود مند کام مسلسل جاری ہے۔

ڈاکٹر ربیندر ناتھ ٹگور

حاذق الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب مرحوم

مولانا رومی کا نظریۂ ارتقا

از جناب سید حسن برنی، بی۔اے، ایل ایل۔بی (علیگ)

ایک زمانہ تھا کہ مشرق بھی دل و دماغ اور فکر و غور کی قوت رکھتا تھا۔ مثال کے طور پر مولٰنا جلال الدین رومی (متوفی ۶۷۲ھ ۱۲۷۳ء) کو پیش کیا جاسکتا ہے جو ایک بہترین صاحب فکر تھے۔ اور جن کی مثنوی افکار عالیہ سے بھری پڑی ہے اور عظمت کے لحاظ سے "پہلوی قرآن" کہلاتی ہے۔

انسان کیا ہے؟ کیسے وجود میں آیا؟ اور کیوں وجود میں آیا؟ اِن دشوار سوالوں پر مولٰنا رومی نے غور کیا، اور اُن کے جواب اپنی مثنوی میں دیئے ہیں جن کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسے بلند نظر حکیم تھے۔

حکمائے حال کی طرح مولٰنا بھی یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ انسان کا ظہور بطریق ارتقا ہوا ہے، یعنی وہ زمانۂ دراز تک حیوانی نباتی اور جمادی درجوں میں ہوکر گزرا ہے ؎

آمدہ اول باقلیم جماد   از جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد   وز جمادی یاد نارد از نبرد
وز نباتی چوں بہ حیواں اوفتاد   ماندش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ دارد سوے آں   خاصہ در وقتِ بہارِ ضیمراں
ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت   تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت

(اول انسان جمادات کی اقلیم میں آیا پھر جمادات سے نباتات میں آیا، سالہا اس اقلیم میں گزار دیے اور اپنی جمادی حالت بھول گیا۔ پھر جب نباتات سے حیوانات کی اقلیم میں آیا تو اُسے حالت نباتی کا کوئی خیال نہیں رہا، بجز اس کے کہ فصل بہار میں وہ اس کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اقلیم باقلیم گردش کرتا ہوا اب عاقل و دانا و توانا ہوگیا ہے۔)

مولانا نے یہ خیال بھی پیش کیا ہے کہ انسان کا ارتقا ابھی ختم نہیں ہوا۔ اور اُسے ابھی اور بلند مدارج طے کرنے باقی ہیں۔ اس تصور میں ہمارے زمانے کے بہترین اہل خیال بھی اُنسے آگے نہیں جاسکے

عقلہائے اولینش یاد نیست | ہم ازیں عقلش تحول کردنیست
تا رہد زیں عقل پر حرص وطلب | صد ہزاراں عقل بیند بوالعجب
گرچہ خفتہ گشت و ناسی شد ز پیش | کے گذارندش دراں نسیان خویش
باز ازاں خوابش بہ بیداری کشند | کہ کند بر حالت خود ریشخند

(انسان کو اپنی ابتدائی عقلیں یاد نہیں ہیں، اور ہر عقل بھی بدل جائیگی۔ اس عقل پر حرص وطلب سے آزاد ہوکر وہ لاکھوں عجیب عقلیں دیکھے گا۔ اگرچہ آدمی سوتا رہا اور اپنی پہلی حالت کو بھولا ہوا ہے لیکن اُسے اس خود فراموشی کی حالت میں کب تک چھوڑا جائیگا؟ پھر سوتے سے جگایا جائیگا اور وہ اپنے حالات پر ہنسے گا۔)

مستقبل کے اس امید افزا منظر میں مولانا نے ایک ایسا تصور پیش کیا ہے جب کہ انسان ذاتی خود غرضی سے آزاد ہوکر ترقی کے میدانوں میں آگے بڑھتا چلا جائیگا۔

(۴)

یہ ارتقائے انسانی کا صاف صاف بیان ہے جو مشرق کے اس بزرگ مفکر نے اب سے چھ سات سو برس پہلے دنیا میں پیش کیا تھا اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ارتقا کا خیال مشرق کے لئے نیا ہے یا مشرق کی مذہبی ذہنیت پر بار گزر سکتا ہے۔

اُنیسویں صدی کے مادہ پرست مفکرین عام طور سے اس کے منکر تھے کہ ارتقا کی کوئی غرض وغایت ہے، لیکن بعد کے بعض بہترین مفکرین ہم آہنگ ہیں کہ ارتقا کا ایک منشا ظاہر ہوتا ہے ورنہ اس کے کیا معنی ہیں کہ انسان جو اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے بہترین مخلوقات ثابت ہوتا ہے سب سے آخر میں ظاہر ہوتا ہے۔

مولانا روم کا خیال ہے کہ ابتدا ہی سے یہ منشا پیش نظر تھا اور نقش اول نقش ثانی کے لئے پیدا کیا گیا تھا ؎

نقش ظاہر بہر نقش غایب است | واں برائے غایب دیگر بہ بست
ہمچو بازیہائے شطرنج اے پسر | فائدہ ہر لعبت در ثانی نگر
اے نہادہ بہر آں لعبت نہاں | واں برائے آں وآں بہر فلاں
اول از بہر دوم باشد چناں | کہ شدن بر پایہائے نردباں

(موجودہ نقش آنے والے نقش کے لئے ہے، اور وہ دوسرے غیر موجود نقش کے لئے جس طرح کہ

شطرنج کی بازی کے پہلے داؤ کا فائدہ دوسرے داؤ میں ہوتا ہے یعنی اس کھیل میں یہ داؤ اُس داؤ کے لئے اور وہ داؤ دوسرے کے لئے چھپایا گیا ہے. جیسے کہ سیڑھیوں کے ڈنڈوں پر چڑھتے ہیں۔)

ارتقا کی غرض و غایت کیا تھی؟ اس کا جواب خود ارتقا کی تاریخ میں لکھا ہوا ہے ؎

تو ازاں روزے کہ در ہست آمدی　　آتشی یا خاک یا بادی بُدی

گر بداں حالت ترا بودے بقا　　کے رسیدی مر ترا ایں ارتقا

(جس دن تو وجود میں آیا تو محض ایک آگ خاک اور باد کا مجموعہ تھا، اگر تو اس حالت میں ٹھیرا رہتا تو تجھے ارتقا کیونکر نصیب ہوتا۔)

از مبدّل ہستیِ اوّل نماند　　ہستیِ دیگر بجائے او نشاند

ہمچنیں تا صد ہزاراں ہستہا　　بعد یک دیگر دوم از ابتدا

(اگر تبدیل کرنے والے نے پہلی ہستی نہیں چھوڑی تو اُس کی جگہ دوسری ہستی بخشی، اس طرح لاکھوں ہستیاں یکے بعد دیگرے پہلے سے بہتر بخشتا چلا گیا۔)

(۳)

اس زندگی کا مآل کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ اور کس لئے ہے؟

ان سوالات کا جواب بھی سنیئے ؎

جاں چہ باشد باخبر از خیر و شر　　شاد از احسان و گریاں از ضرر

چوں سر و ماہیت جاں مخبر است　　ہر کہ او آگاہ تر با جاں تر است

اقتضائے جاں چو اے دل آگہیست　　ہر کہ آگہ تر بود جانش قوی است

روح را تاثیر آگاہی بود　　ہر کہ را ایں بیش اللّٰہی بود

جاں نباشد جز خبر در آزموں　　پس کرا افزوں خبر جانش فزوں

جانِ ما از جانِ حیواں بیشتر　　از چہ رو؟ زاں کو فزوں دارد خبر

(جان کیا ہے؟ ایک ایسی چیز جو نیک و بد سے باخبر ہے، احسان سے خوش اور نقصان سے ناراض ہے. چونکہ جان کی ماہیت خبرداری ہے اس لئے جو زیادہ باخبر ہے وہ زیادہ بہتر جان رکھتا ہے. اے دل چونکہ اقتضائے جان آگاہی ہے اس لئے جو زیادہ آگاہ ہے اُس کی جان زیادہ قوی ہے. روح کی قوت خبرداری ہے جس میں یہ قوت زیادہ ہے. وہی خدا سے زیادہ قریب ہے. آزما دیکھو. جان صرف خبر کے لئے جسے زیادہ خبر ہے اُسی کی جان بھی زیادہ ہے. ہماری جان حیوان سے کیوں

برتر ہے؟ اسی لئے کہ وہ اس سے زیادہ باخبر ہے۔)

لیکن اگر تم اس روح کی حقیقت دریافت کرو تو وہ کسی کو معلوم نہیں، وہ گویا ایک پرندہ ہے جو ہوا میں اُڑتا ہے لیکن زمین پر صرف سایہ دکھائی دیتا ہے، جسم سایہ کے بھی سایہ کا سایہ ہے، روح خدا کے حکم کی طرح مخفی ہے۔ جو مثال بھی دی جائے وہ اس کی نفی ہے۔

درہوائے غیب مرغے می پرد — سایۂ او برزمیں می گسترد

جسم سایہ سایۂ سایہ دل است — جسم کے اندر خور پایہ دل است

روح من ہچوں امر ربی مختفی است — ہر مثالے کہ بگویم منتفی است

البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس عالم مادی سے باہر ہے سہ۔

حاش للہ تو برونی زیں جہاں — ہم بوقت زندگی ہم بعد آں

(واللہ تو اس جہان سے باہر ہے، زندگی میں بھی اور اس کے بعد بھی)

ہمارے زمانہ کا بڑے سے بڑا مفکر بھی اس سرّ عظیم کے سامنے پیر رومی کی طرح حیران نظر آتا ہے اور اُسکی حقیقت کے بیان سے عاجز ہے۔

(۴)

عمل ارتقا کیونکر وقوع میں آیا؟

اُنیسویں صدی اور مابعد کے مفکرین نے انتخاب طبیعی اور توریث کے قوانین دریافت کرکے انھیں ارتقا کا موجب قرار دیا ہے۔ لیکن ارتقا کے جو اسباب بھی اب تک دریافت ہوئے ہیں وہ اُس کی توضیح کے لئے پورے نہیں اُترتے۔ اصلی دشواری تغیر و تبدل کے قوانین کا معلوم کرنا اور نفس انسانی کے ظہور میں آنے کے اسباب کا دریافت کرنا ہے۔ یعنی ان سوالوں کا اطمینان بخش جواب ڈھونڈھنا کہ انواع کیونکر بدل جاتے ہیں، اور انسان کی دماغی قوتیں کیونکر پیدا ہوگئیں۔

مولانا رومی نے ان سوالوں کے جواب میں طبیعی نظریے پیش نہیں کیئے البتہ اُسے خالق کی قدرت سے منسوب کرکے چھوڑ دیا ہے۔ جو ہست سے نیست کرتا رہتا ہے ع

ہستی اندر نیستی بتواں نمود

نیست را نمود ہست آں محتشم — ہست را نمود بر شکل عدم

دست پنہان و قلم بیں خط گذار — اسپ در جولاں و ناپیدا سوار

(اُس بزرگ و برتر ہستی نے نیست کو ہست کیا، اور شکل غیر موجود سے ہستی موجود بنائی۔ ہاتھ چھپا ہوا ہے اور قلم حروف لکھتا دکھائی دیتا ہے۔ گھوڑا دوڑ رہا ہے اور سوار ناپید ہے)

باوجود بہت سی طبیعی توضیحات کے جب عقل سراسیمہ ہوکر رہ جاتی ہے تو کائنات کے تمام عقدہائے سربستہ کی طرح ارتقائے بشری کا بھی یہی اخیر حل نظر آتا ہے اور مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ ایک پوشیدہ ہاتھ پردہ کے پیچھے کام کرتا رہا ہے۔

خوش نصیبی

انسان اُس وقت خوش نصیب ہے جبکہ وہ اپنی خوش نصیبی کو پہچان لے۔

قلبی راحت کے برابر کوئی خوش نصیبی نہیں۔

حقیقی خوش نصیبی فضیلت علم ہے۔

صرف ایک خوش نصیبی ہے اور وہ ادائے فرض ہے۔

بہترین خوش نصیبی دوسروں کی امداد کرنا ہے۔

اگر تم خوش نصیب بننا چاہتے ہو تو دوسروں کی خوش نصیبی کے لئے کوشش کرو۔ کیونکہ وہ خوشی جو ہم دوسروں کو پہونچاتے ہیں ہمارے دل کی طرف پلٹ آتی ہے۔

ہر ایک شخص اُس خوش نصیبی کا مالک ہوتا ہے جسے وہ سمجھ سکتا ہے۔

روئے زمین پر ایک پاک اور زندہ جاوید عشق سے بلند تر کوئی خوش نصیبی متصور نہیں۔

خوش نصیب صرف وہ ہے جو کسی سے محبت کرتا ہے۔

خوش نصیبی یہ ہے کہ انسان دنیا کو اس طور سے دیکھے جس وجہ سے اس کی آرزو ہے۔

خوش نصیبی یہ ہے کہ انسان چھوٹی سی چھوٹی نعمت پر شکر کرے اور بڑی سے بڑی قربانی سے نہ گھبرائے۔

سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ انسان ایک مستقل ارادہ کے ساتھ فضیلت کے مطابق زندگی بسر کرے۔

دوسرے کے آنسوؤں کو مسرت بھری نگاہوں میں تبدیل کر دینا بہترین خوش نصیبی ہے۔

(ماخوذ)

مسیح الملک کے ساتھ ایک ہفتہ

(از ح - ا - ب)

دسمبر ۱۹۱۹ء میں مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ امرتسر کے صدر تھے۔ ابتدائے دسمبر میں جب مجھے تعطیلات کے زمانہ میں دہلی جانے کا اتفاق ہوا تو اُس وقت حکیم صاحب نے میرے قدیم دوست بابو سردار بہادر صاحب کی سفارش پہ مجھے طلب فرمایا اور اپنے ساتھ ریاست دوجانہ چلنے کا حکم دیا۔ یہ ریاست دہلی سے کوئی پچاس میل کے فاصلہ پر ہے اور اگرچہ غدر سے پیشتر وہ خاصی بڑی تھی لیکن اب سمٹ سمٹا کر بہت چھوٹی رہ گئی ہے۔ حکیم صاحب کے سکریٹری مسٹر زبیری بھی جو آجکل اخبار نویسی کی تعلیم کے سلسلہ میں امریکہ میں مقیم ہیں، حکیم صاحب کے ہمراہ تھے۔ شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں صاحب (بمبئی) کے بھائی حکیم ذکی احمد صاحب بھی ساتھ تھے، لیکن ان کا کام فقط اُن طبی خطوط سے متعلق تھا جو بیرونی دنیا حکیم صاحب کی خدمت میں بھیجا کرتی تھی۔ الغرض یہ مختصر سا قافلہ بذریعہ موٹر دوجانہ روانہ ہوا جہاں ہمارا مجموعی قیام آٹھ روز رہا اور اس اثناء میں ہم سب نواب صاحب مرحوم کے مہمان رہے۔ اگر اس امر کا اعتراف نہ کیا جائے تو ناحق شناسی ہوگی کہ نواب صاحب مرحوم نے حکیم صاحب مرحوم اور اُن کے رفقا کی خاطرداری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ اسی طرح ریاست کے دیوان خان بہادر بشیر محمد صاحب مرحوم بھی خاص طور سے حکیم صاحب اور اُن کے ہمراہیوں کے آرام کا خیال رکھتے تھے، اور چونکہ خان بہادر موصوف میرے ہم جماعت اور محترم دوست تھے اس لئے مجھ پہ وہ خصوصیت کے ساتھ مہربان تھے۔ اُن کا اخلاص مجھے آج تک یاد ہے۔

حکیم صاحب مرحوم کی ڈاک کا انتظام بہت اچھا تھا۔ انگریزی اور اُردو کے اخبارات ہمیں روزانہ مل جاتے تھے، میرا کام فقط اتنا تھا کہ میں روزمرہ کی خبروں اور بعض اہم تقاریر یا مضامین کا ترجمہ انھیں سنا دیا کروں۔ چنانچہ علی الصباح ناشتہ کے بعد میں اس خدمت کو انجام دیا کرتا تھا۔ اس کے بعد حکیم صاحب اپنا ایڈریس لکھنے بیٹھ جاتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ حکیم صاحب کو مضامین کا ترجمہ سننے کی فرصت نہیں ہوئی یا یہ کہ وہ نواب صاحب مرحوم سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے تو وقت کی بچت کے خیال سے

میں قابلِ توجہ مضامین کا خلاصہ اُردو میں تیار کر لیتا تھا تاکہ حکیم صاحب جب چاہیں بطورِ خود ملاحظہ فرمائیں،
جہاں تک مجھے یاد ہے حکیم صاحب نے اپنا خطبہ صدارت پانچ چھ دن میں تیار کر لیا تھا۔ ایڈریس میں خصوصیت کے
ساتھ جنرل ڈایر پر نہایت سخت الفاظ میں تنقید کی گئی تھی اور وہ حصہ انھوں نے ہم سب کو سنایا بھی تھا۔

حکیم صاحب کو ہمیشہ سے اس امر کا شوق تھا کہ وہ جس ریاست میں جاتے وہاں کی قدیم یادگار چیزیں
دیکھتے۔ پرانی قلمی کتابیں ملاحظہ فرماتے۔ پرانے شاہی فرامین پر نظر ڈالتے اور اہم سرکاری کاغذات کا بھی مطالعہ فرماتے
چنانچہ دوجانہ پہنچنے پر جب انھیں ذرا سکون ملا تو نواب صاحب نے جو اُن کے مذاق سے کماحقہٗ واقف تھے اُن
کے ملاحظہ کے لئے ریاست کے گھوڑے پیش کئے۔ یہ گھوڑے خاص نواب صاحب کے اصطبل کے تھے اور نہایت
بیش قیمت اور قدآور تھے۔ جنگِ عظیم میں نواب صاحب مرحوم نے سلطنت برطانیہ کی مقدور بھر امداد کی تھی اور
اور سرکاری فوج کے استعمال کے لئے بہت سے نایاب گھوڑے بھی بہم پہونچائے تھے۔ ایک دو دن کے بعد نواب
صاحب نے حکیم صاحب موصوف کو لارڈ کیننگ آنجہانی کی وہ سند بھی دکھائی جو غدر فرو ہو جانے کے بعد اُن کے
بزرگوں کو عطا کی گئی تھی اور جس میں بصلۂ وفاداری وعدہ کیا گیا تھا کہ ریاست ابدالآباد تک نواب صاحب کے
خاندان میں رہیگی۔ اُن دنوں نواب صاحب موصوف خانہ جنگی میں مبتلا تھے اور حکیم صاحب سے افسوس کے ساتھ
فرماتے تھے کہ اب صرف یہی سند میرے پاس رہ گئی ہے، باقی تمام کاغذات دوسروں کے قبضہ میں چلے گئے ہیں
اسی قبیل کا ایک اور واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے جسے خود حکیم صاحب نے دوجانہ کی کسی صحبت میں بیان فرمایا تھا، وہ
فرماتے تھے کہ جب میں پہلی دفعہ ریاست ٹیکم گڑھ میں بغرضِ علاج گیا تو اُس وقت وہاں کے راجہ صاحب نے
نہایت فخر کے ساتھ مجھے وہ تلوار دکھائی جس سے ابوالفضل کو قتل کیا گیا تھا۔ اس قتل کی تفصیل کے سلسلہ میں
فرمایا کہ اکبر نے شہزادہ سلیم کی سرکشی کی خبر سنتے ہی ابوالفضل کو جو دکن کی مہم میں مشغول تھا جلد سے
جلد دارالحکومت میں طلب کیا تاکہ رزم و بزم کا مردِ میدان آکر اپنے ناخنِ تدبیر سے اس گتھی کو بھی حل
کردے۔ چونکہ ابوالفضل سے شہزادہ سلیم کے تعلقات پہلے ہی سے کشیدہ تھے اور وہ خوب سمجھتا تھا کہ دارالخلافت
میں ایسے قابل معتمد کی موجودگی اُس کی ساری خواہشات پر پانی پھیر دیگی، اس لئے اُس نے ٹیکم گڑھ کے
راجہ سے خفیہ ساز باز کرکے وعدہ کیا کہ اگر تم ابوالفضل کو دارالخلافت پہنچنے سے پہلے ہی قتل کرادو تو تخت
نشین ہونے پر میں تمہیں "سرآمد راجگان بندھیل کھنڈ" کے شاندار لقب سے سرفراز کردونگا۔ چنانچہ ابوالفضل
کو نہایت بے رحمی کے ساتھ عین عالمِ تنہائی میں قتل کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ اکبر نے جب یہ وحشت ناک
خبر سُنی تو شدتِ حزن میں اُس نے کہا کہ اگر سلیم کو تخت کی ضرورت تھی تو اسے چاہیئے تھا کہ مجھے قتل کر دیتا،
لیکن ابوالفضل کو نہ مارتا۔ بہرحال وہ تاریخی تلوار ٹیکم گڑھ میں محفوظ ہے اور اُسے اس محبت اور وفاداری

کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے جو اُس دَور کے راجہ کو سلطنت مغلیہ میں تھی"۔ اس ایک واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حکیم صاحب جب ریاستوں میں علاج کے لئے تشریف لے جاتے تھے تو وہ اپنے اوقات کا بہترین استعمال کیا کرتے تھے۔ اس قسم کے قصے وہ بالعموم رات کا کھانا کھانے کے بعد سنایا کرتے تھے جو مرحوم کے غیر معمولی تاریخی ذوق کی زبردست شہادت ہیں۔

دوجانہ کے زمانۂ قیام میں حکیم صاحب سے تفصیلی گفتگو صرف رات ہی کو ہوا کرتی تھی، چنانچہ دس ساڑھے دس بجے تک کا وقت اسی قسم کی دلچسپ گفتگو میں کٹ جاتا تھا۔ کبھی وہ طبیہ کالج کی تعمیر کے سلسلہ میں لارڈ ہارڈنگ کی مہربانیوں کا ذکر کرتے اور فرماتے کہ علم طب پر لارڈ موصوف کا بہت بڑا احسان ہے اس لئے کہ انھوں نے طبیہ کالج کو قرول باغ میں اتنی بڑی زمین محض برائے نام قیمت پر دلوادی۔ مَیں نے جب اس اجمال کی تفصیل دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ "طبیہ کالج کی زمین کا مسئلہ مدّتوں سے چیف کمشنر دہلی کے یہاں زیرِ غور تھا۔ یہ صاحب فی گز بہت زیادہ قیمت طلب کرتے تھے اور ہم برابر انکار پر انکار کرتے رہتے تھے، اس زمانہ میں دہلی میں لارڈ ہارڈنگ کے اعزاز میں ایک گارڈن پارٹی ہوئی۔ وہاں مہمانوں سے ملتے ہوئے لارڈ ہارڈنگ میرے پاس بھی آنکلے اور باتوں باتوں میں پوچھا کہ زمین کا قصہ طے ہوگیا ہے یا نہیں۔ مَیں نے عرض کیا کہ جتنی قیمت طلب کی جارہی ہے، وہ ہماری بساط سے باہر ہے، ہمیں زمین اول تو مفت ملنی چاہیئے اور اگر قیمتاً ہی ملنی ہے تو قیمت برائے نام ہونی چاہیئے۔ چنانچہ لارڈ موصوف نے اُسی وقت چیف کمشنر دہلی سے بتاکید فرمایا کہ اس قضیہ کا فیصلہ جلد سے جلد حکیم صاحب کے منشا کے مطابق کردو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کا قصہ جو مدت سے زیرِ غور تھا نہایت آسانی کے ساتھ طے پاگیا اور جو قیمت طلب کی گئی وہ خود ہم سب کے اندازہ سے بھی کم نکلی۔" اس سلسلہ میں یہ کہنا بے موقع نہ ہوگا کہ لارڈ ہارڈنگ حکیم صاحب کی غیر معمولی عزت کیا کرتے تھے جو بہت کم ہندوستانیوں کو نصیب ہوئی ہوگی، اور وہ اپنے خاص دوستوں سے حکیم صاحب کا ذکر کرتے وقت ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ حکیم صاحب دہلی کے بے تاج بادشاہ ہیں۔

کبھی کبھی حکیم صاحب اپنی سیاحت انگلستان کے واقعات بھی بیان فرمایا کرتے تھے۔ سب باتیں تو مجھے یاد نہیں البتہ ایک بات ذہن میں محفوظ رہ گئی ہے۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ باوجود حکومت ہند اور صاحب وزیرِ ہند کی سفارشوں کے انھیں انگلستان کے متعدد کارخانوں میں دواسازی کے طریقے نہیں دکھائے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اسے اپنی تجارت کا راز قرار دیتے ہیں اور اس کے بتانے پر کسی طرح تیار نہیں ہوتے۔ یہ واقعہ ہے کہ حکیم صاحب اپنی سیاحت انگلستان کو کچھ زیادہ کامیاب

نہیں سمجھتے تھے۔ واپسی پر آپ قسطنطنیہ بھی تشریف لے گئے تھے، وہاں کا ایک واقعہ بھی حکیم صاحب نے سنایا تھا جسے میں ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ فرماتے تھے کہ جب میں قسطنطنیہ کے اسٹیشن سے روانہ ہوکر اپنی جائے قیام پر اُترا تو گاڑی والے نے مجھ سے میرے اندازہ سے کہیں زیادہ دام طلب کئے جس پر مَیں نے کہا کہ یہ کرایہ بہت زیادہ ہے۔ مَیں نے اتنے ملکوں کی سیر کی ہے لیکن کہیں بھی اس قدر دام طلب نہیں کئے گئے۔ ابھی گاڑیبان سے گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک ہندوستانی طالب علم وہاں آنکلا اور یہ سمجھکر کہ میں ہندوستانی ہوں مجھ سے اُردو میں بات چیت شروع کردی۔ مَیں نے اُسے سارا قصہ سُنادیا، اس پر لڑکے نے گاڑیبان سے (جو ابتدا ہی سے نہایت مہذبانہ گفتگو کر رہا تھا) یہ کہا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ کون صاحب ہیں، یہ ٹرکی میں ہم تمام مسلمانوں کے محترم مہمان ہیں اور تمہیں ان سے مناسب کرایہ لینا چاہیئے۔ گاڑیبان نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو یہ میرے بھی مہمان ہیں اور میں اب ہرگز ہرگز کرایہ قبول نہیں کرسکتا۔ چنانچہ باوجود اصرار کے گاڑیبان نے ایک پیسہ تک نہیں لیا اور چلا گیا۔ جب تک حکیم صاحب قسطنطنیہ میں رہے یہ لڑکا ان کے بہت کام آیا۔ چلتے وقت حکیم صاحب کو خیال ہوا کہ مستورات کے لئے چند ترکی برقعے بھی تیار کرالیں، لیکن وقت اتنا نہ تھا اس لئے انھوں نے چند اشرفیاں اُس لڑکے کے حوالہ کیں اور فرمایا کہ اتنے برقعے سلواکر بھجوا دینا۔ دہلی آکر حکیم صاحب اشرفیوں کے واقعہ کو بالکل بھول گئے، لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب کچھ عرصہ بعد اُن کے نام اُس لڑکے کا پارسل آگیا۔ حکیم صاحب لڑکے کی ایمانداری کی بہت تعریف فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھ پر اس کی ایمانداری کا بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک اور بات بھی ظاہر کردینا چاہتا ہوں کہ لندن میں بعض ہندوستانی طلبا کی جو حرکتیں حکیم صاحب کے مشاہدہ میں آئیں اُن سے وہ بہت رنجیدہ ہوئے اُن کی دلی خواہش تھی کہ ہمارے لڑکوں کو بیرونی ممالک میں جاکر اعلیٰ درجہ کا اخلاقی معیار پیش کرنا چاہیئے اور کوئی حرکت ایسی نہ کرنی چاہیئے جس سے ہندوستان کے وقار کو صدمہ پہونچے۔

حکیم صاحب کی طبیعت میں ظرافت بھی بہت تھی، ایک دن فرمانے لگے کہ نواب صاحب دوجانہ اُس بڑے کمرے کو جو موصوف نے اپنے محل میں تعمیر کرایا ہے "ٹاون ہال" کہا کرتے ہیں اور انفلوانزا کو جو اُن کے منہ سے صحیح نہیں نکلتا "انفلورانزا" کہتے ہیں، چنانچہ وعدہ کیا گیا کہ جب نواب صاحب سے ہم سب کی ملاقات ہوگی تو اُس وقت اُن کے منہ سے یہ الفاظ سننے کا شرف ہم کو بھی دیا جائیگا۔ ایک دن باتوں باتوں میں حکیم صاحب نے انفلوانزا کے تباہ کن اثرات کا ذکر کیا اور پوچھا کہ آپ کی ریاست میں کیا حال رہا۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ حکیم صاحب انفلورانزا نے تو غضب ہی ڈھا دیا، ہماری

یاست میں روزانہ بیسیوں موتیں ہو جاتی تھیں وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی باتوں سے حکیم صاحب جب
مدسے زیادہ لطف اندوز ہوتے تو اپنی دلی مسرت کا اظہار ہلکے سے تبسم سے ظاہر فرمادیا کرتے تھے۔ یہ
بسم ان کی ایک ممتاز خصوصیت تھی اور وہ درحقیقت مختلف جذبات کی ترجمان ہوا کرتی تھی۔

ریاست سے چلتے وقت مجھ سے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ اس اسپیچ کا ترجمہ بھی تم کردو۔ میں نے
رض کیا کہ اگر آپ ترجمہ میں وہی ادبی شان قائم رکھنا چاہتے ہیں جو اردو ایڈریس میں موجود ہے تو
ب یہ خدمت مسٹر آصف علی صاحب کو سپرد کیجئے جو انگریزی علم ادب کا نہایت پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں
کیم صاحب نے اتفاق فرمایا اور ترجمہ کی خدمت مجھ سے لے لی گئی۔

میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ کوئی نہ کوئی سند یافتہ حکیم ہمیشہ حکیم صاحب کی معیت میں رہا کرتے
ے، ان بیشمار خطوط کا جواب دینے کے لئے جو باہر کی دنیا اُن کی خدمت میں طبی مشورے اور علاج
ی غرض سے بھیجا کرتی تھی۔ دوجانہ کے قیام کے دوران میں اس خدمت پر حکیم ذکی احمد صاحب فائز
ے۔ ان کا کام یہ تھا کہ روزانہ خطوط کا مطالعہ کرتے اور اگر شکایتیں معمولی ہوتیں تو خود نسخہ لکھکر جواب بھیج
یتے۔ لیکن اگر ذرا بھی پیچیدگی ہوتی تو وہ اُسے فوراً حکیم صاحب کی توجہ میں لاتے اور ان سے نسخہ معلوم
رکے اپنے ہاتھ سے لکھکر بھیجدیتے۔ ایک دن حکیم ذکی احمد ایک مریض کے حالات پر غور کر رہے تھے
ور جب بیحد غور و فکر کے بعد اُنھیں کوئی دوا سمجھ میں نہ آئی تو کہنے لگے کہ مرض بہت پیچیدہ ہے، اگر یہ دوا
جویز کرتا ہوں تو اس سے نئی پیچیدگی کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے اور اگر فلاں دوا لکھتا ہوں تو مرض
یں زور ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ الغرض وہ بہت دیر تک کشمکش و پیچ میں رہے اور جب خود کوئی
یصلہ نہ کر سکے تو اُنھوں نے معاملہ حکیم صاحب مرحوم سے رجوع کیا۔ حکیم صاحب نے سارے خط کو
ور سے سُنا اور فی الفور دوا تجویز کردی۔ میں نے دیکھا کہ صحیح دوا کا نام سنتے ہی حکیم ذکی احمد بہت بشاش
ہو گئے اور بعد میں مجھ سے کہا کہ ایسی ہی دوا کی ضرورت تھی جو تمام شکایات کو کم کرے اور ساتھ ہی کوئی
پیچیدگی بھی پیدا نہ ہونے دے۔ میں نے اپنے آٹھ دن کے قیام میں بار بار دیکھا کہ حکیم صاحب مریضوں
کے خطوط کی جانب بہت متوجہ رہتے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مرحوم کو خدمت الناس کا شغف
س قدر زیادہ تھا۔ اسی سلسلہ میں میں ایک اور واقعہ بھی بیان کرنا چاہتا ہوں جو اگرچہ دوجانہ کے قیام
سے متعلق نہیں تاہم وہ قریب قریب اُسی زمانہ کا ہے اور اُس سے حکیم صاحب کے جذبۂ خدمت انسانی
پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ میری اہلیہ بیان کرتی ہیں کہ "شادی سے قبل میں اکثر بیمار رہا کرتی تھی، میں سمجھتی
تھی کہ مجھے مرض دق ہو گیا ہے۔ چنانچہ میں نے حکیم صاحب سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا اور اس خیال

سے آگرہ سے دہلی آگئی۔ دہلی میں میں اپنی ہمشیرہ کے یہاں قیام پذیر رہی، وہاں سے میں نے بغیر کسی سے مشورہ کئے ایک خط حکیم صاحب کی خدمت میں بھیجدیا، چند دن کے بعد کیا دیکھتی ہوں کہ حکیم صاحب اپنی گاڑی میں تشریف لے آئے اور فرمایا میں اُس مریضہ کو دیکھنے کے لئے آیا ہوں جس نے مجھے خط لکھا تھا۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ حکیم صاحب محض ایک خط کے لکھ دینے پر تشریف لے آئیں گے۔ خیر ہم نے انھیں اندر بٹھایا اور نہایت اطمینان سے سارا حال سنایا۔ حکیم صاحب نے مجھے اچھی طرح سے دیکھا اور فرمایا کہ دق کا خیال ایک وہم سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا اور میرا ہر طرح سے اطمینان کر دیا۔ دہلی کے لوگ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ حکیم صاحب نیز شریفی خاندان کے دیگر ارکان کی ہمیشہ سے یہ ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے کہ وہ باہر سے آنے والے مریضوں کو اپنا مہمان سمجھتے ہیں، خود ان کے گھروں پر باقاعدہ تشریف لے جاتے ہیں اور کوئی فیس حتیٰ کہ گاڑی کا کرایہ تک بھی نہیں لیتے۔ حکیم صاحب کے لیٹر پیپر پر "افضل الاشغال خدمت الناس" کی مشہور حدیث نقش تھی۔ کیا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ ان کی زندگی جو در اصل ایثار اور قربانی کی زندگی تھی ہمیشہ اسی بلند مطمح نظر کے مطابق بسر نہیں ہوئی۔

دو جانہ کے قیام کے بعد میں متعدد مرتبہ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آخری مرتبہ میں نے انھیں اُس وقت دیکھا تھا جبکہ وہ شاہ امان اللہ خاں کو ایڈریس دینے کے لئے بمبئی تشریف لائے تھے۔ اس وقت وہ بہت نحیف تھے۔ لیکن یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ وہ چند دن کے بعد ہم سے جُدا ہو جائیں گے۔ بہرحال یہ خطبہ خوانی غالباً اُن کی آخری پبلک خدمت تھی جو باری تعالیٰ نے اُن سے لی۔

یہ واقعات جو میں نے اوپر بیان کئے ہیں، معمولی ہیں اور اپنے اندر کوئی خاص جاذبیت یا اہمیت نہیں رکھتے، لیکن انسانی زندگی انھیں چھوٹے چھوٹے واقعات پر مشتمل ہوتی ہے اور انھیں سے ہمیشہ انسانی سیرت کی عظمت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ میں نے صرف انہی باتوں کو قلمبند کیا ہے جو سوائے ایک واقعہ کے براہ راست میرے مشاہدہ میں آئی ہیں۔

آخر میں خدائے برتر سے دعا ہے کہ وہ حکیم صاحب مرحوم کی خدمات کو جو اُنھوں نے بنی نوع انسان کے لئے انجام دیں قبول فرمائے اور مرحوم کو اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی درجات عطا فرمائے۔ آمین۔

بلبل ہند سروجنی نائیڈو کے چند نغمے

(مترجمہ مسٹر ظفر قریشی دہلوی بی۔اے)

(۱) ہندوستانی جلاہے

طلوعِ صبح کے وقت اے عزیز جلاہو! تم کیا بُن رہے ہو
یہ نفیس اور خوبصورت کپڑا جس کا رنگ نیل کنٹھ کے پر کی طرح
آسمانی ہے، کیا ہے؟

یہ ایک نوزائیدہ بچہ کا جامہ ہے!

غروب آفتاب کے وقت اے عزیز جلاہو!
تم یہ کون کپڑا بُن رہے ہو؟
یہ چمکیلا کپڑا جو نرم اور پر طاوس کی طرح سرخ و قرمزی رنگ کا ہے
تم کس لئے بن رہے ہو؟

ہم ایک عروس نو ملکہ حسن کے روئے روشن کیلئے نقاب تیار کر رہے ہیں

اے عزیز جلاہو!
چاند کی خاموش سرد اور غم آگیں کرنوں کی پھیکی روشنی میں
تم مغموم و متفکر و سرنگوں بیٹھے ہوئے اس قدر سنجیدگی کے ساتھ یہ کون کپڑا بُن رہے ہو
یہ مرغ کے پر کی طرح نرم اور بادل کی طرح سفید رنگ کا کپڑا، کس لئے بنا رہے ہو؟

ہم ایک مردہ کا کفن تیار کر رہے ہیں!

---

(۲) نسترن

مست، تیز اور زود اثر خوشبودار،
لطیف و نازک اور چمکیلے پھولو!
تمہاری اُلجھی ہوئی پنکھڑیاں عطر و آتش کے گہوارے ہیں
ان پنکھڑیوں میں:-

سرسوتی کا غم نہاں ہے،
سیتا کی آرزوئیں وابستہ ہیں
دروپدی کے ارمان پوشیدہ ہیں
دمینتی کا خوف و ہراس موجود ہے اور
شکنتلا کے اشک ہائے خونیں ہیں۔

---

(۳) گل مہر

اے بہارِ رنگیں کے دلنواز محسن!
تیرے جمالِ زریں کو کون پا سکتا ہے!
تیرا رنگ یا تو عروسِ نو کے لباس کی طرح سرخ ہے
یا کسی طائر وحشی کے بازوؤں کے مانند شعلہ گوں
نہیں نہیں تو اُس بَن کی طلسمی روشنی کی طرح ہے جو
"شیش ناگ" کی پیشانی کو منور کئے رہتی ہے!

اے بہارِ معطر کے سرتاج! تیرا خیرہ کن جمال!
اور تیری عماز چمک اور لالہ گوں رنگت کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟
تو کسی زریں صبح کے منور بادلوں کی خیرگی کے مشابہ ہے۔
یا سطح آب کی چادرِ سیمیں کا نور ہے!
یا اُس خون کی چمک ہے جو ایک راجپوت رانی کی حفاظت میں
ہزاروں خوددار سینوں سے بہا تھا!

(۴) اشوک کا پھول

ہمارے ہندوستان میں ایک روایت مشہور ہے کہ اگر "اشوک" کی جڑ پر کسی خوبصورت
دوشیزہ کا پیر پڑ جائے تو اس کی بند کلیاں پھول کر چٹک جاتی ہیں اور اس کی
شاخوں میں گل ہائے نو پھوٹنے لگتے ہیں !

آہ ! یہ سرخ و زریں غنچے کبھی دوشیزہ کے بالوں میں آویزاں ہوتے ہیں
کبھی معشوقوں کے سیج پر پامال ہوتے ہیں
یا پھر "شاخ عروسی" بنکر اس کے دست حنا مالیدہ میں نظر آتے ہیں !

میرے محبوب ! اگر تیرا مبارک قدم میرے سینہ کو جس میں میرے عشق کے راز
سربستہ بند ہیں ایک بار بھی پامال کر دے تو میرا بخت خفتہ بیدار ہو جائے
میرے قلبی جذبات اور دماغی تصورات "گل نغمہ" کی صورت اختیار کر لیں۔
جس کی ترنم ریز و شمیم بار پنکھڑیوں کا عکسی اثر ہر راہگیر کو از خود رفتہ بنا دے

(۵) نغمۂ غم

اے پپیہے ! اب تو مجھے اپنی داستان محبت نہ سنا،
بلکہ ان گزشتہ خواب ہائے مسرت کی یاد میرے قلب مضطر میں پھر تازہ کر دے
جن میں تاروں بھری رات اور صبح صادق کے وقت میرا دل و جان سے
چاہنے والا عاشق آہستہ آہستہ میرے پہلو میں آجاتا تھا

دریا پر ہلکے ہلکے بادل منڈلا رہے ہیں ——— تار باراں میں پکھراج کی طرح
جڑے ہوئے آم کے پتے ہوا میں جھول رہے ہیں۔ پھولوں کی ڈالیاں
جوش میں ہیں !
لیکن اے پپیہے ! بارانِ رحمت اور ان تمام چیزوں کا حسن و جمال کس کام کا ہے؟
جبکہ میرا حبیب ہی مجھ سے جدا ہے، اور مجھے اس کا دیدار پھر
نصیب نہیں ہو سکتا

اے پپیہے! "پی کہاں" کی صدائے پیہم سے تو میرے دل کو یوں دکھاتا ہے،
اب تو مجھے اپنی داستانِ محبت نہ سنا!
تو میرے دل میں ایام رفتہ کی یاد پیدا کرکے ایک ٹیس پیدا کر دیتا ہے
صبح کو میں تیرے منور جنگل میں طاؤس کو اپنے جوڑے کی فرقت میں بیقرار ہو کر
چیختے چلاتے سنتا ہوں، میں کوئل کی غم میں ڈوبی ہوئی کوک بھی سنتا ہوں،
چمن میں بلبل و قمری کا شیریں و دلنواز نغمہ بھی میرے گوش گزار ہوتا ہے۔
لیکن اے پپیہے! تو ہی بتا کہ مجھے ان سُریلے موسیقی کے راگوں سے کیا تسکین
ہو سکتی ہے؟
سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ نغمہ ہائے محبت و مسرت بالکل پسند نہیں
کیونکہ میں ہجراں نصیب ہوں، اور میرا دوست مجھ سے دُور ہے ——————
اور بہت ہی دُور ہے!

من کا مندر

پہاڑ نے تاڑ کے گنجان درختوں کا لباس پہن رکھا تھا، اُسکی کمر پر تاریک بادلوں کا پٹکہ تھا۔ لیکن مجھے وہ تنگ اور پیچدار راستہ مل گیا جو ہر تا پھرتا مندروں کو جاتا ہے۔ مندر کی قدیم عمارت میرے سامنے تھی اُسکا کلس آکاش کے دیوتا کی مانند خلا میں اکیلا کھڑا تھا۔ ہوا پجاریوں کے گانے کی مدھم آواز کو اُڑا کر لا رہی تھی، گھنٹوں کے بجنے کی آواز صاف تھی، اور شور انگیز طوفان کی طرح پہاڑوں میں گونج رہی تھی

میری روح نے زنجیریں توڑ دیں، اب وہ کائنات کی رفعتوں میں پرواز کر رہی تھی۔

آہ تڑکا ہو گیا۔ میں نے چونک کر کہا۔ میں ایک درخت سے سہارا لگائے کھڑا تھا، میرا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ اب مجھے مندر میں جانے کی ضرورت نہ تھی، میرا مندر میرا دل تھا۔

(ماخذ از گجراتی)

جذباتِ ٹیگور

(از منشی اقبال بہادر سکسینہ صاحب ایم۔اے)

گیتا کے مطابق وہ کام جو محض ذاتی نفع کی خاطر کئے جائیں روح کو جکڑنے کا باعث ہوتے ہیں، ذاتی قربانی کا وہی کام ہے جو ذاتی اغراض سے بالاتر ہو کر کیا جائے اور جس کا موضوع اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر دوسروں کی نفع رسانی ہو۔ برہما جی جب اپنی ذات کو قربان کرتے ہیں تب ہی آفرینش کے موجب ہوتے ہیں۔ ان کی قربانی کی کوئی دوسری غرض نہیں ہے۔ اس لئے ہم اپنے فرائض کی ادائگی میں جن میں ذاتی قربانی شامل ہو برہما کی اسپرٹ کا اعادہ کرتے ہیں۔

خوشی سچائی کا ایک جوہر ہے، جب ہم کو سچائی کا احساس ہوتا ہے تو ہمارے دل میں خوشی کی ایک لہر اُٹھتی ہے جو اس سچائی سے جو ہمارے دل میں ہے موجزن ہو جاتی ہے۔ یہی بات تمام مذاہب کی سچائی کی تہ میں ہے۔

وہ شخص جو سچائی کا احساس اس فوری خوشی سے کرتا ہے جو روح میں پیدا ہوتی ہے تمام شکوک اور خطروں سے بچ جاتا ہے۔

محبت وہ مقناطیس ہے جس کے لمس سے انسانی طمع قربانی میں مبدل ہو جاتی ہے۔

صلح اس اندرونی سرور کا نام ہے جو سچائی میں مضمر ہے نہ کہ بیرونی تبدیلیوں میں۔

حسن بتلاتا ہے کہ حقیقت سے ہمارا روحانی رشتہ ہمیشہ کے لئے قائم ہے، اور ہماری محبت اس کو اپنے نصف النہار پر پہونچاتی ہے۔

تہذیب وشائستگی اپنی آفرینش کے لئے آرٹ کی محتاج ہے، اس کی آفرینش محض اس لئے ہے کہ ہم روحانی کمال کے متعلق اپنے خیال کو چشم دید مناظر کا جامہ پہنائیں، اس کو مذہب کے آرٹ کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔

سچّائی علم الٰہی کا بے پایاں مشغلہ ہے، جبکہ واقعی وہ بے پایاں شے ہے جس کا تعاقب سائنس کا شغل ہے اور حقیقت اس بے پایانی کی تعریف ہے جو سچائی اور ذات شخصی میں توازن قائم رکھتی ہے حقیقت انسانی ہی وہ شے ہے جس کا ہمارے ضمیر کو علم ہوتا ہے جس سے ہم متاثر ہوتے ہیں اور جس کا ہم اظہار کرتے رہتے ہیں۔ جب ہم کو اس کا بدیہی علم ہوتا ہے تو ہم اپنے آپ سے واقفیت حاصل کرتے ہیں اور اس میں ہم کو خوشی محسوس ہوتی ہے، ہم اسی حقیقت میں رہتے ہیں اور ہمیشہ اس کی حدود کو وسعت دینے میں لگے رہتے ہیں۔ ہمارا آرٹ اور ہمارا لٹریچر ہماری اس تخلیقی کوششوں کا اظہار کرتا ہے جو انسان کے لئے لابدی ہے۔

اس زندگی میں یقین واثق ہی تخلیق کا کام کرتا ہے نہ کہ وہ مشین میں جو صناعی کرتا ہے۔ وہی طاقت جو اپنی قوت کو پس پشت رکھتی ہے، حسن کے پھول کھلاتی ہے نہ کہ وہ طاقت جو آستینیں چڑھاتی اور دوسروں کو نقصان پہونچانے کی استعداد پر بغلیں بجاتی ہے۔ ہم کو جاننا چاہیئے کہ مشین تب ہی تک اچھی ہے جب تک وہ دوسروں کی مدد کرتی ہے نہ کہ اس وقت جبکہ وہ زندگی کا کچومر نکال لیتی ہے۔ ہم کو جاننا چاہیئے کہ سائنس کی عظمت اسی وقت تک ہے جب وہ برائیوں کی بیخکنی کرتی ہے نہ کہ اس وقت جب دونوں ملکر ایک ناپاک شرکت قائم کرتی ہیں۔

اگر میں اس سمت میں گامزن رہوں جس سے وہ آتا ہے تو میں اس سے دور ہی ہوتا جاؤں گا۔ اگر میں مقابل کے راستہ پر قدم زن ہوں تب ہی ہم صرف مل سکتے ہیں۔ اس کو شکل پیاری ہے؛ اسی لیے وہ ہمیشہ اشکال کی طرف مخاطب ہوتا ہے۔ ہم صرف اشکال پر زندہ نہیں رہ سکتے اس لئے ہم کو غیر اشکالی کی طرف بڑھنا چاہیئے۔ وہ آزاد ہے اس لئے اس کا کھیل حدود کی طرف مائل ہوتا ہے، ہم محدود ہیں اس لئے ہم کو آزادی میں خوشی نصیب ہوتی ہے۔ ہماری تمام تکالیف کا سبب یہی ہے کہ ہم اس راز کو ذہن نشین نہیں کر سکتے۔ ایک گانے والا اپنی خوشی کو راگ کا جامہ پہناتا ہے؛ جو شخص اس راگ کو سنتا ہے راگ سے

خوشی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ پہلی حالت میں خوشی جو لامحدود ہے محدود راگ کی شکل اختیار کرتی ہے۔ دوسری حالت میں محدود راگ ہم کو لامحدود خوشی کا تجربہ کراتا ہے۔ پہلی حالت میں آزادی غلامی کی حالت میں تبدیل ہوتی ہے اور دوسری میں غلامی آزادی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ صرف اسی طرح غلامی اور آزادی کا میل ممکن ہے۔ وہ گاتا ہے اور ہم سنتے ہیں، جب وہ گاتا ہے وہ محدودات کی زنجیر میں مصنوع کرتا ہے۔ جب ہم اس کے راگ کو سنتے ہیں ان زنجیروں کی بندشوں کو فتح کرتے ہیں۔

(ٹیگور کی کتاب مذہب انسانی سے ماخوذ)

انتخاب آئین اکبری

از مولوی محمد رفیع صدیقی صاحب، کراؤن سائز ۸۰ صفحات قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ :۔ لالہ کامتا پرشاد اگروال پبلشر الہ آباد

آئین اکبری ابوالفضل کی مشہور تصنیف ہے جس میں شہنشاہ ہند اکبر اعظم کے عہد حکومت کے قوانین درج ہیں۔ مولوی رفیع صدیقی صاحب نے فارسی زبان کے طلبا کے استفادہ کے لئے اس کا ضروری انتخاب مرتب کیا ہے۔ شروع میں ایک مختصر دیباچہ ہے جس میں ابوالفضل کے مختصر حالات اور اس کی تصانیف کے ذکر کے علاوہ آئین اکبری کی خوبیوں اور ابوالفضل کی طرز نگارش پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں مشکل الفاظ و اصطلاحات کی تشریح کردی ہے۔ یہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔

انتخاب قصائد سلمان ساوجی

از مولوی محمد رفیع صدیقی صاحب۔ کراؤن سائز ۴۰ صفحات قیمت ۵ر

ملنے کا پتہ :۔ لالہ کامتا پرشاد اگروال پبلشر الہ آباد

سلمان ساوجی فارسی زبان کا مشہور شاعر ہوا ہے۔ قدیم زمانہ میں عام دستور کے مطابق سلمان بھی شاہان وقت کے درباروں سے متوسل تھا اور ان کی مدح میں جو قصائد اس نے لکھے ہیں ان میں سے چودہ قصائد کا انتخاب اس مجموعہ میں شامل ہے۔ شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں سلمان کے حالات اور اس کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ غالباً طلبہ کے مطالعہ کے لئے اس کو مرتب کیا گیا ہے۔

بدگمانی

(از مسٹر جے کرشن)

راج ناتھ نے ماں باپ کا سکھ نہ جانا، ایک سال کا تھا کہ ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، جب پانچ سال کا ہوا باپ نے بھی داغ مفارقت دیا، چچی اور چچا ہی کو اُس نے اپنا والدین سمجھا۔ اُن کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اُنھوں نے بھی بیٹے ہی کی طرح اُس کی پرورش کی، وہ راج ناتھ کی آنکھوں کو نم نہ ہونے دیتے تھے، جس بات کے لئے وہ ضد کرتا وہ فوراً مہیا کر دیتے، جب کبھی وہ بیمار ہوتا اُس کی چچی رات رات بھر گود میں لئے بیٹھی رہتی، صبح وشام دونوں وقت نوکر گاڑی میں ہوا کھلانے لے جاتا، غرض اُس کی پرورش بڑے لاڈ پیار سے ہوئی۔ چچی اور چچا نے ہمیشہ اُس کو اپنی آنکھوں کا تارا سمجھا، ماں کا تو اُسے خیال ہی نہ تھا لیکن باپ کی وہ اکثر یاد کیا کرتا تھا لیکن لذیذ مٹھائیوں اور خوشنما کھلونوں نے رفتہ رفتہ باپ کا خیال بھی اُس کے ننھے دل سے مٹا دیا۔

جب رجو آٹھ نو سال کا ہوا تو اکثر عورتیں اس سے پوچھتیں 'رجو تیری اماں کہاں گئیں' رجو خفگی کے لہجے میں کہتا 'میری اماں گھر میں ہیں، بلا دوں'۔ بعض عورتیں جن کو خواہ مخواہ فضول باتوں میں لطف آتا ہے اکثر اس سے کہتیں "رجو یہ تیری چچی ہیں' تیری اماں تو مدت ہوئی مر گئیں"۔ اس پر رجو ناراض ہو کر کہتا "تم جھوٹ بولتی ہو یہی میری اماں ہیں"۔

(۲)

رجو اب اٹھارہ برس کا خوبصورت جوان ہوا، اُس کا رنگ شگفتہ اور جسم گٹھا ہوا تھا، اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں، چچی اور چچا دونوں اُسے آنکھ بھر کر نہ دیکھتے کہ کہیں اُسے اُن کی نظر بد نہ لگ جائے لیکن دل ہی دل میں اسے دیکھکر پھولے نہ سماتے تھے اس وقت وہ بی۔اے فائنل کلاس میں پڑھتا تھا، اُس کے پروفیسر اس سے بہت خوش تھے۔ ٹینس کھیلنے میں تو اُسے ایسا کمال حاصل ہو گیا تھا کہ بڑے بڑے کھلاڑی اُسے دیکھکر عش عش کرتے۔ اُسے رفاہ عام کے کاموں سے بھی غیر معمولی رغبت تھی، چنانچہ ہر سال گرمی کی چھٹیوں میں وہ الہ آباد سے ملحق دیہاتوں میں جاکر غریب بیماروں کو دوا دیتا

اور اُن کی تیمارداری بھی کرتا۔ اکثر وہ نادار مریضوں کے سرہانے بیٹھکر آنکھوں ہی میں راتیں کاٹ دیتا، اُس کی چچی اُس سے کہا کرتی کہ بیٹا مریضوں سے دور ہی رہا کرو نہ معلوم کونسا مرض ہو کہیں نقصان نہ پہونچ جائے۔ مگر رجو ان باتوں کو ہنسکر ٹال دیا کرتا تھا۔

یونیورسٹی میں گرمی کی تعطیلیں شروع ہوگئی تھیں اور رجو اپنے مکان آیا تھا کہ ایک روز آگرے سے ایک رشتہ دار کا تار آیا کہ اُس کے ماموں کا انتقال ہوگیا۔ تار دیکھتے ہی رجو اور اُس کے چچا بابو رام شنکر آگرہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ رجّو کے ماموں آگرہ کے مشہور وکیل تھے۔ اُن کا کنبہ بڑا تھا، بیوی کے علاوہ دو کنواری لڑکیاں اور تین چھوٹے بچے تھے۔ دونوں لڑکیوں کی عمر شادی کے قابل تھی۔ وکیل صاحب کے انتقال کے بعد کوئی اس کنبے کی پرورش کرنے والا نہیں رہا۔

کریا کرم ختم ہونے کے بعد ایک روز بابو رام شنکر نے رجّو کی مامی سے کہا کہ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوچکا، اب یہاں پڑے رہنے سے کیا فائدہ، سب لوگ ہمارے ساتھ چلی چلو، جو کچھ روکھا سوکھا پرماتما دے اُسے سب ملکر خوش ہوکر کھائیں گے، رجو کی مامی راضی ہوگئیں اور کیوں نہ ہوتیں اب خدا کے سوا دنیا میں اُن کا اور کوئی دوسرا سہارا نہ تھا۔ چنانچہ گھر کا سب ساز و سامان فروخت کردیا گیا، اچھی اچھی چیزیں نصف اور تہائی قیمت پر چلی گئیں اور بابو رام شنکر سب کو اپنے ساتھ مکان لے آئے اُن کا مکان بہت چھوٹا تھا اس میں اتنے لوگوں کا گذر ہونا مشکل تھا، اس لئے انھوں نے پڑوس کا ایک مکان کرایہ پر لیکر ان لوگوں کو اسی میں ٹھہرایا۔

بابو رام شنکر اور راج ناتھ نے اس کنبہ کی دلجوئی کرنا اپنا فرض سمجھ لیا تھا، دونوں ہمیشہ اسی کوشش میں رہتے تھے کہ چاہے کچھ ہو لیکن ان مصیبت زدوں کا دل دُکھنے نہ پائے، دونوں لڑکے مدرسہ میں داخل کرادیے گئے اور رجو اپنی فرصت کا زیادہ تر حصہ اپنی مامی کے یہاں گزارنے لگا، وہ ہر دم اسی کوشش میں رہتا تھا کہ کسی طرح ان لوگوں کا غم غلط ہوجائے۔

(۳)

اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا، مامی کے اصرار سے رجّو اکثر وہیں کھانا کھالیا کرتا تھا۔ برجو اور رتو (مامی کے دونوں لڑکے) کو پڑھاتا، اس کی دونوں بہنیں پشپا اور کملا جب اُسے دادا کہہ کر پکارتیں تو وہ مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا۔ اس کی مامی جب کبھی ان پر خفا ہوتیں تو رجّو ان کو سمجھاتا کہ آپ انھیں کچھ نہ کہیں، یہ مجھے بہت عزیز ہیں، اپنے جیتے جی میں ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ اُٹھانے دونگا۔ یہ سنکر مامی کے پژمردہ چہرے پر خوشی کی جھلک نمودار ہوجاتی اور اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے

ٹپک پڑتے، وہ رجّو کو دعائیں دینے لگتیں۔

رجّو کا ہر وقت مامی ہی کے یہاں رہنا سہنا اُس کی چچی کو اچھا نہ لگتا تھا، چنانچہ کچھ دنوں تک تو وہ خاموش رہیں، لیکن ایک روز انھوں نے رجّو سے کہا کہ بیٹا تم تو اب گھر پر بالکل رہتے ہی نہیں ہو، نہ وقت سے کھاتے ہو نہ پیتے، نہ معلوم تم کو اِن دنوں کیا ہو گیا ہے؟ رجّو نے ہنسکر جواب دیا "واہ اماں کھانا کیوں نہیں ہوں، آج ہی سویرے تمہارے سامنے کھانا کھا چکا ہوں"۔ اس پر چچی نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا اب کیا کھاتے ہو پہلے البتہ جب دیکھو یہی کہا کرتے تھے کہ بھوک لگی ہے۔ اب تو تیری بھوک پیاس سبھی رخصت ہو گئی ہے، ذرا صورت تو دیکھو کیسی نکل آئی ہے؟ رجّو نے پھر ہنسکر کہا "اماں میری صورت کو کیا ہو گیا ہے، جیسا تھا اُس سے کہیں زیادہ موٹا ہو گیا ہوں، رہی کھانے کی بات تو کبھی کبھی مامی کے یہاں بھی تو کھا لیتا ہوں، وہ بھی تو مجھے خوب کھلاتی ہیں"۔

چچی نے منہ پھیر کر اُسی طرح خشک لہجے میں کہا، ہاں تو یہ کہو کہ اب مامی کے یہاں کی سب چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں، اب تو وہی تمہاری سب کچھ ہیں، میں کون ہوں۔ یہ کہکر انھوں نے ایک آہ سرد بھری۔

رجّو کو اب ہوش آیا، وہ سمجھتا تھا کہ اماں یہ باتیں یوں ہی کہہ رہی ہیں، اُسے خیال بھی نہ تھا کہ انھیں اس کا مامی کے یہاں آنا جانا پسند نہیں ہے، اب تک اس کے برعکس وہ کہتا تھا کہ اماں اس سے خوش ہوتی ہونگی، ان کی زبان سے اب ایسی باتیں سنکر اُسے دلی صدمہ ہوا۔ اس نے غمگین لہجے میں کہا "اماں میرے لئے تو تمہیں سب کچھ ہو اس سے کون انکار کر سکتا ہے، مین تو مامی کے یہاں اس سبب سے چلا جاتا ہوں کہ ابھی ان کا غم تازہ ہے ان کی دلجوئی کرنا چاہیئے .... اسکے آگے اس کی زبان رقت سے بند ہو گئی، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، لیکن چچی کے دل پر ان آنسوؤں کا کچھ بھی اثر نہ ہوا حالانکہ یہ آنسو بیچارے رجّو کی نیک نیتی خلوص اور محبت کے مظہر تھے۔

بہر حال اُس دن سے رجّو نے مامی کے مکان میں آنا جانا بہت کم کر دیا، وہ اپنی ماں کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ مامی کے ساتھ بھی اپنی ہمدردی میں کمی نہ کرنا چاہتا تھا لیکن چچی کے دل میں ایک گانٹھ پڑ گئی، جس قدر رجّو اُسے سلجھانے کی کوشش کرتا اُتنی ہی وہ اور مضبوط ہوتی جاتی تھی۔ چچی اُس سے بولتیں لیکن باتوں میں اگلی محبت اور اگلا سا خلوص نہ تھا، ان کا لہجہ خشک تھا جس سے رجّو کے دل پر خواہ مخواہ چوٹ سی لگتی، اور وہ دل مسوس مسوس کر رہ جاتا۔ اس کی طبیعت

میں آتا کہ رو رو کر اپنی جان دے دے، جس کی گود میں پل کر وہ اتنا بڑا ہوا اسی کی زبان سے ایسی تلخ باتیں سنکر وہ تلملا اٹھتا تھا۔ لیکن فرطِ غم سے اس کے آنسو نہ نکلتے، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون پہلو اختیار کرے کہ اس کی ماں اس سے پھر اگلی سی محبت سے پیش آنے لگے۔

(۴)

رجّو کئی دن تک مامی کے یہاں نہیں گیا، وہ گھر ہی پر رہتا اور کہیں نہ جاتا وہ ہر وقت خدا سے یہی دعا کرتا کہ ایشور مجھے ٹھیک راستہ بتلا کہ میں کیا کروں۔

ایک روز وہ اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں گیا، واپسی پر وہاں اُسے جو پان ملا، اس کے کھاتے ہی اُسے متلی ہونے لگی، شاید پان میں تمباکو پڑ گیا تھا۔ رجّو کا سر چکرانے لگا، مامی کا مکان بالکل قریب تھا وہ وہیں جا کر ایک چارپائی پر لیٹ رہا۔ اس کے بدن سے پسینہ نکلنے لگا، اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ یہ دیکھکر مامی گھبرا گئیں، پشپا اور کملا پنکھا جھلنے لگیں۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد جب رجّو کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو پشپا نے ہنسکر کہا "دادا معلوم ہوتا ہے کہ آج تم نے بھنگ پی ہے، رجو نے جواب دیا نہیں بھنگ تو نہیں پی شاید پان میں تمباکو کھا گیا، اُسی وقت کملا بھی ہنستی ہوئی رمّو سے مخاطب ہو کر بولی "ارے رمّو جا کر بواجی سے کہہ آ کہ دادا نے آج بھنگ پی ہے اُنھیں نشہ چڑھ گیا ہے جس کے اُتارنے کے لئے دہی اور بڑے بھیجدیں"، پشپا نے بھی اس بات کی تصدیق کی اور کہا "ہاں رمو دوڑ جا دیکھ آج تجھے دہی بڑے کھانے کو ملیں گے، برجو تو بھی رمو کے ساتھ چلا جا"۔ غرض رمو اور برجو دونوں دوڑ گئے، رجّو نے کہا "پشپا تم نے یہ بُرا کیا، اماں مجھ پر خواہ مخواہ ناراض ہونگی"۔ یہ کہتا ہوا وہ بھی لڑکوں کے پیچھے جانے کے لئے باہر نکلا مگر دروازے سے باہر نکلتے ہی اس کا ایک دوست کیلاش مل گیا، وہ بولا "واہ یار کب سے تمھیں تلاش کر رہا تھا، مگر کہیں تمہارا پتہ نہیں چلا، خیر چلو روپ چند کے کمرے میں کورٹ پیس ہو رہا ہے، تم کو بلانے آیا تھا"۔ رجو نے کہا "بھائی ذرا دیر کے لئے مجھے معاف کرو، میں ابھی آتا ہوں ذرا گھر جا کر ایک ضروری بات کہہ آؤں"۔ لیکن کیلاش نہ مانا، مسکرا کر بولا "اجی حضرت ابھی آپ کو گھر میں کون سی ایسی ضروری بات کہنا ہے، ابھی تو بیوی صاحبہ بھی تشریف نہیں لائی ہیں"۔ رجو نے بہت کچھ عذر معذرت کی لیکن کیلاش نہ مانا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ رجّو نے مایوسانہ نگاہوں سے کیلاش کی طرف دیکھا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر کوئی بھاری مصیبت آنیوالی ہے

(۵)

تاش کھیلتے کھیلتے شام ہو گئی، رجّو کا دل اندر ہی اندر بیٹھا جاتا تھا۔ بہر حال چراغ جلنے کے وقت

جیسے ہی وہ مکان میں داخل ہوا چچی نے بگڑ کر کہا "اب تک تو کہاں رہا، اب تو تجھے بھنگ پینے کا بھی شوق پیدا ہو گیا ہے، آگے چلکر گانجہ چرس بھی پینے لگے گا۔"

رجّو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، بولا "اماں تمہیں ناحق مجھ پر شبہ ہے میں نے بھنگ نہیں پی"

"تو رمو اور برجو جھوٹ ہی کہتے تھے؟"

"پشپا اور کملا نے مذاق میں تم سے کہلا بھیجا تھا، میں گوپال چچا کے یہاں گیا تھا، وہاں پان میں شاید دھوکے سے تمباکو پڑ گیا تھا، کیونکہ اس کے کھاتے ہی میرے سر میں چکر آنے لگے، اور اندھیرا سا چھا گیا" چچی نے اور تیز ہو کر کہا "جھوٹا کہیں کا مجھے بہلانے چلا ہے نشہ تو تیری آنکھوں سے ظاہر ہے، دیکھ آگے چلکر اور کیا کرتا ہے۔"

رجو ان باتوں کو نہ برداشت کر سکا، اس کے ساتھ سراسر بے انصافی ہو رہی تھی، اگر چچی اُسکی ایک گوشمالی بھی کر دیتیں تو شاید اُسے اتنا غم نہ ہوتا، اُس نے بھی ذرا تیز ہو کر کہا "اماں تم تو مجھ سے ناحق ناراض ہو رہی ہو، میں نے بھنگ نہیں پی ہے۔"

بھنگ نہیں پی تو مامی کے یہاں کیوں پڑا رہا گھر کیوں نہیں چلا آیا، کیا انھیں لوگوں نے تجھے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے؟ رمو کہتا تھا کہ سب تیرے ٹھکا چھل رہے ہیں اور تجھے ہوش نہیں آتا" رجو کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ زمین پر گرنا چاہتا ہے، اُس نے پھر اُسی تیز لہجے میں جواب دیا " بالکل غلط ہے میں تو روپ چند کے کمرے میں تاش کھیل رہا تھا یقین نہ ہو کیلاش کو بلا کر دریافت کر لو" مگر چچی نے اس کی ایک نہ سُنی اور اُسی دھن میں جو کچھ دل میں آیا کہہ ڈالا۔ بابو رام شنکر مکان پر موجود نہ تھے ورنہ شاید اس قدر طوالت نہ ہوتی، پڑوس کی چند عورتیں جنھیں کسی مکان میں پھوٹ پیدا ہوتے دیکھکر خوشی ہوتی ہے کسی نہ کسی بہانہ سے آپہونچیں۔ ایک اپنے چھوٹے بچے کی آنکھ میں انجن لگوانے کے بہانہ سے آ گئی، دوسری کو خانہ داری کے متعلق کوئی ضروری مشورہ لینا تھا۔ ان میں سے ایک ذرا منہ بنا کر بولی "ٹھیک ہے بہن سیانی لڑکیوں کا لڑکوں سے ہنسنا بولنا اچھا نہیں ہوتا۔" یہ سنکر رجّو کے بدن میں اور بھی آگ لگ گئی اُس نے ایک طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھکر کہا "تم چپ رہ تم سے کون صلاح پوچھتا ہے" یہ سنکر دوسری عورت بولی "تم کیوں بولتی ہو تم کو کسی کے بیچ میں پڑنے کا کیا اختیار ہے"۔ رجّو سمجھدار لڑکا تھا، دل میں سوچا کہ چاہے میرے اوپر جتنی زیادتی کیوں نہ ہو ان کو خوش نہ ہونے دونگا۔ یہ سوچکر وہ باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد چچی بھی چپ ہو رہیں۔ رات کو جب بابو رام شنکر مکان آئے تو رجّو ان کے سامنے جاکر زار و قطار رونے لگا، رام شنکر نے تعجب سے کہا "میں رجو تم روتے کیوں ہو، کیا بات ہے؟ مگر رجو بیلے تو روتا ہی رہا

پھر جب اس کے آنسو تھمے تو اس نے کل قصہ کہہ سنایا، سب باتوں کو سنکر بابو رام شنکر نے کہا "تو اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات تھی"۔

رجو نے جواب دیا "میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے بھنگ نہیں پی، پشپا اور کملا نے یوں ہی اماں سے کہلا بھیجا تھا کہ میں نے بھنگ پی ہے"۔

رجو کے چچا نے مسکراتے ہوئے کہا "اچھا تو تمہاری اماں تم سے ناحق خفا ہوئیں"۔

رجو سر نیچا کئے خاموش کھڑا رہا۔

ادھر رمو اور برجو نے جب کل قصہ اپنی ماں کو سنایا تو وہ لڑکیوں پر بہت خفا ہوئیں، پشپا اور کملا دونوں رونے لگیں اور تھوڑی دیر بعد معافی مانگنے کے لئے اپنی بوا کے یہاں آئیں، بوا کے پاس پہونچتے ہی دونوں پھر بلک بلک کر رونے لگیں۔

رجو کی چچی ابھی تک بالکل خاموش بیٹھی تھیں، انھیں روتے دیکھکر ان کا دل پگھل گیا، انھوں نے بظاہر رنجی سے کہا "تم دونوں کیوں رو رہی رہو میں نے تمھیں تو کوئی بات بھی نہیں کہی ہے"۔

کملا بولی "بوا جی دادا نے بھنگ نہیں پی تھی میں نے جھوٹ موٹ آپ سے یہ کہلا بھیجا تھا آپ چاہے پشپا سے دریافت کرلیں"۔

پشپا نے سسکتے ہوئے کہا "ہاں بوا جی دادا کا کوئی قصور نہ تھا، ہمیں نے جھوٹ بات آپ سے کہلا بھیجی آپ ہمیں جو سزا چاہیں دیجیے" یہ کہکر وہ پھر سسکنے لگی۔

بابو رام شنکر رجو کو ساتھ لیئے ہوئے کھانا کھانے اندر آرہے تھے۔ جب انھوں نے پشپا کو سسکتے دیکھا تو بولے "تم لوگ آج جھوٹ کیوں بولیں؟ بوا جی اور دادا سے اس بات کی معافی مانگو"۔

چچی کا غصہ اتر چکا تھا، اب وہ دل ہی دل میں پچھتا رہی تھیں کہ انھوں نے بلا وجہ بیچارے رجو کو اس قدر سخت سست کہا، وہ پشپا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں "بیٹی تم کیوں روتی ہو، میں تم سے ناراض نہیں ہوں"۔

اتنے میں کملا بول اٹھی "اگر ناراض نہ ہوتیں تو دادا کو کیوں ڈانٹتیں"۔ یہ کہکر وہ سر نیچا کرکے زمین کی طرف تاکنے لگی۔

چچی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ڈانٹتی کیوں نہ تیرے جھوٹ بولنے کی سزا تجھے کیسے ملتی"۔

(۶)

بابو رام شنکر اور رجو دونوں کھانا کھاکر باہری کمرے میں سونے چلے گئے۔ پشپا اور کملا بھی مر...

چلی گئیں، رات کے گیارہ بج چکے تھے لیکن رجو کی آنکھوں میں نیند نہ آئی وہ سوچتا رہا کہ اماں کا دل میری طرف سے ابھی صاف نہیں ہوا، یہ خیال رہ رہ کر اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتا تھا۔

بارہ بجے کے قریب وہ اُٹھا اور اپنی چچی کے کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوا۔ وہ ابھی تک جگ رہی تھیں، رجو نے غور سے دیکھا، اُن کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ وہ کچھ سوچ رہی تھیں رجو کے آنے کی اُنھیں خبر نہ ہوئی، مگر یکایک رجو نے پکارا "اماں" تو چچی نے چونک کر دیکھا کہ ان کے پاس رجّو کھڑا ہے، وہ بھی بستر سے اُٹھ بیٹھیں اور بولیں "بھیّا رجّو........" اس کے آگے ان کی زبان بند ہوگئی مگر آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ رجو بھی رونے لگا، چچی نے اس کو گلے سے لگا کر کہا "بھیّا پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔"

رجو نے رقت آمیز لہجے میں کہا "اماں اب میرے ماتھی کے یہاں اُٹھنے بیٹھنے کا بُرا نہ ماننا۔"

چچی نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا "بیٹا پہلے تیری اماں وہ ہیں بعد کو میں"۔ اس وقت اُن کے چہرے پر ایک روحانی مسرّت کا ظہور تھا۔

اقبال نامۂ جہانگیری

مصنفہ بخشی معتمد خاں۔ کراؤن سائز ۳۳۷ صفحات۔ مجلد قیمت ۶؍

ملنے کا پتہ: رائے صاحب رام دیال اگروال پبلشر الہ آباد

یہ وہ مشہور و معروف کتاب ہے جس کو کپتان ولیم ناسولیس نے بعد تلاش حاصل کر کے ۱۸۶۵ء ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے شائع کیا تھا اور اب بعد صحت مولوی محمد رفیع صاحب نے مرتب کیا ہے۔

اس میں شہنشاہ جہانگیر کے زمانۂ حکومت کے خاص خاص تاریخی واقعات کے علاوہ حکما و شعرا وغیرہ کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔ اس کے مصنف (معتمد خاں) جہانگیر کے بخشی تھے اور انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لئے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ ان کے چشم دید حالات ہیں۔

اس کی زبان فارسی ہے۔ سادہ و رواں، طرز تحریر دلچسپ ہے۔ فارسی زبان سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔ یہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔

کلام حضرت اثر لکھنوی

(از سید محمد عسکری طبا طبائی۔ بی۔اے)

اُردو کے موجودہ ادیبوں میں ایک طرف تو وہ حضرات ہیں جو مشرقی علوم سے واقف مگر علوم مغرب سے بے بہرہ ہیں۔ دوسری طرف وہ اصحاب ہیں جن کی نظریں مغربی علوم سے ایسی خیرہ ہوگئی ہیں کہ اُنھیں اپنے علم و ادب کی خوبیاں نظر ہی نہیں آتیں۔ پہلا طبقہ اگر ادب میں مزید خوبیوں کا باعث نہیں تو دوسرا اپنی تنگ نظری سے اُس کے لئے نقصان رساں ہے۔ بہر صورت وسط کا طبقہ بہترین ہے، اور اس میں وہ حضرات شامل ہیں جو علوم مشرق و مغرب دونوں سے آگاہی رکھتے ہیں، دراصل یہی حضرات ادب اردو کی صحیح خدمت انجام دے سکتے ہیں، جناب اثر لکھنوی انھیں چند مبارک افراد میں ہیں جنھوں نے مشرق و مغرب کے درمیان صحیح راہ معلوم کرلی ہے۔ اور استقلال کے ساتھ اسی پر گامزن ہیں۔ نہ صرف مشرقی ادب کی خوبیوں سے واقف ہیں بلکہ مغربی اصولِ تنقید سے بھی کماحقہٗ آگاہ ہیں یہی سبب ہے کہ اُن کی شاعری موجودہ زمانے میں پسندیدہ نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔

جو شاعری تصنع سے پاک ہوگی دل پر اثر انداز ہوگی، اثر کلام اثرؔ کی جان ہے اور وہ اسم بامسمیٰ ہیں ان کے احساسات نازک اور جذبات لطیف ہیں، خیالات میں بلندی اور انداز بیان میں جوش و ندرت ہے طبیعت میں شوخی و بذلہ سنجی کے ساتھ سوز و گداز بھی ہے۔ ملٹن کی بتائی ہوئی خصوصیتیں یعنی سادگی، جوش اور اصلیت اُن کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس وقت ان کی ایک غزل مشتے نمونہ از خروارے حاضر ہے جس سے معلوم ہوگا کہ اس فطری شاعر کے کلام میں کیا کیا خوبیاں ہیں۔

یہاں پر میں یہ بھی عرض کردینا چاہتا ہوں کہ یہ غزل ان کی منتخب غزلوں میں نہیں اور نہ یہ اُن کی بہترین غزل ہے، میں اس پر خامہ فرسائی کے لئے محض اس طرح آمادہ ہوگیا ہوں جیسے کوئی خوشنما پھولوں کے گلدستے سے آنکھ بند کرکے ایک پھول توڑ لے اور بعد میں اس کے رنگ و بو سے اپنے ذوق نظر اور

قوت شامہ کا صحیح اندازہ لگائیے۔

اب غزل ملاحظہ ہو۔

دل بُرا ہوتا ہے تجھ سے غم جاناں کوئی کیوں کرے شکوۂ محرومیِ درماں کوئی

غم عشق میں شکوۂ تغافل آدابِ عشق کے خلاف ہی نہیں بلکہ دل بُرا ہونیکی بھی علامت ہے، اسی لیے پہلے مصرعہ میں ایک تغافل کیش کی طرفداری کی جا رہی ہے، مصرعہ ثانی میں غم جاناں سے تخاطب ہے اور ایسے پیار کے لہجے میں کہ شعر سے مجموعی طور پر ایک طربناک کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ کہنے والے کی حقیقی خوشدلی پر دال ہے مگر اس کی تہ میں خود درد و اثر اور سوز و گداز پوشیدہ ہے جس سے ذہن سامع پر برعکس اثر ہوتا ہے اور وہ عاشق کی اُس خندہ پیشانی پر جس کے ساتھ وہ درد الفت اور محرومیِ درماں، بیک وقت برداشت کرتا ہے، دل میں ایک جذبۂ رحم و ہمدردی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ محرومیِ درماں کا یہ عالم ہے کہ خود غم جاناں پشیمان ہے کہ میں نے اس غریب کو کیسی کیسی بلاؤں مصیبتوں اور ایذاؤں کا نشانہ بنایا ہے اور یہ شکوہ بھی نہیں کرتا۔ لہذا غم کی دلدہی کو کہتے ہیں۔ "کیوں کرے شکوۂ محرومیِ درماں کوئی + دل بُرا ہوتا ہے تجھ سے غم جاناں کوئی"۔

لو چلا شعلہ بدل جانب امکاں کوئی لے لیا حسن فسوں ساز نے پیماں کوئی

روداد ازل کی طرف اشارہ ہے جب "الست بربکم" کے جواب میں "بلیٰ" کہا گیا تھا حُسن اور حُسن بھی فسوں ساز، آخر اس نے عشق سے پیمانِ وفا لے ہی لیا۔ اور عشق کی سادہ لوحی دیکھئے کہ اقرار وفا کرنے کو تو کرلیا لیکن انجام کو نہ سوچا جس کا ایک فوری نتیجہ یہ ہوا کہ دل کو ایک شعلہ سپرد کردیا گیا (یہ آئندہ مصیبتوں اور اضطراب کی نشانی تھی) اور پھر منزل امکاں کی رہ نہادی گئی جو خود بلاؤں کا پیش خیمہ ہے۔ دوسرے مصرعہ کا طرز ادا اور خصوصاً "لو" کا صرف ایسے محل پر ہوا ہے کہ آئندہ مصائب کی طرف ذہن منتقل ہوجاتا ہے۔ شاعر تو اتنا کہکر خاموش رہے کہ "لو چلا شعلہ بدل بجانب امکاں کوئی" مگر سننے والا خود بخود مطلب پورا کرلیتا ہے کہ اب خدا ہی خیر کرے دیکھئے کیا کیا مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔

بلاغت دیکھئے کہ شاعر نے پہلے مصرعے میں "پیماں" کی کوئی تشریح نہیں کی اور صرف اس کی نوعیت کی طرف دوسرے مصرعہ میں "شعلہ بدل" کہکر اشارہ کردیا جس سے مطلب صاف ہوگیا۔ یعنی انسان کو آستانِ حسن سے التہاب و اضطراب عشق عنایت ہوا اور وسعت گہ امکان کی رہ نوردی کا حکم ہوکر ارشاد ہوا کہ تیرے پیمانِ عشق و وفا کا امتحان ہے، پہلے نپٹنے کو درخور لطف و عطا ثابت کر پھر ہماری خلوت خاص میں باریاب ہوگا۔ مصرعۂ اولیٰ میں لفظ "فسوں ساز" اور ثانی میں کلمۂ استعجاب و اضطرار "لو" اُن تمام آلام و آفات اور

آزمائشوں کی مجمل تاریخ ہیں جو انسان کو حیز امکان میں پیش آنیوالے تھے۔

جا رہا ہے طرفِ گورِ غریباں کوئی   آج درپیش ہے پھر کارِ نمایاں کوئی

شعر کی تعریف یہ ہے کہ کانوں کے راستے سیدھا دل میں اُتر جائے، سوچنے اور سمجھنے کی مہلت نہ دے اوپر کا مطلع ایسا ہی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں ایک گہرا طنز پوشیدہ ہے۔ تخیل کی کارفرمائی دیکھیئے کہ اسی طنز سے معشوق کی مغرورانہ رفتار پیش نظر ہو جاتی ہے، یعنی جا تو رہے ہیں بیکسوں کی قبریں برباد کرنے اور چال ایسی پرتکبر ہے کہ گویا کوئی بڑا کام کرنے جا رہے ہیں۔ "پھر" کا لفظ بہت اہم ہے: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی مرتبہ پیشتر بھی ایسے ہی مظالم ڈھائے جا چکے ہیں۔ گورِ غریباں لُبھانے والے اسی سراپا ناز کے کشتۂ ادا ہیں۔ زندگی میں ان غریبوں کو تباہ و برباد کیا اب ان کے نشاناتِ مزار بھی مٹا دیے جائیں گے۔ ایک کارِ نمایاں وہ تھا دوسرا یہ ہے۔

پہلے پیدا تو کرے دیدۂ حیراں کوئی   مل ہی جائیگی رہِ منزلِ عرفاں کوئی

کس قدر بلند مطلع ہے، بیشک راہِ منزلِ عرفاں کا مل جانا آسان اور دیدۂ حیراں پیدا کرنا مشکل ہے۔ یہ حیرانی وہ نہیں ہے جو جہل سے پیدا ہوتی ہے (العلم حجاب اکبر) حقیقت یہ ہے کہ انسان جس قدر علم و عرفان کے منازل طے کرتا جاتا ہے اُس کا دماغ عاجز ہوتا جاتا ہے اور آخر ایک مدام حیرت و استعجاب کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ یہ وہی حیرانی ہے کہ طالبانِ حقیقت اگر اس وادی میں ثابت قدم رہیں تو منزلِ عرفان تک رسائی آسان ہوتی ہے، بلکہ یہی حیرانی عین معرفت ہے۔ حیرت ایک وہ رہرو ہے جس کی نظر سے حجاباتِ زمان و مکان اُٹھ جاتے ہیں اور جو برسوں کی راہ دم بھر میں طے کرتا ہے۔ دیدۂ حیراں تحقیقِ جادہ و منزل سے بھی بے نیاز ہے، جس طرف نظر اُٹھ گئی وہی جادۂ راست ہے، اور اُدھر ہی منزل بھی پیشِ نظر ہو گی۔

دوسرے مصرعہ میں لفظ "کوئی" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دیدۂ حیراں پیدا کرنے کے بعد یہ پابندی نہیں رہتی کہ کسی خاص راہ سے منزل کی طرف قدم اُٹھے، ہر شے منزلِ مقصود کا جادہ بن جاتی ہے۔ پھول کی ایک پنکھڑی نکہتِ آوارہ کا ایک جھونکا، ایک ذرہ، ایک قطرہ سب منزل تک پہونچا دیتے ہیں ہاں شرط یہ ہے کہ "دیدۂ حیراں" کی نعمت مل چکی ہو۔ یعنی غور و فکر اور نفسیاتی تحلیل کے بجائے دل کی حساس بیاض کو سادہ چھوڑ دینے کا ملکہ حاصل ہو چکا ہو تا کہ نقوشِ فطرت و حقیقت از خود مرتسم ہو کر اپنے اسرار ظاہر کریں۔ جب عقل و شعور کی دراندازی و رنگ آمیزی نہ ہو گی تو نقوش خالص اور فطرت کے ترجمان ہونگے یہی وہ نکتے ہیں جن تک عام شعرا کی نظریں نہیں پہونچتیں۔ الٰہیات کے ان گہرے مسائل پر اس قدر

تیز روشنی ڈالنا حضرت اثر ہی کا کام تھا۔

جوش زن خوں ہے کہ نغموں کا ہے طوفاں کوئی — اس طرح چھیڑ گیا تارِ رگِ جاں کوئی

معاذ اللہ، مطلع ہے یا ایک نغمہ زار کہ جس میں احساسات گم ہوئے جاتے ہیں، اگر دل پوری طرح متاثر ہو جائے تو تخئیل میں شور برپا ہو جاتا ہے۔ اور دماغ میں تاروں کی سی جھنکار پیدا ہونے لگتی ہے۔ مطلب سمجھنے اور لکھنے کا کسے یارا ہے۔

شاعری کا اعلیٰ کمال یہ ہے کہ شعر کہتے وقت جو کیفیت شاعر کے دل پر طاری ہوئی تھی وہی شعر سنتے وقت سامع کے دل پر طاری ہو جائے۔ اس مطلع کو بار بار ٹھہر ٹھہر کر پڑھیئے، دیکھئے بربطِ جاں سے نغمے پھوٹ نکلتے ہیں یا نہیں

اپنی ہی بزمِ تمنا میں نہیں بار مجھے — خانۂ دل میں ہے اس شان سے مہماں کوئی

خانۂ دل میں کسی کے مہمان ہونے کا تقاضا یہی تھا کہ عاشق آپ سے بیگانہ ہو جائے قسمت کی نیرنگی دیکھئے کہ جب معشوق کا قرب نصیب ہوا تو عاشق اپنے آپ کو بھول گیا، اس کو عشق کی غیرت کہا جائے یا حسن کی شان بے نیازی کہ محفلِ یار میں خیالِ غیر تو کجا خود عاشق کو بھی باریابی حاصل نہیں۔

مجھ کو بھولے ہوئے اربابِ وطن یاد آئے — یوں ستاتا نہیں اے شامِ غریباں کوئی

شعر ہے یا ایک نشتر کہ دل میں چبھتا چلا جاتا ہے۔ مضمون فرسودہ تھا مگر حقیقی شاعر اثر لیکے کوئی بات کہدے اور ضائع جائے یہ ناممکن ہے۔ "یوں" کے استعمال میں جو قوت صرف ہوئی ہے اس کی پناہ نہیں۔ اگر "ستانے" کی حدیں علٰحدہ علٰحدہ بیان کی جاتیں تو یہ اثر نہ پیدا ہوتا۔

اشکِ خوں زیبِ مژہ رہنے دے لے دیدۂ تر — اپنے ہاتھوں سے لٹاتا ہے گلستاں کوئی

شعر صاف ہے مگر اثر سے خالی نہیں، دوسرے مصرعہ کی زبان دیکھئے: الفاظ میں شہد ملا دیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دانتوں میں انگلی دبائے کہہ رہا ہے "اپنے ہاتھوں سے لٹاتا ہے گلستاں کوئی"۔ "زیبِ مژہ" سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خانۂ چشم کی تمام تر زینت کا انحصار اشک خوں ہی پر ہے

ذرے ذرے سے ہے آہنگِ انا البرق بلند — وادیِ شوق سے گذرا ہے غزلخواں کوئی

اس شعر میں اثر مابعد کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ کوئی مستانہ وار نغمہ فشاں وادی سے گذر گیا اور اب یہ عالم ہے کہ ذرے ذرے سے شورِ انا البرق نہیں "آہنگِ انا البرق" بلند ہے۔ ہائے کیا لفظ رکھا ہے کہ کانوں میں نغموں کی صدا آنے لگتی ہے۔ ایک طرف تو کسی کی غزلخوانی نے ذرے ذرے کو مطرب خوشنوا بنا دیا دوسری طرف اسی کے شوقِ فراواں اور گرمیِ رفتار نے اُن کے پیکر میں بجلیاں بھر دیں اب وادی

شوق کیا ہے ایک دنیائے نغمہ و نور ہے کہ مجسّم پیشِ نظر ہے۔

قطرہ ہے موج بدل، موج ہے طوفاں بکنار بحرِ ہستی کے نہیں جوش کا پایاں کوئی

زندگی کو بحر بتایا اور وہ بحر جس کا قطرہ قطرہ موج بردوش اور ہر موج طوفان درآغوش ہے، یہ فلسفہ ارتقا ہے جو خاص شاعرانہ انداز میں نظم ہوا ہے، برگسان مشہور عالم جرمن فلسفی لکھتا ہے کہ "حیات جو عالم میں جاری و ساری ہے بالذات آمادۂ ارتقا ہے، دنیا برابر تکمیل پا رہی ہے" یہی نقطہ حضرت اثر کے پیش نظر تھا، قطرے اپنے دامن میں موجیں چھپائے ہوئے ہیں اور موجیں طوفانوں کی پرورش کر رہی ہیں، ہر شے مائل بہ ترقی ہے۔ خدا جانے حیات کن کن صورتوں میں ظہور پذیر ہوگی اور دنیا ابھی کیا سے کیا ہو جائیگی۔

فلسفیانہ مضامین کے نظم کرنے میں شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ مضمون سے فلسفے کی خشکی دور کر دے اور اس کے نظم کرنے میں شاعری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ حضرت اثر کے شعر میں اس خوبی کا اندازہ لگائیے، وہی دلآویز استعارے ہیں وہی دلفریب ترکیبیں اور وہی مخصوص زورِ بیان جو شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

گلِ نظارہ سے آغوشِ تماشا بھر لے دیکھتا ہے تجھے لے دیدۂ حیراں کوئی

کسی کا دیدۂ حیراں ہے کہ بے خبر کسی دوسرے عالم میں ہے اور کوئی دیدۂ حیراں کی بہار دیکھ رہا ہے کس قدر لطیف منظر ہے، اس موقع پر دیدۂ حیراں کو یہ تاکید کہ ایسے میں جلوۂ حسن عام ہے جی بھر کے بہاریں لوٹ لے کیا مزہ دے رہی ہے حقیقت میں یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ "نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد" نہ کہ چشمِ تماشا خود حیرت فروش بن جائے اور نظارے سے یکسر محروم رہے۔

"گلِ نظارہ" "آغوشِ تماشا" اور "دیدۂ حیراں" کتنی شگفتہ ترکیبیں ہیں، ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک شعر ہے۔

مدعا پوچھنے والے تری باتوں کے نثار اب وہ عالم ہے کہ حسرت ہے نہ ارماں کوئی

کیا کہنا، عشق کی ادا شناسی کا تقاضا یہی تھا۔ جناب اثر زبان کے تو مالک ہی ہیں اگر مضمون بھی لطیف ہو تو نورٌ علیٰ نور کیوں نہ ہو جائے۔ بس پڑھیئے اور لطف اٹھائیے۔

پھر تڑپتے ہوئے دل ٹھہرے، ٹھہر کر تڑپے پھر ہوا ناز سے برہم زنِ مژگاں کوئی

کتنی دلکش تصویر ہے "برہم زنِ مژگاں" ہونے سے مراد آنکھوں کی وہ خواب آلود کیفیت ہے جس میں پلکیں بار بار بے اختیار جھپک جاتی ہیں۔ اگر ناز حسن سے یہ کیفیت پیدا کی جائے تو اس کی دلفریبی کا کیا عالم ہوگا۔ اس ادا کے دیکھنے والوں پر جو اثر مترتب ہو سکتا ہے اُس کے اظہار کے لئے ایک شاعر

کو شاید ہی اس سے بہتر اسلوبِ بیان مل سکتا ہو جو حضرت آثر نے پہلے مصرعہ میں اختیار کیا ہے۔ جبتک تیغِ نگاہ کے بھرپور وار ہو رہے تھے، دل مستقل طور سے تڑپ رہے تھے۔ اُدھر مژگان کی صفحوں میں برہمی پیدا ہوئی اور ادھر دلوں کی حرکت ایک لمحے کے لئے رُک گئی سکتہ سا ہو گیا، پھر پلکیں سیدھی ہوئیں اور پھر رقصِ بسمل ہونے لگا۔ "برہم زنِ مژگاں" جناب آثر کی مخصوص ترکیبوں میں سے ہے۔ ایک جگہ اور کہا ہے

نیند کے حیلے سے وہ برہم زنِ مژگاں ہوا   ہمنشیں اب ہم یونہی ترسا کرینگے خواب کو

قیدِ امکاں سے بھی دیوانوں کی وحشت نہ گئی   اور تعمیر ہو ان کے لئے زنداں کوئی

کس قدر بلند مضمون ہے اور کتنی بیساختگی کے ساتھ نظم ہوا ہے۔ یہ شعر یوں کہنا چاہیئے کہ اُس خیال کے اثرات مابعد ہیں جو اس مطلع میں نظم ہوا ہے ؎

لے لیا حسنِ فسوں ساز نے پامال کوئی   لو چلا شعلۂ دل جانبِ امکاں کوئی

عالمِ امکاں کو زنداں قرار دیا ہے کیونکہ مختلف قیود عائد ہیں۔ حسن فسوں ساز نے انسان کو اپنا عشق دیکر یہاں اس لئے بھیجا کہ امکان یا مجاز کی دلکشی و دلفریبی میں اُلجھ کر فرمانِ "اہبطوا" کا حقیقی منشاء فراموش کر دے اور آستانِ حُسن سے نیازمندی کا پیمان، وقت آزمائش غلط ثابت ہو، حسن ہنگامہ زا کی یہ ایک ادنیٰ شوخی ہے۔ دیوانگانِ عشق آئے اور مجاز کو حقیقت کا پرتو سمجھنے لگے۔ ہر شے میں اسی نگاہِ فتنہ زا کو کارفرما دیکھتے ہیں اور سر دُھنتے ہیں۔ کبھی علانیہ اور کبھی چپکے سے کہتے ہیں کہ "حضور آپ کا منصوبہ پورا نہیں ہوا" لہذا اب کوئی اور زنداں اس زندانِ امکان سے الگ تعمیر ہو۔ گویا در پردہ یہ التجا ہے کہ اِن دیوانوں کو دوبارہ حریمِ ناز میں باریابی کا حکم ہو ورنہ فتنہ و شر، شور و فساد فرو ہوتے نظر نہیں آتے۔ اس التجا نے حُسن فسوں ساز کی بات بھی رکھ لی۔

شعر کی بنیاد وہی عظیم الشان مسئلہ ہے کہ حُسن و عشق ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

ہوش رہتا ہے بس اتنا دمِ تحریکِ جنوں   جیسے چھینے لئے جاتا ہے گریباں کوئی

عجیب و غریب شعر ہے، جوشِ وحشت اور فراوانیٔ جنوں کی ترجمانی کے لئے اردو زبان میں شاید ہی اس سے بہتر کوئی پیرایۂ بیان وضع کیا گیا ہو۔ شعر میں اُس عالم کی مصوری کی گئی ہے جس میں جنون اُس نقطے پر پہونچ جاتا ہے کہ دیوانہ خود اپنی وحشت کا پردہ چاک کرنے لگتا ہے اور اُسے اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ یہ کس کا فعل ہے۔ بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ کوئی دوسرا ایسا کر رہا ہے۔ شعر کی لطافت کا راز اسی نکتے میں پوشیدہ ہے کہ جو بات ہوش کی علامت بتائی گئی ہے وہ خود بے ہوشی کی دلیل ہے جس کو ہوش کے عالم میں یہ محسوس ہوتا ہو کہ جیسے کوئی گریباں چھینے لئے جاتا ہے۔ اُس کی بیہوشی

کا کیا ٹھکانا ہوگا، پھر بڑھتی ہوئی وحشت سے جو خلش سی دل میں پیدا ہوئی اسے ہوش سے تعبیر کر دینا حضرت آثر ہی کا کام تھا۔ احساسات کی یہ نزاکت ایک فطری شاعری میں پائی جاسکتی ہے۔ دیکھیے گریبان کا مضمون اردو شاعری میں کس قدر پامال ہے لیکن جو شعر التقلید سے بیگانہ ہیں وہ ہر جگہ تازگی وجدت پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ جدت ادا ہی کا افسوں ہے جس نے اس پیکر مردہ میں از سر نو روح پھونک دی۔

شعر میں "تحریک جنوں" کا لفظ خاص ہے۔ اس سے وہ کیفیت پیش نظر ہو جاتی ہے جب طبیعت قابو سے باہر ہو جائے اور ہاتھ بلا ارادہ گریبان کی طرف بڑھنے لگے۔ خود لفظ تحریک میں یہ جادو موجود ہے۔ تحریک اور گریبان چھیننے میں جو معنوی ربط ہے وہ الفاظ میں ادا نہیں ہوسکتا۔ ذرا اور گہری نظر سے دیکھئے تو اس لفظ کی کارفرمائیاں معلوم ہوں، گویا جنون ایک ساکت سمندر ہے جس نے یکایک سانس لی کروٹ بدلی اور جزر و مد پیدا ہو گیا، اب جوش جنوں کا یہ عالم ہے کہ خود ہی اپنا گریبان چاک کرتے ہیں اور دھوکا یہ ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص ہمارا گریبان چھیننے لئے جاتا ہے اور ہم اس کا ہاتھ پکڑ رہے ہیں یعنی اس کو اس فعل سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔

دیکھئے تو انداز بیان نے فنا کا کیسا درجہ دکھایا ہے۔ خودی نہیں بلکہ احساس خودی فنا ہو رہا ہے، مگر ہنگامہ فنا بھی خودی اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتی ہے، یہ معمولی خودی نہیں ہے جو مائل بہ فنا ہے بلکہ اس میں جذبۂ خودداری بھی شامل ہے، ایسی خودی کو بھی نذر فنا کر دینا جس قدر مشکل اتنا ہی بصیرت افروز ہے۔

لفظ "جیسے" میں یہ نکتہ ہے کہ بیان واقعہ سے کیفیت قلب کی طرف اشارہ ہوتا ہے، دل پر ویسی ہی حیرت و وحشت طاری ہے جو اس وقت طاری ہوتی جب کوئی دوسرا شخص گریبان چاک کرتا۔

یہ نفسیات کے کیسے باریک مسائل ہیں اور فطرت کے کس قدر نازک پہلو۔ یہ مصور کا کام نہیں کہ وہ پردۂ تصویر پر ان لطیف جذبات و احساسات کی ترجمانی کر سکے۔ یہ شاعر ہی کا کمال ہے کہ وہ قلب انسانی کی عمیق ترین گہرائیوں سے ان سربستہ رازوں کو معلوم کرے اور اپنے اشعار میں ان کا حل پیش کرے۔

کارفرما وہ نگاہِ غلط انداز نہیں آہ کیونکر ہو حریف غم پنہاں کوئی

معشوق کی نگاہِ غلط انداز کے ٹھوکوں سے عاشق کے دل میں ہر گھڑی غم عشق برداشت کرنے کی تازہ جرات پیدا ہوتے رہنا کس قدر نازک بات تھی۔ ایک باریک بیں شاعر نے اس کی گرفت کرلی اور کس اثر آفرینی کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھال دیا۔ مطلب یہ ہے کہ دل غم الفت اٹھانے کے لئے محبوب کے ذرا سے التفات کا سہارا ڈھونڈتا تھا۔ چاہے وہ نگاہِ غلط انداز ہی کی صورت میں کیوں نہ ہوتا۔ اب اتنا سہارا بھی نہیں تو دل ہمت ہارے دیتا ہے اور عاشق ہے کہ بیتاب ہوا جاتا ہے

وہ چاہتا ہے کہ کوئی تو ایسی سبیل نکلے کہ یہ دولت ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

شعر میں کس قیامت کا اثر ہے، معلوم ہوتا ہے کوئی تڑپ رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

کارفرما وہ نگاہ غلط انداز نہیں　　　آہ کیونکر ہو حریفِ غمِ پنہاں کوئی

یہ بات "آہ" کے صرف سے پیدا ہوئی۔

عدل کے بدلے طلب ہوتی ہے میزانِ کرم　　　پیش کرنیکو ہے بے برگیِ عصیاں کوئی

میزانِ عدل میں دو پلّے ہونگے، ایک طرف اعمال نیک رکھے جائیں گے، دوسری طرف افعال بد۔ یہاں اعمال نیک کا تو پتہ ہی نہیں (بے برگی عصیاں سے اشارہ ہے) پھر میزان کرم کیوں نہ طلب ہو جو اس مقدار غیرِ مُثبت کا وزن بھی کر سکے۔

طبعِ اثر نے رحمت وعصیاں کے جادے میں بھی خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔ اگر اس عنوان کے ماتحت اُن کے منتخب اشعار جمع کئے جائیں تو ایک نادر ذخیرہ فراہم ہو جائے۔ مثلاً

تیری مرضی ہو جہاں بھیجدے اے داورِ حشر　　　مجھ سے دُہرائی نہ جائیگی خطائیں اپنی

نہ پڑھ فردِ عمل میری کچھ ایسے ہی معاصی ہیں　　　کہ تیرے عفو کا اے میرے مالک امتحاں ہوگا

چشمِ عصیاں سے ڈھلک کر دامنِ رحمت میں تھا　　　لغزشِ مستانۂ اشکِ ندامت دیکھئے

اِک نظر اور تری شانِ کریمی کے نثار　　　یادِ عصیاں کی ابھی دل سے فراموش نہیں

خود بخود اشک بھرے آتے ہیں آنکھوں میں اثر　　　شاید اب دل میں نہیں داغِ فروزاں کوئی

آنکھوں میں آنسوؤں کا آنا اس بات کی علامت ہے کہ دل کے سب داغ بجھ چکے ہیں۔ ورنہ اگر ایک بھی باقی ہوتا تو اس پانی کو جلا دیتا۔ وادیِ عشق میں یہ وہ منزل ہے جہاں بیدلی کا عالم ہوتا ہے آنکھوں میں اشک بھر آنے کو عام طور سے زندہ دلی کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ حضرت اثر نے اس کو پژمردگی قلب کی نشانی بتایا ہے اور عدم داغ کو ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دل میں اب بھلا سا سوز کہاں، ورنہ اس کے کیا معنی کہ آنکھ تک آنسو آئیں اور دُھواں نہ بن جائیں۔

ایک مقطع اور ہے۔

ہے بڑی چیز اثر محرمیِ عشق و جنوں　　　پہلے سمجھے تو سہی رازِ گریباں کوئی

یعنی عشق وجنون کی ظاہری علامت گریبان ہے جو بجائے خود ایک ایسا راز ہے کہ جس کا سمجھنا دشوار ہے۔ ہر شئے ایک پردہ نظر آتی ہے جس کے چاک کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر ایک حجاب اُٹھتا ہے دوسرا

پیدا ہوتا ہے۔ حرم عشق و جنون تک رسائی بغیر چاک گریباں دشوار ہے۔

شعر میں گریبان کی حقیقت بتائی ہے، یہ چار گرہ کپڑا نہیں ہے بلکہ حجابات شہود و تعین ہیں۔ انسان ان کو تو پہلے اُٹھالے پھر اسرار عشق سمجھنے کا مدعی بنے۔

اوپر کے اشعار میں میں نے اُن چند خوبیوں کی طرف اشارے کئے ہیں جو صرف پختہ کار اور اعلیٰ شعراہی کے کلام میں پائی جاسکتی ہیں۔ بندش کی چستی، زبان کی روانی، روزمرہ کی چاشنی، ردیف کی قافیئے سے پیوستگی اور دیگر معمولی باتوں کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ یہ تو وہ راہیں ہیں جہاں سے ہر شاعر کو گذرنا ناگزیر ہے لیکن حضرت آثر اب اس منزل پر پہونچ چکے ہیں جہاں ان خوبیوں کا تذکرہ اُن کے لئے باعثِ ناز نہیں ہوسکتا۔

لالہ رام دیال اگروالا کی ہندی مطبوعات

حال میں رائےصاحب لالہ رام دیال صاحب پبلشر و بک سیلر الہ آباد نے ہندی کی کئی قابل قدر کتابیں شائع کر کے ہندی ادب کی توسیع و ترقی میں خاص حصہ لیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندی میں عام معلومات کی کتابیں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں، کیا اچھا ہو کہ قدرشناسان اُردو بھی اس طرف توجہ کرکے اردو ادب کی موجودہ کمی کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ ابھی تک اُردو میں نئی معلومات کا ذخیرہ بہت ہی کمیاب ہے۔ یہ تینوں کتابیں یعنی "سمندر پر وجے" "وایو پر وجے" اور "پرکرت کی برلجے" مشہور مصنف شری یان جگتی چترویدی کی تصنیف ہیں اور تینوں باتصویر ہیں جس کی وجہ سے انکی دلچسپی بہت بڑھ گئی ہے، ان کی عبارت سلیس اور طرز بیان نہایت آسان ہے اور کم عمر والے بچے بھی ان کو پڑھکر معلومات حاصل کرسکتے ہیں، قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔ اول دو کتابوں کی قیمت ایک روپیہ فی کتاب اور تیسری کتاب کی قیمت صرف دس آنہ ہے۔ لالہ رام دیال صاحب نے اسی مصنف کی ایک اور قابل قدر کتاب "او بھت مہا پرش" بھی شائع کی ہے جس میں گیلیلیو، نیوٹن، ایڈیسن، اور بوس وغیرہ نامور سائنسدانوں کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں اور ان سب کی تصویریں بھی دی گئی ہیں قیمت ۱۰/ "ابھیمنیو بدھ" شری رامچندر شکل سرس کی دلچسپ منظوم تصنیف ہے، خود مصنف کا نام اس کتاب کی عمدگی کا ثبوت ہے اس کا حجم ۶۵ صفحات اور قیمت ۸/ ہے۔ شائقین رائےصاحب لالہ رام دیال صاحب بک سیلر کٹرا الہ آباد سے طلب فرمائیں۔

تنقید کتب

رَس یعنی فلسفۂ انبساط

مصنفہ مولوی حبیب الرحمٰن شاستری سنسکرت لیکچرار مسلم یونیورسٹی کالج علیگڈھ
ڈیمائی سائز ۱۸۴ صفحات مجلد قیمت بلحاظ کاغذ درجہ اول عہ درجہ دوم عہ/

ملنے کا پتہ: ارشاد اینڈ کو، چوک بازار علی گڈھ۔

رَس اُردو داں حضرات کے لئے غالباً نیا موضوع ہے اور اس کی حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہونگے، لہذا مندرجہ بالا کتاب پر تبصرہ کرنے سے پہلے رَس کے معنی اور اسکی اصلیت کو ذہن نشین کرلینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ رَس سنسکرت زبان کا لفظ ہے اور انبساط یا لطف کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے لیکن اس لطف یا لذت کو جو مادّی ہو رَس نہیں کہا جاتا بلکہ اس وجدانی کیفیت کو کہتے ہیں جو کسی دلکش منظر کے دیکھنے یا پُرلطف اشعار کے سننے سے انسانی قلب میں پیدا ہوتی ہے اور اس کتاب میں اُسی کیفیت کی تشریح کی گئی ہے اور اس کو ایک ربّانی پرتو اور ذاتی تجلّی بتلایا گیا ہے

دیباچہ اور تمہید کے علاوہ اس کتاب میں نو باب ہیں جن میں رَس کے متعلق مختلف العقائد حضرات کے عقیدہ، ان پر تبصرہ، رَس پیدا کرنے کے محرک، اُن کا اثر، منقلبات، جذبۂ مستقل، رَس کی قسمیں، رَس کے مائل اور رس کی حقیقت پر بڑی دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ جابجا سنسکرت کے حوالے حاشیہ پر درج ہیں اور ان کا ترجمہ متن میں موجود ہے۔

چونکہ اپنشد کے خیال کے مطابق رَس خود خدا ہے اس لئے دیباچہ میں وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور آخری باب میں یہ ثابت کیا ہے کہ واقعی حقیقی مسرت یا قلبی لذّت ایک پرتو ایزدی ہے۔

اس کتاب کا موضوع بالکل جدید ہے، اُردو میں ابتک غالباً کوئی کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی۔ مصنف مستحق ستایش ہیں جنھوں نے سنسکرت، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد اس مضمون پر یہ کتاب لکھی ہے جو اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ فلسفیانہ مباحث کے باوجود یہ کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ ابتدائی حصہ کو غور و تامل کے ساتھ پڑھنے کے بعد ناظرین کتاب

کو ختم کئے بغیر چھوڑ نہ سکیں گے۔ کیونکہ رس کے محرکات اور اثر وغیرہ کے سلسلہ میں سنسکرت ادب سے جو مثالیں دی گئی ہیں وہ بے حد دلکش ہیں، مصنف کا طرز تحریر سلجھا ہوا ہے، عبارت دلنشین ہے غرض ہر حیثیت سے یہ کتاب لائق مطالعہ ہے اور مصنف کا یہ خیال کہ "رس کے مضمون کی جدت محققانہ بلند پروازی، شاعرانہ نازک خیالی، سنسکرت شعرا کی نظری اور دلآویز مضمون آرائی مسلمان طلبا کے قلوب میں بھی علم سنسکرت کا ذوق پیدا کرنے کا ایک بہت بڑا سبب ہوگی" صحیح ہے کیونکہ ہندی اور سنسکرت کی شاعری میں بکثرت ایسی دلچسپ باتیں موجود ہیں جن کو اُردو داں حضرات بالکل نہیں جانتے۔

کتاب کے آخر میں اس کتاب کے متعلق سنسکرت کے ماہرین کی رائیں درج ہیں اور ہر شخص نے مصنف کی کوشش کی داد دی ہے اور اسکو ہندو مسلم اتحاد کا پیش خیمہ کہا ہے۔

ہم مصنف کو یہ قابل قدر کتاب لکھنے پر مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اُردو داں ہندو مسلمان حضرات اس کے مطالعہ سے کافی فائدہ اُٹھائیں گے۔

مبادئ فلسفہ

از مولانا عبد الماجد بی۔اے۔ کراؤن سائز ۱۸۵ صفحات

ملنے کا پتہ: معارف پریس اعظم گڈھ

اُردو کے مشہور مصنف مولانا عبد الماجد بی۔اے (دریا بادی) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں آپ کی متعدد کتابیں شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکی ہیں، خصوصاً "فلسفۂ جذبات" و "فلسفۂ اجتماع"۔ یہ کتاب فلسفہ کی پہلی کتاب ہے اور چند قدیم متفرق فلسفیانہ مقالات کا مجموعہ ہے جو نظر ثانی اور ضروری ترمیم و اضافہ کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ دیباچہ کے علاوہ اس میں چھ باب ہیں (۱) فلسفہ و مذاہب فلسفہ پر ایک نظر (۲) بل کی منطق (۳) مقدمہ برکلامات برکلے (۴) عادت و فلسفۂ عادت (۵) نفس و مفردات نفس (۶) ماہیت جذبات۔ ابواب کے عنوانات سے ان کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

زبان و بیان کے لحاظ سے یہ کتاب صاف و سلجھی ہوئی ہے، اس کی عبارت میں وہی دلکشی ہے جو مصنف کا طرۂ امتیاز ہے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں ہے۔

سہاگ رات یا بھورانی کو سیکھ

مصنفہ پنڈت کرشن کانت مالوی، کراؤن سائز، مترجمہ چودھری جگت موہن لال صاحب رواں حجم ۶۵ ۴ صفحات، مجلد۔ قیمت ہے

ملنے کا پتہ: منیجر ابھیودیہ پریس۔ الہ آباد

یہ کتاب پنڈت کرشن کانت صاحب مالوی نے لڑکیوں اور نئی دلہنوں کے لئے ہندی زبان میں لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی اور اب اس کا ترجمہ ہمارے مکرم چودھری جگت موہن لال صاحب رواں ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی نے مصنف کی خواہش پر اُردو میں کیا ہے۔اس کتاب میں شادی کے بعد عورت اور مرد کے فرائض نہایت وضاحت کے ساتھ دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں اور عورت کس طرح شوہر کو اپنا گرویدہ بنا سکتی ہے، جسم کی صفائی حسب منشا لڑکا یا لڑکی پیدا کرنا، بچوں کی حفاظت۔ ایسی تدبیریں جن سے حمل قرار نہ پائے، اس قسم کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور عصمت و پاکدامنی پر بھی بحث کی گئی ہے غرض شادی ہونے کے بعد عورت کو جس قسم کے معلومات کی ضرورت ہوتی ہے یا جو باتیں پیش آتی ہیں ان کے متعلق تمام ضروری ہدایات اسمیں درج ہیں۔

مصنف نے کتاب کو دلچسپ بنانے کے لئے تمام مسائل پر خط و کتابت کے ذریعہ سے اظہار خیالات کیا ہے یعنی ایک شادی شدہ عورت اپنی دوسری بہن کے نام جس کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے جو خطوط لکھتی ہے ان میں تمام باتیں بتلا دیتی ہے۔ترجمہ کی زبان بے حد سادہ ہے کہ معمولی لکھی پڑھی لڑکیاں بھی اس کو بخوبی سمجھ سکتی ہیں، اس کے ساتھ ہی قابل مصنف کا انداز بیان بھی نہایت لطیف و دلچسپ ہے۔

یہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے مگر لیتھو کی طرح کمپوزنگ کی اکثر غلطیاں پائی جاتی ہیں، مثلاً دلچسپ کو تقریباً ہر جگہ دلچشپ کمپوز کیا گیا ہے۔اکثر مقامات پر اختصار سے بھی کام لیا جا سکتا تھا، اور بعض اوقات ایک ہی بات کو مختلف مترادف الفاظ یا جملوں میں دُہرایا گیا ہے، شاید اس وجہ سے کہ خطوط میں بے تکلف گفتگو کی شان پیدا کی گئی ہے۔ زن و شوہر کے تعلقات کے متعلق مہاتما گاندھی کے نظریہ پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو زن و شوہر کو صرف بقائے نسل کی غرض سے یک جا ہونا چاہئیے اور زیادہ بچّے بھی نہ پیدا کرنا چاہئیے مصنف کو اعتراف ہے کہ یہ نظریہ عموماً پسند نہیں کیا جا سکتا تاہم ان کی رائے میں آجکل ہر سمجھدار آدمی کو اسکی خاص طور پر کوشش کرنا چاہئیے۔اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے روز افزوں افلاس اور بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھتے ہوئے اہل ملک کو ان تدابیر کی طرف خاص طور پر متوجہ ہونے کی ضرورت ہے جن کی بدولت فی زمانہ اہل یورپ کثیر الاولادی کی مصیبت سے محفوظ رہتے ہیں۔ہندوستان میں کسی زمانہ میں اولاد کی زیادتی کو لوگ باعث برکت سمجھتے تھے لیکن اب وہ زمانہ نہیں رہا۔اب سیاسی و تمدنی وجوہ کی بنا پر اس نظریہ میں تبدیلی کی اشد ضرورت ہے اور دیگر ملکوں کی طرح یہاں بھی اس کا خاص پروپگنڈہ ہونا چاہئیے۔

اس تصنیف کے ذریعہ نوجوانانِ ملک کے روبرو اصلاح معاشرت کے یہ تمام مسائل پیش کر دئے گئے اور ہم کو امید ہے کہ اردو داں جماعت اس ترجمے سے پورا فائدہ اُٹھائیگی۔

مترجمہ کدار ناتھ صاحب خورشید۔ چھوٹی تقطیع ۔ ۹۶ صفحات مجلد۔ قیمت ۸ر

عورت اور مرد کے تعلقات

ملنے کا پتہ : لالہ راجپت رائے اینڈ سنس تاجران کتب لوہاری گیٹ۔ لاہور

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس چھوٹی سی کتاب میں مشہور روسی فلاسفر و مصلح قوم ٹالسٹائی کے اُن خطوط اور روزنامچوں کے دلچسپ اقتباسات و مضامین کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے جن میں مصنف نے عورت و مرد کے تعلقات پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ عورت و مرد کے باہمی تعلقات کے متعلق ٹالسٹائی کی رائیں نہایت سخت ہیں۔ وہ دراصل برہمچریہ اور تجرد کے قائل و حامی ہیں۔ ٹالسٹائی شادی یا مناکحت کو اچھا نہیں سمجھتے ہیں، اور مرد و عورت دونوں کے لئے نفسانی جذبات پر قابو رکھنے کی تاکید کرتے ہیں اور شادی کی اجازت بدرجۂ مجبوری دیتے ہیں اس حالت میں بھی ٹالسٹائی کی رائے ہیں میاں بیوی دونوں کو کسی طرح بھی اپنی خواہشات کا شکار نہ بننا چاہئیے بلکہ برسوں میں ایک آدھ دفعہ خواہش پوری کرنی چاہئیے۔ ٹالسٹائی یورپین ممالک کے مروجہ طریقہ کورٹ شپ کو بہت بُری نظر سے دیکھتا ہے۔ بہر حال شروع سے آخر تک اُنھوں نے تاہل کی زندگی کو پسندیدہ نہیں قرار دیا ہے بلکہ عورت و مرد دونوں کے لئے مجرد رہنے کی تلقین کی ہے، مہاتما گاندھی بھی بہت حد تک ٹالسٹائی کے موئد ہیں اور انھوں نے بھی اپنی کتاب شاہ راہ صحت میں اسی قسم کی باتیں لکھی ہیں، اس میں تو کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا ہے کہ خواہشات نفسانی کو دبانا ہر طرح مفید ہے لیکن عام آدمی کے لئے ان نصائح پر عمل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے لیکن عورت مرد دونوں تھوڑی سی کوشش میں یہ بات آسانی سے کر سکتے ہیں کہ نفسانی خواہشات کے غلام نہ بنیں اور تاہل کی زندگی بھی احتیاط کے ساتھ بسر کریں۔ بہر حال اُردو داں جماعت کے لئے یہ ایک نیا نظریہ ہے اس لئے اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

مرتبہ مولانا ابو البلاغ علاؤالدین خاوری ایم۔اے مرحوم۔ کراؤن سائز ۴۴ صفحات قیمت ۴ر

صیدیہ

ملنے کا پتہ : منیجر دار البلاغ ، ملتانی اسٹریٹ ، لاہور

یہ وہ نایاب مثنوی ہے جس میں میر وزیر علی صبا لکھنوی نے جان عالم واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے امرائے دربار نواب محسن الدولہ بہادر و نواب منور الدولہ بہادر کی مہم صید و شکار کے دلچسپ حالات نظم کئے تھے اور مرتب مرحوم نے ایک قلمی نسخہ سے اس کو مرتب کر کے بعد تصحیح و تحقیق شائع کیا تھا شروع میں ایک مبسوط دیباچہ ہے جس میں مثنوی پر تبصرہ کیا گیا ہے اور ضمناً شعر و شاعری کے متعلق ضروری و مفید باتیں لکھ دی ہیں۔ دیباچہ اور اصل مثنوی میں جن جن حضرات کے نام یا تلمیحات آئی ہیں ان کے متعلق ضروری نوٹ حاشیہ پر لکھ دیئے ہیں اور اس طرح دیباچہ اصل مثنوی سے زیادہ دلچسپ و کار آمد ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ شعر و سخن کے دلدادہ اس کے مطالعہ سے فائدہ اُٹھائیں گے۔

کلام جوش

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

اے حاجبو!

خدا کے واسطے اے حاجبو نہ دیر کرو
حریم ناز میں کوئی پکار کر کہہ دو

کہ پھر کوئی وطن آوارہ و جگر افگار
ملول و بیکس و مجنون و غمکش و بیمار

جگر کو خون کیے سختیاں اٹھائے ہوئے
درِ حضور پہ حاضر ہے سر جھکائے ہوئے

دھڑک رہا ہے کلیجہ ہر ایک آنسو میں
پکارتا ہے کہ اب دل نہیں ہے قابو میں

جبیں کے نقش میں رنگِ سجود بھرنے کو
ہوا ہوں دور سے حاضر سلام کرنے کو

مرا رفیق نہیں کوئی بھی خدائی میں
زمیں جگہ نہیں دیتی تری جدائی میں

فنا کا جام اب ان انکھڑیوں سے پینے دے
نظر وہ ڈال جواب جوش کو نہ جینے دے

مغموم درخت

سڑک، غلغلہ، شور، ہلچل، غبار
دو رویہ درختوں کی سیدھی قطار

کوئی ہے کہ از راہِ سوز و گداز
سنے اِن درختوں کی کلیوں کے ساز

اسی طرح اس مادّی عہد میں
کہاں دل کہ شاعر کے نغمے سنیں

بسنت

(از منشی شیام موہن لال جگر بریلوی۔ بی۔ اے)

لو آگیا پھر بسنت بچو
جنگل میں چلو بہار دیکھو

ہے صبح کا وقت کیا سماں ہے
نیلا شفاف آسماں ہے

کیا خوب ہوا ہے بھینی بھینی
خنکی بھی ہے اور تازگی بھی

ننھی چڑیاں پھدک رہی ہیں
کیسی خوش ہیں چہک رہی ہیں

پھیلے ہیں نظر کے سامنے کھیت
کیسے دلکش ہیں یہ ہرے کھیت

شبنم جو پڑی نکھر گئے ہیں
سورج چمکا سنور گئے ہیں

پتی پتی کو دھو گئی ہے
شبنم موتی پرو گئی ہے

گیہوں جو میں ملی ہے سرسوں
پیلی پیلی کھلی ہے سرسوں

سرسوں ہے دور تک برابر
سبزہ اوڑھے ہے زرد چادر

سرسوں سے پھبن بسنت کی ہے
سرسوں سے زمیں دلھن بنی ہے

السی سرسوں کی ہے سہیلی
پھولی ہے بغل میں نیلی نیلی

ہیں پھول مٹر کے کیسے خوشرنگ
آنکھیں ہوں گلابی جیسے خوشرنگ

آموں کے شجر پہ آگیا بور
جیسے دولھا کے سر پہ ہو مور

کیا فصل بہار لائی ہے راگ
ٹیسو پھولا تو لگ گئی آگ

جنگل کا سنگار کچھ نہ پوچھو
پھولوں کی بہار کچھ نہ پوچھو

ہر سو ہیں کھلے ہزارہا پھول
خوشبو خوشرنگ خوشنما پھول

خوشبو سے بسا ہوا ہے جنگل
گلزار بنا ہوا ہے جنگل

عالم میں کہاں ہیں یہ بہاریں
پیدا ہیں جو ہند کی زمیں میں

حضرت موسیٰ اور ایک سائل

(از منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی)

اِک مرد ذکی فہیم ہشیار | لیکن بے زر غریب نادار
محروم فراغ بالیوں سے | مغموم شکستہ حالیوں سے
بے مے کا ایاغ ہو رہا تھا | مفلس کا چراغ ہو رہا تھا
جلتا تھا دیا نہ اُس کے گھر میں | دنیا تاریک تھی نظر میں
مفقود تھا زندگی کا جوہر | راحت نہ تھی جان کو میسّر
تاباں نہ تھی شمع انجمن میں | خنداں نہ تھا روئے گل چمن میں
رہتا تھا خطِ جبیں سے دلگیر | حرفِ اولاد تھا نہ تحریر
پارے کی طرح جگر تھا بے تاب | آئینۂ قلب میں نہ تھی آب
نظارہ کی راحتوں سے محروم | رہتا تھا مدام زار و مغموم
مایوس تمام نعمتوں سے | عاجز اپنی مصیبتوں سے
اِک روز غریب تنگ آ کر | پہونچا موسیٰ کے پاس جا کر
تدبیرِ نجات یوں نکالی | کی عرض کہ اے جنابِ عالی
ہیں آپ نبی پاک اکرم | عرفان کے پیشوائے اعظم
ذاتِ انور ہے باعثِ ناز | خاصانِ خدا میں خاص ممتاز
مجھ پر کچھ آپ کا کرم ہو | سامانِ سکونِ دل بہم ہو
درگاہ خدا سے تجھ کو رتبہ | یہ تین سوال پیش کردیں
افلاس نے کر دیا ہے معذور | جلدی سے بلا یہ سر سے ہو دور
آنکھوں کو روشنی عطا ہو | سرمایۂ زندگی عطا ہو

اولاد کا رنج دور ہو جائے
اس شمع سے گھر میں نور ہو جائے
حضرت نے سنی جو حالتِ زار
تھا اُنکی زباں پہ حرفِ انکار
بولے نادان تم ہو کتنے
اِک منھ سے سوال اور اتنے
ممکن نہیں آرزو بر آئے
خالق روئے طرب دکھائے
کرتے فقط اِک سوال اگر پیش
ہوتا منظور وہ کم و بیش
موسیٰ کا جواب سُن کے سائل
یوں عرض سخن پہ اب تھا مائل
مَیں حکمِ جناب سے ہوں مجبور
صرف ایک ہی التجا ہو منظور
دیکھا میں کروں یہ روز منظر
اِک نورِ نگاہ صاحبِ فر
اِک بارگہِ فلک رسا میں
سونے کے ظروفِ بے بہا میں
ہو ناشتہ و طعام سے سَیر
ہو نعمتِ صبح و شام سے سَیر
موسیٰ پابند تھے سخن کے
نقشِ حیرت بنے ہوئے تھے
پہلے جو کچھ طلب کیا تھا
اب تک مشمول التجا تھا
وعدے سے تھے آپ اپنے مجبور
کرنا ہی پڑا سوال منظور
درگاہِ کریم میں دعا کی
سائل کی طرف سے التجا کی
تھے صدق و صفا اثر سے ہمدوش
رحمت ہوئی اُسکی مائلِ جوش
سائل کی طلب ہر اِک بر آئی
کھوئی ہوئی پھر نگاہ پائی
دیکھا قسمت سے منہ پسر کا
روشن تھا اب چراغ گھر کا
دل صورتِ گلستاں ہرا تھا
دولت ثروت سے گھر بھرا تھا

سائل کی بھی آن رہ گئی یوں
موسیٰ کی بھی شان رہ گئی یوں

(از جناب بسمل الہ آبادی)

دورِ سحر و شام سمجھتا ہوں میں
رازِ غمِ ایام سمجھتا ہوں میں
جینا ہے تو مرنا بھی پڑے گا بسمل
آغاز کو انجام سمجھتا ہوں میں

ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور کی سالگرہ

از مسٹر وِشنو پرشاد فدا، بی۔اے،

عالم میں کس کی سالگرہ کی ہے دھوم دھام
پیشِ نظر ہے کس کا زمانے کو احترام

تقریب کیا ہے آج کہ دوشیزۂ بہار
دوشِ صبا پہ لائی ہے پھولوں کے بھر کے جام

کیوں گا رہے ہیں باغ میں مرغانِ خوش گلو
جنگل میں مور ناچتے پھرتے ہیں خوش خرام

فطرت کی دلفریبیاں کیوں جوبنوں پہ ہیں
کیوں شور کر رہی ہیں بپا ندیاں تمام

نرگس، گلاب، جوہی، چنبیلی، کہ موتیا
مہکا رہے ہیں کس لئے آفاق کا مشام

ستر برس کے سن پہ مشرف ہوا ہے کون
کس کی بلائیں لینے لگا ہے مرا کلام

بس ہو گیا ہے حال مرے دل پہ آئینہ
ہاں واقعی مسرت و بہجت کا ہے مقام

فطرت میں سب اُسی ہی کے اعزاز میں ہیں جشن
معروف جس کا نام ہے ٹیگور نیک نام

فطرت کو ہے عزیز کہ اُس کا تمام عمر
دیدِ طلسم جلوۂ فطرت رہا ہے کام

تاروں کے دل کی بات سمجھنے کے واسطے
باغوں کے جگنوؤں سے رہا ہے وہ ہم کلام

رازِ حیات اُس نے سُنا جوئبار سے
شمس و قمر سے لیتا رہا درس صبح و شام

آنکھوں کے تل میں اُس نے بٹھائی ہے کائنات
روشن کیا چکور کے دل میں مہِ تمام

حاصل کیا عبور وہ اسرارِ عشق پر
بلبل کے ہاتھ پھول کو بھیجے کئی پیام

خاروں کو اُس نے پھول کا زیور بنا دیا
چشمِ غزال سے کیا صید افگنوں کو رام

ذرے کو آفتاب سے ایسا ملا دیا،
ذرہ بھی آفتاب پہ پھیلا رہا ہے دام

پروازِ فکر طائرِ سدرہ سے کم نہیں ۔ طبع رواں ہے برق سے بڑھ چڑھ کے تیز گام

فنِ سخن کو عرش سے تشبیہ دیں اگر ۔ ٹیگور لیسے عرش کا ہے داورِ کرام

اس کا کلام کیا ہے شرارے ہیں عشق کے ۔ قائم ہے جس کی ذات سے خورشید کا نظام

انساں کو اُس کے دم نے فرشتہ بنا دیا ۔ جھک کر زمیں کو کرنے لگا ہے فلک سلام

طولِ کلام عیب میں داخل ہے اے فدا ۔ اشعار آبدار کی بے سود ہے یہ لام

فرضِ محال زور لگائے بھی تو اگر ۔ رہ جائے گی یہ مدح تری پھر بھی ناتمام

بہتر ہے اب کہ دستِ دعا کو دراز کر ۔ موقوف کر اسی پہ قصیدے کا اختتام

جب تک ہے رنگ و بو کی کشش اہلِ فکر کو ۔ جب تک فلک پہ ہے مہ و خورشید کو دوام

ٹیگور کا کلام ہو تب تک غذائے جاں

زندہ رہے جہان میں ٹیگور کا پیام

نوروز

(از سید اعظم حسین مدیر "ادب")

مسرت سے پر ہیں زمین آسماں ۔ رنگا ہے نئے رنگ میں کل جہاں

درختوں سے فطرت نے کھیلا ہے رنگ ۔ ہر اک شاخ پر سبز پھینکا ہے رنگ

گلوں کی قبائیں گلابی ہوئیں ۔ تو کچھ اور پھولوں کی آبی ہوئیں

معطر ہوا باغ اس طور سے ۔ اڑیں خوشبوئیں آم کے بور سے

ہوا معتدل پھر سنک کر چلی ۔ چٹک کر مہکنے لگی ہر کلی

زراعت بھی کھیتوں میں تیار ہے ۔ کسانوں کی گرمی بازار ہے

ہر اک نخل گلزار گل پوش ہے ۔ دلوں میں پرندوں کے بھی جوش ہے

زباں پر پپیہے کی ہے "پی کہاں" ۔ درختوں پہ کوئل ہے گرم فغاں

عجب ولولے ہیں امنگیں عجب ۔ عجب مستیاں ہیں ترنگیں عجب

شناور سبک رو ہیں گرداب میں ۔ نئے زور پیدا ہیں اعصاب میں

بسرعت رگوں میں لہو ہے رواں ۔ کوئی دل میں لیتا ہے پھر چٹکیاں

نگارِ تمنا دل افروز ہے ۔ مرے ساز میں بھی نیا سوز ہے

لگا ہونے رہ رہ کے جی بے قرار ۔ تقاضا ہے پھر ہو کوئی ہمکنار

محبت کی تجدید نو، روز ہو

وہ آئیں تو نوروز نوروز ہو

لطف سخن

(از لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی)

حسن عالم سوز نا محدود ہونا چاہیئے — ہر تجلی آفتاب آلود ہونا چاہیئے

ایک ہی جلوہ ہے جب ہنگامہ آرائے شہود — پھر وہی شاہد وہی مشہود ہونا چاہیئے

حسن عالم ساز کا فیض تجلی عام ہے — ایک اک ذرہ یہاں مسجود ہونا چاہیئے

بے نیازی! اب خطا کاروں کی ہمت بڑھ گئی — باب توبہ کچھ دنوں مسدود ہونا چاہیئے

حسن نیت ہے دلیل حسنِ انجامِ عمل — سعی میں بھی جلوہ مقصود ہونا چاہیئے

شانہ و آئینہ کیا اے زلفِ مشکین ایاز — تیری زینت کو دلِ محمود ہونا چاہیئے

کاوشِ مژگاں کا پیہم یہ تقاضا ہے عزیز
ہر نفس کو تیرے خون آلود ہونا چاہیئے

(از لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی)

نالہ نغمہ ہے فریاد نہ فریاد رہے — کوئی کہہ جائے کہ ناشاد مرا شاد رہے

ہو کے آزاد تہِ دامنِ صیاد رہے — گھر میں صیاد کے جبتک رہے آزاد رہے

کبھی خالی نہ ہو یہ گھر یونہی آباد رہے — شوق سے تیری طرح دل میں تری یاد رہے

صدقے اے تیر نگہ آئے نہ آئے دل میں — تیری چٹکی میں یونہی ناوک بیداد رہے

ہر گھڑی ساتھ ہے کیوں ابروِ قاتل کا خیال — میرے سر پر لئے تلوار نہ جلاد رہے

میں وہ بلبل ہوں کروں دامِ محبت میں اسیر — چار ہی روز میں صیاد نہ صیاد رہے

ہمیں گلشن سے سوا ہے کہیں الفت اسکی — ہم نہ ہوں تو بھی الٰہی قفس آباد رہے

کیجئے کیا اسے رفتارِ زمانہ ہے یہی — پائے گل سرو رہے اور پھر آزاد رہے

کوئی کہتا یہ گزرتا ہے ادھر سے ہر روز — ہم رہیں یا نہ رہیں میکدہ آباد رہے

کس قدر ہیں اثر اندازِ بتانِ کافر — اُس زمانے میں بہت [illegible] رہے

لالے کا پھول بنے داغ بنے رنگ بنے
دامنِ کوہ میں خونِ سرفرہاد رہے

چوڑیاں کیسی حنا کیا یہ زمانہ وہ ہے
گورے ہاتھوں میں ترے خنجرِ فولاد رہے

ڈر سے محشر میں دم پرسشِ اعمال ریاضؔ
اسکی رحمت کے سوا کچھ نہ مجھے یاد رہے

(از جناب منوّرؔ لکھنوی)

کیوں عیاں کرتا ہے اس کو جو نہاں ہو دلمیں آگ
یہ نہ کرنا ورنہ لگ ہی جائیگی محفل میں آگ

جب لگی دیکھی محبت کی کسی کے دلمیں آگ
چشمِ قہر آگیں سے وہ برسا گئے محفل میں آگ

عرضِ غم سے لگ گئی ایسی کچھ اُنکے دلمیں آگ
چھین کر دوزخ سے بھر دی کاسۂ سائل میں آگ

پہلے کشتی کی مری طوفانِ دریا کو سپرد
چل دیے وہ پھر لگا کر دامنِ ساحل میں آگ

ہیئت دل کا مدار ہے اس کے انحصار
یہ کسی منزل میں پانی ہے کسی منزل میں آگ

ہے اثر ہر شے کا یہ جلدی سے کرلیتا قبول
جب کبھی لگتی ہے تو لگتی ہے پہلے دل میں آگ

التہاب آگیں تلاطم نے کیا خاک سیاہ
موجِ دریا نے لگا دی دامنِ ساحل میں آگ

گرچہ ہیں ضدین دونوں جان لیوا ہیں مگر
خنجرِ قاتل میں پانی نالۂ بسمل میں آگ

دور رہ کر نورِ حق سے اپنی مٹی کی خراب
کیوں لگا دیتا نہیں تو پردۂ باطل میں آگ

سالکِ راہِ طلب کو چشمِ موسیٰ چاہیئے
ورنہ مثلِ طور روشن ہے ہر اک منزل میں آگ

نالۂ دلگیر سے پیدا ہے شعلوں کی تڑپ
لگ گئی ہے سوزشِ غم سے تنِ بسمل میں آگ

اک دلیلِ سادگی ہے یہ ادائے نازِ حسن
شوخیٔ رنگِ حنا ہے یا کفِ قاتل میں آگ

میں منوّرؔ روزِ اول سے سراپا سوز ہوں
کیا خبر بھر دی ہے کس نے میرے آب و گل میں آگ

(بابو ہرگوبند دیال صاحب سرہوا ستو نشترؔ)

ہم صفیرو رہنے دو افسانۂ ابرِ بہار
آپ ہی دیوانہ ہے دیوانۂ ابرِ بہار

ایک مدت سے قفس کی زندگی ہے اور ہم
کیا سُناتے ہو ہمیں افسانۂ ابرِ بہار

جب تصور بندھ گیا اُسکا وہیں مخمور ہیں
میکشوں کے ساتھ ہے میخانۂ ابرِ بہار

دیر سے مطلب نہ کچھ ہم کو حرم سے واسطہ
ہم تو ہیں بس ساجدِ بتخانۂ ابرِ بہار

دیکھیے گلشن کی سرسبزی و شادابی کا رنگ
پتی پتی کہتی ہے افسانۂ ابرِ بہار

ایک دن وہ تھے کہ ہم تھے اور چمن کی سیر تھی
ابتو ہم ہیں اور فقط افسانۂ ابرِ بہار

ابتو نشترؔ کو جہاں دیکھا کہ سب کہنے لگے
لیجئے وہ آگیا دیوانۂ ابرِ بہار

علمی خبریں اور نوٹ

ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ کی ادبی کانفرنس کا تیسرا اجلاس الہ آباد میں ۵ و ۶ مارچ ۱۹۳۲ع کو وجیا نگرم ہال میور سنٹرل کالج الہ آباد میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو صاحب صدر اکیڈیمی اپنی سیاسی مصروفیتوں کے باعث افتتاحی اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے، چنانچہ آنریبل سر شاہ محمد سلیمان صاحب (چیف جسٹس الہ آباد ہائیکورٹ) چیرمین کمیٹی استقبالیہ نے اپنے و نیز صدر اکیڈیمی کی طرف سے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ صاحب موصوف نے جس طرح اکیڈیمی کے ہر کام میں شروع سے ابتک غیر معمولی دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے اُسی طرح آپ نے اس ادبی کانفرنس کی رہنمائی میں بھی اپنا بیش قیمت وقت بدریغ صرف فرمایا۔ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس، سبجکٹ کمیٹی و مشاعرہ وغیرہ میں آپ شروع سے آخر تک تشریف فرما رہے اور اپنے ہدایات و مشوروں سے منتظمان کو مستفید فرماتے رہے شعبۂ اُردو کے صدر اُردو کے نامور ادیب و محسن۔ لاہور ہائیکورٹ کے محترم جسٹس سر عبدالقادر صاحب تھے۔ ہندی شعبہ کے صدر مہامہوپادھیائے پنڈت گنگا ناتھ جھا صاحب وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی منتخب ہوئے تھے مگر ایک خانگی حادثہ کے باعث وہ کانفرنس میں تشریف نہ لاسکے اور انکے بجائے ہندی کے مشہور و معروف ادیب رائے بہادر لالہ سیتا رام صاحب نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ سر عبدالقادر صاحب کا خطبہ کسی آئندہ نمبر میں ہدیۂ ناظرین ہوگا۔ اردو و ہندی شعبوں کے مباحث کا خلاصہ بھی آئندہ درج رسالہ ہوگا۔ فاضل سکریٹری اکیڈیمی ڈاکٹر تاراچند صاحب نے اس اکیڈیمی کی کارگزاری کے متعلق جو رپورٹ پیش کی اس سے یہ معلوم کرکے ہم کو مسرت ہوئی کہ گو امسال گورنمنٹ صوبہ نے مالی زیرباری کے باعث پچاس ہزار کے بجائے صرف تیس ہزار روپیہ ہی کی امداد عطا کی جسکی وجہ سے اکیڈیمی کو اپنے مجوزہ پروگرام میں تخفیف کرنا پڑی تاہم سال گذشتہ میں اکیڈیمی نے چودہ بڑے قابل قدر کتابیں شائع کیں انمیں دو کتابیں ڈرامے چار شعر و سخن کے متعلق دو ادبی سوانح عمریاں دو تاریخی تصانیف ایک کتاب فلکیات دو بیالوجی اور ایک زراعت کے متعلق ہے۔ اس وقت پانچ دیگر تصانیف (جنمیں تین تاریخی سوانح عمریاں ہیں اور ایک کتاب جغرافیہ اور ایک اقتصادیات کے متعلق ہے) زیر طبع ہیں، اور اُنیس دیگر مسودے منظور ہو چکے ہیں اور عنقریب ہی چھپنے کے لئے مطبع بھیجے جائینگے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:-

ڈراما	۶	فلسفہ	۱	سائنس	۳
ادبی سوانحعمریاں	۱	شعر و سخن	۲	فن باغبانی	۱

نکے علاوہ اس وقت اکیڈیمی کے لئے چھتیس ۳۶ دیگر کتابیں زیر تصنیف ہیں، انکے مصنف بھی ملک کے مشہور
معروف اصحاب کے زمرہ سے انتخاب کئے جا چکے ہیں۔

پچھلے سال سے اکیڈیمی کا ایک اُردو ہندی تماہی رسالہ بھی مولانا اصغر و مسٹر رام چندر ٹنڈن کی اڈیٹری
میں شائع ہو رہا ہے، گو اسکے بعض پہلوؤں کے متعلق ملک کے ادبی حلقوں میں بہت کچھ مباحثہ رہا اور ہے
لیکن بحیثیت مجموعی دونوں رسالوں کا شمار بہترین پرچوں میں ہونے لگا ہے اور انکی کامیابی پر ہم ان کے فاضل
اڈیٹروں کو مبارکباد دیسکتے ہیں۔

اس کانفرنس کے سلسلہ میں دو فاضل ادیبوں کے دو اہم لکچر بھی ہوئے جو اکیڈیمی کی فرمایش پر خاص طور پر
تیار کئے گئے تھے اور عنقریب کتابی صورت میں شائع ہونگے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدر جامعہ ملیہ دہلی کا لکچر اقتصادیات
کے اصول اور نقطۂ خیال کے متعلق ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے جسمیں اس اہم موضوع پر نہایت دلچسپ و دلنشین
پیرایہ میں بحث کی گئی ہے اور زمانۂ حال کے تمام اقتصادی مسائل اور نظریے ایسے دلآویز طریقے اور سلیس زبان
میں پیش کئے گئے ہیں کہ اس مبحث کے تمام دقیق نکات ایک معمولی شخص کے بھی ذہن نشین ہو جائینگے ہمکو یقین
ہے کہ جب یہ لکچر شائع ہوگا تو ہر حیثیت سے اکیڈیمی کے لئے باعث فخر ہوگا۔
دوسرا لکچر پنڈت پدم سنگھ صاحب شرما کا ہندی، اُردو یا ہندوستانی زبان پر بھی نہایت مفید و دلچسپ تھا۔

امسال کانفرنس کے ساتھ ہندی اُردو مشاعرے بھی منعقد ہوئے۔ اُردو مشاعرے کی بعض غزلیات آیندہ ہدیہ
ناظرین ہونگی۔ اپنے طور پر دونوں صحبتیں دلچسپ ہیں لیکن ہماری رائے میں اکیڈیمی کو رسمی مشاعروں میں کچھ نہ کچھ
جدت پیدا کرنیکی کوشش کرنا چاہیئے۔

زمانہ کے کسی نمبر میں مہاراجہ پرتھی راج چوہان کے دربار کا مرقع ہدیۂ ناظرین کیا گیا تھا، اس نمبر میں ہم
ان کے نامور حریف مہاراجہ جے چندر راٹھور والیِ قنوج کے شاہانہ دربار کا فوٹو پیش کر رہے ہیں۔ یہ دونوں
مہاراجے ایکدوسرے کے عزیز تھے لیکن بات ہی بات میں دونوں میں کدورت ہو گئی، اور ان کی باہمی جنگ
نے ہندوستان کی قسمت کا پانسہ ہی پلٹ دیا۔

زمانہ بک ایجنسی کی دلچسپ و قابل دید کتابیں

نصائح چانکیہ

یعنی ناموری ہند چانکیہ کے مشہور و معروف و منیتی کا ترجمہ از جناب پنڈت ہنمنت راؤ صاحب مددگار خزانہ سرکار عالیہ گورنمنٹ نظام دام اقبالہٗ قیمت ۶

گل کدہ

لسان الملک حضرت عزیز لکھنوی کا مجموعۂ کلام جس کا ہر صفحہ ایک چمن زار اور ہر شعر ایک خوش رنگ پھول ہے قیمت عہ

لسان الغیب

شرح دیوان حافظ مع مفصل سوانح عمری ملک کے مشہور اہل قلم حضرات کی رائے ہے کہ یہ شرح یکتائی کے درجہ تک پہونچگئی ہے حصہ اول ے حصہ دوم عا

کاس الکرام

شرح رباعیات عمر خیام مع مفصل سوانحعمری تمام ارباب سخن کا اس پر اتفاق ہے کہ اس موضوع پر اس سے زیادہ مکمل اور بسوط کتاب آجتک شائع نہیں ہوئی۔

قیمت تین روپیہ ے

قومی نمبر رسالہ زمانہ

جسمیں ۲۰ قابل دید مضامین نظم و نثر اور رنگین و سادہ تصاویر اور مہاتما گاندھی اور لالہ لاجپت رائے ڈاکٹر سپرو مسز نائیڈو ڈاکٹر اقبال کے خاص بیانات اور بہت سے قابل دید مضامین نظم و نثر شائع ہوئے ہیں قیمت عہ

اختر ستان

ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علیخاں اختر لکھنوی کا دیوان جس کا ہر مصرعہ پر تاثیر اور ہر شعر تیرو نشتر ہے قیمت عہ

مکمل عورت

دو لڑکیوں کی تعلیمی و سوشل حالات کا مقابلہ ایک یوروپین اسکول اور دوسری کو کنیا ودیالیہ میں داخل کرکے ثابت کیا گیا ہے کہ کنیا ودیالیہ کی لڑکی تعلیمی و سوشیل حالات میں بہتر ہے قیمت ۸

روٹھی رانی

جسمیں حسن و عشق کی سچی اسانی اور راز و نیاز کا دلچسپ مرقع اور ریاست کی دلکش مثال موجود ہے قیمت ۶

* پریم بتیسی

یعنی اردو کے مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند بی۔ اے کے بہترین فسانوں کا مجموعہ زبان کی لطافت اور بیان کی صفائی قابل دید ہے

حصہ اول ۱۲ حصہ دوم ۱۲

دنیائے راز

از ابوالفاضل راز چاندپوری قدیم و جدید دلکش نظموں کا مجموعہ ہر نظم بلحاظ موضوع مکمل و نتیجہ خیز ہے مع تصویر مصنف قیمت صرف عہ

یادگار قومی

جسمیں ملک کے مشہور ترین انشاپردازوں کے ۱۰ مضامین نثر اور چار عکسی تصاویر ہیں کاغذ لکھائی چھپائی صاف ہے قیمت عہ

ترجمہ رامائن منظوم

بال کانڈ کا اصلی حصہ یہی ہے اور چوپائیاں ہندی ترجمہ اردو اشعار میں مترجمہ سورج پرشاد تصور قیمت ۱۲

بزم احباب

اخلاقی کہانیوں کا مجموعہ قیمت ۔

سیر المصنفین

اردو انشا پردازی کی مکمل تاریخ از جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب بی۔ اے شعرا کی طرح نثاروں کا جامع تذکرہ قیمت دو روپیہ عا

طرق دولتمندی

یہ کتاب ہر شخص کے قابل خرید ہے دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے کم لوگ واقف ہیں اس کتاب میں دولت حاصل کرنے کے طریقے نہایت خوبی سے بتائے گئے ہیں۔ قیمت ۸

اردو مضمون نویسی

مضمون لکھنے کے متعلق بابو تانک پرشاد بی۔ اے پروفیسر کی نہایت عمدہ کتاب ہے قیمت ۸

حیات بیوہ

جسمیں مصنف نے بیوگان کی حالت زار کا سچا فوٹو کھینچا ہے اور ان کی جانکاہ مصیبتوں کا دلگداز سین پیش کیا گیا ہے۔

قیمت ۵

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے طلب فرمائیے

پچاس سالوں سے ہندوستانی پیٹنٹ دواؤں کے بے مثل موجد

(سفر حضر میں کام آنے والا)

REGD. ڈابر دواؤں کے نمونہ کا بکس

(اس میں مندرجہ ذیل بارہ قسم کی دوائیں ہیں)

نمبر (۱) "کافو" اصل عرق کافور ہیضہ کی خاص دوا نمبر (۲) "پودن ہرا" عرق پودینہ نمبر (۳) "جلابن" جلاب کی گولی۔ نمبر (۴) "دب دمہ" دمہ کی دوا نمبر (۵) "لال شربت" بچے لڑکے اور بڑے سبھی کی لیشٹی نمبر (۶) "کولاریا" کولا ٹانک نمبر (۷) "لیشٹینا" مقوی با[ہ] کی گولی۔ نمبر (۸) "سرباتما" دردسر کی ٹکیہ نمبر (۹) "زنگ رنگ" مرہم داد۔ نمبر (۱۰) "ہیلک" کٹے جلے وغیرہ زخموں کا مرہم نمبر (۱۱) "درد انت" دانت کے درد کی دوا۔ نمبر (۱۲) "درکان" کان کے درد کی دوا۔

قیمت فی بکس دو روپیہ ۲؎، محصول دس آنہ ۱۰/

REGD. "کولاریا"

(کولا ٹانک)

یہ دل۔ دماغ۔ اور کلیجہ کو طاقت پہونچانے میں بے مثل ہے۔ اس کے استعمال سے دل کی دھڑکن۔ کلیجہ کی [کمزوری]
تھوڑی محنت سے سانس کا پھولنا۔ دور ہو جاتا ہے اور سخت محنت کرنے پر بھی تکان نہیں ہوتی اس سے شراب وا[فیو]
کی بدعادت ترک ہو جاتی ہے اس سے گلے کی آواز سریلی ہوتی ہے۔ لکچرار معلم۔ طالب علم اور گانے والوں کو ہر وقت اپنے پاس رکھنا چاہیئے
قیمت فی شیشی ایک روپیہ دو آنہ عہ/ قیمت نمونہ ۴/ محصول سات آنہ ۷/ نمونہ صرف ایجنٹ سے مل سکتا ہے۔

نوٹ ہماری دوائیں ہر جگہ دوا فروشوں اور دوکانداروں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ محصول بہت بڑھ گیا ہے اس [لئے]
اس سے بچنے کے لئے اپنے مقامی ہمارے ایجنٹ سے خریدئیے۔

(صیغہ نمبر ۱۷) پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ

ایجنٹ:۔ کانپور نیا گنج میں محمد حفیظ محمد نصیر صاحبان

ہمزاد (ڈراما)

اشتیاق حسین قریشی صاحب ایم۔ اے کا وہ دلچسپ ڈراما جس میں کم عمر بیوی اور بزرگوار شوہر کے معاملات قدرے ظرافت آمیز پیرایہ میں بیان کیے گئے ہیں اچھی سوسائٹی میں اسٹیج کرنے کیلئے یہ ڈراما بہت مناسب ہے۔ طباعت کتابت کاغذ بہت اچھا۔ یہ اردو کی ان کتابوں میں سے ہے جو تمام لوازم اشاعت سے آراستہ ہیں ۶/

گناہ کی دیوار (ڈراما)

مصنفہ اشتیاق حسین قریشی صاحب ایم اے۔ گناہ بری چیز ہے لیکن شقاوت قلب اور تکبر بدتر ہیں۔ گناہ کی دیوار شاید ٹوٹ سکتی ہے لیکن شقاوت قلب اور تکبر کے بتوں کا توڑنا بہت دشوار ہے۔ یہ ایک باعصمت خاتون کا قصہ ہے جسے کچھ عرصہ تک مجبوراً عصمت فروشی کی زندگی گزارنی پڑی لیکن بالآخر خدا نے اس کی گریہ وزاری سن لی اور اس زندگی سے نجات دلائی۔ قیمت ۸/

کھیتی (ڈراما)

مصنفہ محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن) مسلمانوں کی ذہنی اور قومی رہنمائی کے لئے ایک دلچسپ ڈراما مذہب اور اخلاق کس رستے پر چلانا چاہتے ہیں۔ زمانے کی مصلحتیں، قوم وملت کی ضروریات سب پر ایک نظر ڈالی گئی ہے اور ایک معیار بھی تجویز کیا گیا ہے جو رہنمائی کے دعویداروں کو پرکھنے میں کام آسکتا ہے۔

قیمت صرف ۶/

پردۂ غفلت (ڈراما)

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا وہ ڈراما جو انھوں نے قیام جرمنی میں لکھکر وہیں چھپوا تھا مسلمان خاندانوں کی معاشرت کی سچی تصویر تعلیم نسواں آزادی نسواں اور پردہ پر مفید بحث، دلچسپ ظرافت آمیز اور نتیجہ خیز قصہ۔ طباعت عمدہ قیمت ایک روپیہ ۴/

جملہ حقوق محفوظ ہیں — رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱

زمانہ

مرتبہ:- دیا نراین نگم، بی-اے-

جلد ۵۸ | اپریل ۱۹۳۲ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

تصاویر آنریبل مسٹر شاہ محمد سلیمان چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ - ہز ہائینس جام صاحب نوانگر - مسٹر وال چند ہیرا چند - آنریبل مسٹر بیگ - سر جیمس ڈیوڈ سفٹن گورنر بہار و اڑیسہ -

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت ممالک غیر سے سالانہ للعہ ششماہی عہ، ہندستان کیلئے ششماہی سے

زمانہ

جلد ۵۸ اپریل ۱۹۳۲ء نمبر ۴

مختارات

(از مسٹر حامد اللہ افسر میرٹھی، بی۔ اے۔)

ہر زبان میں بہ شرطیکہ وہ ایک زندہ زبان ہو، متروکات ومختارات کا عمل جاری رہتا ہے۔ الفاظ بھی انسانوں اور دوسرے جانداروں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، پلتے ہیں، تربیت پاتے ہیں اور اس تربیت کے مطابق مہذب اور شایستہ یا غیر مہذب اور ناشایستہ ہوتے ہیں، تندرست و توانا ہوتے ہیں، علیل اور نحیف وزار ہوتے ہیں، ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہیں، ملکوں ملکوں کی سیر کرتے ہیں، ایک ملک سے دوسرے ملک میں جاکر مستقل طور پر قیام کر لیتے ہیں، وہاں کے رسم ورواج اور اطوار وخصائل اختیار کر لیتے ہیں اور ہر جاندار کی طرح یہ بھی ایک دن مرجاتے ہیں۔ لیکن الفاظ آسانی سے نہیں مرتے، بہت ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہیں، جب کوئی لفظ مرجاتا ہے یا اس قدر علیل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا نہ کر سکے تو اس کی جگہ دوسرے الفاظ لے لئے جاتے ہیں۔ یہ دوسرے الفاظ یا تو بالکل نومولود گویا لفظوں کی نئی نسل سے ہوتے ہیں یا پھر پکے پلائے کسی دوسرے ملک سے آجاتے ہیں، جو الفاظ مرجاتے ہیں یا ترک کر دیئے جاتے ہیں، اُن کا شمار "متروکات" میں ہوتا ہے اور جو الفاظ زبان میں نئے داخل ہوتے ہیں یا کسی

مخصوص مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں اُن کا شمار "مختارات" میں ہوتا ہے لیکن الفاظ کے ترک و اختیار کا مسئلہ زبان کے نہایت اہم اور نازک مسائل میں سے ہے، یہ کسی مخصوص فرد یا جماعت کے بس کی بات نہیں ہے کہ زبان کے کسی لفظ کو ترک کردے یا کسی نئے لفظ کو اختیار کرلے، بلکہ اس کا انحصار تمامتر زبان کے فطری ارتقا پر ہے، البتّہ ایسا ضرور ہوتا ہے کہ بعض اوقات صرف ایک شاعر یا ادیب چند الفاظ کو اپنی تصنیفات میں ترک کر دیتا ہے اور پھر کچھ مدت کے بعد وہ الفاظ استعمال میں نہیں رہتے گویا وہ تمام اہل زبان کے نزدیک متروک قرار پاتے ہیں اس کا سبب عموماً یہ ہوتا ہے کہ زبان کی ترقی کی رفتار میں بعض الفاظ اُس کا ساتھ نہیں دے سکتے جوں جوں زبان سمجھی جاتی ہے اہل زبان کو الفاظ کی معنویت یا فصاحت و عدم فصاحت کا اندازہ ہوتا جاتا ہے اور جو الفاظ بہ آئینِ شایستہ مفہوم ادا نہیں کرسکتے یا ثقیل اور غیر فصیح ہوتے ہیں اہل ذوق حضرات اُن کے استعمال سے گریز کرنے لگتے ہیں۔

مختارات ہر زبان میں دو صورتیں اختیار کرتے ہیں، ایک تو یہ کہ ایسے علوم و فنون کے واسطے جو پہلے زبان میں موجود نہ تھے علمی اصطلاحات وضع کرنے کے لئے الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ اصطلاحیں عموماً دوسری ترقی یافتہ مشترک زبانوں سے لی جاتی ہیں، مثلاً اُردو ہے، یہ زبان آرین زبانوں کے سنسکرت اور ایرانی خاندان سے متعلق ہے۔ مگر اس میں کثرت سے عربی اور ترکی زبانوں کے لفظ بھی رائج ہیں اور ان دونوں زبانوں میں سے ایک سامی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری تورانی خاندان سے۔ پس ہم اُردو میں ہر سہ خاندانِ السنہ کے الفاظ علمی اصطلاحوں کے لئے اختیار کرسکتے ہیں۔ دوسری صورت مختارات کی ادبیات میں ظہور پذیر ہوتی ہے، وہ اس طرح کہ جب کبھی کسی لفظ کا استعمال عام طور پر ترک کردیا جاتا ہے تو اس کی جگہ کوئی نیا لفظ لے لیتا ہے، یا کسی مفہوم کے نازک پہلوؤں کو واضح کرنے کے لئے کبھی کبھی کوئی مصنف نیا لفظ استعمال کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے، اگر وہ لفظ ذوقِ سلیم کے مطابق ہوتا ہے اور حقیقت میں اس کی مدد سے کسی مخصوص مفہوم کی وضاحت ہوجاتی ہے اور وہ مفہوم انسان کے طبعی رجحان کے مطابق ہوتا ہے اور عام حسیات و جذبات کی ترجمانی کرتا ہے تو وہ لفظ رفتہ رفتہ رائج ہوجاتا ہے۔ مختارات کی یہی دوسری صورت ہے، جو اس مضمون کا موضوع بحث ہے۔

ان میں سے پہلی صورت یعنی "اصطلاح سازی" تو اس مخصوص علم کے ماہرین سے متعلق ہوتی ہے جس کی وہ اصطلاحیں ہوں اور اُن کے وضع کرنے کا حق انھیں ماہرین کو حاصل ہے اور اُن کے رد کردینے یا قبول کرلینے کا حق بھی اُن اصحاب کو حاصل ہے جن کو اُس علم سے عام طور پر واسطہ پڑتا ہو لیکن

ادبیات کے لئے "لفظ سازی" کا حق کسی فرد واحد یا کسی جماعت کو نہیں پہنچتا۔ ادبیات نام ہے الفاظ میں جذبات وحسیات وامور ذہنیہ وواردات قلبیہ کے اظہار کا، اور چونکہ ان چیزوں کے اظہار کی ضرورت ہمیشہ پڑتی رہتی ہے اس لئے ہر زبان میں اگر وہ زبان بالکل ابتدائی حالت میں نہو، ان کے لئے الفاظ کا ایک وافر ذخیرہ موجود رہتا ہے اور بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ نئے الفاظ کی ضرورت پڑے۔ پس اگر کوئی صاحب ذوق شاعر یا ادیب اپنے مفہوم کے کسی پہلو کو واضح کرنے کے لئے نیا لفظ اختیار کرتا ہے تو جب تک زبان میں اس کے لئے جگہ نہ پیدا ہو جائے یعنی جب تک یہ نہ ثابت ہو جائے کہ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہماری زبان میں کوئی لفظ موجود نہیں ہے اُس وقت تک وہ نیا لفظ زبان میں رائج نہیں ہو سکتا۔

ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو اس موقعہ پر یہ خیال پیدا ہو کہ ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے متعدد مترادف الفاظ بھی تو ہوتے ہیں، اس لئے اگر کسی مخصوص مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہماری زبان میں کوئی لفظ موجود بھی ہے تب بھی ایک نئے لفظ کے اضافہ سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوگا۔ میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے، کسی زبان میں ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے متعدد الفاظ کا رائج ہونا مشکل ہے۔ چند الفاظ بالکل مترادف نہیں ہو سکتے ان کے معانی میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا خواہ وہ کتنا ہی نازک ہو۔ زبان چاہے کتنی وسیع کیوں نہ ہو بالآخر محدود ہوتی ہے اور خیالات ہمیشہ غیر محدود ہوتے ہیں۔ اس لئے کوئی زبان ایک بیکار اور فضول لفظ کا بار برداشت نہیں کر سکتی۔

اس کے برخلاف قریب قریب ہر زبان میں ایسے الفاظ ضرور ملیں گے جو دو یا دو سے زیادہ معانی میں مستعمل ہیں، مثلاً "یکا" اردو میں کئی معنوں میں بولا جاتا ہے، یعنی ایک قسم کی گاڑی، تنہا، بے نظیر، وہ سپاہی جسے گھر بیٹھے تنخواہ ملے۔ یا "لاکھ" کے بھی دو معنی ہیں، سو ہزار اور ہر چند۔ یا "مچھلی" بھی کئی معنوں میں مستعمل ہے، ماہی، بازو کا گوشت، ایک زیور جو کانوں میں پہنتے ہیں۔ یا "چاک" ہے، اس کے بھی کئی معنی ہیں، دامن کا کھلا ہوا حصہ، کمہار کا پہیہ، کھریا مٹی، کواڑ کی دراز۔

اس تمام گفتگو سے نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کسی مخصوص مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہمارے یہاں کوئی لفظ رائج ہے تو ہمیں صرف اس بنا پر کہ یہ لفظ تو بہت دنوں سے رائج ہے اور پرانا ہو گیا ہے اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ استعمال کرنے کی کوشش نہ کرنا چاہیئے، یہ کوشش کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتی، ہم نئے لفظ بنا کر لوگوں کے حلق میں زبردستی ٹھونس نہیں سکتے۔ جو الفاظ کسی نہ کسی سبب سے زبان کے اندر اپنی جگہ پیدا کر لیتے ہیں اور عام طور پر رائج ہو جاتے ہیں صرف وہی زبان کا جزو بن سکتے ہیں۔

دورِ حاضر میں حیدرآباد نے اُردو کو جس قدر فائدہ پہنچایا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور وہاں کی تعلیم نے جو بعض نئے ادیب پیدا کئے ہیں اُن کی قابلیت، طباعی اور ذہانت کی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہوگا۔ لیکن ان میں سے بعض اصحاب نے موقع بے موقع اپنی تصانیف میں نئے الفاظ کی بھرمار کردی ہے اور ان میں کثرت سے ایسے الفاظ ہیں جن کے لئے ہماری زبان میں نہایت موزوں اور فصیح الفاظ پہلے ہی سے موجود ہیں۔ اس طرزِ عمل سے زبان کو تو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ ہاں اُن کی تصانیف ضرور ناقابلِ فہم بن جاتی ہیں۔

مثلاً ڈاکٹر غلام محی الدین صاحب زور ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی نے اپنی کتاب "روحِ تنقید" میں "کلاسیکل لٹریچر" کے لئے "دبستانی ادب" استعمال کیا ہے۔ اول تو کلاسیکل کے لئے ہمارے یہاں مستند اور قدیم ادب ایک مدت سے مستعمل ہے۔ دوسرے ڈاکٹر صاحب نے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ قطعاً کلاسیکل کے مفہوم کو ادا نہیں کرتا۔ دبستانی ادب سے زیادہ سے زیادہ یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ درسی ادبی کتابیں جو مدرسوں اور مکتبوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کلاس کے معنی مکتب یا جماعت کے سمجھے اور ان معنی میں یہ لفظ انگریزی میں اور خود ہمارے یہاں رائج بھی ہے لیکن کلاسیکل لٹریچر ایک ادبی اصطلاح ہے اور اس میں لفظ کلاسیکل کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے۔ انگریزی زبان کے مستند ادیب اور نقاد میتھو آرنالڈ نے کلاسیکل کے معنی یہ لکھے ہیں:۔

"The work that belongs to the class of the best."

اور ولیم ہنری ہڈسن نے اپنی مشہور کتاب "این انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈی آف لٹریچر" میں "کلاسکس" کی تعریف اس طرح کی ہے:۔

A 'Classic' may be simply defined as a book which has stood the test of time, and by its stability and permanence, and the universality and persistency of its appeal, has given unmistakable assurance of immortal life."

ظاہر ہے کہ "دبستانی ادب" سے یہ مفہوم ہرگز واضح نہیں ہوتا۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب موصوف "بت تراش" کے لئے "مجسمہ ساز" لکھتے ہیں، بت تراش ہماری زبان میں ابتدا سے مستعمل ہے۔ میر تقی میر فرماتے ہیں ؎

خدا ساز تھا آذرِ بت تراش　　ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

"کامیاب" جیسا عام اور کثیر الاستعمال لفظ بھی ڈاکٹر صاحب کو پسند نہیں، اس کی جگہ آپ نے "کامگار" کو دیدی ہے۔ صناع کی جگہ آپ "فن کار" اور استقلال کی جگہ "دیرپائی" استعمال فرماتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے بعض انگریزی محاوروں کا بھی لفظی ترجمہ کر دیا ہے، مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں:۔

"انھوں نے اُردو میں ایک خاص رنگ پیدا کیا اور ان کے رنگ میں ابتدا اور انتہا دونوں انھیں تک رہے۔"

یہ ترجمہ ہے "He was the first and the last" کا، یہ مفہوم اردو میں اس طرح ادا کیا جا سکتا تھا جو ہمارے روزمرہ کے خلاف نہ ہوتا۔

"انھوں نے اُردو میں ایک خاص رنگ پیدا کیا جو انھیں پر ختم ہو گیا۔" یا یوں کہہ سکتے تھے "جو شروع بھی انھوں نے ہی کیا اور ختم بھی انھیں پر ہو گیا۔"

حیدر آباد کے نوجوان ادیبوں نے ایک اور دلچسپ ترجمہ "Bird's eye view" کا "طائرانہ نظر" کیا ہے، یہ ترجمہ نظر کو ضرور کھینچتا ہے لیکن جو لوگ انگریزی نہیں جانتے وہ شاید اس کا مفہوم کسی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ دوسرے یہ کہ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بھی ہمارے یہاں "سرسری نظر" مستعمل ہے، پھر کسی دوسرے لفظ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یا مثلاً ہمارے صوبہ کی مشہور نیم سرکاری جماعت "ہندوستانی اکاڈمی" نے "سہ ماہی" کے بجائے "تماہی" کو رواج دینے کی کوشش کی ہے، سہ ماہی ایک مدت سے ہماری زبان میں مستعمل ہے اور تماہی سے بدرجہا زیادہ فصیح اور خوش آواز ہے۔

بہ ظاہر اس لفظ کے جاری کرنے کی کوشش کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ ہندی اور اُردو قریب تر ہو جائیں۔ مقصد ضرور اچھا ہے لیکن رسالے کے سرورق پر صرف ایک ایسے فارسی لفظ کی جون بدل کر جو مدت سے ہماری زبان میں رائج ہے یہ مقصد کیونکر حاصل ہو سکتا ہے جب کہ اسی رسالے میں یعنی "ہندوستانی" کے پہلے نمبر میں کثرت سے ایسے فارسی، اور عربی الفاظ اور اُن الفاظ کی اجنبی ترکیبیں موجود ہیں جن کے بجائے اُردو کے نہایت سادہ اور سلیس الفاظ مل سکتے تھے۔ مثلاً عمال، تتبع، زاویۂ نگاہ، طوائف الملوکی، عصبیت، نشاۃ الثانیہ، احتشام، اختلاف سوز، یگانگت انگیز، شمشیر ہیبت زا، ...ن نوازی، خیالستان تہذیب، پرحزن آواز، پردۂ مستور، پرفکر شائستہ خیالی وغیرہ۔ میں اس قسم کے الفاظ اور ترکیبوں کو قطعاً ناجائز قرار نہیں دیتا بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ بعض مواقع ایسے پیش آتے ہیں ...ل ان کے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس رسالے کے ارکین ادارت "سہ ماہی" ...سے سادہ اور کثیر الاستعمال لفظ کو محض اس بنا پر ترک کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں "فارسیت" ہے۔

وہ خود اپنی تحریروں میں فارسی کی اجنبی اور غریب ترکیبوں کے استعمال کو کس اصول کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں۔

اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ میں خدانخواستہ ہندوستانی اکاڈمی کے مخالفوں میں ہوں، ہرگز نہیں، میرے نزدیک اپنی عمر کے پہلے چار سال ہی میں اکاڈمی نے نہایت عمدہ اور قابل تعریف خدمات انجام دی ہیں اور اپنے وجود کو اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے لئے مفید ثابت کر دیا ہے۔ اسی طرح اکاڈمی کے آرگن "ہندوستانی" میں بھی اکثر مضامین نہایت پرمغز اور پراز معلومات ہوتے ہیں۔ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا مقصد محض ایک جزوی معاملہ پر نہایت خلوص نیت کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار ہے۔

بہر حال میں نئے الفاظ کا ذکر کر رہا تھا، ایک اور نیا لفظ دکن کے ایک نئے رسالے کے سرورق پر دیکھا، "ماہوار" کی جگہ اس پر "ماہ نامہ" لکھا گیا ہے، آپ کو یاد ہوگا کہ پہلے اردو کے جو اخبار ہر روز شائع ہوتے تھے وہ "روزانہ" اخبار کہلاتے تھے۔ چند سال سے ایران کے بعض اخباروں کی دیکھا دیکھی ہمارے اخبارات نے اس لفظ کی جگہ "روزنامہ" لکھنا شروع کیا چنانچہ اب آپ ہر روزانہ اخبار کے سرورق پر یہی لفظ پائیں گے۔ لیکن روزمرہ میں ابھی تک یہ لفظ داخل نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی جگہ وہی قدیم لفظ روزانہ مستعمل ہے۔ اب "روزنامہ" کے قیاس پر یہ جرات کی گئی ہے کہ ایک نیا لفظ "ماہ نامہ" گڑھ لیا، ممکن ہے آگے چلکر "ہفتہ نامہ" "سہ روزنامہ" "سہ ماہی نامہ" یا "ثماہی نامہ" بہت سے نئے لفظ بن جائیں۔

خدا بخشے مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی بڑے طباع اور ذہین آدمی تھے اور "لفظ سازی" میں تو ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مولانا مرحوم نے اپنی قابل قدر کتاب "وضع اصطلاحات" میں صدہا نئے لفظ بنائے ہیں ان میں سب سے زیادہ دلچسپ نئے مصادر ہیں، مثلاً دفتر سے دفترانا، اشک سے اشکانا، برف سے برفانا، ثمر سے ثمرانا، جذبہ سے جذبانا، جسم سے جسمانا، حسن سے حسنانا، سرخ سے سرخانا، قطرہ سے قطرانا، قلم سے قلمانا، نظر سے نظرانا وغیرہ۔ ان مصادر کے پیش کرتے وقت مولانا نے اس اہم نکتہ پر غور نہیں کیا کہ جن اسما اور صفات سے یہ مصادر بنائے گئے ہیں وہ ایک طویل عرصہ سے ہماری زبان میں رائج ہیں، اگر ضرورت ہوتی تو یہ مصادر ان الفاظ کے ساتھ ہی ساتھ یا کچھ عرصہ بعد ضرور زبان میں داخل ہوگئے ہوتے جس طرح دوسرے اسما وصفات سے مصادر بن کر رائج ہوگئے۔ اصل یہ ہے کہ ہر زبان میں لفظوں کی درآمد و برآمد فطری طور پر ہوا کرتی ہے جن الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے وہ کچھ عجیب غیر محسوس اور نامعلوم طریقے سے زبان میں آکر داخل ہو جاتے ہیں، جیسا کہ میں نے مندرجہ بالا سطور میں عرض کیا ہے۔ یہ نہیں ہوا کرتا کہ ہم پہلے

سے الفاظ بنا کر لوگوں کو مجبور کردیں کہ وہ اپنی تحریر و تقریر میں ان الفاظ کو استعمال کریں، کوئی زبان لغتوں سے الفاظ حاصل نہیں کیا کرتی بلکہ لغت اُن الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں جو زبان میں جاری ہوں۔ ابھی چند سال کی بات ہے کہ جب اول اول "ایروپلین" ہمارے ملک میں آئے تو زبان کو ان کے لئے ایک لفظ کی ضرورت پڑی۔ ہمارے اخبارات و رسائل نے کوشش کی کہ ان کو "طیارہ" کہا جائے لیکن عوام نے اس لفظ کی طرف قطعاً توجہ نہ کی اور سب ایک زبان ہو کر "ایروپلین" کو "ہوائی جہاز" کہنے لگے، یہاں تک کہ خود اخبارات و رسائل کو اسی لفظ کے استعمال پر مجبور ہونا پڑا۔ اسی طرح ایران میں جب ریل چلی تو خود بادشاہِ وقت نے کوشش کی تھی کہ اس کو "کالسکہ بخاری" کے نام سے یاد کیا جائے اور تمام سرکاری کاغذات اور احکام میں ریل کے لئے یہی لفظ استعمال کیا گیا تھا، لیکن پبلک نے اس لفظ کو قبول نہ کیا اور عوام میں ریل کے لئے "ترن" رائج ہو گیا جو "ٹرین" کا مفرس ہے۔

ایران کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ شاید اب سے بہت مدت پہلے وہاں بھی بعض جدت پسند حضرات نے مروجہ اسما و صفات سے نئے مصادر بنانے کی کوشش کی تھی، اس امر کا اندازہ وہاں کے ایک مشہور اور خوشگو شاعر طرزی افشار کے کلام سے ہوتا ہے۔ طرزی نے ازراہ تمسخر و ظرافت بہت سے نئے مصادر بنائے ہیں۔ مثال کے طور پر اس کے چند شعر ذیل میں درج کرتا ہوں۔

تا ابروے تو دیدہ جنونیدہ ایم ما　　　نشناختند خلق کہ چونیدہ ایم ما

قامت خمیدہ و دل چو نقطہ شد سیاہ داغ　　　از عین و شین و قاف تو تونیدہ ایم ما

گر در فراق روے تو کاہیدہ ایم ما　　　گہ چوں کتاں ز حسنِ تو ماہیدہ ایم ما

افتادہ دل بہ چاہِ زنخ ساقیا ز لطف　　　حبل المتین زلف کہ چاہیدہ ایم ما

اگر بے تو ہر گز شرابیدہ باشم　　　بکانونِ ہجرت کبابیدہ باشم

خور و خواب بر من حرامیدہ باشد　　　اگر در غمت خورد و خوابیدہ باشم

از بلدۂ قزویں بہ صفاہاں سفریدم　　　بے خرجی و بے اسپ خراماں سفریدم

یاراں سفریدند بہ جمعیت و من ہم　　　یک قافلہ با جانِ پریشاں سفریدم

ترکیدم و تا تیدم و آنگہ عربیدم | در دیغ کو تہ نظراں بوالعجبیدم
شعباں رمضاں کرب و بلادم متعجب | بے آتش جا دیدم و بے ناں رجبیدم

لیکن اس بحث سے یہ نتیجہ نکالنا بھی صحیح نہ ہوگا کہ میں اردو میں ایک سرے سے نئے الفاظ کے استعمال کا مخالف ہوں، میرا مقصد صرف یہ ہے کہ جس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہماری زبان میں الفاظ موجود ہیں اس کے لئے کوئی نیا لفظ جاری کرنے کی کوشش کارآمد ثابت نہ ہوگی، حقیقت یہ ہے کہ ایک زندہ زبان میں نئے الفاظ کا استعمال ناگزیر ہے لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے زیادہ تر نئے علوم کے لئے اصطلاحات کی صورت میں نئے الفاظ زبان میں داخل ہوتے ہیں۔ ادبیات میں یا زندگی کے معمولی واقعات و حالات کے بیان میں نئے الفاظ کی ضرورت صرف اسی وقت پڑتی ہے جب کہ موجودہ لفظ میں نقل ہو یا پورے طور پر اس سے مطلب ادا نہ ہوسکے یا اظہار خیال کا کوئی ایسا پہلو اختیار کیا جائے جو بالکل نیا ہو اور اس کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کے لئے بعض مستعمل الفاظ کمزور یا بے لبس ثابت ہوں، اصطلاحات علمیہ کے علاوہ اردو میں آجکل جن نئے الفاظ کے جاری کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ان میں سے بھی بعض ضرور ایسے ہیں جو شاید زبان میں مستقل جگہ اختیار کرلیں گے اور ہمارے روزمرہ میں داخل ہوجائیں گے۔ مثلاً ایک لفظ ہے "شاہ کار" فارسی میں پہلے یہ لفظ "بیگار" کے معنی میں مستعمل تھا، اب جدید فارسی میں اسے انگریزی کی ادبی اصطلاح "ماسٹر پیس" کے معنی میں استعمال کرنے لگے ہیں اور اسی معنی میں ہم نے یہ لفظ فارسی جدید سے اردو میں اختیار کرلیا ہے، یہ بہت اچھا لفظ ہے اور شاید سب سے پہلے اسے رسالہ "معارف" اعظم گڑھ نے اختیار کیا تھا لیکن ہماری زبان کے اکثر ادبی رسائل نے اپنے تجارتی مقاصد کی بجا آوری کے لئے اس کی وہ مٹی پلید کی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اب ہر رسالہ "بہتر سے بہتر شاہکار" پیش کر رہا ہے اور اس کا کوئی نمبر ایسا نہیں ہوتا جو بہترین شاہکاروں کا مجموعہ نہ ہو چنانچہ اس بے اعتدالی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی سے اس لفظ کی اہمیت اور اس کے معانی کا وقار کم ہونے لگا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زبان میں رفتہ رفتہ یہ لفظ اپنے قدیم معانی یعنی "بیگار" کی طرف عود کر رہا ہے۔ لفظ اچھا ضرور ہے لیکن اس کے استعمال میں ہمیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے اور جس مخصوص مفہوم کو ادا کرنے کے لئے یہ لفظ اختیار کیا گیا ہے اُس کو صرف اُسی تک محدود رکھنا چاہیئے۔

نئے الفاظ میں سے دو لفظ "حزنیہ" اور "طربیہ" بھی اچھے ہیں، یہ "ٹریجڈی" اور "کامیڈی" کے لئے اختیار کیئے گئے ہیں اور جو مفہوم یہ ادا کرتے ہیں اس کے لئے ہماری زبان میں الفاظ موجود نہ تھے۔ یہ دونوں الفاظ مختصر بھی ہیں اور خوش آواز بھی۔

"پبلشر" کے لئے "ناشر" اور "پرنٹر" کے لئے "طابع" بھی ایسے الفاظ ہیں جو آسانی سے زبان میں داخل ہو جائینگے
مولوی وحید الدین صاحب سلیم مرحوم کے مصادر میں سے بھی دو چار ایسے ہیں جن کے لئے غالباً زبان میں جگہ
نکل آئیگی، مثلاً برق سے برقانا میرے نزدیک بہت اچھا مصدر ہے اور جو مفہوم اس سے ادا ہوتا ہے
اس کے لئے ہمارے یہاں کوئی لفظ موجود نہ تھا، منور کرنا اور روشن کرنا اِن دونوں مصادر سے ضیا و نور کی
وہ شدت ظاہر نہیں ہوتی جو "برقانا" سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ استعارہ کے طور پر زیادہ وضاحت
اور صفائی کے ساتھ بیان کرنے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔

کچھ عرصہ سے ہمارے بعض مصنف خصوصاً بعض رسائل کے مضمون نگار صاحبان فارسی اور عربی
کے غریب اور اجنبی الفاظ اور ترکیبیں بے تکلف اُردو میں استعمال کر رہے ہیں، یہ بھی "لفظ سازی" کی
ایک صورت ہے، میرے نزدیک اس طرح کے مضامین لکھنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ
جن کے پاس خیالات کی کمی ہے اور وہ محض الفاظ کی نمائشی فوج سے اپنی عبارتوں کو شاندار بنانا چاہتے
ہیں، خیر یہ تو قابل توجہ نہیں کیونکہ ان کے عارضی "رنگ و بو" کا زبان پر کچھ اثر نہیں پڑتا، دوسرے وہ ہیں جن
کے خیالات میں جدید تعلیم نے وسعت پیدا کر دی ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں دقت محسوس کرتے
ہیں اور نہایت نیک نیتی کے ساتھ یہ کوشش کرتے ہیں کہ دوسری مشترک زبانوں سے الفاظ حاصل کر کے
اس کمی کو پورا کر دیں۔ اس دقت کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھیں اپنی زبان پر عبور حاصل نہیں ہے، ان کی عمر
کا زیادہ حصہ انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں صرف ہوا ہے۔ اردو زبان کے مستند اور قدیم ادب کے
مطالعہ کا انھیں موقعہ نہیں ملا اور وہ نہیں جانتے کہ جس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے انھیں دوسری زبانوں
کا دست نگر ہونا پڑتا ہے اس کے لئے خود ہماری زبان میں بہتر سے بہتر سادہ اور سلیس الفاظ موجود ہیں۔
مطالعہ کا رواج ہمارے یہاں بہت کم ہو گیا ہے، یہ خامی صرف ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات ہی تک محدود
نہیں ہے بلکہ ہماری قوم کے اکثر نوجوان اپنی مادری زبان کے ادب کا مطالعہ نہیں کرتے، خود ہماری زبان
کے اکثر شعرا اسی مرض میں مبتلا ہیں، معدودے چند حضرات کو چھوڑ کر قریب قریب ہر جگہ کثرت سے ایسے شعرا
ملیں گے جنھوں نے اُردو کی مشہور اور مستند کتابوں کا مطالعہ بھی نہیں کیا ہے۔ جب یہ حالت ہے تو ظاہر ہے
اِن لوگوں کو زبان پر کیونکر قدرت حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لئے سب سے اہم اور سب سے زیادہ ضروری
بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے اسلاف کے ادبی کارناموں کا مطالعہ نہایت توجہ اور غور کے ساتھ کرنا چاہیئے! اس
کے بعد ادبیات میں "مختارات" کا مسئلہ شاید زیادہ اہمیت اختیار نہ کریگا۔

سلطنت مغلیہ اور بنگال

از مسٹر ہری کرشن بی۔اے، ایل۔ٹی،

ہمایوں کی وفات کے بعد جب اکبر تخت سلطنت پر بیٹھا تو تمام ہندوستان مغلیہ حکومت کے دشمنوں سے بھرا پڑا تھا۔ بابر کی قلیل مدت حکومت اور ہمایوں کی بے سر و سامانی کی وجہ سے مغل سلطنت کو استحکام حاصل نہ ہو سکا تھا۔ شیر شاہی رعب و داب کی آندھی نے بظاہر نئی سلطنت کے نازک پودے کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر عدم آباد کے راستہ پر ڈال دیا تھا۔ لیکن اکبر کی اعتدال پسندی اور صلح کل حکمت عملی سے پھر پرانی شاخوں میں نئے نئے کلّے پھوٹ نکلے اور دیکھتے دیکھتے مغل راج ایک تناور درخت بن گیا۔ اکبر کا ابتدائی زمانہ دشمنوں کے زیر کرنے میں صرف ہوا تھا، اسی سلسلہ میں تقریباً بیس۲۰ سال تک اس کو فتح بنگال کے لئے متواتر لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ ۱۵۷۶ء میں داؤد خاں بنگال کا آخری پٹھان فرمانروا شکست کھا کر قتل ہوا اور بنگال ممالک محروسہ میں شامل ہو گیا۔ لیکن سلطنتوں کے تبادلہ سے دل تبدیل نہیں ہوتے۔ افغان سردار جو بظاہر مغل راج کے مطیع ہو گئے تھے، اندرونی طور پر اس کے خلاف رہتے تھے جس کی وجہ سے اکبر اعظم کو اپنے تمام دوران حکومت میں اور نیز جہانگیر کو اپنے قیام حکومت کے کچھ حصہ تک اکثر پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ اسی زمانہ میں ہمارے ہیرو پرتاپ آدیتہ کا ظہور ہوا ہے۔ جس طرح رانا پرتاپ نے اپنی تمام عمر قیام آزادی کے لئے اکبر کے خلاف لڑائی میں صرف کر دی اسی طرح آدیتہ پرتاپ نے بنگال کی آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنی تمام زندگی وقف کر دی تھی۔

پرتاپ آدیتہ جیسور کے راجہ کا لڑکا تھا، لڑکپن کے زمانہ میں وہ مردانہ کھیلوں، شجاعانہ کرتبوں اور جنگجویانہ تفریحوں کا شائق تھا۔ اس کو داؤد خاں اور اس کے پٹھان ہمراہیوں کے جنگی کارناموں کے سننے کا بیحد شوق تھا، لیکن اس کے باپ کو اس کے جبلی جذبات ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ وہ سیدھا سادہ صلح کل اور مذہبی خیالات کا دلدادہ امن و عافیت پسند تھا۔ اس کو یہ کسی طرح منظور نہ تھا کہ بیٹھے بٹھائے مفت میں سلطنت مغلیہ کی دشمنی مول لے۔ وہ اپنے لڑکے

کے رویہ کو سخت ناپسند کرتا اور دل ہی دل میں اس کی جانب سے کڑھتا تھا۔ بہت غور و خوض کے بعد اُس نے یہ راہ نکالی کہ آدیتہ پرتاپ کو آگرہ بھیجے تاکہ وہاں مغلیہ سلطنت کی شان و شوکت سے مرعوب ہو کر وہ راہ راست پر آجائے اور اُس کو اپنے اُن ساتھیوں سے نجات حاصل ہو جائے جن کے دل بالکل اس کے حب الوطنی کے جذبات سے پُر تھے۔ اور جو بالکل داؤد خاں کے مغلوں سے لڑ کر اپنے آبائی ملک بنگال کو اُن کی دستبرد سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ آدیتہ کو آگرہ روانہ کر دیا گیا اور شنکر چکرورتی بھی جو اس کا ہمراز تھا اس کے ساتھ گیا۔ شہنشاہ اکبر اعظم نے نہایت فراخ دلی سے اِن کا خیر مقدم کیا۔ اور ان کی صاف گوئی اور شجاعانہ رویہ سے جن کا اظہار دوران قیام دارالخلافہ میں ہوا نہایت متاثر ہوا۔ اکبر اکثر پرتاپ سے اُن سرداران بنگال کے بارے میں تذکرہ کیا کرتا تھا جن کی متواتر بغاوتیں اُس کو چین نہ لینے دیتی تھیں۔ انھیں تذکروں کے دوران میں اکبر کے دل پر پرتاپ کی باتوں کا کچھ ایسا اثر پڑا کہ اس نے اس کو جیسور کی حکومت کا فرمان شاہی عنایت کیا۔ اس کے عوض میں پرتاپ نے یہ وعدہ کیا کہ وہ تمام بقایا مالگزاری جو سالہا سال سے کسی طرح وصول نہ ہوتی تھی تحصیل و جمع کر کے شہنشاہ معظم کی خدمت میں روانہ کردیگا۔

پرتاپ کی عدم موجودگی میں اس کے نوجوان ہمراہیوں نے اپنی جماعت کی باقاعدہ تنظیم کر لی تھی۔ اور بہت سے سرداران بنگال کو اپنا شریک کار بنا لیا تھا۔ ان لوگوں نے خفیہ طور پر شاہی مالگزاریوں کی رقوم کثیر پر خوب ہاتھ صاف کیا تھا اور اس دستبرد سے کافی دولت فراہم کر لی تھی۔ ان کی جماعت میں بالخصوص جفاکش دیہاتی و کاشتکار شریک تھے جو عموماً شاہی عمال کے مظالم و جور و جفا کے نشانہ بنے ہوئے تھے۔ سرکاری عمال تحصیل لگان و مالگزاری کے لئے رعایا پر ہر ممکن سختی و تعدی روا رکھتے تھے جس سے رعایا نے بددل ہو کر اور بھی لگان و مالگزاری ادا نہ کرنے کا عزم بالجزم کر لیا تھا اور اس طرح خود غرض عمال کی بیجا حکمت عملی و کوتاہ اندیشانہ و فاشعاری سے سلطنت بجائے مستحکم ہونے کے زوال پذیر اور رعایا خوشحال و جاں نثار ہونے کے بجائے برباد و غدار ہوتی جا رہی تھی۔ اور سلطنت مغلیہ کے دشمنوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ سیاسی حالات تھے جس وقت پرتاپ شاہی فرمان لیکر بنگال واپس پہنچا اور اپنے والد بزرگوار کو جیسور کے تخت حکومت سے معزول کر کے اس وسیع ریاست پر قابض ہو گیا اور اپنے دوستان قدیم کی مدد سے مہاراجہ پرتاپ آدیتہ کا لقب اختیار کیا۔

جس زمانہ میں پرتاپ آگرہ میں مقیم تھا اس نے مغلیہ افواج کی ترتیب و تنظیم نیز طریقہ جنگ کو نہایت غور و خوض سے مطالعہ کیا تھا اور گجرات اور راجپوتانہ کا طویل و سخت سفر اختیار کر کے اس نے

وہاں کے سیاسی و دیگر حالات سے بھی بخوبی واقفیت حاصل کرلی تھی، نیز اُن طریقوں سے کماحقہ، آگاہ ہوگیا تھا جن کی بدولت اکبر دور دراز صوبوں اور ماتحت و باجگذار راجاؤں پر نہایت کامیابی کے ساتھ حکومت کرتا تھا، اس قدر وسیع تجربہ اور علمی معلومات سے مالامال ہوکر جب پرتاپ نے حکمرانی شروع کی تو شروع ہی میں بھویاں سرداروں میں سے جن کی تعداد بارہ تھی اور جو بنگال کے نہایت ہی طاقت ور سرداروں میں تھے زبردست ترین سرداروں کو اپنا شریک کار بنالیا۔ ان میں سے بعض لڑکر اور مفتوح ہوکر اس کے شریک ہوئے اور بعض بغیر کسی قسم کی جنگ و پیکار کے اس کے ساتھ شامل ہوگئے۔ اس زمانہ میں روڈا نامی پرتگالی بحری ڈاکو کی قابلیت و جرأت کا سکہ اہل بنگال کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ دریائے گنگا کا ڈیلٹا اس زمانہ میں پرتگالی بحری ڈاکوؤں کا ملجا و ماویٰ تھا۔ ان کے باعث رعایا سخت عذاب میں مبتلا رہتی تھی مقامی حکام رعایا کی حفاظت کرنے کے قطعی ناقابل تھے چھوٹے چھوٹے سرداروں میں بنگال منقسم تھا جن کا وقت باہمی جنگ یا ذاتی تفریحات و مشاغل میں صرف ہوتا تھا، پھر یہ تھے خشکی کے شیر ان کا پرتگالی بحری نہنگوں سے کیا مقابلہ، وہ قہر خداوندی کی طرح نازل ہوتے، لوٹ مار کرتے اور رعایا کو زبردستی جہازوں میں ڈالکر دُور دراز ملکوں میں لیجاکر بطور غلاموں کے بیچ ڈالتے تھے

اراکان کے راجہ کا اِن بحری ڈاکوؤں سے ناک میں دم تھا مگر وہ بھی فرمانروایان بنگال کی طرح بحری جنگ کے طریقوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اُن کی سرکوبی کرنے سے معذور تھا۔ ان لوگوں نے دریائے گنگا کے دہانہ پر سان دیپ نامی جزیرہ میں اپنی نوآبادی قائم کرلی تھی، جہاں پر گرفتار شدہ اہل بنگال کو غیر ممالک کو روانگی سے پیشتر بطور قیدیوں اور غلاموں کے رکھا جاتا تھا۔ یہاں پرتگالیوں نے ایک نہایت ہی مستحکم قلعہ بھی بنالیا تھا جہاں ان کا گولہ بارود و سامان حرب رہتا تھا اور جہاں وقت ضرورت پناہ گزین ہوتے تھے۔ یہ قلعہ اور نوآبادی روڈا و دیگر پرتگالی سرداروں کی جائے رہائش تھی۔ پرتاپ نے اپنے بہادر جاں نثاروں کے ساتھ ان پرتگالی بحری ڈاکوؤں سے جنگ کی اور ان کو شکست فاش دیکر روڈا کو گرفتار کرلیا جو آئندہ ہمیشہ تمام جنگوں میں پرتاپ کا دست راست ثابت ہوا۔

اکبر اعظم کی حکمت عملی پر عامل ہوکر پرتاپ نے بنگال کے ہندو و مسلمان حاکموں کی تعداد کثیر کو اپنا رفیق بنالیا اور تمام مقامات پر جو جنگی اہمیت رکھتے تھے بڑے بڑے قلعے تعمیر کرادیے اس طرح سنہ ۱۵۹۰ء تک اُس نے خفیہ طور پر اپنی طاقت کو نہایت مضبوط بنالیا لیکن بایں ہمہ اس نے

سلطنت مغلیہ کے خلاف جنگ کی ابتدا اپنی طرف سے نہیں کی۔

ان ایام میں شیر خاں منجانب سلطنت مغلیہ بنگالہ کا گورنر تھا۔ اس نے ایک شخص موسومہ شنکر کو کسی قصور پر قید کر دیا لیکن شنکر کسی تدبیر سے جیل خانہ سے نکل بھاگا، شیر خاں بھی اُس کے تعاقب میں روانہ ہوا اور پرتاپ کی زمینداری میں داخل ہو گیا۔ اس پر پرتاپ نے اس سے جنگ کی اور شکست دیکر پسپا کر دیا۔ اس کے بعد پرتاپ نے سپت گرام کو فتح کیا جو جنوبی بنگال کا تجارتی مرکز تھا پھر اُس نے پٹنہ تک فتوحات کا سیلاب بہا دیا، اس طرح اچھے اچھے زمیندار برباد ہو کر حلقہ بگوش ہو گئے اور پرتاپ کے اشاروں پر کام کرنے لگے۔

جب یہ خبر اڑتی اڑتی اکبر تک پہونچی تو وہ بہت پریشان ہوا بلکہ غصہ سے اس کا تمام جسم تھرّا گیا، فوراً ہی اپنے مشہور سپہ سالار عظیم کو اس مہم پر بھیجا، پرتاپ نے راستہ دیا، عظیم اس چال کو نہ سمجھا اور کھلے بندوں موجودہ کلکتہ تک جا پہونچا، عظیم یہ سمجھا کہ غنیم اقتدار شاہی سے مرعوب ہو کر روپوش ہو کر بغیر لڑے بھڑے شکست سے ہم آغوش ہوا لیکن جب آنکھ کھلی تو خود کو گرفتار بلا اور چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں پھنسا پایا، تین طرف سے پرتاپ کی فوجیں حملہ آور تھیں اور دریا کی طرف سے روڈا اپنے جہازوں سے آتشباری کر رہا تھا۔ بالآخر عظیم غنیم کی چالوں کا شکار ہوا۔ وہ عزت و عظمت کے پھریرے اڑاتا آسمان سے باتیں کرتا آیا تھا لیکن اپنی کم فہمی سے معہ بیس ہزار سپاہ کے پیوند خاک ہوا

اِس فتح عظیم سے پرتاپ کل بنگالہ کا فرمانروا ہو گیا۔ اراکان اور اڑلیسہ کے راجاؤں نے اس کے ساتھ عہد نامے کئے۔ اس کے بعد وہ اپنی سلطنت کی تنظیم میں مصروف ہوا۔ اس کا حال مشہور پرتگالی سیّاح فون سیکا[؎] نے حوالۂ قلم کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ پرتاپ کے زمانہ میں مذہبی آزادی کا ناقوس پھونکا جا رہا تھا۔ عیسٰی بہ دین خود موسٰی بہ ایمان خود کا نقارہ بج رہا تھا۔ ہر شخص اپنی مذہبی روایات پر عمل کرنے پر خود مختار تھا۔ پرتگالیوں کو جیسو میں گرجا بنانے کی اجازت دی گئی سوداگروں کے ساتھ ہر قسم کی رعایتیں کی گئیں، تجارت کی گرم بازاری تھی، رعایا آباد و خوشحال تھی، دربار علما و شعرا سے بھرا ہوا تھا۔ حکومت کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس پر پرتاپ نے ہاتھ رکھا ہو اور اُس نے ترقی نہ کی ہو۔ لیکن بقول انیس ؎

دنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گزری

؎ Fonseca   ؎ सप्त ग्राम

یہ حالت بھی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی، اس طرف تو خود پرتاپ کے دربار میں بغض وحسد کے شکار بہت سے مار آستین پیدا ہو گئے، دوسری جانب جب عظیم کی شکست وتباہی کا حال اکبر کو معلوم ہوا تو وہ بستر مرگ پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی وفات کے بعد جب جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہو کر سفید وسیاہ کا مالک ہوا تو اُس نے دور اکبری کے شجاعت وتدبر کے آفتاب راجہ مان سنگھ کو بنگالہ کی مہم پر روانہ کیا پرتاپ نے مان سنگھ کو عظیم کی طرح بے خوف وخطر جنوبی بنگال کے دلدلی مقامات تک چلا جانے دیا، مگر وہاں پہونچتے ہی برسات شروع ہو گئی تو پرتاپ نے راجہ مان سنگھ کی فوج کی رسد بند کر دی اور وسائل آمد ورفت مسدود کر دیے۔ فوجیں گرسنگی اور برساتی وبائی امراض کے چنگل میں تڑپنے لگیں۔ مان سنگھ مصائب کے گرداب میں مایوسی کے عالم میں ہاتھ پیر مارنے لگا اور عظیم کی حسرت خیز موت کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی، اگر کچھ عرصہ یہی حالت اور رہتی تو مان سنگھ بھی مع کل فوج کے راہی عدم ہوتا۔ مگر عین اس موقعہ پر پرتاپ کے خاص معتمد علیہ بھوانند نے دغا کی۔ مان سنگھ نے اس کے دلی منشاء کو معلوم کر کے فوراً ہی اس سے ساز باز کیا، اس دغا بازی وسازش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھوانند نے تمام غلہ کا ذخیرہ مان سنگھ کے حوالہ کر دیا، اب کیا تھا مغلیہ فوج کے دل بڑھ گئے، اور انھوں نے تازہ دم ہو کر جیسور پر دھاوا بول دیا، لیکن پرتاپ کی جائے رہائش کا پتہ جو جنگلوں میں تھی کسی طرح نہ چلتا تھا۔ مان سنگھ سازش وتدبر سے اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں مصروف تھا، آخر پرتاپ کا ایک خاندانی بھائی جو اس کی عظمت کو دیکھ کر آتش حسد سے جل رہا تھا مان سنگھ سے مل گیا اور ایک دن مان سنگھ کے معتمد سرداروں کو بیچ کے بل جھاڑیوں میں سے نکال کر لے گیا اور پرتاپ کا قلعہ اور وہاں آنے جانے کے تمام پوشیدہ وخفیہ راستے دکھا دیے۔ پھر کیا تھا مان سنگھ نے یکایک حملہ کر دیا اور شمع آزادی کا پروانہ پرتاپ اپنے ہی مار آستینوں کا شکار ہو کر اپنے جاں نثاروں کے ہمراہ لڑتا ہوا میدان جنگ میں کام آیا اور اس طرح بنگال سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گیا۔

علامہ محسن کاکوروی[۵]

(از جناب طاہر محسن صاحب)

مولانا محمد محسن محسن کاکوروی مولوی ہادی علی اشک مرحوم کے شاگرد تھے۔ اول مین پوری میں چند دنوں عہدۂ نظارت پر کام کیا پھر بعض حکام اور اکثر احباب کی تحریک سے وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اس زمانے میں صدر دیوانی عدالت آگرہ میں تھی چنانچہ آپ نے بھی آگرہ ہی میں پریکٹس شروع کی، مگر غدر کے ہنگامہ کے فرو ہونے کے بعد مین پوری میں قیام اختیار کیا اور وہیں وفات پائی۔

مولانا محسن کا قد میانہ رنگ گندمی اور چہرہ گول تھا۔ چہرہ پر چیچک کے چند داغ بہت خفیف تھے۔ داڑھی مختصر تھی اور خضاب لگاتے تھے۔ انتقال سے چند سال پیشتر داڑھی بڑھالی تھی اور خضاب ترک کردیا تھا آواز میں نرمی اور ملائمت خلقی تھی۔ مولانا محسن کے کلام کا بیشتر حصہ نعت میں ہے۔ چونکہ آپ کو شہرت وعزت اور شاعرانہ وقعت اور دنیاوی صلے کی خواہش نہ تھی اس لئے آپکی نظم سے خلوص عقیدت کا رنگ ٹپکتا ہے۔ گل وبلبل کے پیش پا افتادہ مضامین سے آپ احتراز کرتے تھے۔ مبالغہ واستعارہ کو نہایت خوبی سے نظم کرتے تھے۔ مضامین کی بلندی۔ الفاظ کا شان وشکوہ۔ بندش کی چستی۔ تشبیب وگریز اور خاتمہ ومناجات میں خاص طرز کے موجد تھے۔ آپ کی چند تصانیف کا ذکر درج ذیل ہے۔

۱۔ سراپائے رسول اکرم (سنہ ۱۲۶۶ہجری) ایک نئے انداز کا سراپا لکھا ہے، اس کا خاتمہ بھی نئے انداز کا ہے

ہے یہ امید کہ جب گرم ہو بازارِ نشور   خود کہے بادشہِ بارگہِ عالمِ نور
لو سراپا ہیں تم دو عوضِ حور و قصور   میں کہوں واہ مجھے یہ نہیں ہرگز منظور

مفت حاضر ہے مگر اس کی یہ تدبیر نہیں
کھوٹے داموں بکے یوسف کی یہ تصویر نہیں

۲۔ ابیات نعت (سنہ ۱۲۷۱ہجری) اس قصیدے کی تضمین حضرت امیر مینائی مرحوم نے بھی کی ہے۔

۵؎ تاریخ ولادت سنہ ۱۲۴۲ہجری، تاریخ وصال ۱۰، صفر سنہ ۱۳۲۲ہجری

اور خوب تضمین ہے۔

۳۔ چتر شہنشاہی (۱۲۷۰ھ ہجری) یہ مسدس ایک عزیز دوست کی طرف سے واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ کی مدح میں کہا تھا، جس کے چند بند ہدیۂ ناظرین ہیں۔

عزیزِ مصر جب تک مشتری ہو مہر قیصر ہو   قمر پرویز زہرہ مثل شیریں ناز پرور ہو
دبیرِ چرخ توقیعات میں کسریٰ کا ہمسر ہو   ہو کیواں مثل کے مریخ بہرام دلاور ہو
الٰہی جانِ عالم بادشاہ ہفت کشور ہو
فلک پر سات اختر ہیں زمیں پر ایک اختر ہو

رہے جب تک بکامِ تشنہ کاماں رحمتِ باری   رہے برسات میں ہر جا پہ سو چھائی ہوئی بدلی
متاعِ کاروانِ ابر گوہر بار ہو پانی   کنویں میں آبِ شیریں ہو بجائے یوسفِ مصری
ترا فیض اے سحابِ مرحمت ہر دم فزوں تر ہو
کنواں ہو، نہر ہو، گنگا ہو، قلزم ہو، سمندر ہو

ہے جب تک ہمتِ لشکر کشی فغفور و خاقاں میں   رہے خونریزی کا نقشہ دماغ کجکلاہاں میں
کمالِ جوہرِ شمشیر سازی ہو سفاہاں میں   چلے تیغ پری پیکر پری کی چال میداں میں
تو اعدا پر مظفر اور ترا اللہ یاور ہو
کمر میں ذوالفقار اور بازوؤں میں زورِ حیدر ہو

رہے تاثیرِ حسنِ پاک جبتک طورِ سینا میں   عزیزِ مصر بے کنعاں رہے مشہور دنیا میں
اُتارا ہو پریزادوں کا دل میں چشمِ بینا میں   ہو ذکرِ گوپیاں گوکل میں بندرابن میں متھرا میں
تو محبوبِ جہاں اے یوسفِ پاکیزہ منظر ہو
کنہیا برج والوں میں، پریزادوں میں اندر ہو[1]

۴۔ مثنوی صبحِ تجلی (۱۲۹۰ھ ہجری) اس میں نئے انداز سے حضورِ اکرم کی ولادت باسعادت کا حال بیان کیا ہے۔

۵۔ فغانِ محسن (۱۲۸۹ھ ہجری) یہ مثنوی اپنے ایک دوست کی ہمدردی میں اپنی بیماری کے بعد لکھی تھی۔

۶۔ نگارستانِ جسکو "پیاری باتیں" بھی کہتے ہیں (۱۲۹۳ھ ہجری) اس میں حضرت محسن نے عشق و محبت کی سچی تصویر کھینچی ہے۔ ایک جگہ محبوب اپنے محب سے اس طرح خطاب کرتا ہے۔

نہ وہ صورت نہ وہ سیرت تیری   ہائے کیا ہو گئی حالت تیری
اڑ گیا رنگ ترا لہو ہو کر   بہہ گیا خونِ دل آنسو ہو کر

---

[1] واجد علی شاہ کا تخلص ہے

چہرہ ڈوبا ہوا حیرانی میں — عرق آیا ہوا پیشانی میں
زردی چھائی ہوئی رخساروں پر — سرسوں پھولی ہوئی انگاروں پر
چھپ گیا چاند ستارا ہوکر — اُڑ گیا آئینہ پارا ہوکر
بند آنکھیں کئے روتا دیکھا — رات ہم نے تجھے سوتے دیکھا
دیکھ بھر آئیں تری بھر آنکھیں — یاد آئیں کوئی کافر آنکھیں
خون میں ڈوبی نگاہیں کیسی — ہیں مری جان یہ آہیں کیسی
جال پھیلائے ہیں منتر والے — بال کھولے ہوئے گھونگر والے
جان لیتے ہیں نکھرنے والے — تم سلامت رہو مرنے والے
بیٹھے بٹھلائے یہ سودا تجھکو — کیا ہوا میرے کنہیا تجھکو
دل لگا ہے تو پشیمانی کیوں — جان کی فکر مرے جانی کیوں
ہوش میں آؤ سمجھ والے ہو — تم تو بے مے پیئے متوالے ہو
سنو کہیں ایک نہ مانی آخر — مٹ گئی تیری جوانی آخر
چاندنی پچھلے پہر کی کب تک — روشنی شمع سحر کی کب تک
تھام لے دل تجھے دلبر کی قسم — سر اُٹھا تجھکو مرے سر کی قسم
دوستا نہ تجھے سمجھاتے ہیں — نہیں سنتا ہے تو ہم جاتے ہیں

۷۔ **مدیح خیر المرسلین** (۱۲۹۳ھ ہجری) یہ وہ لامیہ قصیدہ ہے جس نے حضرت محسن کے کمال کو ہندوستان میں مسلّم کردیا، اس میں ہندوستان کی برسات سے تشبیب شروع ہوتی ہے، چند اشعار منتخب یہاں لکھے جاتے ہیں:-

نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی — پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل
راکھیاں لیکے سلونوں کی برہمن نکلیں — تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل
ابکی میلا تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا — نہ بچا کوئی محافہ نہ کوئی رتھ نہ بہل
ڈوبتے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے — نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل
قمریاں کہتی ہیں طوبیٰ سے مزاجِ عالی — لالہ و باغ سے ہندوے فلک کہیم و کسل
نور کی تیلی ہوئی پردۂ ظلمت میں نہاں — چشمِ خورشید جہاں بیں میں ہیں آثار سبل
شب یجور اندھیرے میں ہے بادل کے نہاں — لیلی محمل میں ہے ڈالے ہوئے منہ پر آنچل

جوگیا بھیس کئے چرخ لگائے ہے بھبوت | یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمل
لہریں لیتا ہے جو بجلی کے مقابل سبزہ | چرخ پہ بادلہ پھیلا ہے زمیں پر مخمل
سبزۂ خط سے ہوا ہونے لگی سرخی لب | چمن حسن سے لال اڑ گئے بن کر ہریل
پھول ٹوٹے ہوئے پھرتے روشوں پر ہیں نسیم | یا سڑک پر ہیں ٹہلتے ہوئے گلگوں کوتل

۸۔ چراغ کعبہ (۱۳۱۰ھ ہجری) اس میں واقعہ معراج کو نظم کیا ہے۔ براق کی تعریف میں شعر ہے ؎

چھوٹا سا فرس فرشتہ ہیکل | کھیت اس کا بہشت خلد جنگل

تیسرے آسمان کی سیر میں حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، لہذا سرکار دو عالم کا سراپا نئے انداز کا لکھا ہے :-

اس گردنِ صاف کی بلندی | تکبیر فریضۂ سحر کی
رعنائیِ قامتِ مناسب | روزے میں اذانِ وقتِ مغرب

بہشت کی تعریف میں کیا لاجواب شعر فرمایا ہے ؎

کیا کیجئے بیاں صفت فضا کی | پھلواری جناب کبریا کی

مقام اعلیٰ پر پہونچے تو کس انداز سے شاعرانہ رنگ میں نئے قسم کے مضامین بیان کئے ہیں ؎

بے سایہ قدِ رسولِ باری | تھا سایۂ نخل خاکساری
سجدے کے لئے جھکا ہوا تھا | سر عرش پر اور زمیں پہ ماتھا
پتلی میں جما جمالِ دل خواہ | جس طرح چنے پہ قُل ہو اللہ

۹۔ مثنوی شفاعت و نجات (۱۳۱۰ھ ہجری) اس کا ہر عنوان تاریخی مادہ ہے

۱۰۔ حشر وحشت افزا (۱۳۱۰ھ ہجری) یہ مثنوی بھی آپ اپنی نظیر ہے۔ اسمیں قیامت کا حال اور وہاں کی پریشانیاں ظاہر کی ہیں۔ چند شعر ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

اڑا اپنے رنگ اب ہے اُڑنا محال | بچھا ایکی اچھا رگ گل کا جال
ہوئی رونق دہر خانہ خراب | وہی چرخ مینا وہی آفتاب
یہ مرقد کا سانچہ اُبلنے لگا | کہ ہر جسم گل گل کے ڈھلنے لگا
نہ سوجھا زمانے کا کیا ہے چلن | ہوا چشم مردم میں جالا کفن
نکل آئے عریاں نئے روپ میں | چلے اُٹھ کے تہ خانے سے دھوپ میں
محبت ہوئی قیس سے ناامید | لہو ہو گیا کوہکن کا سفید
یہ بے الفتی ہے خدا کی پناہ | کہ کعبہ بھی قبلے کی بھولا ہے راہ

آنریبل سرشاہ محمد سلیمان

(چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ)

آنریبل سرشاہ محمد سلیمان صاحب چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ کی تقرری کی خبر ہندوستان کے طول وعرض میں بڑی مسرت سے سنی گئی، آپ پہلے مسلمان اور دوسرے ہندوستانی ہیں جو اس منصب جلیلہ پر فائز ہوئے ہیں۔ چنانچہ زمانہ میں آپ کے حالات زندگی اور مشاغل کا بیان خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

سرشاہ محمد سلیمان صاحب ۳۔فروری ۱۸۸۶ء کو بمقام جونپور پیدا ہوئے، صوبہ متحدہ کے مشرقی اضلاع میں آپ کا خاندان بڑی عزت ووقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ثانی کی اولاد سے ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد میں علم وتصوف کا خاص چرچا تھا۔ شاہ کرم دیوان صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کا مزار بہیرہ ضلع اعظم گڈھ میں ہے سلسلۂ نقشبندیہ کے نامور بزرگ اور حضرت ملا محمود صاحب (مصنف شہرہ آفاق کتاب شمس بازغہ) اسی خاندان کے شمس وقمر تھے۔ سرشاہ محمد سلیمان صاحب کے والد محترم مولوی شاہ محمد عثمان صاحب مرحوم اپنے زمانہ کے ایک ممتاز وکیل تھے۔ آپ جونپور میں وکالت کرتے تھے مگر تمام صوبہ متحدہ آگرہ واودھ میں جہاں کہیں شرع محمدی کی اہم گتھیوں کے سلجھانے کی ضرورت ہوتی آپ ہی کو دعوت دی جاتی۔ چنانچہ آپ کے انتقال کے وقت پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی نے فرمایا تھا کہ "آج قانون کا ایک زبردست ماہر ہمارے درمیان سے اٹھ گیا ہے۔" سرشاہ محمد سلیمان صاحب نے اپنے فاضل پدر بزرگوار کی صحبت میں آنکھیں کھولیں، چند ہی سال کے اندر آپ نے عربی وفارسی کی درسی کتابیں ختم کرکے انگریزی شروع کی، حضرت مولانا ومرشدنا شاہ عبدالعلیم صاحب آسی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روز شاہ محمد سلیمان صاحب کے سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ یہ ہونہار بچہ دنیا میں آفتاب بنکر چمکے گا۔ چنانچہ ان دعائیہ کلمات کا حرف حرف صحیح ثابت ہوا۔ آپ نے بہت ہی کم سنی میں میٹرک کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا تھا۔ اس امتحان میں تمام صوبہ میں آپ چہارم نمبر پر کامیاب ہوئے تھے۔ آپ کے علمی ذوق کا یہ حال تھا کہ ریاضی کے دقیق مسائل کے حل کرنے میں جب آپ مشغول ہوتے تھے تو اپنے کمرے سے آٹھ دس گھنٹہ تک

باہر نکلتے تھے اور ریاضی سے آپ کو خاص دلچسپی تھی۔ انٹرینس کے بعد شاہ صاحب ممدوح الہ آباد یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور ایف۔ اے کا امتحان بھی اول درجہ میں پاس کیا، او بی۔ اے میں تمام یونیورسٹی میں اول نمبر پر پاس ہوئے، اس امتحان میں بھی آپ کا خاص مضمون ریاضی تھا۔ بعدہٗ ۱۹۰۶ء میں آپ گورنمنٹ سے تعلیمی وظیفہ حاصل کرکے انگلستان تشریف لے گئے جہاں آپ کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوگئے اور وہاں سے ایم۔ اے اور قانون کی ڈگری حاصل کی اور ڈبلن یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری لیکر ۱۹۱۲ء میں ہندوستان واپس آئے۔ آپ سول سروس کے امتحان میں بھی شریک ہوئے تھے مگر انتخاب میں نہ آنے پر آپ نے قانون کی طرف توجہ کی، اگر آپ سول سروس میں کامیاب ہوگئے ہوتے تو آج کسی ضلع میں کلکٹر یا کمشنر ہوتے مگر وہ ناکامیابی ڈاکٹر صاحب کے لئے عین کامیابی ثابت ہوئی۔ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدہ پر فائز ہوکر آپ تمام صوبۂ متحدہ کی عدالت دیوانی کے حاکم اعلیٰ ہوگئے ہیں۔

حکومت کی دو شاخیں ہیں انتظامی و عدالتی (ایگزیکیوٹیو و جوڈیشل) اول الذکر کا حاکم اعلیٰ گورنر ہوتا ہے اور دوسری کا چیف جسٹس ہائی کورٹ۔ اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سر شاہ محمد سلیمان صاحب نے ہندوستانیوں میں نادر اعزاز حاصل کیا ہے۔

بہر حال ۱۹۱۲ء میں وطن تشریف لانے پر شاہ صاحب نے جونپور ہی میں اپنے والد محترم کے ساتھ وکالت شروع کی مگر ایک سال کام کرنے کے بعد آپ ہائی کورٹ میں منتقل ہوگئے اور تھوڑی ہی مدت میں ہائی کورٹ الہ آباد کے قانون داں حضرات کی اول صف میں آگئے۔ ۱۹۱۹ء میں آپ قائم مقام جج ہائی کورٹ مقرر ہوئے اور ۱۹۲۳ء میں مستقل جج ہوگئے اور ۱۹۲۹ء میں نائٹ کا خطاب حاصل کیا۔ آپ نے اپنے فرائض منصبی بڑی جفاکشی، آزادی اور غیر جانبداری سے انجام دیے۔ یہ بات اکثر و بیشتر مشاہدہ میں آچکی ہے کہ شاہ صاحب قانون کے دقیق سے دقیق مسئلہ کو بڑی آسانی سے عام فہم بنا دیتے ہیں۔ آپ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ صرف چونتیس ۳۴ برس کی عمر میں مستقل جج ہائیکورٹ ہوگئے۔ آپ کے تعلقات بار اور بنچ دونوں کے ساتھ ہمیشہ خوشگوار رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۶ مارچ کو جب آپ نے اپنے جلیل القدر عہدہ چیف جسٹس کا چارج لیا تو ہر طبقہ کے ہندو مسلمانوں میں خوشی کا اظہار کیا گیا۔ اعلان تقرری کے وقت بھی آپ کے پاس ملک کے ہر گوشے سے صدہا تار اور خطوط مبارکباد کے آئے۔ اس وقت آپ کی عمر صرف چھیالیس ۴۶ سال ہے، ہمارا خیال ہے کہ بہت ہی کم اصحاب کو اس عمر میں ایسا اعلیٰ اعزاز نصیب ہوا ہوگا۔

قانون کے علاوہ سر شاہ محمد سلیمان صاحب کو تعلیمی، ادبی اور معاشرتی مسائل سے بھی غیر معمولی دلچسپی ہے

چنانچہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی اصلاح و ترقی میں شاہ صاحب نے وہ بے نظیر خدمت انجام دی ہے جس کی مثال دورِ حاضرہ میں کمیاب ہے۔ چند سال سے مسلم یونیورسٹی کا نظام خراب ہو رہا تھا اور مالی حالت بھی ناگفتہ بہ ہوگئی تھی، آخر کار بیگم صاحبہ بھوپال نے سر ابراہیم رحمت اللہ صاحب (موجودہ صدر اسمبلی) کی صدارت میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر فرمایا۔ کمیشن کی رپورٹ مرتب ہونے اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کی برطرفی کے بعد یہ سوال سامنے آیا کہ کمیشن کی مجوزہ اصلاحات کو کس طرح عملی جامہ پہنایا جائے۔ آخر کار یہ اہم خدمت سر سلیمان صاحب کے سپرد ہوئی اور آپ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ تقریباً ایک سال تک برابر ہر ہفتہ شاہ صاحب الہ آباد سے علیگڑھ جاتے رہے اور ہائیکورٹ کی تعطیل کے زمانہ میں بھی آپ نے برابر علی گڈھ ہی میں قیام کر کے یونیورسٹی کی خدمت انجام دی۔ اس سلسلہ میں آپ نے اپنے عزیز وقت اور روپیہ کی وہ قربانی کی ہے جس کی مثال مسلمان لیڈروں میں بہت کم ملیگی۔ بہر حال آپ نے مسلم یونیورسٹی کو استوار اصولوں پر قائم کر کے حکومت اور پبلک میں مقبول عام بنا دیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سابق وائسرائے ہند اور گورنر صوبہ متحدہ نے آپ کی شاندار اہم خدمات کا علانیہ اعتراف کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سر سلیمان نے اس آڑے وقت پر دارالعلوم علیگڈھ کی جو خدمت انجام دی ہے اس کے احسان سے مسلمانانِ ہند کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے ہیں۔ آپ نے حکومت ہند کے اعلیٰ افسران سے بھی علیگڑھ یونیورسٹی کے لئے پندرہ لاکھ کی امداد منظور کرائی جو سالانہ قسطوں کی صورت میں ابتک مل رہی ہے

آپ نے کئی مرتبہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کے فرائض بھی نہایت خوبی و کامیابی سے انجام دیے۔ کانفرنس مذکور کے شعبۂ اصلاح و تمدن کے صدر کی حیثیت سے شاہ صاحب نے ۱۹۲۸ء میں بمقام مدراس ایک قابل قدر جامع خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس میں اصلاح معاشرت کے جملہ پہلو پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ خانگی زندگی کی اصلاح اور صنف نازک کی اصلاح و ترقی کے مسائل سے شاہ صاحب کو خاص دلچسپی ہے۔ اپنی اصلاحی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے آپ نے انگریزی اور اردو میں ریفارمر نام سے ایک اخبار الہ آباد سے اپنی نگرانی میں جاری فرمایا۔ آپ الہ آباد یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ کے بھی ایک ممتاز رکن ہیں اور یونیورسٹی مذکور کے کاموں میں برابر عملی حصہ لیتے رہتے ہیں

ان علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ سر شاہ محمد سلیمان صاحب کو خاص ادبی ذوق بھی ہے۔ آپ ہندوستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ کے نہایت سرگرم رکن و رہنما ہیں۔ ادبی کانفرنس کے اجلاس ۱۹۳۱ء

کی صدارت کرتے ہوئے ہندی اور اُردو زبانوں کی اصلاح و ترقی پر آپ نے ایک بلند پایہ خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ اکیڈیمی کا ہر شعبہ آپ کی امداد و رہنمائی کا رہین منت ہے۔

شاہ صاحب کے والد محترم مولوی شاہ محمد عثمان صاحب عربی و فارسی کے جید عالم تھے۔ شعر و سخن سے بھی آپ کو خاص دلچسپی تھی، آپ کی کئی ایک مثنویاں اور غیر مطبوعہ دیوان اردو سر سلیمان صاحب کے پاس موجود ہے۔ حضرت مولانا آسی رحمۃ اللہ علیہ جب کوئی غزل ارشاد فرماتے تو مولوی عثمان صاحب مرحوم کو سب سے پہلے سناتے۔ ان دونوں بزرگوں میں ایسی بے تکلفی تھی کہ ایک ایک مصرع اور الفاظ کی نشست پر پہروں بحث رہتی تھی۔ حفیظ جونپوری اور متعدد شعرا ہر وقت مولوی صاحب موصوف کی صحبت میں رہتے تھے۔ ایسی ادبی صحبت میں پرورش پانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آنریبل سر شاہ محمد سلیمان کو بھی اردو ادب سے خاص ذوق ہے۔ چنانچہ اردو اور فارسی ادب کی نایاب کتابوں کا ایک ذخیرہ آپ نے جمع فرمایا ہے۔ زبان اُردو کے رسالوں میں زمانہ کانپور، ادبی دنیا لاہور، اور معارف اعظم گڈھ آپ ہمیشہ مطالعہ کرتے ہیں اور حسب فرصت آپ نو طبع ادبی کتابوں پر نوٹ و حواشی بھی لکھتے رہتے ہیں۔ کوئی رسالہ یا کتاب اُٹھا کر دیکھئے جا بجا نشانات اور نوٹ نظر آئینگے آپ اہل ادب اور شعرا کی بڑی عزت فرماتے ہیں۔ ہر سال ہندوستانی اکیڈیمی کی ادبی کانفرنس اور مسلم ہوسٹل کے مشاعرہ کے موقع پر ایک مختصر اور محدود اہل ادب اور شعرا کی محفل شاہ صاحب کی قیام گاہ پر بھی منعقد ہوتی ہے۔

شاہ صاحب کے ادبی ذوق کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے مثنویات میر انتخاب غزلیات میر، انتخاب قصائد ذوق کے تین مجموعے مرتب فرمائے ہیں اور ہر ایک پر مختصر دیباچہ اور نوٹ بھی تحریر کئے ہیں۔ یہ مجموعے بداوں کے مشہور نظامی پریس میں طبع ہو کر شائع ہو گئے ہیں۔ ان انتخابات کے مطالعہ سے آپ کے علمی ذوق کا پورا پتہ چلتا ہے۔ اُردو شعرا کا کلام انھیں اصولوں پر انتخاب کیا جائے تو اُردو ادب کے لئے بہت ہی مفید ہو۔

الہ آباد کی ہر علمی اور معاشرتی اصلاح کی تحریکوں میں آپ اور لیڈی سلیمان صاحبہ برابر عملی حصہ لیتی رہتی ہیں۔ لیڈی سلیمان صاحبہ طبقۂ نسواں کی اصلاح اور تعلیم کے وسائل کی ہم رسانی کے لئے ہر وقت کوشاں رہتی ہیں، آپ الہ آباد کے زنانہ کلب کی صدر ہیں۔ زچہ و بچہ کی نگہداشت کی غرض سے جو مختلف مرکز الہ آباد میں قائم ہوئے ہیں اُن کی ترقی اور مقبولیت کے لئے لیڈی صاحبہ محترمہ ہمہ وقت کوشاں رہتی ہیں۔ سر سلیمان صاحب نے "عید ڈنر" کی سوشل تحریک کی بھی بنیاد ڈالی ہے جس کے ضمن میں

الہ آباد میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے مواقع پر ایک ڈنر ترتیب دیا جاتا ہے جس میں ہندو اور مسلمان معززین شریک ہوکر ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں۔ اس طرح پر ہندوستان کے دو بڑے طبقے یکجا جمع ہوتے اور خورو نوش میں شریک ہوکر اخوتِ انسانی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ تحریک متحدہ قومیت ہند کے حق میں نہایت مفید ثابت ہورہی ہے۔

سر شاہ محمد سلیمان صاحب کا اخلاق بہت وسیع ہے۔ ہر شخص کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی اور تپاک سے پیش آتے ہیں۔ آپ کی صحبت میں چند منٹ گزارنا گوناگوں دلچسپیوں کا موجب ہوتا ہے۔ ایک ہی بار کی ملاقات اور چند ہی منٹ کی گفتگو کے بعد ہر شخص یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ مجھ سے زیادہ بے تکلف کوئی دوسرا شاہ صاحب کی خدمت میں نہیں ہوسکتا۔ سچ ہے انسان کا ظاہری اخلاق اسکی دلی شرافت کا آئینہ ہوتا ہے اور جوہر شرافت اپنی حقیقی جھلک دکھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سر شاہ محمد سلیمان صاحب چار بھائی اور ایک بہن ہیں اور شاہ صاحب سب میں بڑے ہیں۔ آپ سے چھوٹے شاہ محمد سفیان صاحب جونپور میں قیام رکھتے ہیں اور جائداد خاندانی کے انتظام و انصرام میں مشغول رہتے ہیں، دوسرے بھائی شاہ محمد سلمان صاحب الہ آباد میں وکالت کرتے ہیں اور تیسرے شاہ محمد حبیب صاحب ابھی زیر تعلیم ہیں۔ آپ کے تین صاحبزادے اور ایک دختر نیک اختر ہیں جن کے نام شاہ احمد سلیمان، شاہ محمود سلیمان اور شاہ حامد سلیمان اور سلمہ بی بی ہیں۔ یہ سب بچے الہ آباد کے مختلف انگریزی اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں۔

سر سلیمان صاحب کے گزشتہ کارناموں کو مدنظر رکھکر یقین ہے کہ آپ چیف جسٹس عدالت عالیہ کے اہم فرائض بھی نہایت خوبی و کامیابی سے انجام دینگے اور یہ حقیقت بہت ہی جلد دنیا پر روشن ہوجائیگی کہ ہندوستانی بڑے سے بڑے اور اہم ذمہ دار عہدہ کے فرائض کی انجام دہی کی اہلیت رکھتے ہیں

بلبل ہند سروجنی نیڈو کے چند نغمے

(مترجمہ مسٹر ظفر قریشی دہلوی، بی۔اے)

ایک دیہاتی گیت

میرے گھڑے بھرے ہوئے ہیں اور منزل دور، طویل اور سنسان ہے۔
آہ! میں کشتی والے کی بانسری سنکر اس قدر مدہوش کیوں ہوگئی تھی!
افسوس مجھے کیا ہوگیا تھا؟
رات کے تاریک سائے بھوتوں کی طرح آہستہ آہستہ زمین پر چھارہے ہیں۔
آہ! ذرا سننا تو! کیا یہ سفید پرندوں کی آواز ہے
کیا یہ اُلّو کی آواز آرہی ہے!
اس وقت تو مسافر نواز چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنیں بھی نہیں ہیں!
اور راستہ تاریک اور بھیانک ہے!
آہ اس اندھیرے میں کہیں کوئی سانپ نہ کاٹ لے!

رام رے رام! میں تو مرجاؤنگی — آہ!!
میرا بھائی اپنے دل میں کیا کہیگا کہ آج کہاں رہ گئی؟
میری ماں انتظار کرتے کرتے تھک کر رو رو کر کہتی ہوگی کہ ہے پرماتما! میری بیٹی کو صحیح سلامت پہونچادے
آج جمنا اس قدر چڑھی ہوئی ہے۔

جمنا کا پانی دیوانہ وار چڑھ رہا ہے
رات کی تاریکی بھی اس طرح بڑھ رہی ہے جیسے کوئی سیاہ پرندہ اپنے پر پھیلائے ہو۔

ہز ہائی نس جام صاحب نوانگر چانسلر
چیمبر آف پرنسس ۱۹۳۰ء

آنریبل سر جے ڈبلیو بھور مشیر تجارت گورنمنٹ ہند

آہ! ایسے میں اگر طوفان آگیا تو میں کیا کرونگی؟ کہاں جاکر پناہ لونگی؟
آہ بادلوں کی کڑک سے، بجلی کی تڑپ سے کیسے بچونگی؟!
اے میرے خدا! مجھے اس طوفان سے بچا
میرے پیروں کو صحیح راستہ پر ڈال دے اور منزل تک پہنچا دے! ورنہ میں مرجاؤنگی!!
رام رے رام ہے رام!

سپیرے کا گیت

میری بانسری کے گیتوں کے جادو سے بچکر تو کدھر جارہا ہے؟
کیا پھولوں کے اُس معطر کنج میں چھپے گا جس میں چاند کی کرنیں جذب ہورہی ہیں؟
کیا وہاں جارہا ہے جہاں گلہری مزے کی نیند سو رہی ہے اور کوے اسکے گرد پاسبانی کر رہے ہیں؟
کیا تو اس جنگل میں جارہا ہے جو یاسمینی شگوفوں کی صورت میں نور اُگل رہا ہے؟

میرے محبوب دیوتا! تو کہاں چلا؟
میں تیرے لئے میٹھا میٹھا سفید دودھ لایا ہوں
جنگل کا تازہ سُرخ و شیریں شہد بھی حاضر ہے!
مَیں تجھے سفید اور سرسبز سرکنڈوں کی ٹوکری میں لئے لئے پھرونگا۔
میں تجھے محل کے اس گل بداماں حصہ میں لیجاؤنگا
جہاں زرپوش دوشیزگان جمال "زرتارِ انبساط" کو اپنے گلہائے مسرت کی پنکھڑیوں میں پروکر "تبسم" کی ایک "نقابِ گل" بنارہی ہونگی۔!

تو آہستہ آہستہ پھنکاریں مارتا ہوا کدھر جارہا ہے؟ کیا اس جنگل میں جہاں حیات بخش زیتون نے ایک سیلِ آتشیں بہا رکھا ہے؟
کہاں جارہا ہے اے محبوب
آ! — اے "خواہشات" کی سیمیں تن کرن ماہتاب!!

اچھوت

(از ڈاکٹر اعظم کریوی سابق ایڈیٹر اکبر الہ آباد)

شکروا چمار اپنی جھونپڑی میں بیٹھا ناریل پی رہا تھا، قریب ہی اس کا اکلوتا لڑکا بینی جسکی عمر قریباً
سال کی ہوگی کھیل رہا تھا۔ بینی کے سوا شکروا کا اس دنیا میں کوئی اپنا نہ تھا وہی اب
کی ٹوٹی ہوئی جھونپڑی کا چراغ اور ضعیفی کا سہارا تھا، دن بھر کی محنت مزدوری سے جو کچھ
جاتا اسی میں دونوں کا خرچ چلتا۔ لیکن دو دن سے اُسے کوئی مزدوری نہ ملی تھی کیونکہ آجکل وہ
ں کے زمیندار پنڈت رام پرشاد اوستھی کے یہاں بیگار کر رہا تھا۔ زمیندار کو سرکار نے رائے صاحب
طاب دیا تھا جس کی خوشی میں بڑا جشن منایا جا رہا تھا حاکموں کی دعوت ہو چکی تھی اور صبح کو پنڈال
بوج ہونے والا تھا۔ دن بھر کی بیگار سے فرصت پاکر تھوڑی دیر ہوئی شکروا نے جھٹی پاکر اپنی
نپڑی میں قدم رکھا تھا۔ بینی نے باپ کے گلے سے لپٹ کر کہا" بابا! مو کا (مجھکو) نئی دھوتی منگا دو۔"

شکروا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "مالک کے یہاں کام ختم ہو جائے تو کچھ انام (انعام) ملی
ی ماں توکا (اسی میں تجھکو) دھوتی منگائے دیہوں (منگا دونگا)"

بینی نے بال ہٹ سے کام لیا "اوں ہوں، میں تو ابھن لیہوں، (ابھی لونگا) مالک کے یہاں
ب لوگ نیک نیک کپڑا پہنے ہیں ہم ہوں پہنب (مالک کے یہاں سب لوگ اچھے کپڑے پہنے
بائیں بھی پہنوں گا۔)

مگر یہ بال ہٹ کسی راج کنور یا رئیس زادہ کی نہ تھی بلکہ ایک فاقہ کش غریب چمار کے لڑکے کی
ں شکروا نے کہا" پاگل نہ بن ہم گریب وہ امیر ہمار اُن کا کا مکابلہ وہ چاہیں تو دن ماں بار بار کپڑا
ہیں ہم ان کی ریس کیسے کر سکت ہیں (ہم غریب وہ امیر ہمارا اور ان کا کیا مقابلہ وہ اگر چاہیں
دن میں کئی مرتبہ کپڑا بدل سکتے ہیں ہم ان کا ساتھ کیسے دے سکتے ہیں۔)

بینی نے بھولے پن سے کہا" ہم کا گریب ان کا امیر کو بنائس ہے" (ہمیں غریب اور اُن کو
میر کس نے بنایا ہے؟)

"ہا ہا" شکروا نے قہقہہ مار کر کہا" تو بڑا پاگل ہس (ہے) بھگوان بنائن ہیں (نے بنایا ہے)

اور کو بنائے سکت (بنا سکتا) ہے"۔

"تو بھگوان ہم کا امیر کاہے ناہیں بنائن (تو بھگوان نے ہمکو امیر کیوں نہیں بنایا) ہمار (ہماری) کون خطا ہی"۔

"اب رام جانیں، اگلے جنم ماں ہم سے کچھ اپراوہ ہوئیگا ہوئی وہی کی سجا ملی ہے (اگلے جنم میں ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہوگی اسی کی سزا ملی ہے۔)

"تو اگر ہم سے بھگوان راجی ہو جائیں تو ہم ہو کا امیر کر دیں (اگر ہم سے بھگوان خوش ہو جائیں تو کیا وہ ہم کو امیر کر دیں گے)

"اور نہیں تو کیا، بھگوان کے ہاتھ میں تو سب کچھ ہے"۔

"تو بھگوان کیسے کھوس ہوت ہیں" (کیسے خوش ہوتے ہیں)

"پوجا پاٹ سے"۔

"تو ہم ہو پوجا پاٹ کرب" (تو ہم بھی پوجا پاٹ کریں گے)

"مدا ہم مندر ماں نہیں گھس سکت ہیں" (لیکن ہم مندر میں نہیں گھس سکتے)

"کاہے" (کیوں)

"ہم لوگ اچھوت ہیں، پنڈت لوگ کہت ہیں کہ ہم مندر میں گھسب تو مندر ناپاک ہو جائی۔ (پنڈت لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے گھسنے سے مندر ناپاک ہو جائیگا)

ناداں بچہ اچھوت کی فلاسفی کو نہ سمجھ سکا، وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا "تو کا بھگوان مندر ماں رہت ہیں؟" (تو کیا بھگوان مندر ہی میں رہتے ہیں اور کہیں نہیں)

"نہیں بھگوان تو ہر جگہ ہیں"

"تو موں ہوں اپنی جھونپڑیا ماں ایک چھوٹا سا مندر بنیہوں اور بھگوان کی پوجا کریہوں تم دیکھ لیہو بہت جلد امیر ہو جاب" (میں بھی اپنی جھونپڑی میں ایک چھوٹا سا مندر بناؤنگا اور بھگوان کی پوجا کیا کرونگا تم دیکھ لینا بہت جلد امیر ہو جائیں گے۔)

"مدا بغیر پنڈت کے پوجا کبول نہ ہوئی" (لیکن کسی پنڈت کی مدد کے بغیر پوجا قبول نہ کیجائیگی) بیٹی کا دل ٹوٹ گیا وہ اور کچھ پوچھ ہی نہ سکا اتنے میں کسی نے باہر سے آواز دی "ابے او شنکروا"، باہر نکلکر شنکروا نے دیکھا کہ زمیندار کا پیادہ داتا دین کھڑا ہے، شنکروا نے ادب سے پوچھا "مہاراج کا حکم ہے؟"

"اسٹیشن تک جانا ہوگا وہاں سے کچھ سامان آئیگا۔"

"ابھن (ابھی)"

"ہاں بے ابھی، مالک کا حکم ہے فوراً شکروا کو بھیجدو۔"

"سرکار ابھن (ابھی) تو دن بھر کے بیگار سے واپس آئے ہوں۔"

"یہ میں کچھ نہیں جانتا میں نے تجھے مالک کا حکم سنا دیا ہے اگر تو ابھی اسٹیشن نہیں جائیگا تو پھر خیر نہیں، ہمیشہ مزہ اڑاتے ہو اب ذرا مالک کا کام پڑا تو رونے لگے تم لوگ تو جوتوں سے کام کرتے ہو۔"

یہ کہکر مہاراج ودیا وین اپنی لوہ بندی لاٹھی کاندھے پر رکھکر اکڑتے ہوئے چل دیے اور شکروا آسمان کی طرف حسرت سے دیکھکر رہ گیا۔ دن بھر بیگار میں رہا سمجھا تھا کہ رات کو تو آرام ملیگا مگر غریبوں کی قسمت میں آرام کہاں وہ تو اسی لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ تکلیف اُٹھاکر امیروں کو آرام پہنچائیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو کم از کم ہندوستان میں اُنھیں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ شکروا نے کچھ چبینا بیٹی کو دیکر اُسے کٹھری پر لٹا دیا اور خود اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۲)

رائے صاحب رام پرشاد اوستھی کے مکان کے سامنے ایک عالی شان شامیانہ لگا ہوا تھا، نو بجے کا وقت ہو گا پنڈتوں کو بھوجن دیا جا رہا تھا۔ پنڈت کون تھے بڑے بڑے نام دھاری جن کی چوٹیاں کنوئیں سے پانی کھینچ لا سکتی تھیں، جن کے تلک آسمانی توس قزح کو بھی مات کرتے تھے جو بظاہر غریب برہمن بنے ہوئے تھے لیکن جن کے گھروں میں سونا برستا تھا، جو دعوتیں کھا کھا کر اتنے موٹے ہو گئے تھے کہ دو قدم چلنے میں بھی اُنھیں تکلیف ہوتی تھی۔ اسی قماش کے برہمن آج تعلقہ دار رائے صاحب رام پرشاد اوستھی کے یہاں گرم گرم پوریاں خستہ کچوریاں اور انواع و اقسام کی مٹھائیاں کھا رہے تھے۔ تھال کے تھال اُن کے سامنے آتے اور وہ بغیر ڈکار لیئے اُڑا لیتے چلے جاتے تھے۔

ان سے کچھ دور پر چند فاقہ کش نیچ ذات والے بیگاری مزدور جنھیں پنڈتوں نے اچھوت کا خطاب دے رکھا ہے حسرت بھری نظروں سے پنڈتوں کی توند کو دیکھ رہے تھے، ان کے لئے نہ پوریاں تھیں نہ کچوریاں۔ پنڈتوں کو کھلانے سے تو دیوتا خوش ہوتے ہیں لیکن نیچوں کو کھلانے سے تو کسی کو فائدہ کی امید نہ تھی۔

شکروا چار کو رات بھر اسٹیشن ہی پر پڑا رہنا پڑا وہ تھوڑی دیر ہوئی مہمانوں کا سامان لیکر گاؤں میں واپس ہوا تھا اور اب تک اُسے گھر جانے کی اجازت نہ ملی تھی وہ ایک طرف لنگوٹی باندھے چپ چاپ کھڑا تھا

کہ ایک تلک دھاری پنڈت شیو شنکر لٹیا میں گنگا جل لئے کھڑاؤں پہنے رام نام کی مالا جپتے ہوئے اس طرف سے نکلے، وہاں کی زمین کچھ اونچی نیچی تھی، پنڈت جی لڑکھڑائے اور ان کا بدن شنکر و اچمار سے چھو گیا، بات معمولی تھی، پنڈت اپنے گھر کی مرمت اچھوتوں ہی سے کراتے تھے، مہاراجن کا ڈولہ چمار ہی اٹھاتے تھے لیکن اس وقت ان کے ہاتھ میں گنگا جل تھا وہی گنگا مائی کا جل جس سے ساری دنیا سیراب ہوتی ہے جس میں بھنگی چمار برہمن سب اشنان کرتے ہیں، وہی گنگا جل اپنی لٹیا میں بھر کر خود کو دیوتا سے بھی بڑھکر سمجھنے لگے غلطی تھی اپنی لیکن قصور بتایا گیا چمار کا۔ شنکر و اچمار کی یہ مجال کہ پنڈت جی سے اپنا ناپاک بدن چھوائے۔ جب اس نے پنڈت جی کو اپنے پاس سے گزرتے دیکھا تو وہ ہٹا کیوں نہیں۔ بھری سبھا میں اس نے جان بوجھکر پنڈت جی کی ہتک کی۔ اب ان کو پھر اشنان کرنا پڑیگا، اسی قسم کی باتیں سوچکر پنڈت جی شنکر و اچمار پر برس پڑے" پاپی، چانڈال، بدمعاش" غرض پنڈت جی کو جتنی گالیاں یاد تھیں وہ ختم کردیں۔ قریب ہی تعلقدار صاحب پنڈتوں کی آؤ بھگت میں لگے ہوے تھے، شور و غل سنکر وہ دوڑے آئے اور پنڈت جی سے پوچھا "مہاراج! کیا بات ہے"؟

مہاراج نے بگڑکر کہا "جہاں پنڈتوں کو بھوج دیا جاتا ہے وہاں چماروں کا کیا کام؟ دیکھئے نہ اس پاپی نے جان بوجھکر مجھے چھولیا، اب آپ ہی بتایئے کہ مجھے غصہ کیوں نہ آئے۔ رام! رام! آپ نے ان چماروں کو بہت سر چڑھا رکھا ہے"۔

مہاراج کے آخری جملہ نے تعلقدار او ستھی جی کو آگ بگولہ کردیا، انھوں نے شنکر و اچمار سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی، پیادہ کو اشارہ کردیا کہ "مار سالے کو" وہاں تو حکم کی دیر تھی، پیادے تو اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے ایسے موقعے تلاش ہی کرتے رہتے ہیں۔ شنکر و اچمار پر لات گھونسہ اور جوتوں کی مار پڑنے لگی۔ شنکر و اچمار بھوک کے مارے یوں ہی مرا جا رہا تھا مار پڑی تو زمین پر گر کر لوٹنے لگا۔ پیادہ نے سمجھا کہ مکر کر رہا ہے اس نے کسکر ایک لات ماری اس کی چوٹ تلّی پر لگی اور وہ پھٹ گئی دیکھتے ہی دیکھتے غریب شنکر وا نے دم توڑ دیا۔

جشن میں ایسی بدشگونی کا کسی کو خیال ہی نہ تھا سب لوگ گھبرا گئے، تھوڑی دیر کے لئے تعلقدار صاحب بھی پریشان ہوگئے، ان کو اس کا تو کوئی غم یا ڈر نہ تھا کہ ایک غریب کی ہتیا ہوگئی ہے بلکہ اس کا صدمہ تھا کہ کمبخت آج ہی کیوں مرا میرا اتمام کیا کرایا خاک میں ملا دیا۔ سب برہمن کھا پی چکے تھے وہ سب رام رام کہتے ہوئے چلنے کے لئے تیار ہوگئے، وہ ایسے پاپ کی جگہ پر کیسے رہ سکتے تھے، برادری ان کو چھوڑ دیتی، لیکن تعلقہ دار صاحب کے پاس پنڈتوں کو رام کرنے کا نسخہ موجود تھا، لکشمی دیوی ان پر مہربان تھیں

ایسی صورت میں پنڈتوں کو ملانا تعلقہ دار صاحب کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ ان کے پاس دولت کی طاقت تھی، وہ پنڈتوں کو جدھر چاہتے نچا سکتے تھے۔ سب سے پہلے تو انھوں نے چماروں کو بلا کر حکم دیا کہ شنکروا کی لاش کو لے جا کر فوراً جلا دیں، اس کے ساتھ ہی دھمکی دی کہ اگر کسی نے پولیس کو مار پیٹ کی خبر دی تو اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ دریا میں رہکر مگر سے بیر، کس کی مجال تھی کہ تعلقہ دار صاحب کی حکم عدولی کرتے، سب دم بخود رہ گئے۔ پولیس کی طرف سے تعلقہ دار صاحب کو اطمینان تھا پھر بھی انھوں نے حلقہ کے تھانہ دار صاحب کی مٹھی گرم کرنے کا بھی انتظام کر دیا۔

ان تمام جھگڑوں سے فرصت پا کر تعلقہ دار صاحب نے پنڈتوں کے پیٹ پوجا کا سامان کیا، ان کو روک لیا گیا اور رات کو پھر ان کو بھوج دیا گیا اور پنڈتوں کے حسب منشا مہا دیو جی پر ایک سو ایک روپیے اور ایک ناریل چڑھا کر دان کر دیا، گویا ان کے خیال میں گناہ کا کفارہ ادا کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ست نراین کی کتھا بھی کرائی گئی۔

آٹھ بجے رات کا وقت ہوگا ست نراین کی کتھا ہو رہی تھی، ایک بڑے پنڈت جی جن کے ہونٹ رام رام کہتے موٹے ہو گئے تھے لیکن جنھوں نے اپنی بیوہ لڑکی کے سسرال کا سارا دھن ہضم کر لیا تھا وہی پنڈت جی اس وقت پھولوں سے لدے ہوئے جھوم جھوم کر ست نراین کی کتھا کہہ رہے تھے کہ یکبارگی "رام نام ست ہے" کی آواز آئی۔ شنکروا چمار کی ارتھی مرگھٹ جا رہی تھی، کسی نے "رام نام ست ہے" کی صدا زور سے لگا دی، پنڈت جی کا کلیجہ دہل گیا وہ ساری کتھا بھول گئے اور یہ کہتے ہوئے چوکی سے اتر پڑے "اب مجھ سے کتھا نہیں کہی جاتی، اچھوتوں نے تو ناک میں دم کر دیا۔"

تعلقہ دار صاحب نے غصہ سے پیادوں کی طرف دیکھا جس کا یہ مطلب تھا کہ چمار کی ارتھی اس طرف سے کیوں نکلی، لیکن اب بگڑنا بیکار تھا جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ ساری سبھا درہم برہم ہو گئی۔

(۳)

شنکروا چمار کوئی بڑا آدمی تو تھا ہی نہیں کہ لوگ اس کی برسی مناتے، ایک معمولی چمار کی زندگی ہی کیا؟ گاؤں والے اسے بہت جلد بھول گئے۔ اس کا لڑکا بھی باپ کے مرنے کے بعد کچھ دن تک تو گاؤں میں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا پھر معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ کسی خاندانی رئیس کا لڑکا ہوتا تو اس کی گمشدگی پر گاؤں میں تہلکہ مچ جاتا، اخبارات میں بڑی بڑی سرخیوں سے اشتہارات شائع ہوتے، انعام کی لالچ میں پولیس بھی انتہائی کوشش کرتی۔ لیکن ایک چمار کے لڑکے کی سماج میں کوئی عزت ہی نہیں ہے، سماج تو بڑوں کے لئے ہے چھوٹوں کی اور وہ بھی ایک چمار کی وہ کیوں پروا کرنے لگی۔

سنکروا کو مرے بیس سال ہو چکے تھے، اس عرصہ میں سیکڑوں انقلاب ہوئے، بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو گئے یا مر گئے۔ تعلقہ دار رائے صاحب رام پرشاد اوستھی زندہ تھے لیکن چراغ سحری، اب ان کا ایک لڑکا گجادھر پرشاد اوستھی علاقہ کا کام کرتا تھا اور رائے صاحب اپنا وقت پوجا پاٹ میں گزارتے تھے لیکن اس ضعیفی کے عالم میں بھی جب حاکم پرگنہ ان کے علاقہ میں آ جاتے تو رائے صاحب فوراً حاکم کے سلام کے لئے حاضر ہوتے۔

ایک دن رائے صاحب نے سنا کہ ایک نئے حاکم مسٹر ڈیوڈ اُن کے علاقہ میں آئے ہیں اور ان کا پڑاؤ گاؤں کے قریب ہی پڑا ہے۔ رائے صاحب فوراً چار پیادوں کو لیکر حاکم پرگنہ کے پڑاؤ پر پہنچے، سب سے پہلے وہ پیشکار سے ملے۔ پیشکار صاحب رائے صاحب کے پرانے نیازمندوں میں سے تھے، جب کبھی وہ رائے صاحب کے علاقہ کی طرف آتے تو رائے صاحب کے یہاں سے ان کو سو روپیہ کا نذرانہ مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ فصل کی چیزیں بھی ان کے گھر پر پہونچ جاتی تھیں۔ پیشکار صاحب نے رائے صاحب سے کہا

"یہ نئے صاحب رئیسوں سے بہت کم ملتے ہیں، آپ ان سے نہ ملیں تو بہتر ہے۔"

"تو کیا مجھ سے بھی نہ ملیں گے؟"

"نہیں آپ ایسے رئیس سے تو ضرور ملیں گے لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ان سے ملکر آپ کی طبیعت خوش نہ ہوگی۔"

"اجی میں بڑے بڑے افسروں سے مل چکا ہوں سب مجھ سے بڑے اخلاق سے پیش آتے ہیں ان کو بھی دیکھ لونگا، میں نے تو سنا ہے کہ یہ نیچ ذات والوں سے بھی ملتے ہیں پھر مجھ سے کیوں نہ ملیں گے؟"

"ہاں یہ تو صحیح ہے کہ یہ صاحب اچھوتوں سے بہت ملتے ہیں، ان کو کرسی پر بٹھاتے ہیں لیکن رئیسوں سے سیدھے منھ بات نہیں کرتے۔"

"عیسائی ہے نہ"

"جی ہاں"

"لیکن اب تو آ گیا ہوں مل ہی کے جاؤں گا۔ آپ ذرا میری اطلاع تو کر دیجئے۔"

"بہت اچھا جیسی مرضی" اتنا کہکر پیشکار صاحب مسٹر ڈیوڈ کے خیمہ میں داخل ہوئے اور اطلاع کی "حضور سے اس علاقہ کے سب سے بڑے زمیندار اور سرکار کے خیر خواہ رائے صاحب رام پرشاد اوستھی ملنے کے لیئے آئے ہیں۔"

اوستھی جی کا نام سنکر ڈیوڈ صاحب نے کچھ سوچکر کہا "اچھا اندر بھیج دو۔"

اوستھی جی نے خیمہ میں داخل ہوکر نہایت ادب سے ڈپوڈ صاحب کو جھک کر سلام کیا اور خود ہی
ہاتھ ملانے کے لئے آگے بڑھے، اوستھی جی سلام کرنے کے بعد افسروں سے ہاتھ ملانے کے عادی تھے
ہر افسر اُن سے بڑی خوشی سے ہاتھ ملاتا تھا لیکن خلاف معمول اوستھی جی کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی
جب ڈپوڈ صاحب نے ان سے ہاتھ نہ ملایا اور کہا "معاف کیجیے میں آپ ایسے عالی خاندان پنڈتوں
سے ہاتھ نہیں ملا سکتا کیونکہ میں اچھوت ہوں۔"

پنڈت جی کے وہم و خیال میں بھی نہ آیا تھا کہ افسران اعلیٰ اچھوت ہو سکتے ہیں، وہ تو ان نیچوں کو
اچھوت سمجھتے تھے جو ان کے گاؤں میں چھوٹے کام کرتے تھے جن کو چھونا وہ مہاپاپ سمجھتے تھے۔ ڈپوڈ صاحب
کی زبان سے اچھوت کا لفظ سُنکر انھوں نے سمجھا کہ ڈپوڈ صاحب نے یوں ہی ہنسی میں کہدیا ہوگا۔ پنڈت
جی نے کہا "حضور ایسی بات نہ کہیں، راج دربار کو تو ہم ایشور کا سایہ سمجھتے ہیں، شاستر میں بھی راج
بھگت کی بڑی مہما لکھی ہے اور یہی پراچین سے ہوتا آیا ہے۔"

"پنڈت جی معاف کیجئے آپ لوگ مطلب کے بندے ہیں جس میں آپ کا فائدہ ہوتا ہے اسکو
آپ وید و شاستر سے جائز ثابت کر لیتے ہیں اور جس سے آپ کو نقصان ہوتا ہے اُسے آپ مذہبی کتابوں
کے خلاف بتاتے ہیں۔ بتاتے رہیئے آپ کی خوشی لیکن اب وہ زمانہ گیا جب خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے
جن کو آپ نیچ سمجھکر اپنی سماج سے نکل جانے کا موقع دے رہے ہیں وہی نیچ تعلیم یافتہ ہوکر آپ پر حکومت
کریں گے۔"

پنڈت جی جھٹ سے بول اُٹھے "جی ہاں یہ کلجگ ہے نہ؟"
ڈپوڈ صاحب نے مسکرا کر کہا "خوب آپ اسی پنڈتائی میں رہیئے اور دنیا ترقی کرتی جائیگی، جسکو
آپ اپنے خیال میں کلجگ سمجھتے ہیں وہ دوسروں کے لئے ست یگ ہوتی جا رہی ہے۔ آپ کی اسی قسم
کی تنگ نظری اور تعصب نے نہ جانے کتنے اچھوتوں کو دوسرے مذاہب اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔
یاد رکھئے کہ اگر آپ نے ان اچھوتوں کو اپنانے کی کوشش نہ کی تو آپکی قوم مٹی میں ملجائیگی۔"
پنڈت جی دل میں سوچ رہے تھے کہ میں تو صاحب سے ملنے آیا تھا نہ کہ اچھوتوں پر بحث کرنے
انھوں نے گھبرا کر کہا "حضور کو اچھوتوں سے بڑی ہمدردی ہے۔"
"جی ہاں، کیونکہ میں خود اچھوت ہوں۔"
"وہ کیسے؟"
"یہ آپ کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا، ہاں یہ تو بتائیے کیا آپ کے گاؤں میں کوئی شنکر اچار تھا؟"

شنکروا چار کا نام سُنکر پنڈت جی کو بیس برس پہلے کی باتیں یاد آگئیں، وہ سمجھے کیا خونِ ناحق رنگ لانے والا ہے، ڈر کے مارے ان کا چہرہ فق ہوگیا، انھوں نے دبی زبان سے کہا "جی ہاں میرا ایک اسامی اس نام کا ضرور تھا لیکن اُس کو مرے ہوئے اب قریباً بیس بائیس سال ہوگئے۔"

ڈیوڈ صاحب نے کہا "میں نے سنا ہے کہ اُس کو آپ نے جان سے مروا ڈالا تھا"

پنڈت جی تن گئے۔ "جھوٹ بالکل جھوٹ، بھلا کہیں پنڈتوں سے جیو ہتیا ہو سکتی ہے؟"

"جی ہاں آپ ایسے بیدرد تنگ نظر پنڈتوں سے جیو ہتیا ہو سکتی ہے، اور اس کا گواہ میں خود آپ کے سامنے موجود ہوں۔"

پنڈت جی نے گھبرا کر کہا "حضور — گواہ!"

ڈیوڈ صاحب بولے "پنڈت جی ادھر دیکھئے جس کو اس وقت آپ حضور کہکر فخر کر رہے ہیں جس کو سلام کرنے کے لئے آپ یہاں حاضر ہوئے ہیں وہ اُس بدنصیب شنکروا چار کا لڑکا بیٹا ہے جو کبھی اچھوت تھا جس نے آپ کی ٹھوکریں کھائی تھیں، وہی عیسائی ہوکر تعلیم پاکر آج حاکم ہے اور آپ کی نگاہ میں ایشور کا سایہ ہے اور وہ اب آپ سے ہاتھ ملانا بھی پسند نہیں کرتا۔"

پنڈت جی پر گویا بجلی گر پڑی، شرم وندامت سے وہ پانی پانی ہوگئے، ان کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا سا چھا گیا، وہ زمین پر گرنے ہی کو تھے کہ ڈیوڈ صاحب نے سنبھال لیا اور اپنے چپراسی کو بلا کر پنڈت جی کو ان کے گھر پر بھیج دیا۔ پنڈت جی کے لئے ضعیفی میں یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا، وہ اسی رات کو قید ہستی سے آزاد ہوگئے، لوگوں نے سمجھا کہ دل کی حرکت بند ہونے سے ان کی موت ہوگئی۔ دس گیارہ بجے دن کا وقت تھا، ڈیوڈ صاحب کے سامنے کوئی مقدمہ پیش تھا کہ ان کے بڑا کے پاس سے رائے صاحب پنڈت رام پرشاد اوستھی کی ارتھی نکلی، ڈیوڈ صاحب کے کانوں میں "رام نام ست ہے" کی صدا آئی، وہ فوراً اجلاس سے باہر نکل آئے اور اپنے سر سے ٹوپ اتار کر اُس وقت تک مؤدب کھڑے رہے جب تک "رام نام ست ہے" کی آواز فضا میں گونجتی رہی۔

تنقید کتب

(۱) تصحیح قاموس المشاہیر

(نوشتہ سید احمد اللہ قادری نایب اڈیٹر رسالہ تاریخ)

حال میں مجھے قاموس المشاہیر مرتبہ مولانا نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی کے مطالعہ
[کر]نے کا پھر موقعہ ملا تو چند فروگذاشتیں اور معلوم ہوئیں چنانچہ ذیل میں ان کی تصحیح کی جاتی ہے۔ یہ
[ت]نقید صرف اس کی پہلی جلد کے متعلق ہے۔ اس پر ایک بسیط تبصرہ رسالہ عالمگیر لاہور کے سالنامے
[ب]جون ۱۹۳۰ء) میں بھی لکھا جاچکا ہے۔

قاموس المشاہیر جلد اول صفحہ ۱، کالم ۱ میں درج ہے:۔

ابراہیم قطب شاہ سلطان قلی قطب شاہ بادشاہ گولکنڈہ کا چھٹا بیٹا تھا۔ ۹۳۶ھ میں پیدا ہوا
سلطان قلی کے مرنے پر اس کا بھائی جمشید علی تخت پر بیٹھا........۲۱ ربیع الثانی ۹۸۹ھ میں ۵۱
سال کی عمر میں فوت ہوا۔ اس کا بھائی محمد قطب الدین شاہ بادشاہ ہوا۔

[ا]س بادشاہ کا نام ابراہیم قلی قطب شاہ ہے۔ سنہ ولادت ۹۳۶ھ ہے۔ سلطان قلی کے بعد اس کا
[ب]ڑا بھائی جمشید علی نہیں بلکہ جمشید قلی جانشین ہوا۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کا سنہ وفات ۹۸۸ھ ہے اس
[ک]ے بیٹے کا نام محمد قطب الدین شاہ نہیں بلکہ محمد قلی قطب شاہ ہے۔

۲۔ صفحہ ۲۴، کالم ۲۔ ابن ذکریا رازی، محمد بن ذکریا نام ابو بکر کنیت وطن قصبہ رے ہے.....
اس کا رسوخ شاہان اسلام کے یہاں بڑھ گیا تھا، یہاں تک کہ سلطان السلاطین منصور بن اسمٰعیل
سامانی نے اپنے واسطے ایک کتاب المنصوری تصنیف کرائی۔"

[ذ]کریا رازی کے وقت میں کوئی بادشاہ منصور بن اسمٰعیل نہیں گزرا ہے اور نہ تاریخ میں شہرت رکھتا ہے
[اگ]ر ہم اس کو منصور بن نوح سمجھیں تو اس کا عہد ۳۵۰ھ سے ۳۶۶ھ تک رہا ہے اور رازی نے
[۳]۱۱ھ یا ۳۲۰ھ میں وفات پائی۔ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں منصور بن اسحٰق بن احمد

بن اسد کا ذکر کیا ہے جو رازی کے حال پر بڑا مہربان تھا، اور رازی نے اسی کے نام پر المنصوری تصنیف کی تھی۔ یہ منصور سامانیوں کے دوسرے بادشاہ احمد بن اسمٰعیل بن احمد بن اسد کا چچا زاد بھائی تھا اور احمد بن اسمٰعیل نے اسے سنہ ۲۹۰ھ میں خراسان کا حاکم مقرر کیا اور رے اس کا مستقر حکومت تھا اس خدمت پر یہ سنہ ۲۹۶ھ تک فائز رہا۔ اس کے بعد سنہ ۳۰۲ھ میں نصر بن احمد بن اسمٰعیل پر خروج کیا۔

۳۔ صفحہ ۲۹ کالم ۱۔ ابوالحسن شاہ احمد نگر کا بادشاہ اور شاہ طاہر کا فرزند تھا اور علی عادل شاہ کا سنہ ۹۸۰ھ میں وزیر تھا۔

اس نام کا احمد نگر میں کوئی بادشاہ نہیں ہوا ہے۔ مرتضیٰ نظام شاہ اول کے زمانہ میں ایک شخص شاہ طاہر نامی احمد نگر میں آیا۔ اس کا یہ ادعا تھا کہ وہ شہزادہ خدا بندہ بن برہان نظام شاہ اول کا بیٹا ہے مگر بعد میں تحقیق کی گئی تو اس کا بیان غلط نکلا۔ اس پر صلابت خان وزیر اعظم (احمد نگر) نے اسے قید کر دیا اور یہ یہیں مر گیا اس کا ایک بیٹا احمد نامی تھا امرا نے اسے غلطی سے سنہ ۱۰۰۳ھ میں احمد نگر کے تخت پر بٹھا دیا۔ مگر چاند بی بی کی کوشش سے معزول کر دیا گیا۔ ابراہیم عادل شاہ نے شورش رفع کرنے کیلئے اسے اپنے پاس ایک جاگیر دیکر امرا میں شریک کر لیا یہ واقعہ سنہ ۱۰۰۴ھ کا ہے۔ (سوانح چاند بی بی صفحہ ۳۹)

۴۔ صفحہ ۳۳ کالم ۲۔ ابوالفداء اسمٰعیل حموی کی تقویم البلدان کا ذکر کیا ہے لیکن اس کی مشہور اور معرکۃ آرا تصنیف المختصر فی اخبار البشر (جو عوام میں تاریخ ابوالفدا کے نام سے شہرت رکھتی ہے) چھوڑ دی ہے۔ اس میں حضرت آدم سے سنہ ۷۲۹ھ تک واقعات ہیں

۵۔ صفحہ ۴۷ کالم ۱۔ ابوسعید بیضاوی، ابوسعید عبداللہ بیضاوی مصنف نظام التواریخ، اس میں حضرت آدم سے لیکر تاتاریوں کے زمانہ تک جب کہ ہلاکو خاں نے سنہ ۱۲۵۸ء میں بغداد پر حملہ کیا حال درج ہے یہ کتاب سنہ ۱۲۷۵ء میں تصنیف کی گئی۔

اسی مصنف کے حالات مرتب نے بیضاوی کے عنوان سے (صفحہ ۴۱ کالم ۱ پر) اس طرح تحریر کئے ہیں:۔

"قاضی بیضاوی نام ناصر الدین ابوالخیر عبداللہ ابن عمر لقب وطن بیضا واقع شہر شیراز کے مدت دراز تک قاضی رہے اور بمقام تبریز سنہ ۶۸۵ھ یا بقول دیگر سنہ ۶۹۱ھ میں وفات پائی یہ مشہور تفسیر بیضاوی کے مصنف ہیں اس کو انوار التنزیل اور اسرار التاویل بھی کہتے ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ نظامت التواریخ کے بھی مصنف ہیں۔ لیکن بعض اسے ابوسعید کی

تصنیف بتاتے ہیں۔"

ابو سعید بیضاوی اور قاضی بیضاوی دونوں ایک ہی مصنف ہیں، جسکو نظامی صاحب نے غلطی سے دو علیحدہ مصنف تصور فرمایا ہے۔ ان ہی صاحب نے تفسیر بھی لکھی ہے اور نظام التواریخ بھی تفسیر بلاد مغرب میں خاص شہرت رکھتی ہے۔ ایک جرمن محقق فلیشر نے اسے نہایت اہتمام کے ساتھ لیزک میں ۱۸۴۶ء میں چھپوایا ہے، ایک اور مستشرق فل نے اس کی انڈکس بنائی ہے جو ۱۸۶۱ء میں طبع ہوئی ہے۔ یہ مشرق میں بھی کئی دفعہ چھپی ہے جنمیں بعض اشاعتوں کے سنہ درج کئے جاتے ہیں (دہلی میں ۱۲۷۱ھ میں دو جلد میں) طہران میں ۱۲۷۲ھ میں ایک جلد میں، بمبئی اور لکھنؤ میں ۱۲۷۹ھ و ۱۲۸۲ھ میں دو دو جلد میں) نظام التواریخ کو اخیر میں مرتب نے نظامت التواریخ لکھا ہے جو سہو ہے، یہ بہت کمیاب تھی مگر حال میں مولوی حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب نے شائع فرمادی ہے۔ اس کے سوا بیضاوی کی اور بہت سی تصنیفات ہیں جن کا ذکر قاموس المشاہیر میں نہیں ہے۔ (مراۃ الجنان جلد چہارم صفحہ ۲۱۹ طبقات الکبریٰ جلد پنجم صفحہ ۵۹، مفتاح السعادہ جلد اول صفحہ ۴۳۶، تاج العروس جلد پنجم صفحہ ۱۱ روضات الجنات صفحہ ۴۳۵، اکتفا القنوع صفحہ ۱۱۱

۶۔ صفحہ ۱۸ کالم ۲۔ اسمٰعیل عادل شاہ یوسف عادل شاہ کا جانشین ۹۱۵ھ میں ہوا۔۔۔۔۔۔ اور مقام کوکی میں اپنے باپ کی قبر کے پاس دفن ہوا"

یوسف عادل شاہ کا ۹۱۶ھ میں انتقال ہوا، اس لحاظ سے اسمٰعیل عادل شاہ ۹۱۶ھ میں تخت نشین ہوا، کوکی کوئی مقام نہیں ہے البتہ گوگی ہے جو حیدرآباد کے ایک ضلع گلبرگہ شریف کا ایک تعلقہ ہے۔

۷۔ صفحہ ۹۱ کالم ۱۔ اکرام علی، اُردو میں خوان الصفا ان کی تصنیف ہے جس کو انھوں نے ۱۸۱۰ء میں فارسی سے ترجمہ کیا۔

محمد اکرام علی کی کتاب کا نام اخوان الصفا ہے جسے انھوں نے عربی سے ترجمہ کیا ہے۔ (کشف الظنون جلد اول صفحہ ۹۰)

۸۔ صفحہ ۹۲ کالم ۱۔ اسمٰعیل نظام شاہ بن برہان نظام شاہ ثانی احمدنگر کا بادشاہ حسین نظام شاہ کے بعد تخت پر بیٹھا، برہان نظام شاہ کی تخت نشینی پر قلعہ لاہ گڑھ میں قید ہوگیا۔"

حسین نظام شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بڑا بیٹا مرتضیٰ نظام شاہ تخت نشین ہوا، مرتضیٰ کے بعد اس کا بیٹا میراں حسین نظام شاہ تخت پر بٹھایا گیا، میراں حسین کے بعد اسمٰعیل نظام شاہ کی بادشاہی کی باری آئی۔ لاہ گڑھ کے نام سے دکن میں کوئی قلعہ نہیں ہے۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ قلعہ لسا گڑ میں قید کیا گیا تھا۔

۹۔ صفحہ ۹۱ کالم ۲۔ الپتگین امرائے بخارا میں سے تھا .... اس نے غزنیں پہنچ کر ایک علاحدہ سلطنت قائم کی اور غزنیں کو جو ایک چھوٹا سا مقام تھا دارالسلطنت بنایا ۳۴۹ھ میں مر گیا، اس کا بیٹا ابو اسحق جانشین ہوا۔ لیکن وہ نہایت کمزور طبیعت اور مسرف تھا، تھوڑے ہی دنوں بعد تمام اراکین سلطنت اس سے ناراض ہو گئے اور انھوں نے ۳۶۷ھ میں سبکتگین کو جو الپتگین کا ایک سردار تھا تخت پر بٹھا دیا۔

الپتگین نے ۳۵۲ھ میں غزنیں میں انتقال کیا اس کے بعد ابو اسحاق نہیں بلکہ اسحاق تخت نشین ہوا جس نے تقریباً چار سال تک فرماں روائی کی، اسحق کے بعد امیر بلکاتگین ۳۵۵ھ میں بادشاہ بنایا گیا۔ آٹھ برس کے بعد جب اس نے وفات پائی تو امیر پیری جانشین بنا ۳۶۲ھ میں چند بدعنوانیوں سے تنگ آکر امرائے ترک نے اُسے معزول کر دیا اور سبکتگین کو اپنا فرمانروا بنا لیا۔ اس واقعہ کا سنہ جیسا کہ مورخ فرشتہ نے ۳۶۷ھ تحریر کیا ہے، یہی عام طور پر صحیح تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن طبقات ناصری میں سبکتگین کی تاریخ تخت نشینی ۲۷ شعبان ۳۶۶ھ مذکور ہے۔ الپتگین کی وفات اور ان کے جانشینوں کی سرگذشت وتصریح تاریخ یمینی عتبی وطبقات ناصری اور اکثر قدیم تاریخوں سے بھی ہوتی ہے

(طبقات ناصری طبع کلکتہ صفحہ ۷، ونیز ریورٹی صفحہ ۷۲ و ۷۳۔)

۱۰۔ صفحہ ۱۰۵ کالم ۲۔ امیر برید اول کے بیان میں لکھا ہے کہ محمود شاہ بھمنی نے ۹۲۳ھ میں انتقال کیا، حقیقت میں اس نے ۹۲۴ھ میں وفات پائی۔

۱۱۔ صفحہ ۱۲۷ کالم ۱۔ برہان عماد شاہ کے بیان میں لکھا ہے کہ طفیل خاں وزیر اس کی ریجنٹ کی حیثیت سے کار سلطنت انجام دیتا تھا مگر اس وزیر کا صحیح نام تفال خاں ہے۔

۱۲۔ صفحہ ۱۳۷ کالم ۱۔ بہادر نظام شاہ کے حالات میں مغلوں کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے۔

میاں منجھو اس وقت احمد نگر پر قابض تھا اس نے بہادر نظام شاہ کو جو اس وقت شیر خوار بچہ تھا بادشاہ تسلیم کر لیا شیر خوار شہزادے کے مخالفوں نے جو مدعیان سلطنت میں تھے شہر کا محاصرہ کر لیا، میاں منجھو نے مراد سے جو گجرات کا گورنر اور شہنشاہ اکبر کا بیٹا تھا مدد طلب کی اور یہ وعدہ کیا کہ اگر اس کی مدد سے کامیابی ہوئی تو وہ سلطنت مغلیہ کا باجگذار ہو جائیگا۔ سلطان مراد نے اس شرط کو قبول کر لیا اور احمد نگر پر بڑی جمعیت کے ساتھ چڑھائی کی قبل اس کے کہ شاہی فوج کی مدد پہنچے وہ اپنے حریفوں کو زیر کر چکا تھا اس لئے وہ مراد سے مدد مانگنے پر بہت پچھتایا اور اب اس نے صرف اس غرض سے کہ اُسے شہزادہ مراد کا باجگذار نہ بننا پڑے مقابلہ کی تیاری شروع کر دی، شہر کو چاند بی بی کے جو سلطان بہادر شاہ کی

پھوپھی تھی عام نگرانی میں دے کر نصیر خاں کے سپرد کیا...... شہزادے نے چاند بی بی سے خراج قبول کر کے محاصرہ اٹھا دیا اور کچھ روپیہ نقد ادا کیا گیا۔

میاں منجھو ابراہیم نظام شاہ کا وزیر اعظم تھا سلطان نے اُسے اپنے عین حیات ہی میں وزارت کی خدمت سے سبکدوش کر دیا تھا بادشاہ کا جب انتقال ہوا تو یہ شاہی خزانہ پر قابض ہو گیا اور اپنے زور سے ایک غیر متعلق شہزادے کو جس کا نام احمد تھا عین عید الضحیٰ کے دن (۱۰۰۳ھ میں) تخت نشین کرا دیا جس کے باعث چاند بی بی اور اس میں شدید معرکے رہے، جب اس کی قوت کمزور ہو گئی تو شہزادہ مراد کو احمد نگر پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی اور خود شہر کے حوالہ کرنے کا وعدہ کیا۔ اسی اثنا میں یہ احمد نگر پر قابو پا گیا مگر شہزادہ مراد بھی احمد نگر آ رہا تھا، اس کو شہزادے کے آنے کا علم ہوا تو چاند بی بی اور انصار خاں کو قلعہ حوالہ کر کے خود عادل شاہ اور قطب شاہ کے پاس مدد کے لئے گیا۔ انصار خاں چونکہ اس کا خاص آدمی تھا چاند بی بی نے اس کو قتل کرا دیا (مرتب نے انصار خاں کو نصیر خاں لکھا ہے جو تصحیف ہے) چاند بی بی نے مراد سے صلح کرنے کے بعد اس کو برار کا علاقہ پیشکش میں دیا، اس کے علاوہ اور کسی قسم کا تاوان جنگ ادا نہیں کیا (سوانح چاند بی بی)

۱۳۔ صفحہ ۱۹۳۔ کالم ۱۔ ٹیپو سلطان...... نے سنگھا پٹن کے قلعہ کو بہادری سے بچانے کی کوشش کی۔

صحیح نام سری رنگا پٹن ہے۔

۱۴۔ صفحہ ۱۹۳ کالم ۱۔ حاجی خلفہ..... کشف الظنون سوانح مشاہیر کی ایک کتاب ہے۔

کشف الظنون کے مصنف کا نام حاجی خلیفہ ہے۔ کشف الظنون عربی و فارسی کتابوں کی فہرست ہے، کتاب کے نام کے تحت مصنف کا نام اور کتاب کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

۱۵۔ صفحہ ۲۰۲ کالم ۲۔ مامون رشید کے وزیر کا نام حسن بن سہیل لکھا ہے۔ لیکن صحیح نام حسن بن سہل ہے (المامون جلد دوم صفحہ ۱۱۲)

۱۶۔ صفحہ ۲۱۱ کالم ۱۔ مولانا حسین واعظ کاشفی کے بیان میں ان کی ایک تصنیف لطائف الطوائف کا ذکر کیا ہے لیکن انھوں نے اس نام سے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ہے، البتہ ان کے فرزند ملا علی کاشفی نے لطائف الظرائف ۹۳۴ھ میں لکھی تھی، غالباً اسی کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

۱۷۔ صفحہ ۲۱۱ کالم ۲۔ حکیم الملک شمس الدین...... ۹۸۹ھ میں اجازت حج لیکر حجاز کو گیا اور وہیں وفات پائی مگر وہ ۹۸۹ھ میں نہیں بلکہ ۹۸۸ھ میں حج سے مشرف ہوا اور وہیں انتقال کیا۔
(منتخب التواریخ صفحہ ۳۴۳)

دکن کا بھی سفر کیا تھا خواجہ نظام الدین احمد اور ملا عبدالقادر بدایونی سے ان کے مخلصانہ تعلقات تھے۔
(منتخب التواریخ صفحہ ۳۳۲)

۱۹۔ صفحہ ۲۱۲ کالم ۲۔ حمد اللہ مستوفی بن ابو بکر الخواجہ القزوینی اس کا نام حمید الدین مستوفی بھی ہے۔
تاریخ گزیدہ اس کی تصنیف ہے۔

اس کا صحیح نام حمد اللہ بن ابی بکر بن نصر مستوفی ہے۔

۲۰۔ صفحہ ۲۱۳۔ کالم ۲۔ حمید الدین مستوفی ملاحظہ ہو حمد اللہ مستوفی۔
حمید الدین حمد اللہ مستوفی کا نام نہیں ہے تصحیف ہے (تاریخ گزیدہ طبع لیڈن سنہ ۱۹۱۰ء ج اتن صفحہ ۲)

۲۱۔ صفحہ ۲۱۴ کالم ۲۔ خاقانی ایران کا مشہور شاعر منوچہر بادشاہ ایران کے عہد میں گزرا ہے اس کو سلطان الشعراء کا خطاب ملا تھا، اس کا نام افضل الدین ابراہیم بن علی شروانی تھا، شیروان کا رہنے والا، فلکی کا شاگرد تھا، اسی نے اس کو خاقانی کا خطاب عطا کیا تھا۔ تحفۃ العراقین کا مصنف ہے، ایک دیوان فارسی اور ایک کتاب موسومہ ہفت اقلیم بھی اسی کی تصنیف سے مشہور ہے بمقام تبریز سنہ ۵۸۲ھ میں وفات پائی۔

خاقانی کا تخلص ابتدا میں حقائقی تھا۔ خاقان کبیر منوچہر کے دربار میں جب یہ پہونچا تو سلطان نے اسے خاقانی کے لقب سے ملقب کر دیا اور بادشاہ کی مناسبت سے اس نے اپنا تخلص خاقانی اختیار کیا۔ خاقانی ابوالعلا گنجوی کا شاگرد تھا اور فلکی کو بھی اسی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حمد اللہ مستوفی نے خاقانی کو فلکی کا شاگرد بتلایا ہے جو نادرست ہے۔ خاقانی رفعت تخیل اور پختگی میں فلکی سے بہت سبقت رکھتا ہے اور یہ دونوں خاقان اکبر کے درباری رہے ہیں۔ مولانا آزاد بلگرامی نے حبیب السیر کے مصنف کے حوالے سے لکھا ہے کہ خاقانی سنہ ۵۹۵ھ تک بقید حیات موجود تھا۔ خاقانی نے ہفت اقلیم نامی کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ہے۔ ہفت اقلیم بہت بعد کی کتاب ہے جس کو امین احمد رازی نے سنہ ۱۰۰۲ھ میں بعہد شہنشاہ اکبر لکھا ہے۔ (تذکرہ مجمع الفصحا صفحہ ۲۰۰، خزانۂ عامرہ صفحہ ۲۰۴، نتائج الافکار صفحہ ۱۳۹)

۲۲۔ صفحہ ۲۱۸ کالم ۱۔ خالدون۔ صحیح لفظ خلدون ہے۔

۲۳۔ صفحہ ۲۲۰ کالم ۲۔ خانخاناں بیرم خاں وزیر شہنشاہ اکبر اور اس کے بیٹے عبدالرحمن خاں وزیر شہنشاہ مذکور تاریخ میں اسی خطاب سے مشہور ہیں۔
بیرم خاں کے بیٹے کا نام عبدالرحمن نہیں بلکہ عبدالرحیم خانخاناں ہے۔

۲۴۔ صفحہ ۲۲۷۔ کالم ۲۔ خواجہ حسن صدرالدین نظامی کتاب تاج المآثر کا مصنف تھا جو اس نے سلطان قطب الدین ایبک بادشاہ دہلی کے نام پر ۶۰۵ھ میں معنون کی تھی۔

تاج المآثر کے مصنف کا نام نظام الدین حسن نظامی ہے جو نظامی عروضی سمرقندی مصنف چہار مقالہ کا فرزند تھا (تاریخ گزیدہ طبع لیڈن صفحہ ۸۲۶) نام کے تحقیق کرنے میں روضۃ الصفاء اور کشف الظنون کے مصنفین کو بھی دھوکا ہوا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں تاج المآثر کا جو مخطوطہ ہے وہ بہت قدیم نسخہ سے جو صدر الملۃ والحق مولنا محمد بن محمد المحوتی کا تھا نقل کیا گیا ہے۔ اس کے آخر میں خواجہ حسن صدرالدین کی تقریظ ہے، جس میں مصنف کی غیر معمولی تعریف کی گئی ہے۔ بقول سر ہنری الیٹ دیباچہ نگار کے نام کی بناء پر مؤلف کا نام بھی صدرالدین خیال کیا گیا۔ تاج المآثر قطب الدین ایبک کے نام پر منسوب نہیں ہے بلکہ اس کی خوشنودی کی خاطر لکھی گئی ہے۔ اس کا سلسلہ تالیف قطب الدین کی وفات (سنہ ۶۰۷ھ) کے بعد بھی جاری تھا۔ تاج المآثر کے عام نسخوں میں سنہ ۶۱۴ھ تک حالات ہیں، لیکن الیٹ نے نواب ضیاء الدین خاں دہلوی کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ دیکھا تھا جس میں سلطان شمس الدین کے آخری عہد یعنی سنہ ۶۲۶ھ تک واقعات تحریر ہیں۔

۲۵۔ صفحہ ۲۲۸ کالم ۲۔ خواجہ محمد مقیم ملاحظہ ہو نظام الدین احمد۔

خواجہ محمد مقیم خواجہ نظام الدین احمد کے والد کا نام ہے۔

۲۶۔ صفحہ ۲۳۳ کالم ۲۔ داراشکوہ بن شاہجہاں کے بیان میں تحریر کیا ہے کہ اس نے ایک سنسکرت کتاب موسومہ اپنگھت[۱] کا ترجمہ کرایا جس کا نام سرالاسرار رکھا۔ اس ترجمہ کا نام سراکبر ہے۔

۲۷۔ صفحہ ۲۳۷۔ کالم ۱۔ دردمند محمد تقی دہلوی کا تخلص ہے جو مرزا جانجاناں کے مرید تھے۔ انھوں نے ایک دیوان اور ساقی نامہ تصنیف کیا ہے۔ مرشدآباد میں سنہ ۱۲۱۲ء میں انتقال کیا۔

محمد تقی دردمند کوئی شاعر نہیں گزرا ہے، البتہ محمد فقیہ دردمند ایک مشہور شاعر ہوئے ہیں جو جانجاناں کے شاگرد و مرید تھے۔ جنھوں نے ساقی نامہ تصنیف کیا تھا مؤلف کا انہی کی جانب اشارہ ہے۔ محمد فقیہ دردمند کے ساقی نامہ کا میر تقی میر، میر حسن اور لالہ لچھمی نراین شفیق نے اپنے تذکروں میں ذکر کیا ہے۔
(نکات الشعراء صفحہ ۱۲۰ تذکرہ اردو شعراء از میر حسن صفحہ ۲۴ چمنستان شعراء صفحہ ۷۰)

۲۸۔ صفحہ ۲۴۲ کالم ۲۔ دولت شاہ بخت شاہ کا بیٹا تھا اور تذکرہ دولت شاہی کا مصنف ہے۔ سلطان حسین والی ہرات کے زمانہ میں گذرا ہے۔ یہ کتاب سنہ ۸۹۲ھ میں لکھی گئی تھی

---

[۱] اپنشد۔

دولت شاہ کے والد کا نام علاء الدین بختی شاہ تھا جو شاہرخ بن تیمور کے مشہور درباریوں سے تھا

اس کا چچا فیروز شاہ بیگ شاہرخ مرزا کے مشاہیر سے تھا اور بھائی امیر رضی الدین بڑا جید عالم اور بہادر

آدمی تھا۔ محمد خدائی داد کی سرکار سے متوسل تھا دولت شاہ نے تذکرہ کو ۱۴۸۷ء میں تمام کیا۔ مرآۃ الصفا

کے مصنف نے دولت شاہ کا سنہ وفات ۹۰۲ھ / ۱۴۹۶ء تحریر کیا ہے۔ تذکرہ دولت شاہ ایک مستند تذکرہ ہے

جسے تذکرۃ الشعراء بھی کہتے ہیں۔ یہ صحیح معنوں میں تحقیق کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اس کی ترتیب میں تاریخ و

تراجم کی ۳۷ کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

۲۹۔ صفحہ ۲۴۴ کالم ۲۔ رابعہ دورانی .... اورنگ زیب کی بی بی تھی ...... اس کا مقبرہ اس کے

بیٹے محمد اعظم نے بعینہ تاج محل کے نمونہ پر بنانا چاہا مگر اورنگ زیب کی روک ٹوک سے اس کی

تکمیل نہ ہو سکی صرف دروازے کی بغلی کے ایک پہلو میں یہ الفاظ کندہ ہیں "ایں روضہ منورہ

در معماری عطاء اللہ بعمل ہیبت رائے تیار شد ۱۰۷۱ھ"

رابعہ دورانی کا روضہ مکمل حالت میں اس وقت تک موجود ہے اور اس کی روشیں اور حصار بھی

باقی ہے اور کوئی حصہ نامکمل نہیں ہے۔ اس میں دو کتبے کندہ ہیں، جن میں سے صرف ایک نقل کیا گیا

ہے دوسرا یہ ہے "ایں دروازہ باہتمام رفعت پناہ آقا ابوالقاسم بیگ داروغہ تیار شد" پہلے کتبہ میں

بجائے ۱۰۷۱ھ کے ۱۰۷۲ھ ہونا چاہیئے۔

۳۰۔ صفحہ ۲۳۸ کالم ۲۔ دریا عماد شاہ نے اپنی بہن ربیعہ کی شادی ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ بڑی

دھوم دھام سے کی۔

دریا عماد شاہ کی بہن کا نام رابعہ بی بی ہے۔

۳۱۔ صفحہ ۲۴۴ کالم ۲۔ راجو قتال مخدوم جہانیاں جہاں گشت شیخ جلال کے بھائی تھے، ان کا شمار بھی

اکابر اولیا میں ہے۔ تحفۃ النصائح ان کی تصنیف ہے۔ ۸۰۶ھ میں انتقال کیا ان کا مزار

ملتان میں اوچھ کے قریب واقع ہے۔

حضرت راجو قتال حسینی مشہور بزرگ اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے مرید تھے، آپ اہل

و عیال کے ہمراہ ۷۲۵ھ میں دولت آباد تشریف لائے ۵ شوال ۷۳۱ھ میں یہیں وصال فرمایا۔ آپ

کا مزار خلد آباد میں مرجع خاص و عام بنا ہوا ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز جو دکن کے مشہور

بزرگ ہیں آپ ہی کے فرزند ہیں۔ بعض مورخین نے تحفۃ النصائح کو آپ سے منسوب کر دیا ہے جو صحیح

نہیں ہے۔ یہ شیخ یوسف دہلوی کی تصنیف ہے جسے انھوں نے ۷۹۵ھ میں تصنیف کیا تھا اس کا

دکنی ترجمہ ملا قطبی نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں کیا۔ شیخ یوسف دہلوی حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دہلی کے مرید تھے (تاریخ الاولیا جلد ۲ صفحہ ۲۰۵، ارمغان سلطانی صفحہ ۴، روضۃ الانتخاب صفحہ ۸۴۔ اردوے قدیم صفحہ ۶۷)

۳۲۔ صفحہ ۲۹۷ کالم ۲۔ رنگین، سعادت یار خاں نام رنگین تخلص، ان کا خاندان روم سے آکر ہندوستان میں آیا تھا۔ رنگین ایک تجارت پیشہ تھا، اس لئے ایک تاجر کی حیثیت سے تمام ہندوستان کی سیاحت کی...... شاہ حاتم کا شاگرد تھا، اردو میں ریختی اس کی ایجاد ہے، چار دیوان اور پانچ مثنویات یادگار ہیں جن میں سے فرسنامہ رنگین نامہ اور مجالس رنگین مشہور ہیں۔

رنگین کا خاندان توران سے آکر چند روز کے لئے لاہور میں مقیم ہوا اس کے بعد دلی آیا، تجارت ان کا آبائی پیشہ نہ تھا کبھی کبھی کر لیا کرتے تھے۔ اسی طرح یہ کئی مرتبہ لکھنؤ آئے اور گئے ہیں۔ لکھنؤ کے سوائے انھوں نے بہت کم شہروں کی سیر کی ہے۔ رنگین ریختی کے موجد نہیں ہیں بلکہ یہ ان سے بہت پہلے زمانہ کی ایجاد ہے، جس کا صحیح زمانہ ابتک متعین نہیں ہوا ہے۔ دکن میں ایک صاحب علی عادل شاہ بیجاپور اور اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں گزرے ہیں جن کا تخلص ہاشمی ہے، انھوں نے ریختی میں بہت کچھ کہا ہے، ان کے بعد دکن میں اور بہت سے شعرا ہوئے ہیں جن کا ہنوز پتہ نہیں لگا ہے۔ چونکہ رنگین نے ریختی کو بہت ترقی دی ہے اسی وجہ سے ان کو اس کا موجد خیال کیا جاتا ہے اور اسی خیال کو قاموس المشاہیر میں جگہ دی گئی ہے۔ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں رنگین کی جس قدر مثنویات اور دیوان موجود ہیں ان کی ایک مجمل تفصیل درج ذیل ہے:-

۱۔ رنگین کا پہلا دیوان، ریختہ۔ نورتن کا پہلا حصہ، بخط رنگین

۲۔ رنگین کا دوسرا دیوان، ریختہ " " دوسرا حصہ " "

۳۔ رنگین کا تیسرا دیوان آمیختہ " " تیسرا حصہ ہزلیات " "

۴۔ رنگین کا چوتھا دیوان انگیختہ " " چوتھا حصہ ریختی " "

۵۔ مجموعہ رنگین نورتن کا پانچواں حصہ قصائد و غزلیات کا مجموعہ سات زبانوں میں بخط رنگین

۶۔ مجالس رنگین نورتن کا چھٹا حصہ بخط رنگین

۷۔ امتحان رنگین " " ساتواں حصہ " "

۸۔ اخبار رنگین، نورتن کا آٹھواں حصہ مصنف نے بعض چشم دید واقعات نظم کئے ہیں بخط رنگین

۹۔ ہشت جہت رنگین۔

۱۰۔ ایجادِ رنگین — ششش جہت کا پہلا حصہ (مجموعۂ حکایات)

۱۱۔ عجائب و غرائب رنگین، شش جہت کا دوسرا حصہ

۱۲۔ داستان رنگین — شش جہت کا تیسرا حصہ، اس کا دوسرا نام مثلث رنگین ہے اس میں تین رسالے ہیں، شہر آشوب، کہاوت ہائے رنگین، حکایات رنگین۔

۱۳۔ چار چمن — شش جہت کا چوتھا حصہ — بخطِ رنگین

۱۴۔ پنجۂ رنگین — " پانچواں حصہ " "

۱۵۔ نظم رنگین — پنجۂ رنگین کا چوتھا حصہ (سو حکایات) " "

۱۶۔ داستانِ رنگین — " پانچواں حصہ (سرگزشت آغا عزیز سوداگر گجرات)

۱۷۔ خمسۂ رنگین — رنگین کے پانچ خمسوں کا مجموعہ — بخطِ رنگین

۱۸۔ جنگنامہ رنگین — ۱۹۔ حکایت رنگین

۲۰۔ نصاب رنگین — ۲۱۔ حکایات رنگین

۲۲۔ سبع سیارہ رنگین۔ رنگین کے سات تصنیفات کا مجموعہ۔

رنگین کی تصنیفات بہت کثیر تعداد میں ہیں اور بہت کم شعرائے اتنا سرمایہ اپنی یادگار میں چھوڑا ہوگا۔ (گل رعنا صفحہ ۲۶۴۔ اردوے قدیم صفحہ ۹۱۔ رسالہ اُردو جلد ا نمبر ۴، استفادہ از مضمون انڈیا آفس کی مخطوطات نوشتہ مولوی حکیم سید شمس اللہ قادری)

۲۳۔ صفحہ ۲۸۶ کالم ا۔ سرخوش نے اپنے ہمعصر شعرا کا ایک تذکرہ لکھا ہے، جس کا تاریخی نام کلامۃ الشعرا ہے۔

سرخوش کے تذکرے کا نام کلمات الشعرا ہے جو تاریخی نام ہے جس سے ۱۰۹۳ھ برآمد ہوتے ہیں۔

۲۴۔ صفحہ ۲۹۲ کالم ا۔ سعدی دکنی دکن کا رہنے والا تھا، کچھ ابیات کا مصنف ہے۔

اس بیان میں صرف اس قدر اضافہ کیا جاتا ہے کہ سعدی دکنی کا مزار برہانپور میں واقع اور مرجع خاص و عام ہے۔ غالباً یہ برہانپور کے رہنے والے تھے

(چمنستان الشعراء صفحہ ۳۹۵)

تنقید کتب

عزیز اللغات

مؤلفہ مولانا مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی - کراؤن سائز - حجم تقریباً ۸۰۰ صفحات
مجلد قیمت قسم اول ؏، قسم دوم ؏ ملنے کا پتہ مطبع انوار احمدی الہ آباد -

"یہ لغت خالص اردو لغات و محاورات و ضرب الامثال پر مشتمل ہے، کہیں کہیں عربی و فارسی کے الفاظ بھی ہیں - اس لغت کے لکھنے کا اصلی مقصد یہ ہے کہ طلبار مدارس صحیح اور مروجہ زبان اور محاورات سے واقف ہوں اور اردو لکھنے پڑھنے میں مستند محاورات کا استعمال کر سکیں .... اس لغت میں ردیف وار اردو کے لغات اور محاورات یکجا کر دیے گئے ہیں اور ان کے معنوں میں جو فرق ہے وہ بھی بیان کر دیا گیا ہے ...... جب تک طلبار اردو زبان کے الفاظ و محاورات سے واقف نہ ہونگے وہ اردو عبارات فصیح و دلآویز نہ لکھ سکیں گے - ان ضروریات کا لحاظ کر کے یہ لغت لکھا گیا ہے - اس کے ضمیمہ میں اخباری محاورات کا انتخاب بھی ہے، دوسرے ضمیمہ میں وہ انگریزی الفاظ ہیں جو زبان اردو میں جذب ہوتے جاتے ہیں - اس لغت کے لکھنے سے اصلی منشا یہ ہے کہ طلبار مدارس اس کے مطالعہ سے اردو لکھنے کا صحیح مذاق پیدا کریں اور نوشت و خواند میں اسی فصاحت و سلاست کا لحاظ رکھیں جس پر اردو زبان کا اطلاق ہو سکے اور یہ بات اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ ٹکسالی زبان سیکھیں اور صحیح محاورات کو مستحضر کر لیں"

یہ لغت مندرجہ بالا مقاصد کو بدرجۂ اتم پورا کرتا ہے اور ہم مولانا عزیز صاحب کو یہ مفید لغت مرتب کرنے پر مبارکباد دیتے ہیں -

---

اردوے قدیم

از حکیم سید شمس اللہ قادری (ایڈیٹر رسالہ "تاریخ" حیدر آباد دکن)
رائل سائز - حجم تقریباً ۲۰۰ صفحات - مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ

حکیم سید شمس اللہ قادری کا نام دنیاے ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، آپ کے علمی و تاریخی محققانہ مضامین اردو، زمانہ اور دوسرے رسائل میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں - آپ نے متعدد کتابیں بھی

تالیف کی ہیں جن میں سے ایک "اردوے قدیم" اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

جیساکہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں اردو زبان کی ابتدا سے لیکر بارھویں صدی ہجری تک اُردو کی درجہ بدرجہ ترقی کا ذکر کیا ہے اور ضمناً ہر عہد کے سلاطین، مصنفین و شعرا، کا ضروری تذکرہ بھی حوالہ قلم کیا ہے آخر میں نظم و نثر کے نمونے درج کر دیے ہیں جن سے اردو کی ابتدائی طرز تحریر اور تدریجی ترقی کا اندازہ کرنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

حکیم صاحب نے اس کتاب کی تالیف میں ایک سو سے زیادہ عربی۔ فارسی، اُردو، انگریزی وغیرہ زبانوں کی کتابوں سے مدد لی ہے۔ نیز یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے ایم۔اے کے نصاب میں داخل ہے اور یہ دونوں باتیں اس کی اہمیت کی کافی ضمانت ہیں۔

ہم حکیم صاحب کو اس کامیاب کتاب کی تالیف پر مبارکباد دیتے ہیں اور ہوا خواہان اردو سے امید رکھتے ہیں کہ وہ اس کے مطالعہ سے مستفید ہونگے۔

قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب

از رائے بہادر مہامہو پادھیائے گوری شنکر ہیرا چند اوجھا

رائل سائز تقریباً ۲۵۰ صفحات۔ مجلد قیمت چار روپے للعہ

ملنے کا پتہ: ہندستانی اکیڈیمی، الہ آباد

یہ کتاب اُن تین معرکۃ الآرا لیکچروں کا مجموعہ ہے جو ہندوستانی اکیڈیمی کی سرپرستی میں ستمبر ۱۹۲۸ء کو ہندی زبان میں دیئے گئے تھے۔ رائے بہادر گوری شنکر ہیرا چند اوجھا کا شمار ملک کے خاص محققین میں ہے چنانچہ ان لکچروں میں انھوں نے تاریخی تحقیقات کی خوب داد دی ہے۔ فاضل مصنف نے نہایت محنت و جانفشانی سے ۶۰۰ء سے ۱۲۰۰ء تک کے زمانہ کی ہندوستانی تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے۔ پہلا لکچر مذہب و معاشرت سے متعلق ہے، دوسرا ادبیات اور تیسرا سیاسی و تمدنی حالت پر ہے۔ ہر لیکچر میں اس کے متعلق موضوع پر ہر پہلو سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ بودھ، جین، برہمن وغیرہ دھرم کی ابتدا اور زوال، عقائد، رسوم مورتوں کی پرستش کے طریقے، غذا، لباس، نظام سلطنت، تعلیم، صنعت و حرفت، غرض کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ اور اس طرح یہ مجموعہ مذکورہ بالا چھ سو سال کی طویل مدت کی تہذیب و تمدن کی مختصر تاریخ ہے۔ اس وقت ہم اس عالمانہ تصنیف کا صرف ایک مختصر ذکر کر رہے ہیں مستقل ریویو کسی آئندہ نمبر میں ہدیۂ ناظرین ہوگا۔ اردو ترجمہ منشی پریم چند صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے اور ہم کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ترجمہ کی زبان بہت آسان و عام فہم ہے۔ مہاتما بودھ۔ وشنو۔ شیو۔ برہما وغیرہ دیوتاؤں کے قدیم مجسموں اور بعض مندروں کی چوبیس تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں۔

ہندی شاعری

از ڈاکٹر اعظم کریوی ۔ رائل سائز ۲۰۲ صفحات مجلد قیمت ۱۶/ ملنے کا پتہ : ہندستانی اکیڈیمی ۔ الہ آباد

ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی جدید مطبوعات میں یہ کتاب بھی بہت دلچسپ ہے۔ ہندی شاعری کے متعلق اُردو زبان میں مختصر مضامین تو اکثر لکھے گئے ہیں مگر مستقل کتاب ایک آدھ سے زیادہ شائع نہیں ہوئی، اور یہ بھی کسی طرح سے مستند یا جامع نہیں کہی جاسکتی ہیں۔ کتاب زیر ریویو میں ایک دیباچہ اور دو ابواب ہیں، دیباچہ میں ہندی بھاشا کی پیدائش اور شاعری کی ابتدا، مشہور ہندو مسلمان شعراء اور ہندی شاعری کی خصوصیات پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں تلسی کرت رامائن پر اظہار خیال کرنے کے بعد (۱) پریم کی پھلواری (۲) مناظر قدرت کی مصوری (۳) فلسفۂ اخلاق و حسن معاشرت عنوانات کے ماتحت رامائن کے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں، اور دوسرے باب میں ہندی زبان کے مشہور ہندو مسلمان شعراء کے مختصر حالات اور ان کے مختلف دوہوں کا انتخاب درج کیا گیا ہے۔

مختلف عنوانات کے تحت میں جو اقتباسات اور دوہے پیش کئے گئے ہیں اُن کو اُردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ مشکل الفاظ کے معنی اور پھر پورا مطلب بھی بیان کر دیا گیا ہے تاکہ ہندی نہ جاننے والے اصحاب اس کے مطالعہ سے پورا لطف اُٹھا سکیں۔

اگرچہ اس کتاب میں رامائن کے اقتباسات کے علاوہ جو کچھ ہے وہ صرف ہندی نظم کی ایک قسم دوہوں پر مشتمل ہے، کسی مختصر نظم، چھند، کبت وغیرہ کا کوئی نمونہ نہیں پیش کیا گیا ہے لیکن جو کچھ بھی ہے غنیمت ہے۔ حضرت نیاز کے جذبات بھاشا یا حیدر آباد کے مطبوعہ منتخبات ہندی کلام کے مقابلہ میں یہ کتاب زیادہ دلچسپ ہے اور ڈاکٹر اعظم کریوی اور ہندوستانی اکیڈیمی دونوں شکریہ کے مستحق ہیں جن کی کوشش سے یہ کتاب مرتب و طبع ہو کر شائقین تک پہونچیگی۔

ترقی زراعت

از خانصاحب مولوی محمد عبدالقیوم، ڈپٹی ڈائرکٹر محکمۂ زراعت ۔ رائل سائز ۔ تقریبًا ۳۲۵ صفحات ۔ قیمت للعہ/ ملنے کا پتہ : ہندستانی اکیڈیمی، الہ آباد ۔

ہندوستان کی زمین بہت زرخیز مشہور ہے اور آجکل کی گئی گزری ہوئی حالت میں بھی بقول کسے یہ زمین سونا اُگلتی ہے مگر کاشت کے طریقے بہت پرانے ہیں اور اس لئے زیادہ پیداوار حاصل نہیں ہوتی۔

اس کتاب میں زمین کی قسمیں، کھاد، فصلیں، بیج وغیرہ کے متعلق نہایت کارآمد باتیں لکھی گئی ہیں کس قسم کی زمین میں کون جنس بونی چاہیئے، کس قسم کی کھاد اور کس مقدار میں ڈالنی چاہیئے۔ کس صورت

میں زمین کی جوتائی، بوائی، کھیتوں کی آبپاشی، نرائی وغیرہ کرنی چاہیئے۔ یہ سب باتیں اس کتاب میں نہایت تفصیل کے ساتھ بتلائی گئی ہیں۔ فصلوں کے بونے کا وقت، بیج بونے کا طریقہ، فصل کو کیڑا لگ جانے کی صورت، اس کے دفعیہ کی تدبیر کے علاوہ مویشی پالنا، ان کی قسمیں، بیماریاں، علاج، غرض لائق مصنف نے فن زراعت کے متعلق سبھی ضروری باتیں اس میں یکجا کر دی ہیں۔

اس کے لائق مصنف صوبہ متحدہ کے محکمۂ زراعت کے ایک اعلیٰ عہدہ دار ہیں اس لئے جتنی باتیں اس کتاب میں درج کی گئی ہیں وہ سب مجرب و آزمودہ ہونیکی وجہ سے عملی حیثیت سے مفید و کارآمد ہیں۔ اس کے دیباچہ میں اس امر پر کافی زور دیا گیا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ کو زراعت کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے اور جدید ترقی یافتہ اصول پر زراعت کر کے ملک کی پیداوار بڑھانی چاہیئے۔ اس صورت میں تعلیم یافتہ حضرات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہترین رہنما کا کام دیگا۔

مختلف قسم کے نقشے اور مویشیوں وغیرہ کی باون ۵۲ تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں اور ان سے اس کی دلچسپی میں قابل قدر اضافہ ہو گیا ہے۔ اکیڈیمی کی تمام اردو مطبوعات اردو ٹائپ میں طبع کی جاتی ہیں، کاغذ بھی دبیز اور عمدہ استعمال ہوتا ہے، مطبوعات نہایت خوبصورت اور مجلد ہوتے ہیں

خواب و خیال

از مسٹر مجنوں بی۔اے۔ گورکھپوری۔ کراؤن سائز ۲۶۵ صفحات قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ: ایوان اشاعت، گورکھپور

مسٹر مجنوں افسانہ نگاری میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ کتاب اُنکی چند مختصر افسانوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے، شروع میں ایک مختصر جذباتی مضمون اور حسب دستور ایک طویل دیباچہ ہے جسکے بعد آٹھ قصے ہیں جو غالباً سب کے سب ملک کے مختلف رسائل میں طبع ہو چکے ہیں اور اب کتابی صورت میں یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

عموماً ہر افسانہ دلچسپ ہے اور نتیجہ خیز ہے، مصنف کا طرز تحریر دلکش ہوتا ہے۔ اس مجموعہ کے ساتھ جناب مجنوں کی عکسی تصویر بھی ہدیۂ ناظرین ہے، لکھائی چھپائی صاف و پسندیدہ ہے۔

بلیک میل

جناب ظفر قریشی دہلوی بی۔اے (کٹرہ مہر پرور دہلی) کا ایک مختصر جاسوسانہ ناول ہے۔ طرز بیان انگریزی سے ملتا جلتا ہے اور دلچسپی سے خالی نہیں۔ قیمت غالباً ۴/ ہے، حجم ۸۰ صفحات۔

آنریبل مسٹر ھیگ ہوم ممبر
گورنمنٹ ہند

ہز ایکسلنسی سر جیمس ڈیوڈ سفٹر
گورنر بہار و اڑیسہ
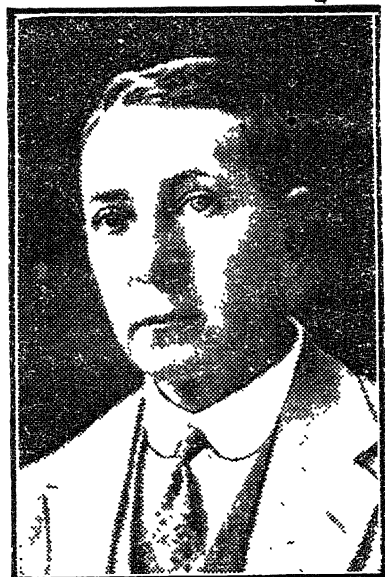
ملک التجار مسٹر وال چند ھیرا چند پریزیڈنٹ اجلاس
دہلی آل انڈیا چیمبر آف کامرس فیڈریشن

کلام شاد

(از سید الشعراء خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی - مرحوم)

رباعیات

مہلت کہیں اک آن تو لینے دے مجھے
کیا چیز ہے پہچان تو لینے دے مجھے
کچھ ختم نہیں ہے دورِ ساقی للہ
اس مے کو ذرا چھان تو لینے دے مجھے

طاقت تنِ ناتواں کی سب دور ہوئی
خم ہو گئی پشت آنکھ بے نور ہوئی
کیا شوخ مزاج تھی جوانی میری
پیری سے ملا کے آپ کافور ہوئی

پیری کے ہیں دن گئی جوانی اپنی
ہم چھوڑ چلے بہت نشانی اپنی
اوروں کی تو سن چکے کہانی ہم سے
اوروں سے سنو گے اب کہانی اپنی

کیوں کر نہ رہے غمِ نہانی میرا
دنیا میں بتا کون ہے ثانی تیرا
ہم لیکے عصا دور تلک ڈھونڈھ آئے
کوسوں نہیں نام اے جوانی تیرا

غزل

تہِ شمشیر کیا مشکل ہے رکھنا اپنی گردن کا
مگر آساں نہیں پہچاننا قاتل کی چتون کا

خرامِ ناز میں ڈورا ہی کھنچتا ہے گردن کا
نہیں اٹھتا مرے نازک بدن سے بوجھ دامن کا

بتا بے فائدہ کیوں پوچھتا ہے خاک کا میری
جھٹکنا یاد کر لے بے مروت اپنے دامن کا

کوئی صہبا کشی میں طاق کوئی مے پرستی میں
خراباتِ مغاں میں جمع ہے استاد ہر فن کا

بلائیں میکدے کی دور خم آباد مے کش خوش
ہمیشہ جام پر سایہ رہے ساقی کے دامن کا

نکالے بیٹھ کر کانٹے نہ اپنے پائے زخمی کے
کبھی بھولے بھی دل توڑا نہ ہم نے اپنے دشمن کا

تمہارے در سے ہمیں دیر و حرم میں کھینچتے کیوں ہیں
نہ لوٹا شیخ کو ہم نے نہ گھر چھینا برہمن کا

بہارِ باغ جاتی ہے کہو بلبل سنبھل بیٹھے
قریب آیا زمانہ نالہ و فریاد و شیون کا

نکل آئے ہم آخر ڈوب کر دریائے ہستی سے
کوئی کونا تو کیا اک تار بھی بھیگا نہ دامن کا

مرا آرام پہونچانا گیا اوروں کے ہاتھوں میں
پھر اے پیری زمانہ آ گیا اپنے لڑکپن کا

بہت جب سوچتا ہوں شاد کچھ کچھ یاد آتا ہے
مگر اس زندگی کا خواب تھا وہ بھی لڑکپن کا

سروشِ بیداری

از جناب محمود اسرائیلی

مشرق کا بدل گیا ستارہ ہر ذرہ بنا ہے ماہ پارہ
ہے نام کو ظلمت آشکارہ یہ بھی نہ رہیگی جو رہی ہے
دنیا بیدار ہو رہی ہے

گلشن کا صبا نے رنگ بدلا بلبل نے فغاں کا ڈھنگ بدلا
آئین محاذِ جنگ بدلا اے قوم! مگر تو سو رہی ہے
دنیا بیدار ہو رہی ہے

رفتار جہاں پر اک نظر کر ہر قوم ہوئی ہے صلح پرور
ہے کشتِ مراد بار آور تو تخم عناد بو رہی ہے
دنیا بیدار ہو رہی ہے

ہے بحر حیات ولولہ خیز یارانِ وطن نکل گئے تیز
کہہ کہہ کے تو حرف یاس انگیز اپنی کشتی ڈبو رہی ہے
دنیا بیدار ہو رہی ہے

ہر قوم ہے زندگی کی طالب آزادی و ہمسری کی طالب
تو بادۂ بیخودی کی طالب آنکھیں اشکوں سے دھو رہی ہے
دنیا بیدار ہو رہی ہے

جرأت تھے جو کچھ دکھانیوالے منزل پہ گئے وہ جانے والے
تجھ میں نہ تھے دُکھ اُٹھانیوالے اپنی قسمت کو رو رہی ہے
دنیا بیدار ہو رہی ہے

ہر تارِ نفس ہے سازِ ہستی ہر نغمہ ہے اس کا رازِ ہستی
اے قوم کر امتیازِ ہستی کیوں مفت یہ وقت کھو رہی ہے
دنیا بیدار ہو رہی ہے

نمودِ سحر

(از منشی گورسرن لال ادیب لکھنوی، بی۔اے)

مانیِ فطرت نے کھینچی چرخ پر تصویرِ صبح — لوحِ مشرق پر نظر آنے لگی تنویرِ صبح
عرش سے تا فرش پھیلی عزت و توقیرِ صبح — ذرّے ذرّے سے عیاں ہونے لگی تاثیرِ صبح

صبح کیا ہے آیتِ والشمس کی تفسیر ہے
خواب تھی ظلمت تو یہ اس خواب کی تعبیر ہے

ہو گئے رخصت فلک سے جتنے تھے شب زندہ دار — ماہِ تاباں نے بھی کر لی بند چشمِ انتظار
تیرگی کے ہٹ گئے پیچھے قدم بے اختیار — لٹ گئی آخر عروسِ شب کے گلشن کی بہار

سکۂ زر نیرِ اعظم کا جاری ہو گیا
تیرگیِ شب کی قسمت کا ستارہ سو گیا

اللہ اللہ چرخ پر سلطانِ خاور کا جلال — آنکھ بھر کر دیکھ لے کوئی کہاں اتنی مجال
پردۂ آئینہ سے بھی دیکھ لینا ہے محال — شوقِ نظارہ میں جلتے ہیں نظر کے پر و بال

یہ چمک ایسی تجلّی اُف یہ عالم نور کا
کھاتے ہیں اہلِ نظر دھوکا چراغِ طور کا

الغرض جاری ہوا گردوں سے فرمانِ سحر — سب نے دیکھا محفلِ ہستی کو آنکھیں کھول کر
گو بہت تکلیف سے آنکھوں میں کاٹی رات بھر — قیدِ مژگاں سے رہائی پا گئی آخر نظر

دم کے دم میں اک طلسمِ دلفریبی ہو گیا
نصف عالم جاگ اُٹھا نصف عالم سو گیا

نور کا عالم نظر آتا ہے تا حدِّ نظر — ذرّے ذرّے میں سرایت کر گیا نورِ سحر
مادّے ہی تک نہیں محدود کچھ اس کا اثر — بلکہ عالم وجد کا طاری ہوا ہے روح پر

جاگ اُٹھے جذبات جو سوئے ہوئے تھے رات میں

زلزلہ سا آگیا دنیائے احساسات میں

یوں تو ہر عالم میں ہنگامِ سحر ہے خوشگوار تھی مگر صبحِ وطن کی اور ہی دلکش بہار

پہلے سنتے تھے مگر آتا نہ تھا کچھ اعتبار آہ غربت میں ملا جاتے ہیں یوں لیل و نہار

یہ سہانا وقت ہے اور مَیں وطن سے دُور ہوں

اُڑ کے جا سکتا نہیں اِک بندۂ مجبور ہوں

افسوس اے وطن

از پنڈت اندرجیت شرما (ماچھرہ ضلع میرٹھ)

دورِ خزاں نے لوٹ لیا ہے ترا چمن گُل ہیں نہ یاسمن

اب کس طرح کہوں تجھے پھولوں کی انجمن افسوس اے وطن

بغض و نفاق و کینہ سے اک حشر ہے بپا مسموم ہے فضا

تہذیب رو رہی ہے کہ بگڑا ترا چلن افسوس اے وطن

اخلاص و اتحاد کا نام و نشاں نہیں اِس دَور میں کہیں

ہے کشمکش میں چاک محبت کا پیرہن افسوس اے وطن

گرداب میں بلا کے ہے کشتی حیات کی اس کائنات کی

رنج و غم و ملال کا دریا ہے موجزن افسوس اے وطن

افسردہ ہو کے رہ گیا قلبِ شرر فشاں وہ جوش اب کہاں

جامِ خیال ہی میں نہیں بادۂ کہن افسوس اے وطن

تصویر ہے تو یاس کی حرماں نصیب ہے ملکِ غریب ہے

دنیا کی ہے نگاہ میں اک لاش بے کفن افسوس اے وطن

رُباعیات

(از مولانا سید احمد حسین امجد حیدر آبادی)

پہنچے غفلت میں دام و دد کی حد تک
معلوم ہوئی نہ نیک بد کی حد تک
کھلتی ہیں ضرور، بند آنکھیں اک دن
سوتے رہو مہد میں، لحد کی حد تک

حد نظر روح ہے تن کا پردہ
ہے مانع دید، ما و من کا پردہ
ہو جائیں گے مرتفع حجابات تمام
آنکھوں پہ پڑیگا جب کفن کا پردہ

ہر رات مرا رشک قمر آتا ہے
وہ چارہ گر دردِ جگر آتا ہے
ہے خیمۂ لیل میں قیام لیلےٰ
تاریکی ہی میں نور نظر آتا ہے

شمشیر محبت پہ گلا رہنے دے
ہاں! جان کے ساتھ یہ بلا رہنے دے
امجد شبِ ہجر میں نہ کر بند آنکھیں
وہ آئے گا، دروازہ کھلا رہنے دے

(از منشی بشن سنگھ خوشتر حیدر آبادی)

ساغر کی طرح رنگ کہیں لائے نصیب
شیشہ کی طرح کاش اُبل جائے نصیب
اک کالی گھٹا جھوم کے قبلے سے اُٹھے
گیسو کی طرح آج جو بل کھائے نصیب

ٹوٹے ہوئے ساغر جنھیں ہم سمجھے تھے
پھوٹی ہوئی قسمت کے وہ ٹکڑے نکلے
دکھلا گئی یہ شکست تو بہ انتاد
چکرا کے گرے زمین پہ پیتے پیتے

ہر اوج کو پستی کے برابر سمجھو
خورشید کو ذرہ سے نہ بڑھکر سمجھو
تقدیر جو کھوٹی ہو تو پھر اے خوشتر
پارس بھی لگے ہاتھ تو پتھر سمجھو

سر سبز رہے دہر کا گلشن کبتک
پُر پھولوں سے گلچیں کا یہ دامن کبتک
نزدیک ہے اب وقت خزاں اے خوشتر
غفلت تری او عقل کے دشمن کبتک

کرتا ہے پریشاں جو غم روز شمار
دیتی ہے تسلی تری رحمت ہر بار
کچھ غم نہیں اب اپنے گناہوں کا مجھے
میں بندۂ عاصی ہوں ترا تو غفار

پیکرِ ایثار

(از منشی تلوک چند صاحب محروم، بی۔اے)

ڈھل چکا تھا دن، اور تھا خورشید　　منظرِ ہولناک سے بیزار
کنجِ خلوت تلاش کرنے کو　　گرم رَو تھا وہ جانبِ کہسار
محشرِ کارزارِ "زٹفن" میں　　گرم ابھی کشت وخوں کا تھا بازار
گرچہ کشتوں کے لگ گئے پشتے　　باز آئے نہ جنگ جو زنہار
مینھ برستا تھا گولیوں کا کہیں　　تھی کسی سمت تیغ صاعقہ بار
کہیں بجتا تھا لوہے سا لوہا　　محشر انگیز جس کی تھی جھنکار
سورما دو طرف سے بڑھ بڑھ کر　　آن پر اپنی ہو رہے تھے نثار
کوئی بڑھتا تھا تان کر نیزہ　　کوئی چڑھتا تھا کھینچ کر تلوار
خندقوں میں ڈٹے ہوئے تھے کئی　　کر رہے تھے جو گولیوں سے وار

دشمنِ صلح و آشتی طرفین
دونوں جانب سے گرمیِ پیکار!

سورماؤں میں اک جوانِ حسیں　　سر فلپ سڈنی تھا علم بردار
تھا عزیزِ دلِ زمانہ، کہ تھا　　صاحبِ علم اور خجستہ شعار
ہاتھ اُس نے دکھائے بڑھ بڑھ کر　　قلبِ دشمن کو کر دیا بے کار
بے جگر ہو کے وہ لڑا ایسا　　کٹ گرے اُس کے نیچے دو رہوار
کارِ دشمن تمام کرنے کو　　اور گھوڑے پہ ہو رہا تھا سوار
کہ لگی آ کے ران میں گولی　　استخواں توڑ کر ہوئی جو پار
اُسی گھوڑے پہ آگیا واپس　　خوں میں لتھڑا ہوا بحالتِ زار

حالتِ نزع ہو گئی طاری   تشنگی شعلہ زن ہوئی یکبار
پانی مانگا اشارہ سے اُس نے   کہ بہت کم تھی طاقتِ گفتار
گرچہ نایاب تھا وہاں پانی   لے ہی آئے کہیں سے خدمتگار
ہاتھ میں تھام کر پیالے کو   پانی پینے کو تھا وہ خوش کردار
کہ مقدر نے گل کھلایا اور
رہ گئے ہونٹ خشک صورتِ خار

اِک سپاہی تھا چوُر زخموں سے   لے چلے تھے اُسے اُٹھا کے کہار
وہ بچارا بھی سخت پیاسا تھا   اور تھی اُس کو زندگی دشوار
بسکہ بیتاب تھا، پیالے پر   مُڑ کے ڈالی نگاہِ حسرت بار
سر فلپ نے یہ دیکھکر فوراً   پانی پینے سے کر دیا انکار
اور کہا "جا کے اس کو دے آؤ   مجھ سے بڑھکر ہے یہ اسے درکار"
نہ زباں پر شکایتِ تقدیر   نہ نگاہوں سے یاس کا اظہار
یہ مروت ہے یہ جواں مردی۔
اِس سعادت کا نام ہے ایثار

پارۂ جگر

(از جناب جگر بریلوی۔ بی۔ اے)

برباد ہو رہا ہوں محبت کی راہ میں   عالم تمام ہیچ ہے میری نگاہ میں
اب یاد رہ گئے ہیں فقط دوزخ و بہشت   دیکھے بہت نشیب و فراز اُسکی راہ میں
ہمرنگیٔ ازل دلِ وحدت طلب کہاں   جبتک ہے امتیاز سپید و سیاہ میں
جو تابِ آزمائشِ ہستی نہ لا سکا   تسبیح لیکے بیٹھ رہا خانقاہ میں
یا ہم تھے یا خدا تھا کوئی دوسرا نہ تھا   علم و خرد نے ڈال دیا اشتباہ میں
ہم پر فریبِ رونقِ باطل چلے گا کیا   عالم کو جانتے ہیں غبار اُسکی راہ میں
اس کو فروغِ حسن کہیں یا جمالِ دل   بجلی چمک رہی ہے تیری جلوہ گاہ میں
دنیا سمجھ رہی ہے جنھیں انجمِ سپہر   روشن چراغ ہیں وہ محبت کی راہ میں
دل رہبرِ نشاط یقیں منزلِ نشاط   نارِ جحیم ہے تو جگر اشتباہ میں

کلامِ مہر

(از پروفیسر نارائن پرشاد ورما مہر (گوالیار))

توڑ کر دل ہم کو ناکامِ تمنا کر دیا — کیا کیا یہ اے ستمگر، تو نے یہ کیا کر دیا
کیا تماشا ہے کسی کے جلوۂ دیدار نے — میری چشمِ شوق کو بھی اک تماشا کر دیا
جو نہ دیکھے تھے حسیں ہمکو دکھائے وہ حسیں — اُف رے شوقِ دید، کس کس سے شناسا کر دیا
تو بلائے جاں بھی ہے غارتگرِ ایماں بھی ہے — اک شبابِ حُسن نے اب تجکو کیا کیا کر دیا

مہر یہ تم نے کیا کیا نالے کر کے عشق میں
خود بھی رُسوا ہو گئے اُن کو بھی رُسوا کر دیا

وہم ہوتا ہے نکلنے کا گماں ہوتا ہے — جو نکلتا ہے وہ ارمان کہاں ہوتا ہے
بدگماں تیری محبت نے کیا ہے ایسا — دوست پر بھی مجھے دشمن کا گماں ہوتا ہے
دیکھ کر حُسن کسی کا مری حیرانی سے — جو بیاں ہو نہیں سکتا وہ بیاں ہوتا ہے
تجھ میں کیا دیکھ لیا اسکو کہے کیا کوئی — کہیں یہ راز زباں سے بھی بیاں ہوتا ہے

مہر کو آپ سمجھتے ہیں جو بندہ اپنا
شکر اس بندہ نوازی کا کہاں ہوتا ہے

میری فغاں سے تو ہجر کی شب ادھر کی دنیا اُدھر ہوئی ہے
مگر یہ اُن سے بھی کوئی پوچھے انھیں بھی اس کی خبر ہوئی ہے
اب اور الزام کس کو دیں ہم، نہ اشک بہتے نہ راز کھلتا
ہماری الفت کی پردہ در تو، ہماری ہی چشمِ تر ہوئی ہے
نظر بھی آئی جو دن کی صورت، تو یوں شبِ انتظار آئی
سفید آنکھیں ہوئیں جب اپنی تو ہم نے جانا سحر ہوئی ہے
ہمارے آگے جو آپ جھکی ہے، تو کیوں حیا اس کو ہم سمجھ لیں
لڑی ہے یہ غیر کی نظر سے، تری نظر کو نظر ہوئی ہے
کسیکے دیدار کی تمنا، ہوئی ہے کیا دل میں آج پیدا — یہاں تو مہر اپنی زندگی ہی اس آرزو میں بسر ہوئی ہے

*

اگر چاقو پھسل کر لگ جائے یا کڑھائی الٹ جائے تو زمبک لگائیے

سب طرح کے کٹ جانے جلجانے جھلس جانے وغیرہ کیلئے حیرت انگیز دوا ہے

جب آپکی جلد کو جلنے جھلسنے کٹنے زخم سے نقصان پہونچ جائے یا خفیف خراش سی پھٹ جائے تو یہ سمجھ لیجئے کہ اسی لمحہ سے آپ خطرہ میں ہیں۔ جیوں ہی کہ جلد آزردہ کیجئے گوشت کو ہوا لگتی ہے فوراً دکھائی نہ دینے والے زہریلے جراثیم کا زخمی مقام پر ہجوم ہوجاتا ہے جس سے سوزش شروع ہوجاتی ہے اسلئے کبھی اپنی جلد کی طرف سے بے پروائی نہ کیجئے جھلسنے جلنے یا کسی دوسرے ضرب پر فوراً حیرت انگیز مرہم زمبک لگاکر پٹی باندھ دیجئے جو زخمی مقام کیلئے تریاق صفت سپر کا کام دیتا ہے زمبک درد کا خاتمہ کرتا ہے پیپ پڑنے یا زہرباد کے میلان کا انسداد کرتا ہے اور یقینی طور پر تمام شکایات کو بہت جلد درست کر دیتا ہے زمبک سائنٹفک طریقہ سے کیا طیار کیا ہوا مرہم ہے جسمیں قیمتی جڑی بوٹیوں کے جوہر شامل ہیں جو طبی حیثیت سے بہت مفید ہوتے ہیں زمبک میں ہر قسم کی حیوانی چربی سے پاک ہونیکی ضمانت ہے اور چھاجن۔ کھجلی داد۔ گھاؤ۔ پیروں کی خرابی۔ زہریلے زخم۔ دمبل۔ بواسیر۔ کٹ جانا۔ جلجانا۔ جھلسنا۔ کیڑے کا کاٹنا۔ چھل جانا۔ زخمی پیر وغیرہ کا مسلمہ حیرت انگیز علاج ہے۔ سب انگریزی دوا فروشوں سے ایکروپیہ فی ڈبیہ کے حساب سے ملتا ہے۔ بڑی ڈبیہ کی قیمت سوا دو روپیہ ہے۔

ایجنٹ: مسرز کے۔ بی۔ محمد سعید اینڈ کمپنی مسٹن روڈ۔ کانپور

زمبک

Zam-Buk

ہیرے اور سچے موتیوں کا

سفید سرمہ

مصدقہ

جناب نامی گرامی ڈاکٹر آر۔ کرا پر صاحب بہادر سی۔ آر۔ فیلو آف کیمسٹری لنڈن

آنکھوں کی بیماریوں و ترقی بینائی کیواسطے مفید ہے اور سب سے بہتر زود اثر دوا ہے ملک ویسٹ افریقہ وغیرہ کے معزز ڈاکٹروں و ہندوستان کے نامور حکیموں نے آنکھوں کی بیماری میں اور دوا چھوڑ کر استعمال کیا ہے۔

ہمارے سرمہ کا امتحان اور اسمیں کامیابی

(۱) نگاہ نا پکر ہمارا سرمہ لگائیے دو ہفتہ میں روشنی بڑھجائیگی اور جملہ نقائص چشم دور ہونگے۔

(۲) عینک کی ضرورت نہیں ہوتی۔

(۳) دھند۔ ڈھلکا۔ آنسو بہنا۔ سرخی۔ کھجلی۔ سوزش آنکھوں کے سامنے اندھیرا۔ پلکوں کی اندرونی گوہانی دور ہوتی ہے

(۴) کمزور نگاہ سے تاگا سوئی میں بہت جلد پرو لیجئے۔

(۵) پربال۔ سیل۔ جالا۔ پھولی۔ ابتدائی موتیابند۔ ناخونہ آنکھ کے سامنے ڈورا سا آنا بند ہوجاتا ہے۔ لکھنے پڑھنے سے آنکھ کا تکان۔ درد بہت جلد صاف کرتا ہے۔ اور جملہ امراض چشم کے لئے اکسیر ثابت ہوا ہے۔ قیمت فی تولہ تین روپیہ محصولڈاک ۶/

ملنے کا پتہ

مینیجر نگم کمپنی، نیا چوک، کانپور

ALETRIS
CORDIAL RIO
THE WOMAN S TONIC
الٹراس کارڈی آل یعنی اکسیر نسواں
ڈاکٹر اس کو جسمانی صحت کیلئے بہترین دوا قرار دیتے ہیں
ہر گھر میں اسکا رہنا نہایت ضروری ہے
ماں بہن اور بیٹی کے واسطے بہترین دوائی
RIO Chemical Co.
79 BARROW STREET
NEW YORK (U.S.A)

پچاس سال سے ہندوستانی پیٹنٹ دواؤں کے بے مثل موجد

ہیضہ سے اپنی جان بچانے کے لئے

اصلی عرق کافور

"کافو" (REGD)

ہیضہ۔ گرمی کے دست۔ پیٹ کا درد۔ اور بدہضمی وغیرہ کو دور کرنیکی بے خطا دوا۔ جہاں کہیں ہیضہ پھیلا ہو وہاں ایک یا دو بوند استعمال کرنے سے ہیضہ میں مبتلا ہونیکا ڈر نہیں رہتا۔ ہر ایک گھر اور سفر میں اسے پاس رکھنا ضروری ہے۔

قیمت فی شیشی چھ آنہ ۶؍ محصول تین شیشیوں تک سات آنہ ۷؍

پیشاب اتارنے کی دوا

"یورا" (REGD)

ہیضہ۔ سوزاک۔ جلندھر خواہ اور کسی وجہ سے پیشاب بند یا کم ہو جائے تو "یورا" استعمال کیجئے۔ اس کے صرف دو ہی تین بار کے استعمال سے پیشاب کھل کر صاف آنے لگتا ہے۔

قیمت فی شیشی چھ آنہ ۶؍ محصول سات آنہ ۷؍

آنکھ آنے کی دوا

آنکھ اُٹھنا۔ سوزش۔ کرکرٹ۔ پانی بہنا اور گرد و غبار۔ دھواں۔ دھوپ کی تیزی وغیرہ کی وجہ سے آنکھ کی سُرخی۔ اس کے تین چار دنوں کے استعمال سے جاتی رہتی ہے۔

قیمت فی شیشی نو آنہ ۹؍

محصول دو شیشی تک سات آنہ ۷؍

نوٹ ہماری دوائیں ہر جگہ فروخت ہوتی ہیں ڈاک محصول بہت بڑھ گیا ہے اس لئے اپنے مقامی ہمارے ایجنٹ سے خرید فرمائیں۔ نمونہ صرف ایجنٹوں ہی سے مل سکتا ہے۔

صیغہ نمبر ۶۷ پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ

ایجنٹ کانپور نیا گنج میں محمد حفیظ محمد نصیر صاحب

مکتبہ جامعہ ملیہ | **ہمزاد** (ڈراما) | قرول باغ۔ دہلی

اشتیاق حسین قریشی صاحب ایم۔اے کا وہ دلچسپ ڈراما جس میں کم عمر بیوی اور بزرگوار شوہر کے معاملات قدرے ظرافت آمیز پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اچھی سوسائٹی میں اسٹیج کرنے کیلئے یہ ڈراما بہت مناسب ہے طباعت۔ کتابت۔ کاغذ بہت اچھا یہ اردو کی اُن کتابوں میں سے ہے جو تمام لوازم اشاعت سے آراستہ ہیں ۶/

گناہ کی دیوار (ڈراما)

مصنفہ اشتیاق حسین قریشی صاحب ایم۔اے۔ گناہ بری چیز ہے لیکن شقاوت قلب اور تکبر بدتر ہیں۔ گناہ کی دیوار شاید ٹوٹ سکتی ہے لیکن شقاوت قلب اور تکبر کے بتوں کا توڑنا بہت دشوار ہے۔ یہ ایک باعصمت خاتون کا قصہ ہے جسے کچھ عرصہ تک مجبوراً عصمت فروشی کی زندگی گزارنی پڑی لیکن بالآخر خدا نے اُس کی گریہ وزاری سن لی اور اس زندگی سے نجات دلائی۔ قیمت ۸/

کھیتی (ڈراما)

مصنفہ محمد مجیب صاحب بی۔اے (آکسن) مسلمانوں کی ذہنی اور قومی رہنمائی کے لئے ایک دلچسپ ڈراما۔ مذہب اور اخلاق کس رستے پر چلانا چاہتے ہیں، زمانے کی مصلحتیں، قوم و ملت کی ضروریات سب پر ایک نظر ڈالی گئی ہے اور ایک معیار بھی تجویز کیا گیا ہے جو رہنمائی کے دعویداروں کو پرکھنے میں کام آسکتا ہے۔

قیمت صرف چھ آنہ

پردۂ غفلت (ڈراما)

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔اے۔ پی ایچ۔ ڈی کا وہ ڈراما جو انھوں نے قیام جرمنی میں لکھکر وہیں چھپوایا تھا۔ مسلمان خاندانوں کی معاشرت کی سچی تصویر۔ تعلیم نسواں آزادی نسواں اور پردہ پر مفید بحث۔ دلچسپ ظرافت آمیز اور نتیجہ خیز قصہ ہے۔ طباعت عمدہ۔ قیمت ایک روپیہ ۱۲/

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم بی۔ اے

[جلد] ۵۸ | مئی سنہ ۱۹۳۲ع | نمبر ۵

فہرست مضامین

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت ممالک غیر سے سالانہ ... ششماہی ... ہندوستان کے لئے ششماہی ...

[قیمت] فی پرچہ ...

قیمت سالانہ ...

علمی ذوق رکھنے والے حضرات مندرجہ ذیل کتابیں ضرور منگائیں

بزم خیال
اس میں اردو اور فارسی شعرا کی
مجالس سے لطائف وظرائف اور
بذلہ گوئی و حاضر جوابی کے نمونے
جمع کیے گئے ہیں جو خوش مذاق
حضرات کی تفریح کا بہترین سامان
ہے قیمت ایک روپیہ ۱ع

ہندوستانی تیوہاروں کی اصلیت
اس کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب بی اے
ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بستی نے
ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور انکی جغرافی
کیفیت نہایت واضح اور آسان زبان
میں لکھی ہے اس کے ساتھ ہی ہندوستان
کا اخلاقی اور تمدنی انتظام اور
ہندو تیوہاروں کی ضرورت پر اظہار
خیال کیا ہے مجلد ۱ر

بہرام کی رہائی
نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری کے بعد اسکا
پڑھنا نہایت ضروری ہے قیمت ۱۲ر

خاک پروانہ
منشی پریم چند کے تازہ ترین چودہ
منتخب مضامین کا مجموعہ۔ پریم چند
صاحب کے افسانے کسی تعارف کے
محتاج نہیں۔ قیمت ایک روپیہ

انتخاب اودھ پنچ
اخبار اودھ پنچ لکھنؤ کے ان مضامین
کا مجموعہ جو ۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۰ء تک اس میں
شائع ہوئے تھے علاوہ ازیں بہت
سا تفریح کا سامان بھی موجود ہے قیمت ۱۲ر

خیالات عزیز
مجموعہ مضامین مولوی عزیز
مرزا صاحب جس کی باضابطہ تشریح
کی گئی ہے حجم دو سو صفحات۔
ٹائٹل خوشنما رنگین ہے لکھائی
چھپائی اعلیٰ مع تصویر مصنف
قیمت
صرف دو روپیہ ۲ر

گلزار داغ
فصیح الملک جناب داغ دہلوی کا مشہور
و مقبول دیوان ہے جو حال میں حسن
و خوبی کے ساتھ شائع ہوا ہے داغ
صاحب کا کلام کسی تعارف کا محتاج
نہیں قیمت بلحاظ دیوان صرف ۱۲ر

مثنوی سحر
یعنی شکنتلا و دشینت منظوم حضرت
سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعلیٰ
اول ایڈیشن کی قیمت ۱ر دوسرے
ایڈیشن کی قیمت جسکی مصنف نے
نظر ثانی بھی کی ہے صرف ۱۲ر

مرقع ادب
حصہ اول و دوم مرتبہ جناب
صفدر مرزا پوری اس میں ہندوستان
کے مشہور انشا پردازوں و شعرا کے
خطوط جمع کیے گئے ہیں جو انھوں
نے اپنے احباب و عزیزوں کو لکھے ہیں
حصہ اول ۱۲ر حصہ دوم عار

ملنے کا پتہ:- مینیجر زمانہ بک ایجنسی۔ کانپور

زمانہ

جلد ۵۸ — مئی ۱۹۳۲ء — نمبر ۵

مذہب کا مستقبل

(از منشی اقبال ورما سحر ہتگامی)

انگریزی کی شہرہ آفاق لیڈی ناولسٹ میری کوریلی نے زسکا نامی ناول میں ایک مقام پر یہ لکھا ہے کہ:-

"انسان دنیا بھر کی برائیوں کا خلاصہ اور دنیا بھر کے امکانی اوصاف کا مجموعہ ہے۔ لیکن خلاصہ قوی تر اور مصروف کار ہے اور مجموعہ محض خواب ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہو جاتا ہے"[1]

آجکل بالعموم ساری دنیا میں ہم کو یہی بات نظر آتی ہے، بدقسمتی سے ہمارا ملک بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، ہاں فرق صرف یہ ہے کہ دنیا تو کم و بیش علانیہ طور پر مذہب کو بالائے طاق رکھکر افعال قبیحہ کی مرتکب ہو رہی ہے اور ہندوستان "نام نہاد" طریقہ پر مذہب کا سہارا لیتے ہوئے اور مذہب ہی کے پردہ میں لامذہبی کا شرمناک نظارہ پیش کر رہا ہے، دونوں کی ایک ہی غایت ہے، مگر ایک میں آزاد قوم کی فطری راستبازی اور دیانتداری ہے اور دوسرے میں غلام قوم کی لازمی مکاری اور دغابازی! آخر الذکر کا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں جس سرزمین کا ذرہ ذرہ مذہب کے نور سے منوّد

"A man is the essence of all that is evil; the possibility of all that [1] is good. But the essence is strong and works, the possibility is a dream which dissolves in the dreaming

ہو، وہ اُس نور کو یکایک ناپید تو نہیں کر سکتی، البتہ حالات گرد و پیش سے متاثر ہو کر کچھ عرصہ کے لئے آنکھیں بند کر کے تاریکی میں ضرور مبتلا ہو سکتی ہے۔ اسی تاریکی میں وہ اُس جھلملاہٹ کو دیکھتی ہے جو اجالے کے بعد آنیوالے اندھیرے میں دفعتاً نظر آتی ہے، اور زیادہ گہری تاریکی میں پڑ کر لغزشیں کھاتی ہوئی خود اپنی نگاہوں کو دھوکا دینے کے ساتھ دنیا کی نگاہوں کو بھی دھوکا دینے کی کوشش کرتی ہے۔

آئے دن کی لامذہبی نے دنیا میں عجیب ہیجان برپا کر رکھا ہے، کافر ہو یا دیندار ہر ایک اُفتاں و خیزاں اُسی راستہ پر دوڑتا ہوا چلا جا رہا ہے جس میں قدم قدم پر خطرہ ہے۔ اس شیطانی انبوہ میں جو خدا پرست لوگ بھی پھنس گئے ہیں وہ بھی اُس کے مسموم اثر سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ انگریزی کے نامور مصنف جان مارلے نے اپنی کتاب "Compromise" نامی میں لکھا ہے کہ:-

"لوگ اپنی تقریر سے تو خدا کا وجود تسلیم کرتے ہیں مگر اپنے اعمال سے اُس سے انکار، ساتھ ہی وہ اپنے دل میں ایک ایسا مذموم شبہ رکھتے ہیں جو تسلیم و انکار ہر دو کو مشتبہ بنا دیتا ہے۔"[1]

ان ساری بے اعتدالیوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ انسان نے مذہب سے منکر یا منحرف ہو کر اپنے لئے ایک ایسا اضطراب آگیں ماحول تیار کر لیا ہے جس میں نہ وہ خود ہی آرام و سکون کے ساتھ رہ سکتا ہے اور نہ دوسروں کو آرام و سکون کے ساتھ رہنے دیتا ہے۔ ہندوستان میں تو فرقہ وارانہ عناد نے جو آفت برپا کر رکھی ہے اُس سے سبھی لوگ بخوبی واقف ہیں، مگر مہذب یورپ بھی اس عناد سے بری نہیں ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اُس کی حالت زیادہ قابل رحم ہے۔ البتہ وہاں کے فرقے تہذیب نو کے قاعدوں کے مطابق نامزد کئے گئے ہیں، اس لئے اُن کے نام سننے میں بھلے لگتے ہیں، وہاں ٹھوس فرقہ وارانہ جدال و قتال کا زمانہ گزر گیا جب مذہب کے نام پر لامذہبی کے خوفناک کام کئے جاتے تھے اور لاکھوں بندگان خدا کا خون بہایا جاتا تھا، اب اُس کے بجائے کمیونزم، انارکزم، سوشیلزم وغیرہ وغیرہ کا زمانہ ہے جنھوں نے اس وقت دنیا میں وہ مہلک کشمکش برپا کر رکھی ہے کہ خدا کی پناہ! یوں تو عموماً ہر شے کے روشن و تاریک پہلو ہوا کرتے ہیں، اور اس لحاظ سے اُن سب طریقوں میں کچھ خوبیاں ضرور ہی ہونگی۔ مگر ہم تو ایک موٹی سی بات جانتے ہیں کہ ابھی تک ان طریقوں سے بنی نوع انسان کے قلبی اطمینان کی کوئی معقول صورت نہیں نکل سکی، ایک بات

---

[1] "They speak as if they affirmed and they act as if they denied and in their harts they cherish a slovenly sort of suspicion that they can neither deny nor affirm."

اور ہے۔ اِن طریقوں" کا دائرہ عمل صرف یورپ ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ دنیا کا ہر خطہ کم و بیش طریقہ پر عملاً وطبعاً ان سے متاثر ہوا ہے اور ہوتا جا رہا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسانی دماغ اصلاح و ترقی کی ہوس میں طرح طرح کے منصوبے باندھتا رہتا ہے، اس لئے طریق کار و خیالات میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے، مگر اس تگ و دو کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ کشمکش میں زیادتی ہو کر حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔

مختلف الخیالی انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اسی کے ہاتھوں مختلف مذہبی فرقوں کی نشو و نما ہوئی، اختلافات نے رفتہ رفتہ زیادہ خطرناک صورت اختیار کی تو مذہبی جنگ و خونریزی کی شکل نمودار ہوئی اسکے بعد ایک دوسرے دور کا آغاز ہوا، اس تباہی و بربادی کا سارا الزام مذہب کے ماتھے پر منڈھا گیا اور دنیا کو مصائب سے نجات دینے کا یہی وسیلہ سوچا گیا کہ یا تو مذہب کی جانب سے بے پروائی برتی جائے یا ترک مذہب کا راستہ اختیار کیا جائے۔ مگر جس افتراق نے مذہبی فرقوں اور اُن کے ذریعہ سے پیدا ہونیوالے مذہبی ہنگاموں کو جنم دیا تھا وہ اُس وقت بھی باہمی منافرت کی شکل میں برابر قائم رہا۔ اور نام نہاد مذہب کی فرضی روحانیت نے جن خالص مادی جذبات کو مشتعل کر رکھا تھا اُن کی آماجگاہ بننے کے لئے سیاسی فضا تیار کی گئی اور اُسی فضا کی مناسبت سے اُن جذبات کے مختلف پہلوؤں کو لیکر مذکورہ بالا متعدد طریقے وضع ہوئے جن کے دباؤ میں پڑ کر آج انسان کی ہڈیاں تک پسی جا رہی ہیں۔ عموماً ایشیا اور خصوصاً ہندوستان کی امپریلزم اور کیپٹلزم کے ہاتھوں جو درگت ہو رہی ہے اس کا اعادہ فضول ہے۔ اب اگر مذکورہ بالا انقلابی مدارج کے موافق اس سرزمین پر دیگر کمونزم وغیرہ کا بھی غلبہ ہو گیا تو سمجھ لیجئے کہ وہ ساری آفتیں ہمارے سر پر آموجود ہونگی جو انتہائی لامذہبی و مادیت کا نتیجہ ہیں۔ اس کے آثار ابھی سے رونما ہو رہے ہیں اس لئے مصلحان قوم کا اس وقت سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ جب وہ مروجہ مذاہب یا رسم و رواج کی اصلاح کے درپے ہوں تو اس کے ساتھ ہی وہ نئے طریق عمل کے ان نقائص سے بھی خبردار رہیں جو مذہب کے اعلیٰ اغراض کے منافی ہوں۔ درحقیقت اُس آزادی کی کوئی وقعت نہ ہونا چاہیئے جو محض انسانی اجسام تک محدود ہو اور جس سے روح کے لئے زیادہ سے زیادہ بندشوں کا سامان مہیا ہو۔

اس قدر لکھنے کے بعد یہ ضروری ہے کہ مذہب کی بھی کسی قدر تشریح کر دی جائے تاکہ فی زمانہ مذہب کے نام سے چونک پڑنے والے یا مذہب کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑنے والے ہر دو قسم کے

اصحاب کے دلوں میں کسی قسم کی غلط فہمی نہ پیدا ہو، مذہب کا تعلق ایک طرف تو خدائے پاک سے
ہے جو ساری نیکیوں کا منبع ہے اور دوسری طرف انسان ہے جس کو نیکیوں کے حصول کی
اہلیت خدائے پاک کی جانب سے عطا کی گئی ہے۔ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ انسان کا وجود دنیا
ہی میں ہوا ہے اور اس کو ہمیشہ دنیا ہی میں رہکر اُن نیکیوں کا مواد اپنے اندر فراہم کرنا ہے جو انسان
اور خدا کے مابین باہمی قربت کے پیدا ہونے میں معاون ہوتے ہیں۔ پس مذہب اُن متعدد فرائض
کے مجموعہ کا نام ہے جن کی انجام دہی پر دنیا و عقبیٰ دونوں کی محفوظیت کا انحصار ہے۔ انسان ہر
دو کو اپنے لئے بھی محفوظ بنا سکتا ہے جب وہ دیگر انسانوں کے لئے ویسا ہی کرنے کی کوشش کرے
بلکہ واقعی بات تو یہ ہے کہ دنیوی وابستگی کے خیال سے تو اس کے فرائض کا تعلق دنیا کے جملہ جانداروں
کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ سنسکرت زبان میں مذہب کا مترادف دھرم ہے جس میں مذہب کی نسبت
کہیں زیادہ جامعیت ہے، دھرم کے لغوی معنی ہیں "جو دھارن کرے" یعنی جس کی بدولت اپنے
وجود کا قیام یا اپنی حفاظت ممکن ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کا مفہوم خودغرضانہ قیام یا حفاظت نہیں ہو سکتا
ایسے ادنیٰ مفہوم کے مطابق عمل کرنے کی صلاحیت تو ادنیٰ طبقہ کے حیوانات بھی رکھتے ہیں پھر اُن
میں اور انسان میں فرق ہی کیا ہو سکتا ہے؟ اسی لئے تو مشہور و معروف انگریز فلاسفر لارڈ بیکن
نے کہا ہے کہ "یقیناً انسان اپنے جسمانی نقطۂ خیال سے حیوانات کا ہمجنس ہے اور اگر وہ اپنی
روحانیت کے ذریعہ خدا کا ہمجنس بننے کی کوشش نہیں کرتا تو وہ ایک ادنیٰ اور ذلیل مخلوق
ہی ہے[۵۱]۔"

بہرحال انسان کو ان باتوں کو اپنے خیال میں رکھتے ہوئے فرائض متعلقہ کی ادائی میں مصروف
ہونا چاہیئے۔ ہماری فطری مختلف الخیالی انسانی فرائض کے تعبیر میں اختلاف پیدا کر سکتی ہے مگر
مذہب کا جو معیار ہم نے اپنے سامنے رکھا ہے اُس کو مدنظر رکھتے ہوئے کم از کم اسقدر متحد الخیالی
کی گنجائش ضرور ہے کہ فی الجملہ انسان کی اخلاقی و روحانی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے اور
وہ دوسروں کو سکھی بنا کر خود سکھ سے رہ سکے، کیونکہ انسانوں کا یہ بھی معمول نہیں کہ ہر ایک بات
پر خواہ مخواہ اختلاف ہی ہو۔ بعض باتوں میں اختلاف ہوتے ہوئے بھی بعض امور میں اتحاد ہو سکتا

---

۵۱ "Certainly man is of a kin to the beasts by his body; and if he is not of a kin to God by his spirit he is a base and ignoble creature."

ہے۔ چنانچہ اس وقت کے مروجہ مذاہب میں بھی کتنے ہی امور ایسے ہیں جو سبھی لوگوں کو مشترکہ تسلیم ہیں یہی امور بنی نوع انسان کے لئے ایک مشترکہ مذہب کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ یہی مشترکہ مذہب انسان کا وہ سچا مذہب ہو سکتا ہے جو دنیا و عقبیٰ دونوں میں اُس کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس میں ایک پُرلطف بات یہ بھی ہے کہ کسی شخص کی خواہ وہ دہریہ ہو یا دیندار یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ اس مذہب کا پیرو ہونے سے انکار کر سکے۔ اس طرح اس واحد انسانی مذہب کو فروغ دیتے ہوئے ہم یہ ثواب بھی حاصل کر سکتے ہیں کہ خدا کی ہستی سے انکار کرنیوالوں کو بھی ہم کم از کم ثانوی طریقہ پر خدا پرست بنا سکیں گے۔ ایک بات اور:۔ اس جدید مذہب کی تعمیر و تبلیغ میں یہ ضروری نہیں کہ ہر مشترکہ اصول کو مذہب کا جزو لاینفک مان لیا جائے۔ ہم نے دھرم کی صورت میں مذہب کی تعریف کر کے ایک ایسی کسوٹی سامنے رکھ دی ہے جس پر سونے کی پرکھ ہو سکتی ہے اور اُس کی تمام کثافت جو امتداد زمانہ کے سبب اُس میں شامل ہو گئی ہے، مصالحت آمیز منطق کی تیز آگ میں تپا کر دور کی جا سکتی ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر مذہب کی ایسی ضرورت ہی کیا ہے جو اس کے لئے اس قدر دردِ سر مول لیا جائے۔ اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کو مذہب کی ضرورت ہو یا نہ ہو مگر مذہب کو تو بے شک انسانوں کی ضرورت ہے۔ آپ مذہب کو دھرم کے معنی میں دیکھئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ اُس سے کون بچ سکتا ہے؟ دھرم تو محیط کل ہے۔ وہ ساری کائنات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور اُس سے باعتبار نوع برابر کام لیتا رہتا ہے۔ وہ انسانوں کے لئے چند انسانی فرائض کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ مگر انسان اپنے فعل میں خود مختار ہے پس ادائے فرض میں قاصر بھی ہو سکتا ہے جس کا خمیازہ اُسے "واپسی عمل" کی شکل میں بھگتنا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں کیا یہ ہمارا فرض نہیں ہے کہ عمل کو دھرم کے مطابق بنا کر "واپسی عمل" کی زد سے بچنے کی کوشش کریں؛ ایک انگریز عالم کا قول ہے کہ "قدرت کو اپنا تابع بنانے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ انسان قدرت کا مطیع ہو جائے۔" اس قول کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہم جو کچھ کر سکیں بہتر ہے۔ خواہ ہم اس تدبیر کو دھرم کہیں یا مذہب یا کچھ اور۔ پھر اگر ہم اُسی مذہب کے بانی کی حیثیت سے خدا کی ہستی کے معترف ہو کر اپنی تدبیر مذکورہ میں زیادہ کامیاب ہو سکیں تو اس میں ہمارا بگڑتا ہی کیا ہے؟ ترک مذہب کا خیال بالکل بے معنی ہے، کیونکہ ہمیں اسے کسی نہ کسی حد تک ہر حالت میں ماننا ہی پڑے گا، اور جس حد تک ہم اُس سے منحرف ہونے کی کوشش کریں گے اُسی حد تک غلطیوں کے مرتکب ہونے کا امکان

ہوگا یعنی ہم جس حد تک مذہب کے معتقد ہوں گے اُسی حد تک ہم ظاہرا دہریت پسند ہوتے ہوئے بھی باطناً خداپرست کہلائے جانے کے اہل قرار پائیں گے۔ لیکن ہم خداپرست یا مذہب دار کہلایا جانا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھیں یا نہ سمجھیں، پھر بھی خدا اور مذہب کو آجکل کی سطحی نگاہوں سے دیکھکر اُن سے ڈرکر بھاگنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں ہر حالت میں نڈر ہوکر واقعات کا مقابلہ کرنا چاہیئے

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اولین مقابلہ کے لئے دنیا میں کچھ نہ کچھ تیاری بھی ضرور ہو رہی ہے اول تو دنیا کی چند برگزیدہ ہستیاں عام دُنیوی رجحان سے مغائرت کرتی ہوئی مذہبی روحانیت کی اشاعت میں منہمک ہیں۔ اسکے علاوہ زمانہ حال کی انتہائی لامذہبی کے تاریک مطلع میں بھی ہمکو حقیقی مذہب کی دُھندلی سی جھلک نظر آرہی ہے۔ اُن جدید سیاسی تحریکوں میں جن کی بدولت اس وقت دنیا کی کایا پلٹ ہورہی ہے، ہمیں اُس انسانی کوشش کا سراغ مل رہا ہے جو مذہب کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے اور اُس کے مطابق عمل پیرا ہونے کے لئے ہورہی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی ہم کو اُس کوشش میں بہت سی ایسی قابل گرفت خامیاں نظر آرہی ہیں جن سے دل بے ساختہ متنفّر ہوتا ہے، مگر یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ انقلاب کی حالت میں ایسا ہونا لازمی ہے۔ جب کوئی عمل اپنی انتہائی حدتک ہوچکر قانون قدرت کے موافق رجعت پذیر ہوتا ہے تو وہ اپنے دَورِ اولین کی بہت سی باتوں کو دُہراتا بھی جاتا ہے، اور متواتر تجربات سے کچھ سیکھتا بھی جاتا ہے۔ آجکل کچھ ایسی ہی کیفیت رونما ہورہی ہے، مگر جب ان تحریکات کی باہمی رگڑ سے پیدا ہونیوالی چنگاریوں کا ہجوم ایک بھڑکتے ہوئے شعلہ کی صورت اختیار کریگا اُس وقت سارے عیوب و نقائص اُسی شعلہ میں جلکر خاک سیاہ ہوجائیں گے۔ جیوں جیوں ارتقائی کوشش کی بدولت انسانی طبائع سے تعصب، تنگدلی، جہالت، خودغرضی، نفرت، انتقام، خونریزی، بہیمیت وغیرہ دُور ہوکر اُن جذبات کی ضدّین کا ظہور ہوگا تیوں تیوں حقیقی انسانی مذہب کا انکشاف ہوتا جائیگا، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آئیگا کہ اُس مذہب کے سراپا منکشف ہوجانے پر دیگر مذاہب یا عقائد کی خامیوں کے ساتھ خود اُنکا بھی خاتمہ ہوجائیگا۔ اس وقت انسان ایک عالمگیر واحد مذہب کا پیرو ہوگا جو دیکھنے میں چاہے جدید ترین معلوم ہو لیکن جو دراصل مذہب یا دھرم کے قدیم ترین اصولوں پر مشتمل ہوگا اور جسکی بدولت یہ ممکن ہوگا کہ انسان خدا کی تمامی مخلوق کی محبت کے ذریعہ خدا تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا اور اس طرح انسانی زندگی کو کامیاب بناسکے گا۔

آخر میں ہم اتنا اور عرض کردینا چاہتے ہیں کہ مذہب کے اس خوشگوار مستقبل کی تعمیر میں ہندوستان کو اپنی روایات قدیم کے مطابق سب سے زیادہ حصہ لینا چاہیئے۔ دیگر ممالک مذہب

کو سیاسیات کا تابع بناکر مذہب کی اصلی منزل پر پہونچنا چاہتے ہیں، مگر انہیں اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ مگر ہندوستان بحالت موجودہ مذہب کی رہنمائی میں سیاسی مساعی کے ذریعہ اسی منزل پر پہونچنے کی کوشش کر رہا ہے، جہاں وہ خود کو دنیا کی رہنمائی کا اہل ثابت کرے گا۔ اس کے لئے ہم کو عہد حاضرہ کے بزرگ ترین انسان مہاتما گاندھی کا ممنون ہونا چاہیئے، جن کی اعلیٰ ترین شخصیت میں روحانی ادعمان اور تبلیغی مدابیر کا بہترین اجتماع ہوا ہے۔

عورت

(۱) عورت کو اُس کی کم فہمی کے باعث معاف کر دینا چاہیئے (رسٹل)

(۲) عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ ہم اس کی نسبت کچھ ذکر ضرور کریں، خواہ وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو (بریگیرو)

(۳) اگر عورت پر قابو چاہو تو خودداری اختیار کرو۔

(۴) عورتیں اگر انتقام نہ لے سکیں تو بچوں کے مانند رونے لگتی ہیں۔

(۵) اے عورت! جس طوفان میں آدمی مضطرب ہو جاتا ہے وہ تیرا ہی برپا کیا ہوا ہوتا ہے (روسو)

(۶) عورت میں خودستائی کا مادہ بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے (اسٹیم ڈی سٹیل)

(۷) عورتوں میں ایک دوسرے سے جو تنفر ہوتا ہے اس کا باعث مرد ہی ہے۔

(۸) عورت اور بدمزاجی کا ساتھ ہے۔ (میرنڈا)

(۹) عورتیں جیسے جیسے عمر رسیدہ ہوتی جاتی ہیں اُن میں بہانہ سازی بڑھتی جاتی ہے

(۱۰) اے کمزوری تیرا نام عورت ہے۔ (شیکسپیئر)

(۱۱) عورت آدمی کو سدھانے کے لئے پیدا ہوئی تھی مگر یہاں رہکر اپنی زندگی کا مقصد بھول گئی۔

(ماخوذ) سید اظہر حیدر۔ پیشی تق

بھاگوت کے فارسی تراجم

(از مولوی فاضل پروفیسر مہیش پرشاد لیکچرار عربی و فارسی ہندو یونیورسٹی بنارس)

اہل ہنود جن کتابوں کو متبرک تسلیم کرتے ہیں اُن میں سے اٹھارہ پوران بھی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان پورانوں میں سے ہر ایک کی نوعیت جداگانہ ہے اور ہر ایک اپنی نوعیت کے اعتبار سے خاص شہرت رکھتا ہے لیکن تمام پورانوں میں جس قدر شہرت شری مد بھاگوت پوران نے حاصل کی ہے، درحقیقت کسی اور پوران کو نصیب نہیں ہوئی ہے۔

عام طور سے تمام پورانوں کی تصنیف کا سہرا شری ویاس جی مہاراج کے سر پر باندھا جاتا ہے اور ان کی تصنیف کا وقت مہابھارت کے بعد کا زمانہ مقرر کیا جاتا ہے جو اب سے تقریباً پانچ ہزار سال پہلے کا ٹھہرتا ہے مگر شری سوامی دیانند جی نے اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہونچا دیا ہے کہ شری بھاگوت دراصل بوپ دیو پنڈت کی تصنیف ہے جسکو گذرے ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال ہوئے ہیں مکمل شری مد بھاگوت فی الواقع ایک ضخیم کتاب ہے یہ عموماً بھاگوت کے ہی نام سے بھی موسوم ہے۔ عوام الناس میں اس کے کتھا کی چرچا آج کل بھی بہت زیادہ ہے۔ بعض بعض مقامات پر بڑی دھوم دھام کے ساتھ اس کی کتھا ہوتی ہے۔ اور یہ رواج کئی سو برس سے متواتر جاری ہے اسی قدیم و زبردست رواج کا سبب ہے کہ فارسی کے کئی علم دوست اصحاب نے نثر یا نظم میں اسکو کلیۃً یا جزاً فارسی کا جامہ پہنایا ہے، چنانچہ بعض نسخے شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور بعض نہایت مختصر ہیں۔ ذیل میں ان نسخوں کا حال مختصر پیش کیا جاتا ہے جو میری نظروں سے گذرتے ہیں

(۱) شری بھاگوت کے نام سے ایک ضخیم منظوم کتاب ہے اس کا سنہ تالیف سمبت ۱۸۰۰ بکرمی ہے اور جناب لالہ امانت رائے صاحب المتخلص بہ امانت کی تصنیف ہے اس کے مقبول خاص و عام ہونے پر لالہ صاحب موصوف نے فارسی میں رامائن کا بھی مکمل ترجمہ کیا تھا۔ یہ منظوم بھاگوت (بالتصویر) منشی نولکشور صاحب کے نامی مطبع لکھنؤ سے ۱۸۷۸ء میں شائع ہو چکی ہے۔ ضخامت معمولی تقطیع کے ۱۷۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

شری مدبھاگوت کے دہم اسکندھ (فصل) میں مذکور ہے، ایک بار شری نند جی مہاراج امبکا دیوی
کی پرستش کے لئے گئے۔ وہاں ایک افعی جانگداز سری نند جی کے پیر میں لپٹ گیا مگر سری کرشن جی
مہاراج کے باعث نجات حاصل ہوئی چنانچہ اس حادثہ جانکاہ کو صاحب بھاگوت نے ان الفاظ میں
بیان کیا ہے :۔

رفتن نند بے عزم پرستش در دیر و گشتن افعی بہ زہر پا لیٹ پیچاں

حقیقت دال رمز دور ایام — چنیں ریزد مے تحقیق در جام

کہ مست نشئہ معنی سری نند — طلبگار بقائے عمر فرزند

بآئین ہمہ ظاہر پرستاں — کہ ہستند از شراب رسم مستاں

بہ بت خانہ برائے طوف روکرد — حصول مطلب دل آرزو کرد

بہ پیش بت کہ نامش امبکا بود — سر ہر موزبان مدعا بود

چو ماہ نو ہمہ تن سجدہ تمثال — برائے آفتاب اوج اقبال

پس آنگہ جانب دیر مہادیو — رواں شد با دل بے شبہ و ریو

رفیقانش برنگ سایہ ہمراہ — براہ دوستی ہر یک ہوا خواہ

بسیر کوہ و صحرا سر کشیدند — چو شب شد در مقامے آرمیدند

نقاب عنبریں چوں شب برو کرد — ہجوم خواب بر مردم غلو کرد

نہ کس را ہوش از بالین و بستر — معطل ماند از جنبش چو پیکر

زبا خواب مژگاں گشت سنگیں — نگہ در دیدہ فرش خواب شیریں

درں احوال بے ہوشی شب تار — گذشتہ از کمر چوں طرۂ یار

سیہ مارے ز سرتا پا پر از زہر — چو زلف خوبرویاں آفت دہر

بپائے نند چوں زنجیر پیچید — چو دود آہ با تاثیر پیچید

گراں شد پائے او در عالم خواب — چو دوش اہل دنیا زیر اسباب

(۲) یہ ایک قلمی منثور نسخہ ہے جو راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے۔ اس میں تمام بھاگوت کا
خلاصہ ہے۔ کل ۳۸۴ صفحات کلاں کا حجم ہے۔ یہ کس کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور کب تیار ہوا ہے
ان امور کی بابت کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہاں اس نسخہ کے اخیر میں جو عبارت مندرج ہے وہ اس امر کی
مظہر ہے کہ رائے سکھ لال بہادر کوئی صاحب بنارس میں کالکا جی کے پاس رہتے تھے۔ ان کے

ساتھ ان کے چھوٹے بھائی لالہ ہرچرن داس بھی رہتے تھے، انھوں نے اس نسخہ کو ۱۲ جمادی الاول ۱۲۱۳ھ مطابق کاتک سدی چتر دشی سمبت ۱۸۵۵ بکرمی روز سہ شنبہ کو لکھکر تمام کیا تھا۔

بھاگوت کے جس واقعہ کا بیان پہلے کیا جا چکا ہے وہ اس نسخہ میں محض چند مختصر الفاظ میں ہے لہذا بطور نمونہ یہ اقتباس کتاب کی ابتدا سے پیش کیا جاتا ہے۔

سری گنیش آیہنمہ

چوں نارایَن جیو برہمارا از ناپھ کنول پیدا نمود چہار اشلوک بہ برہما گفتند و آں چہار اشلوک با برہما بمقدار عقل خویش بنارد دنارد بمقدار عقل خود بہ بیاس و بیاس بموافق عقل و فراست خویش بستار نمود۔ اول بیاس میگوید کہ دھیان نارایَن بکنم کہ ہر دے نرمل شود بعد از ہر دے نرمل بھاگوت گویم۔ اول استت نارایَن میکند کہ آدونت و مدھ شما ہستند و او پور کہ کرچوں مہا پرلے خواہد شد آن بھگوان خود خواہد ماند

اس اقتباس کے مانند تمام کتاب میں سنسکرت آمیز عبارت ہے اس سبب سے قیاس اس امر کا مقتضی ہے کہ اس فارسی خلاصہ کے مصنف کوئی ہندو صاحب ہی ہیں۔

(۳) یہ نسخہ گیان پریس گجرانوالہ (پنجاب) میں ۱۸۷۰ء میں طبع ہوا تھا، چھوٹے سائز کے صرف ۱۱۶ صفحوں پر ہے، اس کے بھی مصنف و سنہ تصنیف کا کچھ پتہ نہیں چلا۔

بہت سے ہندوؤں کا اعتقاد واثق ہے کہ قادر مطلق نے بعض موقعوں پر اوتار لیا ہے یعنی صورت مجسم اختیار کی ہے، اور وہ مختلف موقعوں پر مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا ہے۔ چنانچہ بودھ اوتار کے متعلق فصل نہم میں جو عبارت ہے اس کے کچھ الفاظ بطور نمونہ درج ذیل ہیں:-

"گویند کہ غرض از بودھ اوتار آں بود کہ جہانیاں را از عقائد نیکو خبر دہد و طریق ایزد پرستی را شائع گرداند در آخر دواپر جگ بموضع گیا کہ معبد ایں طائفہ است کارساز حقیقی در رحم زنے برہمنی کہ انجنی نام داشت مظہر اوصاف کمال خود ساخت۔ بعد از ظہور مادر و پدر او را موسوم بہ بودھ گردانیدہ

(۴) اس میں صرف دسویں اسکندھ (فصل) کا بیان فارسی نظم میں مختصراً ہے۔ چندرمن نامی کوئی پنڈت جی تھے انھوں نے اسے ۱۱۰۶ھ / ۱۶۹۴ء میں نظم کیا تھا اس کے شائع ہونے کی نوبت غالباً ابھی تک نہیں آئی۔ اس کا ایک نسخہ کارمیکل لائبریری بنارس میں ہے، حجم کل ۴۰۰ صفحات خورد ہے اور جنوری ۱۸۶۱ء کا لکھا ہوا ہے اور خوشخط ہے۔

بھاگوت کے جس واقعہ کا ذکر سب سے پہلے کیا جا چکا ہے اس کی ترجمانی اس مصنف نے ان الفاظ

میں کی ہے:۔

رفتن نند و سائر گوپ و گوالاں برائے پرستش دیبی و گزیدن مار پای نند را و خلاصی نند از دست مبارک کشن

اے سرو بہار کامرانی — وے زینتِ تاج خسروانی
یک روز کہ نند باہمہ ہا — از بہر طوافِ دیر آنہا
رفتند بچشمۂ سرستی — از شوق ہمہ بہ بت پرستی
چوں دیر کشید شب در آنجا — ماندند بخواب خوش سراپا
در نیم شبے سیاہ مارے — خونخوار و مہیب پر شرارے
پیچید بپائے نند در دم — افتاد غریو زاں ہمہ دم
در سخت بلا شدہ گرفتار — بودہ شدہ گریزہ ازاں مار
آں ہر ہمہ باز خویش حیراں — بودند ازاں بلا پریشاں
فریاد بکشن ز اضطراری — زدند دراں بہ بے قراری
کاں مایۂ جاں برس بفریاد — زیں مار بکن خلاص و آزاد
جز ذات تو نیست غمگسارم — زیں مار سیاہ دل فگارم
بیدار چرا نمی شوی تو — آتش زدہ بہر بنِ مو

(۵) یہ بھی صرف دسواں اسکندھ منظوم ہے۔ ہنوز شائع نہیں ہوا ہے۔ اس کا ایک نسخہ محررہ ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰ء) سنٹرل ہندو ہائی اسکول بنارس کی لائبریری میں ہے۔ معمولی سائز کے تقریباً ایک ہزار صفحات ہیں اور اشعار کی تعداد ۱۰۳۵۴ ہے۔ اس نسخہ کے مصنف لالہ نیتیانند صاحب المتخلص بہ تمنا ہیں وہ ماتھر کایستھ تھے ان کے آباواجداد کا اصلی وطن متھرا تھا جس کو چھوڑ کر وہ دہلی اور بعدہٗ لکھنؤ پہنچے تھے، جہاں ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۶ء میں جناب تمنا صاحب نے بھاگوت کے دسویں اسکندھ کو نظم کیا تھا بھاگوت کے جس حادثے کی ترجمانی کا اظہار پہلے کیا جا چکا ہے اسی واقعے کو اس نسخے سے بھی نقل کیا جاتا ہے تاکہ ارباب سخن کو معلوم ہو جائے کہ ایک ہی امر کو مختلف حضرات نے مختلف اوقات میں کس طرح ادا کیا ہے۔

خامۂ جادو نفسم چوں عصا — بست بہ جادو دہن اژدہا
جملہ طلسمات فسوں را بشکست — تازہ طلسمے بسخن بار بست

رفتہ یکے روز پئے طوف دیر　　نند و سو نند و ہمہ گوالاں بسیر
دایرہ بر سرستی انداختند　　دل زکدورت ہمہ پرداختند
بر در دیبی و شیو سرفراز　　گرم پرستش شدہ باصد نیاز
مادہ گاواں و تماشش و طلا　　یافت صف برہمن با صفا
نیز خورانند و بخوردند سیر　　روز بسر رفت و شد از بسکہ دیر
خواب ربود از کف طاقت عناں　　نیم شبے آمدہ مار کلاں
پائے سری نند بدم در کشید　　نند ازیں غصہ بخود در طپید
نعرہ برآوردہ بدردو فغاں　　گفت کہ اے کرشن........ ؎۱
گوش نمودند ز نند ایں کلام　　بخود و آشفتہ گوالاں تمام ؎۲
سوختہ چوب و عصا و لکد　　ہر یک ازاں بر سرآں مار زد

ممکن ہے کہ مذکورہ بالا نسخوں کے علاوہ دیگر نسخے بھی فارسی میں سری مدبھاگوت کے ہوں۔ اگر کوئی صاحب اس امر کے متعلق کچھ توجہ فرمائیں گے اور خاکسار کو دیگر نسخے یا نسخوں سے آگاہی بخشیں گے تو عین معارف پروری ہوگی۔ مزید برآں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مذکورہ بالا نسخوں سے اہل ہنود کے ذوق سلیم و ساتھ ہی ساتھ عقیدت پسندی کا خاصہ اظہار ہوتا ہے۔

طبیب مرغی خانہ

مصنفہ خواجہ بدرالسلام فروغی پولٹری ایکسپرٹ۔ کراؤن سائز ۱۰۶ صفحات قیمت ۸؍
ملنے کا پتہ: مینیجر دارالبلاغ، ملتانی اسٹریٹ، لاہور

یورپ میں تو مرغیوں کی پرورش و تجارت نے ایک باقاعدہ فن کی حیثیت حاصل کرلی ہے مگر ہندوستان میں ابھی یہ فن بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ اس کتاب میں مرغیوں کی پرورش، بچوں اور انڈوں کی حفاظت، مرغیوں کی بیماریاں اور ان کا علاج، مرغیوں کی قسمیں وغیرہ تمام باتیں تفصیل سے لکھدی گئی ہیں، چونکہ مصنف خود اس فن کے ماہر ہیں اس لئے ان کی بتائی ہوئی باتیں یقیناً مفید ہونگی مختلف قسم کی مرغیوں کی تصویریں بھی شامل کتاب ہیں۔ غرض اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب مفید معلوم ہوتی ہے۔

؎۱ یہ لفظ صاف نہیں پڑھا جاتا۔
؎۲ یہ مصرعہ پورا نہیں پڑھا جاتا۔

فلسفۂ عبرت اور میر

(از سید مقبول حسین احمد پوری)

دنیا میں کتنی بھی تجارت کی گرم بازاری ہو جائے آرام و راحت کی تگ و دو روز بروز زیادتی ہی پر رہے گی اور چونکہ عیش و خوشی کی تلاش میں حزن و ملال کا ہونا ضروری ہے اسلئے غم و خوشی کی آمیزش سے لطف کا حاصل ہونا بھی ضروری ہے، امید کیا ہے؟ آس و یاس کی آمیزش، شوق کیا ہے؛ وصل و فصل کی ایک کیفیت اور وہ کیف اعتدال جو ان دو متضاد خاصیتوں میں پنہاں ہے۔ امید، شوق اور عبرت وغیرہ ناموں سے موسوم ہے۔ صبح، شب تار اور نصف النہار کا اعتدال ہے۔ شام نصف النہار اور شب تار کا اعتدال ہے۔ یہی بات انسانی جذبات کے ساتھ بھی ہے۔ ایک فرنچ محقق نے کیا خوب لکھا ہے۔

"راحت و تکلیف جو بذات خود اس قدر مخالف حیثیتیں رکھتی ہیں علت اور سبب کے اعتبار سے مختلف نہیں۔ گدگدانے کی مثال سے ظاہر ہے کہ اگر خوشی پیدا کرنے والے حرکات زیادہ ہو جائیں تو وہی باعث تکلیف ہو جائیں گے اور اگر تکلیف دینے والے جذبات اعتدال پر قائم رہیں تو یہی ذریعۂ مسرت بن جائیں گے۔" (Fontenelle)

غرض حقیقی کیف مسرت ہلکے سے غم اور دھیمی سی خوشی ہی میں مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جذبات میں تاثیر بھی اسی وقت ممکن ہے جب راحت و تکلیف شیر و شکر ہو کر ان کو جذبات لطیف بنا دیں۔ کیف مسرت راحت و تکلیف کا اعتدال ہے۔ عبرت بھی اسی کا ایک نتیجہ ہے یعنی عبرت کو نفرت اور ترحم کی نہایت لطیف کیفیتوں سے مرکب سمجھنا چاہیئے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ عبرت میں نفرت و ترحم کے ساتھ ایک اجتنابی پہلو بھی شامل ہے جس کو سبق حاصل کرنا کہتے ہیں یعنی عبرت پیدا کرنے والے واقعات سے ہم کو ایک عام مگر یقینی بات معلوم ہو جاتی ہے اور وہ واقعات بذات خود مثال یا نمونہ ہو کر ہمارے دل میں یقین قائم کر دیتے ہیں اس لئے وہ بات جس کو ہم اونھ کہکر ٹال جایا کرتے تھے ایک اٹل قانون

کی شکل میں ہمارے پیش نظر ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی غفلت اور لاپروائی پر نادم ہوتے ہیں اور غفلت میں ڈالنے والی باتوں سے الگ ہونے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

عبرت میں مسرت کا شائبہ تک نہیں مگر ایک قسم کا اطمینان ضرور شامل ہے جس کو نہ تو سکون کہہ سکتے ہیں نہ راحت، بلکہ وہ ایک ایسی کیفیت ہے جو اصلاح قلب کا ذریعہ ہے اور ہمدردی و ترحم کے جذبات کو بھی اُکسا دیتی ہے۔ یعنی جس چیز سے ہم کو عبرت حاصل ہو اس پر ہم تاسف کرتے ہیں، ترس کھاتے ہیں اور اُس کے نتائج کی طرف غور کرنے سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دل پر ایک قسم کا رعب طاری ہو جاتا ہے کیونکہ عبرت میں اجتناب و ترحم کی طرح ایک قسم کا اُداس کن جذبہ اور رعب بھی شامل ہے۔ اس طرح چونکہ رعب میں تعظیم و خوف دونوں شامل ہیں اور غم کسی دلپسند، مرغوب، محبوب اور پیارے جذبے یا اس کے ذرائع سے محرومی کا نام ہے اس لئے عبرت میں رعب، بڑائی، تعجب، ترس، رحم اور محبت وغیرہ جذبات کو بھی شامل سمجھنا چاہیئے۔

عبرت کی نمایاں مثال دنیا اور اس سے متعلق اشیا کی بے ثباتی ہے، کسی کمال کا یکایک مبدل بہ زوال ہو جانا، کسی عیش کا مبدل بغم ہو جانا، بے عزتی، رسوائی اور تباہی و بربادی کی دوسری صورتیں جو واقعات کے ذریعہ سے ظاہر ہوں عبرت کی مثال ہیں۔ شاعر ایسی ہی مثالوں کو [illegible] مختلف نوعیتوں کے ساتھ ظاہر کرکے حیات انسانی کی تنقید اور جذبات قلب کی تفسیر اپنے دلفریب تنوع کے ساتھ کیا کرتا ہے اور یہ دلفریب تنوع زیادہ تر یاس و حرمان پر مبنی ہے مگر اس میں طنز بھی شامل ہو سکتی ہے اور ظرافت بھی مثلاً اکبر کا یہ شعر ؎

کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے بی۔اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

یا سعدی کا یہ مشہور شعر ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق کہ یاراں فراموش کردند عشق

میر صاحب نے بھی اس رنگ کو لیا ہے مگر اس میں بھی ان کا ذاتی انداز شامل ہے، مثلاً ع "میر صاحب زمانہ نازک ہے"۔ اپنے خاص رنگ میں جب کبھی میر صاحب نے لکھا ہے تو فلسفۂ عبرت کی بنیاد اُنھوں نے عموماً دنیا کی بے ثباتی، زمانے کی ستم ظریفی اور موت و حیات کی انقلابی حالتوں کا فوٹو کھینچنے پر قائم کی ہے۔ یہی ایسی باتیں ہیں جن پر دنیا کے تمام بڑے بڑے شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً انگریزی میں شیکسپیئر اپنے ڈرامہ Tempest میں ایک جادوگر کی زبانی دنیا کی بے ثباتی کا ثبوت اس طرح پیش کرتا ہے:-

"تمہارے ایکٹر سب عالمِ ارواح سے آئے تھے جو تماشا ختم ہونے پر ہوا میں تحلیل ہو گئے اور جس طرح دھواں ساکن ہوا میں حل ہو کر غائب ہو جاتا ہے وہ بھی غائب ہو گئے۔ ہماری زندگی اور اس دنیا کا وجود بھی اسی خوابی منظر کے موافق ہے، کیونکہ بڑے بڑے مینارے، عالی شان محل، رعب و جبروت والے عبادت خانے اور خود یہ کرۂ زمین ایک دن اسی طرح وجود سے عدم میں تحلیل ہو جائیں گے۔" (ایکٹ ۴۔ سین ۱)

میر صاحب نے انھیں خیالات کو نظم کر دیا ہے مثلاً:۔

بودِ آدم نمودِ شبنم ہے — ایک دو دم میں یس ہوا ہے یہ
عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم ہے — کچھ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا
کچھ نہیں اور دیکھتے ہیں کیا کیا — خواب کا سا ہے یاں کا عالم بھی
آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں — مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

شیکسپیئر نے تو باقاعدہ ایک مضمون سا لکھ ڈالا مگر میر صاحب کا ایک ہی شعر شاعرانہ آن و بان قائم رکھنے کے لئے کافی ہے ؎

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات — کلی نے یہ سُنکر تبسم کیا

یہی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے کیونکہ جینا دراصل موت کی راہ دیکھنا ہے ؎

یہ جو مہلت جسے کہے ہیں عمر — دیکھو تو انتظار سا ہے ایک

بڑے بڑے شہروں کی تباہی پر ہر قوم کے شعرا نے مرثیے لکھے ہیں، دہلی پر میر کے بھی بہت سے اشعار ہیں ؎

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے — جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
اب خرابہ ہوا جہان آباد — ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

موت و حیات پر شیکسپیئر لکھتا ہے:۔

"ہم کو تو قبر اور لوحِ قبر کی باتیں کرنا چاہئیں۔ خاک کو کاغذ بنانا چاہیئے اور سطح زمین پر آنسو بہانے والی آنکھ سے لکھنا چاہیئے۔ آؤ وصیت کا ارادہ کریں اور وارثوں کی فکر کریں اور یہ بھی نہیں کیونکہ ہم ترکہ میں چھوڑ ہی کیا سکتے ہیں سوا اس کے کہ ہمارا معزول کیا ہوا جسم سپردِ خاک کر دیا جائے۔" (King Jhon Act III, S. II)

بقول میر صاحب ؎

پہلا قدم ہے انساں پامالِ مرگ ہونا ۔۔۔ کیا جانئے رفتہ رفتہ کیا ہو مآل تیرا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام ۔۔۔ آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

لیکن میر صاحب رنج و مصیبت کا رونا ہی نہیں روتے بلکہ وہ ایک سبق آموز دستور بھی پیش کرتے ہیں

یارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو ۔۔۔ ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

کیونکہ دنیا کی بے ثباتی ہم کو خواہ مخواہ میانہ روی اور اعتدال کے لئے مجبور کرتی ہے ۔

چار دن کا ہے یہ جھمیلا سب ۔۔۔ سب سے رکھئے سلوک ہی ناچار

اور مہاتما بدھ کی طرح ان کا پیام بھی اہنسا کے اصول پر مبنی ہے ۔

اور جو چاہے کیجیو پیارے ۔۔۔ ایک ہو جو نہ درپئے آزار

ڈر ظلم سے کہ اس کی جزا بس شتاب ہے ۔۔۔ آیا عمل میں یاں کہ مکافات ہو گئی

ان کا فلسفۂ عبرت اخلاقِ مسیحی کی جان ہے ۔

معیشت ہم فقیروں کی سی اہنائے زماں سے رکھ ۔۔۔ کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا

کیا ہی پر عبرت انداز میں نصیحت کی ہے ۔

سب سے مل جل کہ حادثہ ہے پھر ۔۔۔ کہیں ڈھونڈھا بھی تو نہ پائے گا

یہاں لفظ "حادثہ" میں تو عبرت کا مفہوم کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے۔ انسان اس کے مطلب پر غور کر سکتا ہے اور تھرا سکتا ہے، اس سے نتائج اخذ کر سکتا ہے اور ڈر سکتا ہے۔ یہ میر صاحب ہی کا دل تھا جس نے اس کو محسوس کیا اور صرف انھیں کی زبان اس کو ظاہر بھی کر سکی۔

میر صاحب کے ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ درسِ عبرت دیتے تھے اور وہی قدیم موضوع جو پرانے زمانے کے فقرا برتتے چلے آئے ہیں میر صاحب بھی اشعار کے ذریعہ سے برتتے تھے مگر اس میں ایک ایسی نوعیت تھی جو انسان کے دل پر اثر کرے اور موعظت کا باعث ہو۔

سرسری مت جہاں سے جا غافل ۔۔۔ پانوں تیرا پڑے جہاں ٹک سوچ

ہونٹھ اپنا ہلا نہ سمجھے بن ۔۔۔ یعنی جب کھولے تو زباں ٹک سوچ

نیچے تاثیر سے بھرے ہوئے اشعار میں میر صاحب نے فلسفۂ عبرت کو بخوبی نمایاں کیا ہے: ان پر غور کرنا، اصلاحِ معاشرت کے اصول کا مطالعہ کرنا ہے، اور پرانے لوگوں کی گفتگو سمجھ کر ان کو ٹال دینا ایک صحیح مشفق کی نصیحتوں کو پس پشت ڈالنا ہے۔ کیونکہ وہ ایسے انداز میں واقعات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ نصف النہار کی طرح دہکتی ہوئی خوشی بھی مبدل بہ غم ہو جاتی ہے۔ ہماری دولت کتنی ہی

اطمینان بخش کیوں نہ ہو جذبۂ عبرت سے اس کی وقعت کم ضرور ہو جاتی ہے۔ ہم کتنے ہی قوی کیوں نہ ہوں۔ عبرت کی ایک معمولی سی تمثیل ہی ہم کو منکسر مزاج بنا سکتی ہے، ہمارا حسن کتنا ہی عالم فریب کیوں نہ ہو مگر عبرت کا ایک ہی اشارہ شکست ناز کے لئے کافی ہے، عبرت ہمیں رلاتی ہے، ڈراتی ہے، سمجھاتی ہے اور ہمارے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے صلح و آشتی کے گیت سناتی ہے۔ یہ گیت میر صاحب کی زبان سے اور بھی زیادہ پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ واقعی اگر عبرت نہ ہو تو دنیا سے ہمدردی اُٹھ جائے، کیونکہ یہی صاحب پندار کو خاکسار بنانے والی اور ہر غصّے کو دبانے والی ہے۔ ہر تقصیر کو معاف کرنے والی اور عیوب کو چھپانے والی ہے۔ یہ امن و اماں والے دلوں کی حکمراں اور جوشیلے قلوب کی اتالیق ہے۔ کون ایسا ہے جو قبرستان سے گزرتے ہوئے ساز حسرت کی اس دھیمی سی نوا کو نہ سُنے کہ

یہاں لاکھوں حسیں خواب عدم میں سو گئے ہونگے ۔۔۔ یہاں اُنکے سنہرے بال مٹی ہو گئے ہونگے

کون ایسا ہے جو دشمن کی وفات سے عبرت حاصل کر کے متاثر نہ ہو اور پُر ترحم احساس کے ساتھ یہ نہ کہے کہ "آہ مَیں اس غریب مشت خاک سے لڑا تھا!"

اگر انسان میں عقل صحیح ہے، اگر واقعی وہ اس دنیا میں خود کو مسافر سمجھتا ہے، اگر اس کے دل میں کچھ بھی درد ہے اور اُس کے دل کو خدا سے کچھ بھی اُنس ہے تو درس عبرت سے سبق آموز ہو کر اپنے ہم جنسوں کی تکلیف کبھی نہ دیکھ سکے گا۔ بنی نوع انسان ہی کیا اس کو تو ہر جاندار کی تکلیف ناگوار ہوگی۔ یہی فلسفۂ عبرت کا افادی پہلو ہے اور یہی میر صاحب کا دنیاوی مشن تھا جس کو وہ پورا کر گئے۔

ویدک میگزین (انگریزی) یہ ماہوار رسالہ گورو کل کانگڑی کی جانب سے تقریباً بیس سال سے شائع ہو رہا ہے، اس کا مقصد ویدک تعلیم کی اشاعت اور سوامی دیانند کے مشن کو پورا کرنا ہے۔ اس رسالہ میں سناتن دھرم کے مروجہ طریقہ عبادت پر بغیر دل آزاری نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ ویدک دھرم اور آریہ سماج کے متعلق قابل قدر مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس وقت جنوری ۱۹۳۲ء کا رسالہ ہمارے سامنے ہے جو قابلیت سے مرتب کیا گیا ہے۔ سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے۔ گوروکل کانگڑی ضلع سہارنپور سے طلب کیجئے۔

ہندوستان کی اولین اسلامی درسگاہیں

(از سید امداد اللہ قادری (حیدر آبادی)

مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں مختلف علوم وفنون کی سرپرستی ودلچسپی کے ساتھ کی تھی اور اپنے سچے علم دوست ہونے کا ثبوت دیا تھا، جس کی آج تک تاریخیں شاہد ہیں۔ ان کی اس غیر معمولی توجہ کے باعث اکثر ممالک میں جہاں ان کے قدم پہنچے تھے ایک قلیل عرصے میں علوم وفنون کے مرکز بن گئے تھے۔ یہاں تک کہ مساجد کے صحن اور خانقاہیں بھی درس وتدریس سے معمور نظر آتے تھے۔ مسلمان سلاطین نے ان کے اخراجات کے لئے بیش قرار وظیفے اور جاگیریں وقف کردی تھیں مگر یہ بات چند ممالک تک محدود تھی۔

جب ہم ہندوستان کے مدارس کی بنیاد پر نظر ڈالتے ہیں تو مولوی سعید احمد صاحب مارہروی کا یہ قول یاد آتا ہے:-

"میں وثوق کے ساتھ نہیں بیان کرسکتا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں علمی عمارت کی بنیاد رکھنے میں اولیت کا فخر کس بزرگ کو حاصل ہے، لیکن میری محدود تاریخی واقفیت میں اس ملک میں سب سے پہلے جس شخص نے علمی عمارت کی بنیاد ڈالی وہ سلطان شہاب الدین محمد غوری کا مشہور سپہ سالار محمد بختیار خلجی تھا۔[1]"

ہندوستان کی قدیم تاریخوں کے مطالعہ کے بعد بھی بختیار خلجی ہی کے سر اوّلیت کا سہرا رہتا ہے ان کتابوں میں عہد اسلامی کے کسی ایسے قدیم مدرسے کے حالات نہیں ملتے، جو ایک باقاعدہ حیثیت رکھتا ہو، کیونکہ قدیم زمانے میں مسلمانوں کا ہر گھر، ہر خانقاہ اور ہر مسجد مدرسہ تھی، مگر ہم ان کو باقاعدہ مدارس سے تعبیر نہیں کرسکتے۔

سلطان بختیار خلجی کے مدارس کے متعلق بعض مورخین کی آرا درج ذیل ہیں۔ مصنف طبقات ناصری

---

[1] آثار خیر صفحہ ۱۲۱

کا بیان ہے کہ:-

"چوں محمد بختیار آں مملکت را ضبط کرد، شہر نودیہ را خراب گذاشت۔ و بر موضعی کہ لکھنوتی است دار الملک ساخت و اطراف آں ممالک را در تصرف آورد، و خطبہ و سکہ ہر خطہ قائم کرد و مساجد و مدارس و خانقاہات در آں اطراف بسعی و تحمیل و امرائے او بنا شد" [1]

طبقات ناصری ہندوستان کی نہایت قدیم اور معتبر تاریخ ہے، اس میں مذکورہ بالا مدرسے سے قدیم کسی اور اسلامی مدرسہ کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس لئے ہم اسے ہندوستان کا پہلا اسلامی مدرسہ کہہ سکتے ہیں۔ اس بیان سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ دار السلطنت بہار میں کئی مدارس قائم تھے، اور علم کی نشر و اشاعت میں امراء بھی کافی حصہ لیا کرتے تھے۔

خواجہ نظام الدین احمد مصنف طبقات اکبری نے بھی ان مدارس کا سرسری طور پر تذکرہ کیا ہے۔

"اس واقعہ کے بعد ملک بختیار نے تمام لوازم شاہی اختیار کر لئے۔ چتر لگانے لگا، اپنے نام کا خطبہ، سکہ جاری کر دیا، اور مساجد خانقاہیں اور مدرسے بنوائے۔" [2]

مورخ فرشتہ لکھتا ہے:-

"ایک شہر موسوم برنگ پور بسا کر اپنا دار الملک بنایا اور اس میں مسجدیں اور عبادت خانے اور مدرسے اس شہر اور ولایت .... تعمیر کرائے۔" [3]

غلام حسین سلیم، ریاض السلاطین (تاریخ بنگالہ) میں رقمطراز ہیں:-

"گویند در بہار کتب خانہ بود کہ بدست محمد بختیار افتاد و موجب اجتماع کتب از برہمناں استفسار نمود گفتند تمام ایں شہر مدرسہ بود، و در لغت ہند مدرسہ را بہار گویند۔ لہذا ایں شہر بدیں نام موسوم است" [4]

غلام حسین سلیم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام بہار میں مدارس قائم تھے۔ اور سنسکرت زبان میں "بہار" مدرسے کو کہتے ہیں۔ خواجہ نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے غالباً غلام حسین سلیم کا یہ بیان طبقات اکبری سے ماخوذ ہے۔ اس کا لحاظ کرتے ہوئے ہم بہار کو معدن العلوم بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر ان بیانات سے قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا، کہ کس مدرسہ کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔

اسی زمانے میں مولانا قطب الدین کاشانی سلطان شہاب الدین محمد غوری کے مشہور سپہ سالار

---

[1] طبقات ناصری طبع کلکتہ صہ ۱۵۱

[2] طبقات اکبری فارسی طبع لکھنؤ صہ ۴۲

[3] ترجمہ تاریخ فرشتہ طبع لکھنؤ صہ ۳۰۰

[4] ریاض السلاطین طبع کلکتہ صہ ۶۴

واداری

یدطالب علی طالب الہ آبادی)

روشور سے سیاسی جھگڑے چل رہے ہیں، نت نئی تحریکات کی
ذرہ میں بیداری کی لہریں دوڑ رہی ہیں، قانون شکنی کے
یک کو دبانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ایسی حالت
تا ہے؛ لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہے، اور پھر ضرورت بھی
ں نہ ہوگا اگر میں کچھ دیر کے لئے آپ کی توجہ ایک نہایت اہم مسئلہ

بسا جوہر ہے جو مریض سے قطع نظر خود حکیم کی اصلاح بھی کرتا ہے۔
ں ہے جس میں رواداری کے بغیر کام چل سکے۔ دنیا کے بڑے
سے رواداری کے بیج بوئے ہیں۔ ارسطو سا فلسفی بدھ سا رہبر
ب نے اسی کی تعلیم دی ہے، اور اس کو برت کر بھی دکھا دیا ہے
ں رکھا گیا، کبھی "اخوت" اور کبھی "برادری" کے نام سے پکاری
تھا۔ عالیشان محلوں میں ایک ہی رانی کی حکومت تھی۔
نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ جب دنیا وحشت اور جہالت کے گہوارہ
تھر کا زمانہ تھا اور زندگی کا مقصد صرف اسی قدر تھا کہ اپنا پیٹ
ں کا دور دورہ تھا اور انسان مذہب، سیاست، تمدن، تہذیب
سے بے خبر محض تھا، اور جسکی لاٹھی اسکی بھینس کا ضابطہ رائج تھا
تھ کا کھیل تھا۔ اس وقت فطرت کی گود میں ایک ننھی منّی سی

آنکھیں روشن چندرماں کی دو پھانکیں تھیں۔ ایک میں مروت کی دیوی اور دوسری میں متانت کی موتی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چوڑے ماتھے سے روشن خیالی کا آئینہ شرما رہا تھا، اس کے ابروؤں کی کمانوں سے شانتی اور سلامت روی کے تیر برابر چل رہے تھے۔ اس کے گالوں میں راستبازی اور وفاداری کے دو مرقعے مشرق اور مغرب میں ہم آہنگی پیدا کر رہے تھے۔

رواداری کی ترقی الفاظ میں جو ربط خیالات کا جوہر موجود ہے اس کی مدد سے غالباً آپ بھی سمجھ گئے ہونگے کہ تنظیم، تہذیب اور رواداری ایک ہی مثلث کے تین زاویے ہیں، وہ مثلث کیا ہے؟ تمدن، اس وقت تمدن سے میری مراد نفس تمدن سے ہے جس کا وسیع دامن ملک و قوم، مکان و زمان اور رنگ و روپ سب سے زیادہ کشادہ ہے۔

جیسے جیسے دنیا کو تہذیب کی ضرورت ہوئی، حیات انسانی کو حدود و قیود میں آنا پڑا، علم و تہذیب کے شگوفے پھوٹے، تحریر و تقریر نے اشارات کی جگہ لی، ازدواجی شان پیدا ہونے لگی، خاندان، قبیلہ، قوم، ملک، وطن۔ تجارت و آبادی کی ترقی ہوئی۔ تہذیب، تنظیم، ترتیب، ایجادات اور انکشافات نے سہولتیں مہیا کرنی شروع کیں، ویسے ہی رواداری کا بچپن بھی شباب سے بدلتا گیا۔

رواداری کی تعریف رواداری کی کوئی حکیمانہ یا منطقی تعریف میں نہیں کر سکتا، مگر اس لفظ سے جو مفہوم میری سمجھ میں آیا ہے میں اُسے صاف اور مختصر لفظوں میں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

(۱) ہر چہ بر خود مپسندی بر دیگراں مپسند" یہ مثل بھی تصویر رواداری کا ایک نفیس پہلو ہے مگر صرف ایک ہی پہلو ہے مگر وہ بھی مکمل نہیں ہے، دراصل رواداری کا مفہوم انگریزی لفظ Tolerance سے بہت کچھ واضح ہو جاتا ہے۔

ذیل میں ایک نقشہ نذر کرتا ہوں جس میں اس لفظ کے ہر حرف کی تھوڑی بہت تفصیل پیش کی گئی ہے

ر	ریاض۔ رازداری	رواداری
و	واسطہ	
ا	اہلیت	
د	دلداری، دلسوزی،	
ا	ایثار، ارادہ	
ر	روشن خیالی	
ی	یاد	

ں تو رواداری کا تعلق علم اور عمل دونوں ہی سے ہے مگر میرے نزدیک رواداری کا عملی
ے نسبتاً کہیں زیادہ گہرا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ افعال خیالات کے مادی نتائج ہیں اور خیالات
راست علم سے ہے، اور اس پر بھی مشق و ریاضت سے قابو مل سکتا ہے۔ ہر چیز کا تعلق عمل
ست ہوتا ہے۔ چنانچہ رواداری کا تعلق بھی عمل سے براہ راست ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ نقطۂ مرکز
یدھے خطوط دائرے تک کھینچے جائیں گے سب آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہوں گے
یال رواداری، فعل رواداری کا محرک ہوتا ہے اسی طرح رواداری کا ہر عمل ایک طرف
ملوں کا سرمایہ بنتا ہے اور دوسری طرف نئی نئی امنگیں بڑھا دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بہت کم ہستیاں راز سننے کی اہلیت رکھتی ہیں مگر بعض لوگوں کی کشادہ پیشانی
ں اور زندہ دلی ضرور ایسی ہوتی ہے کہ دکھے ہوئے دلوں کو مجبور کر دیتی ہے اپنے راز دل
نے پر مجبور کر دیتی ہے اور یہ امر واقعہ ہے کہ اپنا راز کسی سے کہہ دینے کے بعد دل و دماغ کا
وجھ ہلکا ہو جاتا ہے لیکن کسی راز کا راز رکھنا بھی صرف صاحبان ظرف کا کام ہے لہذا اگر
زداری سے آپ کے قدم نہ ڈگیں تو رازداری کا ایک نہایت اہم فرض آپ نے ادا
ر آپ سچے معنوں میں ہمدرد، شریف، صاحب ظرف اور سنجیدہ کہلانے کے مستحق ہیں۔

واسطہ کا احساس اور سچا احساس رواداری کی جان ہے۔ اقتصادی اور سماجی اعتبار سے
شان بہت بڑھی ہوئی ہے۔ جب سے ارسطو جیسے حکیم نے دنیا کو یہ بتایا کہ انسان لازماً
حیوان ہے، اسی وقت سے واسطہ کا احساس حیات انسانی کا ایک جزو لاینفک بن گیا۔
ں تہذیب، تنظیم اور تمدن نے جتنی ترقیاں کیں، واسطہ کی گرہیں بھی اتنی ہی مضبوط ہو گئیں
تو کیجیے کہ ہم اپنی روزمرہ کی ضروریات زندگی پوری کرنے میں دوسروں کے واسطے کے کس قدر
ں۔ ہمارا لباس، ہماری خوراک۔ ہمارے مکان سب کے سب صدہا واسطوں کے دست نگر
ہم اور اشتراک عمل نہ ہو تو ہماری ضروریات حیات پوری ہی نہیں ہو سکتیں۔ کوئی ایسا
و بستی میں رہتا ہو کسان سے لیکر گورنر تک اپنی تمام ضروریات خود ہی پوری نہیں کر سکتا۔
کا تمدن اور تہذیب اپنی ارتقا کی اس سطح تک پہونچ گئی ہے جس کا وہم بھی ہمارے اسلاف
وگا۔ حیات کی نزاکتیں، آرزو کی کثرتیں، وسائل کی سہولتیں اور تہذیب کی لطافتیں اس
ئی ہیں کہ اب ہم میں سے ہر ایک دنیا کی چلتی ہوئی گھڑی کا ایک پرزہ ہے۔ تمام اقوام عالم
لاقوامی تجارت، صنعت، محنت اور تعلقات کی مدد سے ہماری حیات کو مکمل بناتی ہیں۔

آپ اگر اپنے گھر کی تمام چیزوں پر ایک سنجیدہ نگاہ ڈال جائیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ غیر ملکوں کی کتنی چیزیں آپ کے استعمال میں ہیں یہی حال کاریگروں اور مزدوروں کے طبقوں کا بھی ہے۔ ہر جماعت دوسری جماعت کی محتاج ہے

اس طور پر دنیا کی مثال ایک گھڑی کی سی ہے اور تمام ممالک اس کے پرزے ہیں اور ہم سب اس چلتی ہوئی گھڑی میں کچھ نہ کچھ حصہ دار ضرور ہیں۔ مگر فطرت کے کارخانے میں اس گھڑی کے پرزے اتنے کثیر تعداد میں اور اس قدر جلد جلد ڈھلتے رہتے ہیں کہ ہماری ہستی بالکل ویسی ہی قیمت رکھتی ہے جیسے بحر ذخار میں کوئی حباب ہو، ظاہر ہے کہ کروڑوں حبابوں کے مٹ جانے یا ابھر آنے سے بحر کی روانی میں کوئی مستقل یا خاص اثر پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ اظہار حقیقت صرف اس لئے ہے کہ آپ اس آئینہ میں اپنی تصویر صاف صاف دیکھ لیں، آپ کو اس کا احساس ہو جائے کہ ہم کتنے پانی میں ہیں تاکہ آپ اپنی فانی زندگی کو بہتر سے بہتر کاموں میں صرف کر کے بقاء حیات دوانی حاصل کر لیں۔

تصویر کا ذرا روشن پہلو دیکھئے تو آپ ہی میں سے ایسے لوگ بھی گذرے ہیں جنھوں نے دنیا کی اس چلتی ہوئی گھڑی میں چار چاند لگا دیے ہیں جن کے نقوش ابتک صفحۂ تاریخ پر ثبت ہیں جن کی جدائی ہم آج بھی محسوس کرتے ہیں اور جن کی شمع بقا کو دنیا کے ہزار ہا برس کے تیز تیز جھکولے بھی بجھا نہیں سکے۔ صرف روشن ہی نہیں ہیں بلکہ ہر صدی گذر جانے پر ان کا نور اور بھی بڑھتا جاتا ہے ان میں سے کوئی فلسفی ہے، کوئی ادیب، کوئی شاعر ہے کوئی صناع، کوئی پیمبر ہے کوئی بہادر، مگر ان کی حیات کا آپ گہرا مطالعہ کریں تو ایک صفت سب میں اشترک پائی جائیگی۔ یہ صفت اخلاق ہے، جس کا ایک لاینفک جزو رواداری ہے۔ یقیناً آج بھی ہم میں آپ میں صدہا فرد ایسے موجود ہیں جو اگر سچائی اور محنت سے چاہیں تو اپنی اسی دو روزہ اور فانی زندگی میں عجیب و غریب کام کر سکتے ہیں۔ وہ دنیا کو اس کی شاہراہ ترقی پر کئی منزل آگے بڑھا سکتے ہیں اور خود بھی غیر فانی بن سکتے ہیں۔ پھر آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ غرور اور خودی کے تھپیڑوں میں پڑ کر بے شمار فانیوں کی طرح مٹ جانا بہتر ہے یا بقائے دوام کے بیش بہا لباس سے ملبوس ہونا اچھا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اگر آپ کو ان تمام واسطوں کا صحیح اندازہ اور پورا احساس ہو جائے گا جن سے آپ گھرے ہوئے ہیں تو میرے خیال میں آپ رواداری کو جنبہ داری پر، روشن خیالی کو تعصب پر، اور عمل کو کاہلی پر کہیں زیادہ ترجیح دینگے۔ یاد رکھئے اگر آپ تہذیب و تمدن کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو قدم قدم پر رواداری سے کام لینا پڑے گا۔ ہر فعل رواداری سے جتنا فائدہ کسی دوسرے کو پہونچے گا اس سے کہیں زیادہ خود آپ مستفید ہونگے

حسن خیال اور حسن عمل سے نفس کی تہذیب ہوتی جائیگی، اور ایک دن آپ اپنی زبان بے زبانی سے غالب کی ترجمانی اس طور پر کریں گے کہ:-

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

اور اگر آپ نے غرور، ضد، ہٹ دھرمی، تعصب اور تنگ دلی سے کام لیا تو مٹتے مٹتے ایسے مٹ جائیں گے کہ لوحِ ہستی پر آپ کا خفیف سے خفیف نشان بھی نہ رہ جائے گا۔

اہمیت جہاں رواداری کی اہمیت کا سوال ہے، میرے خیال میں اسکے دو پہلو نہایت اہم ہیں

(۱) فطرت عادل ہے اور رحیم ہے۔ اس لئے ہر جاندار میں رواداری کی صلاحیت ودیعت کی ہے۔ انسان تو درکنار حیوانات کی حیات کو بھی غور سے دیکھئے تو سب میں رواداری کی جھلک کم و بیش نظر آئیگی۔ ماں باپ کی فطری محبت جس کا اظہار جانور بھی بچوں کی پرورش اور برداشت میں کرتے ہیں وہ بھی رواداری ہی کی ایک زندہ مثال ہے۔ میرے خیال میں رواداری بڑھتے بڑھتے محبت ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ خدا سر جگدیش چندر بوس کی تمام حکیمانہ جستجو کو بقا دے کہ اُن کی مسلسل محنتوں کے بعد اور تازہ ترین انکشافات کی بدولت آج ہم کو اس بات کا پتہ چل گیا ہے کہ پھول، پتے، درخت، جھاڑی، بیل، بوٹے، غرض ساری دنیائے نباتات میں روح کا دور دورہ اور جان کی حکمرانی اسی شان سے ہے جیسی انسان اور دیگر حیوانات کی دنیا میں ہے۔ یہی نہیں بلکہ دنیائے نباتات کے افراد میں محسوسات اور جذبات بھی ہیں، وہ غمگین بھی ہوتے ہیں اور مسرور بھی۔ عدم اور وجود کا سلسلہ ان کے یہاں بھی جاری ہے۔ وہ ہنستے بھی ہیں روتے بھی ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید کچھ ہی زمانہ کے بعد دنیائے نباتات کی طرح دنیائے حجریات اور ذرات میں بھی روح کا وجود دریافت ہو کر رہے گا۔ اور محسوسات و جذبات کی دنیا اس عالم میں بھی نظر آئیگی جس میں آج ہم کو نہ جان کا پتہ چلتا ہے نہ شعور کا احساس ہوتا ہے۔

حاصل کلام صرف اتنا ہے کہ رواداری کی فطری صلاحیت ہم سب میں موجود ہے اور ہم سب جس قدر چاہیں اس صلاحیت سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں

(۲) ساتھ ہی ساتھ اس خدشہ کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ جس طرح بہت سی فطری اہلیتیں عدم استعمال، عدم مشق اور عدم مزاولت سے مٹتے مٹتے مٹ جاتی ہیں اسی طرح اگر ہم رواداری کا عمل نہ کریں اور اس کی مشق نہ رکھیں تو یہ اہلیت بھی ہمارے ہاتھ سے جاتی رہیگی۔ رواداری ہی واحد طریقہ اصلاح کا ہے۔ کاش ہم سب رواداری [illegible] بے شمار فوائد

سے باخبر ہوجاتے تو آج کمزور اور زوردار، مزدور اور مہاجن، راجہ اور رعایا، شوہر اور بیوی، چھوٹوں اور بڑوں میں کشیدگی، بیزاری، قتل اور خون، مایوسی اور جدائی کی جو لہریں دوڑتی پھرتی ہیں ان کا کہیں پتہ بھی نہ ہوتا۔

میرے خیال میں اگر آپ دنیا کے تمام مذہبی، ملی، سیاسی، زرعی، صنعتی، علمی اور مدنی فسادات کی تحلیل کریں تو حرص، خود غرضی، ہٹ دھرمی، ظلم، غرور، نفرت، جہالت یا اس قسم کے صدہا اسباب پائیں گے۔ مگر لطیف نکتہ یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں مل کر صرف ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔ وہ چیز کیا ہے ناروا داری، جو رواداری کی پوری پوری دشمن ہے۔

آج جمعیتہ الاقوام کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ جنگ و جدال اور قتل و قتال کا صفحۂ دنیا سے مٹا دینا ہے۔ اس کوشش میں کامیاب ہونے کے لئے وہ اسلحہ کے استعمال کو بند کرنے کی دعوت تمام دنیا کو دے رہی ہے۔ مگر میرے خیال میں دنیا کے تمام فسادات کا ایک ہی علاج ہے اور وہ علاج رواداری ہے۔ اگر جمعیتہ الاقوام انسانوں کے جذبات کی تہذیب کسی طور پر کردے اور ان میں رواداری آجائے تو یہ سارے فسادات اسی طرح آپ سے آپ مٹ جائیں گے جیسے سورج کی تیز روشنی سے شب کی سیاہی کافور ہوتے ہوتے مٹ جاتی ہے۔ اور ساری کائنات نور کی چادر میں ملفوف نظر آتی ہے۔

ایثار رواداری کے لئے ایثار بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح تلاش، حق یا جستجوئے مقصود کے لئے لازمی ہے۔ خیالی، مالی، مدنی، مذہبی، علمی ہر طرح کے ایثار سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایثار ہی وہ آب حیات ہے جو غرور، خود پرستی، نمائش، خوشامد، خود غرضی، تعصب یا اسی نوع کے تمام امراض کا پورا پورا ازالہ کردیتا ہے۔

ایثار کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جب تک کوئی شخص گاندھی، موتی لال، جواہر لال، سی۔ آر۔ داس۔ نیروجی، محمد علی، لاجپت رائے نہ ہو اس کی کوئی قربانی وقیع نہ ہوگی۔ یہ ایک زبردست غلط فہمی ہے۔ غریب آدمی کی کم سے کم قربانی بھی رئیس کی بڑی سے بڑی قربانی سے کم درجہ نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ مقابلتہً کوئی فرق ہو تو ہو مگر تناسب کے اعتبار سے کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ آسان سی مثال یہ ہے کہ ایک شخص جس کی حیثیت ایک لاکھ روپیہ کی ہے وہ پچاس ہزار کی قربانی کرے تو وہی بات ہوگی جیسے دوسرا شخص جس کی حیثیت ایک روپیہ کی ہے وہ آٹھ آنہ کی قربانی کرے۔ مقابلتاً دونوں رقموں میں بہت فرق ہے مگر تناسب کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں یعنی جو حالت

آٹھ آنہ کی ایک روپیہ میں پچاس فیصدی کی ہے وہی حالت پچاس ہزار کی ایک لاکھ میں ہے۔
اس مثال سے میری غرض یہ ہے کہ ایثار کا معیار ہر شخص کی ذاتی حیثیت پر مبنی ہے، اس لئے رواداری کے حصول کے لئے بادشاہ سے لیکر فقیر تک ہر شخص ایثار کر سکتا ہے اور ہر شخص کا ایثار وقیع اور مفید ہوگا۔

زندگی کیا ہے؟

زندگی ایک سفر ہے — وکٹر ہوگیو

زندگی خواب ہے اور موت بیداری — برمیوطل

زندگی عجز و انکسار پر ایک طویل سبق ہے — بیری

زندگی ازل اور ابد کے درمیان ایک ہلکی سی ضیا ہے۔ — کارلائل

زندگی ایک مختصر سا دن ہے لیکن سراسر مصروفیت — خاموں

زندگی ہم میں سے گذرتی ہے لیکن ہم اس پر قبضہ نہیں کر سکتے — امیل

زندگی ختم ہو جاتی ہے جب ہم زندہ رہنے کی تیاری شروع کرتے ہیں — ایمرسن

زندگی مقدس ہے لیکن اس سے مقدس تر ایک چیز اور ہے۔ حیف ہے اس کے جینے پر جو مقدس کے ذریعہ سے مقدس تر کو حاصل نہیں کرتا — کارلائل

زندگی سمندر کے پانی کے مانند ہے، اُسی وقت پاکیزہ ہوتی ہے جب آسمانوں کی طرف اُٹھتی ہے — جین پال

زندگی نیند ہے، اور محبت خواب۔ جو محبت کرتا ہے۔ وہ زندہ ہے۔

فاتح یا مفتوح

(از جناب اعجاز الہ آبادی ایم اے)

دنیا کی چند دلچسپ و مضحکہ خیز غلطیوں میں یہ بھی ایک عجیب غلطی ہے کہ عاشق سے مراد مرد ہے، اور معشوق عورت کا دوسرا نام سمجھا جاتا ہے۔ جس وقت زمانہ کو اپنی اس غلط فہمی کا احساس ہوگا۔ اس کی پشیمانی خود اس پر خندہ زن ہوگی اور اس کے ساتھ یہ خیال بھی کسی خبط سے کم نہیں کہ عاشق ہمیشہ مفتوح اور معشوق ہمیشہ فاتح ہوتا ہے یعنی نسوانیت مردانگی پر فاتحانہ انداز سے قادر ہے۔

جس طرح عورتوں کے راز کا پتہ لگانا دشوار ہے اُسی طرح مردوں کی مصلحت کا سمجھنا عورتوں کے لئے بھی آسان نہیں۔ یہ بھی ایک پُراسرار بات ہے کہ مردوں نے عورتوں کو معشوق کیوں کہا مگر یہ اس سے کم پُر لطف نہیں کہ عورتوں نے اسے تسلیم کیوں کر لیا۔ غالباً اپنی فتح کی تمہید سمجھکر مجھے اس سے انکار نہیں کہ عشق کا اظہار زیادہ تر مردوں کی طرف سے ہوتا ہے مگر میں اس سے بھی واقف ہوں کہ کبھی کبھی عورت بھی دردِ دل کے اظہار میں سبقت کرتی ہے خواہ دبی زبان ہی سے کیوں نہ ہو۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ نہ ہر عورت زلیخا ہے اور نہ ہر مرد یوسف، باوجود اس کے صورت حال یہی بتاتی ہے کہ مرد ہر حال میں فاتح ہے۔

عورت کی سب سے بڑی دلیل اپنے فاتح ہونے کی یہ ہے کہ وہ اپنے عاشق (مرد) کو اشاروں پر چلاتی ہے۔ جو ستم چاہتی ہے کرتی ہے، وہ اُف نہیں کرتا یہاں تک کہ وہ اگر نا بھی بغیر اجازت کے دشوار ہے یوں تو شکست و فتح بالکل دو جداگانہ باتیں ہیں جس کو ہر شخص سمجھتا ہے خواہ عورت ہو یا مرد مگر شکست و فتح قائم کب ہوتی ہیں، اس کا سمجھنا کسی قدر مشکل ہے۔ عموماً لڑائی کے خاتمہ پر وہی فاتح سمجھا جاتا ہے جس نے زیادہ سفاکی اور خون ریزی کے ساتھ اپنے مخالف کو بے دست و پا کر دیا ہو لیکن کبھی کبھی اس کے خلاف بھی ہوا ہے، بظاہر دشمن نے اپنے فریق کو خانماں خراب کر دیا ہے، دنیا نے اس کو بیکس و بے بس سمجھکر ہمیشہ کے لئے مغلوب و مفتوح سمجھ لیا ہے مگر کچھ دن کے بعد پردہ غیب سے کچھ اور نتیجہ ظہور میں آیا ہے۔

خاک میں ملنے والے کی صداقت اور قربانی مرنے کے بعد وہ اثر پیدا کرتی ہے کہ چند دن کے فاتح کو ہمیشہ کے لئے مفتوح بنا دیتی ہے اور دنیا نے جس کو غلطی سے مفتوح سمجھا تھا وہ ہمیشہ کے لئے فاتحانہ انداز سے تاریخ کے صفحہ پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں دنیا کے اس عظیم الشان واقعہ کا ذکر کرنا نامناسب نہیں معلوم ہوتا جو میری اس دلیل کے لئے قطعی ثبوت ہے اور جس کی طرف مولانا محمد علی مرحوم نے نہایت پر لطف اشارہ کر کے شکست و فتح کا راز سمجھا دیا ہے۔ کہ

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

لیکن سانحۂ کربلا اس کی تنہا مثال نہیں اور بھی بہت سی اس قسم کی مثالیں ہیں، مگر طول کلام کی وجہ سے نظر انداز کرتا ہوں۔

یہی انجام مرد و عورت کا ہوتا ہے، مرد تھوڑی دیر کے لئے مفتوح نظر آتا ہے مگر آخر میں ایک بڑی آزمایش کے بعد میں مردانہ وار کامیاب ہوتے دیکھکر عورت ہمیشہ کے لئے اُس کی مطیع ہو جاتی ہے۔ حسن و عشق کے معرکہ میں تھوڑی دیر کے لئے اگر یہ مان لیا جائے کہ مرد ہی عاشق ہے اور عورت صرف معشوق ہے، تو بھی یہی نظر آتا ہے کہ مرد فاتح اور عورت مفتوح ہے۔

یہ ممکن ہے کہ میرے اس بیان پر کوئی بے ساختہ یہ کہدے کہ "مصور ایں تصویر مرد است نہ کہ زن"، لیکن آپ باور کیجئے کہ صنفِ نازک کے لئے دل تو کیا میں جان تک دینے کے لئے تیار ہوں مگر اس کو کیا کروں کہ حقیقت کا خون نہیں کیا جاتا۔ آپ کہیں گے کہ یہ عجیب منطق ہے کہ مرد خواہ عاشق ہو یا معشوق ہر حالت میں فاتح ہے مگر عورت چاہے عاشق ہی کیوں نہ ہو پھر بھی مفتوح ہے۔

دوران جنگ میں مرد کا بظاہر مسخر و مفتوح نظر آنا دراصل اس کی شکست کی دلیل خیال کرنا کوتاہ بینی یا عشق کی شعبدہ بازی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت (معشوق) کا حسن درگاہ عشق پر اپنی کچھ تمنائیں لیکر آتا ہے اور پردے میں یہ چاہتا ہے کہ ہمت مردانہ کا امتحان لے جو ہر وقت اپنی خصوصیات کے ساتھ امتحان گاہ محبت میں مردانہ وار قدم رکھنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ حسن سب سے پہلے اُسکی شان کرم کا امتحان لیتا ہے اور کبھی یہ چاہتا ہے کہ سکون و اطمینان مانگ کر مردانگی کا امتحان لے، ہمت مردانہ کو کسی سائل کا سوال رد کر دینے سے عار ہے وہ فوراً ان چیزوں کو دے کر دکھا دیتا ہے کہ میں ہر مصیبت اُٹھانے کی قوت رکھتی ہوں۔ حسن ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور عزیز ترین چیز کو طلب کرتا ہے۔ دل کا جدا کرنا جان دینے سے کم نہیں۔ مگر مرد نہایت خندہ پیشانی سے اس سوال

کو بھی پورا کر دیتا ہے۔ حسن پھر ہوش و حواس پر نظر ڈالتا ہے مرد (عاشق) اس کو بھی نذر کر دیتا ہے عورت
کو اس سے بھی سیری نہیں ہوتی، کبھی کبھی وہ جان بھی طلب کرتی ہے اور مرد اپنی شجاعت و جانبازی
کے نام پر جان بھی نثار کرنے سے دریغ نہیں کرتا، غرض مرد ہر چیز کے دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ مگر
ہمت مردانہ کو وہ کسی حال میں اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، اس استقلال اور مردانگی کا اثر
عورت کے اوپر وہ جادو کرتا ہے کہ وہ خود بخود آخر میں متاثر اور مرعوب ہو کر سر تسلیم خم کر دیتی ہے
اسی کا دم بھرتی ہے اور ایسے جانباز کا مفتوح بننا باعث فخر سمجھتی ہے۔

اگر یقین نہ ہو تو نجد کے میدان میں جا کر ایک محمل نشین سے مجنوں کے بعد کا اثر پوچھ لیجئے
شیریں بادشاہ کی بیوی سہی، فرہاد ایک مزدور سہی مگر اس مردانگی کی قدر اسی ملکہ سے پوچھئے جس نے
اپنی جان شیریں بھی مرنے والے سے عزیز نہ رکھی۔ ماتم و شیون کی صدائیں عرصے تک بے ستون
پر آتی رہیں اور انجام جو کچھ ہوا وہ فرہاد کی فتح کا خود نقارہ بجا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ اسے افسانہ
سمجھ کر ٹال جائیں تو تاریخ کے صفحات پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ مہاراجہ پرتھی راج اور سنجوگتا کے واقعہ
پر غور کیجئے۔ پرتھی راج کے دام محبت میں محلوں کی رہنے والی کیوں گرفتار ہو گئی۔ یہ کوئی راز کی
بات نہیں ہے۔ لڑکی کے ماں باپ پرتھی راج کے سخت مخالف تھے مگر اس کی مردانگی شجاعت اور
فیاضی سے سنجوگتا اتنی متاثر ہو چکی تھی کہ تمام ہندوستان کے شہزادوں کو سوئمبر کے موقع پر نظر انداز
کر کے پرتھی راج کے مجسمہ کے گلے میں جے مالا ڈال کر اپنی ہار کا کھلم کھلا اعلان عام کر دیا۔ پرتھی
راج کا قرب و جوار میں موجود رہنا اور دربار میں نہ جانا صاف بتا رہا ہے کہ وہ وہاں کی شرکت کو
ننگ مردانگی سمجھتا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ قبل انتخاب دربار میں جانا مردانہ فتح کو صدمہ پہونچا کر
شکست کے میدان میں قدم رکھنا ہے۔ عورت کو مرد کے مفتوح ہونے کا خیال پیدا ہو جائے گا
اس واقعہ نے نہایت نمایاں طور پر مرد اور عورت کے فاتح و مفتوح ہونے میں امتیازی شان
پیدا کر دی ہے۔

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرد تو عاشق ہو کر فاتحانہ شان قائم رکھتا ہے مگر اس کی
کیا وجہ ہے کہ جب کبھی عورت عاشق ہو تو وہ یہ انداز نہیں قائم رکھ سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ عورت
کے ذہنی انقلاب اور اس کی کمزوریوں نے اس کو دلیری اور ہمت کی سے معذور کر دیا ہے۔ وہ
اپنے عشق کے جوش میں لاکھ کوشش کرے اور فیاضی کے ساتھ دل و جان تک قربان کرنے کو
تیار ہو جائے پھر بھی اس کی فیاضی میں نہ تو وہ مردانہ کیفیت ہوگی اور نہ وہ آزادی جو ایک فاتح

کے شایان شان سمجھی جاتی ہے۔ اس کا ہر کام ڈر اور حجاب کے پردے میں ہوگا۔ اس کی داد و دہش میں بھی شان کرم کے بجائے حسن طلب ہوگا۔ مختصر یہ کہ نسوانیت کا غلبہ اتنا زبردست ہوتا ہے کہ کسی طرح مردانہ وار کام نہیں کرنے دیتا۔ عورت اپنی جانبازی پر بھی لرزاں رہتی ہے اس کی شرم اس کو دل میں بھی نازاں ہونے کا مشکل سے موقع دیتی ہے۔ وہ کام کی اہمیت سے بے خبر نہ سہی مگر نتیجہ کو اپنے لئے باعث فخر بھی نہیں خیال کرتی، وہ ہر وقت سمجھتی ہے کہ یہ کام مردوں ہی کے لئے ہے۔ جس فعل کو کوئی اچھا نہ سمجھیگا اس کے کرنے میں جس آزادی سے وہ کام لے گا وہ ظاہر ہے اور فاتح کا لقب اس کے لئے جتنا موزوں ثابت ہوگا اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

مشرق میں عورتیں جس قدر اپنے شوہر کی مطیع و فرمانبردار ہوتی ہیں وہ آپ اپنی مثال ہے یہ اگر ان کی مفتوحیت نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ خواہ اس کی وجہ کو محبت سے تعبیر کیجئے یا مردوں کا اقتدار سمجھئے۔ مگر حقیقت پر بھی غور کرتے چلئے۔ میرے نزدیک مردوں کے دو جوہر جانبازی و استقلال عورت کو اس اطاعت و فرمانبرداری پر مجبور کرتے ہیں۔ مرد کی جانبازی سے عورت کو یقین ہے کہ اگر اس کے (مرد کے) ابروے مردانہ پر عورت کی وجہ سے کسی طرح کا فرق آتا ہوا نظر آئیگا تو وہ اپنی جان عزیز کو دینے سے بھی دریغ نہ کرے گا اور اگر ضرورت ہوئی تو سر دے کر بھی اپنا وقار قائم رکھے گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتی ہے کہ یہ اپنے دھن کا پکا بھی ہے جس کا اندازہ حسن و عشق کے معرکہ میں وہ کر چکی ہے۔ مرد کی یہ دو خصوصیات ایسی ہیں جو عورت کو اطاعت و فرمانبرداری یا بہ الفاظ دیگر محبت پر مجبور کرتی ہیں۔ مرد اپنی آزادی خیال کی بنا پر ہمیشہ آزاد ہوتا ہے جس کو اکثر صنف نازک شکایت کے پیرایہ میں ہمیشہ پیش کرتی ہے کیونکہ وہ اپنی مفتوحیت کے نقطہ نگاہ سے مرد کے افعال کو بھی جانچنا چاہتی ہے۔ لیکن یہی وہ چیز ہے جو مرد کو ہمیشہ فاتح بنائے رہتی ہے۔ جس مرد کو اپنے اس جوہر کا خیال نہیں اس کو مردوں نے کبھی مرد کامل نہیں سمجھا بلکہ اپنے سے الگ ایک طبقہ میں نامزد کیا اور اس کی جبین انفعال پر "زن مرید" کا لقب لکھ دیا۔

ممکن ہے کہ صنف نازک کو میرے ان خیالات پر غیض و غضب آئے لیکن میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان میں ہر عورت بلا استثناء مفتوح ہے اور ہر مرد فاتح ہے۔ دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں جس میں استثناء نہو۔ ممکن ہے کہ کچھ عورتیں ایسی بھی ہوں جو فاتح کی شان رکھتی ہوں اور چند نام نہاد مرد ایسے بھی ہوں جو یقیناً مفتوح ہوں مگر شاذ پر مثال نہیں قائم کیجاتی۔ اسکو بھی ذرا ایک سرسری طور سے دیکھ لیجئے کہ دنیائے عشق کے اسٹیج پر کتنی عورتیں ایسی نظر آئیں جو صحیح معنوں میں فاتح کہی جاسکتی ہیں۔

شاعر

(از مسٹر جے کرشن)

شاعر مفلس تھا اس کا چھوٹا سا کچا مکان شہر کے باہر دریا کے کنارے واقع تھا لیکن وہ اس میں بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ لوگ اُسے کسی نہ کسی ویرانے میں، کسی نہ کسی درخت کے تلے یا ندی کے کنارے بیٹھا پاتے تھے۔ اس وقت وہ کچھ سوچا کرتا، اس کے ہاتھ میں ایک پنسل اور ایک کاغذ کا ٹکڑا ہوتا اور وہ اپنے خیالات میں محو رہتا، لوگ اس کے پاس آتے لیکن وہ اُن سے گھبراتا۔ کہتے ہیں کہ وہ ابتدا میں کسی معزز عہدہ پر ممتاز تھا لیکن چند ہی سال بعد وہ اس عہدے سے کنارہ کش ہو گیا۔

اب اس کا کوئی ہمدرد و ہم جلیس نہ تھا، اُس کے خیالات ہی اس کے ہمدرد تھے، وہ کوئی مقررہ آمدنی نہ رکھتا تھا۔ اکثر اُسے فاقوں کی بھی نوبت آتی لیکن اُسے اس کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ کبھی کبھی لوگ اس سے زبردستی اس کے پنسل سے لکھے ہوئے پرزے لے جاتے اور انھیں ملک کے مختلف ادبی رسالوں میں بھیج دیتے اور اس سے جو کچھ معاوضہ مل جاتا وہ اُسی میں خوش رہتا۔ تاہم اس نے خود کوئی نظم کبھی کسی اخبار یا رسالے میں نہیں بھیجی۔ اس کا خیال آتے ہی شرم دامنگیر ہو جاتی تھی اور نام و نمود کی اُسے کوئی خواہش نہ تھی۔

پرندوں سے اُس کو محبت تھی۔ ایک روز جب وہ دریا کے کنارے گھاس پر بیٹھا تھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک سوراخ سے ایک کالا سانپ نکلا۔ پہلے تو سانپ ڈرا اور پھن اونچا کر کے غصے سے پھنکارنے لگا۔ مگر شاعر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اور مسکرا مسکرا کر ہاتھ کے اشارے سے اُسے اپنے پاس بلانے لگا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ تھوڑی ہی دیر بعد سانپ شاعر کے بالکل ہی قریب آ گیا اور پالتو کتے کی طرح اپنا سر نیچا کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ شاعر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا جاتا تھا اور کچھ سوچ کر کاغذ پر کچھ لکھتا جاتا تھا۔

وہ چڑیوں کے چہچہوں کو بڑے غور سے سنتا اور سن کر کسی خیال میں غرق ہو جاتا پھولوں سے

اُسے خاص اُنس تھا، ایک دن کا ذکر ہے کہ وہ جنگلی گلاب کی جھاڑی کے پاس بیٹھا تھا۔ جھاڑی کے چاروں طرف گلاب ہی گلاب پھول رہے تھے کہ اتفاق سے ایک مسافر کا اُدھر سے گذر ہوا، اُس نے پھول توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا، شاعر نے نہایت عجز و انکسار اور منت و سماجت سے اس سے پھول توڑنے کی ممانعت کی، مگر مسافر نے کوئی سماعت نہ کی اور پھول توڑ لیئے۔ شاعر نے ایک آہ سرد بھری۔ آنسوؤں کے چند قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

برسات کے دن تھے، شاعر ایک دن کسی گاؤں سے ہو کر نکلا، اُس نے ایک دالان دیکھا، اُسکی دیواریں دھنس گئی تھیں، چھت چھلنی ہو رہی تھی اور دھنیاں بالکل نیچے آگئی تھیں، اُسی کے نیچے ایک آدمی بیٹھا ہوا موٹی موٹی روٹیاں سینک رہا تھا، مٹی کے چند ٹوٹے پھوٹے برتن اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ اُس آدمی کے پاس اس کا ننھا لڑکا بیٹھا رو رہا تھا، وہ آدمی پہلے تو اُسے بہلاتا رہا پھر اُس کی ضد سے عاجز آکر ذرا تُند لہجے میں بولا "لے روٹی کھالے میرے پاس کچھ اور نہیں رکھا ہے" یہ کہکر اُس نے ایک آہ سرد بھری، ناسمجھ بچّہ کچھ نہ سمجھا اور مچل مچل کر رونے لگا۔ شاید وہ روٹی کے علاوہ مٹھائی کھانے کو مانگتا تھا۔

شاعر کا دل یہ نظارہ دیکھکر اندر ہی اندر رو اُٹھا، اُسی دن اُس کے پاس کسی پریس سے پندرہ روپیہ کا منی آرڈر آیا تھا، وہ اُس آدمی کے پاس گیا اور سب روپئے اس کے سامنے رکھدیئے پہلے تو وہ آدمی بھوچکا سا رہ گیا پھر اُس نے بہت انکار کیا لیکن شاعر نے ایک نہ سُنی اور روپیہ چھوڑکر وہاں سے چلدیا۔

پُراسرار افسانے از باصر صاحب، کراؤن سائز، ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۸؍
ملنے کا پتہ: ادبی مرکز، لاہور

اردو میں بھی جاسوسی کے متعلق افسانے مقبول عام ہو رہے ہیں مگر یہ قصے عموماً انگریزی سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ یہ بھی جاسوسی کے افسانوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے جس میں چھ مختصر اور ایک طویل قصہ ہے۔ تفریح کے لئے ان قصّوں کو پڑھنا بیجا نہ ہوگا، کاغذ کھردرا اور کتابت و طباعت معمولی ہے۔

ناکامِ آرزو

کدار ناتھ اب تقریباً بوڑھا ہو چکا، دن بھر کھیتوں میں مزدوری کرنے کے بعد جو کچھ مل جاتا اسی پر قناعت کرتا، آج تک کسی نے اس بوڑھے کو اپنی قسمت کا شکوہ وشکایت کرتے نہیں سنا غربت اور تنگدستی میں بھی اُسے مسرت حاصل رہی، صبر وقناعت کی یہ سراپا تصویر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آرزوؤں سے ناآشنا ہے۔ انسانی زندگی کو برباد کرنے کے لئے یوں بھی دنیا کے افکار و حوادث ضرورت سے زیادہ ہیں لیکن جب زندگی خود وبال ثابت ہو رہی ہو تو رنج وآلام کی یہ یورشیں اور زیادہ تکلیف دہ ہو جاتی ہیں۔ کدار ناتھ کی بیوی داغ مفارقت دے چکی تھی، اس کے دو بچوں نے بھی دنیا سے منہ موڑ لیا تھا، وہ اس صبر آزما زندگی کا مقابلہ کرنے کے لئے اب تک موجود تھا۔ دریاؤں کی ان چٹانوں کی طرح جو طوفانی موجوں کے تھپیڑے کھا کر بھی خاموش کھڑی رہتی ہیں۔ لالہ جی کی زندگی کا سہارا ان کی ایک چھوٹی لڑکی لیلاوتی تھی۔ یہ بچی زندگی کے حوادث سے بیخبر معصومیت کے گہوارہ میں پل رہی تھی۔

کدار ناتھ خود پیٹ پر پتھر باندھتا مگر اُسے یہ گوارا نہ ہوتا کہ اس کی لڑکی بھوکی رہے، ایک دھوتی اور ایک پھٹے پُرانے کرتے میں وہ مہینوں بسر کر دیتا۔ مگر وہ یہ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ گاؤں کی لڑکیوں کے مقابلہ میں اس کی بچی پہننے اوڑھنے میں کسی سے کم رہے۔

(۲)

زندگی اسی طرح بسر ہوتی رہی، لیلاوتی جو کل تک بچی تھی آج شباب کی منزل کے قریب نظر آئی وہ گاؤں کے بچوں کے ساتھ اب کھیتوں میں کھیلتی نظر نہ آتی تھی، گھروندے بنا کر کھیلنے اور پھر انہیں توڑ دینے کا دور ختم ہو چکا تھا، وہ اب گھر ہی میں رہنے لگی۔

لالہ جی اب خوش خوش نظر آتے تھے جیسے انھیں کوئی دولت مل گئی ہے۔ پنگھٹ پر لڑکی کو

اپنی سہیلیوں کے ساتھ پانی بھرتے دیکھکر باغ باغ ہوجاتے، دن بھر محنت و مشقت کر کے جب گھر لوٹتے اور دروازے پر لیلاوتی مسکراتی ہوئی "پتاجی" کہدیتی تو ان کی ساری کلفت دور ہوجاتی، چکی پیستے ہوئے جب وہ گانے لگتی تو یہ جھومتے اور خود بھی کبھی کبھی اسکے ساتھ گاتے۔

مسرت کی اس فراوانی کے ساتھ رنج و آلام نے بھی پیٹ سے پاؤں نکالنے شروع کر دئے۔ لیلاوتی بڑی ہوتی جارہی تھی اور لالہ جی کو ادھر اس کی شادی کی فکر دامنگیر ہوئی، جس دل میں آرزوئیں نہیں ہوتیں وہی چین سے رہ سکتا ہے۔ لالہ کدارناتھ کو آرزو ہوئی کہ ان کی لڑکی کے لئے کوئی خوشحال بر ملے، اور وہ روز بروز اسی فکر میں گھلنے لگے۔

لالہ کدارناتھ نے لیلاوتی کو اس ناز و نعم سے پالا تھا کہ وہ مصیبت زدہ زندگی کے احساس بھول گئی، اب انھیں فکر تھی کہ یہی بے فکری کی زندگی دوسرے دور میں بھی قائم رہے۔ ان کی ایک ہی آرزو تھی کہ لیلاوتی کی آئندہ زندگی امن و اطمینان سے گذر جائے۔ انہی فکروں میں رات دن کٹنے لگے۔ مایوسی کے ساتھ امید نہ رہے تو زندگی عذاب جان ہوجائے۔ وہ ایک غریب آدمی تھا لیکن اس پر بھی اسے امید تھی کہ اس کی آرزو پوری ہوگی۔ خوشی انسان کے دل کے سوتے بہت جلد کھول دیتی ہے لیکن جب رنج و محن ذرا بھی غالب آجائے تو دل کا غنچہ مرجھا جاتا ہے۔

شام کے کھانے کے بعد گاؤں کے بڑے چبوترے پر سب بوڑھے جمع ہوتے، کدارناتھ بھی روزانہ حاضری دیتا، گاؤں کے قضیئے طے کئے جاتے، قصے داستانیں چھڑتیں، زندگی کے تجربات بیان کئے جاتے، چلمیں بھری جاتیں اور آپس میں خاطر تواضع ہوتی، کدارناتھ کے اس معمول میں کبھی فرق نہ آیا تھا مگر وہ اب غیر حاضر رہنے لگا، گھر میں وہ عموماً مغموم بیٹھا رہتا، اس بیمار کی طرح جو صحت و عافیت سے مایوس ہوچکا ہو غریب کدارناتھ کے پاس کیا تھا، پیٹ بھرنے کو جہاں وقت پر روٹی میسر نہ آتی ہو وہاں روپیہ پیسہ کی صورت کس طرح نظر آسکتی ہے۔ لیلاوتی باہر نکلتی تو گاؤں والے انگشت نمائی کرتے، کوئی کہتا "اتنی عمر تک لڑکی کو بٹھا رکھنے کا کیا سبب ہے؟"

کوئی کہتا "کچھ نہ کچھ بھید ہوگا۔"

عوام کے یہ طعنے کدارناتھ کے دل میں تیر بن کر اترتے، مجبوری و مفلسی لاعلاج ہوتی ہے، زندگی کے یہ لمحے ناقابل برداشت ہوتے گئے کدارناتھ نے ہزار جتن کئے کہ کہیں سے کچھ قرض حاصل کرے، مفلس و قلاش آدمی پر کون بھروسہ کرتا ہے ہر طرف سے ٹکا سا جواب ملا مصیبتوں سے جب انسان تنگ آجائے تو وہ قسمت کے سہارے پر خاموش ہو بیٹھتا ہے۔ لالہ کدارناتھ لوگوں

کی منت سماجت کرتے کرتے عاجز آ گئے تھے اور آخر تھک کر بیٹھ رہے۔

(۳)

دو سال کی طویل مدت باتوں باتوں میں گذر گئی لیکن کدار ناتھ کے لئے یہ دو سال پہاڑ ثابت ہوئے، ساری دعائیں اور التجائیں بیکار ثابت ہوئیں، زمانہ نے پلٹا کھایا تو مفلسوں کا بھی نصیبا جاگ اُٹھا مگر کدار ناتھ کنگال کا کنگال ہی رہا۔

ایک صبح کدار ناتھ آنگن میں نیم کے درخت کے نیچے چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا، غم و اندوہ سے تھک کر اس انداز میں جیسے کوئی مراقبہ میں مصروف ہو، مایوسیوں کے آسمان پر امید کی کرن نظر آئی تو اس کی باچھیں کھل گئیں، جوش مسرت میں پکار اُٹھا۔

"لیلاوتی! روٹی باندھ دینا، مجھے بسنت پور تک جانا ہے" کدار ناتھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کدار ناتھ لکڑی ٹیکتا ہوا گھر سے نکلا، اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے منزلیں طے ہوتی گئیں۔ بسنت پور بیس کوس کے فاصلہ پر تھا، جس طرح ایک تھکا ماندہ مسافر پانی کی تلاش میں سراب کے دھوکے کھاتے ہوئے بھی آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اسی طرح کدار دوری منزل اور راستہ کی صعوبتوں کا خیال کئے جا رہا تھا، راستہ میں دریا کے کنارے پر اس نے قیام کیا اور درختوں کے ٹھنڈے سایہ میں بیٹھ کر روٹی کھانے لگا۔

آج اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار تھے۔

رام لال کدار ناتھ کا دوست تھا، ان دونوں کو ملے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ لالہ جی سر شام بسنت پور پہنچ گیا۔ اور رام لال کے مکان کا پتہ دریافت کر کے روانہ ہونے لگا۔ کدار ناتھ دل ہی دل میں کہنے لگا "اگر یہ انکار کر دے تو کیا ہوگا؟"

دل نے ڈھارس بندھائی اور وہ امیدوں کو لئے ہوئے رام لال کے مکان پر پہونچا، سلام پیام کے بعد دونوں بیٹھ گئے اور ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ کدار ناتھ نے موقع پا کر اپنی ضرورت کا اظہار کر دیا۔

رام لال کہنے لگا "لالہ جی! کیا بتاؤں، میں بھی مصیبتوں میں گرفتار ہوں، پرسوں ایک ڈگری آئی تھی، ایک کھیت قرق کر لیا گیا۔ اگر میں اس قابل ہوتا تو تمہاری امداد کرنے میں کبھی دریغ کرتا۔"

یہ سنتے ہی لالہ کدار ناتھ پر اوس پڑ گئی۔

کدارناتھ نے کہا "رام لال! اب لیلاوتی کی شادی کا کیا ہوگا!"

"ایشور کو جو منظور ہو" رام لال نے بے پروائی سے جواب دیا۔

کدارناتھ نے رام لال کے آگے ہاتھ جوڑے، اسکی خوشامد کی اور کہا "بھیا! میں تم سے روپیہ مفت مانگ نہیں رہا ہوں، دوستی کا خیال نہ کرو، اور کہیں سے مجھے دوسو روپیہ قرض دلوادو زندہ رہوں تو ایک ایک پائی بیباق کردونگا" رام لال بوڑھے لالہ کی داستان غم سے متاثر ہونے لگا، دل پسیجے بغیر نہ رہا اور اس نے وعدہ کرلیا کہ قرض دلادیا جائیگا۔

لالہ کدارناتھ پھر مسرت کے خواب دیکھنے لگا۔

(۴)

لالہ کدارناتھ لیلاوتی کی شادی کی تیاریاں کرنے لگا، گہنے کپڑے خریدے گئے، مگر اب تک کہیں نسبت نہیں ہوئی تھی، لیلاوتی کی عمر بڑی ہوگئی تھی۔ مفلس کے گھر آنے میں یوں بھی لوگ پس وپیش کرتے ہیں مگر اب آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ دنیا کے منہ کو کون روک سکتا ہے لڑکی کو اس قدر مدت تک بٹھار کھنے پر طرح طرح سے نکتہ چینیاں ہونے لگیں، کدارناتھ اپنی قسمت پر رورہا تھا۔

زندگی امن وچین کے راستہ سے گذرتی ہے تو مصیبتوں کی طرف بھی کبھی رخ کرلیتی ہے مگر جب یہ مستقل عذاب کی صورت اختیار کرلے تو خوشحالی کی طرف لوٹ کر بھی نہیں دیکھتی۔ لالہ کدارناتھ بازار سے واپس ہورہا تھا۔ راستہ میں برادری کے بعض لوگ مل گئے۔ کدارناتھ کترا کر دوسرے راستہ سے جارہا تھا۔

ایک نے ٹوک کر کہا "کہاں جارہے ہو لالہ جی!"

کدارناتھ رک گیا اور پیشانی پر سے پسینہ کے قطرات کو ہاتھ سے زمین پر ٹپکاتے ہوئے کہا "گھر جارہا ہوں"

"آخر لیلاوتی کی شادی کا کیا ہوا؟"

"ابھی کوئی پیام جما نہیں ہے۔"

دوسرے نے کہا "آخر اس طرح کب تک بٹھا رکھوگے۔"

لالہ کدارناتھ نے کہا "کیا کروں بھیا!"

"اسے اٹھا دینے کی فکر کیوں نہیں کرتے؟"

لالہ کدار ناتھ بت کی طرح خاموش کھڑا ہوا تھا۔

تیسرے نے کہا "لالہ جی! آگے چلکر پچتاؤ گے۔ اگر کچھ زمانہ اور گذر گیا تو تمہاری لڑکی کو کتا بھی نہ پوچھیگا"

لالہ کدار ناتھ غریب آدمی تھا لیکن آج پہلی مرتبہ اسے مصیبت زدہ زندگی کا احساس ہوا۔ وہ احساس جو دنیا میں سب سے زیادہ جاں گسل ہے۔ وہ کھویا ہوا تھا اور ننھے بچوں کی طرح اپنے ساتھیوں کا منہ تک رہا تھا

لالہ کدار ناتھ دوسرے دن اپنے ایک دُور کے رشتہ دار کے پاس لڑکی کا پیام دینے خود گیا، اس وقت احساس ندامت سے اس کی گردن جھکی جا رہی تھی

"رام ناتھ جی! اپنے بیٹے بھولا ناتھ کے لئے لیلاوتی کو قبول کر لو" کدار ناتھ نے کہا۔

"یہ آپ کے گھر میں لونڈی بن کر رہیگی، میرا اب دنیا میں کون ہے اگر میری آنکھوں کے سامنے لیلاوتی کی شادی ہو گئی اور وہ چین سے رہنے لگی تو میں اطمینان سے مرونگا"

رام ناتھ نے کدار ناتھ کا جی رکھنے کو کہا "بھیّا! تم نے بہت دیر کی۔ میں لڑکی والوں کو زبان دے چکا ہوں، بھولا ناتھ کی آئندہ ہفتہ منگنی ہونیوالی ہے، اب کیا ہو سکتا ہے"

(۵)

بھولا ناتھ کے منگیتر کے گھر میں منگنی کی تیاریاں شروع ہو گئیں، گاؤں میں ڈھول کی آوازیں دُور دُور سے آنے لگیں۔ گھر کے سامنے منڈوا ڈالا گیا۔ عورتیں جمع ہونا شروع ہوئیں، مہمان آنے لگے، گھر بھر میں خوشی تھی لیکن ادھر کدار ناتھ مایوسیوں کے دریا میں غوطے کھا رہا تھا۔

مایوسی دیمک کی بُری چیز ہوتی ہے، اچھے اور بُرے میں اس وقت تمیز نہیں ہوتی، کدار ناتھ کی مصیبتیں ختم نہیں ہوئی تھیں، مایوسیوں نے چاروں طرف سے اُسے گھیر لیا تھا مصیبتیں جب حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہیں تو ان سے چھٹکارا پانے کی انسان کوشش کرتا ہے چاہے اس کے لئے اسے سخت خطرناک راستہ ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ لالہ کدار ناتھ اب یہ راستہ اختیار کر چکا تھا۔

رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا، آسمان پر تارے چمک رہے تھے، دن بھر کام کاج کرنے کے بعد گھر والے گہری نیندیں تھے، آدھی رات کو ایک شخص کندھے پر کلہاڑی رکھے ہوئے راستہ سے گذر رہا تھا، پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جیسے کوئی چور چوری کرنے جاتے ہوئے گھبراتا ہے دلہن منڈوے کے نیچے سو رہی تھی، موت کا فرشتہ منڈوے پر پرواز کر رہا تھا، کدار ناتھ آہستہ سے منڈوے کی طرف بڑھا اور کلہاڑی سے دو چار وار کرنے کے بعد بھاگ نکلا۔ ابھی ابھی جس گھر میں شادیانے بج رہے تھے، وہاں سے آہ و بکا کی آوازیں آنے لگیں۔

قدرت کے کھیل کتنے عجیب وغریب ہوتے ہیں۔!!

(۶)

آج سارے گاؤں میں ڈھنڈورا پیٹا گیا، لالہ کدار ناتھ کو شام کو پھانسی دی جانے والی تھی، گاؤں کے بڑے میدان میں لوگ بہت پہلے جمع ہونا شروع ہو گئے گویا انھیں دعوت دی گئی ہے۔ میدان میں املی کے سایہ دار درخت کے نیچے انسانی زندگی کو پامال کرنے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ لوگ اس بوڑھے قاتل کو دیکھنے کے لئے مضطرب تھے جس کی سفاکی کا چرچا گھر گھر ہو چکا تھا۔

کوئی تین بجے کدار ناتھ میدان میں لایا گیا،

اُسے دیکھتے ہی عوام کی انگلیاں اُٹھنے لگیں۔

"اس بڑھاپے میں یہ سفاکی کرتے ہوئے شرم نہیں آئی"۔

"کتنا خونخوار ہے" لوگ آپس میں اس طرح باتیں کرنے لگے۔

کدار ناتھ مسرور تھا، چند لمحوں میں اس کی شمع حیات بجھ جانے والی تھی، لیکن اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں تھے۔

مرنے والے کی یہ خوشی لوگوں کو کسی طرح پسند نہ آئی، وہ اسے گالیاں دے رہے تھے، اس کے خلاف غصہ ونفرت کا اظہار کر رہے تھے، مگر کدار ناتھ خوش تھا کہ اس کی آرزو اب پوری ہو کر رہیگی

پھانسی کا وقت قریب آگیا تھا، مجمع میں اضطراب پیدا ہو گیا، لالہ کدار ناتھ سے پوچھا گیا "کہو تمہاری آخری خواہش کیا ہے"

لالہ کدار ناتھ نے کہا کہ میں شیام لال سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں،

کدار ناتھ کا شناسا شیام لال میدان میں آیا،

کدار ناتھ نے اس سے کچھ دریافت کیا تو اس نے آہستہ سے کہا کہ لیلاوتی کی شادی بھولا ناتھ سے اب نہیں ہو سکتی"

کدار ناتھ پاگلوں کی طرح پکارنے لگا "لیلاوتی!" "لیلاوتی!!" وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا، کچھ عرصہ پہلے وہ موت کا استقبال کرنے آیا تھا اب اس کے نام سے جانے لگا۔ مجمع پر سکون چھایا ہوا تھا۔ جلاد کے بے رحم ہاتھ بڑھے، بوڑھے کے گلے میں پھندا ڈالا گیا، اب وہ پھانسی پر لٹک رہا تھا، مجمع زار زار رونے لگا۔

تنقید کتب

مصنفہ مولوی حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی۔ ناشر ہندوستانی

آنکھ کا نور اور دوسرے افسانے

پبلشنگ ہاؤس میرٹھ۔ قیمت ۱۲ر صفحات ۱۱۲

اردو کے افسانہ نگاروں میں حضرت افسر کا مرتبہ بہت بلند ہے، انکی زبان میں وہ بے ساختگی اور لطافت ہوتی ہے جو بہت کم افسانہ نگاروں کے یہاں پائی جاتی ہے، وہ سلاست کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ آج کل جو انشا پردازی کا ایک نیا طرز پیدا ہو رہا ہے جسے جذبات عالیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے آپ اس طرز کے مقلد نہیں۔ "آنکھ کا نور" آپ کی ۹ مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے اور ہر ایک کہانی دل کے کسی نازک تار کو مترنم کرتی ہے۔ "آنکھ کا نور" میں ایک کریہہ المنظر نوجوان کی شادی ایک حسین مگر اندھی لڑکی سے ہوتی ہے۔ جب قدسیہ ایک بچے کی ماں ہوجاتی ہے تو اُسے بینائی سے محروم رہنا ناقابل برداشت ہوجاتا ہے۔ ایک تجربہ کار ڈاکٹر آتا ہے اور قدسیہ کی آنکھوں کا آپریشن ہوتا ہے۔ اس وقت قدسیہ کے دل میں کتنے پاکیزہ جذبات پیدا ہوتے ہیں

"اگر یہ واقعی صحیح ہے کہ ان کی (شوہر کی) صورت سے لوگ گھبراتے ہیں تو مجھے ان سب کا بدل ہونا چاہیئے۔ میں اس زہر کا تریاق ہونگی۔ میں ساری دنیا کی نفرت اور کراہیت کے مقابلہ میں اتنی محبت اور الفت پیش کرونگی کہ اس کا کوئی اثر اُن کے دل پر باقی نہ رہے"

یہ قصہ متاہل زندگی کی رواداریوں کا ایک شفاف آئینہ ہے۔

"فقیر کی لڑکی" اس حقیقت کی تفسیر ہے کہ شقی سے شقی انسان کے دل میں نازک جذبات پنہاں ہوتے ہیں اور بعض اوقات ایسے مواقع آتے ہیں جب ایک سیہ کار انسان فرشتہ خصلت بن جاتا ہے۔ اس طرح ہر ایک کہانی میں کوئی نہ کوئی جذباتی یا اخلاقی حقیقت ظاہر کی گئی ہے اور نہایت دلآویز پیرایہ میں افسانیات میں آنکھ کا نور یقیناً ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ (پریم چند)

نقش و نگار

از جلیل احمد قدوائی، بی۔اے (علیگ) کراون سائز ۸۴ صفحات، قیمت عہ، مطبوعہ مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ،

بقول مسٹر عبدالشکور "مسٹر جلیل قدوائی کی ذات اور اُن کے ادبی کارناموں سے تمام علم دوست حضرات

بخوبی واقف ہیں، ان کے مضامین، افسانے اور غزلیں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔" یہ جلیل صاحب کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں بارہ ۱۲ نظمیں، بینتالیس ۴۵ غزلیں اور صرف دس ۱۰ رباعیاں ہیں۔ شروع میں حضرت مولانا احسن مارہروی کا لکھا ہوا مختصر "تعارف" ہے اور اس کے بعد مسٹر عبدالشکور کا "مقدمہ" جس میں جلیل صاحب کے کلام پر مختصر دلچسپ تبصرہ کیا گیا ہے۔

کلام جلیل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں وہ سب باتیں ایک حد تک موجود ہیں جو شاعر کے کلام میں ہونی چاہیئے اور امید ہے کہ اگر مشق سخن جاری رہی تو وہ آئندہ بہت کچھ ترقی کر سکیں گے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

گلشن نہیں دیکھے کہ بیاباں نہیں دیکھا — تجھ سا کوئی اے رشک گلستاں نہیں دیکھا
ہر حال میں ممنون ہے وہ تیرے کرم کا — دیوانہ کو تیرے کبھی گریاں نہیں دیکھا
تھی شاق دم قید جو گلشن سے جدائی — منھ پھیر کے بھی میں نے گلستاں نہیں دیکھا

پڑ گئی ان کی نظر بیگانہ وار — دل پہ اب باقی نہیں ہے اختیار
تھا ابھی پیش نظر تیرا خیال — یا ریاض غم میں آئی تھی بہار
آج اس رخ پر زراہ التفات — آگئی آخر حیا مستانہ وار
مطمئن ہیں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ — روئیے چلّائیے کیوں زار زار
میرا اظہار محبت اے جلیل — کس قدر ہوتا ہے ان کو ناگوار

پرانا خواب

(ڈراما) از سید سجاد حیدر (یلدرم) کراؤن سائز، ۰۰ا صفحات، قیمت ۱۰/ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڈھ

سید سجاد حیدر صاحب ایک مشاق اہل قلم ہیں اور ترکی زبان سے براہ راست ترجمہ کرنے میں ان کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ یہ مختصر ڈراما بھی ترکی زبان کے ایک دلچسپ ڈرامے کا ترجمہ ہے اور اس قدر دلکش ہے کہ شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے چھوڑنا مشکل ہے۔ ابتدا میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انجام ٹریجڈی ہوگا مگر آخر میں یہ کامیڈی سے بدل جاتا ہے۔ ڈرامہ کا خلاصہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ شگوفہ کو ابتدائے عمر میں کمال سے محبت تھی مگر اس کی تکمیل نہ ہو سکی اور شگوفہ نے شریف سے شادی کر لی۔ ایک مدت کے بعد شگوفہ و کمال کی ملاقات ہوئی اور کمال کی خواہش پر شگوفہ نے اس کے ہاں جانا منظور کر لیا، وہ گئی اور کچھ

ایسے واقعات پیش آئے کہ اس کا شوہر شریف بھی وہاں پہونچ گیا مگر حسن تدبیر سے شگوفہ کے موجود ہونے کا راز نہ کھل سکا لیکن واقعات کا دونوں کے دلوں پر ایسا اثر پڑا کہ دونوں کا دامنِ عصمت داغدار نہ ہونے پایا اور وہ گناہ سے محفوظ رہے۔

رفیق تنہائی

مصنفہ سید علی عباس حسینی صاحب ایم۔اے لکھنوی، قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتہ: مدیر صاحب "ادب" لکھنؤ، و سید نثار مہدی گذری، پٹنہ

یہ سات افسانوں کا مجموعہ اور سید علی عباس حسینی ایم۔اے، لکھنوی کی سحر نگاری کا نمونہ ہے۔ مختصر افسانے میں جو خوبیاں ہونی چاہئے وہ سب ان افسانوں میں موجود ہیں۔

مختصر افسانوں میں اختصار اس اصول پر ہوتا ہے کہ وہ باتیں چھوڑ دی جاتی ہیں جو بغیر لکھے ذہن میں آجائیں مثلاً کہ ارناتھ نے ایک عورت کو قتل کر دیا، یہ تو لکھدیا گیا مگر اس واقعہ کے بعد پولیس اور عدالت کی کارروائیاں چھوڑ دی گئیں۔ اب کدارناتھ کو پھانسی پر دکھایا گیا اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ درمیانی واقعات لازمی طور پر پیش آئے اُن کا درج کرنا افسانے کے اصلی مقاصد کے لئے ضروری نہ تھا۔ جو لوگ اس فن کو اچھی طرح نہیں جانتے وہ افسانوں میں ان غیر ضروری باتوں کو بھی لکھ دیتے ہیں۔ رفیق تنہائی کے مصنف نے نہایت کامیابی سے اس خوبی کو انجام دیا ہے۔ دوسری چیز افسانے میں یہ ہے کہ مختصر عبارت میں کسی کا کیرکٹر اس طرح دکھا دیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ بعض اوقات بلکہ اکثر ایک قابل افسانہ نگار مثالیں ایسی پیش کر دیتا ہے کہ فوٹو کھنچ جاتا ہے۔ یہی مثالیں افسانہ نگاری کا تمغائے امتیاز ہیں۔ قابل مصنف نے اس کمال کا بھی حق ادا کر دیا ہے۔

ایک تیسری شئے افسانوں میں واقعات کے لحاظ اور ہیروز کی مناسبت ہے، الفاظ کا استعمال ہے۔ مصنف نے ہندو ہیروز کے لئے جو ہندی الفاظ ٹھیک موقعوں پر استعمال کئے ہیں وہ نہایت قابل تعریف ہیں۔ افسانوں میں دو باتیں اور دیکھنے کی ہیں، ایک یہ کہ افسانہ نگار کا مطمح نظر کوئی نفسی تعصب نہ ہو مثلاً مصنف کا یہ مقصد ہو کہ اپنی قوم کے افراد کو بمقابلہ دیگر اقوام کے فاتح، بہادر یا نیک چلن دکھلائے یا افسانہ پڑھنے والے لڑکوں اور لڑکیوں پر چال چلن کے لحاظ سے برا اثر پڑے۔ اُن کے نفسی جذبات کو تحریک ہو۔ یہ دونوں عیب بھی ان افسانوں میں نہیں ہیں۔ ہم مصنف کو مبارکباد دیتے ہیں کہ وہ اردو کے خاص افسانہ نگاروں میں شمار کئے جانے کا حق رکھتے ہیں۔ کاغذ اور لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے چھوٹی تقطیع ۱۹۲ صفحے

میکدہ

از جناب نیرؔ واسطی، کراؤن سائز، ۸۴ صفحات، قیمت مجلد ۱۲/ غیر مجلد ۸/

ملنے کا پتہ: سید صفات احمد منیجر دیسی دواخانہ، چونی منڈی، لاہور

یہ حکیم سید علی احمد نیرؔ واسطی کی چند قومی و ادبی نظموں اور غزلوں کا مختصر مجموعہ ہے جس میں اشعار کی تعداد تقریباً دو سو پچھتر ہے۔ شروع میں خود نیرؔ صاحب کا لکھا ہوا مختصر مقدمہ ہے جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ پنجاب کی ادب نواز ہنگامہ آرائیوں نے ان کے دل میں بھی ایک جوش پیدا کر دیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ مختصر سا مجموعہ مرتب ہوگیا۔

کلام میں جوش، سادگی اور کہیں کہیں شکوہ الفاظ موجود ہے مگر روح شعری کی کمی محسوس ہوتی ہے جو غالباً مشقِ سخن کی کمی کے سبب سے ہے۔ اگر نیرؔ صاحب نے شعر گوئی کو جاری رکھا تو ترقی کی بہت کچھ امید ہے۔ غزل کے چند اشعار بطور نمونۂ کلام درج ذیل ہیں:-

آئینہ ہے کہ تماشائی ہے　　　　کیا قیامت تری رعنائی ہے

نگہِ ناز کی ہر ایک ادا　　　　دشمنِ صبر و شکیبائی ہے

گر چکی خرمنِ تقدیس پہ برق　　　　تو ابھی محوِ خود آرائی ہے

دیکھ نیرؔ کششِ دشتِ جنوں

کہ ہر اک ذرہ میں لیلائی ہے

انتخاب حسرت

مرتبہ مسٹر جلیل احمد قدوائی بی-اے (علیگ) کراؤن سائز، ۱۳۲ صفحات

ملنے کا پتہ:- مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

مولانا حسرؔت موہانی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ دنیائے ادب ان کو ایک مدت سے جانتی ہے اور ان کے کلام کی قدردان ہے۔ حسرؔت صاحب کے کلام کا تھوڑا تھوڑا حصہ نو دیوانوں کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ انھیں دیوانوں کا انتخاب ہے، شروع میں مرتب صاحب کا لکھا ہوا ایک مقدمہ ہے جس میں کلامِ حسرؔت پر دلچسپ تبصرہ کیا گیا ہے۔

حسرؔت صاحب صرف غزل کہتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کے کلام میں سادگی، روانی، اثر، بلند پروازی غرض وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک کہنہ مشق شاعر کے کلام میں ہونی چاہئیں۔ چند اشعار بلا انتخاب درج ذیل ہیں:-

سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم　　　　ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

نہ جانا کہ شوق اور بھڑکے گا میرا — وہ سمجھے کہ اس سے جدا ہو گئے ہم
دمِ واپسیں آئے پرسش کو ناحق — بس اب جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم
جب ان سے ادب سے نہ کچھ منہ سے مانگا — تو اک پیکرِ التجا ہو گئے ہم

فنا ہو کے راہِ محبت میں حسرت
سزاوارِ خلدِ بقا ہو گئے ہم

کفیل تھا کرمِ حق جو میگساروں کا — ہجوم ہے لب کوثر گنہگاروں کا
ادھر تو آپ کے الطافِ بیکراں کی دھوم — ادھر یہ حال محبت کے دلفگاروں کا
غرورِ حسن سے فرصت انھیں کہاں جو کبھی — سنیں وہ غور سے حال اپنے خاکساروں کا

اثر جو نغمۂ حسرت میں ہے وہ اور کہاں
کلام دیکھ لیا سن لیا ہزاروں کا

گنجینۂ زرّیں

(حصۂ اول) مرتبہ مسٹر حامد اللہ افسر میرٹھی، کراؤن سائز ۱۰۹ صفحات مجلد قیمت ۸؍، ملنے کا پتہ: ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس، میرٹھ

اس مجموعہ میں جناب مرتب نے شعرائے ماضی و حال کی اُن نظموں کا انتخاب کیا ہے جو قدرتی مناظر کے متعلق کہی گئی ہیں۔ کل نظموں کی تعداد ۴۸ ہے جن میں ۱۲ نظمیں خود افسر صاحب کی ہیں، شروع میں ایک "تقریب" ہے جس میں مرتّب نے جدید اُردو شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے، انتخاب اچھا ہے خصوصاً اس لئے کہ جس قدر شعرا کی نظمیں اس میں موجود ہیں وہ سب اُردو کے مشہور و معروف شعرا ہیں۔ بہر حال سب نظمیں قابل قدر ہیں اور خصوصیت سے طالب علموں کے پڑھنے کے لائق ہیں یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ محکمۂ تعلیم کی طرف سے انعامی کتب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

مکمل شرح کلام غالب

از مولانا عبد الباری آسی الدنی، ڈمائی سائز ۳۲۰ صفحات، مجلد قیمت ۳؍ ملنے کا پتہ: صدیق بُک ڈپو، امین آباد پارک، لکھنؤ

غالب کے عام مروجہ دیوان کی تو متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور خود آسی صاحب نے بھی اس کی ایک شرح لکھی ہے، مگر غالب کا وہ کلام جو مروجہ دیوان میں شامل نہیں ہے ہنوز تشنۂ شرح تھا، یہ غالب کے اسی کلام کی شرح ہے اور مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام جو دستیاب ہو سکا اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے مگر ایسے اشعار جو نا قابل فہم سمجھے گئے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔

شروع میں آسی صاحب نے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں غالب کے کلام کی خوبیوں کے بیان کے ساتھ اس بات کو خصوصیت سے نمایاں کیا گیا ہے کہ مروجہ دیوان کی شرحیں تو بہت لوگوں نے لکھی ہیں اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق مطلب بیان کیا ہے مگر غالب کے اس کلام کی شرح لکھنے کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی جو "حمیدیہ نسخہ" میں ہے یا بعض حضرات کے پاس بیاضوں میں محفوظ ہے۔ یہ شرح پبلشر صاحب کی اولوالعزمی سے نہایت اہتمام سے چھپی ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ جلد خوبصورت اور غالب کے شباب کی رنگین تصویر غیر معمولی اہتمام سے تیار کرائی گئی ہے۔ کتاب پر سنہرے حروف سے نام بھی چھپا ہوا ہے۔ غرض ہر طرح سے یہ شرح دیدہ زیب ہے۔

کلام غالب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

آئینۂ معرفت

مصنفہ سید اعجاز حسین اعجاز ایم۔ اے، کراؤن سائز ۲۰۷ صفحات مجلد قیمت ۶، ملنے کا پتہ:۔ لالہ رام نراین لال، بک سیلر، کٹرہ، الہ آباد

یہ کتاب مصنف کی اس کوشش و تحقیق کا نتیجہ ہے، جو انھوں نے "ریسرچ اسکالر" کی حیثیت سے ۱۹۲۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں کی تھی۔ اس میں تصوف کی ابتدا و ترقی، تصوف کے مدارج، فرقے، فارسی شاعری میں تصوف، اردو شاعری میں تصوف وغیرہ پر اپنی تحقیقات کے نتائج پیش کئے ہیں۔ مصنف کا اصل مقصود اردو شاعری پر تصوف کا اثر دکھانا تھا لیکن صرف اس پر کچھ لکھنا زیادہ مفید نہ ہو سکتا تھا اس لئے تصوف کی ابتدا و اصلیت پر بحث کر کے اور فارسی کے بعد اردو شاعری میں تصوف کا رنگ دکھایا گیا ہے۔ شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں تصوف کی ہمہ گیری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ غرض مجموعی حیثیت سے یہ کتاب بہت دلچسپ و کارآمد ہے۔ اہل ذوق کو اس کے مطالعہ سے مستفید ہونا چاہیئے۔

تصانیف مہر

پروفیسر نراین پرشاد مہر (گوالیار) ایک کہنہ مشق سخنور ہیں اور مرزا داغ دہلوی کے شاگرد رشید ہیں، چنانچہ داغ کے متعدد جانشینوں میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ آپ کی مندرجہ ذیل کتابیں تبصرہ کے لئے ہمیں موصول ہوئی ہیں۔

(۱) سفید جوگن۔ ایک طبع زاد معاشرتی ناول ہے جس کے مطالعہ سے ہندوستانی عورت کی شوہر پرستی کا بہت اچھا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ناول پہلی بار ۱۳۱۲ھ میں شائع ہوا تھا اور اس کے متعلق مولانا شبلی خواجہ حالی وغیرہ حضرات نے بہت عمدہ رائیں ظاہر کی تھیں، زبان سادہ و دلکش ہے اور یہ ناول قدیم طرز

...نول نویسی کا اچھا نمونہ ہے، ۲۰۱ صفحات - قیمت عہ

(۲) نغمۂ مہر، مہر صاحب کی غزلوں کے مختصر مجموعے ہیں جو اس غرض سے مرتب کئے گئے ہیں
(۳) زمزمۂ مہر کہ گانے والے ان کو گا کر محفل رقص و سرود کی رونق بڑھائیں۔ ہر سہ رسائل کی
(۴) ترانۂ مہر قیمت علی الترتیب ۲ر، ۳ر، ۲ر ہے۔

تمام کتابوں کے ملنے کا پتہ: بابو بدری پرشاد ورما سٹھولے۔ دانا اولی۔ لشکر گوالیار

ہم گور غریباں میں

از مسٹر شہنشاہ حسین رضوی ایم۔اے۔ ایل ایل بی۔ ایڈوکیٹ لکھنؤ۔ ۲۶ صفحات قیمت ۴ر ملنے کا پتہ: سید داور حسین ارشاد منزل، وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ

کچھ مدت ہوئی کہ مسٹر شہنشاہ حسین رضوی نے میر و سودا کے مزارات کی تحقیق کے سلسلہ میں سید جالب دہلوی مرحوم کی تحریک پر کئی مختصر مضامین روزنامہ "ہمت" لکھنؤ میں لکھے تھے جن میں ان دونوں شاعروں کے مزارات کے تعین کے متعلق کتابوں اور بعض اصحاب سے جو حالات معلوم ہوئے تھے ان کی تحقیق کے بعد صرف یہ نتیجہ برآمد ہوا تھا کہ میر صاحب کی قبر "مصری کی بغیا" میں اور مرزا سودا کا مزار امام باڑہ آغا باقر میں تھا، مگر اب قبروں کے نشانات موجود نہیں ہیں۔ اب ان مضامین کو مختصر رسالہ کی صورت میں مرتب کر دیا گیا ہے، کاغذ کھردرا ہے اور کتابت و طباعت معمولی۔

آزادی

مترجمہ مولوی سعید انصاری بی۔اے (جامعہ) رائل سائز ۱۹۶ صفحات ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

یہ جان اسٹوارٹ مل کی کتاب "لبرٹی" کا ترجمہ ہے جو انگریزی داں اصحاب سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ البتہ اردو داں حضرات کے لئے نئی چیز ہے۔ اس میں آزادی کا مفہوم، آزادیِ خیال، فرد و جماعت کے اختیارات وغیرہ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ شروع میں پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) کا لکھا ہوا ایک طویل مقدمہ ہے جس میں اس کتاب کے مصنف کے اصول پر تنقید کی گئی ہے۔ موجودہ زمانہ میں جبکہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ درپیش ہے اس کتاب کا مطالعہ یقیناً مفید ہوگا۔ اور اردو داں حضرات کو بہت سی کارآمد باتیں معلوم ہو جائیں گی۔

دنیا کے بسنے والے

مولفۂ سید شبیر حسین زیدی بی۔اے (کینٹب) کراؤن سائز ۲۰ صفحات ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

اس کتاب میں نوعمر طالب علموں کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے اسکیمو۔ سوس۔ بدو۔ حبشی وغیرہ لوگوں کے حالات سادہ و آسان زبان میں مرتب کئے گئے ہیں، جا بجا آدمیوں، جانوروں وغیرہ کی دستی تصاویر ہیں۔

محنت از مولوی محمد عبدالغفار مدہولی، کراؤن سائز ۴۸ صفحات

ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

یہ ایک مختصر ڈراما ہے جو بچوں کے لئے لکھا گیا ہے، اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک امیر کا لڑکا محنت کرنے پر کس قدر جلد امیر بن گیا اور ایک غریب کو جو محنت نہ کرتا تھا مفت میں روپیہ ملا مگر اس نے فضول باتوں میں صرف کر دیا۔ اور بدستور غریب ہی رہا۔ مقصد یہ ہے کہ بچوں کو ابتدائے عمر ہی سے محنت کرنے کی ترغیب دی جائے۔ زبان بہت آسان ہے۔

پانصد دُرِّ نادر از مسٹر محمد حسین خاں بی۔ اے (علیگ) کراؤن سائز ۱۰۰ صفحات قیمت ۳/

ملنے کا پتہ: سید حمید خاں۔ بستی نو۔ جالندھر

اس کتاب میں مؤلف نے اسلامی بزرگوں کے پانچ سو اقوال و احوال جمع کئے ہیں جن سے اخلاقی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ بچوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔ زبان کی خامیاں اکثر پائی جاتی ہیں اور جا بجا پنجابی محاورے نظر آتے ہیں۔ چونکہ مؤلف پنجابی ہیں اور ایک مدت تک افغانستان میں رہ چکے ہیں اس لئے زبان کی خامیاں نظر انداز کر دینے کے لائق ہیں۔ اور کتاب کے مضامین سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

تاریخ غلاف کعبہ مؤلفہ مولوی علی شبیر صاحب صدر منتظم ہائی کورٹ حیدرآباد دکن

رائل سائز ۵۶ صفحات، قیمت ۶/

یہ اسم با مسمّی کتاب ہے، کعبہ پر غلاف چڑھانے کی رسم کی ابتدا اور اس کے بعد مختلف اوقات میں مختلف بادشاہوں کے زمانہ کے جو غلاف چڑھائے گئے ان کے حالات، موجودہ زمانہ میں مصری غلاف کی کیفیت وغیرہ تمام باتیں مستند کتابوں سے اخذ کر کے اس میں درج کی گئی ہیں۔ اسی کے متعلق دس بلاک کی تصویریں بھی شامل کتاب ہیں۔ غرض اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ اردو زبان میں سب سے پہلی اور مکمل کتاب ہے۔ مسلمانوں کو اس کے مطالعہ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

جناب مؤلف سے مندرجہ بالا پتہ سے مل سکتی ہے۔

تمدن اسلام

(حصہ اول) از خواجہ کمال الدین۔ رائل سائز۔ ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ۶؍

ملنے کا پتہ: مسلم بک سوسائٹی، عزیز منزل، برانڈرتھ روڈ۔ لاہور

خواجہ کمال الدین مسلم مشنری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ نے اشاعت اسلام کے سلسلہ میں قابل قدر خدمات یورپ میں انجام دی ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے اسلام کے متعلق بہت سی کتابیں بھی انگریزی اور اردو میں لکھی ہیں اور یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ موجودہ زمانے میں یورپ خصوصاً اور دوسرے ممالک عموماً جو اپنے اپنے مذاہب سے بیزار و بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں اس کے اسباب کیا ہیں۔ اسلام کی تعلیمات کہاں تک ان کی رہنمائی کر سکتی ہیں، طرز تحریر سادہ مگر مدلل ہے۔ شائقین مطالعہ کر کے مستفید ہوں۔

تبسم

مرتبۂ جناب سلیم کدوروی۔ رائل سائز۔ ۳۲ صفحات، سالانہ چندہ ۱۲؍

یہ ایک ماہوار رسالہ ہے جو حال میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس وقت اس کا دوسرا نمبر ہمارے سامنے ہے جس میں کچھ طرحی غزلیں ہیں۔ ایک نظم اور ایک صفحہ کا نثر کا مضمون بھی ہے، ابھی ابتدائی حالت ہے ممکن ہے کہ آئندہ ترقی کر سکے۔

دفتر رسالہ "تبسم" نیا چوک کانپور سے طلب فرمائیے۔

یورپ میں ایک سال

جناب نصیر الدین ہاشمی نے یورپ میں اپنی ایک سال کی سیاحت کے حالات کتاب کی صورت میں شائع کئے ہیں کتاب دلچسپ اور یورپ جانے والوں کے لئے مفید ہے۔

وطن

(از مولانا محمود اسرائیلی)

آسودگی دہر سے نا آشنا وطن — آشوبِ روزگار سے وقفِ بکا وطن
سرچشمۂ صداقت و مہر و وفا وطن — اے بدنصیب! اے ہدفِ ابتلا وطن

بیکس وطن، غریب وطن، بینوا وطن!

لایا وہ رنگ و بوئے چمن روزگار سے — پیدا ہوئی شمیم ترے انتشار سے
گلچیں کا خوں بنا ہے ترے جسمِ زار سے — مٹ کر بھی تیرا فیض جہاں پر رہا وطن

بیکس وطن، غریب وطن، بینوا وطن

فرقوں کی بود و باش سے قوت وطن کو ہے — پھولوں سے رنگ رنگ کے زینت چمن کو ہے
نغموں کے زیر و بم سے بقا انجمن کو ہے — شیر و شکر ہوں یہ تو پھر کیا مزا وطن

بیکس وطن، غریب وطن، بینوا وطن

تاراج ہو چکا ہے بہت گلستاں ترا — پڑھتا رہا ہے مرثیہ ہر نوحہ خواں ترا
یہ غفلتیں مٹائیں گی نام و نشاں ترا — حیرت فزا نہیں ہے یہ کیا ماجرا وطن

بیکس وطن، غریب وطن، بینوا وطن

سمجھے تھے تو غیور ہے ہمت دکھلائے گا — جس طرح ہو گا جانبِ مقصد یہ جائے گا
ہر رہرو ضعیف کا تو دل بڑھائے گا — یہ مرحلہ بھی تجھ سے نہ طے ہو سکا وطن

بیکس وطن، غریب وطن، بینوا وطن

پھر عزم و خلق و ہمتِ عالی سے کام لے — میخانۂ حیات سے الفت کا جام لے
للہ اپنی ڈوبتی کشتی کو تھام لے — وقتِ مدد ہے، زورِ شجاعت دکھا وطن

بیکس وطن، غریب وطن، بینوا وطن!

غرورِ حسن

(از قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی)

ہو نہ مست ان نشیلی آنکھوں پر جو خمار غرور لاتی ہیں
لو نہ بل کی تم اپنی زلفوں پر مثل اژدر جو پیچ کھاتی ہیں

لعل لب پر نہ اتنا ناز کرو زرد پڑ جائیں گے یہ آخر کار
دُرِ دنداں پہ یوں نہ اتراؤ نہ رہے گی چمک دمک زنہار

گل رخسار پر نہ ہو نازاں ایک دن یہ بھی ہوں گے پژمردہ
آئے گی باغِ حسن پر جو خزاں حسن کے پھول ہوں گے افسردہ

لالہ و گل کئی اُگے تھے یہاں ایک سے ایک حسن میں بڑھ کر
آج انکا نہیں ہے نام و نشاں ہو گئے خاک۔ خاک میں مل کر

حسن ذاتی نہیں صفاتی ہے یہ بھی قدرت کی اک ودیعت ہے
ذاتِ حق اس میں آ سماتی ہے کوئی سمجھے تو ایک نعمت ہے

آدمی وہ ہے جو کرے نہ غرور اپنے ہر کام پر نظر رکھے
ہے یہی مقتضائے عقل و شعور حسن انجام پر نظر رکھے

اوتار

(از پنڈت اندرجیت شرما، ماچھرہ ضلع میرٹھ)

جب جہالت کی گھٹا خلق پہ چھا جاتی ہے
جب کدورت دلِ دنیا میں سما جاتی ہے
جب بدی دخل ہر اک روح پہ پا جاتی ہے
جب سیاہی رخِ پر نور پہ آجاتی ہے
ہو کے رہ جاتے ہیں سب پردۂ باطل میں نہاں
روزِ روشن میں شبِ تار کا ہوتا ہے گماں

ہر طرف ظلم کی تلوار نظر آتی ہے
بے گناہوں کے لیئے دار نظر آتی ہے
جامِ سر میں مے پندار نظر آتی ہے
شکل انسان کی خونخوار نظر آتی ہے
حشر کے ہوتے ہیں پیدا سر و ساماں دل میں
خوں اچھلتا نظر آتا ہے ہر اک محفل میں

بغض و کینہ کی سما جاتی ہے ہر سر میں ہوا
گلشنِ دہر کی ہو جاتی ہے مسموم فضا
عدل کی پردۂ ظلمت ہی میں چھپتی ہے ضیا
دل میں انسان کے آتا نہیں کچھ خوفِ خدا
بند ہو جاتی ہیں سب امن و اماں کی راہیں
کام دیتی نہیں فریاد و فغاں کی راہیں

معجزہ تب کوئی فطرت کا مچلتا ہے ضرور
رہنے پاتی نہیں باطل میں حقیقت مستور
پردۂ غیب سے اک نور کا ہوتا ہے ظہور
جس سے ہو جاتی ہے تاریکی غفلت کافور
اہل دنیا کے لیئے ہے وہ کرشمہ اوتار
دورِ ظلمت میں ہوا کرتا ہے اس کا اظہار

نور آتا ہے وہ اک پیکر انسانی میں
آ کے پھنستا نہیں راحت میں تن آسانی میں
کام کر جاتا ہے وہ خانۂ زندانی میں
ڈال دیتے ہیں زمانہ کو جو حیرانی میں
فتنہ و شر کو کرامت سے دبا دیتا ہے
آتشِ ظلم سے بھگتوں کو بچا لیتا ہے

حبِ وطن کی دُعا

(از جناب ا۔ک۔ یشں)

سفر دراز اور راہ دشوار ہیں جابجا سنگ اور شبِ تار
قدم ہیں مجروح دل ہے مضطر ہیں یاس کے ہر طرف سب آثار
نظر کچھ آتا نہیں کہاں ہوں کدھر چلوں لے کے دوش پر بار
ہیں ہمسفر دزد و راہزن بھی عجب فسوں ساز اور جفا کار
ہے خطرۂ جان و مال و عزت ہیں سو عدو اور ایک تنِ زار
یہ کس طرح ختم ہوگی منزل چھٹے بہت دوست اور مددگار
جو رہ گئے ہیں رفیق و مونس عذاب میں وہ بھی ہیں گرفتار
خدا کا ہو فضل شاملِ حال کہ جلد طے ہو یہ دشت پرخار
کرم کی بارش ہو ہر طرف سے کہ ملک سارا ہو رشکِ گلزار
بہارِ تازہ چمن میں آئے ہوں سبز پھر برگ و بار اشجار
دلوں میں صدق و صفا ہو پیدا جو آج دشمن ہیں کل بنیں یار
خوشی میں اور رنج میں ہوں باہم ہمیشہ ہمدرد اور مددگار
ستارہ بھارت کی سرزمیں کا بلند ہو چرخ پر پھر اکبار
دُرست ابنائے ملک کے ہوں
تمام اخلاق اور کردار

دِل

(از جناب جلیل قدوائی بی۔ اے)

پوچھو نہ مجھ سے عشق میں کیا ہو گیا ہے دل
سرچشمۂ خلوص و وفا ہو گیا ہے دل

مَیں اس کے جذبِ شوق کی تاثیر کیا کہوں
تجھ سا ہی اب تو نامِ خدا ہو گیا ہے دل

اک اضطرابِ شوق کہ اک شوقِ اضطراب
مجھ کو خبر نہیں ہے کہ کیا ہو گیا ہے دل

غم ہے کہ تیرے کام بھی آیا نہ وہ غریب
غم یہ نہیں کہ مجھ سے جدا ہو گیا ہے دل

کیا ڈھونڈھتی ہے سینہ میں اب او نگاہِ ناز
مدت ہوئی کہ صرفِ وفا ہو گیا ہے دل

کیا لطف ہے کہ سارے زمانے کی ہے خبر
اس کی خبر نہیں ہے کہ کیا ہو گیا ہے دل

مانا کہ برقِ حسن بہت بے قرار ہے
اس سے بھی کچھ تڑپ میں سوا ہو گیا ہے دل

اب بے سبب بھی اشک بھر آتے ہیں آنکھ میں
کچھ اس طرح سے درد بھرا ہو گیا ہے دل

ہر انقلابِ دہر پہ ہوتا ہے اشکبار
میرے لئے تو ایک بلا ہو گیا ہے دل

ٹوٹے ہوے دلوں نے رلایا ہے اس قدر
ٹوٹے ہوے دلوں کی صدا ہو گیا ہے دل

اپنے لئے تو اک خلشِ مستقل رہا،
ہاں دوسروں کے حق میں دوا ہو گیا ہے دل

قسمت سے اپنی شاہ و گدا تو نہ ہو سکا،
ہاں سجدہ گاہِ شاہ و گدا ہو گیا ہے دل

کعبہ کہوں تو خوف ہے تکفیرِ خلق کا
کعبہ کا خاص راہ نما ہو گیا ہے دل

کہتے ہیں دل وہ خوب ہے جو باخدا رہے
لیکن کبھی کبھی تو خدا ہو گیا ہے دل

پھر بھی ہے اس غریب کے سر تہمتِ خودی
جو تیری مصلحت نے کہا ہو گیا ہے دل

نیرنگیِ جہاں کی ہے ساری خبر اسے
پھر بھی اسیرِ حرص و ہوا ہو گیا ہے دل

لیتے ہیں اب بھی درسِ حیات اس سے اہلِ درد
گو زندگی سے اپنی خفا ہو گیا ہے دل

بیٹھا ہوں دل کو روکے جو میں ان دنوں جلیل
ہلکا مثالِ موجِ صبا ہو گیا ہے دل

وجہِ بے رخی

(از سید مقبول حسین احمد پوری)

کنارِ آب ٹہلتے ہوئے چلا کرتے صدائے آبِ مصفّٰی کھڑے سنا کرتے
ہوائے سرد ترنم کو گدگدا جاتی خود اپنے آپ کبھی گنگنا لیا کرتے
بھری بہار تھی جنت کی کیفیت ملتی خوشی کا وقت تھا ہر وقت خوش رہا کرتے
کلی کے ذوقِ تبسم پہ مسکرا دیتے گلوں کے خندۂ بیجا پہ ہنس دیا کرتے
گرانکے رنگ سے آنکھوں میں تازگی آتی بہت سے توڑ کے دامن میں بھر لیا کرتے
"یہ سب ہی مگر اُس جانِ رنگ و بو کے بغیر
بہار ہم ترے پھولوں کو لیکے کیا کرتے"

جذباتِ بسمل

(حضرت بسمل الہ آبادی)

عشق میں ہو اثر تو سب کچھ ہے کوئی آئے نظر تو سب کچھ ہے
یوں تو کچھ بھی نہیں دلِ مضطر دیکھ لو اک نظر تو سب کچھ ہے
دیر و کعبہ سے کیا غرض ہم کو آپ کا سنگِ در تو سب کچھ ہے
منحصر ہے اسی پہ اپنی حیات لطفِ دردِ جگر تو سب کچھ ہے
اس میں کیا شبہ حضرتِ بسمل
زندگی ہے اگر تو سب کچھ ہے

لطفِ سخن

(مشاعرہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد)

۵ اپریل ۳۲ء کو ہندوستانی اکیڈمی کی طرف سے الہ آباد میں جو مشاعرہ منعقد ہوا، اُس کی بہترین غزلوں میں سے چند غزلیں (بہ ترتیب حروف تہجی) ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں۔ (ایڈیٹر)

(لسان القوم مولانا صفی لکھنوی)

جمالِ معنی کی معرفت سے ہنوز دل بہرہ ور نہیں ہے
بنا دے کعبہ جو بت کدے کو ابھی وہ ذوقِ نظر نہیں ہے

بنائے ہستی ہے نیستی پر مگر تمھیں کچھ خبر نہیں ہے
یہ گلشنِ رنگ و بو ہے کیا شے اگر فریبِ نظر نہیں ہے

بدل دیا دَور زندگی کا تغیرِ دورِ آسماں نے
جو دل تھا پہلے وہ دل نہیں اب، جگر بھی اب وہ جگر نہیں ہے

نہ ڈھونڈھئے مرہمِ جراحت کہ رنج ہی میں ہمیں ہے راحت
ہمارے زخمِ دل و جگر کو ضرورتِ چارہ گر نہیں ہے

ہے کشتہ مہماں سرائے ہستی مسافرانِ عدم کی بستی
ہزار چاہیں کہ جم کے بیٹھیں اجازت اس کی مگر نہیں ہے

طلوعِ صبحِ امید ہی ہے کہ جس کو کہتے ہیں صبحِ محشر
ہماری شامِ فراق ہی ہے وہ شام جس کی سحر نہیں ہے

خموش رہنے دو غمزدوں کو کرید کر حالِ دل نہ پوچھو
تمہاری ہی سب عنایتیں ہیں مگر تمھیں کچھ خبر نہیں ہے

گناہگارانِ مجلس آرا یہ کوئی انصاف ہے خدارا
عطا پر اس کی نظر ہے لیکن خطا پر اپنی نظر نہیں ہے

انھیں کی چوکھٹ سہی یہ مانا روا نہیں بے بلائے جانا
فقیر عزلت گزیں صفی ہے گدائے دریوزہ گر نہیں ہے

(از پروفیسر سید ضامن علی صاحب ضامن ایم۔ اے۔ صدر شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی)

یہ نالے بیکار سب ہیں اے دل خبر تجھے بے خبر نہیں ہے
کہ جس قدر ضبط میں اثر ہے فغاں میں اتنا اثر نہیں ہے

وہی خبر تیری جانتا ہے جسے کچھ اپنی خبر نہیں ہے
نہیں تو کہنے کے واسطے تو کہاں نہیں ہے کدھر نہیں ہے

یقین کیونکر تمھیں دلائیں دکھانے کی شے ہو تو دکھائیں
کہ ایک چلتا ہوا ہے جادو نظر تمہاری نظر نہیں ہے

فراق کی شب ہو یا قیامت کچھ ایسا اُن میں نہیں تفاوت
کسی کی ہے صبح شب نہیں ہے کسی کی شب ہے سحر نہیں ہے

جو میں نے دیکھا سناؤں کیونکر بیاں کروں تو دکھاؤں کیونکر
نظر میں نطقِ زباں نہیں ہے زباں میں ذوقِ نظر نہیں ہے

بسے ہوئے ہیں ہر ایک دل میں سمائے ہیں وہ ہر اک نظر میں
اور اس پہ کہتے ہیں شوخیوں سے کسی جگہ میرا گھر نہیں ہے

اٹھا نہ گر شور صور پر ہیں تو کیوں ہے ناراض صبح محشر
کٹی ہے کل عمر شامِ غم میں اب امتیازِ سحر نہیں ہے

جراحتِ عشق اور واعظ، سنا ہے کس نام حور اس نے
قتیلِ تیغِ ادا نہیں ہے، شہیدِ تیرِ نظر نہیں ہے

شہیدِ راہِ وفا کا مرنا فنا کی منزل سے ہے گذرنا
جو مر کے زندہ رہیں ابد تک تو ایسے مرنے کا ڈر نہیں ہے

یہیں ہو دیدار بندہ پرور نہیں ہو جو ہوگا روزِ محشر
کہ بزمِ عالم میں کوئی جلوہ بقدرِ ظرفِ نظر نہیں ہے

ہے عقل ناواقفِ حقیقت اسیر ہے شوقِ بیخودی کا
میں راہِ عرفاں میں اس جگہ ہوں جہاں کوئی راہبر نہیں ہے

وفا کے بندوں پہ ہے یہ روشن، نیاز کی حد نہیں معین
جو تیرے نقشِ قدم سے اُٹھے وہ سر حقیقت میں سر نہیں ہے

پڑی ہے نالہ کشی کی عادت نہیں تو اس دارِ غم میں ضامن
اثر شریکِ فغاں نہیں ہے، فغاں کو ذوقِ اثر نہیں ہے

(جناب ابو العلا مولانا ناطق لکھنوی)

یہ دل نہیں نور کا ہے شعلہ کسی کو اس سے ضرر نہیں ہے
مثالِ برق و شرر ہے لیکن مزاجِ برق و شرر نہیں ہے

حجاب ہے اک مشاہدہ بھی وہ روبرو ہے مگر نہیں ہے
نقاب ہے ایک اُس کے رخ کی نظر ہماری نظر نہیں ہے

وہ نیچی نظریں تھیں دل کی طالب وفا نے گو جان نذر کر دی
مگر اثر جو سوال میں تھا جواب میں وہ اثر نہیں ہے

ہے روکشِ آفتاب ذرہ بغیر پردہ بلا وسیلہ
وہاں لڑائی ہے آنکھ دل نے جہاں مجالِ نظر نہیں ہے

جو ضبط کر لی تھیں خاص باتیں ہوئیں وہ تحلیل و جذبِ دل میں
غرضکہ جو راز تھے ہمارے ہمیں اب ان کی خبر نہیں ہے

اذاں ہو ناقوس یا جرس ہو مؤثر اپنی جگہ پہ سب ہیں
مگر جہاں میں پہونچ گیا ہوں وہاں کسی کا اثر نہیں ہے

جو دیکھنے والے دیکھتے ہیں وہ سننے والوں سے کیا بتائیں
نظر کو ذوقِ زباں نہیں ہے زباں کو ذوقِ نظر نہیں ہے

فروغِ حسن اپنی روشنی میں ترقیِ عشق دیکھ لے گا
سلامتی اُن کے آئینہ کی ضرورتِ نامہ بر نہیں ہے

ہے دل پہ احسانِ حسن جتنا ادا ہوا شکر بھی نہ اُتنا
جفا کا حق مجھ پہ جس قدر ہے وفا مری اُس قدر نہیں ہے

حرم سے نکلے تلاشِ بت میں بتوں سے یادِ خدا پہ بگڑی
غرض ہم آوارۂ وفا ہیں کہیں ہمارا گزر نہیں ہے

سخن مرا کیفِ دل ہی ناطق وہی کرے قدر جو ہو عاشق
نہیں ہے یہ فلسفہ کتابی یہ اکتسابی ہنر نہیں ہے

علمی خبریں اور نوٹ

یورپ میں اب تک اندھوں کی تعلیم و تدریس کا یہی طریقہ تھا کہ لوہے کے ابھرے ہوئے حروف کی کتابیں خاص اہتمام سے تیار کی جاتی تھیں۔ مگر اب مسٹر طامس نامی ایک فرانسیسی موجد نے ایک آلہ ایسا ایجاد کیا ہے جس کی مدد سے اندھے معمولی مطبوعہ کتابوں کو بھی آسانی سے پڑھ سکینگے اس آلہ کو چھپی ہوئی کتاب پر رکھ دیا جاتا ہے اور اندھے کے سامنے ایک چھوٹا سا تختہ ہوتا ہے جس پر تمام حروف تہجی بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اندھا اس تختہ پر اپنی انگلیاں رکھتا ہے اور جیسے ہی آلہ کی مدد سے مطبوعہ کتاب کے حروف پر روشنی پڑتی ہے ویسے ہی وہ اندھے کی انگلیوں کے نیچے ابھر آتے ہیں اور اور وہ ان کو ٹٹول ٹٹول کر کتاب پڑھ لیتا ہے۔ اس ایجاد میں مزید ترقی کی گنجایش ہے، چنانچہ کوشش ہو رہی ہے کہ متعدد تاروں اور تختوں کے ذریعہ اندھے طالب علموں کے پورے کلاس کو ایک ہی وقت میں تعلیم دی جا سکے۔

مسٹر طامس گذشتہ جنگ عظیم کے زمانہ میں خود اندھے ہو گئے تھے، چنانچہ اس وقت سے اب تک انھوں نے اپنی زندگی اسی ایجاد کے لئے وقف کر رکھی تھی، سالہا سال کی مسلسل کوشش کے بعد اُن کو کامیابی نصیب ہوئی ہے جس پر وہ تمام مہذب دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

امریکن سینما کمپنیاں کتنی دولتمند ہیں؟ امریکہ میں اہل قلم کی کتنی قدر ہوتی ہے؟ اس کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حال میں ایک انگریز ڈرامہ نگار مسٹر نوبل کوارڈ کو امریکہ کی ایک سینما کمپنی نے اُن کے تین ڈراموں کا حق تصنیف چھ لاکھ پونڈ دیا ہے۔ ہندوستان کے اہل قلم کو بھی محنت کا کچھ صلہ ملتا ہے تو ڈراما کمپنیوں یا تھیٹروں ہی سے ملتا ہے۔ چنانچہ اُردو کے بعض مشہور ڈرامہ نگار ہزار ہزار پندرہ پندرہ سو روپیہ ماہوار ان کمپنیوں کے ملازم ہیں۔ اخباروں اور رسالوں میں تو

انگلستان کے اہل قلم کی مالی حالت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ برنارڈشا کی سالانہ آمدنی کا اوسط بتیس ۳۲ ہزار پاؤنڈ، رڈیارڈ کپلنگ کا اوسط تیس ہزار پاؤنڈ، جیمس باری اور جی۔ ویلز کا اوسط پچیس پچیس ہزار پاؤنڈ کیا گیا ہے۔ ان کی تصانیف انگریزی طبقے میں بڑی قدر و منزلت کے ساتھ دیکھی جاتی ہیں۔ اور اکثر ان کی ایک ایک کتاب کی آمدنی چالیس چالیس پچاس پچاس ہزار پاؤنڈ ہوتی ہے۔ بعض اہل قلم کی آمدنی کا اوسط پچیس پاؤنڈ فی گھنٹہ ہوتا ہے جو وہ تصنیف میں صرف کرتے ہیں۔

حال میں دار الاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن نے کئی قابل قدر مطبوعات شائع کی ہیں، ان میں سے عمر خیام کی بعض رباعیات کا اردو ترجمہ اور دو جلدوں میں مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کے علمی مقدمات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہم عنقریب ہی ان پر مفصل ریویو شائع کریں گے، مگر یہاں پر ہم قدردانان ادب اردو کی توجہ ان مقدمات پر مبذول کئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں ایک نقاد فن کی حیثیت سے مولوی عبدالحق صاحب کا اردو انشا پردازوں میں بہت اونچا پایہ ہے ان کی علمی تنقیدیں اور مقدمات شائع کرکے مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن نے اردو ادب پر احسان عظیم کیا ہے۔

مکتبہ کے اہتمام سے مثنویات میر کا ایک مستند مجموعہ بھی زیر طبع ہے۔ اب تک مروجہ کلیات میر میں جو مثنویاں دستیاب ہوتی ہیں وہ سراسر اغلاط سے پر ہیں۔ مکتبہ ابراہیمیہ کے کارکنوں نے کلام میر کے متعدد قلمی نسخوں کے باہمی مقابلہ اور تحقیق و تلاش کے بعد یہ مجموعہ تیار کیا ہے۔ اس میں ایک بسیط مقدمہ بھی شامل کیا گیا ہے جس میں میر صاحب کے سوانح حیات اور ان کے ادبی کارنامے اور مثنویات پر نظر غائر سے تنقید کی گئی ہے۔ مکتبہ نے اردو شہ پاروں کے نام سے اردو ادب کی ابتدا سے لیکر اب تک مکمل تاریخ بھی شائع کرنے کا بندوبست کیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ چھپکر مقبول ہوچکا ہے اور دوسرا و تیسرا حصہ زیر طبع ہے۔

آجکل دکن میں قدیم اردو کے متعلق علمی تفتیش و تحقیقات کا کام غیر معمولی جوش و خروش سے ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا نصیر الدین ہاشمی (مصنف دکن میں اردو) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آپنے "یورپ میں دکھنی مخطوطات" کے نام سے سات سو صفحات سے زائد حجم کی ایک جامع تصنیف تیار کی ہے جسمیں قدیم مصنفین دکن کے ان مسودات و مخطوطات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے جو انگلستان

اسکاٹ لینڈ اور فرانس کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ساتھ ہی مصنفین کے حالات اور نمونہ کلام بھی دیا گیا ہے محققین ادب اُردو کے لئے یہ تصنیف بہت قابل قدر ہے۔ قیمت چار روپیہ شائقین مولف سے بلی گوڑہ ترپ بازار حیدر آباد دکن کے پتہ سے طلب فرمائیں۔

---

۲۲ اپریل سنہ حال کو اڈیٹر زمانہ کے تیسرے فرزند مسٹر شیام نراین نگم ایم۔اے ڈپٹی کلکٹر رائے بریلی کی شادی خانہ آبادی ہوئی۔ اس تقریب کا نوید ہمارے مخدوم و محترم حضرت صفی لکھنوی مدظلہ کی خدمت مبارک میں بھی بھیجا گیا تھا۔ موصوف خود تو تشریف نہ لا سکے لیکن ازراہ لطف و کرم قلم برداشتہ ایک مختصر سی تہنیتی نظم لکھکر بھیجدی جو شکریہ کے ساتھ ناظرین کے تفنن طبع کے لئے درج ذیل کیجاتی ہے۔

محترمی، نقاد یگانہ — زیب دہ اوراق "زمانہ"

خط نے دیا پیغام مسرت — خط ہے یا اک جام مسرت
غنچۂ دل کو خط ہے یہ شبنم — قلب صفی ہے تازہ و خرّم
تہنیتی لکھنا تھا جو نامہ — لکھے شعر اٹھا کر خامہ
بیٹے کی شادی ہو مبارک — خانہ آبادی ہو مبارک
سجئے شوق سے عشرت خانہ — گانے والے گائیں ترانہ

چاند سا مکھڑا، پھول سا چہرا
شیام نراین باندھے سہرا

صفی عفی عنہ

ادبی حلقوں میں یہ خبر نہایت رنج و افسوس سے سنی جائیگی کہ اس ماہ سررشتہ تعلیم صوبہ متحدہ کے پُرانے شاعر و نثار منشی رام سہائے صاحب تمنا لکھنوی کا انتقال ہوگیا۔ آپ حضرت آفتی لکھنوی کے برادر حقیقی تھے۔ عرصہ سے دربار نام سے آپ کی اڈیٹری میں ایک مختصر سا ماہوار رسالہ بھی شائع ہو رہا تھا۔ آپ نے بہت سی نظم و نثر کی کتابیں بھی لکھیں جنمیں سے اکثر تعلیمی اغراض کیلئے موزوں ہیں۔ عرصہ دراز تک سررشتہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہنے کے بعد جب آپنے پنشن لی تو اپنا زیادہ تر وقت بچوں اور طالبعلموں کیلئے تعلیمی مضامین نظم و نثر لکھنے میں صرف فرماتے رہے۔ آپ اگلی وضع کے صلح کل مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ خداوند تعالیٰ آپ کو غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے

اس ماہ کی تصویر وقت پر تیار نہیں ہو سکیں لہٰذا اس مرتبہ رسالہ تصویر سے معرا ہے

خط و کتابت

اُردو زبان کا ایک مسئلہ

جناب ایڈیٹر صاحب تسلیم ۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ آجکل اُردو کی ادبی دنیا میں ایک اہم مسئلہ زبان کی نسبت چھڑا ہوا ہے، بعض محققین کی رائے ہے کہ اُردو کو مروجہ زبانوں سے مخلوط کر دینا چاہیئے چند بزرگ یہ فرماتے ہیں کہ اردو زبان جس شکل میں ہے اسی میں قائم رہے، اختلاف رائے کی وجہ سے ابھی تک کوئی بات طے نہیں پائی۔ معلوم نہیں کیا طے ہو۔ میں نے اپنا فرض سمجھ کر یہی مناسب جانا کہ اپنی رائے بھی صاف صاف ظاہر کروں۔

کسی بزرگ کا کہنا ہے کہ اُردو اپنی موجودہ شکل میں عام فہم ہے۔ مجھے ان سے بہ ادب عرض کرنا ہے کہ جناب کا دائرہ نگاہ کسی حد تک کوتاہ ہے۔ اگر مہربانی کر کے اس بات پر بے لوث غور کریں تو بہت جلد روشن ہو جائیگا کہ جس خیال کے آپ پیرو ہیں وہ کس حد تک صحیح یا غلط ہے۔ اڈیٹر صاحب زرا آپ بھی اس مسئلہ پر غور فرمائیں اور اگر ممکن ہو تو میری یا ان بزرگ کی رائے کی اصلاح کریں۔ میں اپنی رائے آپ پر ظاہر کئے دیتا ہوں، مہربانی کر کے ان کے خیالات بھی بہ وضاحت انھیں سے معلوم کر کے آپ کوئی بات بہ حیثیت ایک جج یا صدر کے طے کیجئے اور مجھ تک بھی پہونچانے کی زحمت اٹھایئے

میرا کہنا تو محض اتنا ہے کہ جو بزرگ اُردو کو موجودہ شکل میں قطعی عام فہم قرار دیتے ہیں، ذرا ادھر اُدھر گشت لگا کر دیکھیں تو کہ آیا اردو سب لوگ بخوبی سمجھتے ہیں یا نہیں۔ اپنے کو محض خواندہ اور ذی استعداد اشخاص کے زمرہ تک ہی محدود نہ کریں بلکہ تھوڑا ان سے بھی آگے بڑھیں، دیہات نہ جائیں بلکہ شہری میں گھومیں، انھیں کثرت سے ایسے لوگ ملیں گے جو آجکل کی اُردو نہیں سمجھ پاتے۔ وجہ یہ ہے کہ اُردو میں فارسی و عربی الفاظ کی بہتات ہے میں مانتا ہوں کہ عربی و فارسی الفاظ سے بیشک اردو کی زینت ہے۔ وہ ہمارے سامنے ایک مزیّن پیرو ہے لیکن پھر بھی وہ لطف کہاں جو سادگی میں ہوتا ہے۔ بناؤ سنگار اور سادگی میں بہت بڑا فرق ہے۔ میرے خیال میں یہ آتا ہے کہ چونکہ ایک مدت مدید سے ہم لوگ اُردو میں فارسی و عربی الفاظ ہی سے کام لیتے چلے آئے ہیں اور انھیں کے باعث اس میں آب و تاب دیکھتے رہے ہیں اس لئے اب دیگر زبانوں کے الفاظ اس میں شامل کرنے

میں ہمیں عار ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اُردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ آجانے سے کوئی قباحت واقع ہوگی، ابھی وہ وقت آیا کہاں؟ جب وہ زمانہ آجائے اور اُردو مخلوط ہوجائے تب ہمیں خود بخود معلوم ہوجائے گا کہ اس میں کیا کمی یا زیادتی ہے، اگر کمی ہوگی تو اضافہ کرکے یہ خرابی دور کیجائیگی اور اگر زیادتی نظر آئے گی تو بیکار یا ناپسندیدہ الفاظ کو ہم متروک سمجھیں گے۔ اس موقع پر شاید یہ کہا جائے کہ جب زبان خراب ہو جائے گی تو پھر اس کے درست وصاف کرنے میں ایک عرصہ لگے گا۔ میں فوراً پوچھوں گا کہ بلا سمجھے بوجھے یہ اعتقاد کیسے ہوگیا، صرف برائی ہی کی طرف نظر کیوں ہے، اسکے عمدہ پہلو کی طرف کیوں نہ چشم غور سے دیکھا جائے؟

اُردو زبان اب بھی خزانۂ الفاظ کم رکھتی ہے۔ انگریزی کے بعض الفاظ ایسے ہیں جو ہماری زبان پر چڑھ گئے ہیں اور اُنھیں نہ صرف ہم سمجھتے ہیں بلکہ بول چال میں استعمال کرتے ہیں، ان کا بدل ہماری اردو میں نہیں ہے۔ ترجمہ کرنے میں وہ لطف بھی نہیں اور وہ معنی بھی نہیں نکلتے جو مطلوب ہیں علاوہ اس کے ترجمہ میں طوالت ہوجاتی ہے۔ کسی چیز کے مخصوص نام کے لئے ایک فقرہ بول کر اُردو دال کو اس کا مفہوم سمجھانا کس قدر معیوب ہے۔ اگر وہ لفظ انگریزی سے بجنسہٖ لے لیا جائے تو اس میں کیا عیب ہے۔ سائنس کے بہت سے ایسے اصطلاحی اور مخصوص الفاظ ہیں جن کا ترجمہ کرنا میرے نزدیک بجا نہیں۔ ضرورتاً اگر چند الفاظ غیر زبان کے اُردو میں شامل ہوجائیں تو کیا بُرائی ہے؛ زبان میں ان کے داخلے سے بھونڈا پن نہیں آسکتا۔ ہاں بہتات نہ ہونے پائے اور غیر مانوس وثقیل الفاظ سے بھی حتی الامکان گریز کیا جائے۔ اکبر کا کلام ملاحظہ ہو کہیں پر بھی بھونڈا پن نظر نہیں آتا، حالانکہ انھوں نے اکثر رائج الوقت ہندی و انگریزی الفاظ استعمال کئے ہیں، انھیں اپنے مطالب کے اظہار میں ان الفاظ سے جو مدد ملی ان کا کلام خود اسکا شاہد ہے۔

ہندی میں بھی بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو بہ آسانی ہماری اُردو کے احاطے میں آسکتے ہیں اور جن میں سے اکثر ہماری زبان پر چڑھے ہوئے ہیں مگر تحریر میں نہیں آتے، ہاں سنسکرت کے ادق اور غیر مانوس الفاظ بلاوجہ نہ لئے جائیں بلکہ غیر زبانوں سے محض ضروری الفاظ ہی مستعار لئے جائیں، مستعار لینے کے لئے ایک حد اعتدال مقرر کی جائے، جو بھونڈے، ادق اور غیر مانوس الفاظ کے لئے سد راہ ہو، اور سریلے میٹھے، ضروری اور عام فہم الفاظ کے خیر مقدم کا نشان ہو۔ جناب عبدالقادر صاحب نے بھی ہندوستانی اکیڈمی کی کانفرنس میں قریب قریب یہی رائے ظاہر کی تھی، میں خود بھی یہی خیالات رکھتا تھا، ان کی رائے سنکر اپنے عقیدے

میں زیادہ مستحکم ہو گیا۔ اب اگر کوئی بزرگ میرے خیالات کو خام سمجھیں تو مجھے صحیح راستہ دکھا دیں
میں اُن کا تہ دل سے شکریہ ادا کرونگا۔

الہ آباد یونیورسٹی — مدھر بہاری لال سری واستو یہ ایم۔اے۔

نوٹ: قابل نامہ نگار نے اس وسیع مراسلے میں جو بحث چھیڑی ہے وہ اُردو کے اہل قلم اور اہل الرائے اصحاب کی توجہ خاص کی مستحق ہے، ہمارے نزدیک اس بارے میں چند امور خصوصیت سے قابل لحاظ ہیں:۔

(۱) دنیا کی ہر زبان کی تحریر و تقریر میں کسی حد تک فرق ہوتا ہے لیکن جب تک مخاطب کی قابلیت کا اندازہ کر کے گفتگو کی جائیگی "بات کرنے اور سننے والے کسی کو بھی کوئی دقت نہ ہوگی لیکن علمی مسائل بیان کرتے وقت علمی اصطلاحیں ضرور ہی استعمال کرنا پڑیں گی۔ اگر کسی معمولی دوکاندار سے سودا خریدنے جائیے تو نہ عربی و فارسی الفاظ کی ضرورت ہوگی اور نہ علمی اصطلاحات ہی کے استعمال کی نوبت آئیگی۔

(۲) عموماً دو طرح کے لوگ اُردو میں موقعہ بے موقعہ نامانوس الفاظ ٹھونسنے کی کوشش میں رہتے ہیں، ایک وہ جو اُردو جانتے ہی نہیں ہیں اور اپنے خیالات کو آسان روزمرہ میں بیان کرنے پر قادر نہیں ہیں اور چونکہ عربی، سنسکرت یا انگریزی سے بھی واقف نہیں ہوتے اس لئے اپنی ناقابلیت کی پردہ پوشی کے لئے اپنی درسی زبان کے الفاظ ملا کر اُردو کو بھی غتر بود کر دیتے ہیں۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جو عوام کے روبرو اپنی علمی قابلیت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، اس کے لئے انہیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر غیر زبانوں کے مشکل اور ادق الفاظ بھرنے پڑتے ہیں۔ مگر ان دونوں قسم کے لوگوں کا اردو ادب میں کوئی رتبہ نہیں ہے

(۳) علمی حیثیت سے اُردو زبان ابھی مکمل نہیں ہے۔ لہذا اگر کوئی علمی مضمون یا فلسفانہ خیال اُردو میں منتقل کیا جائے گا تو عربی سنسکرت یا انگریزی الفاظ کا استعمال ضروری ہو جائے گا، یہاں پر یہ دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس زبان کے الفاظ اردو میں شامل کئے جائیں مگر اس بات کے فیصلہ میں بھی کہ کس خاص زبان کے الفاظ اس میں شامل کرنے کے لئے منتخب کئے جائیں ہم کو بہت کم اختیار حاصل ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا آسان جواب یہ ہے کہ جس زبان سے جو علم اُردو میں منتقل کیا جائے گا۔ اضطراری طور پر اسی زبان کے اصطلاعات داخل ہو جائیں گے لیکن اگر کسی موقعہ پر ہم کو انتخاب کرنے کا حق و اختیار حاصل ہو تو ہم یہی کہیں گے کہ اُردو میں جتنی جائدادیں خالی ہوں اُن پر سب سے پہلے ایشیائی زبانوں کا حق ہے، ان کے بعد یورپین زبانوں کا استحقاق ہے

اس کے ساتھ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ اردو کی موجودہ روش یہ ہو رہی ہے کہ کچھ الفاظ اس میں خواہ مخواہ شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ ان میں بعض علمی ہیں جو ان علوم کی وجہ سے ہیں جن کا داخلہ زمانۂ حال کی ضروریات کے بموجب اردو میں ہو رہا ہے۔ مگر ان کا تعلق اردو ادب سے اتنا نہیں ہے جتنا علمی ذخیروں سے ہے۔ اس لئے ان الفاظ کا اثر نہ تو روزمرہ کی بول چال پر ہو سکتا ہے اور نہ ادبیات نثر و نظم پر۔ بہ حقیقت یہ الفاظ ایک محدود دائرہ کی زبان میں داخل ہو گئے جو اس علم کے شوقینوں کیلئے مخصوص ہے۔

(۲) بعض الفاظ جو مختلف صوبوں کی خصوصیات ادبی کی وجہ سے اردو میں داخل ہو رہے ہیں ان کی روک تھام بھی آسانی سے ممکن نہیں ہے کیونکہ اس قسم کے الفاظ ہمیشہ سے ہر پراکرت میں داخل ہوتے رہے ہیں کچھ اردو ہی پر ان کا انحصار نہیں ہے۔ اور سچ پوچھیئے تو یہ سیلاب کسی کے بس کا نہیں تو چنانچہ جس روش پر اردو جا رہی ہے اسے ہی کوئی نہیں روک سکتا ہے تاہم ملک کی ادبی جماعتیں اور خاص خاص اہل قلم اتفاق رائے سے زبان کو سلیس بنانے کی طرف رجوع ہونا چاہیئے اور اسکے لئے یہ بات ضروری ہے کہ غیر مانوس عربی فارسی ترکیبوں اور محاوروں سے اجتناب کر کے عام فہم ہندی الفاظ بہ کثرت استعمال کئے جائیں جس سے مشترکہ زبان کی حیثیت سے اردو زبان کا مستقبل بہت ہی روشن ہو جائے گا۔ انگریزی کے جو الفاظ مروج ہو گئے ہیں ان کے استعمال میں بھی کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے۔

ایڈیٹر

ادبیات اور زندگی

ادبیات کا انحصار زندگی پر ہے، اسی بنیاد پر ادبیات کی دیوار کھڑی ہوتی ہے اسی پر اسکے کمرے، مینا اور گنبد بنتے ہیں مگر اسکی بنیاد مٹی کے نیچے چھپی رہتی ہے اُسے دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔

زندگی خدا کی تصنیف ہے اس لئے لامحدود ہے، سادہ ہے، ناقابل فہم ہے۔ ادب انسان کی تصنیف ہے اس لئے پُر از معلومات ہے، آسان ہے اور مصنوعات سے گھرا ہوا ہے۔

زندگی اپنے افعال کیلئے خدا کے روبرو جوابدہ ہے یا نہیں۔ یہ ہم نہیں جانتے لیکن ادب انسان کے سامنے جوابدہ ہے اسکے لئے خاص قواعد اور قوانین مقرر ہیں جنکی اُسے پابندی کرنی پڑتی ہے۔

زندگی کا مقصد حصول راحت ہے اور انسان عمر بھر راحت کی تلاش میں مصروف رہتا ہے کسیکو یہ ہیرا دولت میں دستیاب ہوتا ہے کسیکو بال بچوں میں، کسیکو عالیشان عمارتوں میں، کسیکو شہرت میں۔ لیکن ادبیات کی راحت ان سب راحتوں سے بلند اور پاکیزہ ہے اور یہ راحت صداقت اور خوبصورتی سے وابستہ ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقی راحت محض صداقت اور خوبصورتی میں مضمر ہے۔ اسی راحت کو ظاہر کرنا ادب کا مقصد خاص ہے۔ نفسانی لذتوں میں ندامت چھپی رہتی ہے اُس سے نفرت بھی ہو سکتی ہے، اس پر افسوس بھی ہو سکتا ہے مگر صداقت اور خوبصورتی سے جو راحت حاصل ہوتی ہے وہ ان باتوں سے سراسر پاک ہے۔

(رسالہ ہمایوں) (ا۔ م۔ حنیف)

ہیرے اور سچے موتیوں کا
سفید سرمہ
مصدقہ
جناب نامی گرامی ڈاکٹر آر۔ کرا پر صاحب بہادر
سی۔ آر۔ فیلو آف کیمسٹری لنڈن
آنکھوں کی بیماریوں و ترقی بینائی کیواسطے مفید ہے۔ در
سب سے بہتر زود اثر دوا ہے ملک روس و افریقہ وغیرہ کے معزز
ڈاکٹروں و ہندوستان کے نامور حکیموں نے آنکھوں کی
بیماری میں اور دوا کو چھوڑ کر استعمال کیا ہے۔
ہمارے سرمہ کا امتحان اور اسمیں کامیابی
(۱) نگاہ اگر ہمارا سرمہ لگائیے دو ہفتہ میں روشنی بڑھجائیگی
اور جملہ نقائص چشم دور ہونگے۔
(۲) عینک کی ضرورت نہیں ہوتی۔
(۳) دھند۔ ڈھلکا۔ آنسو بہنا۔ سرخی۔ کھجلی۔ سوزش۔ آنکھوں
کے سامنے اندھیرا پلکوں کی اندرونی گوہانی دور ہوتی ہے۔
(۴) کمزور نگاہ سے تاگا سوئی میں بہت جلد پروئیے۔
(۵) پربال۔ سبل۔ جالا۔ پھولی۔ ابتدائی موتیابند۔ ناخونہ۔ آنکھ
کے سامنے ذرا سا آنا بند ہوجاتا ہے لکھنے پڑھنے سے آنکھ
کا تکان۔ درد بہت جلد صاف کرتا ہے۔ اور جملہ امراض چشم
کے لئے اکسیر ثابت ہوا ہے
قیمت فی تولہ تین روپیہ محصولڈاک ۶/
ملنے کا پتہ
مینیجر نگم کمپنی، نیا چوک۔ کانپور
HERBAL BALM
Zam-Buk
RUB IT IN
EMBROCATION
Proprietors
جلد کی بیماریوں اور ضربات
کے لئے
حیرت انگیز مرہم
اگر آپ کے جسم میں کوئی مقام کٹگیا ہے جس کے کپنے کا اندیشہ ہے یا
کوئی مقام جلگیا ہے یا کوئی کھلا ہوا زخم ہے جو اچھا نہ ہونے آتا ہے یا اگر آپکے
پیر زخمی ہوگئے ہیں یا کیڑے نے کاٹا ہے سوزش کھجلی چھاجن دنبل یا داد
ہوگئی ہے تو زمبک مرہم جادو کی طرح سے آپ کی جلد کو شفا دیگا
اور اور قیمتی جڑی بوٹیوں کے جوہر سے مرکب شدہ زمبک کے حیوانی
چربی سے پاک ہونیکی ضمانت ہے
زمبک کو کبھی انسانی ہاتھ نہیں چھوجاتا ہر حالت میں اسکی حیرت
انگیز تسکین بخش شفا بخش اور متعدی امراض کا اثر زائل کرنیوالی
تاثیر قائم رہتی ہے۔
خالص جڑی بوٹیوں والا مرہم
حیوانی چربی سے پاک
تمام دوافروش ایک روپیہ یا دو روپیہ چار آنہ فی ڈبیہ کے حساب سے
زمبک فروخت کرتے ہیں۔
ایجنٹ: مسرس کے بی محمد سعید اینڈ کو مسٹن روڈ۔ کانپور
زمبک
Zam-Buk

ہند و شعراء
خواجہ عشرت لکھنوی کی جدید تالیف چار سو پچاس گزشتہ و موجودہ
ہندو شعراء کے حالات موثر و دلکش قابل دید چیدہ اشعار قیمت
تذکرہ آب بقا گزشتہ و موجودہ شعراء کے حالات
شاعری کا مکمل سٹ چار جلدوں میں
لغات اردو مکمل سٹ
حال ہندی اور اردو کی حقیقت اور الفاظ کا فرق
اصلی زبان اردو ۔ مترو کات کی تشریح
ترجمان اردو سے فارسی بنانیکی آسان ترکیب
زبان دانی اردو کے مستند قواعد و اصول اردو
المشتہر منیجر عشرت بکڈپو احاطہ خانساماں لکھنؤ
ALETRIS CORDIAL RIO
THE WOMAN'S TONIC
الٹرس کارڈی آئل یعنی اکسیر انسول
ڈاکٹر اسکو جسمانی صحت کیلئے بہترین دوا قرار دیتے ہیں
ہر گھر میں اسکا رہنا نہایت ضروری ہے
ماں بہن اور بیٹی کے واسطے بہترین دوائی
Rio Chemical Co.
79 BARROW STREET
NEW YORK (U.S.A)
ادھر کون آرہا ہے؟
یہ ایک سوال ہے جو رات کے چلنے والوں سے بُرے بھلے کا شک
دور کرنے کے لئے پولیس کانسٹیبل پوچھتا ہے
لیکن ہماری مندرجہ ذیل دوائیوں کی بابت کسی کو ذرا بھی شک کا موقع نہیں ہر ایک استعمال کرنیوالے کو انکی بابت پوری
اور خاطر خواہ تسلی ہو گئی ہے ۔ اگر آپ نے ابھی تک تجربہ نہیں کیا تو اب ضرور تجربہ کیجئے ۔
آتنک نگرہ گولیاں ۔ قبض ۔ بدہضمی ۔ خون اور مادہ مردمی کی خرابی و کمی ۔ جریان ۔ احتلام ۔ سرعت وغیرہ
کو دور کر کے اعلیٰ درجہ کی طاقت و توانائی حاصل کرتی ہیں ۔
چندر پربھا گولیاں ۔ سوزاک ۔ حبس بول ۔ اور عورتوں کے ہر قسم کے امراض مخصوصہ کی لاثانی دوا ہے ۔
جور آتنک گولیاں ہر قسم کے بخار کے دفع کرنے میں پوری طرح فتحمند ثابت ہوئی ہیں ۔
بال متر گولیاں بچوں کے جملہ امراض کو نابود کر کے تندرست و توانا بناتی ہیں ۔
کاسانک گولیاں ہر قسم کے کھانسی اور دمہ کے لئے اکسیر علاج ہے ۔
عرق دمہ دمہ کے حملوں کو چند منٹوں میں دور کرنے کی لاثانی دوا ہے ۔
قیمت ہر ایک دوا فی ڈبیہ صرف ایک روپیہ ۔ پانچ ڈبیہ کی دوا چار روپیہ میں علاوہ محصولڈاک
صحت اور تندرستی کی لغت راہ راست کی استاد اور نہایت عمدہ مضامین سے مزین کتاب کامشاستر بالکل مفت طلب فرمایئے ۔
وید شاستری منی اشنا گوند جی ۔ جام نگر ۔ کاٹھیاواڑ

پچاس سال سے ہندوستانی پیٹنٹ دواؤں کے بے مثل موجد

بچوں کی تندرستی کے لئے! ماں کی طاقت کے لئے

میٹھا مقوی!!

"لال شربت"

(REGD)

(لال شربت) یہ بچے۔ لڑکے اور پرسوتی کے لئے مثل آبحیات اکسیر ہے۔ اس کے پینے سے بچوا کی ہڈی مضبوط ہوتی۔ خون گاڑھا ہوتا اور جسم طاقتور ہوکر چہرہ خوبصورت ہوجاتا ہے۔ پرسوتی کی نقاہت اور دودھ کی کمی دور کرنے کی اس میں خاص صفت ہے۔

قیمت فی شیشی تیرہ آنہ ۱۳/ محصول دس آنہ ۱۰/ نمونہ کی شیشی دو آنہ ۲/

"پودن ہرا" REGD عرق پودینہ

یہ پودینہ کی سبز پتیوں سے بنا ہے۔ اس سے پیٹ پھولنا۔ کھٹی ڈکار آنا۔ پیٹ کا درد اور ریاحی امراض جلد گھٹتے ہیں۔ بچوں کی بدہضمی اور دودھ کی قے کو دور کرنے میں اس سے بڑھکر دوسری کوئی دوا نہیں ہے۔ قیمت بڑی شیشی چودہ آنہ ۱۴/ محصول سات آنہ ۷/

چھوٹی شیشی دس آنہ ۱۰/ محصول سات آنہ ۷/ نمونہ کی شیشی تین آنہ ۳/

نوٹ: ہماری دوائیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ ڈاک محصول بہت بڑھ گیا ہے۔ اس لئے اپنے مقامی ہمارے ایجنٹوں سے خرید فرمائیں۔ نمونہ صرف ایجنٹوں ہی سے مل سکتا ہے۔

صیغہ نمبر ۶۷ پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ

ایجنٹ: کان پور نیا گنج میں محمد حفیظ محمد نصیر صاحب

"سورڈال" بہرے پن کو اچھا کردیتا ہے

سورڈال نامی جدید فرانسیسی دوا نہایت صفائی اور حیرت انگیز طریقے سے بنایا ہوا مرہم ہے جسکے استعمال سے بہت سے لوگوں کا بہراپن اور دماغ میں شور سنائی دینا اور ناک کا نزلہ سے بند ہو جانا عجیب غریب طریقے سے قطعی اچھا ہو گیا ہے۔ ان حالتوں میں بھی جہاں بہترین طبی مشورے اور اعلیٰ ترین قیمتی دوائیں بھی بیکار ثابت ہوئی ہیں یہ مرہم کامیاب ہوا ہے۔ اگر آپ کو اس قسم کی کوئی شکایت ہے تو "سورڈال" آپ کے ثقل سماعت کا نقص رفع کر کے آپ کے سننے کی طاقت کو پھر بحال کردیگا۔

آج ہی سے اس عجیب غریب گھریلو دوا کا بکس منگا لیجئے۔ قیمت صرف تین روپیہ ہے۔

مسز ای۔ اسمتھ ساؤتھ شیلڈز سے لکھتی ہیں:۔

"سورڈال" مرہم نے میری قوت سماعت مکمل طور سے بحال کردی ہے۔ اور نزلہ و سر کے اندر کے شدید شور کو بالکل دفع کردیا ہے۔ میں نے بہت لوگوں سے اس دوائے عظیم کا ذکر خیر کیا ہے۔"

سورڈال کمپنی ۵۲۔ ہوم کرافٹ روڈ سیڈنہم لندن۔ انگلستان

کے پتہ سے طلب کیجئے

SOURDAL Co:

32, Homecroft Road, Sydenham,
LONDON, (England)

سناٹوجن کے استعمال سے کمزوری پر غالب آجائیے

اپنے جسم میں صرف نئی قوت پیدا کر کے آپ مردانہ قوت کی کمزوری پر غالب آسکتے ہیں اور دوبارہ طاقتور اور تندرست ہو سکتے ہیں۔ اس غرض کے لئے سناٹوجن کی مثل اور کوئی چیز نہیں ہے جو دنیا بھر میں مشہور مقوی غذا ہے کیونکہ سناٹوجن میں وہی اصلی اجزا ہیں جو جسم اور اعصاب دونوں کو تندرست اور مضبوط بناتے ہیں۔

پونا شہر کا مشہور طبیب ڈاکٹر ڈبلو۔ ایم راین لکھتا ہے "سناٹوجن اعصاب کو غذا پہنچانے اور جسم کو طاقت دینے میں مفید ہے"

اگر آپ کمزوری یا ناطاقتی میں مبتلا ہوں تو آپ سناٹوجن کا با قاعدہ استعمال شروع کریں تھوڑی ہی مدت میں سناٹوجن آپ کو جوانی کی سی طاقت اور تندرستی دوبارہ عطا کریگی۔

سناٹوجن کی ایک بوتل آج ہی خرید لیجئے۔

SANATOGEN

اصلی تقویتی غذا

تمام انگریزی دوافروشوں اور بازاروں میں ملتی ہے

جملہ حقوق محفوظ ہیں

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱

H. Haideny 15-7-32

زمانہ

مرتبہ دیا نراین نگم، بی۔اے

جلد ۵۸ | جون ۱۹۳۲ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

تصاویر: محسنین اردو، شمس العلماء آزاد۔ شمس العلماء حالی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ مولانا شبلی نعمانی۔ سر سید احمد خاں۔ ڈاکٹر سر اقبال

قیمت فی پرچہ ۸ـــ

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت سالانہ صـ۲ــ

قیمت سالانہ ممالک غیر سے ۸ شش ماہی ۸ ۔ ہندوستان سے ششماہی قیمت تین روپیہ

علمی ذوق رکھنے والے حضرات مندرجۂ ذیل کتابیں ضرور منگائیں

بزم خیال

جس میں اردو اور فارسی شعرا کی
مجالس کے لطائف و ظرائف اور
برجستہ گوئی و حاضر جوابی کے نمونے
جمع کئے گئے ہیں جو خوش مذاق
حضرات کی تفریح کا بہترین سامان
ہے۔ قیمت ایک روپیہ

ہندو تیوہاروں کی اصلیت

اس کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب
بی۔ اے۔ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
بستی نے ہندو تیوہاروں کی اصلیت
اور ان کی جغرافی کیفیت نہایت
واضح اور آسان زبان میں لکھی ہے
اس کے ساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی
اور تمدنی انتظام اور ہندو تیوہاروں
کی ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے۔
اردو ایڈیشن کی قیمت مجلد ۹ر
ہندی ایڈیشن کی قیمت جس میں
اردو ایڈیشن کے مقابلہ میں زیادہ
تفصیل دیگئی ہے قیمت ۱۲ر

خاک پروانہ

منشی پریم چند کے تازہ ترین چودہ منتخب
مضامین کا مجموعہ۔ پریم چند صاحب کے
افسانے کسی تعارف کے محتاج نہیں
قیمت ایک روپیہ عہ

انتخاب اودھ پنچ

اخبار اودھ پنچ لکھنؤ نے ان مضامین
کا مجموعہ جو ۱۸۷۷ء تا ۱۸۸۰ء میں اس
میں شائع ہوئے تھے علاوہ ازیں بہت
سا تفریح کا سامان بھی موجود ہے قیمت ۸ر

خیالات عزیز

مجموعۂ مضامین مولوی عزیز مرزا صاحب
جس کی باضابطہ رجسٹری کی گئی ہے حجم
دو سو صفحات۔ ٹائیٹل خوشنما رنگین ہے،
لکھائی چھپائی اعلیٰ مع تصویر مصنف
قیمت دو روپیہ عار

بہرام کی رہائی

نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری کے بعد اسکا
پڑھنا نہایت ضروری ہے قیمت ۱۲ر

گلزار داغ

فصیح الملک جناب داغ دہلوی کا مشہور
و مقبول دیوان ہے جو حال میں حسن
و خوبی کے ساتھ شائع ہوا ہے داغ
صاحب کا کلام کسی تعارف کا محتاج
نہیں قیمت بلحاظ دیوان صرف ۱۲ر

مثنوی سحر

یعنی شگفتہ و دلکش منظوم حضرت
سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز
اول ایڈیشن کی قیمت ۶ر دوسرے
ایڈیشن کی قیمت جس کی مصنف
نے نظر ثانی بھی کی ہے صرف ۸ر

مرقع ادب

حصہ اول و دوم مرتبۂ جناب صفدر
مرزا پوری اس میں ہندوستان کے
مشہور انشا پرداز شعرا کے وہ خطوط
جمع کئے گئے ہیں جو انھوں نے اپنے احباب
وغیرہ کو لکھے ہیں۔
حصہ اول ۱۲ر حصہ دوم عار

ملنے کا پتہ: مینیجر زمانہ بک ایجنسی کانپور

اردو زبان کے محسن

شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی

شمس العلما مولوی محمد حسین
آزاد دہلوی

مولانا شبلی نعمانی

پنڈت رتن ناتھہ سرشار

جلد ۵۸ جون ۱۹۳۲ء نمبر ۶

حضرت امیر خسرو

از حضرت مولانا کیفی چریاکوٹی

نام و خاندان   ابوالحسن نام، خسرو تخلص، امیر خسرو مشہور تھے یہاں تک کہ لفظ "امیر" ان کے تخلص یا عرف عام کا جزو بن گیا تھا۔ امیر اس لئے مشہور تھے کہ اقلیم سخن کی بادشاہی کی طرح امارت و دولت بھی میسّر تھی۔ امیر خسرو ترکوں کے قبیلہ لاچین سے تعلق رکھتے تھے اور ترکستان کا مشہور شہر کش ان کے والد امیر محمود سیف الدین شمس کا مسکن تھا۔ دولت شاہ اور فرشتہ کے اقوال کے مطابق سیف الدین امرائے بلخ میں سے تھے جو فتنہ تاتاری و حملہ چنگیزی کی تاب نہ لاکر وطن سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور بادشاہ وقت محمد تغلق کی جوہر شناسی کی بدولت یہ سفر موجب ظفر بن گیا۔

پیدائش   حضرت امیر خسرو ۶۵۱ھ میں پٹیالی ضلع اٹہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے سلسلہ حالات میں مولانا شبلی صاحب شعر العجم حصہ دوم صفحہ ۱۰۲ میں لکھتے ہیں کہ جب وہ پیدا ہوئے تو امیر سیف الدین ان کو خرقہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لے گئے جس نے دور ہی سے دیکھکر کہا کہ "وہ شخص آیا ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے جائیگا۔"

حالات   امیر خسرو کی پرورش ان کے نانا عماد الملک کے یہاں ہوئی، ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے خوشنویسی کی مشق شروع کی۔ سعد الدین خطاط ان کے استاد تھے۔ اس کے ساتھ ہی تعلیم بھی شروع ہوئی۔ چونکہ استاد ازل نے ان کی فطرت میں شاعری کا جوہر بھر دیا تھا اس لئے وہ اس طرح ظاہر ہونے

ہونے لگا کہ امیر صاحب لکھنے پڑھنے کی جگہ الٹے سیدھے اشعار کہتے اور انھیں کی وصلیوں پر مشق کرتے تھے۔

امیر صاحب کے کلام میں تلمیحات و اشارات علمیہ دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ مروجہ علوم و فنون میں اُن کو پوری مہارت تھی۔ اگرچہ کسی تذکرہ نویس نے ان کے تحصیل علم کے متعلق کچھ نہیں لکھا صرف مولانا شبلی صاحب نے شعرالعجم میں یہ تحریر کیا ہے کہ "یہ قطعی ہے کہ پندرہ بیس برس کی عمر میں یہ تمام درسی علوم و فنون سے فارغ ہو چکے تھے"۔

سلطان غیاث الدین بلبن (شاہ دہلی) کے عہد میں امیر صاحب سن رشد کو پہونچے۔ اس بادشاہ کے دربار میں قتلو یا کِتلو خاں[1] ایک سربرآوردہ امیر تھا۔ خسرو اس کو اپنے قصائد فارسی سناتے اور داد و صلہ پاتے تھے۔ رفتہ رفتہ امیر صاحب سلطان غیاث الدین کے درباریوں میں شامل ہو گئے اور ان کا رسوخ اس درجہ بڑھ گیا کہ سلطان جب کسی مہم پر جاتا تو امیر خسرو ساتھ رہتے تھے

سلطان کا بیٹا سلطان محمد قاآن مردم شناس، قدردان اور خود صاحب جوہر تھا، اس نے بیس ہزار منتخب اشعار کی ایک بیاض طیار کی تھی جس کو وہ بیت گراں قدر اور عزیز جانتا تھا، اس کے اشعار امیر کو سناتا اور سچی داد پاتا تھا۔ اس انتخاب کی اس زمانہ میں ایسی شہرت تھی کہ اہل ذوق اس کے اشعار نقل کرتے اور دُور دُور لیجاتے تھے۔ جب شاہزادے کا انتقال ہوا تو وہ بیاض سلطان غیاث الدین کے ہاتھ سے امیر علی (شاہی دوات دار) کو ملی اور امیر علی کے بعد امیر خسرو کے ہاتھ آئی۔ اس اثنا میں امیر صاحب کی شہرت کا آفتاب چمکنے لگا اور دیکھنے والوں کی نظروں کو خیرہ کرنے لگا تھا۔

تاتاریوں کے بادشاہ ہلاکو خاں کا پوتا ارغو خاں ایران میں حکمران تھا، اس کے ایک امیر تیمور خاں نے بیس ہزار سواروں سے لاہور پر حملہ کیا اور تاخت و تاراج کے بعد جب وہ واپس جانے لگا تو اموال غنیمت کے ساتھ امیر خسرو کو بھی اپنے ساتھ بلخ لے گیا۔ امیر صاحب کو مجبوراً بلخ میں قیام کرنا پڑا مگر جب کچھ دنوں کے بعد ان کو نجات ملی تو پھر دہلی واپس آ گئے۔ امیر صاحب نے اس مجبوری اور بندش سے متاثر ہو کر ایک مرثیہ لکھا تھا جو عرصہ تک دہلی کے گوشہ گوشہ میں پڑھا جاتا رہا اور اس کو پڑھنے اور سننے والے دامن صبر و ضبط چاک کرتے تھے۔ اس طرح سلطان محمد قاآن کی وفات پر امیر صاحب

[1] تذکرۂ دولت خاں میں یہ نام کِتلو خاں، تاریخ فرشتہ میں کتلی خاں اور خود امیر خسرو کی غرۃ الکمال میں کِتلو خاں ہے۔ مولوی شبلی نے بھی کتلو ہی لکھا ہے۔ لیکن ان ناموں میں سے ایک بھی مشہور نہ تھا بلکہ ملک چھجو کے نام سے مشہور تھے۔ امیر خسرو نے ایک نظم میں یہ نام منظوم کیا ہے۔ (ا۔ ز)

نے جو مرثیہ لکھا تھا اس کے اثر کا یہ نتیجہ ہوا کہ سلطان غیاث الدین نے جس وقت اسکو سنا تو اس قدر رویا کہ بخار آگیا اور بالآخر اسی بخار میں اُس نے سفر آخرت کیا۔

بیعت ۔ ۱۲۷۴ھ میں امیر صاحب نے خواجہ نظام الدین اولیا کے ہاتھ پر بیعت کی یا بیعت کی صورت میں عشق و محبت کا درس جاری کیا۔ یہ بات مشہور ہے کہ امیر صاحب نے بیعت کے بعد جو کچھ ان کے پاس تھا راہِ محبت میں لٹا کر اپنے دامن میں سرمایۂ فقر کے سوا اور کچھ نہ رکھا۔ امیر صاحب کو اپنے پیر کے ساتھ محبت نہیں عشق تھا، کہا جاتا ہے کہ اسی عشق نے طبیعت میں اتنا گداز پیدا کر دیا تھا کہ ان کا ہر شعر نشتر نہیں بجلی بن گیا جو سننے والوں کے دلوں پر اثر کرتا ہے۔

عادات و خصائل ۔ امیر خسرو نے امارت کے آغوش میں آنکھ کھولی، دولت کے سایہ میں ہوش سنبھالا اور بادشاہوں میں زندگی بسر کی، لیکن ان کی طبیعت میں خاکساری تھی، خوشامد اور جاہ پرستی سے وہ ہمیشہ متنفر رہے اور اظہار رائے میں کبھی دریغ نہ کیا۔ سلطان علاء الدین خلجی جیسے سخت گیر بادشاہ کے دربار میں تھے لیکن موقع آتا تو صاف گوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔[۱]

عشق و محبت ۔ امیر صاحب اپنی اس خصوصیت میں تنہا نظر آتے ہیں کہ ان کا دل احساس درد محبت کا مقیاس تھا۔ پیر سے عشق تھا تو ایسا کہ پرستش کی حد کو پہونچ گیا تھا۔ ماں سے ایسی محبت تھی کہ ۴۰ سال کی عمر میں اپنی ماں کو یاد کر کے اس طرح روتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ چھوٹا بچہ بلک رہا ہے (شعر العجم حصہ ۲ صفحہ ۱۲۰) بھائی کے ساتھ ایسی الفت تھی کہ ان کے انتقال پر مرثیہ لکھتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ الفاظ نہیں جگر کے ٹکڑے پیوست کر دیتے ہیں۔ حسن کے ساتھ ایسا اُنس تھا کہ ظاہر ان نظروں میں بے طرہ امتیاز "داغ" نظر آتا تھا۔ گویا عشق حقیقی اور مجازی دونوں کی ایک جگہ انتہا ہوگئی تھی۔ ایسے شخص کے گداز، درد، تڑپ، سوز کا کیا کہنا۔ لیکن جہاں خونناب فشانی کی رنگینی تھی وہیں ستم کی شوخی بھی نمایاں تھی یعنی اُن کی طباعی اور ہمہ گیری نے بزم ادب کو ہر طرح سے آراستہ کیا تھا۔ جہاں وہ رلانا جانتے تھے وہیں ہنسانا بھی اُن کو آتا تھا۔ فارسی کی تمام اصناف سخن غزل مثنوی، قطعات، رباعیات، مرثیے اگر ور دا ور روانی کی تصویریں ہیں تو اُردو میں پہیلیاں، کہ مکرنیاں، دو سخنے، چیستان وغیرہ نکات ذوق، اور مطائبات شاعرانہ سے بھرے ہیں جس کسی نے یہ کہا ہے سچ کہا ہے کہ "امیر خسرو کی اس خصوصیت میں اُن کا کوئی شریک و سہیم نظر نہیں آتا کہ ان کو معانی بیان اور نظم و نثر کے تمام اصناف پر فارسی، عربی، ترکی اور بھاشا زبانوں میں یکساں قدرت و مہارت تھی۔ چنانچہ خالق باری اور بھاشا

---

[۱] اس کی تائید میں کوئی واقعہ جاری نظر سے نہیں گذرا۔ (ا۔ ز) [۲] کسی آئندہ مضمون میں اس بحث کا فیصلہ کیا جائیگا کہ خالق باری خسرو صاحب کی تصنیف ہے یا نہیں۔ (مینی)

کے بعض اشعار سے یہ پتہ چلتا ہے کہ امیر صاحب کو سنسکرت میں بھی دستگاہ تھی۔ اگرچہ امیر صاحب کے عہد میں سنسکرت کو انحطاط اور بھاشا کو عروج حاصل ہو چکا تھا۔ شاعری بالخصوص غزل کے لئے یہ زبان قدرتاً موزوں بھی ہے اور اس وقت اس کا کافی رواج بھی ہو چکا تھا

موسیقی | امیر خسرو نے شاعری بالخصوص غزلوں کو رنگین کرنے کے لئے موسیقی میں کمال پیدا کیا تھا اور کمال بھی ایسا کہ جگت استاد یا نائک کا لقب حاصل کیا تھا۔ ہندوستان فن موسیقی کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتا اور ہندوستانی موسیقی کا ماہر مسلّم الثبوت استاد سمجھا جاتا ہے۔ امیر خسرو کے وقت میں گوپال نائک فن موسیقی میں بہت مشہور تھا۔ اس نے امیر کا کمال دیکھا تو انگشت بدنداں رہ گیا حضرت امیر ہندی راگ راگنیوں کے ساتھ فارسی کی موسیقی میں بھی کامل تھے۔ اس لئے دونوں کی ترکیب سے نئی نئی باتیں پیدا کی ہیں۔ راگ درپن میں حضرت امیر کی حسب ذیل ایجادیں لکھی ہیں مجیر، سازگری، ایمنی، عشاق، موافق، غنم، زیلف، فرغنہ، سرپردہ، باخر منم، فردوس، ان کے علاوہ حسب ذیل تال اور سُر بھی اُنھوں نے ایجاد کئے تھے:۔ قول۔ ترانہ۔ خیال۔ نقش۔ نگار۔ بسیط۔ تلانا۔ سوہل۔

حضرت امیر خسرو اس بات کو جانتے تھے کہ تغزل سے ترنم کا کیا تعلق ہے۔ غور سے دیکھئے تو ان کی غزلوں میں ایک ایک لفظ کے اندر ترنم موجود ہے جس کو مذاق صحیح محسوس کر سکتا ہے۔

تصانیف حضرت جامی لکھتے ہیں کہ امیر خسرو نے مختلف علوم و فنون میں بانوے کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں حساب اور موسیقی کی کتابیں شامل نہیں ہیں۔ اور بقول حضرت امیر ان کے فارسی اشعار کی تعداد چار لاکھ ہے اور اسی قدر بھاشا کی تعداد بھی بتائی جاتی ہے۔ امیر صاحب کی نظم کے حسب ذیل کارنامے مشہور ہیں۔

دیوان تحفۃ الصغر، دیوان وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیۃ نقیہ، نہایۃ الکمال، قران السعدین مطلع الانوار، شیریں خسرو، آئینۂ سکندری، لیلےٰ مجنوں، ہشت بہشت۔ تاج الفتوح۔ نہ سپہر۔ ان کے علاوہ وہ مجموعۂ نظم بھی ہے جو عام طور پر نایاب تھا، اس لئے تذکرہ نویسوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ نثر میں تغلق نامہ، خزائن الفتوح، مناقب ہند، افضل الفوائد، اعجاز خسروی ان کی یادگار ہیں آخرالذکر کتاب فن نثر نویسی میں پہلی کتاب ہے، اس لئے اس کو ان کی ایجاد میں شمار کرنا چاہیئے۔ یہ تین ضخیم جلدوں میں عام طور پر ملتی ہے۔ اس کے دیکھنے سے امیر صاحب کے قوت اختراع و ایجاد اور صنائع و بدائع کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔

ایجاد امیر خسرو کو خدا نے اختراع و ایجاد کی وہ قدرت عطا کی تھی کہ اس خصوصیت میں وہ سب سے الگ نظر آتے ہیں۔ آپ نے پڑھا ہوگا کہ موسیقی کے فن میں ان کے اختراع اور کمال سے ملک کے اہل فن متحیر اور حیران نظر آتے تھے۔ شاعری اور نثر نویسی میں صنائع و بدایع کی اگر تفصیل دیکھنا ہو تو مشہور تذکرے اور کتب تاریخ کے علاوہ امیر کی معرکۃ الآرا تصنیف "اعجاز خسروی" دیکھئے۔

مولانا شبلی صاحب نے شعر العجم اور دولت شاہ نے اپنے تذکرے میں ان کو ترتیب و تفصیل سے بیان کیا ہے۔

امیر خسرو زبان اردو کے اولین مصنفین میں سے ہیں، درحقیقت اس کی بنیاد ان کی تصنیف و تالیف ہی کی رہین منت ہے اور یہ وہ احسان ہے جس سے ہم سبکدوش ہی نہیں ہو سکتے ہیں۔

اردو کی ابتدا زبان اردو کی ابتدا قائم کرنے میں اکثر تذکرہ نویسوں نے عام غلطی کی ہے۔ کسی کی رائے میں اس کی ابتدا شاہجہاں بادشاہ کے عہد سے ہوتی ہے کسی کے خیال میں اس کے بعد کوئی اپنے خیال میں اولیت کا سہرا دکن کے سر باندھتا ہے اور کوئی پنجاب کے مگر ہمارے خیال میں اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر تذکرہ نویسوں نے اولیت، ترتیب، تدوین میں کوئی فرق نہیں بتایا، حالانکہ اس سے کسی کو انکار نہیں کہ اس زبان کی داغ بیل حضرت امیر کے عہد میں پڑ چکی تھی[1] ان محققین میں مولانا محمد امین صاحب اور مولوی شمس اللہ صاحب قادری نے ہمارے دعوے کے مطابق اقرار اولیت کیا ہے۔ مولانا محمد امین صاحب نے اس اولیت کو ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور طریقہ استدلال بہتر اور قابل تسلیم ہے، ہم نے بھی اصول وہی رکھا ہے البتہ استدلال کو زیادہ وسیع اور دعوے کو زیادہ مبرہن کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ حضرت امیر نے زبان اردو کی عمارت کے لئے نہ صرف داغ بیل بنائی بلکہ بنیاد قائم کر کے عمارت کی تعمیر بھی شروع کی جس کی تکمیل و تزئین بعد میں ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ

[1] ملاحظہ ہو (۱) تاریخ اردوئے قدیم شمس اللہ قادری صفحہ ۔ م ۔ ج ۔

---

(۲) گل رعنا صفحہ ۶ معارف پریس
(۳) آب حیات، صفحہ ۱ مطبوعہ کرشی
(۴) نکات الشعرا میر تقی صفحہ ۲ نظامی پریس
(۵) تذکرہ میر حسن صفحہ ۹۲ مسلم یونیورسٹی پریس
(۶) خمخانۂ جاوید ج ۳ صفحہ ۶۳ دلی پرنٹنگ ورکس
(۷) جواہر خسروی، مولوی رشید احمد صفحہ ۳
(۸) مقدمہ خالق باری صفحہ ۴۰ (مولانا محمد امین صاحب)

موجودہ دور کی زبان جو صاف اور ستھری کہی جاتی ہے دور خسروی کے اکثر الفاظ و تراکیب سے مالا مال ہے، یہی دلیل سب سے زیادہ زبردست ہے۔

یہ مسلّم ہے کہ اُردو زبان پراکرت بھاشا سے نکلی ہے اور بھاشا یا سوراسینی سنسکرت کی بگڑی ہوئی صورت کا نام ہے، اسی لئے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اُردو زبان سنسکرت سے نکلی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ امیر خسرو کے وقت میں جو پراکرت بولی جاتی تھی وہ اُردو سے بہت قریب تھی اسلئے امیر صاحب جیسے مبصر و موجد کے لئے اس کو اُردو کے سانچہ میں ڈھالنا آسان تھا۔ امیر خسرو کے عہد میں بھاشا کی یہ صورت تھی:-

۱۔ گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈالے کیس۔
۲۔ سکھی پیا کو جو میں نہ پاؤں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں۔
۳۔ یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من۔
۴۔ پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا۔

یہ مصرعے امیر خسرو کے مستقل اشعار کے ٹکڑے ہیں، ان میں زیادہ تر وہ الفاظ ہیں جو آج سات سو برس کے بعد بھی اپنے اصلی معنوں میں مشہور خاص و عام ہیں۔ امیر صاحب کی مشہور کتاب خالق باری کے الفاظ جملے، ترکیبیں وہی ہیں جو آج بھی زبانوں پر جاری ہیں۔ مثلاً

اسماء

ایک۔ کالا۔ اُجلا۔ نیلا۔ پیلا۔ آس۔ تھاہ۔ گڑھا۔ بھلا۔ بڑائی۔ بڑھاپا۔ میٹھا۔ سیٹھا۔ تالا۔ بلی۔

افعال

جان (امر جاننے سے) اٹھاؤ۔ چلاؤ۔ جانتے۔ پہچانتے۔ کہیئے۔ رہیئے۔ سیکھ۔

مرکبات

گھوڑا چلاؤ۔ آ ڈر رے بھائی۔ بیٹھ رے مائی۔ پاؤں کٹے۔ موتی جانتے۔

بوجھ پہیلیاں

۱۔ ایک بڑھیا شیطان کی خالا، سر ہے سفید اور منھ ہے کالا،
۲۔ گول مول اور چھوٹا موٹا، ہر دم وہ تو زمین پر لوٹا

بن بوجھ پہیلیاں

۱۔ کیا جانوں وہ کیسا ہے، جیسا دیکھو ویسا ہے

۲۔ دانائی سے دانت اس پہ لگا تا نہیں کوئی۔ سب اس کو بھاتے ہیں پہ کھاتا نہیں کوئی۔

کہہ مکرنیاں

۱۔ اوچھلی کود کے وہ جو آیا۔ دھڑ دھکا سب کچھ کھایا۔

۲۔ دُر دُر کروں تو دوڑا آ لے۔

دوسخنے ہندی

۱۔ روٹی جلی کیوں۔ گھوڑا اڑا کیوں۔ جواب۔ پھیرا نہ تھا

۲۔ انار کیوں نہ چکھا، وزیر کیوں نہ رکھا۔ جواب۔ دانا نہ تھا

۱۔ گوئے اور آفتاب میں کیا نسبت ہے؟ جواب گردہ

۲۔ گھوڑے اور حرفوں میں کیا نسبت ہے؟ جواب نکتہ

انملیاں یا ڈھکو سلے

۱۔ گوری کے نیناں ایسے بڑے جیسے بیل کے سینگ۔

۲۔ دال پکی کر سگا سور ہڈل

برج بھاشا

۱۔ نجام دین اولیا کو کوئی سمجھائے۔ جوں جوں مناؤں وہ تو روسا جائے

۲۔ اماں میرے باوا کو بھیجو جی کہ ساون آیا

بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری کہ ساون آیا۔

ضمیمہ خالق باری

۱۔ خواہم گفت کہونگا میں، خواہی گفت کہیگا تیں

۲۔ ازان منست کہ میرا ہے۔ ازان تست کہ تیرا ہے

یہ تمام اصناف تفصیل کے ساتھ جواہر خسروی (مرتبہ مولانا مولوی محمد امین صاحب) میں موجود ہیں، الفاظ و محاورات کے تعین کے بعد دَور اور عہد کا تعین آسان ہو جاتا ہے۔ امیر خسرو نے اُردو میں جتنے اصناف سخن اکٹھا کئے ہیں اگر ان کو باہم مسلسل اور مرتب کیجئے تو آسانی سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ پہلے لغات کو خالق باری کی شکل میں یکجا کیا ہے، اس کے بعد مرکبات، پھر جملے، فقرے، ان کے بعد اشعار لکھے ہیں تاکہ بتدریج سمجھنے میں آسانی ہو۔

جن نمونوں کا انتخاب کیا گیا ہے. ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ اگر آج بھی ان کا اظہار کیا جائے تو ان الفاظ اور ترکیب کے علاوہ دوسری صورت ناممکن معلوم ہوتی ہے۔ ان تمام مقدمات کو ترتیب دینے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ امیر خسرو اُردو کے سب سے پہلے شاعر ہیں۔ حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے تاریخ زبان اُردو میں امیر خسرو کی غزل کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے:۔

خوار شدم زار شدم ست گیار — در غم ہجر تو کمر لوٹتا ہے

روے تو رونق شکن آفتاب — سرو بہ پیش قد تو بوٹا ہے

اس غزل کو دیکھ کر تعجب معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے "بن بوجھی پہیلیوں" میں دانائی سے دانت اس پہ لگاتا نہیں کوئی۔ سب اس کو بھناتے ہیں یہ کھاتا نہیں کوئی۔ کہا ہو، اور بہترین زبان کا نمونہ پیش کیا ہو وہ غزل میں ایسی زبان کیوں لکھتا ہے؟ حالانکہ غزل گوئی کے نشتر سے وہ سراپائے درد تھے جیسا کہ فارسی کی غزلوں سے معلوم ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو یہ غزل حضرت امیر خسرو کی نہیں ہے یا یہ کہ "غزل کا مذاق" اس وقت ایسا نہیں تھا کہ اُردو زبان اس کی تاب لاتی اور سننے والے لطف اندوز ہوتے۔ حضرت امیر خسرو چونکہ بہت بلند پرواز اور عالی خیال تھے اس اعتبار سے ان کو الفاظ نہیں ملتے تھے۔ بہرحال اگر یہ غزل امیر صاحب کی ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ امیر صاحب نے زبان اُردو کی تکمیل اپنے سامنے شروع کر دی تھی، یا کم سے کم اپنے رہروؤں کے لئے ایک راہ نکال دی تھی۔

امیر خسرو کا تخلص پہلے سلطانی تھا جیسا کہ دیوان تحفۃ الصغر کے ابتدائی کلام سے معلوم ہوتا ہے اس کے بعد خسرو ہوا اور دواوین اسی تخلص سے مرتب ہوئے ہیں۔ سلطان نظام الدین اولیا نے امیر کو ترک اللہ کا لقب دیا تھا۔

معاصرین | امیر خسرو کے معاصرین جو ہندوستان میں تھے ان میں خواجہ حسن، صدرالدین عالی، فخرالدین قواس، حمیدالدین راجہ، عارف عبدالحکیم، شہاب الدین عام طور پر مشہور ہیں، ان کے علاوہ شعرا اور بڑے بڑے علما کی صحبتیں بھی انھوں نے دیکھی تھیں۔

خصوصیات کلام | امیر صاحب کا مذاق شاعری اور ادراک اتنا بلند اور نمایاں ہے کہ وہ اس اقلیم کے خسرو (تاجدار) معلوم ہوتے ہیں، تغزل درد اور گداز کے زہر سے بجھائے ہوئے تیروں کا ترکش ہے مثنوی، روانی اور فطرت نگاری کا مرقع ہے، قصائد شان اور شوکت کے جاجے ہیں، مراثی میں تلاطم جذبات بھرا ہوا ہے۔ غرض یہ تمام اوصاف ان کے اصناف کلام میں کمال کی شکل میں نمایاں ہیں۔

تلامذہ | ان کے شاگردوں میں حسن بہت نمایاں ہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی طبیعت کے جا بجا امیر صاحب کی مے جھلکتی ہے۔

وفات | امیر صاحب نے ۱۹۔ ذیقعدہ ۱۳۱۸ھ کو اپنے پیر و مرشد کے غم میں ان کی وفات کے چھ مہینے بعد انتقال کیا اور دہلی میں اپنے پیر کے پائیں دفن کئے گئے۔

اولاد امیر صاحب کے اولاد ذکور میں ایک صاحبزادے ملک احمد مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بیٹی بھی تھیں۔

آرٹ اور ادب میں عامیانہ پن

آرٹ اور ادب میں ہر وہ چیز عامیانہ اور بازاری ہے جو دل و دماغ میں روشنی پیدا کرنے اور اعلیٰ فکری جذبات کو اپیل کرنے کی بجائے محض لذات اور جنسی احساسات کو برانگیختہ کرے۔

عامیانہ پن دو طرح ظاہر ہو سکتا ہے نفس مضمون سے اور اس مضمون کے طرز ادا سے۔ لیکن چونکہ نفس مضمون کو کسی نہ کسی طرح بلند حیثیت دی جا سکتی ہے۔ اسلئے یہاں بحث صرف طرز ادا سے ہے۔ جو کسی خیال کا طرز بیان یا انداز عامیانہ عریاں اور بازاری ہو تو وہ حد درجہ مسموم ہوتا ہے

آرٹ میں ہر تفصیل جس کی ضرورت ہو عامیانہ نہ ہوگی بلکہ پست کہنا اچھا ہوگا مگر پست اور عامیانہ پن میں بھی بہت فرق ہے۔ پست کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ آرٹ نفس مضمون یا انداز بیان کی بلندی یا اعلیٰ معیاری چیز پیدا نہیں ہو سکی عامیانہ پن اس سے زیادہ خطرناک ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ آرٹ کی تخلیق نہ صرف اعلیٰ معیار پر نہ سکیں بلکہ وہ خیالات کے اعتبار سے بھی مجبوری ہو اور رجحان خیز ہیں۔ بلکہ جذبات پست ہوں اور نا کارہ ثابت ہو۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ آرٹ اور ادب کا مضمون جو پست اور عامیانہ ہو تو اس کی پیداوار بھی پست اور بازاری قسم کی ہوگی۔ بلکہ کسی اعلیٰ خیال عمدہ صحیح نظریہ اور عجیب فنی اثر کو ناکارہ اور سرسری طور پر ظاہر کرنے سے بھی پیداوار عامیانہ ہو جاتی ہے۔ اسلوب بیان، طرز ادا اور آرٹ کی عام نمائش اور اظہار سے ہی اس کا درجہ بلند ہوتا ہے ورنہ گر جاتا ہے۔

(ادبی دنیا) (مشیر)

ترکی کا جدید رسم الخط

(از منشی مہیش پرشاد عربی و فارسی لیکچرار بنارس ہندو یونیورسٹی)

ترکی میں پہلے چغتائی رسم الخط کا چلن تھا، اسلام کے پہونچنے پر عربی رسم الخط اختیار کیا گیا تھا مگر یکم دسمبر ۱۹۲۸ء سے رومن رسم الخط لازمی قرار دیا گیا ہے جس کی تفصیل و ترتیب درج ذیل ہے۔

حروف تہجی جدید ترکیہ[1]

Aa آ	Bb بہ	Cc جہ	Çç چہ	Dd دہ	Ee ئہ
Ff فہ	Gg غہ۔گہ	Ğğ غہ	Hh ھہ	İi ئی	Iı عی
Jj ژ	Kk[2] نہ۔کہ	Ll لہ	Mm مہ	Nn نہ	Oo او
Öö اؤ	Pp پہ	Rr رہ	Ss سہ	Şş شہ	Tt تہ
Uu آو	Üü اُو	Vv وہ	Yy یہ	Zz زہ	

عام طور سے مشہور تو یہ ہے کہ ترکی میں رومن رسم الخط جاری ہوا ہے اب عربی رسم الخط وہاں نہیں رہا لیکن مذکورہ بالا حروف پر بعض ادنیٰ تامل کرنے پر مفصلہ ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) تعداد حروف تہجی میں تبدیلی واقع ہوئی ہے، کیونکہ ترکی زبان میں پہلے غالباً کل ۳۳ حروف تھے جن میں سے ۲۰ عربی ۴ فارسی اور صرف ایک ترکی زبان کا تھا مگر اب صرف ۲۹ حروف ہیں، تمام ہم آواز حروف میں سے صرف ایک رکھا گیا ہے چنانچہ وہاں اب یہ جھگڑا نہیں رہا کہ فلاں لفظ میں

---

[1] ماخوذ از سالنامہ پارس ۱۳۰۷ھ مطبوعہ طہران

[2] ترکی زبان میں ک کی آواز ن کے مانند بھی نکلتی ہے، اس وجہ سے جدول میں K کے نیچے ن بھی ہے۔

ت ہے یا ط۔ علاوہ بریں یہ بھی واضح رہے کہ موجودہ رومن حروف میں خ اور ق داخل نہیں ہیں کیونکہ خ کا تلفظ دراصل ہ کی طرح ہوتا ہے اور ق کے بدلے صرف ک ہی بولا جاتا ہے۔ القصہ جو حرف جس طرح بولا جاتا ہے اسی طرح لکھا جاتا ہے

(۲) حروف تہجی کی قدیم ترتیب اب باقی نہیں رہی بلکہ رومن حروف کی ترتیب کو مناسب تبدیلی کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔

(۳) حروف تہجی کے تلفظ میں ضرور فرق آ گیا ہے۔ فتحہ (زبر) چونکہ اخف الحرکات ہے اس لئے فتحہ مخلوط بالہا سے کام لیا گیا ہے۔ بہرکیف الف۔ بے۔ جیم وغیرہ کے ڈھنگ پر تلفظ کرنے کا جو قدیم دستور تھا اس کو خیرباد کہا گیا ہے۔

(۴) زبر۔ زیر۔ پیش۔ جزم۔ تنوین اور تشدید کی علامتیں اب علاحدہ چیزیں نہیں رہیں بلکہ جدید ۲۹ حروف ہی سے ان کا بھی کام چل گیا۔ پس ۳۲ حروف تہجی قدیم اور مذکورہ بالا علامتوں کی جگہ یہ صرف ۲۹ حروف جدید ہی کافی و شافی ہوئے ہیں۔

(۵) عربی حروف کے نقاط، اعراب اور مختلف صورتیں خصوصاً اختصار کی حالتوں کی، جو خوشخط ٹائپ کے حق میں سد راہ تھیں اب کالعدم ہو گئیں۔

غزل

(لسان القوم حضرت علامہ صفی لکھنوی)

نہ آپ وعدہ کو شرمندۂ وفا کرتے
نہ ہم جسارتِ اظہارِ مدعا کرتے

جنوں میں بندگیٔ عشق یوں ادا کرتے
بتوں میں بیٹھ کے کچھ دن خدا خدا کرتے

مٹے ہوئے گل رعنا کی خوش لباسی پر
ملاحظہ تری اتری ہوئی قبا کرتے

فسانہ سنتے ہی غم کا حضور سو جاتے
تمام رات کہانی سی ہم کہا کرتے

نہ منہ سے اف بھی نکلتی خدا ہے سنگ گواہ
جفا کی حد میں اگر رہ کے تم جفا کرتے

سفر عدم کا ہے درپیش اب خدا حافظ
معاف آپ ہمارا کہا سنا کرتے

جسارت ہوس دید ہے معاذ اللہ
کلیم ہوش کی اپنی ذرا دوا کرتے

یونانی دیوتا اور طب

(از جناب شعری انصاری)

یونانی دیوتاؤں کا مرتبہ | گذشتہ زمانے سے اکثر ہم مافوق الانسان قوتوں یا ہستیوں سے امداد کی درخواست کرتے آئے ہیں۔ اسی طرح یونانی بھی اپنے دیوتاؤں سے صحت یابی کے لئے دعائیں کیا کرتے تھے اور قربانیاں چڑھایا کرتے تھے لیکن ان کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ ان کے دیوتا اپنی زبان سے ایک لفظ کہہ دیں گے یا ایک اشارہ کردیں گے تو درد جاتا رہیگا، زخم مندمل ہوجائیگا اور بیماری کا ہمیشہ کے لئے ازالہ ہوجائیگا۔ کیونکہ ان کے خیال میں دیوتا قوانین قدرت پر کچھ اختیار نہ رکھتے تھے۔ ان کے عقیدے کے مطابق دیوتاؤں کا سردار زیوس بھی انسانوں کی طرح قسمت و تقدیر کے تابع تھا اور اس میں یہ طاقت نہ تھی کہ واقعاتِ عالم کی رفتار بدل دے۔ خلاصہ یہ کہ یونانی دیوتا معجزات نہیں دکھلاتے تھے تاہم وہ علم و فضل میں ممتاز تھے، ان کو جڑی بوٹیوں اور ان کے طبی خواص کا بھی علم تھا، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ صحت بخش دوائیں کس طرح تیار کی جاتی ہیں۔ چنانچہ مہربان ہوکر وہ اپنے پجاریوں کو حصول مقصد کا صحیح راستہ بتا دیتے تھے۔ اس لئے یونانی اپنے دیوتاؤں سے یہ درخواست کرتے تھے کہ وہ مریض انسانوں کے لئے خدائی علم کام میں لائیں۔

طب کی ایجاد | بعض لوگوں کا عقیدہ تھا کہ فن طب اتھینا کی ایجاد ہے، کہانی یہہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ پیریکل نے ماہر تعمیرات مینسکل کے لئے اس دیوی سے دعا مانگی اور دیوی نے خواب میں ایک بوٹی بتلادی جس سے وہ ماہر تعمیرات اچھا ہوگیا۔ شہر ایتھنس میں اس دیوی کے نام کا مندر بھی تھا جہاں اس کی اتھینا ہیگیا کے نام سے پرستش ہوتی تھی (ہیگیا کے معنی ہیں تندرستی) اتھینا کے علاوہ اور بھی دیوی دیوتا تھے جن کی نسبت یہ عقیدہ تھا کہ وہ بعض بیماریوں کا علاج جانتے تھے، مثلاً ارٹمیس جس کا شہر ایفیس میں ایک مشہور مندر تھا ایک ضماد جانتی تھی جو آنکھ کی تمام بیماریوں کے لئے اکسیر تھا، اسی طرح افرودیت ٹھوڑی کی پھوڑیاں اچھی کرنا جانتی تھی۔ ہرمز ہیراکل اور ہیفاسٹ کبھی کبھی طبی مشورے دیا کرتے تھے اور چند پریاں بھی جلدی امراض کا علاج

جانتی تھیں۔

غیر ملکی دیوتا | یونان میں جو نئے دیوتا داخل ہوئے انھوں نے عوام کو اپنا عقیدت مند بنالیا۔ اس حسن عقیدت کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ وہ طبی مشورے دے سکتے ہیں۔ انھیں میں فرنگیا باخ ایک دیوتا تھا جو عام طور پر سبازی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اپنی جوش انگیز موسیقی اور اپنے کوریبانٹ (رقاص دینی علما) کے ناچ سے روحانی امراض کا علاج کیا کرتا تھا۔ مصری دیوتا آئیسیس آوزیریس اور سیراپیس۔ بطلیموس فلادلیف کے آخری عہد حکومت میں یونانی دیوتاؤں میں شامل ہوئے تاہم چند ہی سال کے عرصہ میں پندرہ مندر تعمیر کر کے ان کے لئے مخصوص کئے گئے اور سیراپیس کی شہرت شفا بخشی نے اس قدر ترقی کرلی کہ وہ یونان کے فن معالجہ کے ممتاز دیوتا اسقلی بیوس (معرب اسکلیپی) کا حریف مقابل بن گیا۔

معالج دیوتا | یہ دیوتا جن کا اوپر ذکر ہوا یا جو یونان میں داخل ہوئے ان سب کی طبی خصوصیت جزوی تھی۔ جن دیوتاؤں کی امتیازی خصوصیت علاج معالجہ تھی ان میں سب سے قدیم دیوتا پیآن ہے جو ہومر کے زمانے تک زندہ تھا۔ اس زمانہ میں یہ خیال تھا کہ آلپس کے دیوی دیوتا آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے ہیں۔ اور وہ اپنے دیوتائی جذبۂ غرور کی وجہ سے انسانوں سے بھی لڑا کرتے تھے۔ ان لڑائیوں میں ان کے بدن پر ورم بھی آجاتا تھا اور زخم بھی ہو جاتے تھے۔ پھر اس وقت وہ درد و تکلیف سے بے تاب ہو کر اس قدر زور سے چیختے چلاتے تھے کہ یونان اور ٹرائے لرز جاتے تھے یہ قابل رحم دیوتا اگرچہ موت سے بری اور آزاد تھے لیکن ان میں درد کے برداشت کی طاقت نہ تھی اس لئے وہ دیوتاؤں کے معالج پیآن کو مدد کے لئے بلاتے تھے، چنانچہ الیڈ کی پانچویں کتاب میں لکھا ہے کہ پیآن نے ہادز (جس کا لاطینی نام پلوٹون ہے) کے زخم کا علاج کیا۔ اسی طرح الیڈ میں آریز دیوتا کا قصہ لکھا ہے کہ:۔

> جب غارت گر انسان آریز نے دیومید کو دیکھا تو وہ سیدھا اس کی طرف جھپٹا اور جب قریب پہنچ گیا تو پہلے اس نے گھوڑوں کی جوڑی کے اوپر سے اپنے کانسے کے بھالے سے اس پر حملہ کیا لیکن ارزق چشم اتینا نے بھالا گاڑی کے نیچے کر دیا تاکہ وار خالی جائے۔ اس کے بعد دیومید نے اپنے کانسے کے بھالے سے اس پر حملہ کیا۔ ارزق چشم اتینا نے اپنا بھالا آریز کے پیٹ پر مارا جس سے اس کی خوبصورت جلد کٹ گئی۔ آریز نے بھالے کی نوک کھینچ لی اور اس قدر غل شور کیا جس قدر نو دس ہزار آدمی آغاز جنگ کے وقت کر سکتے ہیں۔ اس شور

اہل یونان اور اہل ٹرائے پر لرزہ طاری ہو گیا، زخمی آریز درد و تکلیف میں مبتلا زیوس
کے پاس گیا اور اس سے شکایت کی۔ زیوس نے پیآن کو اس کے علاج کا حکم دیا، پیآن نے
دافع درد دوائیں چھڑک کر اُسے اچھا کر دیا، کیونکہ اس دیوتا میں کوئی چیز فانی نہ تھی۔ اس کے بعد
اس نے ہیبے میں غسل کیا اور اپنی پسند کے کپڑے پہن کر زیوس کے پاس فخر و ناز کے ساتھ بیٹھ گیا"
پیآن دیوتاؤں کا علاج کیا کرتا تھا اسلئے لامحالہ انسانوں کو بھی ان کی بیماری میں مدد دیا کرتا تھا اسی وجہ سے
اس کی پرستش کی جاتی تھی اور اس کے نام پر بھینٹ چڑھائی جاتی تھی تاکہ اس سے طبی مشورے حاصل
کئے جائیں۔

اپالو کچھ عرصے کے بعد پیآن اور اپالو کا نام مخلوط ہو گیا اور یہ دونوں ایک ذات سمجھے جانے لگے
اس وقت سے اپالو پیآن علاج کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ پنڈار جو یونان کا ایک مورخ ہے لکھتا ہے کہ
"اپالو مردوں اور عورتوں کو سخت امراض میں افاقے کی تدبیریں بتلایا کرتا ہے" کئی مرتبہ جب یونان
میں وبا سے موت کی گرم بازاری ہوئی تو اپالو سے دعائیں مانگی جاتی تھیں اور لوگوں کا عقیدہ تھا کہ
بقیہ انسانوں کی جان اُسی نے بچائیں علاوہ اس طبی خصوصیت کے اپالو کے چند فرائض اور بھی تھے
وہ ہم آہنگی (Harmony) اور موسیقی کا سردار تھا۔ شاعروں پر مضامین القا کرنا، نبیوں کو ندائے غیب
پہنچانا، لوگوں کو خواب دکھلانا۔ دینی طہارتوں اور خطاؤں کے جرمانوں کی نگرانی کرنا، کھیتوں کی بھیڑ لوں
ٹڈیوں اور چوہوں سے حفاظت کرنا، جانوروں کی پیدائش کے وقت نگرانی کرنا، راہگیروں کی رہنمائی
اور ہر گھر کی دربانی بھی اسی دیوتا کے ذمہ تھی۔ غالباً قدیم یونانی یہ خیال کرتے تھے کہ تنہا ایک شخص اگرچہ
وہ دیوتا ہی کیوں نہ ہو بہت سے مددگاروں کے بغیر یہ سب کام انجام نہیں دے سکتا ہے۔ اس لئے
ان کا خیال تھا کہ اپالو کے چند بیٹے ہیں جن کا مخصوص پیشہ علاج معالجہ ہے۔ اگرچہ اپالو نے کبھی شادی
نہیں کی کیونکہ ایک مرتبہ اس نے ہیسپیا سے عقد کی درخواست کی تھی لیکن اس مغرور عورت نے یہ
کہکر انکار کر دیا کہ میں ہمیشہ کنواری رہنا چاہتی ہوں۔ اس مغرورانہ جواب سے اپالو کو صدمہ ہوا اور اس
نے تہیہ کر لیا کہ آیندہ میں کسی عورت سے شادی نہ کرونگا۔ لیکن وہ ہمیشہ کنوارا بھی نہیں رہ سکتا تھا اس
وجہ سے اس نے چند عورتوں سے عارضی نکاح کئے جن سے اس کی اولاد ہوئی۔

اسقلیبیوس اپالو کا ایک بیٹا اسقلیبیوس تھا، وہ نہایت دانشمند اور بڑا پرہیزگار تھا لیکن اس سے یہ غلطی ہو گئی کہ
ایک بہت کم عقل عورت سے شادی کر لی جو بے وفا اور خائن تھی۔ اسی کے ساتھ اسقلیبیوس اس عورت کا
بری طرح تابع ہو گیا۔ جس پر دیوتاؤں نے ناراض ہو کر اس کو زمین کے ایک شگاف میں ڈال دیا، لیکن بعد

میں اس کے انصاف اور علم و دانش کے صلے میں اس کو زندہ جاوید بنا دیا۔ اسی وجہ سے امفیارائے
نام سے کئی مندر بنائے گئے جہاں عام اعتقاد کے بموجب وہ ندائے غیبی پہنچایا کرتا تھا۔ بہرحال ان مندروں
میں بہت سے بیمار آیا کرتے تھے خصوصاً اوروپ سے لوگ اس غرض سے آیا کرتے تھے کہ امفیارا
خواب میں آ کر کوئی مفید دوا بتلا دے۔

ہپشولیٹ تیسے کا بیٹا ہپشولیٹ اگرچہ اپنی سوتیلی ماں فیدرا کے ساتھ مجرمانہ محبت رکھنے کی وجہ سے
مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا تاہم شہر تریزین میں اس کا مجسمہ تھا اور وہ نیم دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ اور باشندگان
ارکیڈیا اس کو تندرستی بخشنے والا دیوتا خیال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس کا ایک اژدہے سے مقابلہ ہو گیا
جس نے ہپشولیٹ کو مار ڈالا۔

اسقلی بیوس لیکن اسقلی بیوس نے اس کو پھر زندہ کر دیا۔ اس کے بعد وہ بہت دانشمند ہو گیا اور
اسرار کائنات کی واقفیت اور پرہیزگاری کی وجہ سے لافانیت کا مستحق ٹھہرا لیکن اسقلی بیوس کی شہرت
نے اس کو بہت نقصان پہنچایا۔ تریزین میں اس کے حریف مقابل اسقلی بیوس کا ایک مندر بنایا گیا
کیونکہ یہ کل یونان میں فن علاج کا دیوتا مانا جاتا تھا۔ ہومر کے زمانے میں یہ دیوتاؤں کے زمرے میں
شامل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ الیڈ کا مصنف یا مصنفین کہتے ہیں کہ وہ تھسلی کے علاقے میں شہر ترکا کا بادشاہ
تھا۔ ان مصنفین کا بیان ہے کہ اس نے فن طب کنتاؤر خیرون سے (جس کا نصف بدن انسان
کا اور نصف بدن گھوڑے کا تھا) حاصل کیا اور اپنے دو بیٹوں ماخاؤن اور پوڈالیر کو خود یہ فن سکھایا
جو محاصرہ ٹرائے کے وقت یونانی سرداروں کے طبیب تھے۔ ہومر نے تو صرف اسی قدر بیان کیا ہے
لیکن بعد میں اس کا قصہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ لوگوں نے اس کو کورونیس کے بطن سے اپالو کا بیٹا بنا دیا
اور یہ بھی بیان کیا جاتا تھا کہ اسقلی بیوس اپی ڈاورس میں پیدا ہوا لیکن اس کی بے رحم اور ظالم ماں
اس کو ایک پہاڑ پر پھینک گئی۔ وہاں ایک بکری نے اس کی پرورش کی اور ایک گڈریے کے کتے
نے اس کی حفاظت کی۔ گڈریے نے اس کو اٹھا لیا اور ایک اعجازی بجلی چمکنے سے یہ ظاہر ہوا کہ
یہ بچہ دیوتاؤں کی نسل سے ہے۔ دوسری جگہ یہ قصہ مشہور تھا کہ اس کے باپ اپالو نے جوش غیرت
میں اس کی ماں کورونیس کو تو مار ڈالا لیکن بچے کو بچا لیا جو اس کے پیٹ ہی میں تھا اور خیرون کی تربیت
کے سپرد کر دیا۔ یہ بچہ علم و فضل میں بہت جلد اپنے استاد سے بڑھ گیا اور اس میں صرف یہ قابلیت
پیدا ہو گئی کہ وہ بیماروں کو شفا دے بلکہ مردوں کو بھی زندہ کرنے لگا۔ جو دیکھ کر اعراف کے دیوتا ہادز
نے دیوتاؤں کے سردار سے شکایت کی کہ یہ فانی انسان دوزخ کو بہت جلد غیر آباد اور ویران کر دے گا

زیوس نے اپنے بھائی کی شکایت پر بجلی گرا کر اسقلی بیوس کو مار ڈالا لیکن انتقام، انتقام کا تقاضا کرتا ہے۔ اپالو نے اپنے بیٹے کی موت کا انتقام لیا اور سائیکلوپ کو تیر سے مار دیا۔ اس قصور پر زیوس نے اپالو کو یہ سزا دی کہ نو برس تک انسانوں میں رہ کر ان کی خدمت کیا کرے۔ آخر یہ جنگ اس طرح ختم ہوئی کہ اسقلی بیوس اپنے علم و دانش کی وجہ سے دوزخ سے نکال کر دیوتا بنا دیا گیا۔ اور دیوتاؤں کا احترام بھی اس کو حاصل ہوگیا۔ یونانیوں نے اسقلی بیوس کی طرف بہت سے خاندان اور خدم و حشم منسوب کر دیئے ہیں۔ جو مندر اس کے واسطے بنایا گیا تھا اس میں کئی مجسمے اور بھی تھے، ایک مجسمہ اس کی بیوی اپیون کا تھا جس کے لفظی معنی ہیں "درد دفع کرنے والی" اور تیلیسفور یا اکیشیا جس کے معنی ہیں صحت بخشنے والا۔ ان کے علاوہ اس کی بیٹیاں بھی تھیں۔ پناشیا (ہر مرض کا علاج کرنیوالی) یاس (طبیبہ) اَیگل (دن کی روشنی) اسقلی بیوس کے تین بیٹے بھی تھے، اپالنساک (ننھا طبیب) الکسانور (حامی) اور رات (مقدس) یہ سب نام امراض کے مناسب دیوی دیوتاؤں کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی طرف ایک اور بیٹی بھی منسوب کی جاتی ہے، جس کا نام ہیگیا (صحت) ہے جو پہلے تو ایک صفت مجرد مشخص کر لی گئی تھی لیکن بعد میں ایک جاندار ہستی تصور کر لی گئی اور اسقلی بیوس کی اولاد میں شامل کر دی گئی۔

شہر ترکا میں جو تھسلی کے پہاڑوں پر واقع تھا اس سابق انسان دیوتا کی کہانی وضع ہوئی اور یہی شہر اس کے مشرب کا مبدا تھا۔ یہاں ایک بہت پرانا مندر اور جائے پناہ تھی جس کے دروازے مریضوں کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ اسی شہر سے اسقلی بیوس بحیثیت دیوتا مشہور ہوا اور یہ شہرت یہاں سے علاقہ مسینی کے شہر ایپی ڈاؤر میں پہونچی اور پھر ان تمام ملکوں میں پھیل گئی جہاں جہاں یونانی آباد تھے۔ پاؤسانی سیّاح کہتا ہے (جو دوسری صدی عیسوی میں زندہ تھا) اسقلی بیوس کے ترسٹھ[۶۳] مندر ہیں، ایتھنس میں جو مندر تھا وہ پانچویں صدی قبل مسیح کے آخر میں طاعون کی گرم بازاری کے زمانے میں تعمیر کیا گیا تھا۔

طاعون کے زمانے میں اٹلی کے پایہ تخت روم میں بھی اسقلی بیوس کا ایک مندر تھا سنہ ۲۹۲ ق.م۔ میں اہل روما کا انسانی علاج پر اعتقاد نہ تھا اس لئے وہ دیوتاؤں سے صحت یابی کی التجا کیا کرتے تھے وہ ایپی ڈاؤر میں جس کی شہرت یونان سے باہر بہت تھی اپنے سفیر بھیجا کرتے تھے، یہ سفرا ایک جنگلی سانپ کا ذکر کیا کرتے تھے جو مندر میں موجود تھا کیونکہ اہل روما اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق سانپ کا بہت احترام کرتے تھے اس لئے جب وہ یہاں سانپ کا مشاہدہ کرتے تھے تو وہ یہ خیال کرتے تھے کہ انھوں نے خود

اسقلی بیوس کو دیکھا۔ ان سفرا نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ سانپ ایک جہاز میں سفر کر رہا تھا۔ اُس جہاز سے اُتر کر جزیرہ ٹائبر میں رینگ کر چلا گیا اس لئے رومیوں نے وہاں دیوتا کے لئے ایک مندر بنا دیا تھا۔

یونانی طب کا مولد — اسقلی بیوس کے مندروں میں جو اسکلیپیون کہلاتے تھے یونانیوں کے فنِ طب کی بنیاد رکھی گئی، دینی پیشوا جو ان مندروں کے متولی تھے بزعم خود اسقلی بیوس کی نسل سے تھے، لیکن یہ دینی پیشوا صرف ارشاد وہدایت نہیں کرسکتے تھے کیونکہ ان کا مزعومہ مورث اعلیٰ فن طب کا دیوتا تھا اس لئے ان کو بھی معالج پیشوا ہونا چاہیئے تھا۔ اسی وجہ سے وہ علاج معالجہ میں مشغول رہا کرتے تھے اور گویا وہ اسقلی بیوس کی تعلیمات کی ترجمانی کیا کرتے تھے۔ دن رات مریضوں میں رہنے بسنے سے فنِ علاج میں بہت ہوشیار ہوگئے۔ اور ان کے مندر تھوڑے ہی عرصے میں دار التحقیق بن گئے جہاں فن طب نے رفتہ رفتہ تجربات کی شکل اختیار کرلی۔ یہ مندر تعلیم گاہ کے بجائے دار التحقیق اس لئے موسوم کئے گئے ہیں کہ "بنی اسقلی بیوس" نے ابتدا میں یہ کوشش کی کہ یہ تجارت تنہا انھیں کے ہاتھ میں رہے اس لئے وہ اپنا علم نہایت احتیاط سے مخفی رکھتے تھے اور اپنی اولاد کے سوا یہ "راز" کسی کو نہیں بتلاتے تھے باوجود اس کے بقراط معالج سے بہت پہلے چند اہل دنیا بھی ان جماعتوں میں شامل کرلئے گئے تھے اور انھوں نے تھوڑا سا علم حاصل کرلیا تھا، اس کے علاوہ خود دینی پیشوا مندروں سے باہر بھی علاج معالجہ کے لئے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ خود بقراط جو جزیرہ کوس کے دینی پیشواؤں کی جماعت میں شامل تھا، یونانی شہروں میں اکثر علاج معالجہ کرتا پھرتا تھا۔ آخر میں بنی اسقلی بیوس نے غیر خاندان کے طالب علموں کو بھی اپنے درس میں شامل کرلیا۔ تاہم اسکلیپیون فنِ طب کے مرکز رہے اور یہاں مریضوں کی آمد کم نہیں ہوئی۔

عملی تدابیر — اگر ہم یہ دریافت کرنا چاہیں کہ ان دینی پیشواؤں کی عملی تدابیر کیا تھیں تو ہم کو اپی ڈاؤرس کے مشہور یونانی اسکلیپیون میں جانا چاہیئے۔ اب سے تقریباً بیالیس سال پہلے جو آثار قدیمہ برآمد ہوئے ہیں اور قدیم مصنفین کی جو تحریریں دستیاب ہوئی ہیں ان سے ان عملی تدابیر کا علم ہوتا ہے جو مندروں میں کی جاتی تھیں[۱]۔

اپی ڈاؤرس کا اسکلیپیون ایک پہاڑی پر واقع تھا اور یونان کے دوسرے مندروں کی طرح محض

۱؎ ڈاکٹر ویر کوہٹ نے آرکیالوجک ریویو میں ۱۸۸۳ء - ۱۸۹۵ء میں لکھا تھا کہ دینی پیشواؤں کے فن علاج کو شعبدہ بازی سمجھنا اور ان طبیبوں کو دھوکہ باز خیال کرنا غلطی ہے۔ وہ نہایت قابلیت سے آپریشن کیا کرتے تھے اور ان کا فن علاج بڑی حد تک علمی تھا۔

ایک عمارت نہ تھا بلکہ ایک قطعۂ زمین دیوتا کے لئے مخصوص تھا جس پر عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے اطراف میں "مقدس جنگل" تھا جس کی بیرونی حدیں بڑے بڑے پتھروں سے نمایاں کردی گئی تھیں۔ جب کوئی شخص ان حدود کے اندر داخل ہوتا تھا تو وہ گویا دیوتا کے دربار میں پہونچ جاتا تھا اور اس پر تمام آداب واحکام کی پابندی لازم ہوجاتی تھی۔ وہاں کسی عورت کو وضع حمل کرنے کی اجازت نہ تھی، نہ یہاں کوئی مرسکتا تھا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ دیوتا یہاں کسی کے مرجانے یا وضع حمل سے ڈرتا تھا بلکہ یہ وجہ تھی کہ مردے کی لاش اور وضع حمل سے یہ مقدس جگہ ناپاک ہوجاتی تھی۔

اسکلیپیون میں چند عمارتیں ہوا کرتی تھیں۔ خاص عمارت تو خود اسقلی بیوس کا مندر تھی جس میں ہر وقت ہر قسم کے اکثر زائرین تندرست، بیمار، حاجتمند، سیاح اور زہاد آیا کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوا کرتی تھی جو حسن عقیدت رکھتے تھے یا کسی مرض میں مبتلا ہوتے تھے۔ پانچ سال کے بعد ان مندروں میں بڑے بڑے جشن ہوا کرتے تھے جو نو دن تک قائم رہتے تھے۔ زائرین کی تعداد حیرت انگیز ہوتی تھی۔ ان میں تاجر وغیر تاجر، چور اور ساہوکار سب ہی قسم کے لوگ ہوا کرتے تھے۔

مندر میں ہر جگہ بے شمار شفایاب مریضوں کی شکر گذاری کی یادگاریں پڑی رہتی تھیں یا لٹکتی رہتی تھیں۔ یہ سنگ مرمر کی تختیاں ہوتی تھیں جن پر کچھ عبارت نقش ہوتی تھی اور ان مختلف اعضا کی روپہلی اور سنہری تصویریں ہوتی تھیں جن کا علاج دیوتا نے کیا تھا مثلاً ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ران اور سینہ وغیرہ وغیرہ۔ زائرین ان بڑی تختیوں کو نہایت احتیاط اور حیرت سے پڑھا کرتے تھے جن پر دیوتا کی کرامتیں لکھی ہوتی تھیں۔ پاؤسانی سیاح کہتا ہے کہ اس زمانے میں میں نے چھ تختیاں دیکھیں اور موسیو لیوادیاس کو بھی آثار کی تحقیقات میں چند ٹکڑے دستیاب ہوئے تھے جن میں سے ایک کا عنوان ہے "اپالو اور اسقلی بیوس کے علاج"۔

باوجود اس شہرت کے یہ زیارت گاہ طویل وعریض نہ تھی۔ ۱۳ میٹر بلند اور ۲۱-۲۱ میٹر طول وعرض لیکن یہ بڑے قیمتی سامان سے مزین تھی، ہر جگہ مجسّمے بنے ہوئے تھے اور منبت کاری کا کام تھا۔ دیوتا کا مجسمہ سنگ مرمر اور سونے کے پتروں سے منڈھا ہوا تھا۔ اس مندر کی تعمیر چوتھی صدی قبل مسیح کی ابتدا میں ختم ہوئی تھی اور اس پر ایک لاکھ درہم خرچ ہوئے تھے۔ اس رقم کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ میں ایک معمار کی تنخواہ ایک درہم یومیہ تھی۔

چونکہ یونانی مندر کے اندر جانوروں کو بھینٹ نہیں چڑھایا کرتے تھے اس لئے اسی ڈاور کی قربان گاہ اسقلی بیوس کے مندر سے کسی قدر دور تھی۔ اس کے آثار جو تحقیقات کے سلسلے میں دریافت ہوئے ہیں

ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد بہت چوڑی تھی جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جابرا
کے زمانے میں یہاں کثیر التعداد جانور ذبح کئے جاتے تھے۔

مندر کے قریب بیماروں کے لئے ایک مقدس خوابگاہ تھی جہاں اسقلی بیوس شفابخشا کرتا تھا۔ اس وقت تک دو خوابگاہوں کا پتہ چلا ہے جو ایک دوسرے سے قریب تھیں۔ دوسری خوابگاہ کئی صدیوں کے بعد تعمیر کی گئی تھی۔ گویا ایک خواب گاہ دیوتا کے پجاریوں کے لئے کافی نہیں ہوئی۔ یہ آٹھ میٹر بلند ایک دالان تھا۔ اس کے دو کارستونوں سے آراستہ تھے۔ تین طرف دیوار تھی۔ ستونوں کی دوسری قطار اندر سے دو طولانی غلام گردشوں میں تقسیم کرتی تھی۔

اسکلیپیون میں سفید سنگ مرمر کا ایک قبہ بھی تھا جو ستونوں کی دو قطاروں پر قائم تھا اور ان پر نہایت عمدہ پچیکاری کی گئی تھی۔ ایک تھیٹر بھی تھا جس کے اجزا کے تناسب اور تعمیری خطوط کی یکسانی پر اُس زمانے کے علاوہ آج کل بھی حیرت کی جاتی ہے۔ ایک ورزش گاہ اور آتمیس دیوی کا اور ایک افرودیت کا مندر بھی تھا۔ ان عمارتوں پر روما کے شہنشاہ انٹونی نے بھی بعض عمارتوں کا اضافہ کیا تھا مثلاً ہیگیا دیوی کا مندر، مقدس جنگل میں جگہ جگہ مجسمے، مختلف مورتیں اور ستون وغیرہ بنوائے تھے جن سے یہ جگہ نہایت خوبصورت اور شاندار ہو گئی تھی اور بیماروں پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا تھا۔

<u>طریقۂ علاج</u> اسقلی بیوس دیوتا کا جو طریق علاج تھا اُس کا خاکہ سب سے پہلے یونان کے ایک مصنف ارسطوفن نے گستاخانہ انداز سے اس طرح کھینچا ہے۔ اس نے اپنی کامیڈی پلوٹ میں بیان کیا ہے کہ ایتھنس کا ایک باشندہ خرمیل دولت کے دیوتا پلوٹ سے ملا اور اُسے اپنے ساتھ لے گیا پلوٹ اندھا تھا اس لئے ضرورت تھی کہ اسقلی بیوس اُسے بصارت عطا کرے۔ وہ ایتھنس کے اسکلیپیون میں آیا اور خرمیل کا غلام کاریون اپنی مالکہ سے پلوٹ کی صحت یابی کا حسب ذیل واقعہ بیان کرتا ہے

کاریون۔ "بی بی شراب دیجئے اور آپ بھی پیجئے کیونکہ آپ کو پینے کا بہت شوق ہے۔ میں بڑی خوش خبری لے کر آیا ہوں۔"

بی بی، وہ کیا ہے، بیان کر،

کاریون۔ لیجئے، سنئے۔ جب ہم مندر کے پاس بیمار کے ساتھ پہنچ گئے تو اس بدقسمت کو جو اب بجد خوش قسمت ہے پہلے دریا میں غسل دینے لے گئے۔ اس کے بعد ہم دیوتا ؤں کے مندر میں داخل ہو گئے، اور جب ہم نے قربان گاہ پر روٹیاں اور مختلف قسم کی نذریں رکھیں

اور جب حریص ہیفائسٹسؔ[1] کو خالص میدے کی روٹی مل گئی تو ہم نے قاعدے کے مطابق
لیمپ کو الٹا دیا اور ہم نے بھی اپنے بستر بچھا دئے۔"

بی بی۔ کیا اور لوگ بھی دیوتا سے درخواست کرنے آئے تھے؟

کاریون۔ "ہاں۔ ایک نیوکلیڈ[2] تھا جو ہے تو نابینا لیکن آنکھوں والوں سے زیادہ ہوشیاری سے
چوری کرتا ہے۔ اور دوسرے ہر قسم کے مریض تھے۔ پھر روشنیاں گل کر دی گئیں اور مجاور نے
ہم کو سونے کے لئے بلایا اور حکم دیا کہ اگر کوئی شور ہو تو خاموش رہو اس لئے ہم چپ چاپ
لیٹ گئے۔ لیکن مجکو نیند نہیں آئی۔ میرا دل دلیے کی ایک ہنڈیا میں لگا ہوا تھا جو ایک بڑھیا کے
سرہانے رکھی تھی۔ میں بیتاب ہو رہا تھا کہ لڑھکتا ہوا اُس طرف چلا جاؤں۔ آخر میں نے سر اٹھا کر
مجاور کو دیکھا، وہ ایک مقدس تختے پر روٹیاں اور انجیر لئے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کے بعد وہ
قربان گاہ پر آیا اور ان روٹیوں کو پاک کرکے تھیلے میں رکھ لیا۔ میں نے اس مقدس
مثال کی پیروی کی اور دلیے کی ہانڈی کی طرف چلا گیا۔"

بی بی۔ اور تو دیوتا کے آنے سے نہیں ڈرا؟

کاریون۔ ہاں میں ڈرا کہ دیوتا سر پر تاج لگائے ہوئے کہیں مجھ سے پہلے آکر ہنڈیا نہ لے جائے۔
میں خیال کرتا تھا کہ "جیسا مجاور ویسا ہی دیوتا" میں نے جو کھٹکا کیا تو بڑھیا نے اپنا ہاتھ بڑھایا
اس وقت میں نے سیٹی بجائی اور مقدس سانپ کی طرح کاٹ کھایا۔ اس نے فوراً اپنا ہاتھ
کھینچکر بستر میں چھپا لیا اور دم سادھ کر لیٹی رہی۔ میں نے پیٹ بھر کر دلیا کھا لیا اور اپنے بستر
پر آکر لیٹ گیا۔

بی بی۔ اور دیوتا نہیں آیا؟

کاریون۔ اس کے آنے میں دیر نہیں ہوئی، جب وہ میرے قریب آگیا تو ایک بڑی ہنسی کی
بات ہوئی، میرے پھولے ہوئے پیٹ نے بڑے زور سے ایک آواز خارج کی۔"

بی بی۔ غالباً دیوتا کو بہت غصہ آیا ہوگا؟

کاریون۔ نہیں۔ لیکن ایا اس کا چہرہ سرخ ہوگیا جو دیوتا کے ساتھ تھا اور پناشیا نے ناک بند کرکے

---

[1] آگ کا دیوتا

[2] نیوکلیڈ ایتھنس کا ایک مقرر تھا اس پر ارسطوفن نے چوری اور عہد شکنی کا الزام لگایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے
کہ ارسطوفن کی کامیڈی ایک سیاسی تصنیف ہے اسلئے اس نے اپنے سیاسی مخالفین پر حملہ کیا ہے۔

منہ پھیر لیا۔"

بی بی۔ "تو بڑا بے ادب گستاخ ہے"

کاریون۔ میں لرزتا ہوا بستر میں دبک گیا، اسقلی بیوس سب مریضوں کے پاس گیا اور انھیں نہایت توجہ سے دیکھا، اس کے بعد ایک غلام نے کھرل اور صندوقچہ اس کے پاس لاکر رکھدیا۔"

بی بی۔ پتھر کا؟

کاریون۔ نہیں پتھر کا نہیں،

بی بی۔ لیکن بدمعاش جب تو بستر میں چھپ گیا تھا تو تو نے یہ سب باتیں کیسے دیکھیں؟

کاریون۔ میری چادر میں سوراخوں کی کمی نہ تھی پہلے اس نے نیوکلیڈ کے واسطے ایک ضماد تیار کیا اس نے کھرل میں تین لسن کی گرہیں رکھیں اور ان کو انجیر اور پستے کا عرق ڈال کر پیسا اور سرکہ چھوڑا اس کے بعد اس نے مریض کی آنکھ کے پپوٹے الٹ کر وہ دوا آنکھ میں ڈالی۔ نیوکلیڈ چیخنے چلانے لگا۔" اور بستر سے اٹھکر بھاگنا چاہا لیکن دیوتا نے مسکرا کر اس سے کہا لیپ لگا کر اسی جگہ رہو ورنہ تم حکومت کی مجلس کے سامنے عہد شکنی کے جرم میں پیش کئے جاؤگے، اس کے بعد وہ پلوٹ کے پاس آیا، اس کا سر سہلایا اور ایک نہایت صاف کپڑے کا ٹکڑا لے کر اس کے پپوٹوں کو پونچھا پناشیا نے ایک ارغوانی رنگ کی نقاب سے اس کا سر اور پورا چہرہ چھپا دیا۔ اس کے بعد دیوتا نے سیٹی بجائی اور دو بڑے بڑے سانپ اس جگہ سے آئے جہاں دیوتا کا بت رکھا تھا۔"

بی بی۔ اے دیوتاؤ!

کاریون۔ وہ آہستہ سے نقاب کے اندر گھس گئے اور انھوں نے (میں یقین کرتا ہوں) پپوٹوں کو چاٹا اور تھوڑی دیر کے بعد جتنی دیر میں کہ آپ دس جام شراب کے پی لیتی ہیں پلوٹ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں میں روشنی آگئی۔ جب خوشی کے مارے میں نے تالیاں بجائیں تو دیوتا فوراً سانپوں کے ساتھ بت کی جگہ غائب ہوگیا۔"

بی بی۔ یہ اسقلی بیوس اعظم کی قوت کا ادنیٰ کرشمہ ہے!

اس دلچسپ سین سے جو ارسطوفن نے کھینچا ہے اُن واقعات کا بخوبی پتہ چلتا ہے جو وہاں ہوا کرتے تھے۔ درحقیقت شاعر نے انھیں واقعات کا نقشہ کھینچا ہے جو اتھینس کے اسکلیپیون میں لوگ روزانہ دیکھا کرتے تھے۔ چونکہ یہ نقشہ واقعہ کی تصویر ہے اس لئے ہمارے لئے ایک بیش بہا سند ہے۔

اپی ڈاؤرس کے مندر میں مریض فوراً نہیں داخل ہو سکتا تھا پہلے اسے اُن مکانوں میں رہنا پڑتا تھا

جو مندر سے باہر بنے ہوئے تھے کیونکہ مندر کے دروازے پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے "جو مندر میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ اپنی روح کو پاک کرے۔" اس کے واسطے مریض کو غسل دیا جاتا تھا، مالش کی جاتی تھی اور اس کے جسم پر کوئی چیز چھڑک دی جاتی تھی۔ اس کے بعد بیمار کو نذریں چڑھانا پڑتی تھیں تاکہ دیوتا خوش ہو کر اس کی درخواست قبول کر لیں۔ حال میں جو کتبات دستیاب ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ دولتمند ہوتے تھے کئی سیر جو، گیہوں، ایک گائے۔ ایک مرغ اور شراب نذر دیا کرتے تھے۔ نذر چڑھاتے وقت کچھ دعائیں بھی مانگی جاتی تھیں جو مجاور پڑھتا جاتا تھا، اور بیمار ان کو دُہراتا جاتا۔ اکثر یہ دعائیں آلات موسیقی کے ساتھ گائی جاتی تھیں جن کے لئے اپی ڈاؤر کے مندر میں گویے اجرت پر رکھے جاتے تھے۔

ان مرحلوں کے بعد علاج شروع ہوتا تھا، سب سے پہلے اس غرض سے کہ بیمار دیوتا سے قربت کے لائق ہو جائے اُسے فاقے کرنے پڑتے تھے اور بیماروں کو پندرہ پندرہ دن تک کھانا نہیں دیا جاتا تھا۔ پھر مریض اس امید میں خوابگاہ میں سو جاتا تھا کہ اسقلی بیوس کوئی خواب دکھلا کر تدبیر بتلا دیگا یا خود علاج کر دیگا جب وہ خوابگاہ میں چلا جاتا تھا تو اُس کو رات بھر وہیں رہنا پڑتا تھا۔ مجاور سوائے ایک چراغ کے جو دیوتا کے مجسمے کے سامنے جلا کرتا تھا، سب چراغ گل کر دیا تھا اور حکم دیتا تھا کہ سب سو جائیں۔ کچھ تاریکی اور کچھ عقیدتمندی کی وجہ سے بیمار بہت جلد محو خواب ہو جاتے تھے۔ اُس وقت یہ عقیدتمند بیمار جس کے دماغ پر صحت یابی کا خیال مستولی رہتا تھا کوئی نہ کوئی خواب دیکھتا تھا، زیادہ تر اس کا خیال تدابیر صحت کے متعلق ہوتا تھا اور اُس کی بڑی آرزو یہ ہوتی تھی کہ اسقلی بیوس دیوتا کی زیارت کروں، اس لئے اس کو یہ اعتقاد ہوتا تھا کہ اس نے خود دیوتا کو دیکھا۔ مریض کو اگر نیند نہ بھی آتی تھی تو بھی وہ دیوتا کا جلوہ دیکھ سکتا یا اُس کی آواز سُن سکتا تھا خوابگاہ میں کابوسوں کی کمی نہ تھی

اپی ڈاؤر کے مندر کے کتبے اپالو اور اسقلی بیوس کے علاج کے چند کتبے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے مثالاً لکھے جاتے ہیں :-

(۱) نکا نور لنگ، یہ شخص خوابگاہ میں لیٹا ہوا تھا لیکن ابھی اس کو نیند نہیں آئی تھی کہ اتنے میں ایک لڑکا آیا اور اُس کی لاٹھی چرا کر بھاگا۔ نکانور اُٹھ بیٹھا اور لڑکے کے پیچھے دوڑا اُسی وقت سے اچھا ہو گیا۔

(۲) ہرمیگین کے رہنے والے لڑکے کا کتے نے علاج کیا۔ اس لڑکے کے گلے میں رسولی نکل آئی تھی، وہ دیوتا کے حضور میں گیا اور سونے سے پہلے مندر کا ایک کتا آیا اُس نے اپنی زبان سے

اُس کا علاج کیا اور اُسے اچھا کر دیا۔
(۳) نقرس کا مریض۔ اس شخص کو خواب کی ضرورت نہیں ہوئی۔ جب وہ ٹہل رہا تھا تو ایک ہنس نے اُس کے پیر میں کاٹ کھایا، جس سے بہت خون نکلا اور وہ تندرست ہو گیا۔
(۴) ارسطیدیز تیرہ سال سے کسی عصبی مرض میں مبتلا تھا۔ وہ تمام مندروں میں گیا لیکن کہیں فائدہ نہ ہوا آخر اسقلی بیوس نے اس کے استقلال سے متاثر ہو کر اُسے تندرستی عطا کر دی۔ اس نے تفصیل سے اپنی زیارتوں اور مندروں کی خوابگاہوں میں سونے کے قصے بیان کئے ہیں منجملہ ان کے یہ قصہ بھی ہے کہ میں نے اکثر خواب و بیداری کے درمیان دیوتا کو دیکھا اس نے مجھے چھوا اور جو کچھ میں نے کہا اُسے سن لیا اور مندر سے میرے چلے جانے کی ہدایت کی۔
لیکن ہر مریض دیوتا کو نہیں دیکھا کرتا تھا۔ لاطینی شاعر پلاؤٹس نے ایک کامیڈی میں ایک شخص کی زبان سے یہ شکایت بیان کی ہے کہ "میں نے مندر کو چھوڑ دیا اس وجہ سے کہ دیوتا نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں کی اور علاج کرنے سے انکار کر دیا"۔
جن لوگوں کو دیوتا مہربان ہو کر نظر آتا اور مشورے دیتا تھا وہ صبح کو مندر کے متولیوں یا مجاوروں سے کل حال بیان کیا کرتے کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے اور علاج کے لئے یہ تدبیر معلوم ہوئی مجاور اس خواب کی تعبیر بتلاتے تھے اور اسقلی بیوس کے فرمان کی تعمیل کرتے تھے۔
دوا علاج عموماً بے خطر ہوا کرتا تھا لیکن بعض وقت مضر بھی ہو جاتا تھا، مثلاً کثرت سے خون خارج کر دینا، استفراغ کرانا، جلاب دینا اور زہریلی دوا کھلانا، لیکن اس قسم کے واقعات بہت کم ہوتے تھے، اور یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بنی اسقلی بیوس کی تدابیر علاج بیہودہ نہ تھیں کیونکہ کثرت سے مریضوں کی دیکھ بھال اور روزانہ ہر قسم کے مریضوں کے معائنے سے وہ بڑے ماہر فن ہو گئے تھے اور علاج میں بڑی دلچسپی لیتے تھے، نیز مریض کی صحت یابی کی بہت کوشش کرتے تھے۔ طب قدیم میں اکثر نسخے غالباً وہی ہیں جو ان مندروں کے دفتر سے حاصل کئے گئے ہیں۔
بنی اسقلی بیوس حفظانِ صحت کی دوسری تدابیر بھی عمل میں لاتے تھے۔
اسقلی بیوس اکثر جسمانی ورزشوں کا بھی مشورہ دیتے تھے مثلاً شکار، سواری، گتکا پھیری، اور ورزش جسمانی وغیرہ۔ روحانی مریضوں کو دلچسپ کھیل تماشوں اور گانا سننے کا حکم دیا جاتا تھا
ڈیمارک آوریلی کو جس کا خود اسقلی بیوس نے علاج کیا سواری کے علاوہ یہ بھی حکم دیا گیا تھا کہ وہ ننگے پاؤں ٹہلا کرے اور پانی کا علاج کرے۔ یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ مندر میں جمناسٹک گھر تھیٹر

اور غسل خانے بھی تھے جن کو صحت ہو جاتی تھی وہ سنگ مرمر کی تختیوں پر اپنی تکالیف کھدوا کر بطور یادگار چھوڑ جاتے تھے اور دیوتاؤں کو نذریں بھی چڑھایا کرتے تھے جن میں ان کی صنعت و دستکاری کے نمونے بھی ہوا کرتے تھے اور روپے اشرفیاں چشمے کے اندر پھینکا کرتے تھے جن کو غالباً مجاور پانی سے نکال لیا کرتے تھے۔

مجاوروں کی فریب کاریاں مجاوروں کے ان سنجیدہ اعمال میں فریب کی بھی آمیزش رہتی تھی مثلاً جب ان کو خواب دکھلانا ہوتا تھا تو وہ خود آخرات کو دیوتا کی پوشاک پہنکر خوابگاہ میں آتے تھے اور ان کے خاندان کے لوگ ان کے ساتھ ہوتے تھے جو اسقلی بیوس کے لڑکے اور لڑکیوں کے قائم مقام سمجھے جاتے تھے۔ اس کام کے لئے وہ اس وقت کا انتظار کرتے تھے جب مریض خواب و بیداری کی درمیانی حالت میں ہوتا تھا۔ پلوٹ کا سین جو اس سے پہلے نقل کیا گیا ہے اس کا ثبوت ہے کیونکہ کاریون غلام نے معالج دیوتا کو علاج کرتے ہوئے دیکھا جو کچھ اس نے دیکھا وہ خود مجاور اسقلی بیوس کے بھیس میں تھا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ سونے والے بیدار ہو گئے تو ہوشیاری سے بھاگ گیا۔

بات یہ ہے کہ اسکلیپیون اپنے آپ کو نہ صرف دیوتا کے جانشین اور نائبین خیال کرتے تھے بلکہ وہ اسی کی نسل سے تھے اور اپنے کو علوم وفنون کا محافظ سمجھتے تھے۔ درحقیقت وہ وہی نسخے استعمال کرتے تھے جو گزشتہ علاجوں میں کارآمد ثابت ہو چکے تھے اور سینہ بسینہ چلے آرہے تھے۔ لیکن وہ اس بات کے ضرور قصوروار تھے کہ اپنے علاج میں مریض کو دھوکہ دینے کے لئے بہت سے عجائبات شامل کر دیا کرتے تھے۔ اسی غرض سے انھوں نے مندر میں جنگلی سانپ، کتّے اور دوسرے جانوروں کو پال رکھا تھا اور ان سب کو اس طرح سدھا لیا تھا کہ ایک آواز پر وہ مریض کا زخم چاٹنے اور اس کے کسی حصۂ جسم کو مس کرنے کے لئے چلے آیا کرتے تھے۔ قدیم زمانہ کے لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ سانپ کی زبان میں کوئی اعجازی اثر ہے۔ چنانچہ یہ حکایت مشہور تھی کہ ایک کتّے نے اسقلی بیوس کے بچّے کی جان بچائی تھی اس لئے اسقلی بیوس نے کتوں کی نسل کو یہ انعام دیا کہ ان میں قوت معالجہ پیدا کر دی۔ بہرحال یہ مجاور اپنی تجارت کو فروغ دینے کے خیال سے ان عقائد کی تلقین کیا کرتے تھے۔ غالباً تجارتی شہرت کی ضرورت ان کو مجبور کرتی تھی کہ جن باتوں پر سادہ لوح اور بے علم لوگ عقیدہ رکھیں وہ بھی اپنے آپ کو ان کا معتقد ظاہر کریں۔ چنانچہ وہ ان کرامتوں کو بڑی بڑی تختیوں پر نقش کرا کر رکھتے تھے۔ ان میں سے چند تختیوں کا مضمون ذیل میں

نقل کیا جاتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ عیسوی سے چار صدی قبل یونانی کس قدر ضعیف الاعتقاد تھے۔

(۱) یک چشم۔ ایک آدمی کی آنکھ ایسی تھی کہ اس کے صرف پپوٹے تھے اور کچھ بھی نہ تھا، وہ بالکل خالی تھے، وہ دیوتا سے التجا کرنے آیا تو چند لوگوں نے مندر میں کہا "یہ بڑا سیدھا اور بھولا آدمی ہے، اسکو خیال ہے کہ بصارت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیگا لیکن اس کی آنکھ کا سرا بھی تو نہیں ہے لیکن جب وہ خوابگاہ میں سو گیا تو اس نے ایک جلوہ دیکھا، دیوتا نے کوئی دوا جوش دی اور پپوٹے اٹھا کر وہ دوا اندر ڈال دی۔ جب دن نکلا تو وہ آدمی دونوں آنکھوں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔

(۲) گورگیا۔ اس کے پھیپھڑے میں ایک لڑائی میں تیر سے زخم آگیا تھا، اس میں اس قدر پیپ پڑ گئی تھی کہ ڈیڑھ سال میں ۶۷ کونڈے بھر گئے۔ وہ خوابگاہ میں آکر سویا اور اس نے ایک خواب دیکھا۔ اُسے معلوم ہوا کہ دیوتا نے اُس کے پھیپھڑے سے تیر کی نوک نکال ڈالی۔ جب دن ہوا تو وہ نوک ہاتھ میں لئے ہوئے صحیح تندرست چلا گیا۔

(۳) گونگا لڑکا۔ ایک گونگا لڑکا مندر میں دعا کرتا ہوا آیا۔ پہلے نذریں چڑھائیں اور ابتدائی رسمیں ادا کیں اس کے بعد اس جوان نے جس کی خدمت دیوتا کے پاس آگ لانا تھی اس لڑکے کے باپ کو دیکھا اور کہا، اگر تم کو وہ چیز حاصل ہوجائے جس کی تم کو تمنا ہے تو کیا تم ایک سال میں شکر گذاری کے انعام دینے کا وعدہ کرتے ہو؟

لڑکا دفعتاً بولا کہ میں وعدہ کرتا ہوں جس پر اس کے باپ نے کہا "یہی الفاظ پھر دُہرا"

لڑکے نے پھر کہا "میں وعدہ کرتا ہوں" اور اس وقت سے وہ اچھا ہو گیا۔

(۴) میلی تین کا رہنے والا ہیراپے۔ اس کے سر پر ایک بال بھی نہ تھا اور ٹھوڑی پر بہت بال تھے۔ وہ اس شرم سے کہ لوگ اُسے چھیڑتے تھے خوابگاہ میں آکر سویا۔ دیوتا نے اُس کے سر پر کوئی دوا لگا دی اور بال نکل آئے۔

(۵) کیرین کا رہنے والا دیائت۔ اس کے گھٹنے بیکار تھے۔ وہ خوابگاہ میں سویا اور ایک خواب دیکھا اس کو معلوم ہوا کہ دیوتا نے خدمت گاروں کو اس کے اٹھانے کا حکم دیا کہ خوابگاہ سے لے جائیں اور مندر کے سامنے لٹا دیں، اس کے بعد دیوتا نے اپنے گھوڑے گاڑی میں جوتے اور مندر کے گرد ایک چکر لگایا اور گھوڑے اس کے اوپر سے لے گیا۔ اس کے بعد وہ شخص سیدھا کھڑا ہو گیا اور تندرست ہو کر چلا گیا۔

(۶) تین سال کے بعد ولادت۔ پیلین کی رہنے والی انتھونیکا مندر میں بچے کے واسطے آئی وہ خوابگاہ

میں سوئی اور ایک خواب دیکھا۔ اس کو معلوم ہوا کہ وہ دیوتا سے ایک بچی کے حمل کی درخواست کرتی ہے۔
اسقلی پیوس نے جواب دیا کہ تم حاملہ ہو جاؤ گی اور اگر تم اور کچھ درخواست کرو گی تو میں اُسے بھی پورا کروں گا۔ اس
نے کہا میں اور کچھ نہیں چاہتی۔

وہ حاملہ ہو گئی اور تین سال تک بچی کو پیٹ میں لئے رہی، آخر وہ دیوتا سے وضع حمل کی درخواست کرنے
آئی۔ وہ خوابگاہ میں سوئی اور ایک خواب دیکھا اُس کو معلوم ہوا کہ دیوتا اُس سے سوال کرتا ہے:-

"کیا جو کچھ تم چاہتی تھیں وہ نہیں ہوا؟ کیا تم حاملہ نہیں ہو؟"
اس حالت پر اتو نیکا وضع حمل کے متعلق کچھ نہ کہہ سکی
اسقلی پیوس نے پوچھا کہ تم اور کچھ چاہتی ہو؟"
اُس نے کہا "چونکہ آپ میری تسکین خاطر کے درپے ہیں اس لئے آپ میرے دل کی خواہش معلوم
کر لیجئے وضع حمل کے سوائے اور میری کیا درخواست ہو سکتی ہے"
دیوتا نے جواب دیا "میں تمہاری درخواست پوری کروں گا"
اس خواب کے بعد وہ خوابگاہ سے بھاگی اور جب وہ مندر سے باہر آ گئی تو اس کے لڑکی پیدا ہوئی۔

(۲) پانچ سال کی حاملہ کلیے۔ یہ پانچ سال سے حاملہ تھی، اس نے دیوتا سے درخواست کی اور خوابگاہ
میں سوئی، پھر وہ بشکل مندر سے باہر جا سکی اور بلا تاخیر اس کے بچہ پیدا ہوا۔ یہ بچہ ہوتے ہی چشمہ کے اندر
نہایا اور اپنی ماں کے پاس چلا آیا۔ یہ معجزہ دیکھ کر کلیے نے ایک تختی پر یہ الفاظ نقش کرائے "یہ معجزہ حیرت انگیز
ہے، پانچ سال تک کلیے پیٹ میں بچہ لئے رہی، آخر جب خوابگاہ میں سوئی تو دیوتا نے اُسے تندرست کر دیا"
اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ مجاور عمل جراحی بھی کرتے تھے لیکن اس کے متعلق بھی چند
موجود ہیں، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:-

(۱) تورون کا ایک شخص۔ اس کے بدن میں جونکیں تھیں، وہ خوابگاہ میں سویا اور ایک خواب دیکھا اُسے
معلوم ہوا کہ دیوتا نے ایک چھرے سے اُس کا سینہ چاک کر دیا اور جونکیں نکالکر اُس کے ہاتھ پر رکھدیں
اور سینے میں ٹانکے لگا دیے جب دن ہوا تو وہ ان کیڑوں کو ہاتھ میں لئے ہوئے نکلا اور صحیح و تندرست
تھا۔ اُس کی سوتیلی ماں نے انھیں کسی پینے کی چیز میں ڈالکر اُسے دھوکے سے پلا دیا تھا۔

(۲) لاسے دائمون والی جلندر کی مریض۔ اس بیمار عورت کی ماں خوابگاہ میں سونے آئی اور بیمار لا سے
دائمون میں رہی۔ اس نے ایک خواب دیکھا جس میں اس کو معلوم ہوا کہ دیوتا نے اس کی بیٹی کا سر
کاٹ ڈالا اور اُس کا دھڑ نیچے لٹکا دیا یہاں تک کہ سب خون بہہ گیا، پھر دیوتا نے دھڑ کھول کر اسے

گردن پر سر رکھ دیا۔ یہ خواب دیکھکر وہ لاسے دامُون واپس آئی۔ یہاں آکر دیکھا کہ اس کی بیٹی تندرست ہے اور معلوم ہوا کہ اس نے بھی یہی خواب دیکھا تھا۔

(۳) ایک شخص جس کے پیٹ میں زخم تھا، خوابگاہ میں سویا اور ایک خواب دیکھا۔ اس کو معلوم ہوا کہ دیوتا نے خادموں کو حکم دیا کہ اس آدمی کو پکڑ لیں تاکہ اس کا پیٹ پھاڑا جائے۔ وہ شخص بھاگا لیکن خادموں نے اسے پکڑ لیا اور دروازے کے پاس ٹٹی سے باندھ دیا۔ اس کے بعد اسقلی بیوس نے اس کا پیٹ چیرا اور زخم میں شگاف لگایا۔ پھر شگاف کو سی کر اُس کی رسیاں کھول دیں۔ وہ شخص تندرست ہو گیا۔ خوابگاہ کا راستہ خون سے بھرا ہوا تھا۔

یہ اعجازی صحتیابیاں پڑھکر اسکلیپیوں کے زائر دیوتا کی قوت اور مہربانی پر حیرت کرتے تھے اور ساتھ ہی اس کے مندر میں بہت فیاضیاں کیا کرتے تھے، مجاور بھی ان کی تھیلیوں کا منہ کھولنے کی جرأت کرنے میں تذبذب نہیں کرتے تھے۔ ان کا عذر تھا کہ اسقلی بیوس اپنی امداد کے واسطے تنخواہ اور وظائف کا حکم دیتا ہے۔ اور اگر رقم ادا نہ کی جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے اور اُس کی مرضی ہے کہ سوائے اپی ڈاؤر کے متولیوں کے اور کسی کو روپیہ نہ دیا جائے۔ اس کے ثبوت میں ذیل کے واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں جو تختیوں پر نقش تھے۔

(۱) تاس والا ہیرمون۔ ہیرمون نابینا کو اسقلی بیوس نے تندرست کر دیا لیکن وہ مندر میں شکر گزاری کی نذریں لے کر نہیں آیا، اس لئے دیوتا نے اُسے پھر اندھا کر دیا۔ لیکن جب وہ پھر مندر میں آیا اور خوابگاہ میں سویا تو اچھا ہو گیا۔

(۲) تھسلی والا پنڈار بھی جس کی پیشانی پر زخم کے نشان تھے خوابگاہ میں سویا اور اس نے بھی خواب دیکھا جس میں اس کو معلوم ہوا کہ دیوتا نے اس کے نشانوں پر ایک پٹی باندھ دی اور حکم دیا کہ خوابگاہ سے نکلکر پٹی اُتار ڈالے اور مندر میں لٹکا دے۔ جب دن نکل آیا تو وہ اُٹھا اور پٹی اتار ڈالی۔ اُس کی پیشانی تو نشانوں سے پاک تھی لیکن وہی نشان پٹی پر اُتر آئے تھے۔ اس نے وہ پٹی مندر میں لٹکا دی۔ اس کے بعد ایخیدور کو جس کے سر پر بھی نشان تھے پنڈار نے روپے دیئے کہ اپی ڈاؤر میں دیوتا کے نذر کر دے لیکن اُس نے روپے نہیں دیے۔ پھر وہ خوابگاہ میں سویا تو اُس نے خواب دیکھا جس میں دیوتا نے اس کے پاس کھڑے ہو کر پوچھا کہ کیا تیرے پاس پنڈار کے روپے نہیں ہیں جو اس نے مندر کے واسطے دیئے تھے؟

ایخیدور نے جواب دیا "نہیں" لیکن اگر آپ مجھے تندرست کر دیں گے تو میں مندر میں ایک مجسمہ رکھو

اسقلی بیوس نے پنڈار کی پٹی اس کے نشانوں پر باندھ دی اور حکم دیا کہ جب خوابگاہ سے جائے تو پٹی کھول ڈالے اور چشمے پر اپنی پیشانی دھوکر پانی میں اپنا چہرہ دیکھے۔ جب دن ہوگیا تو آئیندور خوابگاہ سے باہر آیا اور پٹی اتار ڈالی لیکن دیکھا تو وہ نشان اس پر موجود نہ تھے۔ جب اس نے پانی میں اپنا چہرہ دیکھا تو نشان بدستور موجود تھے اور اپنے نشانوں کے ساتھ پنڈار کی پیشانی کے نشان بھی پیدا ہو گئے تھے۔

(۳) تیر کی رہنے والی سوس ترانا کا پیٹ اس قدر پھول گیا تھا کہ چل پھر نہیں سکتی تھی۔ لوگ اُسے اٹھا کر لے جاتے تھے۔ وہ خوابگاہ میں آکر سوئی لیکن اس نے کوئی صاف خواب نہیں دیکھا اس لئے گھر واپس آگئی۔ راستے میں کورابی گاؤں کے قریب کوئی خوبصورت آدمی اس کے نزدیک آتا ہوا معلوم ہوا۔ اُس نے خدمت گاروں سے دریافت کیا کہ اس کو کیا تکلیف ہے، اور حکم دیا کہ اس کا پلنگ زمین پر رکھ دیں۔ اس کے بعد اس نے اس کا پیٹ چاک کیا اور آنتوں سے بہت سے کیڑے نکالے، یہاں تک کہ دو چھوٹے کونڈے بھر گئے۔ پھر پیٹ میں ٹانکے لگادیے اور سوس ترانا کو تندرست کردیا اس کے بعد اسقلی بیوس نے اپنے آپ کو ظاہر کر کے فرمائش کی کہ ایپی ڈاور میں اس کی شکرگزاری کی نذریں بھیج دی جائیں۔

یہ چالیں چاہے ہمکو تجارتی اور ذلیل معلوم ہوں لیکن وہ اس تحصیل زر کو اس لئے بھی پسند کرتے تھے کہ ایک موقعہ پر وہ اپنے ہمسایہ مندروں کی طرف سے لوگوں کو بددل نہ کرسکے جن کے مقابلے سے وہ ڈرتے تھے، چنانچہ ایک تختی یہاں نقل کی جاتی ہے:-

تریزین والی ارسطوغورا کے پیٹ میں کینچوے تھے۔ وہ تریزین میں اسقلی بیوس کے مندر میں آئی، اور اس نے خواب دیکھا کہ دیوتا کے بیٹے آئے (کیونکہ دیوتا ایپی ڈاور میں تھا) اور انھوں نے اس کا سر کاٹ ڈالا لیکن وہ جوڑ نہیں سکتے تھے۔ اس لئے انھوں نے کسی کو اسقلی بیوس کے بلانے کو بھیجا۔ جب صبح ہوئی تو مجاوروں نے دیکھا کہ ارسطوغورا کا سر کٹا ہوا پڑا ہے آئندہ شب کو اس نے پھر خواب دیکھا اس کو معلوم ہوا کہ دیوتا نے ایپی ڈاور سے آکر پھر گردن سے جوڑ دیا اور پیٹ سے کیڑے نکالکر سی دیا۔ اس کے بعد وہ اچھی ہوگئی۔

اسقلیپیون کی بقیہ یادگاریں باوجود اس ٹھگ بدیا کے اسقلی بیوس کے مندروں میں فن طب کی معقولیت سے انکار نہیں ہوسکتا۔ مریضوں کی صحتیابی نے یونانیوں کو اسقلی بیوس کا پورا معتقد بنادیا تھا جب بت پرستی کا زوال ہوا تب بھی اس دیوتا کا شرب مسیحیت کی اشاعت کے سامنے قائم رہا اور جب اس نئے مذہب

نے فتح پائی تو اس وقت بھی اس معالج دیوتا کی چند یادگاریں باقی رہ گئیں۔ مقدس شفا بخشنے والوں سے قطع نظر جو عوام کی نگاہوں میں اس دیوتا کے قائم مقام ہو گئے تھے۔ اسی قدیم طریقے کی مثالیں موجود ہیں مثلاً سولھویں صدی عیسوی کا ایک مصنف لکھتا ہے کہ میں نے پاڈوا میں دیہاتی لڑکوں کو سینٹ انطونی کے گرجا میں سونے کے واسطے آتے دیکھا۔ اور اسی زمانے میں جی ہیرو نے مجرا رخبیل کے ایک جزیرے بسبا میں اس قدیم رسم کو دیکھا کہ گرجا میں بیمار اس غرض سے آکر سوتے ہیں کہ خواب میں دفع مرض کی کوئی تدبیر یا علاج معلوم ہو جائے۔

ہم اور ہماری ہستی

ہماری ہستی کیسی ہی بے ثبات کیوں نہ ہو اسکی بیقدری اچھی نہیں، ہم اپنی زندگی خوردبین سے نہ دیکھیں، نگاہ شوق سے دیکھیں۔ گلاب کے پھول کو آپ خوردبین سے دیکھنے بیٹھئے تو جو پتی حسن و خوبی میں لب یار سے زیادہ نازک نظر آتی تھی خوردبین سے ہاتھی کے کان اور ٹوٹے چھاج کے برابر دکھائی دیگی۔ وہ لکی سُرخی گندے پانی سے زیادہ کریہہ معلوم ہوگی۔ پتیوں کی نرمی پرانے کمبخت کے چمڑے سے بدتر نظر آئیگی کسی پریوش کے خط و خال آپ آتشی شیشے سے دیکھئے تو ساری خوبی کا خون ہو جائیگا اسی طرح زندگی کو بھی آپ ذلت کی نگاہ سے دیکھئے تو بُری معلوم ہوگی۔

اگر در اصل ہماری ہستی اچھی نہیں تو کوئی چیز بُرا سمجھنے سے اچھی نہیں ہو جائیگی، آپ نے دیکھا کہ بیوقوف کو بیوقوف کہنے سے عقل نہیں آجاتی۔ بلکہ کسی بیوقوف کو سمجھانا ہو تو میں نے دیکھا ہے کہ پہلے اسکی عقل کی تعریف کرتے ہیں کہ آپ خود سمجھدار ہیں، آپکو سمجھانا لقمان کو حکمت سکھانی ہے۔ دستور ہے کہ جس چیز کو آپ جیسا سمجھیں گے ویسی ہی امید آپ اس سے رکھ سکتے ہیں۔

اپنی ہستی کے فنا ہونے کا خیال انسان کو کتنا ہی سمجھائیے ناگوار معلوم ہوتا ہے اور گو عقل لاکھ دلیلیں پیش کرے سب بیکار جاتی ہیں۔ سبب یہ ہے کہ عقل کو خواہش سے ضد ہے۔ خواہش کا گھر دل میں ہے جہاں عقل کو دخل نہیں۔ انسان جب اپنے دل کے کہنے پر چلتا ہے تو قدم جلدی اُٹھتے ہیں۔ عقل کے سہارے سے قدم اُٹھانے میں پاؤں لڑکھڑاتے ہیں۔ انسان عقل سے اسی بات میں خوش ہوتا ہے جب کہ عقل ہمارے مطلب کی سمجھائے ورنہ عقل کی بہت نہیں چلنے پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے مفید مطلب مہمل بات بھی ہم جلدی مان لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ عقائد میں بعید از قیاس باتیں ماننے کے لئے صرف ارادہ چاہیئے عقل کی ضرورت نہیں۔ کسی عقیدہ کے ماننے والے اُس عقیدے سے انکار کرنیوالوں سے عقل میں کم نہیں ہوتے۔ ہماری آرزوئیں کے پورے کرتیں اگر عقل کام آئے تو عقل کا لطف ہے ورنہ بیکار ہے۔

(ساقی دہلی)

خان بہادر ناظر علی صاحب

صدر لکھنوی

(از منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی)

جناب منشی لچھمن پرشاد صاحب صدر لکھنوی دورِ حاضرہ کے اُن باکمال سخندانوں میں ہیں جنھوں نے شاعری کو ایک فن کی حیثیت سے حاصل کیا ہے۔ مگر ایسے مستغنی الطبع واقع ہوئے ہیں کہ کبھی نام و نمود کی خواہش نہیں کی۔ آپ کی عمر اس وقت قریب ۶۴ سال کے ہے آپ کا تعلق فرقہ کایستھ سکسینہ سے ہے اور وطن خاص شہر لکھنؤ ہے۔ مضافات قنوج میں ایک مشہور مقام سورکھ ہے۔ عہد شاہی میں یہاں ایک ریاست قائم تھی جس کے والی اور رئیس اعظم جناب صدر کے مورث اعلیٰ راجہ مہانند تھے۔ اسی سلسلہ میں آپ کا خاندانی لقب سورکھوال مشہور ہے۔ یہ پتہ نہیں چلا کہ جناب صدر کے بزرگ کس زمانے میں فرخ آباد سے لکھنؤ تشریف لائے۔ البتہ اس قدر معلوم ہوا ہے کہ آپ کے جد امجد منشی شیو پرشاد صاحب خلف منشی موہن لال صاحب ایک نہایت متمول اور صاحب جاہ و ثروت بزرگ تھے جن کی سکونت محلہ پور نٹولہ متصل محلہ چاہ چھاچھو شہر لکھنؤ میں تھی۔ آپ کے دادا منشی کالکا پرشاد صاحب عہد شاہی میں بخشی کے لقب سے مشہور تھے کیونکہ وہ کسی محکمہ شاہی کے اہلکاروں کی تنخواہ تقسیم کرنے پر مامور تھے۔ صدر صاحب کے والد منشی نوبت رائے صاحب مرحوم جو مناسب تخلص فرماتے تھے ہمیشہ محکمہ بندوبست میں اچھے اچھے عہدوں پر ملازم رہے اور سنہ ۱۸۷۹ء سے سنہ ۱۸۹۱ء تک انھوں نے ریاست اودے پور (راجپوتانہ) میں مفرم بندوبست کے فرائض انجام دیے۔ جناب مناسب نے ۸۲ سال کی عمر میں سنہ ۱۹۲۳ء میں بمقام لکھنؤ انتقال فرمایا۔

جناب صدر کا فن شعر و سخن میں صاحب کمال ہونا تعجبات سے نہیں، کیونکہ دادا اور نانا دونوں کی طرف سے شاعری آپ کو ورثے میں ملی ہے۔ آپ کے بزرگوں کو اپنے زمانہ کے کاملانِ فن سے استفادہ حاصل ہوا تھا۔ آپ کے والد کو ابتدائے عمر میں منشی دینا ناتھ صاحب واجب (قوم کایستھ سکسینہ) سے تلمذ حاصل تھا۔ جو اپنے زمانہ کے ایک مسلم الثبوت استاد گذرے ہیں۔ جناب واجب اردو و فارسی کے علاوہ علوم عربی میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے اور اردو و فارسی دونوں زبانوں

میں داد حق بھی دیتے تھے۔

جناب صدر کے نانا منشی گنگا پرشاد صاحب مرحوم خود ایک نامی گرامی نثار تھے! اور ان کے والد منشی لالچند صاحب اُنس لکھنوی فارسی کے ایک باکمال شاعر گذرے ہیں جو مرزا قتیل کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ حضرت اُنس مغفور کا ایک دیوان بزبان فارسی جو تمام اصناف سخن پر مشتمل ہے مطبوعہ موجود ہے۔ اور جناب مرحوم کی تصنیفات سے انشائے منشی لالچند بھی ایک قابل یادگار چیز ہے جو نہایت پاکیزہ خط میں لکھی ہوئی جناب صدر کے قبضہ میں ہے۔ انشار مذکور کا دیباچہ منشی گنگا پرشاد صاحب نے تحریر فرمایا تھا جس سے فن نثاری میں ان کے باکمال ہونیکا پتہ چلتا ہے۔

جناب صدر اردو و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ آپ کو فن تاریخگوئی میں خاص کمال حاصل ہے اور ہندوؤں میں شاید صاحب رائے صاحب آنجہانی کے بعد آپ ہی کو اس فن میں کامل دستگاہ ہونیکا فخر حاصل ہوا ہے۔ اردو میں آپ کو رائے خیراتی لال صاحب شگفتہ لکھنوی سے استفادہ حاصل ہوا تھا جو مرزا نسیم دہلوی کے تلمیذ رشید تھے۔ جناب موصوف نے فارسی میں پہلے کچھ دنوں جناب آغا کمال الدین صاحب سنجر طہرانی سے مشورہ لیا جس کا ذکر آپنے اپنی ایک فارسی غزل کے مقطع میں اس طرح سے کیا ہے۔

کوس شاگردی سنجر می زنم صدر البفرس دانداستعداد من آنکس کہ استاد من است

حضرت سنجر کے لکھنؤ سے ریاست رامپور چلے جانیکے بعد آپ اپنا کلام فارسی خواجہ عزیز الدین صاحب مرحوم عزیز کشمیری لکھنوی کو دکھلاتے رہے۔ خواجہ صاحب ممدوح کے انتقال کے بعد آپ نے اپنی ہی طبیعت پر بھروسا کیا، آپ کو اردو کے مقابلہ میں فارسی سے زیادہ اُنس ہے۔ اردو فارسی میں آپکی معلومات نہایت وسیع اور جامع ہیں۔ فن شاعری کی باریکیوں سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ آپ نے عربی میں بھی کچھ استعداد حاصل کی ہے اور فارسی میں قلم برداشتہ نثر لکھتے ہیں۔

جناب صدر صاحب دیوان ہیں لیکن افسوس کہ ابتک اسے زیور طبع سے آراستہ ہونیکا شرف حاصل نہیں ہوا۔ آپ کی دو مختصر مثنویاں بزبان اردو جو سرتاپا صنعت غیر منقوط میں ہیں شائع ہو چکی ہیں، ان میں سے ایک میں جو سلک گہر موسوم بہ سرو صدر ہے ایک مشہور عاشقانہ قصہ نظم کیا گیا ہے اور دوسری (سداما) جس میں سری کرشن جی اور سداما برہمن کے حالات ہیں۔ اور دونوں میں اسی صنعت سے متعلق کچھ غزلیں بھی ہیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ صنعت آفرینی پر زیادہ توجہ دینے کے باعث شاعر تاثیر آفرینی سے اکثر قاصر رہتا ہے، اور صنعت کو اس زمانے کے لوگ ایک بیکاروں کا شغل

سمجھتے ہیں لیکن ہمیں تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھنا چاہیئے۔ جب ہم دیگر فنون میں اہل کمال کی موز
کی داد دیتے ہیں تو شاعر کے ساتھ بھی انصاف ہونا چاہیئے جو ایک خاص راستہ اظہار کمال
اختیار کرتا ہے۔ جناب صدر کے حضرت فیضی کی منظوم گیتا کا بھی اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے جو
شائع ہو چکا ہے۔ صدر صاحب کا کلام بیشتر اصناف سخن میں موجود ہے اور اکثر اساتذہ کے کلا
تخمیس بھی کی ہے۔ مذاق سخن بدل جانیکی وجہ سے آپ نے اپنی غزلوں کا بہت بڑا حصہ تلف
تاہم جو کچھ کلام باقی ہے وہ اس قابل ہے کہ ہم اس کو تبرک سمجھکر سر آنکھوں سے لگائیں اور ا
زندہ رکھنے کی کوشش کریں۔

۱۹۱۱ء میں آپ نے ملک معظم جارج پنجم کے دربار تاجپوشی کے موقع پر ایک قصیدہ اُرد
ایک فارسی تصنیف کرکے دہلی بھیجا تھا، یہ دونوں قصیدے پسند فرمائے گئے اور آپ دربار دہ
طلب ہوئے تھے۔ وہاں سے ایک تمغہ اور ایک سرٹیفکیٹ انگریزی درباروں کے قاعدہ کے
مرحمت ہوا تھا لیکن آپ نے کبھی اس کو اپنی قدردانی کا کافی صلہ نہ سمجھا۔ اس موقع پر میرے
حضرت آفق مرحوم کی بھی اسی طرح عزت افزائی ہوئی تھی

جناب صدر میرے عزیز ہیں اسلئے ممکن ہے کہ اُن کے متعلق اظہار رائے کرنے میں میر
کسی قدر عقیدت مندی سے کام لیا ہو۔ ایک نقاد کی ان کے کلام کے بارے میں کیا رائے
کے متعلق میں کچھ عرض نہیں کرسکتا۔ جناب صدر سے میں اکثر استفادہ کرتا ہوں اور سچ تو یہ
جناب والد کے بعد جس طرح جناب نظر کی رہنمائی نے مجھے فن شعر کے نکات سے آگاہ کیا اسی طر
فی الحال جناب صدر کے مفید مشورے اکثر میری کامیابی کے باعث ہوئے ہیں۔ جناب صد
کلام کا کچھ نمونہ درج ذیل کرتا ہوں، امید ہے کہ ناظرین و قارئین کرام بھی ان کے اوصاف
داد دینے میں میرے ہم نوا ہونگے۔

جہاں گردش میں جامِ بادۂ گلفام آتا ہے — ہمیں جمشید کا عبرت سے یاد انجام آتا ہے
وحوش و طیر مشتاقِ اجل ہیں دشت میں شاید — وہ صید افگن سوارِ توسنِ خوشگام آتا ہے
جوانی کے مجھے پیری میں آتے ہیں وہ ملنے کو — گلہ کیا صبح کا بھولا جو وقتِ شام آتا ہے
کروں کیا خاک فکر اے صدر میں تازہ مضامیں کی — فنِ شعر و سخن مجھکو برائے نام آتا ہے

ثباتِ دہر ہماری نظر میں خاک نہیں — کہ اس مکان کے دیوار و در میں خاک نہ

اردو زبان کے محسن

سر سید احمد خاں

ڈاکٹر سر محمد اقبال

ازل سے حصہ میں ہیں خاک و باد و آتش و آب / کچھ اور ان کے سوا میرے گھر میں خاک نہیں
سوائے حسرتِ دیدار دیکھتے کیا ہو / تمہارے کشتۂ تیغِ نظر میں خاک نہیں
شباب ہی میں ہوئے صدر اپنے بال سفید / اوڑی تھی ایسی کبھی دوپہر میں خاک نہیں

دنیا مقام لذتِ اہلِ ہوس نہیں / طشتِ عسل یہ طعمۂ مور و مگس نہیں
مٹی نہ اس گلی سے اڑا میری اے صبا / میں خاکپائے یار ہوں کچھ خار و خس نہیں
باغِ جہاں میں ظاہرا بے بال و پر ہوں میں / صیدِ زبونِ کشمکشِ دام و قفس نہیں
اے صدر ان کو تازہ مضامیں کی قدر کیا / جو لوگ نکتہ فہم نہیں نکتہ رس نہیں

مٹا کر بے گناہوں کو ہوئے اندوگیں وہ بھی / کہ جانبازوں کا مجمع تھا جو ہر دم اب نہیں وہ بھی
سکھائے رمزِ حکمت کون جز بنت العنب مجھکو / فلاطوں کی طرح برسوں رہی ہے خم نشیں وہ بھی
مقدر نے جو کچھ ہمکو دکھایا آج تک دیکھا / دکھائیگا جو کچھ دیکھیں گے اے صدرِ حزیں وہ بھی

اگر دور اختلافِ کعبہ و بتخانہ ہو جاتا / تو شیخ و برہمن میں کیا عجب یارانہ ہو جاتا
دلِ منصور کو حاصل ہوئی تھی بیخودی جس سے / عطا مجھکو بھی اے ساقی وہی پیمانہ ہو جاتا

الٰہی امتحانِ عاشقی کس درجہ مشکل تھا / وہی ناقص رہا سبکی نگاہوں میں جو کامل تھا
یہاں تک عشق میں حاصل فروغِ دیدۂ دل تھا / نگاہِ قیس میں آنکھوں پھر بے پردہ محمل تھا
نہ رحم آیا تجھے سنگِ جفا سے چور کرنے میں / ارے ظالم بہت نازک ہمارا شیشۂ دل تھا
سرِ محفل نہ کیونکر پھینک دیتا خاک پر ظالم / دلِ صدرِ حزیں ٹوٹا ہوا سا ساغرِ گل تھا

جب کبھی تجھکو بتِ سیم بدن دیکھ لیا / جلوۂ قدرتِ خلاقِ زمن دیکھ لیا
شرم سے کیوں نہ ہو شرمندہ چمن میں ہر گل / مسکرانا ترا اے غنچہ دہن دیکھ لیا
روز مرہ ستمِ نو سے ترے او ظالم / جو نہ دیکھا تھا تہِ چرخِ کہن دیکھ لیا
کیا قصور آپ کا اس میں ہے مقدر نے مرے / جو دکھایا مجھے اے مشفقِ من دیکھ لیا

پوچھتے رہتے ہیں بیگانہ سمجھکر مجھے لوگ — میں نے غربت میں بھی اک لطفِ وطن دیکھ لیا
نخلِ پامالِ خزاں غنچہ و گل پژمردہ — بے ترے حسنِ عروسانِ چمن دیکھ لیا
قدرداں اس کا بھی کوئی نہ رہا عالم میں — صدر انجامِ فنِ شعر و سخن دیکھ لیا

اپنی خوشی اسی میں ہے تم جس میں خوش رہو — دشمن کو دیکھتے ہیں تمہاری نظر سے ہم
چاہا نہ کچھ ہوا جو نہ چاہا وہ ہوگیا — بے پال و پر رہے ہوسِ بال و پر سے ہم

زباں پہ آتا ہے بے اختیار ہائے وطن — جو یاد آتے ہیں غربت میں آشنائے وطن
نہ جان و دل سے ہو کس طرح اسکا عشق مجھے — فضائے خلد سے بھی ہے فزوں فضائے وطن
میں جاکے وادیِ غربت میں کیا کروں ہمدم — مجھے قبول ہے مٹنا اگر مٹائے وطن
وطن کے مل گئے یار آشنا تو ہم سمجھے — سفر میں ہم کو میسر ہوئی ہوائے وطن
وطن کو چھوڑ کے جائیں کہاں بھلا اے صدر — کوئی مقام نہیں دل کشا سوائے وطن

طوالت کے خوف سے صرف مندرجہ بالا نمونۂ کلام ہی پر اکتفا کی جاتی ہے ورنہ صدر صاحب نے غزل کے علاوہ دوسرے اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ آپکا فارسی کلام بھی کافی ہے۔
افسوس ہے کہ اس عالمِ ضعیفی میں صدر صاحب کو اپنے فرزند دلبند کی دائمی مفارقت کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ اس سانحہ کے متعلق آپ کی صرف ایک رباعی پیش کی جاتی ہے جس سے آپ کے دلی جذبات کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔

ہر چند رہا تمہارا جویا افسوس — پایا نہ کہیں کچھ ایسا کھویا افسوس
یوں میری نظر سے ہو گئے تم پنہاں — پیدا ہی نہیں ہوئے تھے گویا افسوس

سارناتھ میں بودھی دھارا کا افتتاح

(از رائے بہادر پنڈت شیونراین شمیم ایڈوکیٹ، لاہور)

لوگ کہا کرتے تھے کہ بدھ مت اپنی زاد بوم سے نکالا گیا۔ مگر بعض اوقات ایسی باتیں جن کی امید نہیں ہوتی ظہور میں آجاتی ہیں۔ اور لوگ متعجب وحیران رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ عملی حیثیت سے فلسطین پھر عیسائیوں اور یہودیوں کے پاس واپس آگیا، اور حضرت مسیح کا مقبرہ عرصہ دراز تک غیر مسیحیوں کے قبضہ میں رہنے کے بعد اب پھر عیسائیوں کے پاس آگیا ہے، اور یہودی پھر اپنے آبائی ملک میں کثرت سے آباد ہو رہے ہیں اور بیت المقدس ویروشلم (Jerusalum) پر لاکھوں روپے صرف کر رہے ہیں۔ اسی طرح سارناتھ کی سرزمین جو آٹھ سو سال سے ویران پڑی تھی اب گلزار ارم بن گئی ہے وہاں نہ صرف ایک مدفون مندر نکل آیا ہے بلکہ بودھ دھارا (Vihara) کی نہایت عالی شان عمارت بودھ طرز پر تعمیر ہوگئی ہے۔ ۱۱۔ نومبر ۱۹۳۱ء کو اس کی افتتاحی رسم بھی نہایت شان وشوکت سے ادا ہوئی۔ یہ وہ تاریخ ہے جس دن یورپ کی جنگ عظیم کی عارضی صلح ہوئی تھی، یعنی جب دنیا جنگ سے تنگ آگئی تھی تو اسی دن اسے پیام امن ملا تھا "زمانہ" کے کسی پچھلے نمبر میں ہم سارناتھ کے تاریخی حالات ہدیۂ ناظرین کر چکے ہیں۔ اس لئے یہاں پر ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

منتظمان سارناتھ نے ۱۱۔ نومبر کے واقعہ عظیم کے انتظار میں سب سامان مہیا کر رکھا تھا، جاتریوں کے لئے نئی نئی عمارتیں بن گئی تھیں۔ تار اور ڈاک خانہ جاری ہوگئے تھے، دھارا کے ارد گرد گھاس کے مرغزار بن گئے تھے، بودھی پیپل کی شاخیں لگانے کے لئے ایک پختہ احاطہ بنا دیا گیا تھا، معزز مہمانوں کے قیام کے لئے جا بجا خیمے نصب کئے گئے تھے، روشنی کا بھی وسیع پیمانہ پر انتظام کیا گیا تھا۔ ایک وشنو ہوٹل بھی کھل گیا تھا اور موٹر لاریوں کے آمد ورفت کا بندوبست بھی کر دیا گیا تھا، عجائب خانہ سے سرکار نے پختہ سڑک بنوا دی تھی۔ راقم الحروف کا خیمہ بھی آم کے باغ میں نصب تھا۔ اور یہاں وہ اس تقریب سعید سے چند روز پہلے پہونچ گیا تھا۔ اور ۵ نومبر سے لوگ آنا شروع ہوگئے تھے، چینی، جاپانی، اچیاگانگ، برما، سیلون، تبت، وغیرہ وغیرہ دور دور مقامات سے آکر اس جشن میں شریک ہوئے، غرض چاروں طرف رونق ہی رونق نظر آتی تھی۔ جہاں ویرانہ میں کھنک سور پالتے تھے وہاں آنے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ

نظر آنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پاک روح کام کر رہی ہے اور عام نظروں سے پوشیدہ طریقہ
سے اپنا منشا پورا کر رہی ہے، بظاہر اس نے ایک ایسے شخص کو انتخاب کر لیا تھا جس کے ذریعہ سے وہ
اپنا عندیہ پورا کر رہی تھی، یہ ذات بابرکات مسٹر دھرمپال کی تھی جو مختلف عارضوں میں مبتلا چارپائی
پر پڑے ہوئے احکام جاری کیا کرتے تھے۔ آخر ۱۱۔ نومبر کی تاریخ آپہونچی جس کا دلی تمناؤں کے ساتھ انتظار
ہو رہا تھا۔ اُس دن بدھ دھرم کا جھنڈا ہندوستان میں پھر نصب ہوگیا۔

قبل اس کے کہ ہم ان افتتاحی رسم کی کیفیت حوالۂ قلم کریں یہ بتلانا ضروری ہے کہ جس دن
بدھ بھگوان کے اَست جلے گئے راجگان و رؤسا اور پنڈتوں میں جھگڑا ہوگیا کہ اُن کو کون اُٹھا کر
لے جائے، آخر یہ فیصلہ ہوا کہ چند حصّوں میں وہ تقسیم کئے جاویں، چنانچہ اس واقعہ کے بعد بہت سے
مقامات پر یہ استخوان ایک مقدس و متبرک کی حیثیت سے دفن کرد گئے اور اُن پر رفیع الشان گنبد
جن کو اسٹوپا (Stupa) کہتے ہیں بنوا دیے گئے۔ شاہانِ وقت اُن کے مقام بھی تبدیل کرتے رہے
چنانچہ روایت ہے کہ مہاراجہ اشوک شہنشاہ ہند نے چوراسی ہزار اسٹوپے تعمیر کئے۔ غالباً یہ مبالغہ ہے
لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس فرشتہ سیرت شہنشاہ نے جس کا ثانی ابتک کوئی دوسرا بادشاہ دنیا میں
نہیں گزرا ہے کثرت سے اسٹوپے تعمیر کرائے تھے، اسی زمانہ کا ایک اسٹوپا سارناتھ میں ابتک موجود ہے
گورنمنٹ کو ٹکسیلا کے آثار سے دو صندوق ملے ہیں جن میں بدھ بھگوان کی ہڈیوں کے ریزے ہیں اور اُن
صندوقوں پر یہ عبارت کندہ ہے کہ "یہ بودھ بھگوان کے اَست کے ٹکڑے ہیں" لہذا یقینی طور پر کہا جا سکتا
ہے کہ ان کے اصلی ہونے میں کسی کو شک کی گنجائش نہیں ہے۔ گورنمنٹ کو اور مقامات میں بھی ایسے
تبرک ملے ہیں، انھیں میں ایک مانڈلے (برما) میں دوسرا کلکتہ کے دھارے میں حفاظت سے رکھا
گیا ہے۔ دو صندوق گورنمنٹ کے پاس باقی ہیں۔ مہابودھی سوسائٹی کے ساتھ سرکار نے وعدہ کیا تھا کہ
اگر وہ سارناتھ میں ایک دھارا (Vihara) بنادیں تو ایک تبرک اُن کو بھی دیدیا جائیگا، اور دوسرے
صندوق کے لئے یہ تجویز تھی کہ ٹکسیلا میں بھی ایک دھارا بنا دیا جائے۔ اس فیصلہ میں گورنمنٹ نے
حق بحقدار کے اصول پر عمل کیا ہے، بہرحال اب ایک صندوق حوالہ کرنے کا وقت آگیا۔ سارناتھ کی
سرزمین پر جہاں بدھ بھگوان نے پہلا وعظ سنایا تھا دھارا بن گیا، اور گورنمنٹ نے فخر قوم رائے بہادر لا
دیا رام صاحب ساہنی ڈائرکٹر جنرل کو ان تبرکات کو مہابودھی سوسائٹی کے حوالہ کرنے کی ہدایت دے دی
چنانچہ ۱۱۔ نومبر کی صبح کو لالہ صاحب موصوف نے حضور والسرائے کے پیغام مبارکباد کے ساتھ اس کبر
مسٹر جسٹس مکرجی پریسیڈنٹ مہابودھی سوسائٹی کے حوالہ کر دیا۔ اس صندوق میں کیا تھا؟ یہ پتھر کا صن

جس میں سونے کی ایک چھوٹی سی ڈبیا تھی، اس ڈبیا میں ہڈیوں کی گولیاں سی تھیں معلوم ہوتا ہے کہ ہڈیوں کو پیس کر کوئی مسالہ ملا کر پختہ کر دیا گیا ہے۔ روایت یہ ہے کہ مہاراجہ اشوک کو جہاں کہیں پتہ ملا کہ بدھ بھگوان کے استھ مدفون ہیں اُنھوں نے ان کو نکلوا کر ان کے ہزارہا نئے نئے اسٹوپے بنوا دیے، ان کی تعداد چوراسی ہزار بتلائی جاتی ہے جو مبالغہ آمیز ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ مہاراج موصوف نے اپنے وقت میں بہت سے اسٹوپے بنوائے اور اُن میں بدھ بھگوان کے جو استھ مل سکے بانٹ بانٹ کر مدفون کر دیے اور اُن پر عالی شان عمارتیں بنوا دیں — یہ ہڈیاں ٹیکسلا کے ایک مندر سے بھی ملی تھیں، صندوق پر ایک عبارت بھی کندہ ہے جس سے کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ یہ بدھ بھگوان کی اصلی ہڈیاں ہیں، اس تحریر کی نقل اور اس کا ترجمہ بھی ساہنی صاحب نے اس صندوق کے ہمراہ عطا فرمایا۔

مسٹر جسٹس مکرجی نے شکریہ ادا کیا اور صندوق ایک نوجوان کے حوالہ کر دیا جو ہاتھی پر سوار ہو کر اس مقدس صندوق کو اپنے ہاتھ میں لیکر جلوس کے ساتھ مندر تک پہونچا، جلوس کی ترتیب تبت کے رئیس مسٹر لیڈن لا نام نے کی تھی، سب سے آگے تبتی سازندے تھے جو عجیب و غریب ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے۔ ان کے بعد اور لوگ صف در صف قرینہ کے ساتھ چل رہے تھے۔ مندر کی تین مرتبہ پرکرما کی گئی، پھر یہ تبرکات مندر کے اعلیٰ بھکشوؤں کے حوالہ کر دیے گئے اور مندر کا باضابطہ افتتاح ہو گیا، گاتیا (Gatha) گائے گئے، منگل سنائے گئے، ساری رات پوجا ہوتی رہی، مندر روشنی سے جگمگاتا رہا، دیہمک اسٹوپا (Dhemekh Stupa) کی بھی روشنی ہوئی، ساری رات جاتری آتے جلتے موم بتیاں اگر کی بتیاں مہتابیاں روشن کرتے، سجدہ کرتے اور شلوک پڑھتے تھے۔ غرض عجیب سماں تھا جو سات سو برس کے بعد ظہور میں آیا۔ جلوس کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایشیا کی کوئی قوم نہ تھی جس کے قائم مقام اس جلوس میں شامل نہ ہوئے ہوں۔

شام کو ایک شامیانہ میں ایک جلسہ ہوا جس کے صدر سیلون کے ایک مقدس بھکشو تھے، اُن کی تقریر کا ہندی میں ترجمہ کر کے سنایا گیا، راجہ موتی چند صاحب نے اپنا استقبالیہ خطبہ پڑھا، شخص کے قریب مبارکباد کے پیغام تھے ان میں سے بعض سنائے گئے، مثلاً لارڈ زٹلینڈ، ڈاکٹر ٹیگور، سر جان مارشل سر ہری سنگھ گوڑ، پنڈت مالوی جی۔ پیام سنانے کے بعد ہز اکسیلنسی گورنر صوبۂ متحدہ کی طرف سے ایک پیش بہا تحفہ سوسائٹی کو پیش کیا گیا۔ مندر کے بنانے والے ٹھیکہ دار لالہ ستا لعل گوپاکر، اور جالندھر نواسی لالہ ہری چند رائے صاحب کو جنھوں نے لطور انجنیئر عمارت مندر کے متعلق بہت سا کام انجنیئر کی حیثیت سے مفت کیا تھا

سونے کے تمغے دیے گئے، مورتی کے بنانے والے پنڈت گلاب چند برہمن ساکن جے پور کو سو روپیہ نقد انعام دیا گیا۔ پھر بودھی سوسائٹیوں کے ایڈریس پڑھے گئے، بابو راما نند چٹرجی نے ہندو مہاسبھا کی جانب سے ایڈریس پیش کیا جس کی بڑی قدر کی گئی، بہت سی اور تقریریں بھی ہوئیں۔ دھرمپال جی کے ایڈریس کا کچھ حصہ راقم الحروف اور کچھ حصہ لالہ سری پرکاش نے پڑھکر سنایا، وہ خود بھی وہاں موجود تھے مگر علالت کی وجہ سے خود پڑھنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ ہجوم اس قدر تھا کہ تل رکھنے کی جگہ نہ تھی، معلوم ہوتا تھا کہ تمام بنارس یہاں آکر جمع ہو گیا ہے، سب لوگ خوش تھے کیونکہ اُس مقدس سرزمین پر جس پر دنیا کے سرمایۂ ناز بھگوان بُدھ کا نام و نشان پھر قائم ہو گیا۔ بودھی جاتریوں کی اس قدر آؤ بھگت ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو صاحب نے بھی جو حسن اتفاق سے بنارس آئے ہوئے تھے اس جلسہ میں شرکت کی۔ اُنھوں نے حسن عقیدت سے مندر کو ایک قومی نشان پیش کیا۔ اللہ اللہ کسی وقت یہ مقام کھنڈر ہی کھنڈر تھا اب یہ رونق۔ دورِ فلکی کی نیرنگیاں کون سمجھ سکتا ہے!

(۲)

دوسرے دن ۱۲۔ نومبر کو صبح سے پونے تین بجے تک جاری کھنڈرات کا ملاحظہ کرتے رہے پونے تین بجے سہ پہر کو پیپل کی تین شاخیں لگانے کی رسم ادا ہوئی۔ اشوک کے زمانہ میں بودھی برکش یعنی پیپل کا درخت جس کے تلے بھگوان بدھ کو گیان ہوا تھا تر و تازہ تھا، اس کی ایک شاخ شہزادی سنگامتی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ لے گئی تھیں، یہ شاخ اب ایک تناور درخت ہو گئی ہے اور انورادہ پور میں موجود ہے۔ اس کی تین شاخیں سارناتھ لائی گئیں، اور مذہبی رسمیات کے ساتھ ایک پختہ احاطہ میں نصب کی گئیں۔ مسٹر دیارام ساہنی نے اس کی ایک شاخ اپنے ہاتھ سے نصب کرتے وقت اس کے تاریخی واقعات بھی بیان کئے۔ شام کو ایک جلسہ بدھسٹ کنونشن کا ہوا جس کے صدر ڈاکٹر داس گپتا تھے جو کلکتہ کے سنسکرت کالج کے پرنسپل ہیں۔ اور سنسکرت کے عالم متبحر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ صاحب ہندو فلسفہ کے مورخ بھی ہیں چنانچہ ان کا خطبہ صدارت تاریخی تحقیقات کا ایک نادر مجموعہ تھا۔ بعض اخبارات میں اس ایڈریس کی نکتہ چینی بھی ہوئی۔ درحقیقت شنکراچارج کے متعلق جو کچھ انھوں نے فرمایا ہے اس سے بہت سی مروجہ غلطیاں رفع ہو گئیں۔ علاوہ ازیں اس موقعہ کے لیے بہت سے عالموں نے مضامین پڑھنے کے لئے بھیجے تھے، یہ سب مضمون کتاب کی شکل میں شائع ہونگے اور بودھی جرنل میں باقساط نکلیں گے۔

(۳)

۱۳۔ نومبر کی صبح تہ خانے میں تبرکات رکھنے اور تحائف کے آراستہ کرنے میں صرف ہوئی۔ ڈھائی بجے

بعد دوپہر ایک عام جلسہ منعقد ہوا جس میں اس مسئلہ پر غور ہوا کہ بدھ مت کو ہندوستان اور دیگر ممالک میں کس طرح سے ترقی دی جائے۔ اس جلسہ کے پریسیڈنٹ مسٹر براوٹن ایک انگریز بدھسٹ تھے۔ بہت سی اور تقریریں بھی ہوئیں۔ دھرمپال جی نے فرمایا کہ وہ اس نئے دھارا کو دنیا کے حوالہ کرتے ہیں، اس مباحثہ کے بعد بہت سی اور تقریریں بھی ہوئیں جن کا ذکر باعث طوالت ہے۔ اخیر پر راقم الحروف نے اہالیان بنارس اور دیگر امداد کنندگان کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوا۔ شام کو راجہ موتی چند صاحب کی طرف سے گارڈن پارٹی ہوئی جس میں بہت سے لوگ مدعو تھے۔ دیوالے کے قریب لاما ناچ بھی دکھلایا گیا اور مسٹر لیڈن لا نے لاما ناچ کی تاریخ بھی بیان کی جس سے سامعین ناواقف تھے۔ اس لاما ناچ میں جسے مذہبی ناچ بیان کیا جاتا ہے سوائے جسمانی حرکات و سکنات کے ہمیں کوئی خاص خوبی نظر نہیں آئی، البتہ ایک نئی بات ضرور تھی۔ فلم کمپنی والے مدھم روشنی میں اس کی تصویر نہیں لے سکتے تھے چنانچہ دوسرے روز دن کے وقت فلم کمپنی نے پھر ناچ کروایا اور عکسی تصویریں لیں۔ غالباً سارناتھ کی افتتاحی تصویر کے ساتھ اس ناچ کی فلم بھی تیار ہوگی اور عوام کو دکھلائی جائیگی۔

۱۳۔ نومبر کی رات اور ۱۴ کی صبح کو جاتری جو ہزاروں کی تعداد میں تھے واپس روانہ ہونے لگے۔ دو تین دن میں سناٹا ہوگیا اور راقم الحروف بھی ۲۱۔ نومبر کو لاہور واپس آگیا۔

اخلاقیات کا دستور العمل

لندن کے ایک جج نے زندگی کی چودہ تجربی غلطیاں یوں گنائی ہیں:-

۱۔ نیک و بد کا اپنا انفرادی معیار مقرر کرکے یہ توقع رکھنا کہ ہر شخص اس کی تصدیق کرے۔ (۲) اپنے نشاط و خوشی سے دوسروں کی نشاط کا اندازہ لگانا۔ (۳) اس دنیا میں ہر ایک سے اتفاق رائے کی توقع رکھنا (۴) [illegible] سے عقل اور تجربے کی توقع رکھنا (۵) یہ کوشش کرنا کہ سب لوگوں کی طبیعتیں یکساں ہو جائیں (۶) [illegible] اور فضول باتوں میں طرح نہ دینا (۷) اپنے اعمال میں تکمیل کی توقع رکھنا (۸) جن باتوں کا کچھ علاج نہ ہو ان سے خود پریشان ہونا اور دوسروں کو پریشان کرنا (۹) اس بات کو نہ ماننا جس کا کرنا ضروری اور اختیاری ہو (۱۰) دوسروں کی کمزوریوں کو وسیع النظری سے قبول نہ کرنا (۱۱) جو بات ہم سے نہ ہو سکے اسے ناممکن سمجھنا (۱۲) [illegible] ان باتوں کو نہ سمجھنا جو ہماری محدود عقل سمجھ سکتا ہو (۱۳) [illegible] (۱۴) انسان کے اخلاق کے متعلق کسی بیرونی معیار سے اندازہ لگانا [illegible] انسان کو انسان بناتا [illegible] انسان کے اندر ہی ہے۔

کبیر صاحب[1]

کبیر کے متعلق جناب پنڈت منوہر لال زتشی کی ایک کتاب ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد کی طرف سے حال میں شائع ہوئی ہے، جس میں حسب ذیل مضامین ہیں:-

۱- مذہب - ۲- ہندو مذہب کا ارتقا - ۳- ہندو مذہب کے اصول - ۴- کبیر صاحب کے حالات ۵- کبیر کی تعلیم و تلقین - توحید - بھگتی اور پریم - مذہب کی نمایش - تناسخ - ہندو مسلمانوں کا میل - کبیر کی شاعری -

ادبی حیثیت سے بھی یہ کتاب بہت زیادہ قابل تعریف ہے - فاضل مصنف نے انگریزی زبان سے مستغنی ہو کر جس اعلیٰ قسم کے اردو لٹریچر کا نمونہ پیش کیا ہے اس سے بہتر کوئی اور شخص خواہ وہ کسی مذہب کا ہو ایسی پاک و صاف عبارت میں ایسی مشکل چیزیں بشکل پیش کر سکتا ہے لیکن تقاضائے بشری کے اعتبار سے جہاں اس کتاب میں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں بعض خامیاں بھی ہو گئی ہیں مثلاً پہلے مضمون میں جس میں مذہب کی اصولی حقیقت بیان کی ہے، مذہب کی تعریف مصنف نے اپنے الفاظ میں یہ کی ہے کہ:-

"مذہب کے معنی ہیں احساس ہونا ایسی قوت یا قوتوں کا جو انسان سے بالاتر ہیں جو اس کو نفع یا ضرر پہونچا سکتی ہیں اور جن سے نفع حاصل کرنے کے لئے اُن کو خوش رکھنا اور ضرر سے بچنے کے لئے کوئی ایسا فعل نہ کرنا جس سے وہ ناخوش ہوں لازم ہے"

مصنف نے اس تعریف کے لکھنے سے پہلے ہی یہ کہہ دیا ہے کہ اگر منطقی اور فلسفی موشگافیوں سے قطع نظر کریں تو سیدھے سادے الفاظ میں مذہب کی یہ تعریف ہے - درحقیقت مذہب کا مفہوم تو یہی ہے یا اس کے قریب مگر مشکل یہ ہے کہ جہاں تعریف کا لفظ آجائے گا وہاں تعریف کے اصول ...

[1] مؤلفہ پنڈت منوہر لال زتشی، پبلشر ہندستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ الہ آباد، حجم ۱۵۲ صفحات قیمت عہ/

پڑینگے۔ اگر شام کی تعریف کیجئے تو اُس میں ایسے الفاظ ہوں کہ نہ تو کوئی شام اُس تعریف سے خارج ہو سکے اور نہ کوئی دوسرا وقت اس میں داخل ہو سکے۔ اس تعریف کے پہلے جملے میں ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے "مذہب کے معنی ہیں احساس ہونا۔۔۔۔۔۔" مذہب مصدر نہیں ہے بلکہ ظرف ہے، اگر یوں کہتے کہ "مذہب مرکز ہے اُس قوت یا اُن قوتوں کا۔۔۔" تو یہ زیادہ صحیح ہوتا گو یہ لفظی فرق کچھ زیادہ قابلِ توجہ نہیں ہے تاہم اس تعریف میں ایک حل طلب سوال تشنہ رہا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس تعریف سے ایک یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ مصنف نے قوت سے شاید قدرتِ الٰہی مراد لی ہے، اور قوتوں سے ان کا مطلب فرشتوں یا مؤکلوں یا دیوتاؤں کی طاقت ہے، اگر یہ خیال صحیح ہے تو مذہب کی اس تعریف میں وہ مذاہب نہ آسکیں گے جو فرشتوں اور دیوتاؤں وغیرہ کو نہیں مانتے بلکہ صرف وحدت پرست ہیں۔ ہندوؤں میں بھی ایک جلیل القدر فرقہ وحدۃ الوجود کا قائل ہے اور کسی دوسری طاقت کو تسلیم نہیں کرتا بہر حال یہ عظیم الشان مذہب مصنف کی اس تعریف سے خارج ہو جائیگا کیونکہ مصنف نے نہ صرف قوتوں کی قید لگائی ہے بلکہ مذہب کی تعریف میں یہ امر خاص طور پر ظاہر کیا ہے کہ نفع کے لئے اُن کو خوش رکھنا شرطِ مذہب ہے

مذہب کی تعریف ان الفاظ میں کسی قدر صحیح ہو سکتی ہے کہ انسان کسی ہستی کو غیر فانی اور سب سے بالاتر سمجھکے اس سے بہترین تعلقات پیدا کرنے کا جو طریقہ اختیار کرے وہی اُس کا مذہب ہے"۔ اس تعریف سے کوئی مذہب باہر نہیں ہے خواہ وہ خدا پرست ہو خواہ بت پرست، آتش پرست ہو یا ستارہ پرست یگ پر عامل ہو یا تپ پر، اخلاق کی راستی کو اپنا طریقہ بنائے یا عرفان یا بھگتی کو بہر حال مذہب ہے اور لامذہب وہ ہے جو کسی ہستی کو سب سے بالاتر اور لازوال نہ سمجھے اور اگر سمجھے بھی تو کوئی طریقہ ایسا اختیار نہ کرے جس سے اس کے ساتھ اچھے تعلقات پیدا ہو سکیں تو بھی اس کا مذہب صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنا مرجع محسوس کرتا ہے مگر اس کے طریقہ یعنی مذہب سے بے پروائی کرتا ہے۔

لائق مصنف نے صفحہ ۱۲ میں یہ لکھا ہے کہ:-

"بودھ مت کے بعض اصول اور عقائد قوم کے دل و دماغ میں اس طرح سرایت کر گئے تھے کہ اس مذہب کے زوال کے بعد (یعنی بودھ مذہب کے زوال کے بعد) ہندو مذہب کا جزو بن گئے"۔ اسی صفحے میں دوسری جگہ لکھتے ہیں "اس وقت بودھ مذہب کا زوال اور ہندو مذہب کی نئی زندگی شروع ہو گئی تھی"۔

اس تحریر سے ہمارا اور شاید بیشمار لوگوں کا یہ یقین تھا کہ "بودھ" مذہب ہندو ہی کے ایک مجدد

اور مصلح تھے۔ ممکن ہے کہ مصنف کے اس بیان سے کہ بودھ مذہب ہندو مذہب سے جداگانہ ہے وہ یقین مشکوک ہو جائے۔ قابل مصنف نے ایک سے زیادہ مقامات پر ایک تاریخی غلطی بھی کی ہے آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ تاریخ عالم شاہد ہے کہ جتنی خونریزی دنیا میں مذہب کے نام سے ہوئی ہے اس سے زیادہ شاید کسی اور وجہ سے نہوئی ہوگی۔"

میرا خیال ہے کہ دنیا میں سب سے بڑی لڑائیاں غیر مذہبی ہوئی ہیں، مثلاً مہابھارت (حق طلبی) روما کی پہلی لڑائی رولس سے (عورتوں کے بارے میں) یونان و ایران کی تمام بحری و بری لڑائیاں (ملک گیری) سکندر و دارا کی جنگ اور سکندر کے تمام حملے (تسخیر ممالک) چنگیز خاں کا حملہ الپ ارسلاں شاہ سمرقند پر (چنگیز کے گروہ کا ایک قافلہ سمرقند میں لوٹ لیا گیا تھا) مغلوں نے جتنے حملے تمام ایشیا میں جا بجا کئے اور جن کا کوئی شمار ہی نہیں اُن میں سے ایک بھی مذہبی نہ تھا کیونکہ اس وقت مغلوں کا کوئی مذہب ہی نہ تھا۔ یورپ کی سب سے بڑی لڑائی نپولین کی صرف اس طمع پر مبنی تھی کہ تمام یورپ اس کے قبضے میں ہو جائے۔ زمانہ جاہلیت میں عرب ہمیشہ ذاتیات پر اس قدر لڑتے تھے کہ یہ لڑائیاں موروثی ہو جاتی تھیں۔ آغاز اسلام کے بعد جو لڑائیاں مسلمانوں کی غیر قوموں سے ہوئیں وہ مختلف اغراض سے ہوئیں۔ محمد ابن قاسم نے سندھ پر اس لئے حملہ کیا تھا کہ مسلمانوں کا ایک بحری قافلہ لوٹ لیا گیا تھا۔ ایران و کابل اور مغل قوم کے بادشاہوں یا جرگوں نے جس قدر حملے ہندوستان پر کئے اُن میں زیادہ حصہ طمع زر کا تھا۔ جرمنی کی آخری لڑائی جو گزشتہ زمانہ کی تقریباً تمام لڑائیوں سے زیادہ وسیع تھی وہ بھی مذہبی نہ تھی۔ غرضکہ عظیم الشان لڑائیاں جس قدر ہوئیں وہ سب غیر مذہبی تھیں۔

اس مضمون میں ایک اور بات غور کرنے کے لائق ہے "مذہب کیونکر پیدا ہوا" اس سوال کے ایک جواب دوسروں کی زبان سے دیے گئے ہیں اور اُن پر لوگوں کے اعتراضات بھی ظاہر کئے گئے ہیں۔ مگر اعتراض کا صحیح جواب نہ دینے سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ مصنف موصوف بھی معترض کے ہم [illegible] ہیں، اصل عبارت یہ ہے:-

"نکتہ چیں اس میں شاخسانے نکالتے ہیں، اُتنے مذہب پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی، ایک مذہب جاری ہوا اور پھر حکم الٰہی سے منسوخ ہو کر اس کی جگہ دوسرا مذہب جاری کیا گیا یہ کیوں؟ اس کا کیا ثبوت ہے کہ ہر زمانے میں اور ہر گروہ انسان میں پیمبر بھیجے گئے؟ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ ایک خاص زمانے میں خدا نے ایک خاص مذہب جاری کیا اور وہی مذہب برحق ہے اور اس سے انکار کرنے والا کافر ہے تو ان لوگوں کا کیا حشر ہوگا جن تک وہ پیام پہنچا ہی نہیں۔ خدائی مذہب کے طرفدار ایک

حد تک ان اعتراضوں کا جواب دلیل اور منطق سے دیتے ہیں۔ اور آخر میں معترضین کو یہ کہہ کر خاموش کر دیتے ہیں کہ احکام الٰہی میں چون وچرا کی گنجائش نہیں۔ مذہب ادراک انسانی سے بالاتر ہے۔ وغیرہ وغیرہ

ان (چاروں) اعتراضوں کے جواب اگر کوئی شخص عقلی وعلمی حیثیت سے منطق وفلسفہ سے دیتا ہے۔ تو یہ کہا جاتا ہے کہ حجتی ہے اور اگر نقلی جوابات پیش کرتا ہے تو روشن خیال نہیں سمجھا جاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قابل مصنف بھی معترض کے ہمخیال ہیں، ورنہ وہ کوئی تیسری صورت سے جواب دیتے۔ چونکہ یہ اعتراضات عام طور پر ہر مذہب سے متعلق ہیں اسی لئے مصنف کا بھی فرض تھا اور مبصر کا بھی فرض ہے کہ جہاں تک ہوسکے ان کے صحیح جواب دے۔

۱۔ اعتراض اول" اتنے مذہب پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر اصل مذہب سے سوال ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مذہب ایک ہی پیدا کیا گیا ہے، یعنی خدا ایک ہے، ازلی وابدی ہے، اور گناہوں اور نیکیوں کا بدلہ دیگا۔ ابتدا سے آج تک ہر مذہب میں اسی پر زور دیا گیا، البتہ خدا کو خوش کرنے اور اس کی دینی ودنیوی نعمتیں حاصل کرنے کے لئے مختلف زمانوں میں مختلف طریقے ضرور بتائے گئے مگر چونکہ مختلف قوموں اور ملکوں کے مزاج مختلف ہیں اس لئے راستوں کا مختلف ہونا بھی قدرتی ہے۔ ہر ملک کا ملکی وفوجی قانون بھی جدا جدا ہوتا ہے مگر بادشاہ ایک ہی ہے اور سب کا منشا اُس کی خوشنودی ہے۔ راستوں کے اختلاف سے منزل فوت نہیں ہوتی۔

۲۔ ایک مذہب جاری ہوا پھر حکم الٰہی سے وہ منسوخ ہو کر اُس کی جگہ دوسرا مذہب جاری کیا گیا، یہ کیوں؟"

مذہب وہی ایک جاری ہوا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، یہ کسی مذہب میں نہیں ہے۔ کہ ایک مذہب جاری کر کے پھر وہ منسوخ کیا گیا۔ اس کا ثبوت تمام مذہبی کتابوں سے ملتا ہے مثلاً قرآن ہی کی ایک آیت کو لے لیجئے وَمَا نَنسَخْ مِنْ آيَاتٍ أَوْ نُنسِهَا مگر یہ مغالطہ معترض کو اس وجہ سے ہوا کہ مذہب کے شاخوں اور طریقوں میں بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کی دو صورتیں ہوئیں ایک تو یہ کہ جس زمانے کے لحاظ سے جو احکام مفید اور ضروری تھے وہ بطور جزئیات یا فروعات مذہب میں اضافہ کئے گئے اور جو اُس موقع کے لحاظ سے غیر ضروری تھے وہ نکال دیے گئے۔ لیکن ایک دوسری بات یہ بھی ہے کہ مدت مدید گزرتے گزرتے طریقوں میں خرابیاں پیدا ہو گئیں اور بعض عبادتیں رسوم ورواج میں داخل ہو کر بے اثر ہو گئیں کیونکہ اُن میں وہ خلوص نہیں رہا۔ اس لئے عبادت یا نجات کے دوسرے طریقے بتائے گئے۔ مثلاً یگ میں نمائش، نمود اور صرف ادائے رسم کا تخیل باقی رہ گیا

خلوص اور بے ریائی نہ رہی۔ اس وجہ سے گوتم بدھ نے اس کو یوں بدل دیا کہ یگ سے زیادہ مفید تپ ہے۔ یا بزرگان اسلامی کی محبت اس قدر افراط کے درجے پر پہونچ گئی کہ لوگ انکی نشانیوں اور اُن کی قبروں کو پوجنے لگے اس لئے اولیا اور علما نے قبر پرستی کی بیخ کنی شروع کردی۔ ایسی ہزاروں مثالیں ہر مذہب میں ہیں اور پر لطف مثال یہ ہے کہ یہودیوں کی عبادت میں کچھ دعائیں تھیں کہ جس قدر وہ پڑھی جائیں اسی قدر زیادہ ثواب ہو۔ زیادتی کی یہ صورت ہوئی کہ پہیوں کے ہال پر وہ دعائیں لکھکر چسپاں کی گئیں اور پہیے زور زور سے جلد جلد گھمائے جانے لگے یہ گویا تلاوت کی کثرت تھی۔ ظاہر ہے کہ جب اس طرح کی تلاوت ہوگی تو اس تلاوت کا ہر خدضرور نذر آتش کیا جائیگا

۳۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ ہر زمانے اور ہر گروہ انسان میں پیمبر بھیجے گئے" اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ ہر ملک و قوم میں رہنما بھیجے گئے، اس کا ثبوت دنیا کا ہر مذہب ہے جو یہ کہتا ہے کہ ہمارے اوتار یا پیشوا و رہنما خدا کے بھیجے ہوئے ہیں جنھوں نے ہم کو صحیح ہدایت کی، جب تک ہر قوم یہ نہ کہے کہ ہمیں کوئی رہنما نازل نہیں ہوا جو لوگ ہماری ہدایت کا دعویٰ کرتے تھے وہ جھوٹے تھے اور فی الواقع ہادی نہ تھے اُس وقت تک یہ دعویٰ رد نہیں ہوتا کہ ہر ملک و قوم میں رہنما و ہادی نازل ہوئے۔

۴۔ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ ایک خاص زمانے میں خدا نے ایک خاص مذہب جاری کیا اور وہی مذہب برحق ہے اور اس سے انکار کرنے والا کافر ہے، تو ان لوگوں کا کیا حشر ہوگا جن تک وہ پیام پہونچا ہی نہیں" جب پیام ہی نہیں پہونچا تو اس سے انکار کے کیا معنی ہو سکتے ہیں، جب پیام پہونچے گا جبھی تو اُس کا مُقر مومن اور منکر کافر سمجھا جائیگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب زمانے میں مطبع اور ڈاک خانہ نہ تھا اس وقت ہر ملک میں ایک رہنما یا نائب خود پہونچتا تھا اور لوگوں کو ہدایت کرتا تھا، کوئی مقام متمدن ایسا نہیں جہاں تبلیغ نہ پہونچی ہو اور اب تو کوئی ملک یہ انکار کر ہی نہیں سکتا کہ ہم کو فلاں مذہب کی اطلاع نہیں ہوئی۔ عوام اگر مختلف مذاہب کی کتابیں نہ پڑھیں تو یہ ان کا قصور ہے۔

اس کے بعد مصنف نے یہ لکھا ہے کہ" اگر مان بھی لیا جائے کہ یہ سب کتابیں آسمانی ہیں تو ان کے سمجھنے میں دقتیں ہیں، ہر ایک نے ایک علحدہ بات بتائی ہے اسی وجہ سے ہر مذہب میں سیکڑوں فرقے پیدا ہوگئے۔ اس میں بھی مصنف موصوف کو مغالطہ ہوا ہے حقیقت یہ ہے کہ اصول مذہب میں کہیں کوئی اُپنشد یا آیت مجمل اور ناقابل فہم نہیں ہے۔ خدا کا وجود اور اس کی قدوسیت اور اُس کی وحدت ہر آیت اور ہر اُس اُپنشد میں جس میں اوس کا بیان ہے صاف صاف ہے، کوئی پیچیدگی احکام اور واقعات میں نہیں ہے۔ البتہ علوم و عرفان میں باریکیاں ہیں اور انھیں کے حل کرنے کے طریقے کثرت اختلاف

کی وجہ سے جتنے زیادہ ہوں اُتنے ہی مفید ہیں۔ اصول میں تو یہاں تک صفائی ہے کہ خدا کی توحید او
اس کے صفات میں وید و قرآن دونوں متحد ہیں

اس کتاب میں دوسرا مضمون "ہندو مذہب کا ارتقا" ہے۔ ارتقاے مذہب کا ذکر مضمون اول میں بھی جا بجا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مضمون اول مضمون ثانی کی تمہید ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ کے دوران میں یہ خیال بار بار آتا ہے کہ کسی مکمل چیز کا ارتقا ناممکن ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ایک مکمل چیز اہل دنیا کے برتنے سے غیر ضروری امور سے آلودہ ہو کر اکثر زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ ہندو مذہب بھی پہلے مکمل تھا اور بعد کو اُلجھا دیا گیا اس لئے مکرر سہ کرر ہادی و رہنما آکر اُس کی تجدید و اصلاح کرتے رہے مثلاً ویدی تعلیم پر ایک عرصہ تک عملدرآمد رہا رفتہ رفتہ زمانہ کے انحطاط نے مذہبی تقریبوں کو رسم و رواج میں داخل کر لیا، یگ امیرانہ نمائش و نمود کے لئے ہونے لگی۔ عبادتوں میں خلوص کی جگہ ریاکاری نے لے لی اور طرح طرح کی بدعتوں سے مذہبی اصول آلودہ ہو گئے یہاں تک کہ "بودھ" سے پہلے "شاکت" نے شراب و دیگر مکروہات کو بھی مباح کر دیا اور وید کے مفہوم ہی کو بدل دیا۔ ان خرابیوں کی اصلاح کے لئے خدا نے گوتم کو بھیجا جنھوں نے ان بدعتوں کو رفع کیا۔ جو کئی سو برس سے داخل مذہب ہو گئی تھیں پھر کیا شاکت مذہب کو ہندو مذہب کا ارتقا کہہ سکتے ہیں۔ گوتم کی اصلاح کو ارتقا کہا جا سکتا ہے

واقعہ یہ ہے کہ ہر مذہب میں جب خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو ان کو دفع کرنے کے لئے رہنما آیا کرتے ہیں شاکت کے مثل آتش پرستوں میں بھی ایک شخص مزدک نامی ہوا ہے۔ اس نے بھی بالکل اسی قسم کے خواہش رواج دیئے تھے جس کا قلع قمع کسریٰ نوشیرواں نے کیا۔ مذہب اسلام میں بھی گو اس حد تک نہیں مگر کچھ نہ کچھ خرابیاں ہر صدی میں پیدا ہو گئیں، چنانچہ ہر صدی میں ایک مجدّد ان خرابیوں کی اصلاح کے لئے آیا، پھر معلوم نہیں کہ تجدید و اصلاح کو کس اصول پر ارتقا کہا گیا ہے۔ کسی مکمل مذہب کو ارتقا کا محتاج بتانا اس کی اصلیت نہ سمجھنے کے مرادف ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ جب تک کوئی قانون مکمل نہ ہو جائے قابل عمل نہیں ہوتا اور ایسے مذہب کے گزشتہ عامل جو کروروں برس کے بعد ارتقا حاصل کر سکا ہو۔ مذہب میں کامل نہیں سمجھے جا سکتے حالانکہ سچ پوچھئے تو اگلے ہی لوگ کامل المذہب تھے پھر ایک آخری مشکل یہ اور باقی رہ جاتی ہے کہ کروروں برس تک ارتقا کے مدارج طے ہونے کے باوجود ممکن ہے کہ اب بھی اس مذہب کی تکمیل نہ ہوئی ہو۔ قاعدہ یہ ہے کہ جو قوانین کوئی رہنما خدا کی طرف سے لاتا ہے انھیں وہ اپنی زندگی ہی میں مکمل کر جاتا ہے۔ اگر سوء اتفاق سے کوئی حصہ باقی رہ جائے تو فوراً ہی اُس سے پیوستہ اس کے اتمام کے لئے دوسرے رہنما کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ کسی مذہب میں کسی

ضروری امر کا رہ جانا حکمت ایزدی اور منشاء الٰہی دونوں کے خلاف ہے۔ اتنی مدت تک کوئی مذہب حق محتاج تکمیل نہیں رہ سکتا

تیسرا مضمون "ہندو مذہب کے اصول" اور چوتھا مضمون "کبیر کے حالات" پر ہے۔ آخری مضمون میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کبیر ہندو تھے، لیکن خود مصنف موصوف کو یہ تسلیم ہے کہ کبیر کی حیات میں یہ تصفیہ نہ ہو سکا کہ کبیر ہندو تھے یا مسلمان۔ پھر جب خود کبیر اتحاد بین المذاہبین کو اپنا سرمایۂ حیات سمجھتے رہے تو کسی دوسرے شخص کو اس بحث میں پڑنے کا کیا حق ہے۔

ان باتوں کے باوجود یہ کتاب شروع سے آخر تک قابل قدر اور غور سے مطالعہ کے قابل ہے اس کا طرز بیان ادب اردو کی ایک روشن اور قابل تقلید مثال ہے اور اس سے زیادہ یہ امر قابل تعریف ہے کہ پنڈت منوہر لال صاحب زتشی نے اپنے ہر ضمیر کو نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے جس سے لوگوں کو سبق لینا چاہیئے۔

اردو شاعری

(از محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے دہلوی مرحوم)

بدقسمتی سے اردو ادبی دنیا میں نری لفاظی ہی شاعری کی جان سمجھی جانے لگی ہے۔ ہماری شاعری ایک چیتھڑوں کی گڑیا سی ہے جس کو چھوٹے مسالہ والی کترنیں سی سلا کر پہنا دی گئی ہیں۔ لونگ اور شیشہ کا زیور ہے، خد و خال ماشاء اللہ جیسی ہمارے ہاں گڑیاں بنتی ہیں وہ ظاہر ہے ایک لمبا سا سیاہ دھاگا آنکھ ناک اور بھوں کی علامت ہوتی ہے ایک سرخ تاگے کا ٹانکہ ہوتا ہے ڈیل میں تناسب بنئے کے تن و توش کی طرح غائب ہوتا ہے۔ اردو شعراء اس قسم کی گڑیاں کھیلتے ہیں، اصلیت کی ہوا سے بھاگتے ہیں اور زندگی کی لہراتی ندی سے جان چراتے ہیں۔ شاعر کی قادر الکلامی کے یہ معنی ہوگئے ہیں کہ توڑ مروڑ کر الفاظ کی ایسی نرالی نامانوس اور بے ضرورت ترکیبیں نکالی جائیں کہ شاعری عام لوگوں سے کالے کوسوں دور جا پڑے۔ اور اسمیں اصلی زندگی کی چھینٹ بھی نہ پڑے۔ ایک مخصوص طبقہ سمجھے یا نہ سمجھے اس قسم کے اشعار کے مزے لے۔ قادر الکلامی کی بڑی نشانی یہ ہے کہ گہرے سے گہرے بلند سے بلند مضمون کو سیدھے سادے الفاظ میں ادا کیا جائے اور اسکی بہترین مثال کبیر کا کلام ہے۔ اس بنئیے والے شعر کے ساتھ دوسرا شعر پڑھئے:۔

سائیں میرا بانیا سہج کرے بیوپار ۔۔۔ بن ڈانڈی، بن پالڑا، تول کرے سنسار

سائیں تجھ سے باہر کوڑی بھی نہ جائے ۔۔۔ جاکے سر پہ تو دھنی، لاکھوں مول کرائے

اس سے زیادہ دلمیں بیٹھ جانیوالا خیال اور اس سے زیادہ سادی زبان جو محلوں اور جھونپڑوں دونوں میں گھومے دلمیں اتر جائے ممکن نہیں"

تخلیقِ عالم

(از حضرت شارق ایرانی)

ہر ایک نغمۂ ہستی تھا مبتلائے سکوت
سکوں پسند تھا خود خالقِ فضائے سکوت

نہ آفتاب میں تھی روشنی نہ ماہ میں نور،
نہ کہکشاں میں حقیقت کا راز تھا مستور

نہ اس طرح تھی ثریا میں شانِ رعنائی
نہ اس طرح کبھی پروین میں تھی دل آرائی

ابھی فلک کا نشاں تھا نہ کچھ زمیں کا پتہ
ابھی خرد کو نہ تھا عقلِ اولیں کا پتہ

خود اپنی ذات سے گل اور چمن تھے ناواقف
گلوں کے حُسن سے گل پیرہن تھے ناواقف

ہنوز سبزہ تھا نشو و نما سے بیگانہ
ہرآب و رنگ سے تھا پاک حسنِ جانانہ

سمندروں کی روانی تھی محوِ خواب ابھی
فنا کے راز سے واقف نہ تھا حباب ابھی

یہ دلکشی نہ تھی ندی کے سنگپاروں میں
نہ یہ ترنّم دلکش تھا آبشاروں میں

ہنوز دل میں نہ تھا شعلۂ جنوں بیتاب
نمو پذیر نہ تھے خاک و باد و آتش و آب

غرض مناظرِ عالم ابھی حجاب میں تھے
تمام حُسن کے جلوے ابھی نقاب میں تھے

یکایک ایسی تجلّی ظہور میں آئی
کہ جس نے دہر کو بخشی حیات و رعنائی

رُخِ حیات کو نازِ کرم نے چمکایا
جمالِ ناز کو حسنِ قدم نے چمکایا

ہر ایک ذرہ میں اِک موجِ نور دوڑ گئی
ہر ایک قطرہ میں جانِ سرور دوڑ گئی

لباسِ شوق میں چمکی جو حُسن کی تنویر
تمام عالمِ امکاں ہوا ظہور پذیر

جہاں کو ملی رونق وجودِ آدم سے
صدائے حمد اُٹھی وسعتِ دو عالم سے

عدم نے ہست کی رنگیں قبا کو یوں پہنا
کہ حسن اپنے ہی جلوؤں سے خود تڑپ اُٹھا

فسونِ شب

(از مولوی سید ابو محمد ثاقب کانپوری)

الٹ دیتی ہے جب تاریکیِ شب اپنی چادر کو   تو اشیائے منور میں نہیں رہتی ہے تا
چھپا لیتی ہے منہ تاریک شب شبنم کی چادر میں   فنا ہو جاتی ہے خورشید کی سب جلوہ سا

ہجوم اس وقت ہوتا ہے خیالاتِ پریشاں کا   کہ جیسے طائرِ وارفتہ آئے آشیانے
تلاطم اس قدر ہوتا ہے دریائے تفکر میں   سکوں گویا میسر ہی نہیں سارے زمانے

ترے آتے ہی مٹ جاتی ہیں سب گرمیاں دن کی   کہ جیسے طائرِ وارفتہ اُڑ جائے نشیمن سے
خدا جانے کہ یہ جادوگری ہے شب کے دامن کی   کہ رخصت ہو گیا ہے رنگ و بو خود صحنِ گلشن سے

مگر اے شب ترے آنے سے یہ اک فائدہ نکلا   کہ جھوٹی لن ترانی اور نمائش اب نہیں
یہ ساری کشمکش تھی صبح کے دامن سے وابستہ   نہیں ہے اب فریبِ ناروا کی گرم بازا

سکوتِ شب سے ناحق ہے پریشانی تجھے ثاقب   کہ یہ قدرت کا اک انعام ہے راحت کا ساما
یہ خوابِ کامرانی ہیں اُسے آ کر سلا دے گی   کہ جو دن بھر کی محنت اور کشاکش سے پریش

موسمِ بہار کا آخری پھول

(از منشی گورسرن لال ادیبؔ لکھنوی۔ بی۔ اے۔)

گردشِ تقدیر نے بدلے مرے لیل و نہار — اب کہاں میں اور کہاں وہ لطف و امانِ بہار
ایک دن وہ تھے کہ میں تھا اور ہوائے خوشگوار — بادِ صرصر کے ہیں جھونکے آج وجہِ انتشار

اُڑ گیا ہے رنگِ رخ ہے بیکسی چھائی ہوئی
زندگانی نے وفا کی میری رسوائی ہوئی

بگڑ گئی ہے کیا کہوں کیسی زمانے کی ہوا — اڑ رہی ہے خاک صحنِ گلستاں میں جابجا
اب چمن میں نام کو ملتی نہیں بوئے وفا — اپنے بیگانے ہوئے کیا ہو کسی سے آسرا

جن سے امیدِ وفا تھی وہ ستمگر بن گئے
خار جو میرے محافظ تھے وہ نشتر بن گئے

موجبِ آزار ہے اپنی گراں جانی مجھے — اپنی حالت سے نہ ہو کیونکر پریشانی مجھے
چھوڑتے جاتے ہیں سب اعضائے جسمانی مجھے — ڈوب مرنے کو بھی اب ملتا نہیں پانی مجھے

ہوتی ہے وحشت یہ بربادی کے ساماں دیکھکر
دامنِ گلشن کو ہمرنگِ بیاباں دیکھکر

ذکر کیا اور دل کا خود اپنی نظر میں خار ہوں — ہمنشیں پھولوں کا تھا اب ہمنشینِ خار ہوں
کیا بتاؤں زندگی سے اپنی کیوں بیزار ہوں — دل میں یہ کانٹا کھٹکتا ہے کہ میں بیکار ہوں

زندگی رائیگاں پر دل میرا مائل نہیں
خاک جینے پر اگر جینے سے کچھ حاصل نہیں

یہ بھی کیا جینا کہ ہوں میں شرمسارِ زندگی　　ہو گیا نذرِ خزاں لطفِ بہارِ زندگی
کیا سناؤں میں زباں سے حالِ زارِ زندگی　　دیکھ لو ہے داغِ دل آئینہ دارِ زندگی

کیا کہوں بادِ حوادث سے ہوں کیسا بے قرار
آہ مشتاقِ فنا ہے میری چشمِ انتظار

جو کبھی آنکھوں نے دیکھا وہ زمانہ اب نہیں　　گلستاں میں سوزِ الفت کا فسانہ اب نہیں
طائروں کے لب پہ بھی رنگیں ترانہ اب نہیں　　مجھ کو بھی منظور بارِ غم اٹھانا اب نہیں

ہو الٰہی بارِ ہستی سے سبکدوشی مجھے
جلد ہو خاکِ عزیزاں سے ہم آغوشی مجھے

ذی حیات مُردے

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

لطفِ سخن

(خان صاحب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی)

ہلاکِ وہمِ فراق کیوں ہے، تجھے کچھ اپنی خبر نہیں ہے
تلاش جس کی ہے کب وہ دل میں برنگِ موجِ گہر نہیں ہے

ادب گہِ ناز میں حضوری بغیر دردِ جگر نہیں ہے
خیالِ عرضِ نیاز بے جا، مژہ لہو میں جو تر نہیں ہے

نسیمِ صبحِ بہار بنکر کسی کی نکہت سے آشنا ہو
ہوس کو پیغامِ بیخودی دے، وہ جلوہ مفتِ نظر نہیں ہے

مآل سے بے نیاز ہو کر طریقِ الفت میں گامزن ہو
اسی میں ہے رازِ دلکشی کا کہ ابتدا ہے خبر نہیں ہے

ادب شناسِ رہِ وفا ہوں نہ پوچھ کیا مدعا ہے تیرا
زبانِ مطلب سے آشنا ہو یہ عاشقی کا ہنر نہیں ہے

اٹھی جو مینا سے موجِ صہبا دلوں میں ڈوبی سرور ہو کر
نظر میں ابھری تو نور ہو کر نظر کو لیکن خبر نہیں ہے

بساط آرائیاں تو ایسی کہ لحظہ لحظہ نئی ہے دنیا
مگر یہ ہستی یہ رنگِ ہستی کہ پا ثباتِ شرر نہیں ہے

بنائے آشوبِ حشر ہو کر جگر سے مستانہ وار نکلے
وہ نالہ ہے ننگِ دردمندی جو سر بجیب اثر نہیں ہے

غرور تجھ سے ہے ناز تجھ سے یہ بزمِ راز و نیاز تجھ سے
حقیقتِ آئینہ ساز تجھ سے کہاں نہیں ہے کدھر نہیں ہے

کہا یہ ساقی نے راز مجھ سے رہین ذوقِ خمار بھی ہو
کہ فکر جب تک ہے کیف و کم کی یہ نشہ بے دردِ سر نہیں ہے

ورق زمانے کا ایسا الٹا کہ پر تکلف تھے جن کے بستر
ہوئے ہیں یوں خاک سے برابر کہ خشت بھی زیر سر نہیں ہے

ضیائے خورشید ذرہ پرور سے گوشہ گوشہ ہوا منور
بس ایک ہم ہیں وہ تیرہ اختر کہ جنکی شب کی سحر نہیں ہے

نہ چھیڑیئے گا نہ بولئے گا کہ اب ہے کچھ دل سے اور عالم
جسے رلاتے تھے آپ ہنس کر اثر وہ پہلا اثر نہیں ہے

(پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوقؔ)

ہزار نالے کئے ہیں ہم نے، مگر انھیں کچھ خبر نہیں ہے
الٰہی کیسا یہ سوزِ دل ہے کہ جس میں مطلق اثر نہیں ہے

ستم کے پردے میں بھی کرم ہے کئے ہیں در پردہ لطف و احساں
نگہ کرشمے دکھا رہی ہے مگر ہماری نظر نہیں ہے

لبوں پہ اُف تک نہ آنے پائے یہی تو ہے داد دل جلوں کی
فلک نہ ٹوٹا ہو جس کے سر پر کوئی بھی ایسا بشر نہیں ہے

ہمیں ہے شوقِ وفا پرستی انھیں ہے ذوقِ جفا شعاری
مآل پر عشق کے نظر کچھ ادھر نہیں ہے اُدھر نہیں ہے

وہ کیوں ہوں جور و ستم سے عاری ہے جوشِ وحشت سوا ہر دم
کہاں وہ جاتا ہے ہم کو لیکر ہمیں کچھ اس کی خبر نہیں ہے

غضب کیا ہے یہ باغباں نے وہ شاخیں کاٹی ہیں جو گھنی تھیں
ذرا تو دم لیتے جس کے نیچے کوئی اب ایسا شجر نہیں ہے

اُدھر خزاں کی ہے آمد آمد ادھر ہے صیاد بے مروت
کہاں کا اب آشیاں صفیرو ان چمن میں اپنا گذر نہیں ہے

ہزاروں پامال ہو رہے ہیں انھیں کے مارے وہ سو رہے ہیں
ادھر کی دنیا اُدھر ہوئی ہے مگر انھیں کچھ خبر نہیں ہے

درخت جتنے ہیں فصلِ گل میں پھل اپنے دنیا کو دے رہے ہیں
مگر وہ اک نخلِ آرزو ہے کہ جس میں آتا ثمر نہیں ہے

اُدھر وہ نازک مزاج ٹھہرے اِدھر میں ضبطِ فغاں کا عادی
خموش ہوں اُن کے آگے ایسا کہ جیسے دردِ جگر نہیں ہے

خبر بھی ہے تم کو شوق اپنی کٹے گا کیسے عدم کا رستہ
سفر بھی ایسا سفر کہ توبہ، اور اُس پہ زادِ سفر نہیں ہے

(راز ابو الفاضل راز چاندپوری)

بظاہر راہبر و بنکر، بباطن رہنما ہوکر
رہا میں ساتھ دنیا کے حقیقت آشنا ہوکر

یہ جلوہ، جلوۂ رنگیں۔ یہ صورت، صورتِ زیبا
کوئی دنیا کو کیا دیکھے گا تجھ سے آشنا ہوکر

یہ شانِ خود نمائی، جلوہ فرمائی جہاں تابی
مبارکباد، اِدھر بھی اک نظر مہر آشنا ہوکر

جزاک اللہ اے ساقی یہ صہبائے صفا پرور
رہونگا دہر میں اب سرخوشِ کیفِ وفا ہوکر

بڑے اہلِ نظر ہو ہمنشینو! واہ کیا کہنا
خبر ہے، کون تھا جو چھپ گیا جلوہ نما ہوکر

یہ مانا اہلِ عالم کی ریاکاری مسلّم ہے
مگر تم اُن سے ملتے ہو ہمیشہ بے ریا ہوکر

نہ وہ دنیا نظر میں ہے نہ وہ دنیا کی رنگینی
خدا معلوم کس عالم میں ہوں تجھ سے جدا ہوکر

بہت دشوار تھا لیکن تری شفقت تری رحمت
کہ تیرے آستاں پر آ گیا کافر آشنا ہوکر

یہ طرزِ شعر خوانی، رحم کر اربابِ محفل پر
تجھے کیا ہو گیا اے راز آخر خوشنوا ہوکر

(مسٹر جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی بی۔اے)

مبتلا دل اگر نہیں ہوتا
زیر بار دگر نہیں ہوتا

حسن گر خود نگر نہیں ہوتا
قصۂ خیر و شر نہیں ہوتا

کاش ذوقِ نظر نہیں ہوتا
عشق کا دردِ سر نہیں ہوتا

آنکھ پھرتے ہی پھر گیا عالم
ورنہ زیر و زبر نہیں ہوتا

تکیہ کر لوں ترے توکل پر
نہیں ہوتا مگر نہیں ہوتا

سوکھتا ہے غمِ خزاں سے جہاں
خشک غم کا شجر نہیں ہوتا

خندہ زن دل کے زخم ہوتے ہیں
پاس جب چارہ گر نہیں ہوتا

ہے رسائی مری وہاں کہ جہاں
عقل کا بھی گذر نہیں ہوتا

دردمندوں کا دل نکلتا ہے   سنگدل پر اثر نہیں ہوتا

(جناب فرخ بنارسی)

کاشفِ راز ہو ایسی کوئی تدبیر نہیں   یہ ہے وہ خواب جو شرمندۂ تعبیر نہیں
حسنِ صورت کا مرقع ہے یہ دنیا لیکن   تری تصویر سے ملتی کوئی تصویر نہیں
ہوں گے آزاد نہ مر کر بھی اسیرانِ جہاں   قیدِ ہستی ہی کچھ ان کے لئے تعزیر نہیں
نا امیدی تجھے اللہ سلامت رکھے   اب مری آہ بھی منت کشِ تاثیر نہیں
دل سے جاتا ہی نہیں شوق گنہگاری کا   لذتِ عفو بہ اندازۂ تقصیر نہیں
بسر کرتے ہیں بیابادیہ پیمائے جنوں   یارب ان کے لئے اب کیا کوئی زنجیر نہیں
نیک و بد دیکھ کے سرگرمِ عمل ہو غافل   کوئی بھی راز پسِ پردۂ تقدیر نہیں
مشربِ عشق میں ہر حال میں معصوم ہے حسن   مانعِ رنجش بیجا کوئی تدبیر نہیں
جلوہ گر پیکرِ خاکی میں ہے اک حسنِ لطیف   گرد آلود اب آئینۂ تصویر نہیں
عشق نے قیدِ تعین سے کیا ہے آزاد   اب مرے پاؤں کے قابل کوئی زنجیر نہیں
المدد ہوش ابھی ہے ترے دیوانے کو   دست وحشت جسے توڑے یہ وہ زنجیر نہیں
وجہِ آلام گرفتاری خاطر معلوم   یعنی افسانۂ غم کی کوئی تفسیر نہیں
لوحِ تربت پہ یہ ہے میری یہ مصرعِ فرخ   کوئی تعمیر بجز حسرتِ تعمیر نہیں

(حضرت بسمل الہ آبادی)

ہمیں کچھ جانتے ہیں قدر اپنے داغِ فرقت کی   یہ سرمایہ ہے الفت کا یہ پونجی ہے محبت کی
اندھیری رات کے روشن ستارے خضرِ منزل ہیں   حقیقت میں انہیں سے راہ ملتی ہے حقیقت کی
کوئی سمجھا نہ یہ اب تک محبت کس کو کہتے ہیں   ہوئیں شرحیں ہزاروں رنگ سے لفظِ محبت کی
قفس میں رہ کے بھی بھولے نہ اپنا آشیاں اب تک   چمن والو اسی سے ہو گئی تصدیق الفت کی
محبت کا اثر دل پر نہ ہو یہ ہو نہیں سکتا   کسی دن آپ کو بھی آرزو ہوگی محبت کی
زمیں کے ذرّے ذرّے میں چمن کے پتّے پتّے میں   نظر آتی ہے اربابِ نظر کو شان قدرت کی

تڑپتا لوٹتا رہتا ہوں میں ہر وقت اے بسمل
اسی سے جان لو کتنی تمنا ہے شہادت کی

علمی نوٹ اور خبریں

حکومت صوبہ متحدہ کی سالانہ رپورٹ بابتہ ۳۱-۱۹۳۰ء کے بموجب صوبہ آگرہ و اودھ سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی تعداد ۶۲۷ ہے اس سے پہلے یہ تعداد ۶۰۰ تھی! انمیں سے چھبیس روزانہ، ۹ ہفتہ میں دو بار اور دوسو دو ہفتہ وار اخبار اور دوسو تریسٹھ ماہانہ رسالے ہیں۔ اشاعت کے اعتبار سے سب سے زیادہ یعنی ۱۹۱ پرچے الہ آباد سے شائع ہوتے ہیں اسکے بعد لکھنو کا نمبر ہے جہاں سے ۴۰ پرچے شائع ہوتے ہیں باقی شہروں کی تعداد یہ ہے: کانپور سے ۵۴ بنارس سے ۵۳، آگرہ سے ۴۸، میرٹھ سے ۲۷، علیگڈھ سے ۲۴، اٹاوہ سے ۲۴ گورکھپور سے ۱۰، مراد آباد سے ۱۵، سہارنپور سے ۱۵، متھرا سے ۱۴، بجنور اور مظفر نگر میں ہر ایک سے"

ان میں سے چوراسی اخبارات انگریزی میں، ۲۵۳ ہندی میں اور ۲۲۵ اردو میں شائع ہوتے ہیں سینتیس اخبارات کی تعداد اشاعت دو ہزار یا اس سے زیادہ ہے باقی سب کی اس سے کم۔

اس سال کتابی مطبوعات کی تعداد پچھلے سال کے ۴۲۴۴ کے مقابلہ میں ۵۶۴۳ رہی انمیں سے ہندی کتابوں کی تعداد دو ہزار اٹھاون اور اردو کتابوں کی تعداد پانچسو ساٹھ ہے انگریزی کی تینسو ایک سنسکرت کی ایکسو تین نیپالی زبان کی اکیس بنگالی کی اکیس فارسی کی نو، مارواڑی کی چار، رومن ہندوستانی کی چار، گڑھوالی تامل اور گجراتی زبان کی دو دو کتابیں شائع ہوئیں اور مرہٹی، گورکھی زبان کی صرف ایک ایک کتاب طبع ہوئی۔

کل مطبوعات میں دو ہزار دوسو اٹھتر نثر اور ۱۲۰۷ نظم میں تھیں، مگر انمیں بہت سے مطبوعات بہت ہی معمولی قسم کے تھے اور بہت سے تحریک ستیہ گرہ کے پمفلٹ بھی اس تعداد میں شامل ہیں، اردو مطبوعات میں عہد مغلیہ میں فارسی زبان کی تاریخ اور اردو ادب کی تاریخ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اور ہندی میں بابو جے شنکر پرشاد بنارسی کے تاریخی ڈرامے کی تعریف کی گئی ہے، ان ڈراموں سے ہندی ادب میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔

قلمرو دکن میں بھی اعلیحضرت نظام کی سرپرستی علوم و فنون کی بدولت تصنیف و تالیف کا شوق ترقی پر ہے چنانچہ پچھلے سال وہاں چارسو نوے کتابیں شائع ہوئیں، اس سے پہلے سال کی مطبوعات کی تعداد صرف ۳۹۵ تھی گذشتہ سال کی کتابوں کی تفصیل یہ ہے:۔

الٰہیات و اخلاق	۵۹	قانون	۱۹	نظم و ڈراما	۱۴		
قصص	۱۵	حفظان صحت	۵	تعلیمی	۴۵		
ادب	۲۹	دینیات	۲۷	سوانح	۶		
ناول	۲	شعر و سخن	۱۰	معاشرت	۱		
سائینس	۱	انجینری	۴	تصوف	۱	متفرق	۱۵۱

اس کے علاوہ دارالترجمہ سرکار عالی نے سال کے دوران میں دس کتابیں شائع کیں، تعداد اور نوعیت دونوں کے لحاظ سے یہ کارگزاری حیدرآباد دکن کیلئے ہر آئینہ قابل مبارکباد ہے۔

اعلحضرت نظام دکن نے الہ آباد کے انگریزی اخبار اسٹار کو تین سال تک پانچہزار روپیہ سالانہ کی امداد منظور فرمائی ہے ہز اگزالٹیڈ ہائینس کو اپنے قلمرو کی ادبی ترقی سے بھی خاص دلچسپی ہے چنانچہ حال ہی میں ممدوح نے حیدرآباد کے زنانہ رسالہ "ہجولی" کے پرچے ملاحظہ فرماکر خود اپنے دست مبارک سے چند ہدایتیں تحریر فرماکر مدیرہ ہجولی کو ارسال فرمایں۔ اعلحضرت کی تحریک خاص سے ا بشہزادہ ولیعہد بہادر کی دولھن صاحبہ پاشاہ ملکہ نے بھی اس رسالہ کی سرپرستی قبول فرماکر اسمیں مضامین لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ہم اس قدر افزائی پر منتظمان رسالہ ہجولی کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس عالیشان واقعہ کے بعد یہ رسالہ ملک و قوم کے لئے پہلے سے بھی زیادہ مفید ثابت ہوگا۔

ہمارے معزز دوست خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی نے دقیقہ رس نام سے ایک رسالہ تصنیف فرمایا ہے جس میں اردو نثر نویسی کے قواعد مرتب کئے ہیں عنقریب ہی یہ کتاب شائع ہوگی

مولانا محمد علی صاحب مرحوم کی سوانحعمری جو جامعہ ملیہ دہلی کے زیر اہتمام تیار ہو رہی تھی مکمل ہوگئی ہے۔ اسکی طباعت کا کام اگلے ماہ کو شروع ہوجائیگا اور آخر اکتوبر تک یہ کتاب شائع ہوجائیگی۔

جامعہ ملیہ کی طرف سے "جامعہ" اور "پیام تعلیم" کے نام سے دو قابل قدر رسالے شائع ہو رہے ہیں پچھلے ماہ سے اسکے اہتمام میں ایک اور مختصر سا اشتہاری پرچہ "کتاب نما" کے نام سے جاری ہوا ہے، اسمیں صرف وہ مضامین درج ہونگے جو کتابوں اور مضمون سے متعلق ہوں یا اردو کی خدمت کرنیوالی انجمنوں کی کارگذاری پر روشنی ڈالتے ہوں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ ابھی تو "کتاب نما" کی حیثیت زیادہ تر اشتہاری ہے لیکن ہمکو امید ہے کہ جلد ہی اس کے حجم و مضامین میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا اور اس کے ذریعہ اردو کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوجائیگی۔ اُردو میں نئی کتابوں کے خریداروں کے لئے ایک قابل وثوق رہنما کی سخت ضرورت ہے، کیا اچھا ہو "کتاب نما" کے ذریعہ یہ کمی رفع ہوجاے۔

اپنے گلے اور پھیپھڑوں کو

برساتی موسم کے خطرات سے محفوظ رکھئے

ٹھنڈی سردی لگنے سے بچے رہیئے۔ اپنے پھیپھڑوں کی حفاظت کیجئے کیونکہ برسات کے موسم میں ان کو مزید خطرات درپیش رہتے ہیں۔ تمہارے گلے یا سینہ میں ذرا سی تکلیف بھی محسوس ہو تو پیپس کی حیرت انگیز ٹکیوں میں سے دو ایک منہ میں ڈال لیجئے۔

پیپس سے طبی حیثیت سے مفید و طاقتور دھواں نکلتا ہے جو سانس پہنچوانے تمام اعضا کو تکلیف دیکر انہیں مضبوط بنا دیتا ہے۔ مضر صحت جراثیم کی بدولت جو کھانس اور سوزش حلق میں پیدا ہو جاتی ہے پیپس کی گولیاں اس سے آپکو محفوظ رکھیں گی۔ انکی بدولت کھانسی زکام۔ ٹھنڈ لگنے کی سوزش اور برانکٹیز وغیرہ شکایتیں دفع ہو جائینگی۔

سب انگریزی دوافروش پیپس کو ایک روپیہ فی شیشی کے حساب سے فروخت کرتے ہیں۔

ان عجیب و غریب سانس کے ساتھ اثر کرنے والی ٹکیوں کو استعمال کیجئے۔

پیپس Peps

ادھر کون آرہا ہے؟

یہ ایک سوال ہے جو رات کے چلنے والوں سے بُرے بھلے کا شک دور کرنے کے لئے پولیس کا نسٹیبل پوچھتا ہے!

لیکن ہماری مندرجۂ ذیل دوائیوں کی بابت کسی کو ذرا بھی شک کا موقع نہیں ہر ایک استعمال کرنیوالے کو انکی بابت پوری اور خاطر خواہ تسلی ہو گئی ہے۔ اگر آپ نے ابھی تک تجربہ نہیں کیا۔ تو اب ضرور تجربہ کیجئے۔

آتنک نگرہ گولیاں۔ تبض۔ بدہضمی۔ خون اور دھاتو مردمی کی خرابی و کمی جریان۔ احتلام۔ سرعت۔ سدقت۔ وغیرہ کو دور کرکے اعلیٰ درجہ کی طاقت و توانائی حاصل کرتی ہیں۔

چندر پربھا گولیاں۔ سوزاک۔ جلس بول۔ اور عورتوں کے ہر قسم کے امراض مخصوصہ کی لاثانی دوا ہے۔

جور انتک گولیاں۔ ہر قسم کے بخار کے دفع کرنے میں پوری طرح فائدہ مند ثابت ہوئی ہیں۔

بال متر گولیاں۔ بچوں کے جملہ امراض کو نابود کرکے تندرست و توانا بناتی ہیں۔

کاسانتک گولیاں۔ ہر قسم کی کھانسی اور دمہ کے لئے اکسیر علاج ہے۔

لعوق دمہ۔ دمہ کے حملوں کو چند منٹوں میں دور کرنے کی لاثانی دوا ہے۔

قیمت ہر ایک دوا فی ڈبیہ صرف ایک روپیہ پانچ ڈبیہ کی دوا چار روپیہ میں علاوہ محصولڈاک۔

صحت اور تندرستی کی نعمت راہ راست کی افتتاد اور نہایت عمدہ مضامین سے مزین کتاب کام شاستر بالکل مفت طلب فرمایئے

ویدشاستری منی شنکر گووندجی۔ جام نگر۔ (کاٹھیاواڑ)

کانپور ایجنٹ میسرس عبد الکریم اینڈ سنس۔ مشن روڈ۔ کانپور

سائیکل پر دنیا کا سفر
۲۲۰۰۰ میل کی سیر و سیاحت میں
زمبک کا استعمال ضروری ثابت ہوا

موٹر سائکل پر دنیا کا سفر کرنیوالے دو اولوالعزم نوجوانوں مسٹر جے گل اور ڈبلیو۔ ٹی۔ اسٹیونس نے اپنے مسلسل اور عدیم المثال سفر کی داستان بیان کرتے ہوئے زمبک کی بڑی مدح سرائی کی ہے۔ مسٹر گل لکھتے ہیں کہ یورپ۔ ہندوستان۔ ریاستہائے ملایا۔ اسٹریلیا لناڈا میں سفر کرتے ہوئے زمبک سے ہمکو بروقت امداد ملی۔ اسی نے ہمارے جسم کی جلد سخت سے سخت آب ہوا میں بھی تندرست رکھی اسکی بدولت دھوپ کی تمازت سے جسم پر دانے نہیں پڑنے پائے۔ کیڑے مکوڑوں کے کاٹنے کا کوئی اثر نہیں ہونے پایا اور آماس سے بھی حفاظت رہی۔ زمبک سے بہت سے چھوٹے چھوٹے زخم جو دوران سفر ہو گئے فوراً اچھے ہو گئے اور ان کا زہر جسم میں پھیلنے نہیں پایا۔ زمبک سے ہم نے دیسی باشندوں کے بہت سی خطرناک جلدی امراض بھی اچھے کئے۔ ہر موسم اور ہر ملک میں زمبک اچھی حالت میں رہتا ہے اور بہت تھوڑی جگہ اسکے لئے درکار ہوتی ہے اور ہمارے جیسے سفر کیلئے زمبک ایسی نہایت ضروری شے ہے۔

زمبک ایک نہایت خالص اور اعلیٰ درجہ کا نفیس مرہم ہے جو بیش قیمت جڑی بوٹیوں کے روغن اور جوہروں سے بنایا گیا ہے۔ آپ اس پر پورا بھروسہ رکھئے۔ چاقو کے کاٹ۔ زخم۔ آگ سے جلنے۔ زہریلی زخموں کیڑے مکوڑوں کے کاٹنے۔ گرمی دانے۔ خارش کھجلی۔ داد۔ اگزیما۔ بواسیر وغیرہ کو تسکین دینا اور اچھا کرتا ہے اسکے ہر قسم کے حیوانی چربی سے پاک صاف ہونیکی ضمانت کیجاتی ہے۔ سب انگریزی دوا فروش زمبک کو ایک روپیہ فی ڈبیہ کے حساب سے فروخت کرتے ہیں بڑی ڈبیہ کی قیمت سوا دو روپیہ ہے۔

ایجنٹ :۔ میسرز کے۔ بی۔ محمد سعید اینڈ کو۔ مسٹن روڈ۔ کانپور۔

زمبک

Zam-Buk

دنیائے شاعری میں
ایک بے بہا اضافہ
شاعر کی راتیں

یہ حضرت جوش ملیح آبادی کی ان معرکۃ الآرار نظموں کا مجموعہ ہے جو موضوعِ شب سے متعلق ہیں اور جن کے مناظر و کیفیات کی مصوری میں جناب جوش اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ نہایت دیدہ زیب کتابت و طباعت کے ساتھ بکمال آب و تاب شائع ہو چکا ہے اور مندرجہ ذیل پتہ پر دستیاب ہو سکتا ہے

قیمت علاوہ محصولڈاک عہ؍

بعجلت ممکنہ طلب فرمائیے ورنہ طبع دوم کا انتظار کرنا پڑے گا

اعجاز الحق قدوسی، ناملی جدید مکان ۱۹۷ دکن
حیدر آباد دکن

مرتبہ:۔ دیا نراین نگم، بی۔اے

جلد ۵۹ | جولائی سنہ ۱۹۳۲ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

تصاویر: سر ربیندر ناتھ ٹیگور۔ سر سی۔ وی۔ رمن۔ ہز ایکسلنسی نواب سر سکندر حیات خاں قائم مقام گورنر پنجاب۔ شہزادی فرطیس بانو پروین کجکلاہ

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت سالانہ ممالک غیر سے مع محصول ششماہی مع ۳ ہندوستان سے ششماہی قیمت تین روپیہ

علمی ذوق رکھنے والے حضرات مندرجہ ذیل کتابیں ضرور منگائیے

بزم خیال

...س میں اردو اور فارسی شعرا کی مجالس ...ے لطائف و ظرائف اور برجستہ گوئی و ...ضر جوابی کے نمونے جمع کئے گئے ہیں جو ...ش مذاق حضرات کی تفریح کا بہترین ...امان ہے - قیمت ایک روپیہ

ہندو تیوہاروں کی اصلیت

...کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب بی ...ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بستی نے ...ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور انکی جغرافی ...یت نہایت واضح اور آسان زبان ...میں لکھی ہے اسکے ساتھ ہی ہندوؤں کا ...تی اور تمدنی انتظام اور ہندو تیوہاروں ...ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے - اردو ...شن کی قیمت مجلد ۹ ہندی ایڈیشن ...مت جس میں اردو ایڈیشن کے مقابلہ میں ...فصیل دیگئی ہے قیمت ۱۲

خاک پروانہ

منشی پریم چند کے تازہ ترین چودہ منتخب مضامین کا مجموعہ - پریم چند صاحب کے افسانے کسی تعارف کے محتاج نہیں - قیمت ایک روپیہ

انتخاب اودھ پنچ

اخبار اودھ پنچ لکھنؤ نے ان مضامین کا مجموعہ جو ۱۸۷۷ء میں اسمیں شائع ہوئے تھے علاوہ ازیں بہت سا تفریح کا سامان بھی موجود ہے قیمت ۸

خیالات عزیز

مجموعہ مضامین مولوی عزیز مرزا صاحب جس کی باضابطہ رجسٹری کیگئی ہے حجم ۲ سو صفحات ٹائیٹل خوشنما رنگین ہے لکھائی چھپائی اعلیٰ مع تصویر مصنف قیمت ۶

بہرام کی رہائی

نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری کے بعد اسکا پڑھنا نہایت ضروری ہے - قیمت ۱۲

گلزار داغ

فصیح الملک جناب داغ دہلوی کا مشہور و مقبول دیوان ہے جو حال میں حسن و خوبی کے ساتھ شائع ہوا ہے داغ صاحب کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں قیمت صرف ۱۲

مثنوی سحر

یعنی شکنتلا و دشینت منظوم حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز اول ایڈیشن کی قیمت ۶ دوسرے ایڈیشن کی قیمت جس کی مصنف نے نظر ثانی بھی کی ہے قیمت صرف ۸

مرقع ادب

حصہ اول و دوم مرتبہ جناب صفدر مرزا پوری اس میں ہندوستان کے مشہور انشا پرداز شعرا کے وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں جو انھوں نے اپنے احباب وغیرہ کو لکھے ہیں

حصہ اول ۱۲ حصہ دوم ۶

پریم چند کی تازہ تصانیف

بیوہ

اس کتاب میں ایک بیوہ کے دردناک واقعات لکھے گئے ہیں اور ان ترغیبات کا ذکر کیا گیا ہے جو ایک بیکس بیوہ کو آزمائش میں ڈالتے ہیں ایکساتھ ہی اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کیگئی ہے کہ بیواؤں کیلئے کس قسم کی زندگی بہترین ہے - حجم ۲۵۰ صفحات قیمت ۱۲

ملنے کا پتہ :- مینیجر زمانہ بک ایجنسی کانپور

زمانہ

جلد ۵۹ — جولائی سنہ ۱۹۳۲ء — نمبر ۱

راجپوت مصوّری

(۱)

(از مسٹر جگدیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی - بی - اے)

مغلوں کے مرقعوں میں اکثر و بیشتر ایسی تصویریں نظر آجاتی ہیں جن کا طرزِ عمل بہت کچھ مشابہت کے باوجود بھی ان کی روش عام سے علیحدہ ہے۔ لیکن بعض اہل الرائے کی غلط فہمی کے باعث وہ بھی مغل مصوّروں کی قلمکاری کی رہین منت سمجھی جاتی رہی ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ راجپوت مصوّری کی بنیادیں راجپوتانہ، پنجاب اور عرش پیما ہمالہ کے وسیع و عریض دامن میں مغلوں کے سنہ ورود سے بہت پہلے مستحکم ہو چکی تھیں۔

راجپوت قلم کے کارنامے خالص ہندو وضع قطع کے علمبردار ہیں۔ اور مختلف پہلوؤں سے اس حقیقت کے کفیل و ضامن ہیں کہ راجپوت مصوروں کو بودھوں کی نسل و نسب سے براہ راست تعلق ہے۔ حالانکہ مذہبی عقائد میں انھیں اپنے مورثوں سے گو نہ اختلاف ہے۔ ایلورا کے غاروں کی مورتوں وغیرہ کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۶۰۰ء تک بودھ مصوّر پتھریلی دیواروں پر اپنے مخصوص رنگ میں گلکاریاں کرتے رہے۔ اس تسلسل میں تقلیب روش کے سوا کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی

سنہ ۷۰۰ء لغایتہ سنہ ۱۱۰۰ء اور اس کے بعد تک پتھر کی تراشی ہوئی چٹانوں پر مصوّر برابر اپنا زور قلم دکھلاتے رہے۔ ان کے انداز التام میں اجنتہ کے کاریگروں سے بیحد مشابہت ہے۔ کیلاش

کا مندر اور بہت سے غار جو گنیش لین (Ganesa Lena) کے نام سے موسوم ہیں انھیں کی تخئیل رنگین کی کا نتیجہ ہیں۔ جین (Jaina) نامی غاروں میں بھی ایسے نمونے بکثرت موجود ہیں۔ شاید اپنی بے پایاں رنگینی ہی کی بدولت وہ "اندر سبھا" مشہور ہیں، اور غالباً [illegible]ء سے [illegible]ء تک کا حاصلِ عمل ہیں۔

کیلاش کے مندر کے اُن دروازوں کی تصویریں جن کا رخ جنوب اور مغرب کی جانب ہے اپنی نظیر آپ ہیں۔ اور اپنے خالق کی کاوشِ تخلیق کے حسین ترین نمونے خیال کئے جاتے ہیں۔ مندر کے اندرونی حصہ میں حسن و عشق کی معرکہ آرائیوں کے علاوہ جنگ و جدل کے خونیں مناظر بھی دکھائے گئے ہیں۔ سواروں کے برق خرام گھوڑے اس خوبصورتی سے بنائے ہیں کہ جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے خود ان کے بشرہ سے راجپوت قلم کا اچھوتا انداز ٹپکا پڑتا ہے۔ ایلورا کے غاروں کے قرب و جوار کے علاقہ میں حال ہی میں ایک کتبہ برآمد ہوا ہے جس پر "پرمار" اور "مالوہ" وغیرہ الفاظ کندہ ہیں۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ایلورا کی مصوری کا راجپوتوں سے کچھ نہ کچھ علاقہ ضرور ہے۔

گنیش لین کی تمام تر صناعیاں پُرانوں (पुराण) کی روایتوں سے مستنبط ہیں اور زوال آمادہ فنِ تصویر کا نقشہ پیش نظر کرتی ہیں۔ جین نامی غاروں کے مماثل مصوری کی اس کیفیت کا آئینہ ہیں جبکہ وہ بسرعت پستی کی جانب گامزن تھی۔ ان نقوش کو دیکھکر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے مصوروں کے خیال و عمل میں کوئی خاص جدت نہ تھی لیکن گجرات اور (Kanada) کے مندروں کی صناعی اس کلیہ سے بالاقتضائے حق مستثنیٰ ہے۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ جین آرٹ کے پہلو بہ پہلو راجپوتانہ اور گجرات میں ایک دوسرا آرٹ بھی رائج تھا جس کا اندازِ عمل (Style) جین مصوری سے بہت کچھ ہمرنگ تھا اور جو بلاشک جین اور راجپوت مصوروں کے اختلاط باہمی کا نتیجہ تھا۔ جے پور، جودھپور، اودے پور اور بیکانیر وغیرہ ریاستوں کے محلات کی دیواریں اب بھی ان تماثیل کے دم قدم سے مزیّن ہیں جو اس آرٹ کی تفاصیل کو بخوبی ظاہر کرتی ہیں لیکن مسٹر مہتا کو یہ رائے صائب نظر نہیں آتی اور جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا جاچکا ہے انھیں جین آرٹ کے وجود سے بھی انکار ہے۔ تاریخ بتا رہی ہے کہ بدھ اور جین مذاہب اگر ایک دوسرے کے رقیب نہیں تو ہم عصر تو ضرور ہیں اور ان میں ایک حد تک اصولی یگانگت بھی موجود ہے۔ پھر یہ امر کب قرینِ قیاس ہے کہ جب مصوری رسول ایک فرقہ کی تبلیغی سرگرمیوں کا کامیاب آلۂ کار رہی ہو تو دوسرے نے اس طرف مطلق التفات نہ کیا ہو۔ تاہم مسٹر مہتا کا یہ کہنا بالکل حق بجانب ہے کہ بعض وہ مناظر جو عام طور پر

جین آرٹ کی تخلیق سمجھے جاتے رہے ہیں راجپوت صناع کے موقلم کی آفرینش ہیں۔

جیمز ایچ۔ کزنس (James H. Cousins) کے رائے میں راجپوت اور بودھ مصوروں میں مرکزی فرق یہی ہے کہ اول الذکر کا زور قلم صفحۂ قرطاس پر ختم ہوا ہے اس لئے اس نے چھوٹے پیمانہ پر کام کیا ہے، لیکن آخر الذکر نے دیواروں سے سر مارا ہے اور اسی لئے بڑے پیمانہ پر اپنے جوہر دکھائے ہیں حالانکہ راجپوت اسکول کی قدامت کا ہر طرف سے اعتراف کیا جا چکا ہے لیکن سنہ ۱۹۱۰ء سے قبل شاید کسی کو اس کا احساس نہ ہوا تھا۔ اس سال ہیول، ڈاکٹر ابنیندر ناتھ، ڈاکٹر کمار سوامی اور مسٹر او۔سی گنگولی نے تجسس بسیار کے بعد راجپوت مصوری کے وجود کے نقوش کی نشان دہی کی اور ۱۹۲۴ء میں جے پور آرٹ اسکول کے پرنسپل دربار سے چند عجیب وغریب تصویریں لکھنؤ کی نمائش میں لائے۔

امن وعافیت کی ان ساعتوں میں جبکہ چار سو خوش حالی و فارغ البالی اور صلح و آشتی کے راگ گائے جا رہے تھے راجپوت اسکول کی بنیاد رکھی گئی، اور جے پور اس کا مرکز و مرجع قرار پایا۔ جہاں سے یہ صنعتِ رنگین نئے انداز میں منزل بہ منزل دہلی آگرہ اور دور و نزدیک کے دیگر مقامات تک جا پہنچی۔

اصطلاحی نقطۂ نظر سے راجپوت اور مغل مصوری کا فرق نمایاں کرنا چنداں دشوار نہیں۔ مغل مصور جیسا کہ خود اس کی وجہ تسمیہ سے ظاہر ہے، ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں شاہی دربار سے متعلق رہا ہے یہی وجہ ہے کہ مغلوں کی تمام تر مساعی انفرادی پہلو لئے ہوئے ہیں۔ جدول کی گلکاریاں متشکل افراد کی احدیت ان کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ لیکن راجپوت مصور مجلسی زندگی کا عادی عامۃ الناس میں رہ کر ان کے لئے کام کرنا اور ان کی تفریح گاہوں کی زینت و آرائش کا سامان فراہم کرنا کا شعار ہے۔ اسی لئے اس کی دنیائے تخیل اجتماعی رنگ میں ڈوبی ہوتی ہے۔ واسارتی (Vasari) ایک راجپوت مصور کے بارے میں جو Andrea del Castagno کا اتالیق تھا رقمطراز ہے کہ "وہ دہقانی صناعوں میں سے تھا جو قلیل اجرت پر مزارعین کے لئے تصویریں بنایا کرتے تھے۔"

مغل مصور مذہب سے قطعاً بے نیاز تھے مگر راجپوت مذہب کے دائرۂ عبودیت سے کبھی نہیں ہوتے اور بقول مسٹر اجیت گھوش ان کے کرداروں (Charachters) میں خود ایک روح حلول کر جاتی ہے، چنانچہ کرشن لیلا، راگ مالا، اور راس لیلا کے فرحت اثر مناظر اس دعویٰ کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ لازوال محبت کے کیف سرمدی میں سرشار رادھا خلاق دو عالم کرشن سے نوازی کر رہی ہیں، دریا کی سنہری موجیں، چاند کی روپہلی کرنیں ایک عجیب دیوانگیِ عشق سے

رقصاں ولرزاں ہیں، بیل بوٹے، پھول پتے، گردو پیش کی معنبر فضا غرض سارے کا سارا ماحول تلاطم خیز بحر ترنم و تغزل میں مستغرق، فردوس نظر بن کر رہ گیا ہے۔ یہی وہ دلدوز سین ہیں جو راجپوت مصور کو مغلوں سے ممتاز کرتے ہیں اور جنھیں دیکھ کر آنکھوں پر لافانی محبت کا غیر متناہی نشہ اور دل پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

مغلوں کے عہد میں راجپوت مصوری نے پھر رنگ بدلا، چنانچہ جے پور وغیرہ ریاستوں کے شاہی محلات کے نقوش کے دامنِ رنگین پر اب بھی چینی و ایرانی اثرات صاف نمایاں ہیں۔ لیکن اس سے قبل اور بودھ مصوری کے اختتام و زوال کے بعد فنِ تصویر کی کیا کیفیت رہی؟ یہ کسی کو معلوم نہیں، کہا جاتا ہے کہ ہندو مذہب کی تلقین کے ساتھ بودھوں کے عقائد اور مصوری جیسا فنِ رنگین سب کچھ نقش باطل کی طرح نابود ہو گیا۔ اور اس کی جگہ شیو اور وشنو کی پوجا، صنعتِ تعمیر اور بت تراشی نے لے لی۔ لوگ روز بروز تصویر سازی سے بے نیاز ہوتے گئے، اہلِ فن کی تمام تر توجہ مندر کی تعمیر اور سنگی اصنام کی تراش پر مرکوز ہو گئی۔ رفتہ رفتہ لوگ پچی کاری کی جانب مائل ہوتے گئے، اور اب شاذ و نادر ہی کوئی مصوری کی طرف رجوع ہوتا تھا۔

بت پرستی کے اس رواج عام نے تو فن تصویر کا گلا ہی گھونٹ دیا تھا لیکن خوش قسمتی سے اُسے قدامت پسندی کے دامن میں پناہ مل گئی۔ عہدِ مغلیہ سے قبل راجپوت مصوری کا غالباً اوائل عمری کا زمانہ تھا اور اس عہد کے نمونے جینیوں کے پندرھویں صدی کے قلمی نسخوں کے علاوہ کہیں دستیاب نہیں ہوتے۔ لیکن اس قلیل ذخیرہ سے بھی مطلب برآری نہیں ہوتی، اور راجپوت اسکول کی ابتدائی تاریخ اسی طرح تاریکی کے کلبۂ احزان میں مستور رہتی ہے۔ ہاں راجپوت اسکول کے بعض۔ کارنامے جو بلاشبہ اکبر کے دورِ اقتدار سے بہت پہلے ظہور پذیر ہوئے ہیں خال خال نظر آ جاتے ہیں، لیکن ان کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کے ذرائع بالکل مفقود ہیں۔

جب مشہور عرب محمد قاسم نے سندھ پر یورش کی تو راجپوت صناعوں کا ایک وفد فاتح کے حضور میں اس کی شبیہ اتارنے کی درخواست لیکر باریاب ہوا۔ یہ واقعہ ۷۱۲ء کا ہے، اور اس سے ثابت ہے کہ ان دنوں ملک کے گوشہ گوشہ میں راجپوت مصوری کا سکہ رواں دواں تھا اور وہ ترقی کے انتہائی مدارج طے کر چکی تھی۔ مغلوں نے بھی اپنے عہد حکومت میں راجپوت مصوروں کی فراخ دلی کے ساتھ سرپرستی کی، جس سے ان کی روشِ کہنہ میں عالمگیر تبدیلی واقع ہوئی اور اسی بنا پر مغل اسکول کو اس قدر فروغ نصیب ہوا۔ لیکن جونہی عنانِ حکومت اورنگ زیب کے

ہاتھوں میں گئی سارے صناعوں کے سر سے حکومت کا دستِ شفقت ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا اور مصور تو ایک دم یتیم ہو کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ اسی پریشانی و درماندگی کے باعث راجپوت مصوری کے مختلف اسکولوں کا ظہور ہوا۔ اور بعض اساتذۂ کمال لکھنؤ، پٹنہ، بنگال، لاہور، کشمیر اور حیدر آباد دکن جیسے دور دراز مقامات میں جا کر آباد ہو گئے۔

سب سے پہلے جے پور یا راجستھانی قلم کی بنیاد پڑی، لیکن چونکہ والیٔ جے پور مدتوں برسرِ پیکار رہے اور قومی آزادی کے لئے مسلمان بادشاہوں سے برابر تیغ آزمائی کرتے رہے اس لئے فنِ تصویر کے عروج وارتقا کا سدِّباب ہو گیا۔ دہلی، آگرہ اور لاہور کے مصور عرصہ سے اپنے اپنے مخصوص رنگ میں دادِ فن دیتے چلے آتے تھے لیکن جے پور اسکول کی بنیاد پڑتے ہی انھیں راجپوتوں کے زورِ قلم کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا، حالانکہ اس سے پیشتر بھی ان پر راجپوتی رنگ غالب ہو چکا تھا مگر اب انکی نس نس میں راجپوتی انداز سرایت کر گیا۔

راجپوت اسکول کی اہم ترین شاخ کانگڑہ اسکول یا پہاڑی قلم ہے، قیاس کیا جاتا ہے کہ سترھویں صدی کے آخری ایام میں پہاڑی قلم کی گلباریاں شروع ہوئیں۔ اور انیسویں صدی کے اوائل میں اس کا نشان بھی کالعدم ہو گیا۔ راجہ سنسار چند کے دورِ حکومت (۱۷۷۵ء تا ۱۸۲۳ء) میں کانگڑہ اسکول خوب پروان چڑھا۔ تقریباً دو سو برس کے مختصر سے عرصہ میں اس اسکول نے فنِ تصویر کی جس قدر گرانمایہ خدمت کی ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

اس اسکول کے مصوروں نے کرشن لیلا، نائک نائیکا، اشٹ نائیکا اور نل دمینتی وغیرہ میں سے کسی ایک یا دوسرے موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اپنا سارا کمال اس پر صرف کر دیا ہے۔ رنگ آمیزی جذبات نگاری اور اندازِ و عمل (Action) کی توضیح کرنے میں جو بات پہاڑی قلم نے پیدا کر دکھائی ہے وہ آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ پرستان کے مناظر برف سے ڈھکی ہوئی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کو چیر کر نکلتے ہوئے دریائے بیاس کی روانی اور دیودار کے دراز قامت درخت اس بھلائی و یکتائی کے ساتھ دکھلائے گئے ہیں کہ بے ساختہ داد نکل جاتی ہے۔ کہیں کہیں دربار کے عام نظارے بھی دعوتِ نظر کا سامان فراہم کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

راجپوت مصوری کے دامنِ رنگین میں مغلوں کی گلکاریوں کے ساتھ ساتھ مغربی رنگ کی جھلک بھی موجود ہے۔ کانگڑہ قلم کمار سوامی کی رائے میں نسائیت کے جوہروں سے سراپا معمور ہے نیز یہ جذبات و حسیات کے بجائے عقیدت و محبت کا عنصر غالب ہے۔ [illegible]

پاکیزہ رنگوں کا استعمال ہوا ہے۔ جس نے مصور کی تخیل و تخلیق میں جان ڈال دی ہے۔
۱۸۷۵ء تک مغل اسکول کا نشان مزار بھی صفحۂ ہستی سے معدوم ہو چکا تھا، لیکن اس واقعہ کا
راجپوت مصوری پر بالواسطہ کوئی اثر نہ ہوا۔ پہاڑی مصور اس سانحہ کے بعد بھی بدستور سابق مقامی
ضروریات کی تکمیل میں منہمک رہے، اور گاہ بگاہ اپنے مربیوں کی فرمائش پر مذہبی کہاوتوں اور پیدائش عالم
کی کہانیوں کو پردۂ تصویر میں عریاں کرنے میں سارا زورِ قلم صرف کرتے رہے۔ بشرہ کے خط و خال کو
بجنسہ نقل و نمایاں کرنا پہاڑی راجپوت کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔

انیسویں صدی سے کانگڑہ قلم کا زوال شروع ہوا اور خاندانی صناعوں کی نئی نسل قسمت آزمائی
کے لئے مادرِ وطن کی آغوش پُر بہار سے نکل کر غربت و نکبت کی ٹھوکریں کھانے لگی۔ آخر کار
۴۔ اپریل ۱۹۰۵ء کے تباہ کن زلزلے کی شعلہ خیزی و فتنہ انگیزی نے رہے سہے اصحاب قلم اور اسا[تذہ]
کی تمام یادگاریں حرف مکرر کی طرح مٹا ڈالی۔

راجپوت مصوری کا دوسرا شعبہ جموں اسکول کے نام سے مشہور ہے جو قدیم ترین پہاڑی اسکول
میں سے ایک ہے۔ ڈاکٹر کمار سوامی کی رائے میں ۱۸۷۰ء میں اس قلم کا آغاز ہوا، لیکن مسٹر اجت گو[ش]
کا خیال ہے کہ جب انیسویں صدی میں کانگڑہ کے راجپوت مصور ہجرت کر کے پریشان و سرگرداں
کشمیر کی زرنگار وادیوں میں پہونچے تو ان کے علم و فضل کی اتنی قدر و قیمت ہوئی کہ سارے کا سارا
قافلہ سیر بہشت کے مزے سے بہرہ اندوز ہو کر کم مائگی و درماندگی کی کلفتوں کے ساتھ یادِ وطن بھی
فراموش کر بیٹھا۔ جموں کے سابق مہاراجہ کی داد و دہش نے اس اسکول کے کارناموں کو اس
قدر چمکایا کہ ان کی فضیلت و برتری میں چار چاند لگ گئے۔

آرٹ کے اس شعبہ کا مغلوں سے بہت کچھ لگاؤ ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے تمام [illegible]
اسی رنگ میں مستغرق ہیں۔ لیونل ہیتھ (Lionel Heath) رقم طراز ہے کہ: "جموں اسکول
انداز و عمل میں اس درجہ ہم رنگ و ہم آہنگ ہیں کہ ایک دوسرے میں تمیز کرنا دشوار ہے۔ عام طور
پر جن مناظر کی تکوین و ترتیب ہوئی ہے وہ اپنے خالق کی سادہ لوحی کے بغایت مظہر ہیں۔ [illegible]
رشیوں اور سادھو مہاتماؤں کی تصویریں اس لازوال عقیدت کا آئینہ ہیں جو ہندوؤں کو [illegible]
اپنے مذہب اور اس کے رہنماؤں سے ہے۔"

اپنی موقلم کی جنبش سے فطرت کو بے نقاب کرنا راجپوت مصوروں کی عام عادت [illegible]
ہے۔ رامائن اور مہابھارت کے مختلف النوع واقعات، محاصرۂ لنکا، اور سدراما کا استقبال [illegible]

جستی و چابکدستی سے جبینِ تصویر پر مرتسم ہوئے ہیں کہ مصور کی مشاقی و سحر طرازی کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ تھوڑی سی جگہ میں بیشمار فوج کا اجتماع اور جنگِ عظیم کا ہیبت ناک نقشہ بڑے حسن و کمال کے ساتھ بالتفصیل واضح کیا گیا ہے، جس ادا سے کرشن سداما کا سواگت (خیر مقدم) کر رہے ہیں اس سے خلوص و اشتیاق کا ایک عجیب عالم مترشح ہے۔

راجستھانی قلم بالعموم نائیک نائیکا بھید، نمایاں کرنے میں مصروف کار رہا ہے۔ لیکن جموں اسکول نے راگ مالاہی کے احاطۂ رنگین میں گل ریزیاں کی ہیں۔ جموں قلم کا بہترین اندوختہ ۱۷۱۰ء تا ۱۷۹۰ء کا حاصلِ عمل ہے۔ اس دوران میں راجپوت مصور کے کلک گہربار نے بکثرت گل افشانی کی ہے اور نمودِ حسن کی عجیب عجیب راہیں نکالی ہیں۔ کہیں پگڑی میں کوئی خوبصورت و نو شگفتہ پھول آویزاں کر دیا ہے اور کہیں پھری ہوئی کشادہ پیشانی کو عریاں کر کے مقامی خصوصیات کو قائم و برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

راجپوت مصوری کا تیسرا رخ گڑھوال اسکول ہے جو اٹھارھویں صدی کے اختتام پر معرضِ وجود میں آیا۔ کانگڑہ قلم اور گڑھوال اسکول میں بیحد یکسانیت ہے جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ کانگڑہ اسکول ہی کے درخشاں اراکین نے چمنستانِ وطن کو خیرباد کہکر وادیٔ غربت میں جدید اسکول کا سنگِ بنیاد نصب کیا۔ گڑھوالی مصوروں میں مولا رام (۱۷۶۰ء-۱۸۳۳ء) سب سے پیش پیش تھا اس کے کارنامے اس نئی جماعت کی خصوصیتوں کو بوجہ احسن الم نشرح کرتے ہیں۔ حسنِ فطرت کو اپنے مخصوص انداز میں آراستہ کرنا تو اس اسکول کا حصہ ہے۔ علاوہ ازیں بشرہ کے خطوط کا انداز اور لباس کی وضع گڑھوال اسکول کی امتیازی علامات ہیں۔

متذکرہ پہلوؤں کے علاوہ بسوہلی، چمبا اور سکھ اسکول بھی راجپوت آرٹ کے اجزا شمار ہوتے ہیں بسوہلی اسکول کے مصوروں کی رسیلی نظریں صنفِ نازک کے حسن و شباب کے باغ و بہار کی منور فضا میں محو گلگشت رہتی ہیں کبھی کبھی کنول جیسی بڑی بڑی خوشنما آنکھوں پر متوالے بھونرے کا سایہ ڈالکر دلکشی و دلفریبی کی شان دوبالا کر دیجاتی ہے۔ اسکے علاوہ انھیں کچھ بھی مد نظر نہیں ہوتا۔

چمبا اسکول کی تمام تر شہرت کا انحصار شبیہ سازی پر ہے۔ اس اسکول کے مصوروں نے راجہ رانی کی پہلو بہ پہلو نشست کو اپنا طرۂ امتیاز بنا لیا ہے۔ کسی نہ کسی شبیہ کو جامع بنانے کیلئے شیریں ادا جوڑے کی نشست میں دلبعد کو بھی شامل کر لیا گیا ہے اور اس طرح خلوت میں جلوت کا سماں پیدا ہو گیا ہے۔ جب راجپوت مصوروں کا شیرازہ ایکبار پھر منتشر ہوا تو ناسازگاریٔ زمانہ کے مظلوموں کو

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں پناہ ملی۔ اور اسطرح سکھ اسکول عرصۂ ظہور میں آیا۔ سکھ قلم نے پہاڑی مصوری کا بانکا انداز چرایا ہے چنانچہ اسکے شاہکاروں کی دزدیدہ نگاہیں خود اس حقیقت کی غماز ہیں سکھوں نے اپنے گرو (نانک وغیرہ) اور انکے درباروں کی شان و شوکت کا بڑی خوش اسلوبی سے مظاہرہ کیا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں راجپوت مصوری سالہا سال کے قیام کے بعد عالمگیر انقلاب کے سیلاب عظیم میں بہہ کر ہمیشہ کے لئے تہ نشین ہو گئی۔

ستارے کی خودکشی

(ڈاکٹر ٹیگور کی تازہ ترین سحر طرازی)

ایک ستارہ آغوش فلک سے تڑپ کر سمندر کے نیلگوں پانی میں کود پڑا ——

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عالمِ دیوانگی میں ہے۔ لاتعداد ستاروں نے خوف و اضطراب کی نظروں سے یہ خودکشی دیکھی، انھوں نے دیکھا کہ کس طرح آسمان کی ایک روشن قندیل جو انکے ساتھ مدت مدید سے جگمگا رہی تھی چند لمحات کے اندر تاریکی میں غائب ہو گئی —— بس گہرے سمندر میں اترا —— اسکی تہ میں متعدد ستارے بکھرے ہوئے تھے جنکی روشنی ہمیشہ کیلئے زائل ہو چکی تھی —— آخر اس گمشدہ ستارے پہ کیا مصیبت نازل ہوئی؟ اس سوال کا جواب صرف میں جانتا تھا —— صرف مجھی کو معلوم تھا کہ اس زمانہ میں جبکہ یہ گمشدہ ستارہ آسمان کی آغوش میں جلوہ طراز تھا، کون سی چیز اسکو دعوت مرگ دے رہی تھی۔ یہ خندۂ پیہم کا عذاب تھا —— کوئلے کا ایک ٹکڑا اپنی سیاہی کو چھپانے کے لئے ہنستا ہے —— جس قدر یہ ہنستا ہے اس قدر جلتا ہے —— اسی طرح یہ ستارہ بھی ہنسا اور روشن ہو گیا، جب جلنے کی مصیبت زیادہ برداشت نہ کر سکا تو روشنی کی مملکت سے ٹھنڈے سیاہ پانی میں کود پڑا۔

ہزاروں لاکھوں جگمگاتے ستاروں نے اس گرے ہوئے ستارہ کو دیکھا اور مایوسی کا قہقہہ لگایا۔

ان ستاروں نے زبان حال سے کہا —— "اس ستارے کی موت سے ہمارا کوئی نقصان نہیں آسمان اسی طرح ابدالآباد تک جگمگاتا رہیگا"

آپ کا نام کرامت علی اور شہیدی تخلص ہے، آپ عبدالرسول خاں کے بیٹے تھے اور آپ کا وطن بالس بریلی تھا۔ آپ کا نشو و نما لکھنؤ میں ہوا وہاں شعر و شاعری کا چرچا تھا چنانچہ آپ بھی مصحفی سے اصلاح لینے لگے۔ جب اُستاد کا انتقال ہوگیا تو آپ اپنا کلام شاہ نصیر دہلوی کو دکھلانے لگے۔

آپ یارباش، زندہ دل، بذلہ سنج، مرنجاں مرنج اور وارستہ مزاج آدمی تھے۔ ابتدا میں آپ نیمچ کی چھاؤنی میں سرکار انگریزی کے ملازم ہوگئے تھے، محکمہ کمسریٹ سے آپ کا تعلق تھا۔ آپ نے بہت سا روپیہ یارباشی میں اُڑا دیا جب حساب طلب ہوا تو آپ سخت پریشان ہوئے۔ اتفاق سے جس مکان میں دفتر تھا اُسی کے ایک حصہ میں آپ رہتے بھی تھے، رات کو آپ نے اُس میں آگ لگادی چنانچہ آپ کے سامان کے ساتھ دفتر بھی جلکر خاک سیاہ ہوگیا۔ آپ کچھ دنوں تک دیوانے بنے رہے اور اس طرح خدا خدا کرکے جان بچی۔

سرکاری ملازمت ترک ہوجانے کے بعد آپ نے کوئی اور تعلق گوارا نہیں کیا ہمیشہ سیر و سیاحت میں مشغول رہے۔ آپ کا دورہ اکثر بھوپال، دلّی، اجمیر، پنجاب اور گجرات میں ہوتا رہتا تھا۔ اور ان مقامات میں آپ کے بکثرت احباب تھے۔ جب آپ دلّی تشریف لاتے تھے تو اکثر نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی صحبت میں رہتے تھے اور نواب مرحوم سے استفادہ کرتے تھے۔

آپ ۱۲۵۵ھ ہجری میں حج کے ارادہ سے روانہ ہوئے اور فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ جا رہے تھے کہ راہ میں بیمار پڑے اور ۴ صفر ۱۲۵۶ھ کو جس وقت تمام منازل طے کر کے ایسے مقام پر پہونچے جہاں سے روضۂ مطہرہ نظر آتا تھا اُس کو بنظر حسرت دیکھا اور آپ کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا اور آپ کی یہ دعا قبول ہوئی۔

تمنا ہے درختوں پر ترے روضہ کے جا بیٹھے   قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقدس کا

کلام پر تبصرہ ۔ مجھے آپ کے کلام کو دیکھنے کا اشتیاق آپ کے نعتیہ قصیدہ کے چند اشعار سننے کے بعد ہوا۔ اسی دَوران میں آپ کے دو چار مشہور اشعار بھی سنے۔ جس سے آپ کا مزید کلام دیکھنے کا شوق ہوا چنانچہ آجکل آپ کا دیوان میرے پیش نظر ہے۔ آپ کے کلام کی نسبت نواب شیفتہ گلشنِ بیخار میں تحریر فرماتے ہیں " در عروض دستگاہے معقول دارد"۔ آپ کے کلام کے بارہ میں کسی قسم کی کوئی تعریف ارشاد نہیں فرمائی۔ عروض کی واقفیت یا اُس میں مہارت کوئی کمال شاعری نہیں بلکہ لازمۂ شعری ہے آگے چلکر نواب مرحوم لکھتے ہیں " ہنگامِ ورودِ دہلی بارا قم آثم بارہا برخوردہ، مردِ بے تکلف و وارستہ مزاج و وسیع المشرب است۔" اس تحریر سے ذاتی تعلقات ضرور ظاہر ہوتے ہیں لیکن کلام پر تنقید کچھ نہیں کی گئی۔

آپ کے کلام کی نسبت ہماری یہ رائے ہے کہ آپ کو اُستادوں کے زمرہ میں تو جگہ نہیں دی جاسکتی۔ البتہ آپ کو دوسرے درجہ کے شعراء میں ضرور شامل کرنا ہوگا۔ آپ کا قصیدۂ نعتیہ کافی شہرت پذیر ہے اور مقبولِ عوام و خواص ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

طلوعِ روشنی جیسے نشاں ہو شہ کی آمد کا ۔۔۔ ظہورِ حق کی حجت ہے جہاں میں نورِ احمد کا

دبستانِ ازل میں وہ معلم عقلِ کل کا تھا ۔۔۔ نہ تھا نام و نشاں جن روزوں اُس لوحِ زبرجد کا

عجم میں زلزلہ نوشیرواں کے قصر میں آیا ۔۔۔ عرب میں شور اُٹھا جس وقت اُسکی آمد آمد کا

شب و روز اُسکے صاحبزادوں کا گہوارہ جنباں تھا ۔۔۔ عجب ڈھب یاد تھا روح الامیں کو بھی خوشامد کا

اُدھر اللہ سے واصل اِدھر مخلوق کا شامل ۔۔۔ خواص اُس برزخِ کبرے میں تھا حرفِ مشدد کا

گزر وحدت سے کثرت میں نہ ہوتا ذاتِ مطلق کو ۔۔۔ نہ بنتا صفر گر نقشِ احد پر میم احمد کا

بھروسا ہر کسی کو اک حصارِ عافیت کا ہو ۔۔۔ مجھے نامِ مبارک کا ہے ذوالقرنین کو سد کا

رہا کعبے میں تیرے روضے کے در پر نہ جا پایا ۔۔۔ اسی اندوہ سے ہے رنگ تیرہ سنگِ اسود کا

خدا منہ چوم لیتا ہے شہیدی کس محبت سے ۔۔۔ زباں پر میری جس دم نام آتا ہے محمد کا

آپ نے منقبت میں بھی ایک قصیدہ لکھا ہے، زورِ کلام اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے، اس کے بھی چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

یدِ قدرت لقب ہے میرے کلکِ گوہر افشاں کا ۔۔۔ بیاضِ صنع اک سادہ ورق ہے میرے دیواں کا

بہارِ حُسن ہر مالی میرے صحنِ سرا کی ہے ۔۔۔ ریاضِ قدس گلدستہ ہے میرے طاقِ ایواں کا

دلوں میں شاعروں کے گوہرِ معنی نہ پیدا ہوں ۔۔۔ نہ ٹپکے گر صدف میں اُن کی قطرہ میرے نیساں کا

فنافی المرتضیٰ کے رمز سے ہے جس کو آگاہی — مقام اُس شخص پر ہے کشف میری عزت و شاں کا

مرا سینہ ہے بیشہ بود و باشش شیر یزداں کا — فضائے لامکاں سے قرب ہے میرے نیستاں کا

کیا پرسش جو اُس کا مرتبہ پیر طریقت سے — بتایا کان میں مجھکو علی ہے نام یزداں کا

بتوں کے توڑنے میں اُس سے ابراہیم ہمسر تھا — اگر ہوتا نہ زیر پا کتف شاہ رسولاں کا

دو چنداں روشنی اس سے ہوئی شرع محمد کو — کہ پھیلا ایک ہو کر نور دو شمع فروزاں کا

شہیدی مصطفےٰ کا لاڈلا حیدر کا پیارا ہوں — مجھے کیا خوف ہے بردہ ہوں میں شاہ شہیداں کا

لیکن بعض اشعار میں مبالغہ حد سے زائد ہے اور فرق مراتب کا خیال نہیں رکھا۔ جو قابل افسوس ہے مثلاً

بنا دیتا ہے سلطاں آپ سا جس پر تفقد ہو — خدا سے کم نہیں عز و جلال اس دیں کے سلطاں کا

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو یہ قدرت ہرگز حاصل نہیں تھی کہ وہ کسی شخص کو اپنے ہی جیسا عالی مرتبہ بنا دیتے اور خدا کے مقابلے میں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ایک بندہ سے زیادہ نہیں ہیں جیسا کہ خود حضرت کا ارشاد ہے۔ جو کہ اس شعر میں نظم ہے:-

مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی — کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

لہٰذا حضرت علی کا عز و جلال کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ خدا کے عز و جلال سے کم نہیں، نعوذ باللہ من ذلک۔
اس شعر میں دوسرا نقص یہ کہ مصرع ثانی کو مصرع اول کے ساتھ پڑھنے سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ جس کو چاہے اپنا سا سلطان بنا دیتا ہے حالانکہ یہ بھی غلط ہے۔ اور اگرچہ ان اللہ علیٰ کل شئی قدیر قرآن مجید کی آیت ہے لیکن یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ خود اپنا سا خدا بنا سکتا ہے غلط ہوگا کیونکہ ایسا خدا جس کو کسی نے بنایا وہ خدا نہیں ہو سکتا لہٰذا اصلی اور حقیقی خدا سے مصنوعی خدا کو (خواہ اُس کو حقیقی خدا نے ہی بنایا ہو) مماثلت نہیں دی جا سکتی۔

آپ کے کلام میں پختگی اور شستگی دونوں موجود ہیں لیکن کوئی خاص وجہ امتیاز نہیں ہے۔ اس عصر کے دوسرے درجہ کے دیگر شعرا کا کلام جیسا ہے ویسا ہی آپ کا کلام ہے بلکہ فرسودگی زیادہ ہے اور تازگی کم پائی جاتی ہے۔ کسی غزل کو پڑھ کر دیکھ لیجئے سب جگہ یہی بات پائی جائیگی۔ مثلاً

دلجوئی عشاق سے فرصت نہیں ملتی — نازوں سے اپنے تمہیں رخصت نہیں ملتی

دیتا ہے اگر زہر ملا دے شکر اس میں — بے زہر شکر میں مجھے لذت نہیں ملتی

آساں ہے وہاں بھیس میں اغیار کے جانا — صورت سے پر اُن کی مری صورت نہیں ملتی

ہے شکل تری گل سے کچھ کچھ ہے مشابہ — لیکن تری بو اُس میں تو نکہت نہیں ملتی

فرشِ قدمِ بت ہے مرا جامۂ احرام | بے خوار ہوئے عشق میں لذت نہیں ملتی
اے بختِ سیہ سایۂ فگن ہو مرے اوپر | تکلیف ہما سے مجھے دولت نہیں ملتی
گو جنس بکے حسن کے بازار میں ارزاں | سودا اس کو ہے فوراً جسے قیمت نہیں ملتی

ناکامیِ جاوید کی ہم مانتے منت
افسوس شہیدی تری تربت نہیں ملتی

تمام غزل میں بجز مقطع اور شعر ۲ کے ایک شعر بھی قابل توجہ نہیں ہے۔

اس دور کے دیگر شعرا کی طرح آپ کے یہاں بھی ادق الفاظ پائے جاتے ہیں جن کی ثقالت کا بار صنفِ نازک (غزل) برداشت نہیں کر سکتی، چند الفاظ بطور نمونہ تحریر کئے جاتے ہیں:-

چشمِ کحیل۔ عدیل۔ مبدا۔ صبح رحیل۔ خزول۔ سالوس۔ شکارِ شیون و مظاہر۔ الیتام۔ حداد سنگِ فلاخن۔ عربدہ جو۔ اندیشۂ عواصف۔ ذبیب۔ کف الخضیب۔ عین الکمال۔ مطموس۔ نقشہ

اس پر لطف یہ ہے کہ بعض متروک الفاظ و محاورات بھی موجود ہیں، مثلاً "ساحت پرے ہے حضرتِ ربِ جلیل گا" یا "پیسجا ایک تیر ادل نے اے شیریں لکھو اس پر | جگر پانی ہوا فرہاد کی باتوں سے پتھر کا"

آپ نے اکثر سنگلاخ زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور یہ فیض آپ کو اپنے استاد شاہ نصیر دہلوی سے پہنچا تھا جو سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کے بادشاہ ہیں مثلاً پیرہن ٹکڑے ہوا۔ بدن ٹکڑے ہوا آشیاں باندھا۔ آسماں باندھا۔ جام شیشے کا۔ پیام شیشے کا۔ بسمل ٹھنڈا۔ قاتل ٹھنڈا۔ مولوٹ پڑا رفو لوٹ پڑا۔ کوڑے محتسب۔ گھوڑے محتسب۔ دلبر شب مہتاب۔ بدتر شب مہتاب۔ تقریر کا جواب دلگیر کا جواب۔ سخن موج۔ دہن موج۔ تقدیر شکار۔ نخچیر شکار۔

آپ کے یہاں بھی رکیک اشعار بکثرت موجود ہیں۔ صرف مشتے نمونہ از خروارے ذیل میں درج کرتا ہوں:-

تپش پر بلبلوں کی رشک ہے لوٹن کبوتر کو | ہوا کس طفلِ خو کو عزم بازی گاہِ مقتل کا
ملا پستاں جنت سے تجھے شیریں قد جاناں | اسی سے نخلِ طوبیٰ تیرا کو کلناش ہے گویا
خط کے آنے سے ہوا حسن کا عنوان نیا | نئی فصل آئی اُگا باغ میں ریحان نیا
بالے پن سے اُس پری کی بالیوں کا کشتہ ہوں | میرے حق میں تھی زیادہ نوک سے بھالے کی گونج

یہ تمام غزل ایسی ہی ہے جس کا مطلع ہے:-

شب جو اے مہوش نظر آئی ترے بالے کی گونج | رشک سے کیا کیا نہ کھٹکے جان میں بالے کی گونج

یاد آتا ہے کسی کا چیکے آنا رات کو آتشیں پوشاک پر اوڑھے ہوئے چادر سپید
بے اختیار جی میں یہ آتا ہے توڑ دوں پر ہائے کیا کروں کہ ہے اسکا پتنگ دور

آپ نے بعض بعض جگہ محاورات کو بدل دیا ہے جو کسی طرح جائز نہیں۔

آمد و شد کی جگہ لکھتے ہیں :-

شد آمد ہی سے اس سرا میں تھی رونق کسی روز کوئی مسافر نہ ہوگا

اور کہیں کہیں خلاف روزمرہ کہہ گئے ہیں، مثلاً

قبر حافظ پہ شہیدی بیٹھکر پی لیں شراب ہند میں جاکر کریں گے یاد کیا شیراز کا

یہاں "شیراز کا" کی جگہ شیراز کو ہونا چاہیئے!

بعض الفاظ بھی غلط استعمال کر گئے ہیں مثلاً :-

کبھی عمداً وہ ہکلا کر جو مجھ سے بات کرتا ہے مزا دیتا ہے اُس کا ہر سخن قندِ مکرر کا

یہاں عَمداً ہونا چاہیئے یعنی میم پر جزم نہ ہونا چاہیئے۔ ایسے ہی سَر کو بکسر سین لکھ گئے ہیں۔

عبث رنج دیتا ہے تو مجھکو زاہد نہ ہوگا یہ سودا بھی جب سر نہ ہوگا

اس غزل میں ظاہر ہوگا آخر ہوگا ردیف و قافیہ ہے۔

مجھے یہ دیکھکر سخت تعجب ہوتا ہے کہ اس دور کے بعض شعرا اور نیز متقدمین و متوسطین کو ہرگز اپنے معشوق کا پاسِ ادب کچھ نہیں ہوتا جو جی میں آتا ہے کہہ دیتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان بزرگوں کو عشق کی ہوا بھی نہیں لگی تھی، ان کا جو کچھ کلام ہے وہ تقلیداً عاشقانہ ہے، خود اپنے اوپر کچھ نہیں گذرا، بالکل سوقیانہ انداز ہے، فرماتے ہیں :-

اے بدسلیقہ یہ بھی قرینہ ہے بزم کا عشاق دور بیٹھیں اور اغیار عنقریب

معشوق کو بدسلیقہ کہنا ان ہی جیسے بوالہوسوں کا حصہ ہے، علاوہ ازیں ردیف عنقریب کے بجائے قریب اختیار کی جاتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔ کیونکہ مکان کی نسبت زمان پر اس لفظ (عنقریب) کا زیادہ اطلاق ہوتا ہے۔

آپ کے دیوان میں تقریباً تین ہزار اشعار ہیں جن میں دو قصیدے، ایک مثنوی، سات مخمس، ایک جنازہ نامہ، چھ رباعیاں اور چار قطعات ہیں۔ کچھ فرد بھی ہیں۔

آخر میں ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آپ نے بعض فارسی تراکیب خوب استعمال کی ہیں اور آپ کے کلام میں اس کی نظیریں بہت ہیں لیکن ہم صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ قارئین کرام

خود آپ کا دیوان پڑھکر محظوظ ہوں "طرب گاہ گاہ - اندوہ فراواں" آپ کے مقطعے اکثر خوب ہوتے ہیں ذیل میں آپ کے کلام سے بہتر منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں:۔

حسنِ سخن ہو وصفِ جمال اس جمیل کا　　گلگونہ جس کا اسم رخِ قال وقیل کا

شوقِ وصال سینہ میں آزار بن گیا　　میں خواہشِ طلب ہی میں بیمار بن گیا

دم میں جلا کے خاک کیا جس نے طور کو　　اُس شعلہ کا مقامِ اقامت یہ دل ہوا

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا　　ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا

بے حجابانہ اگر جلوہ دکھاتا وہ شوخ،　　دو جہاں ایک کرشمے ہی میں لسبمل ہوتا

عام ہیں اس کے تو الطاف شہیدی سب پر　　تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

ہما کے پر جلیں گر استخواں پر میری آبیٹھے　　وہ مجنوں تھا کہ سر پر طائروں نے آشیاں باندھا

شہیدی کثرتِ عصیاں سے مجھکو خوف آتا ہے　　سفر ہے دور کا اور دوش پر بارِ گراں باندھا

جیسے چمک کے گم ہو شبِ تیرہ میں شرار　　خورشید لقمہ ہے مرے روزِ سیاہ کا

اندوہ دائمی میں کٹی کس خوشی سے عمر　　گر مجھکو غم نہ ہو طرب گاہ گاہ کا

اے شہیدی سے تو ہے ضبطِ جنوں بس دشوار　　دامنِ یار ہی چھوٹا تو گریباں کس کا

میری محتاجی دلیلِ فرطِ استغنا سمجھ　　کیا نہ ملتی مجھکو گر مالک سے دولت مانگتا

میں تو سمجھاؤں ہزار اس کو شہیدی لیکن　　میرے سمجھانے سے کب یہ دلِ شیدا سمجھا

جو صاحبِ قدرت ہیں وہ کیا کیا نہیں کرتے　　مجھکو کسی شے کا نہیں مقدور کروں کیا

واقف ہے مرے حال سے تو مجھ سے زیادہ　　ہر روز ترے سامنے مذکور کروں کیا

تو نے شبِ غم پاؤں نہ داماں سے نکالا　　سر صبحِ قیامت نے گریباں سے نکالا

مژدہ باد اے دل کہ اب تیری دعا ہے مستجاب　　میرے نالوں کی بدولت آسماں کا در کھلا

خواب میں شکل دکھاتا وہ مقرر مجھکو　　شوق کے طالع بیدار نے سونے نہ دیا

نہ پسند آئے شہیدی ہمیں تیرے اشعار　　تجھ سے اندازِ غزل سیکڑوں فرسنگ رہا

دیر و حرم کا جبکہ جہاں میں نشاں نہ تھا　　عاشق کے دل سوا کوئی اُس کا مکاں نہ تھا

ہوا ہوں جب سے آشفتہ قدِ رعنائے دلبر کا　　جدھر جاتا ہوں میرے ساتھ ہنگامہ ہے محشر کا

شہیدی قصرِ جنت دیکھکر میں خوب سا رویا　　مجھے یاد آگیا نقشہ کسی محبوب کے گھر کا

گزر جی سے اگر طالب ہے عمرِ جاودانی کا　　چھپا ہے گور کی ظلمت میں چشمہ زندگانی کا

دہشت بھرے ہوئے مرے تیور کو دیکھکر — آتا نہیں ہے اب کوئی غمخوار عنقریب

انجمن آرائیِ اہلِ فنا کو کیا ثبات — ٹوٹ جاتی ہے ہوا سے دم میں فانوسِ حباب

زندانیِ جاوید کی ہر شب ہے مناجات — یارب ہمیں کرنا نہ گرفتارِ محبت

اُٹھ گئی الفت جہاں سے خون سپید ہو گیا — کیجیئے گر ذبح عالم کو رہے خنجر سپید

گلگشتِ گلستاں میں پڑھو صلِّ علیٰ تم — ہر پھول کی بو میں ہے رچی بوئے محمد

دشنامِ یار و بادہ کا ہے ایک سا خواص — یہ دونوں اہلِ ذوق کو ہوں تلخ پر لذیذ

دیدۂ عبرت سے گورستاں کی جانب کر نگاہ — خاک پر سوتے ہیں کیا کیا قصر و ایواں چھوڑ کر

ترے پر سے جھڑنے لگے شرر نہ تڑپ تو بلبلِ زار بس — یہ جلیگا قفس یہ جلیگا قفس یہ جلیگا قفس یہ جلیگا قفس

کہتا ہے پڑھ کے نامۂ عاشق کو وہ ظریف — انشا میں کچھ کلام نہیں مدعا غلط

رندانِ باخبر کے ہیں افعال خیر محض — اہلِ صواب پر ہے گمانِ خطا غلط

ہم نے دیکھا ہے تماشا آمدِ سیلاب کا — کب کسی کے روکنے سے رکتا ہے جب آتا ہے دل

آبِ بقا خضر کو مبارک رہے ہمیں — کافی ہے جامِ زہر کہ ہیں فانیوں میں ہم

فردوس کی گلگشت کو بھی چلتے ہیں رضواں — دوزخ پہ ذرا سینک لیں یہ دامنِ تر ہم

دوستو گر ہم سے کج خلقی ہو رکھنا تم معاف — فرقتِ جاناں میں اپنے جی سے ہیں بیزار ہم

پروانہ شمع سے بھی زیادہ ہے روشناس — نامحرم اُس کی بزم میں محرم سے کم نہیں

میں آزما چکا ہوں نہ کھانا کوئی فریب — اُس بے وفا کا قول و قسم دم سے کم نہیں

غیر سے پرسشِ احوال رہے گی کب تک — متوجہ ہو ادھر ہم بھی زباں رکھتے ہیں

شہیدی میں تو کیا ہوں لیکے بوسہ سنگِ اسود کا — کیا خوشنود اُس بت نے خدا کو یک بوسے میں

نزع کے وقت شہیدی سے جو خواہش پوچھی — کیا ہی حسرت سے کہا کچھ مجھے مرغوب نہیں

محفلِ یار میں ہوئی تیری رسائی کس روش — صدقے ترے پیامبر کچھ تو مجھے بتا کہ یوں

رحم آتا ہے مجھے اس نوجوانی پر تری — اے شہیدی رات دن کا رنج و غم اچھا نہیں

احباب سے دیکھی نہ وفا ہم نے شہیدی — شرمندہ ہوئے شفقتِ اعدا سے بہت

خدا نہ کردہ کسی زخم کو شفا ہو گی — سحر سے اور ہی سوزش دلِ فگار میں ہے

دشمن کے طنز دوست کے پند آسماں کے جور — کیا کیا مصیبتیں نہیں ہیں تیرے واسطے

سب طالب اپنے اپنے ہوں مطلوب سے بہم — ہیں نامراد ایک ہمیں تیرے واسطے

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

سر سی - وی - رمن

سائنس اور اہل ہند

(از ٹھاکر جے۔ آر رائے صاحب)

سائنس کی ترقی کا دور جدید

عرصۂ دراز کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغربی علوم کی تعلیم رائج کی۔ تو ہندوؤں نے پرانے تعصبات کو دریا بُرد کر کے دلی شوق سے اہل مغرب کے علوم و فنون کی تحصیل میں پیش قدمی کی جس سے سائنس کی ترقی کے دورِ جدید کی بنیاد پڑی۔ پروفیسر جگدیش چندر بوس نے اقلیم نباتات کے اسرار سربستہ کی تحقیقات شروع کی۔ آپ نے اپنی روح فرسا تحقیقات کے نتائج کا جب علمی اخباروں کے ذریعہ سے اعلان کیا تو مغرب کے ارباب سائنس نے مضحکہ اڑایا مگر پروفیسر موصوف اس سے پست حوصلہ نہ ہوئے بلکہ بڑے استقلال اور دماغ سوزی سے اس مبارک کام میں مصروف رہے۔ آپ نے پودوں کا نظام اعصاب دریافت کیا اور ان کے اندر جو فطری عمل حیات ہوتا ہے اسے بھی معلوم کیا عجیب و غریب آلات تحقیقات معلوم کئے۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ پندرہ بیس سال کی جامع تحقیقات سے بیالوجی کے اس شعبہ کی عجیب و غریب بھید آشکارا ہو گئے جو مدت ہائے دراز سے عالم اسرار میں مستور تھے۔ پروفیسر جگدیش چندر کی جامع و مانع تحقیقات کے بیش بہا نتائج کو بلاد مغرب کے ارباب سائنس اب بخوبی تسلیم کر کے داد دیتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں کوئی ایسی بڑی یونیورسٹی نہیں ہو گی جہاں سر جگدیش چندر بوس نے اپنی لاثانی تحقیقات کے معرکتہ الآرا نتائج پر ایک سے زیادہ مرتبہ لیکچر نہ دیئے ہوں مغرب سے قطع نظر جاپان۔ فلپائن۔ چین کی یونیورسٹیوں نے بھی موصوف کو دعوت دی۔ امریکہ اور یورپ جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا کے طلبائے سائنس موصوف کے زیر نگرانی کلکتہ میں آپ کے عجیب طریقہ تحقیقات کی تربیت پاتے ہیں۔ اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ سر جگدیش چندر بوس کی تحقیقات سے جس شعبۂ سائنس کے اسرار سربستہ منکشف ہوئے ہیں۔ اقلیم سائنس کے ماہروں کی نگاہ میں ان کی بے حد قدر و قیمت ہے۔ علمی سوسائٹیوں نے اس عجیب اور بیش قیمت تحقیقات کے صلہ میں شاندار طلائی تمغے اور انعامات عطا کر کے اپنی قدر دانی کا اظہار کیا ہے، بڑی بڑی یونیورسٹیوں نے آپ کو اعزازی ڈگریوں سے ممتاز کیا ہے۔ برطانیہ کی مشہور اور پرانی علمی انجمن رائل سوسائٹی نے آپ کو اپنا فیلو (رفیق)

منتخب کیا ہے۔ غرض چوتھائی صدی کے بعد یورپ اور امریکہ نے سر جگدیش چندر بوس کی بے نظیر تحقیقات کے بیش بہا نتائج کو تسلیم کر کے اس درماندہ اور خستہ حالت میں ہندو فطانت کی برتری کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے جس کی مساعی جمیلہ سے رگ وید اور قدیم ہندو تمدن کے علوم و فنون عالم وجود میں آئے تھے۔

ملک ہند کے مایۂ ناز سپوت

سر جگدیش چندر بوس بلا شبہ شہرہ آفاق ہیں اور موصوف کی دماغ سوزی سے حکمت سائنس کے مخزن معلومات میں نہایت مستقل اور بیش قیمت اضافہ ہوا ہے لیکن غریب ہندوستان کے اور بھی سپوت ہیں جن کی ہستی مغتنمات سے ہے، ان کی وجہ سے ملک ہند کی سارے جہاں میں نیک نامی ہو رہی ہے۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور بحیثیت بے نظیر ادیب اور ماہر صناعیات کے مغرب اور مشرق میں مشہور اور نیک نام ہیں۔ آپ کی بلند پایہ خیالی شاعری اور ڈرامانویسی کے صلہ میں ۱۹۱۳ء میں آپ کو نوبل پرائز عطا کیا گیا تھا۔ دنیا میں کوئی بڑی یونیورسٹی ایسی نہیں ہے جس نے رابندر ناتھ ٹیگور کو بلا کر لیکچر نہ دلائے ہوں۔ آپ سیام چین جاپان۔ فلپائن۔ آسٹریلیا جنوبی افریقہ میں عالمانہ لیکچر دے چکے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے سارے جہان میں جو ہر دلعزیزی اور شہرت حاصل کر رکھی ہے، وہ قومی اور ملکی مخمصوں میں راست شعاری اور ایمان داری سے ہدایت حاصل کرنے اور حکومت وقت کو راہ راست پر لانے کے واسطے مزاحمت مجہول سے کام لینے کے باعث نصیب ہوئی ہے۔ مہاتما جی نے پولیٹیکل معاملات میں ایک عجیب دستور العمل کو رواج دینے کا لاثانی امتیاز حاصل کیا ہے۔ سر پرپھلہ چندر رائے نے مہارت کیمیا کے سبب سے بلاد مغرب تک شہرت حاصل کر رکھی ہے اور ڈاکٹر میگھ ناد سہا نے فلکی طبیعیات کی تحقیقات کے لئے علمی دنیا میں نام پیدا کیا ہے۔ پروفیسر رادھا کرشن نے ہندو اور مغربی فلسفہ کی لاثانی مہارت اور اپنے استادانہ طریقہ سے ہندو مسائل فلسفہ و مذہب کی تشریح کے لئے ملک ہند سے باہر یورپ اور امریکہ میں بڑی نام آوری حاصل کر لی ہے۔ سر فرانسس ینگ ہزبنڈ برطانیہ کے بلند فکر نامی اہل قلم ہیں۔ آپ نے پچھلے سال اہل ہند کو حکومت خود اختیاری عطا کئے جانے کی حمایت کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ جس ملک میں رابندر ناتھ ٹیگور، سر جگدیش چندر بوس، مہاتما گاندھی، اور ڈاکٹر رادھا کرشن ایسے گرامی قدر حضرات ہوں وہ ہر قسم کی عزت کا مستحق ہے۔ اس رائے سے ہر ایک سلیم العقل کو اتفاق کلی ہے کہ چیدہ اور عالی دماغ اصحاب ہی ملک کی عزت اور نیک نامی کے موجب ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے سر جگدیش چندر، سر رابندر ناتھ ٹیگور اور مہاتما گاندھی ایسے بزرگوں کا دم غنیمت ہے۔

سر چندر شیکھر رامن

سر چندر شیکھر رامن سے پڑھے لکھے لوگ اتنے واقف نہیں ہیں جتنے سر جگدیش چندر بوس، سر پی۔ سی۔ رائے۔ اور رشی رابندر ٹیگور اور مہاتما گاندھی سے لوگ آشنا ہیں۔ اگر سر چندر شیکھر رامن کا نام مقبول عام نہیں ہے تو اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ آپ کیمیا خانہ کے اندر بیٹھکر دماغ سوزی اور تن دہی سے کام کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ کی تحقیقات طبعیات کے نتائج عام اخباروں اور رسالوں میں اشاعت نہیں پاتے۔ بلکہ برطانیہ کے اعلیٰ علمی رسائل کی زینت کے باعث سمجھے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے عوام کی دسترس سے بالا رہتے ہیں۔ انھیں فقط بلند پایہ ارباب سائینس ہی پڑھتے ہیں، اور ان کی قدر و قیمت صرف ماہران سائینس ہی کماحقہ سمجھتے ہیں۔ سر چندر شیکھر کے اسم گرامی سے اہل ملک حال ہی میں روشناس ہوئے ہیں۔ انھیں نوبل انسٹی ٹیوٹ کی منتظم کمیٹی نے نوبل پرائز کا مستحق قرار دیا ہے۔ اس واسطے ذیل میں سر چندر شیکھر صاحب کے اجمالی حالات ہدیۂ رسالہ ہذا کئے جاتے ہیں۔

ولادت اور تعلیم

سر چندر شیکھر رامن ۱۸۸۸ء میں مقام ترچناپلی احاطۂ مدراس میں پیدا ہوئے تھے، اس حساب سے آپ کا سن اب ۴۲ سال ہے۔ آپ کے والد صاحب ریاضی کے نامی استاد تھے جو بعد ازاں وزیگاپٹم کالج میں وائس پرنسپل مامور ہوئے تھے۔ باپ سے کئی درجے غیر معمولی ذہانت بیٹے کے حصے میں آئی تھی جس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ چندر شیکھر نے بارہ سال کی عمر میں انٹرنس پاس کیا۔ چودہ سال میں ایف۔ اے، سولہ برس میں بی۔ اے، اور بعد میں ایم۔ اے پاس کیا۔ ان دونوں امتحانوں میں آپ مدراس یونیورسٹی میں اول رہے۔ سائینس سے چھوٹی ہی عمر میں گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی ایم۔ اے میں آپ کا پسندیدہ مضمون طبعیات تھا جس کے امتحان میں آپ نے سب طلبا کو مات کر دیا۔ آپ کا برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ تھا۔ اور سرکاری وظیفہ بآسانی مل سکتا تھا۔ مگر آپ کی صحت بہت اچھی نہ تھی، اس وجہ سے اپنے مبارک ارادے کی تکمیل نہ کر سکے۔ اگر صحت جسمانی تسلی بخش حالت میں ہوتی، اور ولایت جاکر ممتاز ماہروں کے زیر ہدایت تعلیم حاصل کرتے تو آپ اب سے بہت پہلے مملکت سائینس میں بڑی نام آوری حاصل کر لیتے۔

محکمۂ مالیہ میں ذمہ داری کا اعلیٰ عہدہ

ایم۔ اے۔ پاس کرنے کے بعد محکمۂ مالیات کے اعلیٰ درجہ کا امتحان دیا جس میں آپ اول رہے۔ آپ ایک اعلیٰ عہدے پر تعینات ہو کر کلکتہ میں کام کرنے لگے لیکن طبیعت کو سائینس سے جو فطری مناسبت تھی اس سے روگردانی نہ کر سکے چنانچہ فرصت کا وقت انڈین ایسوسی ایشن کے کیمیا خانہ میں صرف کرتے اور تحقیقاتِ طبعی کا نازک اور روح فرسا کام انجام دیتے۔

آپ نے اپنی تحقیقات کے نتائج مضامین کے وسیلہ سے شائع کئے، جن کی اشاعت پر سنٹرل میور کالج، الہ آباد کے نامی پروفیسر ہم شم کاکس نے آپ کو مبارکباد دیتے ہوئے آپ کی لیاقت کی موزوں الفاظ میں تعریف کی، اور اس میں مصروف رہنے کا مشورہ دیا، دوران جنگ میں آپ بنگال کے ڈپٹی اکونٹینٹ جنرل صیغہ ڈاک خانہ و تار مقرر ہوئے ۱۹۱۴ء میں آل انڈیا سائنس کانگریس کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا جس کے دوران میں آپ نے اپنی تحقیقات کے نتائج پر ایک مضمون پڑھا۔ سر آسوتوش مکرجی آنجہانی بھی اجلاس کانگریس میں تشریف فرما تھے۔ آپ کے مضمون کا موصوف کے دل پر بہت گہرا اثر ہوا، انجام یہ ہوا کہ ۱۹۱۸ء میں سر آسوتوش مکرجی نے آپ کو سر ترک ناتھ پالیت کی قائم کردہ طبعیات کی پروفیسری پر تعینات کرا دیا۔

ڈپٹی اکونٹینٹی سے دست برداری اور اس کا مبارک انجام

تحقیقات سائینس کی خاطر گو ڈپٹی اکونٹینٹی کے عہدے کا مشاہرہ زیادہ تھا اور آپ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مگر سر چندر رامن نے سیلان طبع کی طبعی مناسبت اور سائینس کی خدمات سے سرخروئی حاصل کرنے کے ارادے سے متاثر ہو کر ایثار سے کام لیا، اور مشاہرہ کی کمی کا خیال نہ کر کے اس ذمہ داری کے عہدہ کو ترک کر دیا۔ شروع میں دو سال کی رخصت لیکر کلکتہ کے سائینس کالج میں کام شروع کیا۔ بعد کے حالات سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ آپ سرکاری ملازمت سے دست بردار ہونے میں حق بجانب تھے۔ اگر آپ اس سے علحدگی اختیار کر کے سائینسی تحقیقات میں مصروف نہ ہوتے تو آج آپ کو اتنی جہاں گیر شہرت نصیب نہ ہوتی۔ اور نہ اقلیم سائنس کی بیش بہا معلومات میں آپ ایسا گراں قدر اضافہ کرنے کی بے نظیر نیک نامی حاصل کرتے۔ ۱۹۲۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے سر چندر رامن کو ڈاکٹر آف سائینس کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ آپ کی قابل قدر بلند پایہ سائینسی تحقیقات کے باعث برطانیہ کی سب سے بڑی سائینس کی انجمن رائل سوسائٹی نے ۱۹۲۴ء میں آپ کو فیلو منتخب کیا۔ جس معرکۃ الآرا طبعی انکشاف کے سبب سے ساری مہذب دنیا میں آپ کا نام روشن ہو گیا ہے وہ ۱۹۲۷ء میں عمل میں آیا تھا۔ اسی کے صلہ میں گورنمنٹ ہند نے آپ کو ۱۹۲۹ء میں نائٹ بنایا اور اسی کی بدولت نوبل پرائز پایا۔ اور اسی کے طفیل علمی انجمنوں نے آپ کو تمغے اور اعزاز عطا کئے ہیں۔ اسی دریافت سے آپ کی عزت و حرمت سائینس کی دنیا میں بے حد بڑھ گئی ہے۔ یورپ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں نے آپ کو اپنی تحقیقات کے بیش بہا نتائج پر لیکچر دینے کی دعوت دی جس سے آپ کی نیک نامی کو چار چاند لگ گئے۔ اس دورہ کے سلسلہ میں آپ کو جرمنی کی فرائی برگ یونیورسٹی (Freiburg) نے

ڈاکٹر آف نیچرل فلاسفی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ آپ صوبہ جات متحدہ امریکہ اور کنیڈا میں بھی گئے اور وہاں پر فاضلانہ لیکچر دیکر سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ غرض اپنی غیر معمولی لیاقت اور فطانت کی کرشمہ سازیوں سے نہ صرف اپنا ذاتی وقار ہی بڑھایا اور دور و نزدیک ایک نامی حاصل کر لی بلکہ خستہ حال ہندوستان کی عزت و حرمت بھی سارے جہان میں بڑھادی۔ اس وجہ سے ملک آپ کے احسان گرامی سے کبھی اسبکدوش نہیں ہوسکتا۔ اہل ہند سر چندر راامن موصوف پر جتنا فخر کریں کم ہے۔

پروفیسر سمر فیلڈ کی قابل قدر رائے

بلاد مغرب کے مقابلہ میں سائینس کا رواج ملک ہند میں نیا ہے۔ پچاس سال بھی نہ گذرے ہوں گے جب اس ملک میں سائینس کی تعلیم کی مستحکم بنیاد قائم ہوئی تھی۔ برخلاف اس کے مغرب میں سر آیزک نیوٹن کے زمانہ سے سائینسی تحقیقات کا چرچا چلا آتا ہے، اور یہ کوئی تین سو سال کا زمانہ ہے تاہم اس قلیل عرصہ میں تحقیقات سائینس کا جو قابل قدر کام اس ملک میں ہوا ہے وہ یورپ کے نہایت ترقی یافتہ ملکوں سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے، بلکہ سر جگدیش چندر بوس اور سر چندر شیکھر رامن کی عجیب و غریب تحقیقات سے بیالوجی اور طبعیات کے انکشافات کی تاریخ میں نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ ان دونوں بلند پایہ ماہروں کی دماغ سوزی سے اقلیم سائینس میں جو عجیب و غریب اختراعات ہوے ہیں وہ مغرب کے مشہور ماہروں کے کارہائے نمایاں سے کسی طرح بھی کمتر نہیں ہیں۔ پروفیسر اے۔ سمر فیلڈ (Sommerfeld) جرمنی کے ایک نہایت ممتاز ماہر ہیں۔ آپ تین سال ہوے کہ سیاحت ہند کو آئے تھے، کلکتہ یونیورسٹی میں آپ نے ایک سے زیادہ لیکچر دئے اور تمام بڑے بڑے مشہور شہروں کی سیر کی۔ واپس جاکر ۱۹۲۹ء میں مشہور جرمن رسالہ "سائٹ ونڈ" (Zeitwende) میں حسب ذیل قابل قدر خیالات کا اظہار کیا تھا۔

سرزمین عجائبات (ہندوستان) جس کی عظیم الشان عمارتیں آسمان سے باتیں کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ اور جس کے نظام ہائے فلسفہ و مذہب ارباب تحقیق کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس نے میرے دل کو بھی مفتوں کر لیا ہے، کیونکہ تمدن کے اس ابتدائی مولد میں طبعیات جدید کی جو قلمیں لگائی گئی ہیں۔ انھوں نے پوری نمو حاصل کر لی ہے جس کے سبب سے [illegible] اس کے ارباب تحقیق یورپ اور امریکہ کے ماہران سائینس سے بخوبی تعلق رکھتے ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں جتنی اختراعات عمل میں آئی ہیں۔ ان میں ایک بھی ایسی نہیں ہے جس کی بدولت دنیا کے سائینس میں اس قدر تہلکہ برپا ہوا ہو۔ اور بڑے بڑے ماہروں کی تحسین حاصل کی ہو، جیسا کہ سپیکٹروسکوپ کے ذریعہ سے شعاع کے نامعلوم عجیب اثر کی دریافت سے ظہور میں آیا ہے۔ اس کے مخترع کلکتہ کے پروفیسر [illegible]

سرچندر شیکھر رامن ہیں۔ ڈاکٹر کرشنا نے بھی اس اختراع میں قابل قدر حصہ لیا ہے۔ پروفیسر میگھ ناد سہا نے جو اب الہ آباد میں ہیں۔ طبعیات فلکی (Austrophysies) میں جو عجیب و غریب دریافت کی ہے۔ اس سے ستاروں کی ترکیب فطری کی ماہیت خوب اچھی طرح واضح ہوتی ہے

اس اقتباس سے یہ امر بخوبی ظاہر ہے کہ مغرب کے بلند پایہ ماہران سائینس ملک ہند کے استادان سائینس کے کارناموں کو کس بلند نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

سرچندر رامن کی عجیب و غریب دریافت کی بے نظیر اہمیت

سرچندر رامن موصوف کی ایجاد معمولی قسم کی نہیں ہے۔ اس سے اقلیم سائینس میں شاندار انقلاب واقع ہوگا۔ نوبل پرائز ہر کس و ناکس کو نہیں دیا جاتا، اس سے پیشتر علم طبعی کی عجیب تحقیقات اور حیرت افزا اختراعات کے صلہ میں ایکس رے کے مخترع ڈبلیو سی۔ رونجن (Rontgen) ریڈیم کی موجد میڈم کوری (Curie) لارڈ ریلے۔ پروفیسر سر جے۔ ٹامسن ذروں کی ماہیت کی تحقیقات کے صلہ میں، بے تار کی تار برقی کے موجد مارکونی، طبعیات کی قابل قدر اختراع کے مخترع جرمن ماہر میکس پلانک (Planck) اے۔ آئن اسٹائن (Eeinstein) جس کے مسئلہ اضافیات سے صدہا سال کے مسلمہ اصول موضوعات تہ و بالا ہوئے جاتے ہیں۔ نیل بوہر (N. Bohr) ڈنمارک کے ماہر طبعیات کو مسلمہ سالمات کی چھان بین کے لئے۔ امریکہ کے ماہر ملی کن (Milhkan) کو خاص برقی شعاع کی دریافت کے صلہ میں اور پروفیسر کامٹن کو طبعی تحقیقات کے عوض میں نوبل پرائز عطا کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سرچندر رامن کی ایجاد کیسی بلند پایہ ہے جس کی بدولت آپ مشہور زمانہ ماہران طبعیات کے ہمپایہ شمار کئے جاتے ہیں۔

مسئلہ تنویر رامن کی ماہیت

سنہ ۱۹۲۷ء کے شروع میں جبکہ سرچندر شیکھر رامن کی عجیب و غریب اور معرکۃ الآرا اختراع عمل میں آئی تھی، تو اس کی اجمالی کیفیت کلکتہ کے مشہور اخبار اسٹیٹسمین میں طبع ہوئی تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد کسی ماہر نے ایک مختصر مضمون "سلمات آپس میں کیوں ترکیب پاتے ہیں؟" کے عنوان پر ۱۶ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء کے پرچہ میں طبع کرایا تھا، ذیل کے معلومات ان ہی مضمونوں سے ماخوذ ہیں۔ اس اختراع سے شروع میں جو اہمیت منسوب کی گئی تھی اس کا اجمالی حال یہ ہے کہ عمل تنویر (Radiation effect) کے ایک نامعلوم پہلو کے انکشاف سے جو کلکتہ میں تحقیقات کے وسیلہ سے عمل میں آیا ہے ساری دنیا کے ماہران طبعیات غیر معمولی دلچسپی ظاہر کر رہے ہیں۔ اس اختراع کا نام "رامن تنویر" (Roman effect) ہے اور یہ اس وقت بحث و تمحیص کا سب سے پسندیدہ موضوع بنا ہوا ہے۔ سائینس کے رسالوں میں اس کا بڑا چرچا ہو رہا ہے۔ یورپ کی مشہور تعلیم گاہوں میں اس کا ذکر خیر ہوتا ہے۔ اس ایجاد کی اہمیت

کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جرمنی کے ایک سرکردہ رسالہ نے بیس کالم کا مضمون شائع کر کے اس کی تشریح کی ہے۔ پروفیسر رامن کی ایجاد کا لب لباب یہ ہے کہ جب سالمات پر روشنی پڑ کر منتشر ہو جاتی ہے تو عجیب و غریب اثر رونما ہوتا ہے جو فقط منشور مثلثی؛ سپکٹروسکوپ ہی کے ذریعہ سے دکھائی دیتا ہے۔ تجربہ کے واسطے مرکزی ویپر لیمپ (Mercury Wapour Lamp) سے کام لینا چاہیئے۔ اس سے بے انتہا صاف روشنی پیدا ہوتی ہے، اگر اسے منشور مثلثی سے دیکھا جائے تو یہ نیلی، آسمانی، سبز اور دو قسم کی پیلی شعاعوں کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر جب یہ صاف روشنی برف یا پانی سے گزرتی ہے تو وہ منتشر ہو جاتی ہے۔ اگر پھر اسے منشور مثلثی کے ذریعہ سے ملاحظہ کرو، تو ایسی شعاعیں دکھائی دیتی ہیں جو مرکری ویپر لیمپ کی آنکھیں خیرہ کرنے والی تیز روشنی میں قطعاً نہیں پائی جاتیں۔ تمام شفاف اجسام میں یہی بات پائی جاتی ہے۔ مگر روشنی کے عجیب رنگ مختلف چیزوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی عجیب کیفیت کیوں رونما ہوتی ہے۔ اس کا جواب پروفیسر رامن کے نظریہ کے مطابق یہ ہے کہ روشنی مسلسل تموج نہیں ہے بلکہ ایسے ذروں سے مرکب ہے جو روشنی کی سرعت کے ساتھ خلا میں گردش کرتے پھرتے ہیں۔ جب سالمات مادہ کے ذروں سے ٹکراتے ہیں تو یا تو وہ صدمہ کھا کر اپنی ابتدائی قوت کے ساتھ پیچھے کو ہٹ جاتے ہیں اور روشنی منتشر دکھائی دیتی ہے یا جب ذرے حالتِ اضطراب میں ہوں اور وہ روشنی کے ذروں سے ٹکر کھائیں تو اپنی قوت آخر الذکر کے حوالے کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بڑھی ہوئی قوت کے ساتھ گردش کرنے لگتے ہیں، اس وجہ سے منتشر نور منشور مثلثی میں نئی روشنی نمایاں کرتا ہے۔

پروفیسر رامن کی دریافت سے نہ صرف عمل تنویر ہی کا نیا پہلو رونما ہوتا ہے، بلکہ سالمات اور مادہ کی ماہیت کی تحقیقات کے واسطے راستہ صاف ہو گیا ہے، نیز اس کے نورانی خواص پر بھی روشنی پڑنے کی قوی توقع ہے۔ اس دریافت کی وسیع اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ آسٹریلیا کے نہایت مشہور ماہر سائنس پروفیسر آر۔ ڈبلیو۔ وڈ نے لندن کے ہفتہ وار سائنسی اخبار "نیچر" میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اس شاندار دریافت سے بڑے بڑے نتائج مرتب ہونگے۔

سالمات کے اجتماع کا مسئلہ پروفیسر وڈ ہی پر کیا موقوف ہے برطانیہ کے چوٹی کے ماہر طبعیات پروفیسر سر ارنسٹ رادرفرڈ نے رائل سوسائٹی لندن کے روبرو اس کی توضیح کے لئے بنا ہوا ڈریس وقف کیا تھا۔ ڈاکٹر اے سی۔ سنز نیر نے اخبار نیچر میں مطول محققانہ مضمون لکھ کر یہ بات واضح کی کہ اس دریافت کی بدولت دو سال کے اندر بہت قابل قدر تحقیقات طبعی کا کام انجام پذیر ہوا ہے۔ سر چندر رامن نے اخبار اسٹیٹسمین کے ایک نامہ نگار سے دوران گفتگو میں یوں اظہار خیال فرمایا تھا کہ "ماہران طبعیات اور کیمیا کی دلچسپی کا سب سے بڑا

اور ضروری سوال یہ ہے کہ سالمات کے اجتماع سے ذرے کیوں بنتے ہیں؟ اس کا مفصل جواب دینا سردست دشوار ہے، مگر حقائق کیمیا سے یہ ظاہر ہے کہ ترکیب کیمیائی مختلف قسم کی ہوتی ہے، مثال کے لئے نمک کو لینا چاہیئے۔ سوڈیم اور کلورین کے عناصر جب ملائے جائیں تو ان کا اتصال پھٹنے والے گولے کی طرح عمل میں آتا ہے تو نمک پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جب نمک پانی میں گھولا جاتا ہے تو اس کے اجزائے ترکیبی سوڈیم اور کلورین کے برقی ذروں میں نمایاں ہوتے ہیں۔ رامن تنویر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سالمات کے کیمیائی ارتباط میں کتنا زور ہے۔ علاوہ ازیں سالمات کی ساخت کا اندازہ بھی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ یہ معمہ بہت پیچیدہ ہے جس سے صرف سائنس سے آشنا حضرات ہی پورا لطف ذہنی حاصل کر سکتے ہیں۔

گراں قدر انعام پانے کی تقریب پروفیسر سر چندر رامن کو نوبل پرائز عطا ہونے کی خبر آخر اکتوبر میں مشتہر ہوئی تھی۔ اس وجہ سے آپ وسط نومبر ۱۹۳۰ء میں اسٹاکہالم کو روانہ ہو گئے تاکہ شاہ سویڈن کے دست مبارک سے گراں قدر انعام قبول کریں۔ چنانچہ گذشتہ ۱۰ دسمبر کو ایک شاندار مجمع کے روبرو شاہ سویڈن نے سر چندر رامن کو انعام عطا کر کے سرفراز کیا۔ شہر اسٹاکہالم کے نامی اخباروں میں سر چندر موصوف کے فوٹو شائع ہوئے، مختصر حالات زندگی کے علاوہ موصوف کی سائنسی تحقیقات کے قابل قدر نتائج کا ذکر بھی قدرے تفصیل کے ساتھ شائع ہوا تھا جس سے تعلیم یافتہ اور روشن خیال اصحاب کے درمیان ملک ہند کی خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ تقسیم انعام کے بعد سر چندر رامن نے رائل ٹکنیکل کالج میں ایک محققانہ لکچر دیا جس سے طلبا اور استادوں کو بہت نفع حاصل ہوا۔

الفریڈ نوبل کی وصیت غالباً یہاں پر "نوبل پرائز" کے قائم کرنیوالے ڈاکٹر الفریڈ نوبل کے متعلق کچھ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ ڈاکٹر نوبل کی ولادت ۱۸۳۳ء میں ہوئی تھی اور ان کا انتقال ۱۸۹۶ء میں ہوا تھا۔ بھک سے اڑنیوالے مصالح کے موجد آپ ہی تھے۔ اس ایجاد سے لاکھوں روپے پیدا کئے۔ مرنے سے ایک سال پہلے اپنی جائداد کا جزو اعظم بقدر تین کروڑ کرونر اس مقصد سے وقف کیا کہ اسکے سود کی رقم سے پانچ انعام ایسے حضرات کو ہر سال ملا کریں جو بنی نوع انسان پر سب سے بڑا احسان کرنیکی کوشش کریں، ایک انعام طبعیات کی عجیب ایجاد کیلئے، دوسرا کیمیائی اختراع کیلئے تیسرا فزیالوجی یا ڈاکٹری کی نرالی تحقیقات کے بہترین نتائج کیلئے چوتھا ادبیات کے خیالی کمال کے واسطے اور پانچواں امن دنیا قائم کرنیکے بہترین وسائل وضع کرنیکے واسطے مقرر کیا گیا ہے۔ یہ انعام ہر سال مستحق ماہروں کو تقسیم ہوتے ہیں ہر ایک انعام لاکھ سوا لاکھ روپیہ کے قریب ہوتا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں سر رابندر ناتھ ٹیگور کو ادبیات خیالی کے صلہ میں سوا لاکھ کا انعام ملا تھا۔ اسی وجہ سے سر چندر رامن دوسرے ہندوستانی اور طبعیات کی بیش بہا تحقیقات کیلئے انعام پانیوالے پہلے ایشیائی ہیں۔

ہندوستان اور فنِ پرواز

(از ہز ہائینس نواب صاحب بہادر لوہارو)

ہر چند کہ ہندوستان نے جنگ عظیم کے بعد سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی امور میں غیر معمولی ترقی کی ہے، جس کا وہم و گمان بھی زمانۂ سابق میں نہ تھا، لیکن افسوس کہ مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی کوئی خاص توجہ فن پرواز کی جانب نہیں کی گئی۔ ہندوستان کا شمار بھی مہذب ممالک میں ہے لیکن دیگر ممالک کے لوگ جو ہم سے بھی کم تعلیم یافتہ ہیں آنیوالے زمانہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر ایک مقبول عام فن کو حتی الوسع کامیاب بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہندوستان دنیا کے اُن وسیع ممالک میں سے ہے جس میں ترقیات کی توقعات کا اندازہ بیش از بیش کیا جا سکتا ہے لیکن پھر بھی فنِ پرواز کو جو ترقی کا راز اور توقعات کا جزو اعظم ہے فراموش کیا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں پرواز نہایت مفید اور کامیاب ثابت ہو سکتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قدرت نے اس ملک کو ہوائی جہاز رانی کے لئے موزوں بنایا ہے۔ یعنی پہاڑوں اور بلند چوٹیوں کو ایک جانب قائم کر کے اعلیٰ سے اعلیٰ میدان دور دراز مسافت طے کرنے کے لئے بنا دیے ہیں۔ نہ سمندر حائل ہیں نہ پہاڑ نہ ولدل ہے اور نہ طوفان غرض ہر شے اُسی حد تک ہے کہ وہ پرواز میں مخل نہیں ہو سکتی۔

عام طور پر لوگ پرواز کو خطرناک تصور کرتے ہیں، اور چو چند حوادث ہوابازوں کی غلطی سے پیش آتے ہیں اُن کو آلات پرواز کے غیر محفوظ ہونے کی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ ان صاحبوں کے خیال میں خواہ کتنے ہی حوادث موٹر لاریوں اور ریلوں سے پیش آئیں ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کی وجہ محض اسی قدر ہے کہ ابھی لوگ پرواز کی طرف سے غیر مطمئن اور ریل و موٹر کی طرف سے مطمئن ہیں۔ یہ امر غور طلب ہے کہ آلات مشین پر کسی دلیل سننے اور بحث کرنے کے بغیر یہ فتویٰ دینے کو تیار ہیں کہ ہوائی جہاز اور پرواز دونوں خطرناک ہیں۔ دہلی میں چند حوادث پیش آئے جن کے اسباب دریافت کرنے کی غرض سے طلبا اور فن پرواز کے شوقین تحقیقات کے لئے گئے اور اُن حوادث کے متعلق کارکنان پرواز سے سوالات کئے، اُنھوں نے اس بات کا ثبوت دیا کہ یہ حوادث ہوابازوں کی غلطی کے نتائج ہیں نہ کہ مشین کی کمزوری اس پر بھی توہمات میں کوئی خاص کمی نہیں ہوئی

دوسری اقوام کو ملاحظہ فرمائیے کہ ان کی جانیں جاتی ہیں پھر بھی باز نہیں آتے اور اپنی ترقیات میں اسی طرح سرگرم کوشش رہ کر اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کرتے ہیں اور نام کے ساتھ مالی فائدہ بھی حاصل کرتے ہیں

ہندوستان میں صاحب حکومت اور صاحب زر دونوں موجود ہیں۔ اگر ذرا اپنی راحت، کمی اخراجات اور وقت کی بچت کی طرف متوجہ ہوں تو پرواز کو ان امور کے لئے بہت مفید پائیں گے۔ مثلاً ہندوستان جیسے وسیع ملک میں ڈاک رسانی، رسد رسانی وغیرہ کے لئے ہوائی جہاز بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ جو چیز پشاور سے مدراس یا کلکتہ چار پانچ روز میں پہنچتی ہے وہ ہوائی جہازوں کے ذریعہ نہایت آسانی سے دو روز میں پہنچ سکتی ہے۔ سفر میں کس قدر سہولت ہو سکتی ہے، جو سفر پشاور سے مدراس تک تین دن تین رات میں طے ہوتا ہے وہ چند گھنٹوں میں طے ہو سکتا ہے۔ غرضکہ پرواز نہ صرف سہولت اور آسایش کا باعث ہو سکتی ہے بلکہ وسعت خیالات و ترقی ملک کا بھی بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔

اس وقت ہندوستان میں پرواز کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے، اس لئے کہ صرف چند کلب ہیں سو وہ بھی اتنے بڑے ملک کے عظیم شہروں اور غیر ممالک والوں کی بدولت چل رہے ہیں۔ مثلاً کلکتہ، مدراس، بمبئی، کراچی کے کلب محض باہر والوں کی امداد یا دلچسپی کی وجہ سے جاری ہیں، دہلی اور لکھنؤ وسط ہندوستان میں ہونے کی وجہ سے اپنا گذارہ چلا رہے ہیں۔ جودھپور کا انحصار محض والیِ ملک کی سرپرستی پر ہے، اور کانپور و لاہور کے مرکز جیسے برائے نام ہیں سب جانتے ہیں۔ اگر اس ملک میں جو وسعت میں یورپ کی برابری کرتا ہو صرف نو کلب پرواز کے موجود ہیں تو کیا ہوا؟

پرواز کی تمام ناکامیابی ہماری پست ہمتی اور خوف کے باعث ہے، ہوائی جہاز میں بیٹھنا گویا موت کے منہ میں جانا خیال کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ طبقہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ دماغ والے بھی اسے جیتے جی موت کے منہ میں جانے سے نامزد کرتے ہیں۔ دوسرے کو ہمت دلانا تو در کنار ہر شخص کو پرواز سے باز رکھنا اپنا فرض تصور کیا جاتا ہے۔ خدا خدا کرکے کراچی سے دہلی تک ڈاک اور مسافرت کے لئے جہاز چلنے لگا تھا لیکن اسے بھی کامیاب نہ ہونے دیا۔ متمول اور سوداگر صاحبان کو چاہیئے تھا کہ دہلی سے کراچی تک بجائے ریل کے جہاز میں سفر کرتے لیکن مشکل اور سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ صاحب ملازم ساتھ کس طرح رہیں، پھر بستر، ٹرنک، پھلوں کا ٹوکرہ، تھیلی بیگ، لوٹا، گلاس اور صراحی کس طرح ہمسفر ہوں۔ اس پر طرہ یہ کہ جہاز کی ناگوار آواز کون برداشت کرے اور بفرض محال اسے بھی برداشت کر لیا جائے اور خدانخواستہ پٹرول اٹک جائے تو گویا پھر جان دینے ہی میں آئے نہیں جناب نہیں ایسی سواری اور سفر سے ہم باز آئے۔ بھلا موجودہ زمانہ اور ان خیالات کو ملاحظہ فرمائیے اور بتلائیے کہ ہندوستان کس طرح ترقی کر سکتا ہے۔

سوئیٹ روس اور ہندوستان کے اقتصادی حالات

(۱)

(از مسٹر منوہر لال طالب بی۔اے (آنرز) ایل۔ایل۔بی، وکیل چکوال)

آجکل جسے پوچھو وہی بیزار ہے، ہر طرف بے روزگاری وکساد بازاری کا زور وشور ہے، ملازمتوں کا تو پہلے ہی سے بُرا حال تھا، اب ان کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی ہے۔ تنخواہیں کٹ گئیں، اسامیاں گھٹ گئیں، غرضیکہ تخفیف کا کلہاڑا پورے زور کے ساتھ چل رہا ہے۔ بیوپاری بلحاظ پیشہ آزاد تھے، سونے چاندی سے ہر وقت کھیلا کرتے تھے مگر اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ روزگار روپیہ میں ایک آنہ رہ گیا، لکھپتی دیوالیہ ہو رہے ہیں، اور بیکاری وبے روزگاری نے سب طرف اپنا رنگ جما لیا ہے۔ نوجوان طبقہ ان حالات سے گھبرا کر مرنے مارنے کو تیار ہوگیا ہے جس سے سیاسی جرائم میں معتدبہ اضافہ ہوگیا ہے۔ گورنمنٹ نے بیماری کی جڑ کو چھوڑ کر علامات کی روک تھام شروع کی ہے جس سے خفیہ پولیس کے اخراجات میں ترقی ہوگئی، حکومت کا خرچ بڑھ گیا، تجارت کی سرد بازاری سے محصول گھٹ گیا، آمدنی میں کمی واقع ہوئی اور بجٹ میں خسارہ ہی خسارہ نظر آنے لگا اور اس کے پورا کرنے کے لئے نئے ٹیکس لگانے پڑے۔ ضروریات زندگی بھی سستے نہ رہ سکیں، ٹکٹ ڈاک کی شرح بڑھا دی گئی، ریل والوں نے کرایہ زیادہ کر دیا، تار والوں نے اپنے دام بڑھائے۔ لوگ پہلے ہی سے ناداری کے ہاتھوں نالاں تھے اب نئے ٹیکس ان کی کمر ہمت اور توڑ رہے ہیں، ایسا معلوم ہوا کہ دنیا ہی بدل گئی ہے۔

یوں تو غریب ہندوستان کا ہر فرد بشر اس غیر معمولی کساد بازاری کے ہاتھوں نالاں ہے اور کوئی طبقہ ایسا نہیں جس پر اس کا اثر نہ ہوا ہو مگر کاشتکار طبقہ اس سے خاص طور پر متاثر ہوا ہے؛ غلہ کا بھاؤ گر گیا ہے، نہری علاقہ میں تو زمین سے اتنی بھی پیداوار نہیں ہوتی کہ سرکاری لگان اور آبیانہ ادا ہو سکے۔ کاشتکار اور مالکان زمین کی ضروریات کا کیا ٹھکانہ ہے۔

اس وقت دنیا میں ہر ایک ملک کی تجارت کو نقصان پہنچا ہے ہر جگہ کساد بازاری کا رونا ہے پھر بھی جو ممالک خود مختار ہیں ان کی آبادی کا کثیر حصہ صنعت وحرفت میں مشغول ہے۔ بایں ہمہ اس وقت تمام ممالک میں بے روزگاری کا چرچا ہے اور مزدوری گھٹ گئی ہے پچھلے سال امریکہ میں سترہ سو بنک بند ہوئے،

برطانیہ نے "گولڈ اسٹینڈرڈ" ترک کر دیا، اس کی دیکھا دیکھی دیگر ممالک نے بھی اپنے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اس شاہد طلائی کو طلاق دے دیا اور اب اس حشر خیز تباہ کار اقتصادی طوفان میں ہاتھ پاؤں مار کر زندگی کی آخری کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ایک عالم جانتا ہے کہ دنیائے استعمار کا اقتصادی محل عنقریب ہی منہدم ہونیوالا ہے۔

ہندوستان ہی دنیا میں ایک ایسا ملک ہے کہ شاندار تاریخی روایات اور فخر عالم تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہونے کے باوجود اس کی مالی اور غیر ملکی پالیسی غیروں کے ہاتھ میں ہے۔ شاید اسی وجہ سے ہندوستان پر موجودہ کساد بازاری کا اثر بہت نمایاں ہوا ہے۔ یہاں کی کثیر آبادی کے نصف حصہ کو دو وقت کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا، اسی فیصدی اہل ملک کی زیست کا انحصار زراعت پر ہے اور غلہ و دیگر اجناس کی قیمت اس قدر گر گئی ہے کہ سرکاری مطالبات ادا کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس لئے ہندوستان کے زراعت پیشہ اور ان کے متعلقہ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں اور حیران ہیں کہ یہ کیسی ہوا چلی ہے، اتنا سستا غلہ تو اپنی یاد میں کبھی نہیں دیکھا۔ نہ معلوم پیسہ کھنچ کر کدھر چلا گیا ہے۔ فلسفیانہ دماغ رکھنے والے اصحاب یہ کہکر تسلی دیتے ہیں کہ یہ حالت صرف ہندوستان تک محدود نہیں ساری دنیا کا یہی حال ہے۔ اس وقت تمام دنیا کی تجارت تباہ و برباد ہو رہی ہے۔ کوئی قسمت کے سر الزام تھوپ کر دل کو تسلی دیتا ہے کوئی شرح تبادلہ کو ایک شلنگ چار پنس نہ کرنے کی پالیسی کو اس تباہی کا ذمہ دار قرار دیتا ہے، جتنے منہ اتنی باتیں، مگر یہ تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستان بالعموم اور اس کا زراعتی طبقہ بالخصوص بری طرح پس رہا ہے۔

اہل مشرق محسوس کرتے ہیں اور قسمت کے سر الزام دیکر چپ ہو جاتے ہیں یا چرخ پیر کو صلواتیں سنا کر دل کا غبار نکال لیتے ہیں۔ اہل مغرب دیکھتے اور سوچتے ہیں اور مناسب تدابیر عمل میں لاتے ہیں، وہ تقدیر کہہ کر چپ رہنا نہیں جانتے۔ اہل مشرق ہمالہ کی رفعت اور خوبصورتی کو دیکھتے ہیں اہل مغرب اس کی اونچائی ناپتے اور اس پر چڑھنے کی کوشش میں جان تک لڑا دیتے ہیں۔ ہم آبشاروں کی چادر میں حسن فردوس کے مناظر دیکھتے ہیں، وہ یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ اس سے کس قدر برقی قوت پیدا کی جا سکتی ہے، ہم پرستار حسن ہیں وہ پرستار عمل، ہم خوبصورت اشیاء پر مائل ہیں وہ کارآمد پر، ہم اہل دل ہیں وہ اہل دماغ۔ ہم فوری جذبہ کے ماتحت کام کرتے ہیں، وہ پورے غور و خوض کے بعد، ہم جلد ہی ناامید ہو کر رہ جاتے ہیں وہ سوچتے رہتے ہیں اور کوئی نہ کوئی صورت اپنے فائدہ کی نکال ہی لیتے ہیں، ہم مشکل سے ڈر جاتے ہیں وہ مشکل پر فتح پاتے ہیں، ہم مشکل کو ناممکن کہتے ہیں، وہ

ناممکن کو ممکن کر دکھاتے ہیں، ہم مشکلات کے ڈر سے ضمیر کو دبا دیتے ہیں وہ ضمیر کا حکم پاکر خدا کی خدائی سے بھی بے خوف ہو جاتے ہیں، وہ یہ نہیں دیکھتے کہ دنیا کیا کہتی ہے، وہ سوچتے ہیں کیا کرنا چاہیئے کیسے کرنا چاہیئے اور دنیا اور اس کے طریق کار سے بے پرواہ ہو کر ضمیر کو مشعل راہ بنا کر عقل و دماغ کے دکھاتے ہوئے راستہ پر چل نکلتے ہیں. استقلال ان کے ہمرکاب ہوتا ہے، ہمت ان کی بلائیں لیتی ہے اور کامیابی ان کے قدم چومتی ہے، ہم دیکھتے ہیں اور عش عش کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے اکثر ممالک اس وقت قعر غربت و فلاکت میں گھرے ہوئے ہیں، مگر ہماری حالت ہی جدا ہے، گیہوں کے ساتھ گھن پس رہا ہے، ذرا اپنی بدقسمتی یا نااہلیت سے نظر اٹھایئے اور سوویٹ روس کی طرف دیکھئے، کیا یہ حیرت و استعجاب کا مقام نہیں ہے کہ دنیا کے تمام مہذب ممالک جو روس کے اصولوں کا مضحکہ اڑانا اپنا فرض سمجھتے ہیں مالی مشکلات کے ہاتھوں نالاں ہیں، مزدوروں کی تخفیف اجرت اور کہیں اضافۂ محاصل کی کوشش پر بھی صورتِ حال بہتر ہوتی نظر نہیں آرہی ہے، لیکن سوویٹ روس کے بجٹ کا حال ہی مختلف ہے، خسارہ درکنار اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے، روپیہ فاضل ہے، نئے ٹیکسوں کی ضرورت نہیں، پیداوار کی افراط ہے. لوگ مطمئن ہیں، ملکی، تعلیمی، صنعتی اور معاشرتی ترقی کی سرعت رفتاری عدیم المثال ہے. حکومت فلاح عامہ کے نئے نئے کام ہاتھ میں لے رہی ہے. کیا یہ سوچنے کی بات نہیں ہے کہ سوویٹ روس اس کساد بازاری کی حالت میں بھی کیوں اس قدر خوشحال اور فارغ البال ہے!

ہندوستان اور روس کی حالت میں بڑی مشابہت ہے، اس میں بھی ہندوستان کی طرح مزدوروں اور کسانوں کی اکثریت ہے، اس کا رقبہ بھی ہندوستان کی طرح نہایت وسیع (۱/۶ حصۂ زمین) ہے اس میں بھی دنیا کی آبادی کا ایک کثیر حصہ (۱۴۶۰۰۰۰۰۰) آباد ہے، اور اس نئے اصولوں پر مبنی حکومت سے پہلے ۱۹۱۷ء تک اہل روس بھی اسی طرح جاہل اور بے علم تھے جس طرح ہندوستانی جمہور آجکل ہیں۔ ان میں بھی مختلف النسل قومیں آباد تھیں، ان میں بھی فرقہ وارانہ مناقشات اور تعصبانہ مظاہرے رونما ہوتے رہتے تھے۔ پھر کیا یہ اہل ہند کے لئے سوچنے کا مقام نہیں کہ کس طرح یہ لوگ قعر مذلت سے نکل کر چند سال کے قلیل عرصہ میں فراوانی اور خوشحالی کے شہ نشین پر متمکن ہو گئے ہیں، ہماری راہ میں کیا باتیں حائل ہیں، وہ کون سے اسباب ہیں جو روس کی موجودہ ترقی کا موجب ہوئے ہیں۔ یہ نہایت دلچسپ اور سبق آموز سوالات ہیں، ان وجوہات اور سوویٹ روس کے حالاتِ حاضرہ پر انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں کسی قدر شرح و بسط سے تبصرہ کیا جائیگا۔

ہماری وہم پرستیاں

(از شریمتی شیو کماری دیوی دختر حضرت جگر بریلوی)

ہم لوگ وہم پرستیوں کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ وہ ہماری زندگی کا ایک جزو بن گئی ہیں، کتے نے کان پھٹپھٹا دیے اور ہم کام کرتے کرتے رک گئے۔ کسی نے چھینک دیا ہم خواہ مخواہ اس کی طرف غصہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ بلی راستہ کاٹ گئی اور ہمارا دل بیٹھ گیا، اگر کہیں راستہ میں کانا نظر آ گیا تو زندگی ہی کی خیر منانے لگے۔ کیونکہ مشہور ہے ؎

سات کوس تک ملے جو کانا　　　جو گھر کو لوٹے بڑا سیانا

ایک طرف تو وہ توہمات ہیں جن کی بنا نحوست پر ہے، دوسرے وہ ہیں جو مذہب کا جزو سمجھے جاتے ہیں، مثلاً شادی بیاہ میں کوئیں اور ڈیوڑھی کا پوجنا، چوراہے کا پوجنا وغیرہ مکروہ رسمیات میں داخل ہے۔ اور کسی تاویل سے بھی یہ باتیں مذہب میں شامل نہیں سمجھی جا سکتیں۔

ایک اور قسم کے توہمات بھی ہیں جو دیوی دیوتا اور بھوت پریتوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، مثلاً جب ہم لوگ تحصیل سیجا ضلع الہ آباد میں تھے تو ہمارے یہاں ایک برہمنی ملازم تھی، ایک روز اس کے ہاتھ میں چوٹ لگ گئی اور زخم ہو گیا تھا پوچھنے پر کہنے لگی کہ بھوانی نکلی ہیں، پوچھا گیا کہ یہ کیسی بھوانی ہیں تو بتلایا کہ یہ لہو (خون) کی بھوانی ہیں۔ ایک روز بڑے زور کی آندھی آئی تو کہنے لگی کہ دیوی بندھیاچل کو جا رہی ہیں۔

اسی تحصیل میں ہمارے یہاں ایک اہیر ملازم تھا اس نے اس لئے فاقے کرنے شروع کر دیے کہ اس پر دیوتا کھیلیں۔ میرے والد صاحب نے کہا کہ جب تک تم ہمارے یہاں ہو تم پر دیوتا نہیں کھیلیں گے چنانچہ یہی ہوا، اس نے برت رکھے اور پوجا پاٹ بھی کی مگر دیوتا نہیں کھیلے۔ ایک مرتبہ اس کا ڈیڑھ سال کا بچہ بیمار ہو گیا اس نے سیانوں کو دکھلایا اور جھاڑ پھونک شروع کر دی، ہوتے ہوتے اس کو نمونیا ہو گیا، والد صاحب نے زبردستی اس کو اسپتال میں داخل کرا دیا اور ڈاکٹر صاحب نے بڑی ہمدردی اور توجہ سے علاج کیا تب کہیں وہ بچہ جانبر ہوا۔ یہ تو رہا جہلا کا حال مگر تعجب تو یہ ہے کہ مہذب گھرانوں میں بھی اس قسم کے خیالات رائج ہیں۔

ایک مرتبہ میں اپنے ایک عزیز کے یہاں گئی ہوئی تھی وہاں میرے ایک اور عزیز کی چار سالہ لڑکی کو ایک قسم کے دورے آنے لگے مگر اُس کے ماں باپ اور دیگر متعلقین نے یہی خیال کیا کہ آسیب کا خلل ہے۔ کسی نے مرچوں کی دھونی دی، کسی نے اور گندی چیزیں سُنگھائیں۔ کسی نے بال کاٹ لئے کسی نے منہ پر طمانچے مارے غرض وہ ننھی سی جان ایک مرض کی وجہ سے ہزارہا مصیبتوں کا شکار ہوئی لیکن اس کے بیدرد ماں باپ کا دل نہ دکھا کہ آہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ لاؤ کسی ڈاکٹر یا طبیب کو تو دکھا دیں۔ بہر نوع مجھ سے یہ حال نہ دیکھا گیا، لیکن وہاں کون سنتا تھا کیونکہ میرا شمار تو بچوں میں تھا۔ وہ بچی سخت جان تھی بچ گئی ورنہ سب کے سب رو پیٹ کر ہی بیٹھ رہتے اور یہ خیال کسی کے دل میں بھی پیدا نہ ہوتا کہ اس کی موت کا باعث ہماری جہالت تھی۔

یہ توہمات وخیالات جسم و دماغ کے قویٰ کو بالکل ضعیف و کمزور بنا دیتے ہیں، جن بچوں کی نشوونما ہی ایسی فضا میں ہوئی ہو جو صحیح قوت عمل اور صحیح جذبۂ ایمان کے منافی ہے۔ اُن کی طبیعتوں میں شروع ہی سے ایک خوف باطل سرایت کر جاتا ہے جو ایک طرف تو جسمانی قوت کو کمزور بنا دیتا ہے دوسری طرف جزو مذہب بن کر ہندو دھرم کو قابل تضحیک صورت میں پیش کرتا ہے اور شرک وکفر کا اعتراض وارد کراتا ہے۔

ان توہمات کی ابتدا کسی طرح سے ہوئی ہو، لیکن ان کی پرورش کا سبب اب جہالت ہی جن کو دور کرنے کے لئے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہے مگر تعلیم کا یہ حال ہے کہ ہماری دیہاتی آبادی میں چار فیصدی بھی ایسے اشخاص نہ ہونگے جو اپنے نام خود لکھ سکنے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ بعض مدبروں کا خیال ہے کہ اس کا واحد علاج سوراج ہے لیکن اگر یہ بھی مان لیا جائے تو سوراج ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر مشکل نظر آرہی ہے۔ دوسرے اس پر یہ بھی مثل صادق آتی ہے کہ "تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود"۔ میری سمجھ میں تو صرف ایک تدبیر نظر آتی ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص خصوصاً ہم عورتیں اپنی زبان، قلم، عمل غرض ہر طرح سے ان برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ حکومت خود اختیاری یا سوراج ہماری اخلاقی برائیوں کو دور نہیں کر سکتا ہے جب تک کہ ہم خود ان کے انسداد کی تہ دل سے کوشش نہ کریں۔

پروین کجکلاہ طہرانی

(از منشی احمد حسین باروی صاحب ناظم اعلیٰ اودھ پنچ لکھنؤ)

آپ کا نام شہزادی فرطیس بانو اختر جہاں آرا اور کجکلاہ خطاب ہے، تخلص دو ہیں، پروین و شیریں ۱۹۰۱ء میں بمقام طہران ایران پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد کا نام میرزا عاشق حسین المتخلص بہ بزم ہے، آفندی خطاب خاندانی ہے، قزلباش ہیں مرثیہ گو اور مرثیہ خواں ہیں، میرزا جعفر علی قسیم مرحوم کے بیٹے اور منشی منیر مرحوم شکوہ آبادی کے پوتے ہیں، سلسلۂ النسب نوشیروان عادل سے ملتا ہے، موروثی جائداد کے تلف ہونے کے بعد عہد نواب شاہجہاں بیگم والی بھوپال میں وزیر بھوپال کے آئے۔ ڈپٹی کی خدمات پر مامور رہے، اب پیرانہ سالی کے باعث عزلت نشین ہیں، شاعری کا مشغلہ دم کے ساتھ ہے اس وقت تک تقریباً نو سو مرثیے لکھ چکے ہیں۔ والدہ کا نام میری وکٹوریہ سارکس نپولین ہے۔ یہ کونٹ ولیم سارکس نپولین کمانڈر انچیف بھوپال کی چھوٹی بیٹی تھیں، کونٹ ولیم فرنچ نژاد اور نپولین اعظم کے خاندان سے تھے، بھوپال میں جنگی ولیم کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ نواب سکندر جہاں بیگم والی بھوپال کی سرکار میں ان کا بڑا رسوخ تھا، بیگم صاحبہ کے مصاحب تھے، ضلع اچھاور کے مختار کل کئے جانے کے علاوہ جاگیر بھی عطا ہوئی تھی۔

میرزا عاشق حسین بزم آفندی کی سعی اور سرکار شاہجہاں بیگم کی اشارت سے کونٹ ولیم نے میری وکٹوریہ کا عقد مرافقت میرزا صاحب کے ساتھ باندھا بعد منا کحت بزم آفندی نے وطن مالوف کا رخ کیا تھوڑے دنوں میں پروین کی ولادت سے مسز میری وکٹوریہ کی گود آباد ہوئی، جب پروین نے چھٹے مہینے میں قدم رکھا تو بزم آفندی نے ہندوستان کو مراجعت کی اور اس کے بعد سے ایران کی آمد و رفت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

آپ کا آبائی وطن طہران ہے، پروین کے جد امجد نے بادشاہ اودھ کے اصرار پر ہندوستان آئے لیکن وطن کو خیرباد نہیں کہا، البتہ آپ کے والد بزم آفندی نے یہیں ہوش سنبھالا اور آگرہ میں سکونت اختیار کی۔ اور پروین کی پیدائش کے بعد پھر طہران جانے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔

چار برس کے سن سے آپ کی اردو فارسی کی تعلیم شروع ہوئی، بزم آفندی کا زمانہ موافق تھا، لائق استادوں کی تعلیم و تربیت اور فاضل و طباع باپ کی نگہداشت نے آپ کے دل و دماغ پر حیرت انگیز اثر کیا
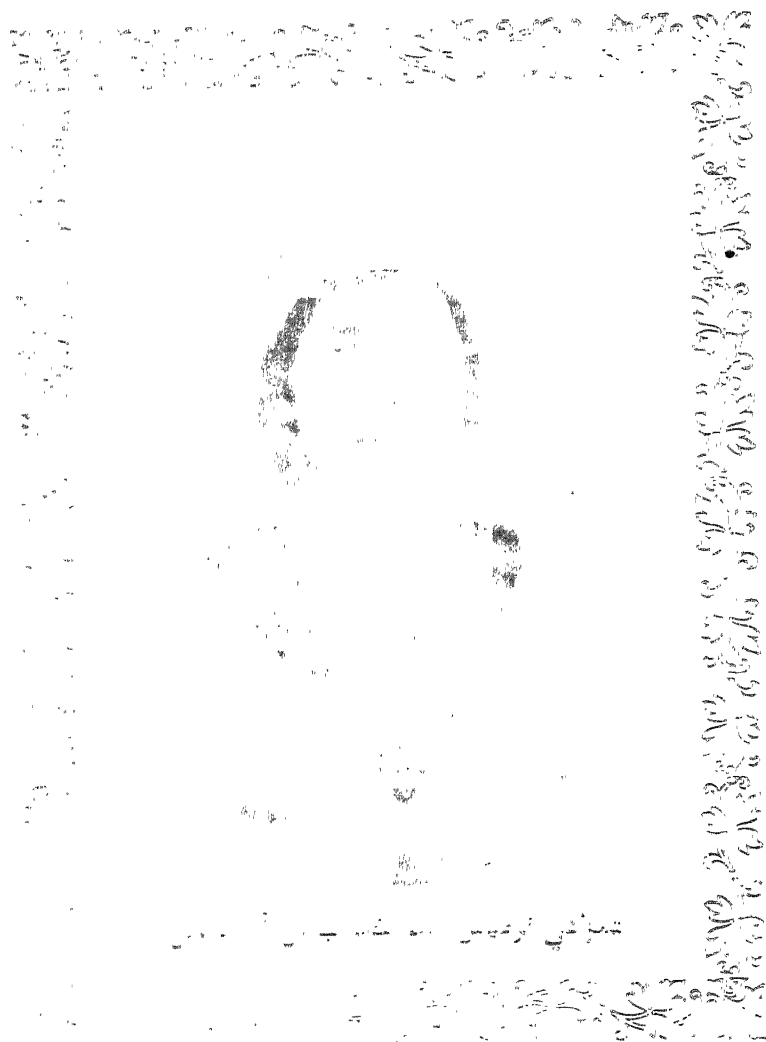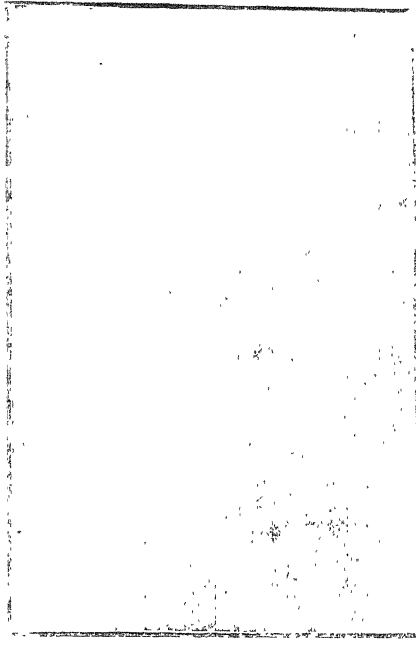
ہز ایکسلنسی کیپٹن سکندر حیات خان بالقابہ
قائمقام گورنر پنجاب

حتیٰ کہ نو برس کی عمر میں تحصیل علم سے ایک حد تک فراغت حاصل کر لی۔

شاعری کا ذوق نو سال کے سن سے شروع ہوا۔ پہلی غزل کا مطلع ملاحظہ طلب ہے ؎

کسی گلبدن پر جو آئی ہوئی ہے
طبیعت عجب رنگ لائی ہوئی ہے

اصلاح سخن کے لئے شفیق باپ کی موجودگی میں غیر کی کیا احتیاج تھی چنانچہ وہ اصلاح دیتے رہے۔ گیارہ سال کی عمر میں مولوی سید علی رضا نقوی زمیندار سرسی کے ساتھ شادی ہوئی، آٹھ سال تک خانہ آبادی رہی، اس عرصہ میں سوائے نوحہ جات کے اور کچھ نہ لکھا۔ اس کے بعد نامساعدت روزگار غالب آئی اور خانہ ویرانی ہوئی، طبیعت کو غزل گوئی سے لگاؤ پیدا ہو گیا اور اس وقت تک مشق سخن جاری ہے چنانچہ پانچ دیوان چار مثنویاں، چھ مرثیے کچھ قومی نظمیں اس مدت کی عرق ریزی اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہیں۔ ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے یہاں پر چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی آپ کو کافی مہارت ہے دو ناول اور ایک ڈراما آپ کی تصنیف ہیں، اس وقت ریاست جاورہ میں مقیم ہیں۔

(کلام پروین)

میں کسرائی وطن طہران مسکن گونڈوانے میں،
خدا معلوم کیونکر آ گئی اردو زباں مجھ کو

خوشامد سے جو حاصل ہو وہ رتبہ کوئی رتبہ ہے
نہیں مد نظر دنیا میں یہ نام و نشاں مجھ کو

اگر دست جوانی کو امنگیں کھینچتی بھی ہیں،
ذرا بڑھنے نہیں دیتا ہے نام خانداں مجھ کو

نہیں گر ثروت دنیا نہ ہو یہ فخر کیا کم ہے
امیر المومنیں کا کہتے ہیں سب مدح خواں مجھ کو

سنبھل کے پروین قدم اٹھانا کہ سخت مشکل ہے راہ الفت
ہزاروں جاں باز مرٹے ہیں وہ ڈھب ہے قاتل کی تیغ کا

رخت وحشت کم رہے ہیں جس کو میرے ہمنشیں
دل ہی جامہ بھی رشک کفن ہو جائے گا

حوروں کو اشتیاق ہے جنت میں دید کا
کیا پوچھتے ہو مرتبہ اپنے شہید کا

کیا ایسا مایوس ناکامیوں نے
دعا میری اب اثر ڈھونڈتی ہے

یہ عقدہ کھلا قیس کی جستجو سے
محبت بھی راحت کا گھر ڈھونڈتی ہے

اچانک کسی جا جو دل پر پڑا تھا
اسی تیر کو پھر نظر ڈھونڈتی ہے

کیا کہوں جب ٹوٹ کر نشتر رگ میں رہ گیا
چارہ گر کس یاس سے منہ دیکھ کر رہ گیا

دیکھتے ہی دیکھتے بسمل کی آنکھیں پھر گئیں
کھینچتے ہی کھینچتے سفاک خنجر رہ گیا

تو نے اے ضبط محبت خوب ہی روکی زباں
شکر ہی پردہ کسی کا روز محشر رہ گیا

الفت اسلام میں گو جل بسا ایماں طلب
اے پروین کا مگر سب کی زباں پر رہ گیا

سوم بنود

(ایک قصہ)

(از مسٹر سلیم جعفر)

بنو جس وقت بی۔اے پاس کرکے تلاش معاش میں گھر سے نکلا تو یونیورسٹی کے عطا کردہ پروسیری نوٹوں کا بھاؤ بہت گرچکا تھا۔ اور حالت یہ تھی کہ نام کے پیچھے ساری کی ساری اے۔بی۔سی۔ڈی لگی ہوئی ہے مگر بازار ملازمت میں اس جنس گراں کا خریدار کوئی نہیں پچیس سال پہلے انگران ڈگریوں میں سے کسی ایک کا پاس ہونا دلیل تھی اس بات کی کہ کسی نہ کسی دفتر میں کسی ایسی تنخواہ کی نوکری مل جائیگی جس سے صرف اپنے اور کنبے ہی کی آرام سے نہیں گذرے گی بلکہ ایک آدھ دور کے رشتہ دار کا بار بھی ہنسی خوشی اُٹھالیا جائے گا۔ تو آج کئی کئی ڈگریوں کے مجموعی اثر کے بھی اس سے زیادہ معنی نہیں کہ کسی نہ کسی طرح اپنی گذر ہو جائیگی۔ ایسے ناموافق زمانے میں کئی دفتروں میں کوشش کرنے کے بعد ایک نوکری ہاتھ آئی، مگر کتنے کی؟ وہی پچاس ساٹھ کی، وہ اس کو غنیمت سمجھتا تھا اور اس کا دل خیالات شکر و امتنان سے لبریز تھا۔

چند ماہ تنہا رہنے کے بعد ایک دن نہاتے ہوئے بنو کی نظر اپنے جسم پر پڑی تو وہ حیران ہوگیا، اب نہ وہ گول گول بازو ہیں نہ پہلوانوں کا سا ابھرا ہوا سینہ، بے اختیار منہ سے نکل گیا "یہ کیا ہوا غضب ہوگیا، کالج سے نکلنے کے بعد سے میں نے ٹینس کھیلنا چھوڑ دیا، اسی کا یہ نتیجہ ہے، اب میں ٹینس کلب کا ممبر ہو جاؤنگا، لیکن پہلے مجھے رکمنی کو لے آنا چاہیئے تاکہ ٹینس کھیلنے کا وقت مل جایا کرے"۔

اس خیال کا آنا تھا کہ رخصت لیکر گھر پہونچا اور ایک ہفتے کے اندر اندر اپنے اردھانگنی کو ساتھ لئے واپس آیا، اب اس کے وقت میں وسعت پیدا ہوگئی۔ دفتر سے آکر ہر روز شام کو ٹینس کا بلا ہاتھ میں لئے، سر سے پاؤں تک صاحب بنا، سڑکوں پر اکڑتا ہوا کلب جایا کرتا تھا۔ رات کو دو ایک گھنٹے چارلس گاروس کے ناولوں پر صرف کرتا اور کبھی اخبار لیڈر پڑھنے کے لئے کتب خانہ چلا جاتا۔ وہ انگریزی طرز زندگی کا دلدادہ نہ تھا مگر کالج کی تعلیم نے اس میں مغربی رنگ بھر دیا تھا اور ہم چشموں کے خیالات نے اسے ایک لفظ سکھا دیا تھا جسے "پوزیشن" کہتے ہیں۔ اس اصطلاح کی تعریف حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ صرف

اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ یہ ایک مرض ہے جو آمدنی خواہ کتنی ہی کیوں نہ بڑھتی جائے مگر اپنے مبتلا کو تنگدستی سے پیچھا چھڑا کر منزلِ اطمینان و راحت میں قدم رکھنے نہیں دیتا۔ بنّو انگریزی طرزِ زندگی کا محض پوزیشن قائم رکھنے کے لئے پابند تھا ورنہ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ "کوّے کا ہنس کی چال چلنا" مناسب نہیں ہے۔

(۲)

بنّو کی ملازمت کو تین چار سال گذر چکے ہیں، حسنِ کارگذاری کے صلے میں پانچ پانچ روپے کی تین چار سالانہ ترقیاں بھی مل چکی ہیں مگر اس کی مالی حالت میں کوئی فرق نہ آیا، بظاہر کتنی جیسی ویسی ہی زندگی بسر کر رہی ہے جو تین چار سال پہلے تھی، بنّو بھی کوئی فضول خرچی نہیں کر رہا، صرف اپنی پوزیشن کا خیال رکھتا اور اس کا قائم رکھنا اپنا فرضِ اولین سمجھتا ہے۔ "آسودگی" اور "فارغ البالی" یہ دو لفظ اس نے کبھی کورس کی کتابوں میں پڑھے تھے جو گذشتہ ناگوار واقعات کی یاد کی طرح اب بھی اس کے حافظے میں محفوظ ہیں مگر ایسی صورتوں سے کبھی سابقہ نہیں پڑا کہ جن کو وہ ان کا قائم مقام سمجھتا۔ اسے تنگدستی اور عسرت کا منحوس منہ بھی ابھی تک دیکھنا نہیں پڑا مگر اکثر موقع آتے رہتے ہیں کہ اس کی چشمِ تصور کے سامنے ان کی بھیانک تصویر آ جاتی ہے، وہ ان کی طرف ایک نگاہِ غلط انداز سے دیکھتا اور کہتا ہے "میں تمہارے پنجے میں نہیں پھنس سکتا، میری تنخواہ میری پوزیشن قائم رکھنے کے لئے کافی ہے اور مادرِ قدرت کی نوازش ......اولاد...... کا بار میرے نازک دوش پر نہیں رکھا گیا کہ اس کے نیچے دب کر تباہ ہو جاؤں۔"

بنّو دفتر سے پانچ بجے گھر آتا، چاء پیتا اور پھر کلب جاتا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے دو چار کھیلنے والے جو سرکاری ملازمت کی بندشوں سے آزاد تھے وہاں پہنچ چکتے۔ قاعدے کے مطابق وہ ان کے بعد کھیل سکتا تھا اس لئے لوٹتے وقت اکثر اندھیرا ہو جاتا۔ ایک دفعہ چھٹیوں میں گھر سے ساڑھے چار بجے چل کھڑا ہوا، کلب پہنچا کوئی نہ تھا، پانچ بجے تک اور لوگ آ گئے کھیل شروع ہو گیا، آج بنّو جلد کھیل چکا اور بجائے اس کے کہ بنچ پر بیٹھ کر اوروں کا کھیل دیکھے اور داد دے "ناول" پڑھنے کے شوق میں گھر روانہ ہو گیا، خراماں خراماں سڑک پر جا رہا تھا کہ پیچھے سے گھنٹی اور گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی بچ کر کنارے ہو گیا، دو تین منٹ میں پاس سے ایک ٹمٹم گذری جس میں اسٹیشن ویلر بیٹھا تھا سیٹھ جی جنہیں خود ہی ہانک رہے تھے پیچھے ایک ملازم وردی پہنے مؤدب کھڑا تھا۔ جو بے خبر بے ہوش پیدل چلنے والے گھنٹی بجانے پر بھی راہ چھوڑ کر پیچھے نظر نہ کرتے تھے انہیں یہ چابک چلا کر ہوش میں لاتا اور اپنی حفاظت کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ یہ نظارہ دیکھ کر بنّو کے دل میں خیال آیا "یہ فرق کیوں، یہ شخص تعلیم و تربیت میں میرا ہم پلہ نہیں مگر ایشور اس پر کتنے مہربان ہیں اور مجھ پر نہیں۔ آخر اس کا سبب؟"

انھیں خیالات میں ڈوبا ہوا بنو دگھر پہنچا مگر انھیں چھپانے کے لئے حسب معمول خوش و خورم گھر میں داخل ہوا، کھانا کھا کر ناول پڑھنے بیٹھ گیا، مگر آج نظر کتاب پر جمی ہوئی ہے اور دماغ اپنے اور سیٹھ لکھمی چند کے فرق مراتب کی گتھی سلجھا رہا ہے۔ گیارہ بجے سوتے سوتے رکمنی کی آنکھ کھلی، بابو جی ابھی ناول پڑھ رہے ہیں، پیارے پتی کا خیال کر کے بولی:-

"رات بہت گذر چکی، آرام کیجئے، کل ختم کر لیجئے گا"

"قصہ مزہ دار تھا، دیر ہو گئی، ابھی سوتا ہوں۔"

رکمنی نے یہ سنکر کروٹ لی اور سو گئی، بنو د نے لیمپ بجھایا اور لیٹ گیا، مگر نیند نہیں آتی، بستر پر پڑا ہے اور وہی ایک گتھی سلجھا رہا ہے جو سلجھائے نہیں سلجھتی۔ ایک بجے تک مالدار بننے کی سیکڑوں تدبیریں دماغ میں آئیں اور ہر تدبیر کسی نہ کسی وجہ سے رد کر دی گئی۔ ان تدبیروں میں سے جو بہت ہی عملی اور کامیاب نظر آتی تھیں اُن کے لئے اچھے خاصے سرمائے کی ضرورت تھی۔ اس لئے اس قدر دماغ سوزی کے بعد اس نے طے کیا کہ پہلے کہیں سے سرمایہ بہم پہونچایا جائے۔

قرض لینا مناسب نہیں، نفع میں سے بہت بڑی رقم سود میں دینی پڑے گی۔ دوستوں میں کوئی اس قابل نہیں کہ بے تکلف دس پانچ ہزار نکال کر دیدے۔ اور پھر وہ کسی کا بندۂ بے دام کیوں بنے اس لئے بنو د نے فیصلہ کیا کہ اپنی طرز زندگی کو بدل کر یہ رقم بہم پہنچائے۔ عزم بالجزم کر لیا مگر یہ خیال بھی ہے کہ جو کچھ ہو رکمنی کے سامنے نہ ہو، ورنہ اسے رنج ہوگا۔

اس ارادے کو ایک مہینہ گذر گیا مگر کوئی صورت نظر نہ آئی کہ وہ اپنی دھرم پتنی کو کچھ عرصے کے لئے کہیں بھیج سکے۔ آج صبح کی ڈاک دفتر میں والد کا خط لائی، لکھا تھا "کچھ دنوں کے لئے بیٹی رما کو اس کے والدین کے یہاں بھیجدو، وہ کسی کو لینے کے لئے بھیج رہے ہیں۔" رکمنی کو اس کا والد آکر لے گیا اور یوں اس کو وہ موقع مل گیا جسے وہ تلاش کر رہا تھا۔

بیوی کے جانے کے بعد بنو د نے ٹینس کلب کی ممبری چھوڑی، مگدر کی ایک جوڑی خرید لایا، صحت قائم رکھنے کے لئے ڈنڈ بیٹھک کرنا اور مگدر ہلانا شروع کر دیا۔ سوٹ صندوق میں بند کر دیئے سیدھی سادی ہندوستانی وضع اختیار کر لی، پڑوس کے کنوئیں سے خود ہی پانی بھر لاتا۔ رامائن کا ایک نسخہ رکمنی چھوڑ گئی تھی صبح و شام اُسے پڑھتا اور ان اعلیٰ اصول پر غور کیا کرتا جو گوسوامی تلسی داس جی نے قصے کے پیرائے میں سکھانے چاہے ہیں۔

چھ مہینے کے بعد رکمنی میکے سے دیور کے ساتھ واپس آئی، بنود جاکر اسٹیشن سے دونوں کو لے آیا رات کا وقت تھا سب آکر سو گئے صبح ہوئی تو رکمنی گھر کے دھندوں میں پھنس گئی۔ بنود نے ورزش کی پھر رامائن لیکر بیٹھ گیا۔۔ ایسے کھانا کھاکر دفتر روانہ ہوا، رکمنی یہ دیکھکر حیران تھی کہ اس کے پیارے پتی کے جسم پر آج سوٹ نہیں ہے، گذشتہ طرز زندگی کی اگر کوئی یادگار باقی ہے تو کریپ سول کا بوٹ، دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کہ یہ کیا ہوا۔ شاید فوراً پوچھتی کہ یہ کایا پلٹ کیوں ہوگئی مگر دیور گھر میں تھا اس لئے یہی مناسب سمجھا کہ اس کے جانے کے بعد اس بات کو چھیڑے۔

بنود کا بھائی تین چار روز رہ کر چلا گیا، اب بے تکلف گفتگو کا موقع تھا، بنود جب دفتر جانے کے لئے کپڑے پہن رہا تھا تو رکمنی نے جھجکتے ہوئے کہا "اگر خفا نہ ہو تو ایک بات پوچھوں"۔

بنود۔ "کہو، کیا ہے؟"

رکمنی۔ "جانے بھی دو۔ خفا ہو جاؤ گے"۔

بنود۔ "نہیں نہیں، جو کچھ پوچھنا ہو بے تکلف پوچھو، مجھے یقین ہے کہ ہرگز کوئی ایسی بات نہ پوچھو گی جو مجھے ناگوار ہو"۔

رکمنی۔ "بات تو ایسی نہیں ہے پھر بھی مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمھیں بری نہ لگے"۔

بنود۔ "پھر کہہ ڈالو، ڈرتی کیوں ہو، میں خواہ مخواہ کیوں ناراض ہونے لگا"۔

رکمنی۔ "پران پیارے! جب سے آئی ہوں یہ دیکھکر حیران ہوں کہ تم نے اپنا طرز زندگی بدل ڈالا ایشور کا دیا سب کچھ موجود ہے پھر یہ ویراگ کیسا؟ جب سے آئی ہوں اسی سوچ میں پڑی ہوں"۔

بنود۔ مسکرایا اور یہ کہکر دفتر چلتا ہوا کہ "اب دیر ہو رہی ہے شام کو بتاؤنگا"۔

شام کو دفتر سے آکر وہ ایک دوست سے ملنے چلا گیا، آٹھ بجے جب کھانے سے فراغت ہوئی تو وہی مسئلہ در پیش تھا، اب بات کا ٹالنا دشوار تھا۔

بنود۔ "پیاری! تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ میں نے ویراگ لے لیا، بات صرف اتنی سی ہے میں اب تک میں ایک غلطی میں مبتلا تھا، جو کچھ میں کر رہا تھا اس میں صرف ضرورت ہی کو دخل نہ تھا بلکہ بھیڑیا چال اور نمائش کو اس سے زیادہ دخل تھا۔ اب میں اپنی غلطی سے آگاہ ہو گیا، کپڑے صرف گرمی سردی سے بچنے کے لئے پہنتا ہوں اور کھانا زندہ رہنے کو کھاتا ہوں۔ دونوں میں نمود و نمائش کو دخل نہیں دیتا۔ پوزیشن کا فریب اب مجھے

فضول خرچی کی طرف مائل نہیں کرسکتا، تمہارے اور پرمود کے آنے کی خبر سنکر میں نے ایک ہفتے پہلے ایک مہاراج کو پانی بھرنے کے واسطے نوکر رکھ لیا تھا، آج وہ ہفتہ پورا ہوگیا، کل سے میں خود پانی بھر لایا کروں گا آئندہ جو کپڑے تمہارے لئے آئیں گے ان میں بھی ان باتوں کا خیال رکھا جائیگا جن کا میں اپنے کپڑے خریدتے وقت رکھتا ہوں۔

یہ وعظ سنکر رکمنی پر سناٹا چھاگیا، وہ اس مشکل معمے کو حل کر رہی تھی کہ آیا وہ اپنے پتی کو گذشتہ طرز زندگی پھر اختیار کرنے کی ترغیب دے یا نہ دے۔ بہت کچھ غور کرنے کے بعد یہی سمجھ میں آیا کہ یہ فضول ہے زندگی اگر خوش وخرم گذر سکتی ہے تو ان کا ساتھ دینے میں کیا حرج ہے۔ سیتاجی اور ساوتری نے اپنے اپنے پتی کا ساتھ دیا تھا میں کیوں نہ دوں۔ میں ہر حال میں اپنے پتی کا ساتھ دونگی، میرا دھرم یہی ہے۔ اس قسم کے خیالات نے رکمنی میں ہمت پیدا کردی، اس کو خیال آیا کہ کل میں ہی پانی کیوں نہ بھر لاؤں، انھیں جو تکلیف ہوگی اُسے میں کیوں نہ برداشت کروں۔

رکمنی آج سویرے اُٹھی اور پڑوس کے کنوئیں سے چار گھڑے پانی بھر لائی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے سر پر پانی کے گھڑے رکھے تھے۔ گھر سے کنوئیں تک چار چکر کرنے پڑے، گلے کی رگیں دکھ رہی تھیں مگر اسے اس کا مطلق خیال نہ تھا، وہ اس خیال سے پھولی نہ سماتی تھی کہ جب میرے پران پتی اُٹھیں گے اور گھڑوں میں پانی بھرا دیکھیں گے تو خوش ہونگے۔ بنود حسب معمول ۷ بجے سو کر اُٹھا ضروریات سے فارغ ہونے پر خیال آیا کہ لاؤ پانی بھر لائیں، ڈول اُٹھا کر گھڑوں کے پاس گیا سب گھڑے بھرے تھے

"آئیں یہ پانی کون لایا؟"

رکمنی۔ "وہ جس کا دھرم پتی کی سیوا ہے۔"

بنود۔ "غضب ہوا، تم لائیں۔"

رکمنی۔ "ہاں، میں لائی۔"

بنود۔ "کل سے تم نہ لانا۔ مجھے تمہاری تکلیف گوارا نہیں۔"

رکمنی۔ "میں آپ کی آگیا کا پالن کرنے کے لیے تیار ہوں، مگر آپ مجھے دھرم چھوڑ کر ادھرم پر چلنے کی آگیا نہ کیجئے، آپ کی سیوا میرا دھرم ہے، پانی میں ہی لاؤنگی۔"

رکمنی کا انداز کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے ارادے سے باز نہ آئیگی اور اس نے اس کام کو خوشی سے اپنے ذمہ لیا ہے، اس لئے بنود یہ کہکر چپ ہوگیا "اچھا تمہاری مرضی" مگر دل میں خوش تھا کہ اس کی بیوی اُس کی ہم خیال اور ہمدرد ہے۔

شملہ الائینس بنک پانچ برس سے ہر مہینہ پچاس کا ایک منی آرڈر وصول کرکے بہی میں مسٹر سوم بنود کے نام جمع کر لیتا ہے، بنود کو جب اور کام نہیں ہوتا تو وہ اپنی پاس بک پر ایک نظر ڈال لیا کرتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اُسے جو خوشی ہوتی ہے وہ نہ تو کسی ناول کے پڑھنے سے ہو سکتی ہے اور نہ کسی دلکش و دلفریب منظر کے دیکھنے سے۔ ناول کا پڑھنا یا منظر کا دیکھنا اس کے دل پر جو اثر کر سکتا ہے اسے اس کی آئندہ زندگی سے کوئی تعلق نہیں اور پھر یہ خوشی ذرا سے دیر کی ہے حالانکہ بنود اس مسرت کا جویا ہے جس کو کوششیں بڑھا سکتی ہیں مگر گھٹا نہیں سکتیں۔ اس کی نظر اس ذرا سی جگہ کو جو تین ہزار کی رقم کی تحریر نے گھیر رکھی ہے بہت ہی آہستہ آہستہ طے کرتی ہے، ایک ہندسہ اور تین دائرے اس کے واسطے حلقہ ہائے دام ہیں، ان میں پھنسکر نہ وہ نکل سکتا ہے اور نہ نکلنا چاہتا ہے۔

ایک دن بنود اسی مسرت بے اندازہ میں ڈوبا ہوا تھا کہ رکمنی آ گئی اور اُسے خبر تک نہ ہوئی، چند منٹ تک خاموش رہکر اور اپنے پتی کی محویت کا لطف اُٹھاکر بولی "کیا پڑھا جا رہا ہے؟"

بنود۔ "کچھ نہیں، پاس بک دیکھ رہا ہوں"

رکمنی۔ "اچھا، تو یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کتنا جمع ہو گیا"

بنود۔ "ہاں۔ یہ دیکھ رہا تھا کہ سادہ زندگی کی برکتوں نے میری حقیقی پوزیشن کو کس قدر مضبوط کر دیا ہے آج ایشور کی کرپا سے میں چاہوں تو تین ہزار خرچ کر سکتا ہوں۔ اور اس کے لئے نہ تو کسی کا احسان اُٹھانا پڑے گا اور نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا ہوگا۔ تم اس وقت یہاں کیسے آنکلیں؟"

رکمنی۔ "یہ کہنے آئی تھی کہ فرصت ہو تو ہسپتال جاکر دوا لا دیجئے، بدن ٹوٹ رہا ہے۔ سر دکھ رہا ہے اور کبھی کبھی کھانسی بھی آ جاتی ہے"

بنود۔ "اچھا ابھی جاتا ہوں"

کپڑے پہن کر بنود شفاخانہ پہونچا، ڈاکٹر صاحب سے حال بیان کیا۔ انھوں نے ایک مکسچر تجویز کرکے ہدایت کی کہ مریضہ کو سوڈا اور دودھ دیا جائے، اور وہ پلنگ پر آرام سے لیٹی رہے۔ بنود نے آکر دوا رکھ دی، جلدی سے بازار گیا سوڈا اور دودھ لایا، ڈاکٹر نے جو کچھ کہا تھا بیوی سے کہہ دیا۔

رکمنی "دس بجنے والے ہیں، آپ کھانا کھاکر دفتر چلے جائیں۔ اس کے بعد میں دوا پی کر لیٹ جاؤنگی، بھوک لگی تو سوڈا اور دودھ ملا کر پی لونگی"

گھر کے دھندوں سے فارغ ہوکر رکمنی دوا پی کر لیٹ گئی۔ تھوڑی سی دیر میں بخار ہو گیا اور رفتہ رفتہ اس قدر

تیز ہو گیا کہ اُسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ بنود جب گھر میں آیا تو وہ بے ہوش پڑی تھی، بدن سے شعلے نکل رہے تھے، دُلائی کا تھوڑا سا حصہ جسم کی حفاظت کر رہا تھا، باقی فرش پر پڑا تھا، اس نے پہلے رکمنی کو دُلائی اُڑھائی پھر گھبرا کر اسپتال پہنچا، ڈاکٹر سے حال بیان کیا اور مریضہ کو دیکھنے کی درخواست کی۔

ڈاکٹر نے کہا "آپ چلیے میں ابھی آتا ہوں۔ بازار سے کولون واٹر لیتے جائیے، اس میں کپڑا بھگو کر مریضہ کے سر پر رکھئے، ہوش آ جائیگا، جب تک میں بھی آتا ہوں، دیکھ کر نسخہ بدل دونگا۔"

بنود کولون واٹر لیتا ہوا گھر پہنچا، فوراً رومال بھگو کر رکمنی کے سر پر رکھا، چند منٹ میں اس نے آنکھیں کھول دیں، اتنے میں ڈاکٹر صاحب آ گئے، آتے ہی تھرمامیٹر لگایا اور کہا:۔

"حرارت ۱۰۲ ڈگری ہے، میں مکسچر بھیجتا ہوں، جب تک بخار رہے تین تین گھنٹے بعد پلایا جائے جب اُتر جائے مجھے اطلاع دی جائے، میں دوسری دوا تجویز کروں گا۔"

ڈاکٹر صاحب چلنے لگے تو بنود نے فیس دی اور ساتھ ہو لیا۔ شفاخانے سے دوا لایا، رات بھر جاگ کر پلاتا رہا مگر بخار نہ اُترنا تھا نہ اُترا صبح باحال پریشاں پھر شفاخانے پہنچا، کل حال بیان کیا، ڈاکٹر صاحب حسب وعدہ گھنٹہ بھر بعد آئے، پہلے تھرمامیٹر سے حرارت دریافت کی پھر "اسٹیتھس کوپ" لگا کر سینے کی حالت دیکھی، ان دونوں معاونین تشخیص نے بتایا کہ نمونیا ہو گیا ہے اور دونوں پھیپھڑوں پر اثر ہے، فوراً نسخہ بدلا گیا اور انٹی فلو جسٹین کا لیپ کرنے کا حکم ہوا۔ بنود نے ہدایات کی پابندی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، مگر ٹوٹی کی بوٹی کہاں، پانچ بجے کے قریب رکمنی نے کچھ بہکی بہکی باتیں کر کے بنگاہ یاس و حسرت بنود کو دیکھا اور بولی "میرا دل بیٹھا جاتا ہے، آنکھوں میں اندھیرا چھایا جاتا ہے، میں چلی، پرماتما تمہیں سکھ دیں۔" بنود کی آنکھوں میں دنیا تیرہ و تار ہو گئی، ابھی وہ اس صدمے سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ رکمنی نے دو ہچکیاں لیں اور گردن ڈھلک گئی۔ چیخ مار کر سنبھالنے دوڑا مگر روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

کچھ دیر تک بنود دھاڑیں مار مار کر روتا رہا، ذرا طبیعت سنبھلی تو تجہیز و تکفین کی فکر میں پڑ گیا، محلے والے جمع ہوئے ارتھی تیار ہوئی۔ "رام نام ست ہے" کی صداؤں کے ساتھ ایک تنِ نازک شمسان پہونچایا اور نذر آتش کر دیا گیا۔

رکمنی کی موت کو آج تیسرا دن ہے، دوست آتے اور بنود کی دلجوئی کرتے رہتے ہیں، انھیں میں ایک پابند مذہب پنڈت جی بھی ہیں، انھوں نے صلاح دی کہ بھائی چھٹی لیکر اپنی دھرم پتنی کی استھیاں گنگا جی چھوڑ آؤ۔ بنود نے یہ صلاح خاموشی سے سنی اور غور کرنے لگا کہ آیا اس سے رکمنی کو کوئی فائدہ ہوگا اس کے نزدیک اسے کچھ فائدہ نہ ہوگا وہ اپنے کرموں کا پھل بھوگے گی، گنگا جی میں استھیاں ڈالنے سے

کرموں کا پھل نہیں بدل سکتا۔ اس لئے اس نے اس پر عمل نہیں کیا، اور رسموں میں بھی اس نے اپنی قوت امتیازی سے کام لیا اور صرف انہیں کو ادا کیا جو اس کے نزدیک کسی مصلحت یا فائدہ پر مبنی تھیں۔

بارہ دن تک سوگ منا کر بنود پھر دفتر جانے لگا۔ رکمنی کی موت نے بے ثباتی دنیا کا گہرا نقش اس کے دل پر بٹھا دیا۔ عیش و تنعم کو وہ پہلے ہی فضول سمجھتا تھا اب اور بھی فضول نظر آنے لگے۔ اگرچہ اب وہ اپنے روپیے سے روپیہ کمانے کی ہوس نہیں رکھتا، مگر اس کی بھی کوئی وجہ نہیں نظر آتی کہ وہ پرانی طرز کیوں اختیار کر لے اور ایک آدمی کا خرچ تو کم ہو ہی گیا جہاں تک ممکن ہو اسے اور کم کیوں نہ کر دے۔ چنانچہ بہت غور و فکر کے بعد اس نے طے کیا کہ کل پندرہ روپیے ماہوار خرچ کرونگا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آیندہ سے قریب قریب سو روپیے ماہوار مسٹر سوم بنود کے نام سے بینک میں جمع ہونے لگے۔

(۵)

بنود کا حلقۂ احباب پہلے سے بھی زیادہ تنگ ہو گیا۔ اس کا زیادہ تر وقت دفتر میں صرف ہوتا ہے جو بچ جاتا ہے وہ کھانا پکانے اور رامائن پڑھنے میں گزر جاتا ہے۔ لیکن آخر انسان ہے، طبیعت کا اجتماع پسند ہونا لابدی ہے، کبھی کبھی کسی دوست کے یہاں جا بیٹھتا ہے، دوستوں میں وہ اپنی طرز زندگی کے لئے انگشت نما ہے، لوگ منہ پر کچھ نہیں کہتے ہاں دو چار منچلے اوروں پر رکھکر کچھ نہ کچھ سنا جاتے ہیں، جس کی وہ پروا نہیں کرتا۔

ایک دن گھر بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرائی اور اس نے ایک دوست کے گھر کا رخ کیا جس کے بالاخانے پر احباب جمع ہوتے تھے۔ بالاخانے کے نیچے پہونچا تو آواز آئی:۔

"ارے ارے صبح ہی صبح کس کا نام لیا، دیکھئے آج کھانا نصیب ہوتا ہے یا نہیں؟"

دوسری آواز۔ "سوم بنود کا۔"

پہلی آواز۔ "ارے یار مان جاؤ ابھی کسی نے کھانا نہیں کھایا ہے۔"

تیسری آواز۔ "بیچارے کو کیوں برا کہتے ہو، وہ تمہارا کیا لیتا ہے۔"

پہلی آواز۔ "یہ کون کہتا ہے کہ کچھ لیتا ہے لیکن ہم تو اس کے نام کی نحوست سے بچنا چاہتے ہیں۔"

چوتھی آواز۔ "یار ایک روز صبح ہی سامنا ہو گیا تھا۔ کس کمبخت نے دن بھر کھانے کی صورت دیکھی ہو۔"

تیسری آواز۔ "بھائی تم سب وہمی ہو، چھوڑو بھی اس قصے کو۔"

بنود یہ چہ میگوئیاں سنکر واپس چلا گیا اور سوچنے لگا "یہ سب مجھے کیوں برا سمجھتے ہیں، اس کا کیا سبب ہے، کیا میں چور ہوں۔ نہیں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آج تک میں نے کسی کی کوئی چیز لی ہو، کیا میں شرابی ہوں

نہیں، میں کبھی شراب خانے کے پاس سے بھی نہیں گذرا، کیا میں جواری ہوں؟ نہیں، میں ان سداچاریوں میں بھی نہیں جو محض شگون لینے کے لئے ہولی دیوالی کو جوا کھیلتے ہیں۔ کیا میں دُراچاری ہوں؟ نہیں، میری روش نے آج تک سماج کے مقدس قانون کی توہین نہیں کی، میں پراستری کو ہمیشہ ماتا سمان سمجھتا ہوں کیا میں جھوٹا ہوں؟ نہیں، میری زبان سے آج تک کوئی ایسا لفظ نہیں نکلا جو حقیقت سے بعید ہو، پنج عیب شرعی سے پاک ہوں پھر بھی سماج مجھے حقارت سے دیکھتی ہے، اس کا سبب؟ دنیا! کم بخت دنیا! تجھے کیا ہوگیا: تو مجھے اس لیئے بُرا کہتی ہے کہ تیرے اور میرے سرت حاصل کرنے کے طریقوں میں فرق ہے، تو دولت سے قوت حاصل کرتی اور اُسے برباد کرکے خوش ہوتی ہے، اور میں اس نعمت پر قابض ہوکر خوش ہوتا ہوں نمود و نمائش مجھے ترغیب نہیں دے سکتی، کہ میں اسے خاک میں ملا دوں، مجھے اس سے خوشی ہوتی ہے کہ مجھ میں ایک قوت ہے جس کی مدد سے میں بہت سے ایسے کام کرسکتا ہوں جو نمود و نمائش کے بندے نہیں کرسکتے۔ غور سے دیکھا جائے تو مجھ میں اور تجھ میں کوئی فرق نہیں، لیکن ٹھہر، میری موت میری فوقیت کا راز تجھ پر افشا کرے گی"۔

(۶)

ڈی۔اے۔وی۔اسکول فتح نگر کے ٹرسٹی بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے ہیں کہ پچاس ہزار روپیہ جو مسٹر سوم بھو نے اپنی وصیت کی رو سے اسکول کو دیا ہے، اس کا بہترین مصرف کیا ہے کیونکہ مرحوم کے وصیت نامے کے مختصر الفاظ یہ ہیں "شملہ الائینس بنک میں میرے نام جتنا روپیہ ہے میں اسکول کے ٹرسٹیوں کے نام منتقل کرتا ہوں، انھیں اختیار ہے جس نیک کام میں چاہیں لگاویں"۔ کسی کا خیال ہے کہ سائینس کے آلات خرید لیئے جائیں، کوئی کہتا ہے کہ بورڈنگ ہاوس بنا دیا جائے، کسی کی رائے ہے کہ عملہ کی تعداد بڑھا دی جائے مگر بحث جاری ہے اور کوئی بات طے نہیں ہوتی۔ بہت کچھ جرح و قدح کے بعد یہ طے ہوا کہ یتیم خانے سے تین تیز طبیعت لڑکے لائے جائیں اور ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دیکر ایک کو اپدیشک ایک کو ڈاکٹر اور ایک کو انجنیر بنا دیا جائے، ڈاکٹر اور انجنیر سے یہ عہد لیا جائے کہ کامیاب ہونے پر ان میں سے ہر شخص ایک ایک یتیم کو اپنے اپنے پیشے کی تعلیم انھیں شرطوں پر دلائے جن شرطوں پر کہ اس نے خود پائی ہے، دونوں ملکر ایک یتیم کو اپدیشک بنانے کا خرچ دیں، ڈاکٹر اپدیشکوں اور یتیموں کا مفت علاج کرے اور انجنیر مندروں اور مدرسوں کے نقشے مفت بنائے۔

مسٹر سوم بھو کی قابل نفرت زندگی سے آج قوم جو فائدہ اٹھا رہی ہے وہ فائدہ اُس پر قہقہہ لگانے والوں کی عالی زندگی سے نہ اٹھا سکی، وہی شخص جو اپنی زندگی میں بُرا سمجھا جاتا تھا آج سب اسکی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

ؔ بزرگ کا کام کرنیوالے تھوڑے ہیں، بُرے کام کرنیوالے تشخیص عیوب ہیں

تنقید کتب

تذکرہ مشاہیر کاکوری

صفحات پانچسو دس ۵۱۰، کاغذ و کتابت نفیس و دیدہ زیب، قیمت تین روپیہ ۳؎

پتہ: مؤلف صاحب تذکرہ مشاہیر کاکوری، تکیہ شریف۔ کاکوری، لکھنؤ

شاہجہاں اکثر فخر سے کہا کرتا تھا کہ میری مملکت میں اودھ کے مردم خیز قصبات رشک شیراز و اصفہان ہیں، واقعہ بھی ایسا ہی ہے، بلگرام، کاکوری، نیوتنی، موہان، مہونہ، کسمنڈی، نگرام، امیٹھی، اور سندیلہ وغیرہ اکثر مراکز علمیہ رہ چکے ہیں جہاں کے باشندوں نے اپنے وقتوں میں علم کی کافی خدمت کی۔

ان قصبوں میں بلگرام اور کاکوری کو ایک امتیازی درجہ حاصل ہے، ہم کو بلگرام کے حالات تو مل جاتے تھے لیکن کوئی ایسا تذکرہ نہ تھا جس سے بزرگان کاکوری کے حالات سے واقفیت حاصل کرتے مگر شکر ہے کہ مشاہیر کاکوری کی اشاعت سے یہ کمی ایک بڑی حد تک پوری ہوگئی ہے اس کی تالیف کاکوری ہی کے ایک بزرگ مولانا حافظ علی حیدر صاحب کی کوشش کا نتیجہ ہے

اس میں شک نہیں کہ بعض وجوہ سے چند ایسے بزرگوں کے حالات اس کتاب میں داخل ہونے سے رہ گئے جن پر اہل کاکوری کو بجا طور پر فخر و ناز ہو سکتا ہے، مثلاً مولوی نادر علیخاں صاحب نادر کاکوروی مرحوم، مولوی فخرالدین صاحب سفیر کاکوروی وغیرہ۔ یہ وہ بزرگ ہیں جن کو اردو زبان کے محسنین میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اور زمانہ، ادیب، خدنگ نظر، مخزن اور دلگداز کی پرانی جلدیں ان کے کمال فن کی شاہد ہیں۔ کاکوری وہ قصبہ ہے جس میں ایک نہیں متعدد ایسے حضرات گذرے ہیں جنھوں نے سو سے زائد تصانیف چھوڑی ہیں۔ یہاں طبیب، عالم، محدث، شاعر، مورخ، مدبر اور ظریف اور سیف و قلم کے مالک غرض سبھی قسم کے اہل کمال پیدا ہوئے انھیں ہر ایک زمانہ میں مولانا محمد کاظم جیسے بزرگ بھی تھے جن کے دروازے پر شہنشاہ دہلی (شاہ عالم) اپنی عزت خود بہ نفس نفیس تشریف لائے اور انھوں

ملنے سے انکار کر دیا۔ اسی خاک پاک سے سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ محسنؔ کاکوروی جن میں ایک نے اردو ادب میں ظرافت کا دروازہ کھول دیا اور لافانی شہرت حاصل کی، دوسرے نے لغت گوئی میں بقائے دوام کا سہرا حاصل کیا۔ اسی قصبہ میں مولوی ارتضیٰ علی صاحب شررؔ تھے جن کا کلام امیرؔ و داغؔ سے ٹکر کھاتا ہے۔ یہیں سے محی الدین علی خاں ذوقؔ، مقصود احمد نطقؔ، رضاؔ اور صبرؔ اور سیکڑوں بلند پایہ شعراء اُٹھے۔ ان میں ذوقؔ مسلسل چھ گھنٹہ تک تاریخ میں گفتگو کر سکتے تھے یعنی جو لفظ یا جملہ زبان سے نکلتا اس سے حسب خواہش تاریخ نکلتی۔ ساحرؔ کاکوروی گو بے استاد بے نہ رہنے کے خیال سے مصحفیؔ کے شاگرد ہو گئے تھے مگر شاگرد کا رتبہ استاد سے کہیں بلند تھا، چنانچہ مرزا قتیلؔ اکثر کہتے تھے کہ "اوا استاد مصحفی است"۔ امیر حسن تسبلؔ وہ شخص تھے جن سے غالبؔ مرحوم سے چوٹیں چلتی تھیں ان کی ایک تصنیف پنج گلبن ہے جو غالبؔ کی پنج آہنگ کا جواب ہے۔

منشی ہادی علی ہفت قلم کے لکھنؤ میں اکثر شاگرد تھے، آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے لیکن اس حال میں بھی لکھتے رہتے تھے، ان کے ایک شاگرد کا بیان ہے کہ انھوں نے حضرت شاہ تراب علی کے مزار کی سہری کے لئے ایک چھت کپڑے کی بنوائی اور اس پر اپنے ہاتھ سے آیتہ الکرسی بخط نسخ لکھی اور اس کے درمیان سورہ اخلاص کا نہایت نفیس طغرا لکھا جس مقام پر حرف لکھوانا مقصود ہوتا شاگرد اس جگہ قلم رکھ دیتے اور یہ لکھ دیتے۔ یہ چھت اب بھی موجود ہے اور ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔

مولانا فرید الدینؒ بڑے زبردست عالم اور بلند پایہ محدث تھے۔ راقم الحروف کے نانا داروغہ جعفر علی صاحب عاجزؔ مرحوم سے بے حد مراسم تھے اکثر تشریف لاتے، راقم الحروف پر بڑی شفقت فرماتے۔ آہ ایسی نورانی صورتیں دیکھنے کو دل ترستا ہے اور کہیں نظر نہیں آتیں۔ مرحوم کی بہت سی تصانیف غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ منشی رام پرشاد بڑے قابل اور ہوشیار محاسب تھے ان کی متعدد تصانیف ہیں جن میں سے کشاایش نامہ کا ایک قلمی نسخہ میرے پاس بھی محفوظ ہے۔

یہ تو قصہ ماضی تھا، ہمارے دیکھتے دیکھتے چند ایسی ہستیاں اُٹھ گئیں جن کی جگہ موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے پُر ہونی دشوار نظر آتی ہے۔ مثلاً مولوی نور الدین صاحب کیفیؔ کاکوروی جن کے دو ضخیم دیوان فارسی اور اُردو میں موجود ہیں۔ مرحوم ایک کتاب داستان نورنگا بطرز بوستان خیال لکھ رہے تھے جس کی انیس[1] ضخیم جلدیں ہیں ان میں اکثر جلدوں کی دو دو تین تین جلدیں ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں

---

[1] ان کے صاحبزادے مولوی نور الحسن صاحب نیرؔ وہ شخص ہیں جنھوں نے اردو کا سب سے پہلا جامع و مانع لغت ترتیب دیا جو چار ضخیم جلدوں میں چھپکر شائع ہو چکا ہے۔ [2] انکی ایک بیاض میرے پاس موجود ہے جسمیں انکا کلام ہے۔

نے تین ناول بھی لکھے تھے جو بنگلور کے کسی مطبع کے مالک نے ہضم کر لیئے۔ سیکڑوں غزلیں اپنے شاگردوں کو لکھکر دیدیں۔ ان کے اشعار کا اندازہ ایک لاکھ سے اوپر ہے۔

حضرت مؤلف صاحب ایک بزرگ اور عالم باعمل خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکثر باشندگان قصبہ کو ان کے پدر بزرگوار اور برادر بزرگ سے بیعت ہے اور ان کے مریدوں میں مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندو بھی ہیں۔ موصوف نے اس تذکرہ میں کاکوری کے ہندو مشاہیر کے حالات بھی شامل کر کے اپنی وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے۔

یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر میں ارباب علم کو کتبخانۂ کاکوری کے نوادرات کی طرف توجہ دلاؤں۔ تکیہ شریف قصبہ کا روحانی مرکز ہے جہاں مولانا تراب علیؒ اور مولانا تقی علیؒ صاحبان ایسے نیک سیرت بزرگ اپنی روحانی تعلیم سے لوگوں کو مستفید فرماتے رہے ہیں۔ ان بزرگوں کا ایک کتب خانہ بھی تھا جس میں وقتاً فوقتاً کتابیں جمع ہوتی رہتی ہیں یہاں تک کہ آج اہل کاکوری اس بات پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ ان کے قصبہ میں ایک ایسا کتب خانہ ہے جس میں بہت سے ایسے قلمی جواہرات موجود ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتے افسوس اس کتب خانہ کی کوئی مطبوعہ فہرست نہیں ہے۔ کاش ارباب علم بلکہ خود حضرت مؤلف تذکرۂ مشاہیر کاکوری اس طرف توجہ کر کے فہرست شائع فرمادیں تو ایک عظیم الشان علمی خدمت ہوگی۔

مسلم کاکوری

مراسلات

کبیر صاحب

(از پنڈت منوہر لال زتشی ایم۔ اے)

جون ۱۹۳۲ء کے زمانہ میں جناب ناطق لکھنوی کا ایک مضمون میری ناچیز کتاب "کبیر صاحب" کے متعلق شائع ہوا ہے، میں جناب ناطق کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے میری تحریر کو قابل التفات خیال کیا۔ جناب ناطق کے مضمون کے متعلق دو باتیں عرض کرنی ہیں مباحثہ کے خیال سے نہیں بلکہ غلط فہمی رفع کرنے کے لئے۔

جناب ناطق فرماتے ہیں:-

مذہب کی تعریف مصنف نے اپنے الفاظ میں یوں کی ہے۔ کہ

"مذہب کے معنی ہیں احساس ہونا ایسی قوت یا قوتوں کا جو انسان سے بالاتر ہیں الخ

.... اس تعریف میں ایک شبہ یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ مصنف نے قوت سے شاید قدرت الٰہی مراد لی ہے، اور قوتوں سے ان کا مطلب فرشتوں یا موکلوں یا دیوتاؤں کی طاقت ہے، اگر یہ خیال صحیح ہے تو مذہب کی اس تعریف میں وہ مذاہب نہ آسکیں گے جو فرشتوں اور دیوتاؤں وغیرہ کو نہیں مانتے"

میں جناب ناطق کی خدمت میں یہ عرض کرونگا کہ میں نے "قوت یا قوتوں" لکھا ہے "قوت اور قوتوں" نہیں لکھا ہے۔ پس جو مذہب ایک قوت کو مانتا ہے وہ بھی اس میں شامل ہے اور جو ایک سے زیادہ قوتوں کو مانتا ہے وہ بھی۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:۔

قابل مصنف نے ایک سے زیادہ مقامات پر تاریخی غلطی بھی کی ہے آپ نے فرمایا ہے کہ تاریخ عالم شاہد ہے کہ جتنی خونریزی دنیا میں مذہب کے نام سے ہوئی ہے اس سے زیادہ شاید کسی اور وجہ سے نہ ہوئی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں سب سے بڑی لڑائیاں غیر مذہبی ہوئی ہیں، مثلاً الخ

میں جناب ناطق کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ میں نے خونریزی کا لفظ استعمال کیا ہے اور خونریزی لڑائیوں کے علاوہ بھی ہوسکتی ہے، مثلاً سیکڑوں برس تک یورپ میں رومن کیتھولک حکومتوں نے پراٹسٹنٹ گروہ کے لوگوں کو جلایا اور پراٹسٹنٹ حکومتوں نے دوسرے طریقوں سے اپنے مخالفین کو قتل کیا۔ خونریزی میں یہ سب کچھ شامل ہے۔

قاموس المشاہیر

(از سید احمد اللہ صاحب قادری)

تصحیح قاموس المشاہیر کے عنوان سے میرا ایک مضمون زمانہ بابتہ اپریل و مئی سنہ ۱۹۳۲ع میں شائع ہوا تھا اس سلسلہ میں مولانا نظامی بدایونی نے ایک خط مجھے تحریر کیا ہے جس میں خاقانی کے سنہ وفات سے بحث ہے مولانا آزاد بلگرامی کی کتاب خزانۂ عامرہ کو میں نے دوبارہ دیکھا تو پتہ چلا کہ دراصل غلطی ہے جو مسودہ کی کتابت میں ہوگئی ہے حقیقت میں خاقانی کا سنہ وفات سنہ ۵۹۰ھ ہے، سنہ ۵۹۵ھ سہو ہے، تصدیق کے لئے مولانا آزاد کی اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

تحقیق صاحب حبیب السیر مستفاد می شود کہ او تا حدود سنہ تسعین و خمسمائۃ [۵۹۰] بقید حیات بود۔

(خزانۂ عامرہ طبع نولکشور صفحہ ۲۰۵)

از راہ عنایت رسالہ میں اس کی تصحیح فرما کر ممنون فرمائیے۔

محفلِ تنہائی

(از سید اعظم حسین مدیر "ادب" لکھنؤ)

عروسِ شب کی زلفیں تا کمر بل کھا کے آپہنچیں اُگلنے زہر اپنا ناگنیں لہرا کے آپہنچیں

دھڑکتے ہیں کلیجے دیکھ کر دل تلملاتے ہیں ستارے صبح کے جیسے فلک پر جھلملاتے ہیں

تمناؤں سے پھر آباد ہے، ہر دل کا ویرانہ اندھیرا جس میں تھا پھر جگمگاتا ہے وہ کاشانہ

کہیں ساغر پہ ساغر چل رہے ہیں بزمِ عشرت میں تلاطم ہے ترنم کا کہیں سازِ مسرت میں

ستم ڈھاتے ہیں وہ نغمے فضا میں شعلہ ور ہو کر دلِ مطرب میں مدت سے جو پنہاں تھے شرر ہو کر

فلک پر خوں فشاں جو تھی زوالِ مہرِ تاباں سے وہی سرخی چھلک اُٹھی رخِ گلہائے خنداں سے

جو تھا اب تک دلِ نازک کسی مجبور و مضطر کا اُسی شیشے سے مے کش لے رہے ہیں کام ساغر کا

یہ جوشِ کامرانی کی بھی کیا دنیا نرالی ہے کہ زاہد رند ہے اور وہ بھی رندِ لاابالی ہے

مگر میں، یعنی وہ جو پاکبازوں میں نہ رندوں میں نہ جس کا نام مردوں میں نہ جسکا کام زندوں میں

انھیں احباب میں احباب سے بیزار بیٹھا ہوں زمانے بھر سے غافل اور پھر ہشیار بیٹھا ہوں

بنا ہوں مست گو ساغر مرا بادے سے خالی ہے گلوں سے دور ہوں لیکن خوشی سے رخ پہ لالی ہے

بساطِ دہر صحنِ گلستاں معلوم ہوتی ہے!!

مجھے محفل کسی کا آستاں معلوم ہوتی ہے!!

زرداران ہند سے یتیمانِ ہند کی فریاد

(از پروفیسر نارائن پرشاد ورما مہر گوالیار)

اے اہلِ ہند تم کو اس کی بھی کچھ خبر ہے — اک دلگداز صدمہ اب جانِ ہند پر ہے
سینے میں سوزِ غم ہے، اشکوں سے آنکھ تر ہے — باقی کہاں وہ دل ہے، باقی وہ کب جگر ہے

پانی ہوئے ہیں غم سے گھل گھل کے آہ دونوں
نکلے ہیں اشک بنکر آنکھوں سے آہ دونوں

اِک آگ سی لگی ہے سوزِ غمِ نہاں سے — خاموش جل رہا ہے مجبوریِ فغاں سے
آتا نہیں ہے لب پر کچھ قلبِ ناتواں سے — پھر حالِ غم سنائے کس منہ سے کس زباں سے

جو ہو بیان اس سے یہ وہ محن نہیں ہے
یہ کیا کہے کہ اس کو تابِ سخن نہیں ہے

اِس سے یتیم اس کے پلتے نہیں ہیں پالے — بے موت پڑ رہے ہیں جینے کے ان کے لالے
ہر وقت بھوک سے ہیں اِک ایک لب پہ نالے — کس کے سپرد کر دے کس کے کرے حوالے

بے باپ ماں کے بچے بے نان بے نمک ہیں
اِن بیکسوں پہ کیا کیا صدمے تہِ فلک ہیں

لوں ان کے پونچھے آنسو کون انکی لے بلائیں — اب ہیں نہ باپ ان کے اب ہیں نہ ان کی مائیں
ہمدرد ہو جو کوئی تو داغِ دل دکھائیں — جن کو یہ رو چکے ہیں اُن کو کہاں سے لائیں

کوئی نہیں ہے ان کا یہ کر رہے ہیں نالے
اب کاش بیکسی ہی ان کو گلے لگا لے

ماں باپ کے الم سے پر اضطرار یہ ہیں — باغِ خزاں رسیدہ قبل از بہار یہ ہیں
جو رہ گئے ہیں اُن کو کیوں ناگوار یہ ہیں — سمجھیں تو جانے والوں کی یادگار یہ ہیں
اُف دورِ آسمانی، اُف گردشِ زمانہ — تُف دورِ آسمانی، تُف گردشِ زمانہ

پھر سوزِ دل دکھا دے اے حدّتِ تپِ غم　　پھر سیلِ غم بہا دے اے آنکھ ہو کے پُرنم
پھر آسماں ہلا دے اے اضطرابِ ماتم　　پھر واقعہ سنا دے اے نالۂ شررزم

آ دل میں اب اُمنڈ کر مہرِ پدر کہاں ہے
لے ماں کی مامتا اب ان کی خبر کہاں ہے

رہتا نہیں ہمیشہ رنگِ بہارِ ہستی　　ناپائدار ٹھہرے نقش و نگارِ ہستی
ہیں اِک طلسمِ حیرت نقش و نگارِ ہستی　　دیکھا تو موت ہی ہے پایانِ کارِ ہستی

زردار ہو کہ بے زر کس کو فنا نہیں ہے
دنیا ہے نام جس کا دارِ بقا نہیں ہے

رہنا ہے تم کو زندہ تو نیک کام کر لو　　کچھ نیک کام کر کے دنیا میں نام کر لو
ننھے یتیم بچوں کا انتظام کر لو　　جو دے سکو وہ دے کر ان کو غلام کر لو

کہتا ہے کون تم سے سب اپنا گھر لٹاؤ
جتنا لٹا سکو تم اُتنا تو زر لُٹاؤ

اب بارِ غم اٹھائیں یہ نا تواں کہاں تک　　اب سر پہ لیں بلائیں یہ نیم جاں کہاں تک
اب دل جگر جلائیں یہ شمع ساں کہاں تک　　اب یوں سہیں جفائیں یہ بے زباں کہاں تک

دنیا سے اٹھ گئے ہیں وہ تھے جو ان کے والی
اب تم ہو ان کے مالک اب تم ہو ان کے والی

زردار ہو اگر تم محتاجِ زر ہیں یہ بھی　　دل سے مدد کرو کچھ بے برگ و بر ہیں یہ بھی
انسان ہی کے آخر لختِ جگر ہیں یہ بھی　　ہو آدمی تو پالو ان کو بشر ہیں یہ بھی

ہو جب تمہیں نہ ان کے پھر کس کے ہو رہیں یہ
تم کچھ نہ دو تو کہہ دو کچھ کھا کے سو رہیں یہ

بجھتے ہیں دل میں روشن ہر وقت داغ انکے　　ہوتے نہیں ہیں ٹھنڈے جلتے چراغ ان کے
حاصل نہیں ابھی جب ان کو فراغ ان کے　　کیا کام دے سکیں گے آگے دماغ ان کے

تم کھاؤ لقمۂ تر خون جگر پئیں یہ
یہ زندگی ہو ان کی تو کس طرح جئیں یہ

ان کے الم سے دل پر چلتے تھے غم کے بھالے　　آخر فقیر بن کر گھر سے قدم نکالے

سائیں نہ ہم نہ ہیں ہم درویش پھیری والے　　آئے ہیں انکی خاطر جھولی گلے میں ڈالے

دیتا ہو تم کو جو کچھ دو ان کو یہ چیزیں ہیں
کچھ اپنے واسطے تو ہم مانگتے نہیں ہیں

فاقوں سے جب بُری گت اِن بیکسوں کی ہولی　　تو مہر نے تمہارے آگے زبان کھولی

دن رات یہ صدا ہے ہر وقت ہے یہ بولی　　اِن کے فقیر ہیں ہم بھردو ہماری جھولی

داتا ہو تم تو بابا پورا سوال کردو!
مفلس یتیم ہیں یہ ان کو نہال کردو!

آبشار

(از جناب محمود اسرائیلی صاحب)

مطربِ بزمِ چمن، آئینہ بردار بہار　　چادرِ سیماب رقصاں، معدنِ گوہر فگار

آتشِ سیّال، برقِ تیز رو، دریائے نور　　جلوۂ حسنِ پری رو، پرتوِ رخسارِ حور

مہر کے آتشکدہ کا جلوۂ تاباں ہے تو　　یا زمیں پر ماہ کا اک حصۂ عریاں ہے تو

گنجِ راوی میں ترے یہ قطرہائے آبدار　　شعلۂ جولاں ہے جیسے کھیلتا ہو کوہسار

چھوٹے چھوٹے قمقمے روشن ہیں نخلِ طور میں　　یا یہ جگنو ٹمٹماتے ہیں شبِ دیجور میں

کیا فضائے گلستاں میں گل کے طیارے ہیں یہ　　یا جبینِ چرخ کے چھوٹے ہوئے تارے ہیں یہ

تیرا ہر قطرہ دل آویزی میں دنیائے بہار　　ہے یہاں برگِ چمن حسنِ چمن کا مایہ دار

ہاں ملائے جا یونہیں تو لنیے گوہر خاک میں　　انکی آمیزش سے آجائیں گے جوہر خاک میں

تو پلائے جا یونہیں ہر تشنہ لب کو لنیے جام
اور یونہیں نکلی رہے تیری زبانِ تشنہ کام

لطفِ سخن

(از پروفیسر رام پرشاد کھوسلہ، ایم۔ اے آئی۔ ای۔ ایس)

چمن میں جو نغمہ سازیاں ہیں گلوں میں جو جاں نوازیاں ہیں
اُسی کی قدرت کے ہیں کرشمے اُسی کی نیرنگ سازیاں ہیں

کوئی گدا ہو کوئی ہو سلطاں ہیں راہِ اُلفت میں دونوں یکساں
اُسی کی حکمت کے کھیل ہیں سب اسی کی عشوہ طرازیاں ہیں

فلک پہ سجدے کرا دیے ہیں، ملک سے مٹی کی مورتی کو
دیا ہے انساں کو نورِ عرفاں، غضب کی ذرہ نوازیاں ہیں

کسی کو چرخِ بریں پہ پھینکا، کسی کو فرشِ زمیں پہ پٹکا
اسی کے ہیں ناز اور کرشمے، اسی کی یہ کارسازیاں ہیں

جہاں میں اے عشق تیری آتش سے ہو گئے خاک کتنے جگر
تڑپ کے کتنوں نے جان دیدی، تری وہی بے نیازیاں ہیں

مٹے جو خاکِ رہِ صنم میں وہ اُڑ کے عرشِ بریں پہ پہونچے
یہ عشق تیری ہی برکتیں ہیں، یہ تیری بندہ نوازیاں ہیں

جو سر کٹاتے ہیں راہِ اُلفت میں مثلِ ناشاد بے تامل
فروغ اُن کو ہے، اور اُنھیں کے نصیب میں سرفرازیاں ہیں

(از جناب برق دہلوی بی۔ اے)

ہر نفس شکرانۂ معبود ہونا چاہیے
زندگی کا کچھ نہ کچھ مقصود ہونا چاہیے

کعبہ و بت خانہ کیوں مسجود ہونا چاہیے
لاتعین کس لئے محدود ہونا چاہیے

عالمِ اسباب ہے یک جلوۂ حسنِ ازل
ذرہ ذرہ کعبۂ مقصود ہونا چاہیے

کیوں حجابِ ماسوا ہے مانعِ ذوقِ نظر
نقشِ ہر ہستی بے بود ہونا چاہیے

جوشش ہمت کا تقاضا ہے یہ اک اک گام پر
صرفِ راہِ منزلِ مقصود ہونا چاہیئے

ہستیٔ قطرہ ہو جیسے بحرِ بے پایاں میں گم
یوں وصالِ شاہد و مشہود ہونا چاہیئے

سوزِ دل سے رختِ ہستی پر نہ آنچ آئے کہیں
کچھ علاجِ آتشِ بے دُود ہونا چاہیئے

رکھ اسے پہلو میں بے لوث غبارِ آرزو
دل کا آئینہ نہ زنگ آلود ہونا چاہیئے

برقؔ میخانے میں ہوگی منعقد بزمِ سخن
آپ کو تو کم سے کم موجود ہونا چاہیئے

(از جناب سید وجاہت حسین رمزؔ تلہری)

اب اٹھا دیا ہے نقاب اگر تو پھر اک نگاہ بھی بام سے
تجھے چشمِ بد سے گزند کیا کوئی جرعہ پھینک دی جام سے

میں لرز رہا تھا جہاں میں بھی اسی دل کو حشر کے نام سے
مجھے بیکسی میں پناہ دے مجھے بخشِ منظرِ عام سے

مرا نقشِ سجدہ ہی رہ سکے ترے سنگ در پہ تو شکر ہے
یہ تو جانتا ہوں کہ پاسباں کو ہے دشمنی مرے نام سے

کوئی پھول ہنس ہنس کے فنا ہوا کوئی غنچہ وقتِ صبا ہوا
کوئی شمع صبح کو اٹھ گئی کوئی بجھ گئے رنگیٔ شام سے

انھیں آشیاں سے چمن سے کیا انھیں برق شعلہ فگن سے کیا
وہ پڑے ہیں قید میں آجتک جو قفس میں آ گئے تھے دام سے

ابھی اور زلف کو پیچ دے کہ دل اپنی بات تو رکھ سکے
ترا جلوہ خانہ بدوش ہے جو گرا یہ آئینہ بام سے

جسے بجلیوں نے چھوا نہ ہو پھر اس آشیاں کا پتہ نہ ہو
تجھے یاد بھی ہے یہ باغباں کہ بکا تھا تو مرے نام سے

ابھی راہ ہے دل بے عمل جو سنبھل سکے تو سنبھل کے چل
جو بدل سکے تو ابھی بدل مری موت زیست کے نام سے

یہ نگاہ میکدہ ساز تھی کہ میں لغزشوں سے بچا رہا
جو پڑے کہیں کا کہیں قدم تو گیا تھا بادہ بھی جام سے

وہ گئے ہوئے تھے وہ سب کہاں جو ہوا کی زد میں جلا گئے
بہت ایسے رمزؔ چراغ تھے کہ بھڑک کے رہ گئے شام سے

(از حضرت جلیل قدوائی)

داستاں ثبت ہے ہر صفحۂ گل پر میری
پڑھتے ہیں باغ میں افسانۂ غم دل میرا

کھو گیا ہوں میں کہیں راہ میں لیکن احباب
راستہ دیکھ رہے ہیں سرِ منزل میرا

تم نے دیکھا تھا اس انداز سے کیوں میری طرف
اب سنبھلتا ہے سنبھالے سے کہیں دل میرا

عشق کی رہ میں پہلا ہی اٹھایا ہے قدم
حوصلہ پست نہ کر دوریٔ منزل میرا

جو بیگانۂ منزل سا رہا کرتا ہوں
یہ بھی ہے ذوقِ طلب گاہِ منزل میرا

ڈوب کر مجھ کو ملا بحر پہ ایسا قبضہ
دامنِ موج مرا ہے لبِ ساحل میرا

پردۂ دل میں تجھے لے کے چھپا پاتا ہوں
کیا دکھاتا ہے مجھے جذبۂ کامل میرا

لاؤں میں عشق میں پھر اور کہاں سے گرمی
تو بھی گر ساتھ نہ دے اے تپشِ دل میرا

بحرِ غم جوش پہ ہے خوف نہ آئے کیونکر　　ناخدا کشتیِ امید کا ہے دل میرا
کچھ تو پامال خاک زمانے نے کیا ہے مجھکو　　خاکساری میں ہے کچھ عجز بھی شامل میرا
چھُٹ کے اس انجمنِ ناز سے افسوس جلیلؔ　　اب بہلتا کسی محفل میں نہیں دل میرا

(از منشی گوبرن لال ادیبؔ لکھنوی بی۔ اے)

کب معرفتِ حق کی انسان میں طاقت ہے　　احساسِ حقیقت بھی اعجازِ محبت ہے
فطرت کی مخالفت ہے گر دل میں عداوت ہے　　ترتیبِ عناصر کی بنیاد ہی الفت ہے
کیا شوق کے جذبے ہیں کیا دل کی حقیقت ہے　　آئے جو تصور میں یہ بھی تری رحمت ہے
پابندِ فرائض ہوں انجام سے بے پروا　　آغازِ محبت ہی انجامِ محبت ہے
ہر ذرۂ صحرا ہے اک راہ نما میرا　　ہر خارِ بیاباں کا انگشتِ ہدایت ہے
فطرت کا تقاضا ہے کچھ کام کئے جانا　　مانا کہ وہی ہو گا جو اس کی مشیت ہے
جلووں کا نہیں ممکن محدودِ نظر ہونا　　یہ مشقِ تصور بھی انعامِ عقیدت ہے
کثرت ہی کے پردے میں اسرار ہیں وحدت کے　　یعنی ترا ہر جلوہ شایانِ عبادت ہے
ہے چشمِ تصور کو جلووں سے ہم آغوشی　　خلوت میں بھی جلوت ہے جلوت میں بھی خلوت ہے
ظلمت ہوئی پوشیدہ وہ نورِ سحر چمکا　　پھر چشمِ تماشا کو جلووں کی بشارت ہے
معلوم نہیں مجھکو میں کیا ہوں ادیبؔ آخر　　دنیا جسے کہتے ہیں کہ وادیِ حیرت ہے
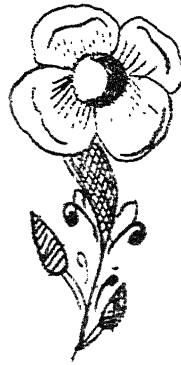
مشاہیر ہند

ہز ایکسیلنسی کپتان سکندر حیات خاں قائم مقام گورنر پنجاب

ہز ایکسیلنسی سر جافرے ڈی مونٹ مورنسی بالقابہ گورنر پنجاب کے دو ماہ کی رخصت حاصل کرنے کے بعد ملک معظم نے خان بہادر کپتان سکندر حیات خاں صاحب ایم، بی۔ ای ممبر اگزیکٹیو کونسل پنجاب گورنمنٹ کو قائم مقام گورنر مقرر کر دیا ہے۔ صاحب موصوف پنجاب اگزیکٹیو کونسل کے سینیر ممبر تھے لہذا یہ تقرر حق بحقدار کے مصداق ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ چوتھا موقع ہے کہ کوئی ہندوستانی گورنر مقرر ہوا ہو اس سے پیشتر لارڈ سنہا کو بہار اور اڑیسہ کا گورنر مقرر کیا گیا تھا، اور مسٹر تامبے اور نواب صاحب چھتاری صوبہ متوسط اور یو۔پی کے گورنر مقرر کئے گئے تھے۔

پنجاب کی خوش نصیبی ہے کہ اُن کو ایک ایسا گورنر میسر ہوا ہے جو پنجاب ہی کا باشندہ ہے۔ ہز ایکسیلنسی کپتان سکندر حیات خاں صاحب کے دادا سردار کرم خاں نے جو جنرل نکلسن کے ہمراہ ہو کر لڑے ۱۸۴۹ء میں سوار اور پیادہ فوج فراہم کی اور راولپنڈی کے پار درہ مرگلا کی حفاظت کرنے میں مدد دی۔ سردار کرم خاں کے لڑکے سردار محمد حیات خاں (جو بعد میں خان بہادر محمد حیات خاں، سی آئی۔ای۔ ہوئے) چند رنگروٹوں کو لیکر ایبٹ صاحب کے ساتھ شامل ہوئے اور سکھوں کی لڑائیوں کے خاتمے تک اُن کے ساتھ رہے، ان لڑائیوں میں اُن کا آبائی محل بالکل تباہ ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء میں جنرل نکلسن پشاور کے ڈپٹی کمشنر بنائے گئے اور جب غدر ہوا تو نواب محمد حیات خاں نے جنرل نکلسن کی درخواست پر باغیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے آفریدیوں کی ایک فوج فراہم کی۔ بعد میں جب جنرل نکلسن سفری فوج کے کمانڈر مقرر ہوئے تو اُنھوں نے نواب محمد حیات خاں کو اپنا ایڈیکانگ نامزد کیا اور آپ نے ہوتی مردان وغیرہ میں شاندار خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد جنرل نکلسن کی فوج دہلی کو روانہ ہو گئی اور سردار موصوف محاصرے کے دوران میں جنرل نکلسن کے ہمراہ ہو کر لڑتے رہے۔

جب جنرل نکلسن گولی سے زخمی ہوئے تو سردار محمد حیات خاں نے نہایت جاں نثاری سے آخری وقت تک ان کی خدمت سرانجام دی۔ کہتے ہیں جنرل نکلسن نے اپنے خون سے ایک چٹھی لکھی جس میں برطانوی گورنمنٹ اور برطانوی لوگوں سے سردار محمد حیات خاں کی شاندار خدمات کا ذکر کیا۔

غرض ہز ایکسیلنسی کپتان سکندر حیات خاں ایک برگزیدہ اور وفادار حکومت خاندان کے

چشم و چراغ ہیں، اُن کا آبائی وطن واہ ضلع اٹک ہی جہاں وہ جون ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ محمڈن اورینٹیل کالج علی گڑھ اور یونیورسٹی کالج لنڈن میں تعلیم حاصل کی۔ جنگ کے آغاز میں آنریری اسسٹنٹ رکروٹنگ افسر مقرر کئے گئے۔ بعد میں ان کو پنجابی رجمنٹ میں کمیشن دیا گیا۔ جنگ کے دوران میں انھوں نے زیادہ تر شمال مغربی سرحد پر نہایت شاندار خدمات سرانجام دیں۔ جنگ کے بعد پنجاب لیجیسلیٹو کونسل میں داخل ہوئے، دو دفعہ بلا مقابلہ اس کے ممبر منتخب کئے گئے ۱۹۲۶ء میں پولیس تحقیقاتی کمیشن کے غیر سرکاری ممبر مقرر کئے گئے، اور پرنس آف ویلز کے دورہ کے دوران میں میلا افسر کے پرسنل اسسٹنٹ مقرر ہوئے بعد میں پنجاب کی قانونی کونسل کی طرف سے سائمن کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے اس کمیٹی نے اتفاق رائے سے ان کو صدر منتخب کیا۔ ممدوح گیارہ کمپنیوں کے ڈائرکٹر بھی رہ چکے ہیں ۱۹۲۹ء میں تین ماہ کے لئے گورنمنٹ کے قائم مقام ریونیو ممبر مقرر ہوئے اور دو سال سے اس عہدے پر مستقل ہیں۔ ہز ایکسلنسی نواب لیاقت حیات خاں صاحب چیف منسٹر ریاست پٹیالہ کے سگے بھائی اور نواب مظفر خاں صاحب ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات پنجاب کے چچا زاد بھائی ہیں۔

بہرکیف ہم کپتان صاحب کے تقرر کا پُرتپاک خیر مقدم کرتے اور اُن کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ خدا کرے ان کا یہ مختصر عہد گورنری بھی پنجاب کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو۔

یاد رفتگاں

حضرت تمنا مرحوم

آپکا نام منشی رام سہائے تخلص تمنا آپکے استاد فرحت صاحب کا رکھا ہوا تھا جو تمنا صاحب کے ماموں بھی تھے آپ کے مورثِ اعلیٰ دہلی کے رہنے والے تھے، نادرشاہ کی لوٹ کے بعد لکھنؤ میں آباد ہوئے۔ تمنا صاحب کے پردادا منشی ادے راج مطلع اور دادا منشی الیشری پرشاد شعاعی فارسی کے اعلیٰ طبقہ کے شاعر تھے۔ شعاعی صاحب نثار بھی تھے آپکی قلمی کتاب رقعات شعاعی آپکی علمیت کا پتہ دیتی ہے۔ تمنا صاحب غدر سے تین برس پہلے پیدا ہوئے آپکی تعلیم شروع میں پُرانے طریقے کے مکتبوں میں ہوئی، فارسی تعلیم کے بعد انگریزی تعلیم آپ نے مشن اسکول میں حاصل کی اور چونکہ اس زمانہ میں سرکار کو انگریزی دانوں کی بہت ضرورت تھی اسلئے آپکو سولہ برس ہی سے قبل اودھ کے ڈائرکٹر کے دفتر میں جگہ مل گئی۔ غدر کی تباہی کی بدولت آپکے سارے خاندان کی بسر اوقات حضرت تمنا ہی کی آمدنی پر تھی۔ اسی زمانہ میں گورنمنٹ کی طرف سے صوبہ کی تواریخی اور اقتصادی جغرافیہ تیار ہو رہی تھی تمنا صاحب اس کام میں مدد دینے کیلئے اپنی کم سنی ہی میں منتخب کئے گئے۔ سررشتۂ تعلیم کی طرف سے اردو میں ایک گزٹ بھی نکالا گیا جس کی اڈیٹری بھی آپ کے سپرد کی گئی

اس گزٹ کو آپ قریب ستائیس برس تک نکالتے رہے۔ ان مشغلوں کے ساتھ ساتھ تمنا صاحب نجی حیثیت سے شعرو شاعری کا مشغلہ بھی جاری رکھا آپکو شاعری کا خاص شوق تھا آپ اپنی غزلوں کی اصلاح اپنے ماموں منشی شنکر دیال صاحب فرحت سے لیا کرتے۔ اس زمانہ میں کئی اور بزرگ بھی استادانہ قابلیت رکھتے تھے جن سے تمنا صاحب کو فیض حاصل ہوا۔ چونکہ اس زمانہ میں علم کی اشاعت کی بڑی ضرورت تھی اور آپ سرکاری ملازم تھے اسلئے آپ نے اپنے والد کی نگرانی میں تمنائی پریس جاری کیا اور ایک اخبار بھی تمنائی اخبار کے نام سے نکالا۔ تمنائی اخبار بہت عرصہ تک جاری رہا، اسی اثنا میں آپ کے چھوٹے بھائی منشی دوار کا پرشاد افق نے ایک نظم اخبار جاری کیا جو شروع سے آخر تک نظم میں ہوتا تھا یہاں تک کہ خبریں بھی نظم میں لکھی جاتی تھیں۔ یہ اخبار بھی تمنائی پریس میں چھپتا تھا۔ افضل التواریخ اور اشرف التواریخ شاہان اودھ کی مکمل تاریخیں بھی اسی پریس میں چھپیں اردو زبان میں ہندو مذہبی کتابوں کی بہت ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ حضرت تمنا نے چھوٹی چھوٹی قریب دوسو کتابوں کے تصنیف کیں، جن میں کئی قسم کی رامائنیں، بھجن، استتیں وغیرہ سبھی شامل ہیں۔ ڈائرکٹر کے دفتر سے متعلق ہونے کی وجہ سے آپ کو درسی کتابیں لکھنے کی بھی سہولیت تھی لہذا آپ نے کئی کتابیں مثلاً مضامین اخلاقی، ضروریات ہند، رسالہ خط شکست، رسالہ خطوط نویسی وغیرہ تصنیف کیں۔ رسالہ خط شکست اسکولوں میں کتاب کی شکل میں سب سے پہلے آپ ہی نے پیش کیا۔ چنانچہ آپ کا رسالہ خط شکست بہت عرصہ تک اسکولوں میں جاری رہا۔ درسی کتابوں کے علاوہ آپ نے کئی قصے نظم میں شائع کئے شکسپیر کے رومیو جولیٹ کا قصہ گلزار فرنگ کے نام سے شائع ہوا۔ براوننگ کے پادری ہیملن کا فسانہ ہیملن توتی باز کا قصہ" کے نام سے شائع کیا۔ اور بھی کئی قصے مثلاً اسلک گھر وغیرہ لکھے۔ اس زمانہ میں اسکولوں میں اردو ڈکشنری کی بڑی ضرورت تھی حضرت افق اور آپ نے ملکر ایک لغت اسکول ڈکشنری کے نام سے شائع کی۔ جو بہت مقبول ہوئی۔ آپنے برہمن عالموں کی مدد سے ہندی میں بھی کافی مہارت پیدا کر کے کئی کتابیں لکھیں۔ کئی سال ہوئے پنڈت ادھے شیام کی رامائن کا طرز خاص طور پر کتھا باچکوں کو مرغوب تھا اسلئے پنڈت جی نے اپنے طرز میں ایک کتاب لکھنے کیلئے تمنا صاحب سے فرمائش کی چنانچہ آپنے دھرو چرترا اسی طرز میں لکھ ڈالا اور وہ پنڈت جی ہی کے مطبع سے شائع ہوا۔ ہندی شاعری کے سلسلہ میں بھارت دھرم مہامنڈل کیطرف سے آپکو کوی بھوشن کا خطاب عطا ہوا۔ آپنے رباعیات عمر خیام کا بھی ترجمہ کیا ہے مگر ابھی یہ شائع نہیں ہو سکا۔

آپ کی بی بی بھی ہندی میں شاعری کرتی تھیں کشن پیاری کے نام سے آپکی کئی تصنیفات شائع ہوئی ہیں یہ فن موسیقی کی ماہرہ تھیں اسلئے آپکے ہندی گانے اور بھجن کی کتابیں بہت مقبول ہوئیں۔ آپنے شاماین کے نام سے کرشن جی کے حالات ہندی شاعری میں قلمبند کر کے شائع کئے۔ شادی کے وقت تمنا صاحب کی عمر دس برس کی اور آپکی بی بی کی عمر آٹھ برس کی دونوں نے مرتے وقت تک ایکدوسرے کا ساتھ نہ چھوڑا اور تمنا صاحب کے انتقال کے پچیس دن بعد آپ بھی جسم خاکی چھوڑ کر سورگ میں آپ سے جا ملیں۔ الشور غریق رحمت کرے۔

ادھر کون آرہا ہے؟

یہ ایک سوال ہے جو رات کے چلنے
والوں سے برے بھلے کا فرق دور
کرنے کے لئے پولیس کانسٹبل پوچھتا ہے

لیکن ہماری مندرجہ ذیل دوائیوں کی بابت کسی کو ذرا بھی شک کا موقع نہیں ہر ایک استعمال کرنیوالے کو ان کی بابت پوری اور خاطر خواہ تسلّی ہو گئی ہے اگر آپ نے ابھی تک تجربہ نہیں کیا تو اب ضرور تجربہ کیجیے۔

اکسیر نگرہ گولیاں قبض، بدہضمی خون اور مادہ مردمی کی خرابی وغیرہ جریان۔ احتلام سرعت۔ رقت وغیرہ کو دور کر کے اعلیٰ درجہ کی طاقت و توانائی حاصل کرتی ہیں۔

چندر پربھا گولیاں سوزاک جلن پیشاب اور عورتوں کے ہر قسم کے امراض مخصوصہ کی لاثانی دوا ہے۔

جور انتک گولیاں ہر قسم کے بخار کے دفع کرنے میں پوری طرح فتحمند ثابت ہوئی ہیں۔

بال امرت گولیاں بچوں کے جملہ امراض کو نابود کر کے تندرستی و توانائی بخشتی ہیں۔

کاسانتک گولیاں ہر قسم کی کھانسی اور دمہ کے لئے اکسیر علاج ہے۔

لعوق دمہ دمہ کے حملوں کو چند منٹوں میں دور کرنے کی لاثانی دوا ہے۔

قیمت ہر ایک دوا فی ڈبیہ صرف ایک روپیہ۔ پانچ ڈبیہ کی دوا چار روپیہ میں علاوہ محصول ڈاک۔

صحت اور تندرستی کی نعمت ۔۔۔ راست کی ۔۔۔ عمدہ مضامین سے مزین کتاب کام شاستر بلا قیمت طلب فرمائیے

ویدشاستری منی شنکر گووند جی جام نگر (کاٹھیاواڑ)

[illegible]

ڈاکٹر ایس کے برمن
لمیٹڈ
بانی
ڈاکٹر ایس کے برمن
پچاس سالوں سے ہندوستانی پیٹنٹ دواؤں کا ہمیشہ بڑا کارخانہ
برسات میں ملیریا کا خوف
جوڑی تاپ
REGD
(فصلی بخار و طحال کی دوا)
سے ہر سال لاکھوں مریض صحت پاتے ہیں۔ برسات کے ساتھ ہی ملیریا بخار
ہوتا ہے اس لئے آپ کو بھی مناسب ہے کہ اسکی ایک شیشی منگا کر اپنی اور
دوسروں کی جان بچائیں کیونکہ ملیریا۔ باری کا بخار اور بڑھی ہوئی طحال کو گلانے
کی یہ لاجواب دوا ہے۔ اکترا۔ تجاری۔ چوتھیا طحال اور کالا بخار اس سے دفع
ہوتا ہے یہ خون کی خرابیوں کو دور کرکے گاڑھا کرتی ہے۔ اس کے استعمال
سے اجابت بھی خلاصہ ہوتی ہے قیمت فی شیشی کلاں پندرہ آنہ ۱۵ شیشی خرد
نو آنہ ۹ محصول شیشی کلاں دس آنہ ۱۰ شیشی خرد سات آنہ ۷
دوا کھانے کے پہلے
دوا کھانے کے بعد
REGD.
رنگ رنگ
داد کا مرہم
نیا پرانا داد خواہ کھجلی کیسی ہی کیوں نہ ہو اس کے استعمال سے فوراً دور ہوتی ہے۔ اور طرہ یہ کہ کسی قسم
کی سوزش یا تکلیف نہیں ہوتی۔
قیمت فی ڈبہ چار آنہ ۴ محصول چھ ڈبوں تک سات آنہ ۷ نمونہ دو آنہ ۲
نقلی دواؤں سے ہمیشہ ہوشیار رہیئے
نوٹ ہماری دوائیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ بغرض کفایت محصول ڈاک اپنے مقامی ہمارے ایجنٹوں سے
خریدیں۔ نمونہ صرف ایجنٹوں ہی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔
صیغہ نمبر ۶۷ پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ
ایجنٹ: کانپور نیا گنج میں مسرس محمد حفیظ محمد نصیر صاحبان
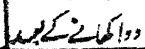
THE WOMAN'S TONIC

لٹرس کارڈی آل یعنی اکسیر نسواں

لٹرس کو جسمانی صحت کیلئے بہترین دوا قرار دیتے ہیں

ہر گھر میں اس کا رہنا نہایت ضروری ہے

ں۔ بہن۔ اور بیٹی کے واسطے بہترین دوائی

Rio Chemical Co

79, BARROW STREET,

NEW YORK, (U.S.A.)

ہندو شعراء

خواجہ عشرت لکھنوی کی جدید تالیف چار سو پچاس گزشتہ
و موجودہ ہندو شعراء کے حالات مؤثر و دلکش قابل دید چیدہ
اشعار قیمت ۴؍

تذکرہ آب بقا گزشتہ و موجودہ شعراء کے حالات عہ؍

شاعری کا مکمل سٹ چار جلدوں میں عہ؍

لغات اردو مکمل سٹ ۱۲ روپے

حال اردو ہندی اور اردو کی حقیقت اور الفاظ کا فرق ۶؍

اصلاح زبان اردو۔ متروکات کی تشریح ۶؍

ترجمان پارسی۔ اردو سے فارسی بنانیکی آسان ترکیب ۶؍

زبان دانی۔ اردو کے مستند قواعد ۶؍

اصول اردو ۶؍

المشتہر منیجر عشرت بکڈپو احاطہ خانساماں لکھنؤ

ہاف ٹون عکسی تصاویر

یہ تصاویر ہاف ٹون بلاک سے عمدہ آرٹ پیپر پر شائع ہوئی ہیں اور ان کو عام پسندیدگی کا فخر حاصل ہے

تصاویر رنگین
فی تصویر ۲ر
نغمۂ محبت
موسم سرما
باد بہاری
انتظار
ہدایت
گل پنج روز
رفیق طفلی
شکنتلا و دشینت
مشعل ہدایت
تار شکستہ
صبح نوروزی
فن تصویر کے نمونے
کثرت میں وحدت
وقت نزع
نظریہ کا آغاز
راجہ آج کا ملاپ
بھکارنی
سمندر ساشن
امید و فاداری
سیواجی اور رام داس

قدیم زمانہ کا طریق جنگ
یورپ کا ایک معرکہ
ایک قدیم مشرقی مدرسہ
مصطفےٰ کمال پاشا
کی ترکی کونسل
غسل کی تیاری
ستیہ وان اور ساوتری
راجہ کمانڈ کے بیٹے
کا قتل
باسدیوا اور دیوکی قید
زیر بحث متعلق سکھ دوست
کالیداس ۱ر
اکبر اعظم ۱ر
راجہ مان سنگھ ۱ر
اکبر اور چیتے کا شکار ۱ر
دربار شاہجہاں ۱ر
عہد مغلیہ میں شاہی
سواری کا جلوس
محاصرہ چتوڑ
پیدائش شاہزادہ سلیم
دربار جہانگیر میں سفیر
فارس

دارا شکوہ کا سر اورنگزیب
کے سامنے پیش ہوتا ہے
میران صاحب معہ جعفر
ٹیپو سلطان
دربار مادھو راؤ پیشوا
دربار شاہ عباس

موسمی تصاویر
ماہ چیت ۲ر بیساکھ ۲ر
جیٹھ ۲ر اساڑھ ۲ر
بھادوں ۲ر ماگھ ۲ر
پھاگن ۲ر ساون ۲ر

مشہور انشا پردازان اردو
مولانا شبلی ۱ر
شمس العلماء ذکاء اللہ ۱ر
شمس العلماء ڈاکٹر سید علی ۱ر
میر تعشق لکھنوی ۲ر
حضرت نسیم مرحوم ۲ر
حضرت سرور ۲ر
مولوی عزیز مرزا ۲ر
بابو بالمکند گپتا ۲ر
اڈیٹر بھارت متر ۲ر

مشاعرہ کیننگ کالج
منعقدہ ۱۸ء ۱ر
منشی احمد علی شوق ۱ر
مرزا سلطان احمد ۱ر
مرزا محمد رفیع سودا ۱ر
مرزا انشاء اللہ خاں ۱ر
مولانا عبدالرزاق البرامکہ ۱ر
مولانا آزاد دہلوی ۱ر
مسٹر رام بابو سکسینہ ۱ر
منشی نوبت رائے نظر ۱ر
جناب چکبست ۲ر
حضرت صفی ۱ر
ڈاکٹر اقبال ۲ر
مولانا حسن نظامی ۲ر

لیڈران ہند و ناموران ملک
راجہ رام موہن رائے ۲ر
مسٹر دادا بھائی نوروجی ۱ر
سر سالار جنگ ۲ر
ڈاکٹر نذیر احمد خاں ۱ر
[illegible] دیانند کالج ۱ر
مسٹر تلک ۲ر

جسٹس محمود ۲ر
بابو سریندر ناتھ بنرجی ۱ر
کالیچرن بنرجی ۱ر
سر رام کرشن بھنڈارکر ۱ر
بابو گنگا پرشاد ورما ۲ر
سوامی ویوکانند ۲ر
نواب محسن الملک ۲ر
مسٹر ریس بہاری ۲ر
ڈاکٹر ستیش چندر
بنرجی ۲ر
پنڈت بشمبھر ناتھ ۲ر
بابو پرتاپ چندر بنرجی ۲ر
جسٹس لال چند ایم اے ۱ر
آنریبل مسٹر گوکھلے ۲ر
انجمن خادمان ہند ۱ر
مسٹر رام داس ۲ر
مہاتما گاندھی ۲ر
پنڈت مدن موہن
صاحب مالوی ۱ر
کرنل بھولاناتھ ۲ر
پنڈت موتی لال نہرو ۲ر
لالہ لاجپت رائے ۲ر

سر ابراہیم رحمت اللہ
لالہ ہنسراج ۲ر
راجہ صاحب محمود آباد ۱ر
لارڈ سنہا ۱ر
سر آغا خاں ۲ر
مولانا محمد علی ۲ر
مسٹر سچدانند سنہا ۲ر
مسز سروجنی نائیڈو ۲ر
مسٹر [illegible] ۲ر
مہاتما منشی رام ۲ر
سوامی شردھانند ۲ر
سر سریندر ناتھ بنرجی
ڈاکٹر ٹیگور ۲ر
بابو بھگوان داس ۲ر
نواب سید حسین بلگرامی ۱ر
نواب سید محمد ۱ر
سورداس ۱ر
ایک عالم دین کا مدرسہ ۱ر
مصروف [illegible] ۱ر
منشی شیو نرائن [illegible] ۱ر
راز و نیاز ۱ر
تصویر [illegible] ۱ر

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱

مرتبہ: دیا نراین نگم، بی-اے

لد ۵۹	اگست ۱۹۳۲ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

تصویر: مہاتما گوتم بدھ

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

مہاتما گوتم بدھ

زمانہ

جلد ۵۹ | اگست ۱۹۳۲ء | نمبر ۲

راجپوت مصوّری

(۲)

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاؔب بریلوی۔ بی۔ اے)

راجپوت مصوری کے وہ تمام مماثل جواب تک دستیاب ہوئے ہیں مغل اسکول کے ہم دور ہیں۔ حالانکہ
ں اور راجپوتوں کی فنی مناسبت و مطابقت سے ثابت ہے کہ عہد مغلیہ کے آغاز سے صدہا سال
قدیم ہندی فنِ تصویر کے اِس طرزِ جدید کی طرح پڑ چکی تھی۔ بعض محققین کی تلاش و تدقیق سے حال
ں چند ایسی تصویریں برآمد ہوئی ہیں جو مغلوں کے ظہور سے بہت پہلے کی بتائی جاتی ہیں، پھر بھی
ں و حال کے تمام کارنامے مجموعی حیثیت سے اپنے خالق کی پیامبری میں قطعاً ہمرنگ و ہمزبان ہیں۔
ں زندگی کی حقیقی نمایندگی راجپوتی صنعت کا بنیادی اصول ہے یہی وجہ ہے کہ راجپوت مصوری کی
ی عام دلچسپی کا موضوع ہے لیکن چونکہ مغل مصور دربار کے اشارہ پر اپنے فطری جوہر کی نمود و نمائش
۔ ہے ہیں اس لئے شخصی خوشنودی اور انعام و اکرام کے علاوہ وہ بات پیدا کرنے سے قاصر ہے
ں کے پیشرو کو حاصل ہے۔

ذہنی طرز معاشرت کا چربہ اتارنے میں تو راجپوت کاریگر نے قلم توڑ دیا ہے، تلوار کے دھنی نے اس میدان
سن کمال کے وہ وہ ہاتھ دکھائے ہیں کہ بلا تامل دنیا کو اس کے زورِ قلم کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ دہقانوں کے
ل، آل لی تفریح، لہو و لعب، خانگی زندگی اور مذہبی رسوم کی آئینہ داری میں انتہائی نفاست ملحوظ
ئی ہے مصور کے پروازِ تخیل میں تو اس بلا کی جدت ہے کہ ہمیش پا افتادہ مضامین کی بندش میں بھی شیرینی

لطافت قدم قدم پر ہاتھ چوم رہی ہے۔ بازار ہاٹ کے عام مناظر میں عجیب انداز کمال سے خصوصیت کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔

سامنے چاک کے قریب مٹی کے برتن بکھرے ہوئے ہیں، کمہار آس پاس کھڑے ہوئے خریدار کو اپنی چرب زبانی کے جوہر دکھانے میں مصروف ہے۔ اس مختصر سے مجموعہ میں ایک سردار بھی موجود ہے جسے اس کی دستار میں آویزاں پھول نے عوام سے ممتاز کر دیا ہے۔ کمہار کے قریب ہی کھڑی دوشیزہ اپنی شرمگیں نگاہوں سے سردار کی قدر شناسی کا اندازہ کر رہی ہے۔ آنکھوں میں مسرت کی چمک نمایاں ہے اور گلابی ہونٹوں سے مسکراہٹ پھوٹی پڑتی ہے۔ سطح کے ابھار سے چابکدست مصور نے سارے منظر پر بڑی صفائی سے جلا کر دی ہے۔ ایک طرف نوربات کا چھوٹا سا کچا مکان ہے جہاں وہ کرگھے پر جھکا ہوا قالین کی تکمیل میں محو ہے۔ اس کے گرد و پیش رنگ برنگ صوف کی گچھیاں اور ضروری اوزار ادھر ادھر بے ترتیب پھیلے ہوئے ہیں۔ قریب ہی پانی کی چھاگل اور جوتے رکھے ہیں جو بتا رہے ہیں کہ نوربات تاروں کی درستی میں پیروں سے بھی کام لے لیا کرتا ہے۔

زر دوزی، خیاطی، چھیپی اور زرگری وغیرہ دکانوں کے مناظر پیش نظر کر کے مصور نے اپنے عام مشاہدہ اور ادراک فن کا ثبوت دیا ہے۔ ایک دوسرے منظر میں صناع نے جذبات کی مصوری میں غضب کا کام کیا ہے۔ کسی چیرہ دست کا مشاق بیٹا اپنے آبائی پیشہ میں غیر معمولی سلیقہ اور استعداد کا اظہار کر رہا ہے، اس کا نومشق چھوٹا بھائی اس کی صفائی و سرعت کا متحیر نگاہوں سے اعتراف کر رہا ہے، ان کے پس پشت دو خواتین کھڑی ہیں، ان میں سے ایک کی گود میں پیارا پیارا بچہ کلکلیاں کر رہا ہے۔ نوخیز بچے کا ماں کے کان کی آبدار بالی پکڑنے کا دلربا انداز جس قدر دلفریب ہے اس سے کہیں زیادہ دلدوز اس کے مسرت انگیز نعرے ہیں جو پردۂ تصویر میں بھی سنے جا سکتے ہیں۔ اس خاتون کی ہمجولی اپنے نابالغ لڑکے کا ہاتھ تھامے پیاری سہیلی کی لاانتہا مسرتوں میں کھلے بندوں حصہ لے رہی ہے۔

سیاحت و تفریح کے مناظر کی مصوری میں راجپوت اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ زمانۂ سلف میں آمد و رفت کے ذرائع محدود و مخدوش ہونے کے باعث سفر کرنا فرصت و فارغ البالی کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ لوگ جوق در جوق گھر سے باہر قدم رکھتے اور خیل کے خیل منزلیں طے کرتے تھے۔ یہی باعث ہے کہ سیاحت کی کہنہ اہمیت مصور کے زور تخیل دکھانے کا بہترین موضوع بن گئی ہے چنانچہ دوپہر کا پڑاؤ، اندھیری رات میں خیموں کے گرد لگے ہوئے الاؤ کی ناچتی ہوئی روشنی، کاروانوں اور قافلے والوں کا ٹھہرنے میں طویل قیام وغیرہ خشک واقعات میں بھی راجپوت کی نظر انتخاب اور فکر رسا کے لئے بیحد کشش

کانگڑہ قلم کے ایک شہرۂ آفاق شاہکار میں سڑک کے کنارے قافلہ کے پڑاؤ کا قابلِ دید منظر بڑی خوبی سے دکھایا گیا ہے۔ دوپہر کے سر چڑھے آفتاب کی آتش بار تمازت سے بچنے کے لئے مسافروں نے سخی کی شہرت کی طرح پھیلے ہوئے بڑ کے درخت کے سایہ میں پناہ لی ہے۔ تھکے ماندے قلی نے اپنا گراں بار بوجھ ایک طرف ڈال دیا ہے، اور بوسیدہ بستر فرشِ خاک پر دراز کر کے کمال بے پروائی سے سر جھکائے بیٹھا ہے۔ ایک دوسرا مزدور بھی کچھ فاصلہ پر پیر پھیلائے دم لے رہا ہے۔ کنوئیں کی سیڑھیوں پر نیم خمیدہ سطح محافظ خاص اندازِ تشکر کے ساتھ پانی پی رہا ہے۔ پانی دینے والی "موتن" دوشیزہ گھونگھٹ کی اوٹ میں کنکھیوں سے آبِ حیات حل کر رہی ہے۔ جگت کے نیچے ایک خدمتگار اپنے آقا کے لئے حقہ تازہ کر رہا ہے۔ رحمدل مالک ہاتھ کے منکرانہ اشارے سے اُسے آرام کرنے کا مشورہ دے رہا ہے اور دوسرے ہاتھ سے آئینہ کے روبرو بال سنوارنے میں مشغول ہے۔ پاس ہی دو عورتیں بیٹھی ہیں، ان میں سے ایک پنکھا جھل رہی ہے اور ہوش رُبا ادا و مستانہ انداز سے پیر دبا رہی ہے۔ الغرض ساری کی ساری تفصیلیں اسی کمال کے ساتھ منقوش ہوئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے۔ تصویر منہ سے بولا چاہتی ہے۔

گڑھوال اسکول کے مستغنی عن التعریف مصور منکو نے جے دیو کی مشہور تصنیف "گیت گووند" کا تتبع کر کے حیاتِ دوام حاصل کر لی ہے۔ ٹہری کی ایک شہزادی کے ایما پر جو کرشن کی بھگتی میں میراں کی طرح سرشار تھی منکو نے اس طرف توجہ کی، ورنہ طبعاً وہ سطحی مناظر کی نقاشی کا شائق تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ اس شعبہ فن میں طاق و یگانہ تھا۔ چونکہ اوروں کی طرح اس پر بھی پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں اس لئے وہ مختارانہ اپنی قابلیت و ہمہ گیری کا مظاہرہ کرنے سے قاصر رہا۔

ہمالہ کی برف سے چھپی ہوئی فلک بوس چوٹیاں، برفستانی قوسِ قزح کی نیرنگیاں، زریں آسمان اور طلوع و غروب کے سحر کار نظارے، برف بار وادیوں اور لق و دق کہسار میں پانی کی مترنم موجوں کی مستانہ وار چھیڑ چھاڑ، منکو کی ایک نگاہِ الفت کی امیدِ حصول میں سب کے سب اپنی ساری دلربائیوں اور رنگینیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ کرشن اور گوپیوں کی پاک صحبتوں کی یاد تازہ کرانے کا سامان فراہم کرتے وقت منکو نے سطح کی اُبھار کے لئے حسبِ دلخواہ چٹیل پہاڑیوں، دلفریب مرغزاروں، چشموں اور کہساروں کا انتخاب کیا ہے۔ اکثر و بیشتر اس کی "بیک گراؤنڈ" اصل تصویر سے زیادہ دلکش ہو گئی ہے۔

منکو کے ایک شاہکار کا ماحصل یہ ہے کہ سنسان دریا کے کنارے حسنِ بہار نے اپنی مخمور آنکھیں بچھا دی ہیں، چاندنی کی نقرئی بارش میں جمنا کی مہتاب در بغل موجیں بےخود و بدمست رواں دواں ہیں۔ اس سکون

وسکوت کے عالم میں وارفتۂ الفت رادھا سراپا ناز کرشن سے دوچار ہوتی ہیں اور آنکھیں چار ہوتے ہی عالم بالا کے سربستہ راز ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح عریاں ہو کر کائنات کے حسین ذرّوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس منظر کی تشکیل میں مصوّر کو جس قدر کامیابی بیک گراؤنڈ کی تعمیر میں ہوئی ہے اس نے اس کے بقیہ عمل کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔

ماہتاب کی نورانی شعاعوں اور آگ کے مشتعل شعلوں کی آمیزش سے کسی منظر کو نمایاں کرنا بھی مصوّر کی روش عام میں داخل ہے۔ درختوں کے نیچے یا جھونپڑیوں کے جلو میں دہکتی ہوئی آگ کی مدھم روشنی میں افراد کا اجتماع عجیب شانِ خود نمائی سے ہمدوش ہے۔ دور تاریکی میں ملبوس کائنات آنکھ بند کئے خاموش پڑی ہے" ماہِ نو کی دھندلی کرن" نے "شبِ دیجور" کی "سیاہ چادر" پر اس شوخی سے طلائی جدول کھینچ دی ہے کہ "لیلیٔ شب" کے "چراغِ تہِ دامن" کا دلفریب سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ غلیظ سیاہی کا غلبہ اور آسمانی و خاکی روشنیوں کا اتصال دونوں کو یکجا کر کے بڑے حسین انداز میں اجتماعِ ضدین کا جلوہ دکھایا ہے۔ اور کہیں کہیں رخِ تصویر کو مطلا کر کے اس کی سحر آفرینیوں میں خوشگوار اضافہ کر دیا ہے۔ راجپوتوں کی ہمسری میں بعض جاپانی مصوروں نے بھی سنہری رنگوں کا استعمال روا رکھا ہے مگر انھیں آج تک وہ شعور نہ آیا جو ایک راجپوت کا پیدائشی حق ہے۔

موجِ نسیم کی رندانہ شوخی، تختۂ گل کے تلاطمِ رنگین کا بہار آفریں و معصوم منظر، پانی کے جمود کا لطیف نقرئی رنگ، سطحِ آب پر کھلے ہوئے کنول کے شاداب پھول اور آبدوز برگ و بار کا خوشنما نظارہ نشاطِ روح کا سامان مہیا کر دیتا ہے۔ بودھوں سے قریب تر ہونے کے باعث راجپوت صنّاع بقول مسٹر بلیک قدرتی طور پر باریک خطوط سے جذبات کو رونما کرنے کا عادی ہے۔ اجنتہ کی مصوّری اور راجپوتوں کی مصنوعات میں بظاہر بہت بُعد ہے لیکن بباطن اختلافاتِ زمانہ کی قیود کے علاوہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں جذبات کی یکسانیت اور اسلوبِ ارتسام کی ہم رنگی اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔

تنگی و فراخی پیمانہ کا اس باہمی یگانگت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، ہاں اتنا اختلاف ضرور ہے کہ مذہبی عقائد کے مطابق بودھوں اور راجپوتوں کے مرکز عمل میں بھی اہم تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ راجپوتی دور میں "بدھ" کی جگہ سیتا رام، رادھا کرشن اور شکتی (پاروتی) اور شیو نے لے لی ہے۔ بالعموم ہر شبیہ کی پشت پر اس کا ماحصل اور موزوں عنوان مرقوم رہتا ہے۔ مغلوں کے یہاں بھی سرخیاں قائم کرنے اور تذکرہ لکھنے کا رواج عام تھا۔ مگر ان دونوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ مغل خوشنویس کی تحریروں کا نفسِ مضمون سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مغلوں کے ہر کارنامہ کی تکمیل ایک سے زائد صناعوں کی رہینِ منت ہے مصوّر

کا کام صرف تصویر بنانا تھا، جدول کی نقاشی اور تذکرہ لکھنا باکمال خوشنویسوں کے سپرد تھا جو بلا تکلف من مانی کہانی لکھ مارتے تھے۔

راجپوتی صنعت کے بہترین نمونے وشنو کے اوتار کرشن کی عبرت انگیز زندگی کے کسی ایک یا دوسرے پہلو پر مشتمل ہیں۔ اس آسمانی دیوتا کا ترحم وتعلق عوام کے رم خوردہ دلوں کو رام کرنے میں جادو کا اثر رکھتا ہے وہ ان کے مشاغل وتفریحات اور مصائب ومسرتوں میں اس طرح برابر کا شریک رہتا ہے کہ خود ان کی صحیح زندگی کا اہم جزو بن گیا ہے چرند وپرند سے اس کا دلی لگاؤ خصوصاً گلے کا عشق مزا ہین کو اس کا بندۂ بے دام بنا دیتا ہے۔

حیوانات کی تصویریں لینے میں مغل مصور نے بھی اپنا زور قلم دکھایا ہے مگر اس شعبہ میں راجپوت صناع اس سے بیش پیش ہے۔ کیونکہ ساری حیوانی مخلوق حتیٰ کہ درندے بھی پردۂ تصویر میں اس کے دردمند دوست نظر آتے ہیں۔ لیکن مغلوں کے نزدیک جنگلی جانور محض شکار وتفریح کے سامان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں تشکیل جذبات کا قطعی طور پر فقدان ہے جس سے بعض دلکش مناظر میں بھی خشکی عود کر آئی ہے۔ بانروں کے سردار ہنومان اور اس کے وفا شعار ہمراہیوں کی تصویر کی ساخت میں تو راجپوت مصور نے غضب کا کام کیا ہے۔ نیم وحشی مخلوق کا جوش وفاداری اس کے ہر عضو بدن سے مترشح ہے۔

شونرتیہ (शिव नृत्य) یا سندھیا گایتری (संध्या गायत्री) کے مناظر مظاہر کی ہیئت وصورت کی عکاسی میں تصویر کش نے تازگیٔ خیال اس طرح کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے کہ اس کی تخلیق جسد وپیکر کا بیجان مجسمہ نہیں بلکہ ایک زندہ ہستی اور جاندار مخلوق کی دنیا ہے۔ تصویر کے عین وسط میں موت کا دیوتا (شیو) چیتے کی کھال کا جامہ زیب تن کئے صدر نشین ہے۔ کنول کے تخت پر "شکتی" جلوہ فگن ہے اور متحیر ومحجوب آئینہ میں اپنے حسنِ جلوہ کی بہار دیکھ رہی ہے۔ آئینہ برداری کی خدمت نہایت باشعور خدام کے سپرد ہے۔ اس کے جلو میں مطربانِ شیریں ادا نو بہ نو ساز نئے دادِ موسیقی دے رہی ہے۔ بائیں جانب دیوتاؤں کا گروہ بیک زبان اپنے آقا "نٹ راج" کا ثنا خواں ہے۔ دور فاصلہ پر برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں ایک عجیب شان استغنا وخود بینی کے ساتھ سر بلند کئے ہوئے موجود ہیں۔ براق چوٹیوں پر ابر گہربار کے دل بادل اڑتے پھرتے روئی کے گالے کی طرح رقصاں ہیں۔ جہاں آسمانی مخلوق گھبا ہو میں مستغرق ہے۔

متذکرہ تصویر اٹھارھویں صدی کا نظر فریب عمل ہے، اور کانگڑہ قلم کا معرکۃ الآرا شاہکار شمار ہوتی ہے

سارے اعیان ومظاہر خوبصورت ودیدہ زیب رنگوں سے ایسے حسین انداز میں نمایاں ہوئے ہیں، کہ صورت گری کی صنعت کا سارا کمال ختم ہوگیا ہے۔ لیکن دستِ بُردِ زمانہ کے ہاتھوں اس کارنامہ پر کیسر پانی پھر گیا ہے۔ تاہم اس گئی گذری حالت میں سنہری ولاجوردی رنگ اپنا سکّہ جمائے ہوئے ہیں۔

جے پور قلم کے بیشتر کارنامے ہنوز ناتمام ہیں۔ ان کے نامکمل موضوعات کی تشریح کرنا بہت دشوار ہے۔ رنگوں کے اشتراک وآمیزش کے انداز پر سادگی کا غلبہ وتسلّط ہے۔ تصویر کی جدول جدت ونفاست میں خصوصیت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ بالعموم بال سے زیادہ باریک خطوط سے خاکہ کی تعمیر ہوئی ہے۔ معمولی سے معمولی اور چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بڑی چابکدستی کے ساتھ واضح ونمایاں کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تصویر میں جان سی پڑگئی ہے۔

ابتداءً سیاہی سے تصویر کا خاکہ تیار کیا جاتا، پھر اُس پر ہلکی سفیدی پھیر کر نقوش وخطوط کو محو وغم کردیا جاتا، اس کے بعد بھورے رنگ سے خاکہ کو از سرِ نو اُبھارا جاتا تھا تب کہیں مختلف رنگوں کا عمل شروع ہوتا اور اس طرح مطلوبہ شبیہ کی تکمیل ہوتی تھی جے پور اور کانگڑہ قلم کے دستور العمل میں خاص فرق یہ ہے کہ آخر الذکر نے شوخ رنگوں کا استعمال روا رکھا ہے۔ اور برملا اس کی ترویج کی ہے۔ موڈل کی تعمیر رنگوں کا انعکاس اور سطح کو جلا دینے میں تو اس اسکول کا تمام تر حاصلِ عمل ایک عجیب انداز خود ستائی سے ہمدوش ہے۔

"راگ مالا" (राग माला) نامی مرقعوں کی تشکیل وتخلیق کے لئے پہاڑی صنّاع کی رفعت وعظمت فلک بوس ہمالہ کی مضحک ہے۔ موسیقی توبجائے خود ایک وسیع علم اور دلکش فن ہے لیکن اس کے انداز وکمال کی تصویر کشی نے اس کے بے پایاں دلچسپیوں میں مزید اضافہ کردیا ہے۔ یہ نایاب مرقعے اس عالمگیر حقیقت کو ببانگِ دُہل الم نشرح کرتے ہیں کہ تہذیب وتمدن کا ارتقاء فنونِ لطیفہ کی ترقی کا زیر بار احسان ہے دنیز یہ کہ جمیع اصنافِ فنون ایک باہمی رشتۂ اتحاد میں منسلک ہیں "راگ مالا" بیالیس مشہور ترانوں کا مجموعہ ہے۔ راجپوت صنّاع نے ہر راگ کی ایک تصویر بنائی ہے جس کو اس کے تمام اجزاء وعناصر کی تفسیر سمجھنا چاہیئے۔

ایک طرف مطربِ دلنواز پردۂ تصویر میں رہزنِ ہوش بنا بیٹھا ہے۔ دوسری طرف چابکدست مصوّر رنگینئ ترنم سے کمالِ صورت گری کے جلوؤں کو بے نقاب کرنے میں محو ہے۔ راجپوتوں کے بیش بہا مرقعوں میں بعض ایسی تصویریں بھی نظر آجاتی ہیں جو ان کے شاعرانہ وتمثیلی رجحان کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان میں کثیر التعداد مماثل کا ماخذ قدیم ومستند ہندی ادب ہے۔

راجپوت صناع کی بزم رنگیں میں حسن و عشق کی بے پناہ معرکہ آرائیاں مذہب کے پاکیزہ جذبات کی ہلکی نورانی چادر میں ملبوس ہیں۔ اور یہی ایک ایسی خصوصیت ہے جس نے بیک وقت نظر نوازی و بیداریٔ روح کا رنگا رنگ سامان فراہم کر دیا ہے۔

ڈراما

ڈرامے کے وجود سے انسان کی حالت میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا۔ نیک اور پارسا لوگ ایک بُرا ڈراما دیکھنے کے بعد بھی نیک اور پارسا ہی رہتے ہیں۔ (لارڈ بائرن)

ڈراما دیکھنے کے شوقین تین گروہوں میں منقسم ہو سکتے ہیں، پہلا گروہ عورتوں کا ہے جن کو ڈرامے کی خوبیوں یا پلاٹ کی دلآویزی یا نقائص سے کچھ سروکار نہیں ہوتا، وہ اس میں صرف جذبات کی متلاشی رہتی ہیں، انھیں صرف ایسے مناظر پسند آتے ہیں جو اُن کے جذبات کے لئے تازیانہ ہیں۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو ڈراما صرف اس نقطۂ نگاہ سے دیکھنے جاتے ہیں کہ اس میں کوئی ایسا عجیب و غریب کردار نظر آئے جو عمومیت سے الگ ہو۔ تیسرا گروہ نہ جذبات برانگیختہ کرنے والے مناظر کا دلدادہ ہوتا ہے اور نہ عجیب و غریب کردار کا۔ اس کا زاویۂ نگاہ صرف خوبصورت مناظر، نازک اندام ایکٹریس اور تمام کھیل میں ایک مسلسل کشمکشِ زندگی تک محدود ہوتا ہے۔ (دکٹر ہیگو)

اگر ڈرامے کا پلاٹ مذہب سے کچھ تعلق نہیں رکھتا تو پھر اس سے زیادہ بیکار چیز دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتی۔ مذہب کے بغیر اخلاق پر بھی بُرا اثر پڑنے کا خوف ہے (ڈ ٹالسٹائی)

مذہب کی تعلیم اگر ناٹک کے ذریعہ سے دی جائے تو گرجا کی تعلیم سے کہیں بہتر اثر ہوگا (والٹر)

"کامیڈی" دیکھتے وقت ذرا اپنے دل کی حالت کا بھی اندازہ کرتے رہنا چاہیئے کہ کس طرح کھیل کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ ہمارے دل میں مختلف جذبات اور احساسات پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ (افلاطون)

(ہمایوں)

عالمگیر مذاہب اور اُن کے بانی

(از ٹھاکر جے۔ آر۔ رائے صاحب لاہور)

اقلیم مذہب دیار مذہب عالمگیر ہے اور اس کا اثر و اقتدار غیر محدود ہے۔ سارا جہان اس کے زیر نگیں ہے، اس کی ہمہ گیری پر قیود زمانی اور شرائط مکانی عائد کرنا فضول ہے۔ کیونکہ مذہب انسان کی تمام مصروفیتوں پر حکمراں ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ اس کے احاطۂ قدرت سے بالا نہیں ہے۔ یہ ہمارے دل و دماغ پر حاوی ہے، ہمارے تخیلات ارفع اس کے تابع اور جذبات لطیفہ اس کے محکوم ہیں۔ غرض مہد سے لحد تک یہ ہمارے ساتھ رہتا ہے، جب انسان عالم ارواح سے کشور اجسام میں داخل ہوتا ہے تو یہی اس کی پیشوائی کرتا ہے اور جب وہ دنیائے فانی سے مملکت جاودانی کی طرف قدم اٹھاتا ہے تو یہی اُسے رخصت کرتا ہے۔ مذہب تمدن کا مبدا اور معاشرت کا محرک ہے۔ ہر قسم کی تمدنی ترقیاں اسی کے ایما سے عمل میں آتی ہیں۔ ابتدائی زمانہ میں لوازم تہذیب اسی کی تحریک سے معرض وجود میں آئے تھے۔ قصہ کوتاہ مذہب کی ہمہ گیری سے انحراف اور اس کی ہدایت سے روگردانی ناممکن ہے۔

مذہب اور ارباب سائنس معقولیات (Rationism.) کے دلدادہ مذہب کو تمدنی ترقی کے منافی تصور کرتے ہیں۔ نااہل اور تنگ ظرف اس کا مذاق اڑاتے ہیں، تعلیم یافتہ حضرات اس قابل افسوس وہم میں مبتلا ہیں کہ سائنس کے انکشافات اور گوناگوں علمی ترقیوں کے باعث مذہب بیکار اور فضول ثابت ہوتا ہے۔ لیکن زمانۂ حال کے عالی دماغ ارباب سائنس اور بالغ نظر اہل تحقیقات کی نگاہوں میں مذہب کی عظمت و حرمت اب بھی ویسی ہی اعلیٰ ہے جیسا کہ ذیل کے چند بلند پایہ سائنس دانوں کی رائیوں سے بخوبی عیاں ہوتا ہے۔

شہرۂ آفاق ماہر تاریخیات لارڈ ایکٹن (Lord Acton) کا یہ خیال قابل غور ہے "مذہب انسان کے تمام تعلقات اور جذبات میں افضل ترین ہے۔"[1] فرانس کا ممتاز ماہر انسانیات (Anthropology

[1] ملاحظہ ہو "زمانہ" بابت نومبر ۳۰ء صفحہ ۲۷۰ - ۲۷۱۔

رناش (Renasche) جو خدا کی ہستی کا قائل نہ تھا لکھتا ہے "مذہب انسان کی اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا بندھن ہے، اور اس کے پہلو بہ پہلو پرورش پا کر ظاہر ہوتا ہے۔ ہر قسم کے علوم اور ضوابط اخلاق کا محرک اور مبداء بھی ہوتا ہے۔" علوم السنہ کا سب سے مشہور عالم میکس مولر نامی جرمن فلاسفر ہیگل اور فلسفۂ دینیات کے سرگروہ استاد شیلنگ (Schelling) کے خیال بالغ کی حمایت میں یوں لکھتا ہے "مذہب شیرازۂ قومیت کا سب سے بڑا محرک اور اتحاد باہمی کا نہایت مستحکم رشتہ ہے"۔ برطانیہ کے نامی ماہر السنیات پروفیسر ڈی۔ اے میکنزی رقمطراز ہیں "ازمنۂ سلف کے تمام بڑے بڑے فنون کو مذہبی عقائد سے تحریک ابتدائی پہونچی تھی"۔ زمانۂ حال کا سب سے بڑا فلاسفر ہربرٹ اسپنسر لکھتا ہے "تمام علوم و فنون نے مذہب کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی تھی"۔ ہمارے موجودہ مقصد کے واسطے یہی اقتباسات بس ہیں جس سے اہل سائینس اور ارباب فکر کے خیالات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

عالم گیر مذاہب سے کیا مراد ہے؟

اس تمہید کے بعد اب اصل مضمون[1] کی طرف رجوع ہونا واجب ہے۔ عالمگیر مذاہب سے ایسے مذاہب مفہوم ہیں جن کے معتقدات اور اصول اولیہ ایسے جامع و مانع ہیں کہ وہ ہر قوم کے حسب حال اور ہر زمانہ میں جمہور کے ایمان کے لئے موزوں اور ہر ملک کی اخلاقی حالت سنوارنے اور ترقی تمدن کی تحریک ابتدائی کے موجب ہو سکتے ہیں۔ امتداد زمانہ کا ان کے اصول موضوعات اور مسلمات اساسی پر کوئی مضر اثر نہیں پڑتا۔ علمی ترقیوں سے وہ بیکار ثابت نہیں ہوتے، گردش ایام سے وہ فرسودہ اور ناقابل تسلیم نہیں ہو جاتے۔ غرض انقلاب روزگار اور ارتقائے نظام تمدن کے باوجود بھی وہ زندہ جاوید رہتے ہیں۔ شہرۂ آفاق محقق ڈاکٹر کروزیر (Crozier) نے بڑے بڑے اور تاریخی مذاہب کے تین مشترکہ مسلمات[2] لازم قرار دیے ہیں

(۱) خیال آخرت، جس میں سزا و جزا اور جنت و جہنم کا عقیدہ مشمول ہے۔ اسے آپ اپنے پسندیدہ محاورہ میں "مافوق الفطرت منتہائے کمال" (Supernatural Ideal) قرار دیتے ہیں۔

(۲) مخصوص تصور خدا۔ دیوتاؤں کے اعتقاد کا خیال بھی اسی ضمن میں شمار ہوتا ہے۔

(۳) مخصوص ضابطۂ اخلاق۔

ہر ایک مذہب جو عالمگیر اور مقبول عام ہونے کا مدعی ہوتا ہے، ان تینوں تصورات سے بیگانہ نہیں

---

[1] اس خالص علمی بحث میں صرف مسلمات مذہب کی تشریح سے سروکار ہے۔ ورنہ علماء کی تحقیقات کی روشنی سے ہدایت حاصل کی گئی ہے۔

[2] ملاحظہ ہو "ہسٹری آف انٹلکچول ڈیولپمنٹ" History of Intellectual Development

ہو سکتا۔ تاہم ان کے علاوہ اور عقائد اساسی بھی ہوتے ہیں جن کا تذکرہ اپنے موقع پر مناسب ہوگا۔

دنیا کے مقبول مذاہب فی زمانہ تین بڑے بڑے مذاہب ایسے ہیں جن کے بے شمار مقلد دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ روئے زمین کی آبادی کا جزو اعظم انھیں کے پیرووں میں منقسم ہے۔ باعتبار قدامت (۱) بدھ مذہب (۲) عیسائیت اور (۳) اسلام عالمگیر سمجھے جاتے ہیں۔ ہر گروہ اپنے پسندیدہ مذہب کو کامل اور دنیا کی مقبولیت عامہ کیلئے ہر طرح موزوں قرار دیتا ہے۔

مشہور ماہر دینیات پروفیسر ریس ڈیوڈز (Rhys Davids) نے بدھ مذہب[1] پر بحث کرتے ہوئے تمام موجودہ مذاہب کے مقلدوں کے شمار و اعداد بیان کئے تھے جو ۱۸۹۱ء کی مردم شماری سے مستعار تھے، ان کی رو سے بدھ مذہب کے نام لیوا پچاس کروڑ نواسی لاکھ یعنی دنیا کی آبادی کا چالیس فیصدی تھے۔ مسیحی مذہب کے پیرو تینتیس ۳۳ کروڑ، ہندو بیس[2] کروڑ اور اسلام پر چلنے والے پندرہ کروڑ شمار ہوئے تھے۔ اول الذکر منگولی قوموں کا مذہب ہے۔ برہما، سیام، انام، کوچین چائنا، چین، جاپان، کوریہ، منچوریا، منگولیا، تبت کے لوگ بھگوان گوتم کے چیلے ہیں۔ یورپ اور امریکہ (شمالی وجنوبی) آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ کے علاوہ مشرقی، شمالی اور مغربی افریقہ اور نیز ایشیا کے کئی حصوں میں اور جزائر اوشنیا میں مسیحی مذہب مقبول عام ہے۔ اسلام کا زور مغربی ایشیا، ایران، افغانستان، بلوچستان، ایشیائے وسطی اور شمالی افریقہ میں ہے۔ مشرقی افریقہ، جزائر جاوا و سماٹرا، ملایا، اور ملک ہند میں بھی کئی کروڑ مسلمان پائے جاتے ہیں۔ چین کی مسلم آبادی ایک امریکن ماہر نے ایک کروڑ تخمینہ کی ہے ماہروں نے حال میں جو تخمینہ روئے زمین کی مردم شماری کا مرتب کیا ہے اُس سے دو ارب سے اوپر کل آبادی ظاہر ہوتی ہے اور اس کا ⅓ عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ بعبارت دیگر باعتبار مردم شماری مسیحی مذہب کے مقلد دیگر مذاہب کے حامیوں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان سے دوسرے درجہ پر بدھ مت کے پیرو اور مسلمان تیسرے نمبر پر گنے جاتے ہیں، ہندوؤں کا شمار چوتھے درجہ پر ہے۔ اس مختصر ابتدائی بحث سے ظاہر ہے کہ کیا باعتبار مردم شماری اور کیا بلحاظ جغرافیائی مساحت بدھ مت، مسیحی مذہب اور اسلام مختلف ملکوں میں مروج اور مختلف قوموں میں مقبول ہے، اور دنیا کی آبادی کا بہت بڑا حصہ ان تینوں مذہبوں کے مقلدوں میں بٹا ہوا ہے۔

مذہب سے بانی مذہب کا تعلق ڈاکٹر کروزیر کا بیان ہے کہ ہر مذہب کسی نہ کسی بانی کا محتاج[3] ہوتا ہے۔ پرنسپل فیربرن (Fairbairn) جو فلسفہ مذہب اور الٰہیات کے نہایت سربرآوردہ عالم تھے بیان کرتے ہیں کہ بانی کا اس کے مذہب سے نہایت گہرا تعلق ہوتا ہے، بلکہ یوں سمجھنا بجا ہے کہ مسلمات مذہب بانی کی ذات کے دست نگر ہوتے اور اس سے گہرا رابطہ[4] رکھتے ہیں۔ تاریخ مذاہب لسبتی سے اس حقیقت کی بخاطر خواہ تصدیق ہوتی ہے۔ کوئی مذہب

---

[1] ملاحظہ ہو "بدھ ازم" صفحہ ۔۔۔ مطبوعہ ۱۸۹۱ء [2] ملاحظہ ہو "ہسٹری آف انٹلکچول ڈیویلپمنٹ" جلد اول صفحہ ۱۹۳

[3] ملاحظہ ہو "سٹی آف گاڈ" مطبوعہ ۱۹۰۳ء مصنفہ پرنسپل اے ایم۔ فیربرن

ایسا نہیں ہے جس کا کوئی بانی نہ ہو۔ ہر ایک مذہب کے فروعات میں جو مصلحان دین کی مساعی حسنہ سے معرض وجود میں آتے ہیں۔ بدھ مذہب بھگوان بدھ کی ذات والا صفات سے، عیسائیت پربھو عیسیٰ مسیح کی ہستی یگانہ روزگار سے اور اسلام حضرت محمد کی بلند پایہ شخصیت سے وابستہ ہے۔ اگر ملک ہند کی تاریخ دینیات پر نگاہ ڈالی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ دیو سماج پنڈت اگنہوتری، دیو گرو بھگوان کے طفیل۔ آریہ سماج سوامی دیانند سرستی۔ برہم سماج راجہ رام موہن رائے، رادھا سوامی مت رائے بہادر لالہ سالگ رام کے وسیلہ سے، اور مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے دعوئے مسیحیت سے احمدی فرقہ معرض ہستی میں آیا ہے۔ ایران میں بہار اللہ کی کوشش سے بابی مذہب (Babism.) کی بنیاد پڑی۔ غرض شخصیت انسانی اساسِ مذہب کی مصدر ہے، اور اس کا اظہار خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ فقط انسان کی ذات اور افعال ہی میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر مذہب کسی نہ کسی برگزیدہ ہستی سے وابستہ ہوتا ہے۔ تینوں عالمگیر مذاہب تین بے نظیر ہستیوں سے منسلک ہیں اس لئے ان کے سوانحی حالات اور تعلیمات مسلمہ پر اجمالی بحث کرنا ضروری ہے۔

(۱) بھگوان گوتم بدھ اور ان کی تعلیمات

سرزمین ہند اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے سارے جہان میں بے مثال ہے، اور باتوں کو جانے دیجئے، یہ قدیم الایام سے گہوارہ تمدن و مذہب ہے۔ اگر پروفیسر ابناش چندر داس اور ان کے ہمخیال ارباب تحقیق و تجسس کی انوکھی خیال آرائیاں صحیح تسلیم کر لی جائیں تو یہ ملک ویدک دھرم، ہندو تمدن اور سنسکرت علوم کا مولد ہے، مذہب[1] فلسفہ، فن شاعری و ادبیات کی ولادت گاہ بھی یہی بے نظیر خطہ ہے۔ زمانۂ قدیم بعید کے ہندو آریہ مذہب کے موجد اور لوازم تمدن کے مخترع تھے، اور جیسا کہ شروع میں مذکور ہوا ہے۔ مذہب ہر قسم کی ترقیوں کا محرک اولیٰ ہوتا ہے۔ چونکہ ابتدائے تاریخ سے ملک ہند مذہب کا مولد شمار ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی یہ خصوصیت کلیتہً لاثانی ہے۔

مذہب اور کشتری قوم

از روئے روایت کشتری قوم ملک گیری اور ملک داری کے واسطے مشہور چلی آتی ہے۔ لیکن اس امر کی طرف بہت کم خیال رجوع ہوتا ہے کہ برہم ودیا (علم الٰہی) کے بانی بھی کشتری بہادر ہیں، اپنشد اس پر شاہد ہیں۔ بھاگوت مت کے بانی سری کرشن تھے۔ اگر ان کی الوہیت سے

---

[1] پروفیسر داس نے نئے نظریات اور تحقیقات پیش ... "رگ ویدک انڈیا" مطبوعہ ۱۹۲۱ء میں پیش کئے تھے جن سے علمی دنیا میں تہلکہ برپا ہو گیا۔ مسٹر گوپی ناتھ کمیر نے ۱۹۳۵ء میں اپنے نظریات کو ... پہنچا دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ سپت سندھو یعنی سات دریاؤں کی سرزمین آریہ قوم کا گہوارہ ہے جہاں سے آریہ آباد کار ایشیائے وسطی، ایران، مغربی ایشیا، مصر اور یونان میں آباد ہوئے تھے۔ [2] ملاحظہ ہو مسٹر نگیندر ناتھ باسو کا صدارتی ایڈریس جو اورینٹل کانفرنس منعقدہ پٹنہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں دیا گیا تھا۔ آدھا ایڈریس اس مسئلہ کی بحث سے متعلق ہے۔

چشم پوشی کی جائے تو وہ پرانے زمانہ کے ایک نہایت عالی حوصلہ فرماں روا باریک بیں مدبر اور پاک طینت مصلح دین ثابت ہوتے ہیں۔ جین مت کے بانی وردھ ماں مہابیر ایک راجہ کے لڑکے تھے جن کا اصلی وطن موجودہ قسمت بھاگل پور میں تھا۔ اگر اس دلآویز خصوصیت کو ملحوظ رکھا جائے، تو زمانہ سلف کا نہایت مقبول عام مذہب بدھ مت بھی ایک کشتری کی روحانی کرامات اور معنوی عظمت کا قابل تحسین کارنامہ ہے۔ اس دور افتادہ زمانہ کے کشتری جو میدان کارزار سے منہ چھپا کر گیان دھیان میں مگن رہتے تھے۔ راج رشی (رئیس مزاج حکیم) کہلاتے تھے، اسی وجہ سے انھوں نے علوم معنوی کو بڑی ترقی دی تھی۔

بدھ مذہب کے احسانات ایشیا پر

ملک ہند قدیم کو اپنے سپوتوں پر بےحد ناز ہے، ویدک رشی، اپنشد کار، فلسفہ کے بانی ویاکرن اور عروض کے استاد، دھرم شاستر کے مصنف، نیتی شاستر کے مخترع، نظام تمدن کے موجد وغیرہ اسی قبیل میں گنے جاتے ہیں۔ ملک گیری میں ساگر اور چندر گپت (موریہ) اعظم، ملکداری میں اشوک بےنظیر ہیں۔ اسی راجہ نے سب سے پہلے جنگ و جدل موقوف کر کے رام راج یعنی راستی اور عدل و انصاف اور ترس و رحم کی سلطنت قائم کی تھی، مگر اسے سب سے زیادہ فخر شاکی منی گوتم بدھ پر ہے۔ جن کی ایثار نفسی، مساعی جمیلہ اور پرواز تصور سے وہ مذہب معرض وجود میں آیا جس کی تحریک سے بیسوں قوموں کی کایا پلٹ گئی۔ تمدن اور اس کے لوازم سے بے بہرہ ملکوں کو شائستگی اور روشنی نصیب ہوئی، ناہموار ناتراشیدہ اور پرلے درجہ کے جہلا کی اخلاقی حالت سدھر گئی، اسی مذہب کے ایما سے کئی علوم و فنون میں بہت ترقی ہوئی۔ یہ وہ بلند پایہ مذہب ہے جس کی برکت سے اہل ایشیا نے ایسے زمانہ میں تہذیب میں معتدبہ اور قابل رشک ترقی حاصل کی تھی، جیسا کہ سرمایہ تمدن جدید کے مالکوں کے آبا و اجداد ننگے دھڑنگے جنگلوں میں پھرتے اور مصیبت کے دن بڑی مشکلوں سے کاٹتے تھے۔ اس پرشوکت مذہب کے بانی بھگوان گوتم بدھ تھے جن کے سوانحی حالات کا اجمالی ذکر لطف سے خالی نہ ہوگا۔

شاکی منی گوتم کی ولادت

نیپال کی ترائی اور موجودہ ضلع بستی کے شمال میں پرانے زمانہ میں شاکیہ کشتری قوم کی ایک ریاست تھی جس کی راجدھانی شہر کپل وستو تھا یہاں راجہ شدھودن حکمراں تھا جس کی چہیتی رانی مایا دیوی کے بطن سے راجکمار سدھارتھ پیدا ہوئے۔ آپ کی سن ولادت کی نسبت ارباب تحقیق میں سخت اختلاف ہے۔ پروفیسر اے۔ ایس گیڈن[1] (Geden) نے ۵۶۰ق م آرتھر لیلی (Lillie)

---

[1] ملاحظہ ہو "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" جلد دوم ص۸۸
[2] ملاحظہ ہو "بدھ اینڈ بدھ ازم" ص۲۴

ششہ ق م۔ پروفیسر ایس ڈیوڈز نے ۵۰۰ ق م اور پروفیسر مارکس ڈاڈز (Dods) نے سنہ
وی سے چھ سو سال پیشتر تسلیم کیا ہے۔ آخری تحقیقات سے ۱۸۹۵ء میں وہ سنگلاخ ستون مع کتبہ برآمد
ہوا جس سے آپ کی ولادت گاہ لمبنی کا شاداب جنگل ثابت ہوتا ہے۔ جو دارالحکومت سے نو میل دور
یہ یادگار مہاراجہ اشوک نے نصب کرائی تھی۔ مہاپرشوں کی پیدائش سے عجیب و غریب باتوں کا ظہور
تہ کرنا خوش اعتقادی کا لطف انگیز مشغلہ ہے۔ بدھ مت ایسے مقبول جہاں مذہب کا بانی ظہور پذیر
اور اس کے بھگت اس سے اچنبھے منسوب نہ کریں یہ ممکن نہ تھا۔ چنانچہ پالی اور سنسکرت کی کتابوں میں
ں افسانے مندرج ہیں۔ مثلاً جب آپ عالم محسوسات میں ظہور پذیر ہوئے تو کروڑہا دیوتا آپ کے ہمرکاب
اس وقت ایسا نور نمودار ہوا کہ جس سے عالم کے تمام گوشے روشن ہو گئے۔ کوئی وجود ذی روح ایسا
جو اس کے جلالِ تاباں سے مرعوب نہ ہوا ہو۔ کروڑوں دیوتا آپ کے سنگھاسن کو خوشی خوشی کندھوں
اٹھا کر لائے، لاکھوں اپسرائیں (حسینانِ فلک) آپ کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں گاتی اور ناچتی
تی تھیں۔ سفید ہاتھیوں کے پانچ سو بچوں نے کپل وستو میں جا کر راجہ شدھودن کے قدم چومے
ؤں کی دس ہزار نازک اندام لڑکیاں چنور لیکر آسمان پر نمودار ہوئیں، ندی نالے بہنے اور چاند
ے چلنے سے رک گئے۔ ہزارہا قسم کی نورانی شعاعیں چاروں طرف ہویدا ہو رہی تھیں۔ اسی قسم کے
عجائبات مذکور ہیں۔ مگر ہمارا مقصد گوتم بدھ کی شخصیت اور آپ کے انوکھے مت پر محققانہ بحث کرنا ہے
لئے یہاں پر آپ کی فوق البشریت سے دانستہ چشم پوشی کی جاتی ہے۔ آپ ایسے زمانہ میں تولد ہوئے
آپ کے عالی تبار والدین کا سن ڈھل چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ جو بچہ سیکڑوں منتوں اور ہزاروں مرادوں سے پیدا
و ذی شان ماں باپ نے اس کی خوشی میں کتنے خزانے نہ لٹائے ہوں گے۔ چنانچہ سدھارتھ کی
ت کی مبارک تقریب پر نہ صرف شاہی محلوں ہی میں شادیانے بجے بلکہ راجدھانی اور راج کے ہر حصہ
بحد مسرت ظاہر کی گئی۔ آپ کی ولادت سے پہلے دربار شاہی کے جوتشیوں نے اس بات کی پیشین گوئی
" یا تو راجکمار چکرورتی راجہ ہوگا یا گرہست تیاگ کر سنیاس دھارن کرے گا۔ اور کامل نروان حاصل
بنی آدم کو راہ نجات دکھائے گا۔" راجہ شدھودن کو یہ بات خوب یاد تھی۔ اس وجہ سے شہزادے کی
ت ایسے شاہانہ طریقہ سے شروع کی کہ وہ سنیاس لینے کے بجائے راج پاٹ سنبھالے، اور سلطنت
وستو کو چار چاند لگائے۔ اس مقصد سے ہر قسم کے سامان لہو و لعب اور راحت مہیا کر لئے، تا کہ

یکھیئے "بدھ ازم" ص ۲۵ ۔ ۵۴ ملاحظہ کیجئے "محمد، بدھ، مسیح" ص ۱۳۲
ماخوذ از "ریلی جنز آف انڈیا کو یٹی" (Religions of ancient India) ، صفحات ۲۳، ۲۴ و ۱۲۵
نہ اے۔ ریناں۔

راجکمار سدھارتھ شروع ہی سے شاہانہ طریقۂ زیست کا خوگر ہو جائے، اور سنیاس دھارن کرنے کا نام نہ لے، اور ساتھ ہی یہ بھی حکم دیدیا کہ لنگڑے لولے، اپاہج، بڈھے، دکھیا، بیمار آدمی، سادھو مہاتما اور مردے اور دکھ مصیبت میں مبتلا آدمی راجکمار کے پاس ہرگز نہ آنے پائیں۔ بلکہ اس کی نظروں سے کوسوں دور رہیں۔ ہم یہ ہرگز نہیں چاہتے کہ وہ بدھ بنے بلکہ ہماری یہ تمنا ہے کہ وہ چاردانگ عالم پر حکومت کرے اور بڑے بڑے تاجدار اس کے ہمرکاب ہوں"۔ چنانچہ جدھر سے شہزادے کا گزر ہوتا تھا اس کے آس پاس کوس کوس بھر سنتری تعینات کیئے جاتے تاکہ بڈھے بیمار وغیرہ اس کے سامنے نہ آنے پائیں۔ ہر فن اور ہر علم کے اتالیق مقرر کیئے گئے تاکہ راجکمار کو جنگی فنون سکھائیں علاوہ ازیں اور علوم کی تعلیم بھی ہونے لگی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ذہین راجکمار نے تمام فنون سپاہگری میں کمال حاصل کرلیا۔ پرانے اور آزمودہ کار ماہروں پر سبقت لے گیا جس پر استادوں کو بڑی مسرت حیرت ہوئی اور تاجپوش والدین کے دل باغ باغ ہو گئے۔

مشاغل دنیا میں پھنسانے کی سعی

اوائل شباب میں سدھارتھ کا سب سے بڑا مشغلہ سیر و شکار تھا، جب محلوں میں ہوتا تو خوبصورت لڑکیاں اپنی دلفریب خوش الحانی اور عجیب و غریب ناچ سے رجھایا کرتی تھیں۔ عالی وقار والد کا جو منشا اپنے بیٹے کو دنیاوی کھیل تماشوں سے مفتوں کرنے کا تھا اس کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا، اسی کے ساتھ ہی راجکمار کی شادی راجہ کولیہ کی بیٹی جسبودھرا سے ہو گئی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ شہزادہ حظ نفسانی کا غلام بنکر دین دھرم کی باتوں سے کلیتہً غافل ہو جائے۔ اس وجہ سے اس کے خاصہ کا محل راجہ اندر کا اکھاڑا بنا رہتا تھا۔ جہاں اعلیٰ درجہ کی حسین لڑکیوں کے علاوہ ہر قسم کے سامان عیش و طرب مہیا تھے۔ غرض عالم شباب اس قسم کے دل گرویدہ کرنے والے مشاغل کا سلسلہ تھا وہ اپنے کو ہمیشہ بہشت میں تصور کرتا تھا۔

تلاش حق کی آرزو

اب ہمارے سامنے ایک نہایت دلچسپ سوال آتا ہے جس کا نہ صرف مہاتما گوتم بدھ ہی کی زندگی سے گہرا تعلق ہے بلکہ تاریخ مذاہب اور نیز تاریخ جہاں میں بھی بہت اہمیت رکھتا ہے، اور وہ سوال یہ ہے کہ "نیا مذہب قائم کرنے کا گوتم کو کیسے خیال پیدا ہوا" اس میں کوئی کلام نہیں کہ راجہ شدھودن نے اپنے لخت جگر سدھارتھ کو دنیاوی لہو و لعب کا گرویدہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ پرستان کی عالم فریب پریاں اس کا دل رجھانے کی نئی نئی چالیں

---

[1] دیکھئے "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" جلد دوم صفحہ ۸۸۲ پہلا کالم۔

[2] بعض ماہر چینی اور تبتی کتابوں کے بیانات پر انحصار کرکے یہ کہتے ہیں کہ جسبودھرا کے علاوہ گوپیا اور اتپل راتی بھی رانیاں تھیں۔

چلتی تھیں۔ لیکن راجکمار سدھارتھ بالطبع پرواز فکر، نزاکت حس، فطانت افضل اور اثر پذیر طبیعت سے غیر معمولی طور پر بہرہ ور واقع ہوئے تھے۔ نفسانی خوشیوں سے آپ کو رفتہ رفتہ نفرت ہونے لگی آپ گھنٹوں خلوت میں بیٹھے مسائل زیست کی غور و فکر میں منہمک رہتے تھے۔ ۲۹ سال کی عمر میں پہلا لڑکا پیدا ہوا جس کا نام راہلہ رکھا۔ ان ہی دنوں آپ نے کئی بار متواتر ایک خواب دیکھا۔ جس میں ایک دیوتا پہلے ایک بڈھے کی شکل میں دکھائی دیا، پھر ایک مریل مریض کے مانند، پھر مردے کی لاش میں رونما ہوا، اخیر میں پرانتی مہاتاجی کے بھیس میں نظر آیا۔ یہ خواب اس کے باوفا خادم چنّہ نے بھی دیکھا اور الہام کے ذریعہ سے اس کی تعبیر کی۔ لیکن عام طور پر پرانی بودھ کتابوں میں جن میں للتہ۔ وستارہبت مشہور ہیں یہ مذکور ہے کہ ایک دن راجکمار سدھارتھ رتھ میں سوار ہوا خوری کو جارہے تھے کہ سامنے سے ایک بڈھا لڑکھڑاتا ہوا آیا جس کی حالت بہت دردناک تھی۔ آپ نے رتھ بان سے پوچھا "کیا یہی آدمی ایسا ہے یا اس کے بھائی بند بھی ایسے ہی ہیں"۔ چنّہ بولا "حضور! دکھ بیماری اور محنت و مشقت سے اس آدمی کی حالت خستہ اور درماندہ ہوگئی ہے، ہر فرد بشر کی آخر کار یہی حالت ہوجاتی ہے"۔ سدھارتھ نے کہا "افسوس! انسان کیسا ناعاقبت اندیش ہے کہ جوانی کے نشہ میں بڑھاپے کی مصیبت سے بے خبر رہتا ہے"۔

دوسرے موقع پر سڑک کے کنارے ایک بیمار کو کراہتے اور بے یار و مددگار پایا۔ پھر ایک اور موقع پر ایک مردے کی ارتھی دیکھی جسے لوگ شمشان گھاٹ کو لئے جارہے تھے، اس کی بیوی اور بھائی بند اس کے پیچھے روتے پیٹتے چلے جاتے تھے۔ ان المناک مشاہدات سے اثر پذیر ہوکر آپ نے فرمایا، جوانی کیا ہے جب بڑھاپا ہڑپ کرلیتا ہے! صحت و توانائی کیسی بے ثبات ہے جسے دکھ بیماری برباد کردیتی ہے! زندگانی کا کیا بھروسہ ہے جو ہر وقت اجل کا نوالہ بنی رہتی ہے! کاش بڑھاپا، بیماری اور قضا نہ ہوتی! چنّہ واپس لوٹ چلو۔ اب میں اپنی باقی ماندہ زندگی ان آفتوں سے مخلصی حاصل کرنے کے لئے وقف کردونگا"۔ اس سے ظاہر ہے کہ صاحب فکر گوتم نے انسانی زندگی کی مصیبتوں سے متاثر ہوکر یہ ٹھان لی کہ ان سے رہائی حاصل کرنے کی پوری کوشش کرنا چاہیئے۔

ترک دنیا چنانچہ دکھ سکھ کے مسئلہ کے سلجھاؤ کا پختہ ارادہ کرکے سدھارتھ نے گرہست آشرم تیاگ کر بن باس کا مصمم ارادہ کرلیا۔ آدھی رات کے وقت جب پاک دامنی و وفاداری کی جیتی جاگتی مورت جسودھرا اپنے ننھے بچے کو سینے سے لگائے خواب شیریں میں محو تھی آپ چپکے سے محل سرا سے

سلہ ملاحظہ ہو "روسن کلک ہسٹری آف بدھ ازم" صفحہ ۱۵۶-۱۵۹ مصنفہ بیل بحوالہ "محمد، بدھ، مسیح" صفحہ ۱۲۴-۱۲۵

نکل کھڑے ہوئے، جتنہ ہمراہ تھا، اُسے بھی کچھ دور جاکر واپس کر دیا۔ اور خود راج گڑھ کی طرف چلدیئے
جو اُس زمانہ میں مگدھ کی شاندار سلطنت کا پایہ تخت اور پر فضا پہاڑوں کے مابین واقع تھا۔ اس
کے قرب و جوار میں بہت سی گپھائیں تھیں، جن میں بیسیوں جوگی اور سنیاسی رہتے تھے، وہاں پر الآر
نامی ایک براہمن مہاتما تھا، جسے آپ نے اپنا گرو بنا کر علم الٰہی کی تحصیل شروع کر دی، مگر تھوڑے ہی
عرصہ بعد آپ کو یہ محسوس ہو گیا کہ میرا گوہر مراد یہاں نہیں ہے۔ چنانچہ آپ اس کے سامنے یوں
حجت کرنے لگے کہ "گو آپ کے مارگ پر چلنے سے انسان سورگ میں جا سکتا ہے مگر اس سے آخری
مکتی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کچھ عرصہ تک سورگ میں رہ کر آپ پھر جنم لیں گے اور نرک میں جائیں گے کیونکہ
سورگ میں پہونچنے کی تمنا سے جنم مرن کا سلسلہ بنا رہتا ہے۔ دکھ سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ سورگ کی راحت
کی ہوس سے عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے، اور آپ یہ نہیں سوچ سکتے کہ جسم خواہ کیسا ہی پاک کیوں نہ ہو
مگر وہ تغیر پذیر اور فنا کا سزاوار رہتا ہے۔ اگر بھوکوں مرنے سے مکتی پراپت ہو سکتی ہے تو جانور انسان
سے زیادہ مکتی کے مستحق ہیں۔ اگر جانوروں کی بھینٹ اور اپدیش سے بھلا ہو سکتا ہے، تو آپ کا دھرم
کس کام کا؟ اگر جانوروں کے ذبح کرنے سے دیوتا خوش ہو سکتے ہیں تو اپنے بچے اس کی نذر کیوں
نہیں کئے جاتے، تاکہ اس کی کامل خوشنودی حاصل ہو۔" گرو نے یہ جواب دیا کہ پرانے زمانہ سے
رشی منی اسی مارگ پر چلنے کے عادی ہیں، اور تپسیا سے مکتی حاصل کرتے ہیں، بعد ازاں آپ ایک
دوسرے گرو ادرکہ نامی کے پاس جاکر درشن (فلسفہ) اور شاستر مطالعہ کرنے لگے اور جوگیوں سنیاسیوں
سے بات چیت کرتے رہے۔ اسی طرح پر مسلمات اور عقائد اور نیز فلسفہ کے اصول اولیہ پر تو عبور حاصل
ہو گیا مگر جس چیز کی تلاش تھی وہ ہاتھ نہ آئی اور راحتِ قلبی نصیب نہ ہوئی۔ آپ کا مقولہ تھا کہ میں
اس چیز کا متلاشی ہوں جو فنا سے بیگانہ اور دوام سے آراستہ ہے۔" آپ کے سامنے موجودات کے
تبدلات اور کائنات کے استحالہ کا مسئلہ تھا، جاندار پیدا ہوتے اور نمو حاصل کر سکتے ہیں پھر نیست و نابود ہو جاتے
ہیں، انسان جنم لیتا، پلتا، بڑھتا اور جوان ہوتا ہے، پھر بڈھا ہو کر مر جاتا ہے، آواگون کے اس مسلسل چکر
سے انسان کامل رستگاری کس طرح حاصل کر سکتا ہے؟ اس سوال کے حل میں آپ کا دل و دماغ پورے
طور پر منہمک تھا، رات دن اسی میں غلطاں و پیچاں پھرتے تھے، اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اسی کا انہماک
اور استغراق رہتا تھا۔ جب سنیاسیوں اور جوگیوں کی صحبت میں اس مسئلہ کو حل کرنے میں کامیابی نہیں
ہوئی تو بطور خود ہی اسے سلجھانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔

---

۱ ملاحظہ ہو "رومنٹک ہسٹری آف بدھ ازم" صفحہ ۵۵-۱۵۹ مصنفہ بیل، نیز "بدھ - مسیح" صفحہ ۱۲۳-۱۲۵

مراقبہ اور نروان پراپتی

بہرحال آپ پانچ چیلوں کو ساتھ لے کر اردیلہ کے جنگل میں جا رہے جہاں اب بدھ گیا کا مشہور مندر ہے۔ وہاں پر پیل کے بڑے بڑے گھن دار درخت تھے جن کے نیچے تپسیا اور گیان دھیان کا بڑا آنند آتا تھا۔ آپ چھ برس تک وہاں رہے اور انتہا درجہ کی نفس کشی اور تپسیا سے کام لیا جس کا چرچا دور و نزدیک ہوا اور آپ بہت بڑے مُنی (عارف) شمار ہونے لگے۔ ایک دفعہ سخت ریاضت اور فاقہ کشی کی حالت میں ایسا ضعف غالب آگیا کہ سکتہ طاری ہوگیا اور چیلوں نے آپ کو مردہ تصور کرلیا۔ کچھ دیر بعد از خود ہوش میں آگئے مگر درد معنوی اور سوز عقلی پہلے سے بھی کہیں بڑھ گیا۔ رات دن یہ خیال بے چین کر رہا تھا کہ چھ سال کی نفس کشی اور تپسیا اکارت گئی اور گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ اس وجہ سے آپ نے آخری کوشش کے لئے کمر ہمت چست کرلی اور اسی جستجو میں مٹ جانے کے قصد سے پیپل کے پیڑ کے نیچے سمادھی لگالی۔ سات ہفتے تک ایک ہی جگہ بیٹھے رہے، اس موقع پر سجاتا نام کی ایک عورت آپ کی کھیر سے سیوا کرتی رہی۔ آخر کار آپ منزل مقصود پر جا پہونچے، نروان حاصل ہوگئی۔ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب آخری رات کمال نصیب ہوا تو پہلے پہر اپنے تمام گذشتہ جنموں کا علم حاصل ہوا، دوسرے پہر میں ہستی کی گوناگوں حالتوں کا، تیسرے پہر سلسلہ ہائے علل و اسباب کا، اور طلوع آفتاب کے قریب موجودات کا پورا پورا علم حاصل ہوگیا۔[1] اس سے پیشتر آپ محض بودھی ست تھے، لیکن نروان حاصل کرنے کے بعد بدھ ہوگئے وہ زبردست معمہ حل ہوگیا جس کے لئے وہ اتنی مدت سے سرگردان پھرتے تھے، گوہر مراد ہاتھ آگیا، جس کی خاطر آپ نے راج پاٹ چھوڑا تھا۔ اُسی دن سے آپ مہاتما بدھ یعنی باطن منور کہلاتے ہیں۔ نہ صرف آپ کی معقول زندگی ہی کا یہ سب سے بڑا سانحہ شمار ہوتا ہے بلکہ بدھ مذہب کی تاریخ کا مبدا اور مرجع یہی انقلاب خیز واقعہ ہے گوتم کا باطن روشن ہوتے ہی کایا پلٹ گئی۔ آپ کی طبیعت میں عجیب و غریب قسم کا روحانی جوش بھر گیا۔ اعتماد علی النفس نے آپ کے دل و دماغ پر پورا قابو پالیا۔ آپ کے جی میں یہ سماگئی کہ جو بارگ میں نے اتنی جاں فشانی اور سینہ کاوی سے دریافت کیا ہے، اس کا مژدہ اوروں کو بھی دینا چاہیے

نروان کا پرچار اور بدھ مت کی اشاعت

نروان کا پیام مبارک دینے اور اپنے وضع کردہ مذہب کی تلقین و تبلیغ کے مقصد سے اس شاندار پیپل کو جس کے نیچے آپ کو نور باطن حاصل ہوا تھا خیرباد کہکر بنارس کا رخ کیا، جو اُس زمانہ میں حال کے مانند شمالی ہند کا سب سے مقدس مقام اور علوم و فنون کا منبع سمجھا جاتا تھا۔ آپ سارناتھ میں وارد ہوئے جو اس وقت مرگ دایہ کہلاتا تھا وہاں آپنے

[1] ملاحظہ ہو "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" جلد دوم صفحہ ۸۲ دوسرا کالم۔

پرانے چیلوں کو پایا۔ جو آپ کو اُرویلہ کے جنگل میں تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ آپ نے وہاں پہلے پہل اپنے مت کا پرچار شروع کیا۔ بودھ پستکوں میں بہت سی بعید از قیاس باتیں لکھی ہیں، مثلاً "آپ کا ویاکھیان (وعظ) سننے کے لئے سب دیوتا آسمان چھوڑ کر نیچے اتر آئے۔ ساری کائنات خوشی سے اچھل پڑی، پہاڑ سرنگوں ہوگئے۔ حاضرین نے اپنی اپنی زبان میں اُپدیش سنا، وغیرہ۔" آپ نے سامعین کو مدھ مارگ (میانہ روی) پر چلنے کی تلقین کی جس سے یہ مراد ہے کہ ایک طرف تو سنیاسیوں اور جوگیوں کی طرح تپسیا اور نفس کشی سے اجتناب کیا جائے، دوسری طرف دنیاوی لہو ولعب اور مشاغل نفسی سے احتراز رکھے۔ اس طریقہ سے مستقل روحانی استفادہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ آپ کی وضع سے رعب اور صورت سے جلال ٹپکتا تھا۔ آپ کی وجاہت ذاتی، اوضاع واطوار اور بات چیت دل کو موہنے والی تھی۔ زبان میں خاص کشش تھی، گفتگو عالمانہ ہوتی تھی، انداز بیان دلفریب اور زود الاثر تھا۔ اصول مذہب پُرتمکین اور عام فہم تھے، اس وجہ سے سننے والے مفتون ہو کر جھٹ پٹ آپ کے مرید ہو گئے۔

سب سے پہلے آپ کے پرانے چیلوں نے دھرم چکر پرورتن قبول کیا پھر اوروں نے آمادگی ظاہر کی، اس طرح تھوڑے ہی دنوں میں بہت آدمی مہاتما گوتم بدھ پر ایمان لائے، نتیجہ یہ ہوا کہ سارناتھ میں تین ماہ مقیم رہنے کے بعد آپ نے ساٹھ چیلے اپنے مذہب کی اشاعت کے واسطے چاروں طرف روانہ کر دئیے۔ بعد میں آپ خود چند خاص چیلوں سمیت راج گریہ گئے۔ آپ کا اُپدیش سن کر مہاراجہ بمب سار ایمان لائے۔ آپ کا قیام شہر سے تھوڑی دور بانسوں کے شاداب باغ میں تھا۔ شروع میں تو آپ کا انوکھا مذہب بہت مقبول ہوا لیکن جلد ہی عوام نے مخالفت شروع کر دی کیونکہ لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیل گئی کہ بدھ مت قبول کرنا ترک دنیا کے مترادف ہے۔ یہ کب ممکن تھا کہ گوتم کے انوکھے مت اور شہرت کا علم عالی نژاد والدین کو نہ ہوتا! ان کے حسب منشا آپ کپل وستو گئے اور سواد شہر میں ایک باغ میں جا ٹھہرے۔ راجہ، رانیاں اور دیگر عزیز اور ارکان دولت نے وہاں جا کر درشن کئے مگر جسودھرا نہیں آئی اس لئے آپ اس سے شاہی محلوں میں جا کر ملے۔ کہا جاتا ہے کہ جب سے آپ اسے سوتی چھوڑ کر بن باس کو چلے گئے تھے وہ زمین پر سوتی اور ایک ہی وقت کھانا کھاتی تھی اور اُن تمام چیزوں کو اپنے لئے حرام سمجھتی تھی جو مہاتما گوتم نے ترک کر دی تھیں۔ جسودھرا اور راہلہ اور ننہال کے کئی نوجوان آپ کے معتقد ہو گئے۔ ان میں آنند جو مرتے دم تک آپ کا سچا معتقد اور ہمدم رہا۔ دیودت جس کا اعتقاد محض دکھاوے کا تھا اور آن رُدھ مشہور ہیں جس نے بعد میں بدھ مت

[1] ملاحظہ ہو "بدھ ازم" صفحہ ۲۹

مابعدالطبیعی فلسفہ کی مہارت کے واسطے بڑی ناموری حاصل کی۔ بعدہٗ آپ شراوستی میں گئے جس کے کھنڈرات اب سہت مہت ضلع گونڈہ میں پائے جاتے ہیں۔ ویشالی میں بھی وارد ہوئے جو بہار اور صوبہ متحدہ کی سرحد پر واقع تھا۔ شاکیہ اور کولیہ قوموں کے درمیان سرحدی دریا کے پانی کی بابت جب تنازعہ ہوا تو پھر اپنے مولد میں گئے اور جھگڑا طے کیا۔ جب سن رسیدہ راجہ شدھودن قریب المرگ تھے تو آپ تیسری بار کپل وستو گئے، جب ستانوے سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا تو آپ کی رانیوں کو ساتھ لیکر چلے آئے اور یہ سنگھ میں شامل ہوگئیں۔ اس کے بعد آپ کوشامبی میں گئے جس کے کھنڈر موجودہ الہ آباد سے نو میل کے فاصلہ پر پائے جاتے ہیں۔ یہ پرانے زمانہ کی نہایت بڑی تجارت گاہ اور مغرب، شمال، مشرق اور جنوب کی شاہراہوں کا سنگم تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب شراوستی کا دولتمند سیٹھ آپ کا معتقد ہوگیا تو اس نے اپنے راجہ کے بیٹے سے ایک مرغزار خرید کیا، تاکہ اس پر اشرفیاں بچھا کر اپنے گرو کی نذر کرے وہاں پر بدھ بھکشوؤں اور راہبوں کے واسطے ایک بہت بڑا مٹھ بنایا گیا۔ از روئے روایت مہاتما بدھ شمالی مغربی ہند اور پنجاب میں بھی اشاعت مذہب کی خاطر گئے تھے۔ آپ کے پرچار کے سینتیسویں سال کا واقعہ ہے کہ دیودت آپ کے ماموں کا لڑکا جو برائے نام معتقد تھا آپ کی ہردلعزیزی، شہرت اور اثر و اقتدار سے کبیدہ خاطر ہوگیا، اس نے اپنا جدا فرقہ قائم کیا اور مہاتما گوتم بدھ کو تین مرتبہ زہر سے ہلاک کرنے کی کوشش کی مگر اس کی کوشش بار بار ناکام ہوتی رہی۔

مہاتما گوتم بدھ کی وفات

مہاتما گوتم بدھ موسم برسات میں دورہ نہ کرتے تھے بلکہ ایک ہی جگہ مقیم رہتے تھے۔ باقی تمام جاڑے اور گرمی میں مختلف دیہات، قصبات اور شہروں میں جاتے۔ آپ کا دستور تھا کہ چند روز کسی مندر یا باغ میں جا ٹھہرتے جب لوگ آپ کے پاس جمع ہوتے تو آپ انہیں اپدیش دیتے اور بعد چندے دوسرے مقام کو چل دیتے۔ سال میں آٹھ مہینے اسی طرح دورہ کرتے رہتے تھے۔ آپ کی عمر اسی سال سے اوپر تھی کہ اسی طرح پرچار کرتے ہوئے ایک گاؤں میں جا نکلے جہاں چنداک لوہار نے آپ کو چیلوں سمیت بھوجن دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے خشک خنازیر کا سالن تیار کیا تھا جسے کھا کر آپ کشی نگار میں پہنچے اور جاتے ہی بیمار ہوگئے۔ چند روز تک اسی بیماری میں مبتلا رہ کر مہا پری نروانی کو سدھارے۔ مرتے آن تک آنند آپ کے پاس رہا۔ آپ نے مرنے سے تھوڑی دیر پہلے اپنے شاگردوں کو نصیحت کی:-

"اے بھکشوؤ! اس امر کو خوب ذہن نشین کر لو کہ تمام مرکب ہستیاں زوال پذیر ہیں۔ تندہی اور جانفشانی سے اپنی مکتی کے واسطے جتن کرو۔"

چھ روز تک آپ کی لاش وہیں دھری رہی تاکہ معتقد اور بھکشو آپ کے آخری درشن کا فیض حاصل کر سکیں۔

ساتویں دن جلائی گئی۔ کُشی نگار کے مَلہ لوگوں نے یہ دعویٰ پیش کیا کہ چونکہ گروجی کا انتقال ہمارے ہاتھوں ہوا ہے اس وجہ سے ان کے پھول اسی جگہ رہیں گے۔ مگر بعدازاں آٹھ حصّے کئے گئے اور مختلف صوبوں میں سمادھوں کے نیچے دفن ہوئے۔ مقام وفات کا صحت کے ساتھ اب تک تعین نہیں ہو سکا۔ کننگم نے کُشیہ جو گورکھپور کے مشرق میں چالیس میل دور ہے قرار دیا تھا مگر ونسنٹ اسمتھ اور سر جان مارشل کو اس سے اختلاف ہے۔ اسی طرح سن ولادت کی بابت بھی اختلاف ہے۔ سنگھالی روایات (لنکا) کی رو سے ۵۴۳ قبل مسیح سن عیسوی ظاہر ہوتا ہے۔ جنرل کننگم نے بہت تحقیقات کے بعد ۴۷۸ ق م قرار دیا ہے۔ میکس مولر نے بطور خود اسی تخمینہ کو درست تسلیم کیا ہے۔ جرمن ماہر بوُلر نے بھی اسی کو واجب التسلیم ٹھہرایا ہے۔ ڈاکٹر فلیٹ نے تمام معلومات اور بیانات پر غور کر کے ۱۳۔ اکتوبر ۴۸۳ ق م اور لنکا کی تاریخ مہاونش کے مترجم گائیگر نے ۴۸۳ ق م ٹھہرایا ہے۔ پروفیسر اے۔ ایس[1] گڈن نے بھی اس سے اتفاق رائے کیا ہے۔

مہاتما گوتم بدھ کی تعلیم اور نروان مت

مہاتما گوتم بدھ نے اپنے وضع کردہ مذہب کے جن اصولوں کی قریباً نصف صدی تک مگدھ (بہار) اور جنوبی نیپال کی ترائی اور موجودہ یو۔پی کے مختلف حصوں میں اشاعت کی تھی، مروجہ بدھ مذہب کے مسلمات ان کے نقیض ہیں۔ نامی مستشرق ڈاکٹر ای۔ کارپنٹر نے اپنے ہبرٹ لیکچروں[2] میں سے آستک (معترف خدا) مذہب ثابت کرنے کی عالمانہ سعی کی ہے۔ پرنسپل اے۔ ایم۔ فیربری نے جو فلسفۂ دینیات اور مذاہب نسبتی کے نہایت مشہور استاد سمجھے جاتے ہیں طریق استخراج سے ہدایت حاصل کر کے مہاتما بدھ کے نظام اخلاق سے یہ نتیجہ[3] اخذ کیا ہے کہ یہ عالم کے ذی عقل خالق اور خواص اخلاقی سے متصف مالک کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آپ کا دلآویز اور فلسفیانہ انداز ملاحظہ ہو:-

"وہ اصول آخری جس سے مذہب کی ماہیت کا تعین ہوتا ہے موضوع پرستش یعنی تصور خدا ہے عبادت حقیقت میں ایک فعل یا عمل باہمی لین دین کا ہے۔ اس کی رُو سے انسان اپنے کو خدا کے حوالہ کر دیتا ہے، تاکہ خدا اپنا فضل انسان کو عطا کرکے اپنی مرضی کی اس کے وسیلے سے تکمیل کرے، باہمی ربط ضبط فقط ذی عقل ہستیوں ہی کے درمیان قائم ہوا کرتا ہے۔ ایک دوسرے کے مزاج اور خیال سے آشنا ہوتا ہے۔ عقل و ارادت سے معرا ہستی معبود نہیں ٹھہر سکتی گو وہ تخیل کا موضوع بن

---

[1] ملاحظہ ہو "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" جلد دوم صفحہ ۹۸۳
[2] "تھی ازم ان میڈیوِل انڈیا"
[3] "اسٹڈیز ان دی فلاسفی آف ریلیجن" صفحہ ۱۹۱

سکتی ہے۔ بدھ نے ہمہ اوست اور بہت سے دیوتاؤں کے مت سے انکار کیا تھا۔

بدھ نے ہمہ اوست اور بہت سے دیوتاؤں کے مت سے انکار کیا تھا۔ مگر اس انکار کو انکار خدا
مجھنا منطق کی مغالطہ خیزی ہے ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اس کا انکار خدا کی ہستی کے ادراک کا پورا اظہار ہے
ہ اپنے زمانہ کے اخلاق سے بیگانہ مابعد الطبعیات اور مکروہ مورتی پوجا کا استیصال کر کے زندگی
ں اخلاقی حقائق کے مسئلہ کو حل کرنے کا خواہاں تھا۔ وہ مابعد الطبعی انانیت کو موقوف کر کے ایثار
ی النفس کے اصول اخلاق کو رائج کرنے کے درپے تھا، اور یہ خواب سب سے شاندار تھا، اس نے
فضل نظام اخلاق کا تصور پیش کیا تھا جس کی رو سے کوئی گنہگار جزا سزا سے نہیں بچ سکتا۔ اور نہ
ز و نیاز یا بلیدان ہی سے گناہ کی سزا سے بچ سکتا ہے۔ اس وجہ سے بدھ کا تصور خدا بہت لطیف
ر شاندار ثابت ہوتا ہے۔

جے۔ پی۔ کرو زر کا یہ دعویٰ ہے

اعلیٰ نظام اخلاق کے ساتھ اعلیٰ تصور خدا مربوط ہوتا ہے، اور اعلیٰ تصور خدا کے سبب سے اعلیٰ
نظام اخلاق ظہور میں آتا ہے۔"

بھگوان بدھ نے بلاشبہ اعلیٰ درجہ کا نظام اخلاق قائم کیا ہے جو اس سے پیشتر کے اخلاق سے
تر تھا۔ اور اب بھی منکرین بدھ مت کے اخلاق کو پیش کر کے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا کے اعتراف
ں کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن اخلاقی تعلیم کا منتہائے مقصود ہوتا ہے اور اس کے ساتھ جزا و سزا
ا مسئلہ وابستہ ہے۔

بدھ مت کے متعدد بڑے گروہوں میں منقسم ہیں، ایک جنوبی فرقہ ہے جس کے پیرو لنکا، برما،
یام وغیرہ میں ہیں اور دوسرا شمالی فرقہ ہے جس کے حامی تبت، ترکستان، چین، منگولیا وغیرہ کے
گ ہیں۔ گوتما تا شاکی منی بدھ نے خدا کی ہستی کی نسبت خاموشی اختیار کی تھی لیکن بعد میں بودھ
گوں نے حاسۂ مذہب اور فطرت انسانی کے جبلی میلان کے باعث آپ کو اپنا معبود مقرر کر لیا۔ آپ
ے الوہیت منسوب کی گئی۔ یہ عقیدہ بھی غالب ہے کہ آپ سے پیشتر بہت سے بدھ ہوئے ہیں
س سلسلہ میں آپ ایک جزے تو تار کئے جاتے ہیں۔ اس امر کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ بدھ مت
مالک میں پھیلا مقامی عقائد اور رسومات اس کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ اس ضمن میں اہل تبت کے

---

۱۵ فلاسفی آف دی ریلیجن، ریلیجن۔ صفحہ ۲۲۴-۲۳۰-۲۴۳۔ مطبوعہ [illegible]

۱۵ اٹلنک بُرٹل دری بمنٹ، جلد اول [illegible]

موجودہ رسم ورواج اور رسمیات دینی خاص غور کے قابل ہیں۔

گوتم بدھ کی تعلیم کا ماخذ

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے: مہاتما گوتم بدھ کی تعلیم کا ماخذ کیا ہے؟ شہرہ آفاق مستشرق ریس ڈیوڈز نے اس سوال کا جواب بہم پہونچایا ہے، اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔ گوتم جنم کا ہندو تھا، اور مرتے دم تک ہندو رہا، اس کے فلسفہ کا ماخذ پرانا ہندو فلسفہ ہے، اس کی اخلاقی تعلیم پرانی ہندو کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کی جدت اس بات میں ہے کہ اس نے پرانے رشیوں کے خیالات کو اپنے نرالے انداز میں بیان کر کے نئے قالب میں ڈھالا ہے۔ مساوات اور عدل وانصاف کے اصول اولیہ کو جن کے موجد اگلے زمانہ کے رشی منی تھے مدلل صورت میں پیش کیا ہے۔ اس کے دستور العمل کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے بلا امتیاز سب کے ساتھ نیکی اور مروت کے برتاؤ کا نمونہ قائم کیا ہے۔ بدھ مت ہندو دھرم کا بچہ ہے اور گوتم تمام ہندو استادوں اور رفارمروں میں سب سے دانشمند، عالی دماغ اور افضل تھا۔[1] اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ بدھ مت ہندو دھرم کی ایک شاخ ہے۔ گوتم بدھ کے مذہب کے اصول ہندو درشن سے مستعار ہیں۔ کئی نامی مستشرقین کی یہ رائے ہے کہ یہ سانکھ کے فلسفہ سے ماخوذ ہیں۔ وشنو پران کی رو سے آپ وشنو بھگوان کے ایک اوتار سمجھے جاتے ہیں۔ بہرحال بدھ مت کو ہندو دھرم سے غیر سمجھنا غلطی ہے۔

گوتم بدھ کا فلسفہ الٰہیات

مہاتما بدھ کی تعلیم کا اجمال خالی از لطف نہ ہوگا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے تمام باتیں پرانے ہندو دھرم ہی سے اخذ کی تھیں۔ اس امر کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ ہندو فلاسفروں کا سب سے بڑا مسئلہ دکھ سکھ ہے جس کی ماہیت کی موشگافیاں کی گئی ہیں۔ دکھ کے کلیتہً رفع داد اور سکھ کے حصول کے وسائل پر جامع ومانع بحثیں پائی جاتی ہیں۔ مہاتما گوتم بدھ کے سامنے بھی یہی مشکل مسئلہ تھا جس کے سلجھاؤ کی خاطر آپ برسوں تک نامی گرامی رشیوں منیوں کی شاگردی کرتے رہے مگر جب مایوس ہوئے تو بطور خود اسے حل کرنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوگئے۔ آپ نے سارناتھ میں جو پہلا اُپدیش دیا تھا اس سے ذیل کا اقتباس ہدیہ ہے:۔

دکھ کی حقیقت یہ ہے، جنم دکھ ہے، بڑھاپا دکھ ہے، بیماری دکھ ہے، اجل دکھ ہے، تمنائے دلی بر نہ آنے سے دکھ ہوتا ہے، عناصر خمسہ کے بندھنوں میں مقید رہنے سے دکھ ہوتا ہے۔ زندگی کی طمع سے بار بار جنم لینا پڑتا ہے۔ ہوا و ہوس کی آرزو انسان کو آواگون کے چکر میں پھنساتی ہے۔ راحت او شہرت حاصل کرنے کی خواہش مسلسل جنم کی محرک ہوتی ہے۔ پس طمع اور تمنا کو سینہ

---

[1] "بدھ ازم" صفحہ ۹۳-۹۵

میں جگہ نہ دو۔ اس کی بیخ کنی کر ڈالو تو دُکھ سے چھٹکارا حاصل[1] ہو جائے گا۔"

نامی استادِ مذاہبِ اضافی پرنسپل اے۔ ایم۔ فیربرن کا قولِ ناطق قابلِ ملاحظہ ہے۔ آپ رقمطراز ہیں:۔

"ہندو فلاسفروں نے آواگون کے چکر سے رستگاری حاصل کرنے کے وسائل پر بہت دماغ سوزی کی ہے۔ گوتم بُدھ کو بھی اس مسئلہ سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے استدلال کی رو سے زندگی کی تمنا جو تمام دکھوں کی مصدر ہے ادراک سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ادراک حواسِ خمسہ کے اشارہ سے ظہور میں آتا ہے۔ حواس کا تعلق شخصی ہستی سے ہے، اور شخصی ہستی کا انحصار شعور پر ہے۔ اور شعور جذبات کا دست نگر ہے۔ اگر شخصی ہستی کا مدار یعنی شعور نابود ہو جائے تو جنم مرن کے تمام دکھوں سے مخلصی حاصل ہو جاتی ہے۔ ان ہر دو اقتباسات سے ثابت ہے کہ مہاتما بدھ کے مت کے اصول اولیہ کیا ہیں: شاید یہ سوال پیدا ہو گا: دکھ سے نجات حاصل کرنیکا کیا دستور العمل ہے۔[2]

اس پر مختصر بحث کرنا ضروری ہے۔

راہ نجات | ارکانِ ایمان جو نجات کے لئے قطعی لابدی ہیں دھرم پد کہلاتے ہیں۔ یہ اشٹ مارگ یعنی ہشت گونہ طریقت کہلاتی ہے۔ مہاتما بدھ کا قولِ ناطق ملاحظہ ہو:۔

"سب سے افضل اشٹ مارگ یعنی طریقت ہشت گونہ ہے۔ جس کے بغیر نروان یعنی کمال اخلاقی اور حصول راحت ابدی ناممکن ہے۔ جب میں نے تمام علائق منقطع کر دیئے اور دنیاوی تعلقات سے انحراف کرنے کا طریقہ سیکھ لیا تو میں نے اس کی تلقین اور اشاعت کا پختہ ارادہ کر لیا۔"

اور یہ اشٹ مارگ جس کے وسیلہ سے انسان آواگون کے چکر سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ حسب ذیل ہے:۔

(۱) خیالات پاک ہوں (۲) خواہشات بے لوث ہوں (۳) بول چال میں پاکیزگی ہو۔ (۴) اعمال نیک ہوں، (۵) معاش نیک ہو (۶) مساعی حسنہ ہوں (۷) من لوتحمّر ہو (۸) سوچ بچار ہر قسم کے گناہ سے ناآشنا ہو۔ اگر یہ تعلیم تزکیہ نفس کا ذریعہ تسلیم کی جائے تو چینی حکیم کنفوشس اور یونانی حکیم سقراط سے گہری مشابہت رکھتی ہے۔

ریس ڈیوڈز نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ہندو رشیوں کے پراگندہ خیالات کو ایک نظام میں

---

[1] "بدھ ازم" صفحہ ۲۸-۲۹ مصنفہ ڈاکٹر ایچ۔ آر۔ رینڈس۔

[2] ملاحظہ ہو "اسٹڈیز ان دی فلاسفی آف ریلیجن" صفحہ ۔۔

منضبط کرنے کی تحسین گوتم بدھ کو ملنی چاہیئے۔ اور یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ گوتم بدھ نے نہ صرف منتشر خیالات ہی کو ایک جامع ضابطہ میں ڈھالا ہے بلکہ ذات پات کا امتیاز عملاً موقوف کر کے دیا دھرم کے کلیہ کو نہایت واضح صورت میں پیش کیا ہے۔ آپ ہمدردی اور مروّت کے برتاؤ کا نمونہ ہیں۔ آپ نے پروہتوں کا زور توڑ کر ذات پات کے بندھن کاٹ ڈالے۔ جس کی تحسین کے آپ ہر طرح سے مستحق ہیں۔

کئی اہم مسائل کی بحث دانستہ آئندہ کے لئے اٹھا رکھی گئی ہے جو اس مضمون کے مقصد سے سراسر خارج ہے۔

تغیّر

تغیر میں عروج ذات بھی ہے ارتقا بھی ہے — ثبات ہوش بھی آئینۂ دل کی جلا بھی ہے

نظام عالمِ اسباب قائم ہے تغیر سے — اسی آئینہ میں نیرنگی صبح و مسا بھی ہے

تحیر خیز ہے گو اضطراب و سوز پروانہ — حیاتِ چند ساعت کا مگر یہ مدعا بھی ہے

تلاطم خیز ہیں موجیں بہت بحرِ تغیر کی — انھیں موجوں میں لیکن زندگی کا راستا بھی ہے

نہ جلتا بحر کا سینہ تو بادل کب نظر آتے — حرارت ہی سے یہ کالی گھٹا ٹھنڈی ہوا بھی ہے

بہت تاریک ہیں گو منزلیں راہِ تغیر کی — اسی ظلمت میں لیکن چشمۂ آب بقا بھی ہے

پریشاں حال گو رکھتا ہے درد و سوزِ دل لیکن — اسی کے فیض سے نالے بھی ہیں آہِ رسا بھی ہے

اسی کے لطف سے ہے گرمیِ قلبِ تپاں باقی — اسی مجنوں کے سینے میں دلِ لیلیٰ نما بھی ہے

یہ وہ دریا ہے جس میں گوہرِ مقصود ملتے ہیں — اسی آتش کدہ میں نورِ حسنِ انتہا بھی ہے

جو عاری ہیں تغیر سے وہ انساں ہو نہیں سکتے
جو قطرے تھم گئے وہ ابرِ نیساں ہو نہیں سکتے

(غلام طیب۔ طیب)

روسی ادیب ترجنیف

ولادت ۱۸۱۸ء وفات ۱۸۸۳ء

(از قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی)

آیُون سرغیوچ ترجنیف (I.S. Turgenieff) روس کے مشہور اور ممتاز ادیبوں میں دبستان فطرت (Natural School) کا چوتھا معلم خیال کیا جاتا ہے۔ روسی ادبیات میں اس کا درجہ پُشکن (Pushkin) لرمنٹوف (Lermentof) اور گوگول (Gogol) کے بعد ہے۔ لیکن وہ اپنے پیشرووں سے اس لحاظ سے بڑھا ہوا تھا کہ اس نے اپنی مادری زبان کے محدود دائرہ سے نکل کر تمام یورپ میں شہرت عام حاصل کر لی تھی۔

روس کی دیہاتی زندگی، کاشتکاروں اور غریب مزدوروں کی سادہ معاشرت کی تصویر کھینچنا اور غلام کسانوں (Serfs) کی دردناک حالت سے ہمدردی پیدا کرنا ترجنیف کے قصوں اور فسانوں کا خاص موضوع تھا۔ ممکن ہے ابتدا میں لوگوں کو ان سے دلچسپی نہ ہوئی ہو لیکن

"دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے"

آخر ترجنیف کی تحریروں نے اہل روس کے دلوں پر گہرا اثر ڈالا چنانچہ انہی تحریرات کا اثر تھا کہ ۱۸۵۶ء میں شہزادہ زاروچ (بعد میں شہنشاہ الگزنڈر ثانی) نے اپنی تخت نشینی کے موقع پر ان غلام کسانوں کی حالت کی اصلاح کا کام شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۱ء میں تین کروڑ غلاموں نے آزادی حاصل کی۔ بایں ہمہ بنی نوع انسان کے محسنوں کے ساتھ دنیا نے جو سلوک روا رکھا ہے اس سے ترجنیف بھی مستثنٰی نہ رہ سکا۔ اسے سخت اذیتیں پہونچائی گئیں اور آخرکار اپنے پیشرو ادیب گوگول کی وفات پر ایک مضمون لکھنے کی پاداش میں اسے پیٹرسبرگ کا جیلخانہ نصیب ہو۔ ایک ماہ کی قید کے بعد شہزادہ زاروچ کی سفارش نے اسے قید کی مصیبت سے نجات دلائی لیکن اپنی جاگیر کے گانوں سے باہر جانے کی اسے ممانعت کر دی گئی۔ یہ بھی ایک طرح کی قید تھی جس میں اس نے کئی سال گزارے۔ اس کے

بعد اس نے روس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا، اور یورپ کی علمی فضا میں اپنی زندگی کے بقیہ دن تیر کرکے ۱۸۸۳ء میں پیرس میں وفات پائی۔

ترجینیف نے اپنی بقیہ زندگی کا کچھ حصہ فرانس اور کچھ حصہ جرمنی میں بسر کیا۔ خاص کر مہمان نواز پیرس کو اس نے اپنا مسکن بنالیا تھا۔ وہ فرنچ اور جرمن زبانیں روانی کے ساتھ لکھ اور بول سکتا تھا انگریزی بھی پڑھ لیتا تھا لیکن اس پر بخوبی قادر نہ تھا جرمنی کے ممتاز مصنفین سے اس کے دوستانہ روابط قائم ہو گئے تھے۔ اسی طرح فرانس کے مشہور افسانہ نگار پراسپر (Prosper) میریمی (Merime) فلاؤبر (Flaubert) ڈاوڈے (Daudet) ایمیلی زولا (Emile Zola) وغیرہ سے اس کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔

یورپ میں اپنے طویل قیام کے دوران میں اس نے اپنی روسی تصانیف کے فرانسیسی ترجمے شائع کئے اور جوں جوں یورپ میں اس کی شہرت بڑھتی گئی۔ اس کی تصانیف کے ترجمے یورپ کی مختلف زبانوں میں ہونے لگے۔ اب اسے موقع مل گیا کہ اہالی روس کے ایک محدود طبقہ کے بجائے ایک وسیع بر اعظم کے باشندوں کو مخاطب کر سکے اور ساتھ ہی حریفوں کی ایک بڑی تعداد کو دعوت مقابلہ دے سکے۔ اگرچہ اہل یورپ کے سامنے وہ جو کچھ پیش کرتا تھا وہ ترجموں تک محدود ہوتا تھا جن میں بعض تراجم بدترین کہے جاسکتے ہیں۔ باایںہمہ وہ اپنے زمانہ کا ایک زبردست افسانہ نگار تسلیم کیا گیا اور اس کے افسانے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ پڑھے جانے لگے۔ اس ہردلعزیزی اور شہرت نے نہ صرف اس کے وطن کی عزت و شان بڑھائی بلکہ یورپ کی تاریخ ادبیات میں ایک عہد زریں پیدا کردیا۔

ترجینیف نے متعدد افسانے لکھے ہیں جو اس کی ادبیت اور صناعی کے بہترین نمونے ہیں۔ اواخر عمر میں ۱۸۷۸ء اور ۱۸۸۲ء کے مابین اس نے مختصر ادبی پارے لکھے تھے جو "شعر منثور" (Prose Poems) کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ جواہر ادب ترجینیف کے ادبی طرز اور اس کے فلسفیانہ خیالات کے آئینہ دار ہیں جو تصورات، افسانے، خواب، تمثیلات اور تخیلات کا مجموعہ ہیں۔ ولہم سینگ نے ان کا جرمنی میں ترجمہ کیا، اس جرمنی ترجمہ سے الیس جے۔ میک مولن نے ۱۸۹۰ء میں انگریزی میں ترجمہ کیا ذیل میں اس کے چند پارہ ہائے ادب کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

بھکاری

پلکیں، پُرنم آنکھیں، اُودے اور خشک ہونٹ، بوسیدہ کپڑے اور بد نما زخم۔ آہ! اُس قدر خوفناک طریقہ سے مفلسی اور فلاکت نے اس بد نصیب انسان کو تباہ کر دیا تھا۔

اس نے اپنا سوجا ہوا سُرخ میلا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا اور کراہتے ہوئے حسبِ دستور سوال کیا:۔

میں نے اپنی تمام جیبیں ٹٹول ڈالیں۔ ان میں نہ تو پیسے ہی تھے نہ گھڑی تھی، نہ جیبی رومال۔ میرے پاس کچھ نہ تھا۔

مگر بھکاری کچھ ملنے کی امید میں اسی طرح کھڑا رہا، اس کا دستِ سوال خفیف لرزش کے ساتھ کپکپا رہا تھا۔

میں متحیر اور حیران کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کے میلے کچیلے، کپکپاتے ہوئے ہاتھ کو گرمجوشی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"خفا نہ ہونا بھائی! اس وقت میرے پاس کچھ بھی موجود نہیں!"

بھکاری نے اپنی حلقے پڑی ہوئی آنکھیں اوپر کو اُٹھائیں، اس کے زرد ہونٹوں پر تبسم کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی اور اس نے میری سرد انگلیوں کو دبایا۔

"کوئی مضائقہ نہیں بھائی!" اس نے تُتلاتی ہوئی آواز سے کہا۔

"تم نے جو کچھ کیا میں اُس کے لئے تمہارا ممنون ہوں۔ یہ بھی ایک طرح کی خیرات ہے بھائی!"

میں نے محسوس کیا کہ گویا میں نے بھی اپنے بھائی سے کچھ خیرات حاصل کی ہے۔

بشاش نوجوان

پایۂ تخت کی گلیوں میں ایک نوجوان نہایت بشاش بشاش تیز قدم جا رہا ہے۔ اس کی حرکات بہت دلچسپ اور خوشنما ہیں۔ اس کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ اس کے ہونٹ مطمئن انداز سے تبسم ریز ہیں اور اس کے بشاش چہرے پر مسرت کی سرخی دوڑ گئی ہے۔

آخر اس کو ایسی کیا بات پیش آئی ہوگی؟ کوئی بڑی دولت ورثہ میں ملی ہوگی؟ حکومت نے اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا ہوگا؟ سرکار نے اسے خطاب کی عزت سے سرفراز فرمایا ہوگا؟ کسی نے ملاقات کا وقت دیا ہوگا۔ اس لئے شاید تیزی سے جا رہا ہے؟ یا پھر غالباً اس نے صبح ڈٹ کر ناشتہ کر لیا ہے کہ صحت اور جسمانی طاقت کے احساس کی وجہ سے اس کا تمام جسم سراپا مسرت بنا ہوا حرکت

کر رہا ہے۔

نہیں، ان میں سے کوئی بات بھی نہیں، دراصل اپنے ایک دوست کے خلاف اس نے ایک تہمت تراشی، اور بڑی گرمجوشی سے اس کی اشاعت کی تھی، آج اس نے یہی بات ایک دوسرے دوست کی زبانی سُنکر اس کی تصدیق کی ہے۔

اخاہ! کس قدر قانع و مطمئن، بلکہ کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے ہمارا یہ خوش باش امید افزا نوجوان!

آخری وداع

ہم دونوں کبھی نہایت گہرے دوست تھے، مگر ایک منحوس گھڑی ایسی بھی آئی کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن بنکر جدا ہوگئے۔ کئی برس گزر گئے۔

ایک مرتبہ میں اُسی شہر میں جا نکلا جہاں وہ رہتا تھا میں نے سنا کہ وہ بیماری کی حالت میں زندگی سے مایوس ہے۔ نیز یہ کہ وہ مجھ سے ملنے کی خواہش رکھتا ہے۔

میں اُس کے یہاں گیا، کمرہ میں داخل ہوا، آنکھیں چار ہوئیں، میں نے اسے بمشکل پہچانا، یا اللہ! بیماری نے اس میں کتنا تغیر پیدا کر دیا ہے!

زرد اور پژمردہ، مختصر سی ڈاڑھی کے سوا تمام جسم پر بال ندارد، وہ بیٹھا ہوا تھا، اور ایک نہایت ہلکا سا کپڑا جو خاص اس کے لئے بنایا گیا تھا۔ اوڑھے ہوئے تھا۔ کیونکہ سبک سے سبک کپڑے کا وزن اُٹھانے کے قابل نہ رہ گیا تھا۔ سرعت کے ساتھ اس نے اپنا لاغر، پژمردہ ہاتھ میری طرف بڑھایا اور شدتِ کرب کے ساتھ چند ناقابلِ فہم الفاظ بڑبڑایا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ الفاظ خیر مقدم کے تھے یا طنز و تشنیع کے؟ اس کا کمزور اندر دھنسا ہوا سینہ سانس لینے لگا اور سوجی ہوئی آنکھوں کی بے نور پتلیوں پر دو دردناک گرما گرم قطرے آنسو کے بہنے لگے۔

میرا دل ڈوبا جا رہا تھا، میں اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اور اس خوفناک مریض کے سامنے اپنی آنکھیں اضطراری طور پر نیچی کئے ہوئے تھا۔ میں نے بھی اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے رکھا تھا۔

مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ گویا ہمارے درمیان کوئی خاموش سفید "پیکر طویل" بیٹھا ہوا ہے۔ جو سر سے پاؤں تک ایک چادر میں ملفوف ہے۔ دھنسی ہوئی زرد آنکھیں بے معنی طور پر دیکھ رہی تھیں زرد، کرخت ہونٹوں سے کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ —— اس پیکر نے ہمارے ہاتھ ملا دیے۔

ہاں، موت نے ہمارے درمیان صلح کرا دی!

طلسمِ نظر

(از سید ابو طاہر داؤد۔ بی۔ ایس۔ سی (لک)

ہمارے حواس اس قدر کار آمد ہیں کہ جن کی خدمت کے ہم ہر وقت محتاج ہیں اور وہ اپنے فرائض
ٹھیک ٹھیک انجام بھی دیتے ہیں مگر اس کے باوجود ہم کو دھوکے میں ڈالکر غلطیوں کا شکار بنا دیتے
ہیں۔ سب سے زیادہ کار آمد چیز ہماری آنکھ ہے مگر سب سے زیادہ مغالطہ میں ڈالنے والی بھی یہی ہے
اگر اس کے بجائے قدرت ہم کو مصنوعی آنکھ دیتی تو ان فاش غلطیوں کا امکان ہی جاتا رہتا۔ ہم کسی پیڑ
کو فاصلہ سے دیکھیں تو چھوٹا سا دکھائی دیتا ہے لیکن جوں جوں فاصلہ کم ہوتا جاتا ہے اُسی تناسب سے
بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ پیڑ کی لمبائی اور آنکھ کے فاصلہ میں ایک قسم کا تناسب ہے
لیکن دقت یہ ہے کہ ہم اپنی آنکھ پر بھروسہ کرتے ہوئے اُس کی لمبائی کا تعین کیسے کریں۔ یہ بھی ایک
قدرتی کرشمہ ہے کہ ہماری آنکھ متحرک چیزوں کو ساکن اور ساکن چیزوں کو متحرک دکھاتی ہے۔ ٹرین میں
سے جھانک کر دیکھیں تو باہر کے سارے درخت گھومتے معلوم ہوتے ہیں، بعد کو ہم غور کرنے سے سمجھتے ہیں کہ یہ
دراصل ٹرین کی تیز رفتاری ہے جو درختوں کے درمیانی فاصلہ کو معدوم کر دیتی ہے اور وہ گھومتے دکھائی
دیتے ہیں مگر اس سے یہ انکار تو نہیں کر سکتے کہ ہماری آنکھ غلطی کی مرتکب نہیں ہوئی۔ ایک موٹر ڈرائیور
کا بیان ہے کہ میں اپنا موٹر اس تیزی سے لئے جا رہا تھا کہ سڑک پر میل کے پتھروں کی ایک دیوار سی
معلوم ہونے لگی تھی۔ اب اس میں جس قدر مبالغہ ہو لیکن حقیقت کے شائبہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔
یہ بھی ہر شخص کا تجربہ ہے کہ متحرک ٹرین میں سے مقابل کی ساکن گاڑی کو دیکھیں تو ہماری گاڑی ساکن
معلوم ہوتی ہے اور دوسری گاڑی متحرک۔ جیسے ہم سورج کو متحرک دیکھتے ہیں اور اپنی متحرک زمین
کو ساکن۔

اسی نقص کے دعوے کو ہم طلسمِ نظر کہتے ہیں، اسی کی بنا پر بہت سے فلاسفہ دنیا کی حقیقت اور وجود
سے یک قلم انکار کرتے ہیں۔ ان تمام قدرت کے تماشوں کو وہ آنکھ کا کھیل خیال کرتے ہیں۔ افق جہاں
آسمان زمین سے ملتا ہے ہم کو حقیقتاً ملا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن اسکی حقیقت اسسے پوچھنا چاہیئے جو اس کی

تلاش میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہو آیا ہو۔ طلسم نظر کی ایک عمدہ مثال سراب ہے لفظ سراب دنیا کی حقیقت کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ریگستان میں سفر کرنے والا اپنے سامنے ریت کے بجائے پانی کا لہریں مارتا ہوا چشمہ دیکھتا ہے اور اسمیں کھجور کے درختوں کا عکس بھی۔ اس کو اس موہوم چیز کا اتنا یقین ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی پیاس کو روک کر میلوں کا سفر اسی امید پر کہ اب پانی ملتا ہے طے کر لیتا ہے۔ لیکن جس قدر وہ آگے بڑھتا ہے اتنا ہی وہ چشمہ بھی آگے بڑھتا جاتا ہے۔

اسی طرح ہماری آنکھ رنگ کے معاملہ میں بھی سخت دھوکا کھاتی ہے، زرد چیز دور سے سفید نظر آتی ہے اور نیلی اور گہری سرخ چیز کالی۔ ہماری اسی غلطی سے خود قدرت نے بھی بہت زبردست فائدہ اٹھایا ہے۔ بہت سے جانور اور درخت اسی طرح جان بچا لیتے ہیں۔ ایک درخت بالکل گول گول پتھر کی شکل کا ہوتا ہے۔ جانور اس کے پاس سے گذر جاتے ہیں لیکن اس کو پتھر سمجھکر کھانے سے باز رہتے ہیں۔ ہرا ہرا کیڑا سبز پتیوں پر ہمارے سامنے ہی آرام سے لیٹا ہوا ہنسا کرتا ہے، اور ہم اس کو دیکھ نہیں سکتے۔ Protective coloration اسی کو کہتے ہیں، گرگٹ جس جگہ بھی ہوتا ہے اسی کی مناسبت سے وہی رنگ اختیار کر لیتا ہے اور ہماری نظروں سے بچ جاتا ہے۔ برفستانی جانور بالکل برف کی طرح سفید رنگ کے ہوتے ہیں، خرگوش اور لومڑیاں برف کی سلوں میں شکاریوں کے سامنے ہی دم سادھے بیٹھی رہتی ہیں، لیکن شکاریوں کی نظر ان پر نہیں پڑتی۔۔۔اسی طرح ریگستان کے جانور ریت کے رنگ کے بھورے ہوتے ہیں۔ ہر شخص کو کٹے ہوئے گیہوں اور جوار کے کھیتوں میں چلنے کا اتفاق ہوا ہوگا، ہمارے سامنے کتنی ہی بٹیریں اور تیتر بیٹھے رہتے ہیں لیکن ہم کو پتہ تک نہیں چلتا جب وہ ہماری آہٹ پاکر اڑنے لگتے ہیں اس وقت معلوم ہوتا ہے۔ چڑیوں کے انڈے چٹانوں اور مٹی میں بھورے رنگ کے اور گھاس میں ہرے رنگ کے ہوتے ہیں، پانی میں رہنے والے سانپ کائی کے رنگ کے ہوتے ہیں، ایک قسم کا سانپ جو آدھا پانی میں رہتا ہے اور آدھا سمندر کی گھاس میں چھپا رہتا ہے اس کا نیچے کا حصہ پانی کے رنگ سے مناسبت رکھتا ہے اور اوپر کا حصہ گھاس کے رنگ سے۔ شیر کا رنگ بھی خاکی ہوتا ہے، وہ جھاڑیوں میں اس طرح دبک کر بیٹھ جاتا ہے کہ تمیز نہیں کیا جا سکتا

اسی طلسم نظر کی بدولت بہت سے مداری تماشائیوں پر حیرت و استعجاب کا سکہ بٹھا دیتے ہیں ہمارے سامنے وہ بہت سی چیزوں کو انگلیوں کے بیچ میں آستین میں یا جھولی میں اس تیزی سے چھپا دیتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا۔ ہم یہی خیال کرتے ہیں کہ انھوں نے اس چیز کو غائب کر دیا ہے، جادو ہوگا۔ علوم جدیدہ کا جس زمانہ میں رواج نہ تھا لوگ انھیں ترکیبوں سے دیکھنے والوں کو مبہوت بنا دیتے

تھے، اور ان واقعات کو خرقِ عادات سے تعبیر کرتے تھے۔ مذہب کی ترویج میں ان باتوں سے کافی مدد لی گئی ہے۔

طلسمِ نظر دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو وہ کہ جس میں قوت ارادی شامل نہ ہو اور دوسرا وہ جس میں قوت ارادی شامل ہو۔ پہلی قسم کے طلسمِ نظر کی مثالیں اوپر بیان کر آیا ہوں۔ اب دوسری قسم لیجئے رات کو سوتے وقت ہم کھونٹی کی طرف نظر کرتے ہیں تو لٹکتی ہوئی اچکن کے سر بھی پیدا ہو جاتا ہے اور ہاتھ پیر بھی۔ دیر تک نظر جما کر دیکھنے سے وہ حرکت بھی کرنے لگتا ہے اور ہماری طرف بڑھتا ہوا بھی معلوم ہوتا ہے، اس کا سبب یہی ہے کہ ہمارے دماغ میں خوف کی وجہ سے چور کی ایک خیالی تصویر تھی جو ہمارے خیال کی قوت کی وجہ سے مجسم ہوگئی۔ ہسپٹزم بھی اسی کی شاخ ہے۔ جس میں طلسم نظر اور قوت ارادی دونوں شامل ہیں۔ جادو اس کا دوسرا نام ہے۔

ہر نئی چیز میں ایک قسم کی جاذبیت اور مقناطیسی کشش ہوتی ہے۔ بچے ایک قسم کا کھلونا ضد کرکے لیتے ہیں، اُس وقت اُن کو بےحد پسند ہوتا ہے، لیکن اس کو لیکر جب وہ تھوڑی دیر تک اُسے دیکھتے رہتے ہیں تو کشش کے بجائے جذبۂ تنفر پیدا ہو جاتا ہے۔ کھلونا وہی رہتا ہے مگر آنکھ بدل جاتی ہے، اب وہ مختلف زاویوں سے دیکھکر اُس کے عیوب کو سامنے لاکر رکھ دیتی ہے۔ یہی حال نئے شہروں، نئے آدمیوں کی جاذبیت کا بھی ہے۔

ہم اپنی آنکھ سے ایک چیز کے دو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ بچے ایک آنکھ کو دبا کر دوسری آنکھ سے چاند کو دیکھا کرتے ہیں تو انھیں ایک چاند کے بجائے دو نظر آتے ہیں۔ ذیل میں چند اشکال دی ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوگا کہ ہماری آنکھ کس قدر مغالطہ دے سکتی ہے۔

شکل (الف) بڑی ہے یا (ب)؟ (ب) بڑی معلوم ہوتی ہے حالانکہ دونوں ایک ہی لمبان کی ہیں۔
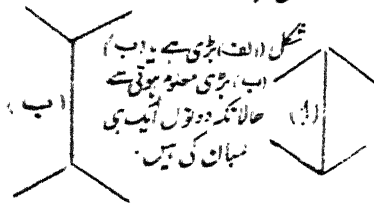
کونسا مربع بڑا معلوم ہوتا ہے؟
سفید بڑا معلوم ہوتا ہے حالانکہ وہ کالے سے چھوٹا ہے۔
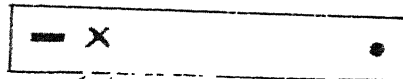
ہماری آنکھ میں ایک ایسا نقطہ ہے جہاں سے وہ چیزیں نہیں دکھائی دیتی [illegible] ہیں۔ بائیں آنکھ بند کیجئے اور سیدھی آنکھ کو × پر جمائیے۔ اس کاغذ کو آنکھ کے سامنے ایک فٹ کے فاصلے پر رکھئے اور آہستہ آہستہ آنکھ کے قریب لاتے جائیے حالانکہ آپ کی نظر صرف × پر مرکوز ہے لیکن آپ کو بازو والا بھی نظر آتا رہیگا مگر ایک مقام پر آکر وہ سیاہ نقطہ غائب ہو جائیگا۔ کاغذ کو اور قریب لانے کے بعد پھر نظر آنے لگے گا۔

لکیردار پٹیوں کے درمیان جو خالی جگہ ہے اگر اس کو غور سے دیکھا جائے تو پہلی پٹی کے بیچ کا حصہ کناروں کے مقابلہ میں تنگ نظر آئیگا۔ نیچے والی پٹی میں اس کے مخالف حالت پائی جائیگی۔ حالانکہ دونوں پٹیاں بالکل متوازی اور سیدھی ہیں۔
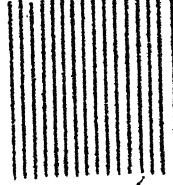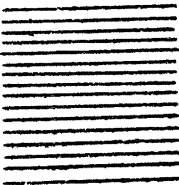
ان مربعوں میں سے ایک مربع لمبائی میں زیادہ معلوم ہوتا ہے اور دوسرا چوڑائی میں زیادہ، حالانکہ دونوں کی لمبائی چوڑائی ایک ہے۔

من کا مندر

پہاڑ نے تاڑ کے گنجان درختوں کا لباس پہن رکھا تھا، اس کی کمر پر تاریک بادلوں کا پٹکا تھا لیکن مجھے وہ تنگ اور پیچدار راستہ مل گیا جو ہرتا پھرتا مندر کو جاتا ہے۔

مندر کی قدیم عمارت میرے سامنے تھی، اس کا کلس آکاس کے دیوتا کے مانند خلا میں اکیلا کھڑا تھا ہوا پجاریوں کے گانے کی مدھم آواز کو اڑا کر لا رہی تھی۔ گھنٹوں کے بجنے کی آواز صاف تھی۔ اور شور انگیز طوفان کی طرح پہاڑیوں میں گونج رہی تھی۔

میری روح نے زنجیریں توڑ دیں۔ اب وہ کائنات کی رفعتوں میں پرواز کر رہی تھی

"آہ، تڑکا ہو گیا" میں نے چونک کر کہا۔ میں ایک درخت کے سہارے کھڑا تھا اور میرا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

اب مجھے مندر میں جانے کی ضرورت نہ تھی میرا مندر میرا دل تھا۔

(گجراتی)

۴۵ سال

(ایک افسانہ)

(از مسٹر مسلم کاکوروی)

مسٹر فرینک شا کمپنی کے دفتر میں بت کی طرح خاموش بیٹھا ہے، سامنے چائے اور کافی کی کیتلیاں رکھی ہوئی ہیں، جن پر ڈھلتے ہوئے آفتاب کی شعاعیں پڑ کر کمرے کو منور کر رہی ہیں۔ یہ کیتلیاں اس محبت اور مودت کا ثبوت ہیں جو کمپنی کے ملازمین کو اس کے ساتھ ہے۔ بیس سال تک اس نے نہایت ایمانداری اور جانفشانی سے کام کر کے بہت سی مشکلات پر قابو حاصل کیا، اور کمپنی کو کئی مرتبہ تباہی سے بچا کر اس قابل کر دیا تھا کہ اب اسے زوال کا خدشہ نہ تھا۔ وہ مسلسل کام سے اکتا گیا تھا۔ چاہتا تھا کہ معاہدہ ختم ہو اور جلد اپنے کام سے سبکدوشی حاصل کر کے آرام و اطمینان کی زندگی بسر کرے۔

اس لئے دو ہفتہ قبل اپنے احباب کو اطلاع دی تھی کہ وہ ۲۲۔ دسمبر کو تجارتی بکھیڑوں سے آزاد ہو کر اپنی پیاری پھلواری میں بغیر کسی رکاوٹ کے صبح و شام گلاب کے پھولوں کی نگہداشت کرے گا۔

آج آخری دن تھا اس لئے صبح کو نہایت مسرت سے دفتر میں قدم رکھا، دل میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ آج آخری دن ہے اور اب یہاں میرا آنا نہ ہوگا۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے چاروں طرف ان مانوس اشیاء کو دیکھنا شروع کیا جو زمانۂ دراز تک اس کی مصاحب رہ چکی تھیں۔ اس کا دل اس مسرت کے موقع پر ان کی جدائی کے خیال سے بھر آیا۔ خیال تھا کہ دفتر سے روانہ ہوتے وقت اس کا دل آزادی و مخلصی کے جذبات سے معمور ہوگا مگر خلاف توقع گذشتہ بیس سال کے جملہ واقعات یکایک اس کی نظروں کے سامنے پھر گئے۔ سفر حیات کی چالیسویں منزل سے آگے بڑھنے کے بعد عادت فطرت ثانیہ بن جاتی ہے اور مشکل بدلتی ہے۔ اس وقت اسے معلوم ہوا کہ تجارت اس کی زندگی کا ضروری جزو بن گئی ہے۔

"بیس سال" اس نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کہا "میں نے کولھو کے بیل کی طرح کام کیا اور اب جب آزادی و مخلصی کا زمانہ آیا تو مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ انسان کو کبھی اطمینان بھی نصیب ہوتا ہے؟ کاش میرے عزیز دفتری مجھے چھیڑنے اور تحفے پیش نہ کرتے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ لوگ مجھے

اس قدر عزیز رکھتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ مجھے شیطان سے کم نہیں تصور کرتے، کاش یہ لوگ مجھے کچھ نہ دیتے اور میری جدائی پر وداعی تقریر نہ کرتے۔ ان کے تحفوں اور تقریروں نے مجھے بزدل بنا دیا، اب مجھے نئے اور پرانے ملازموں کی جدائی پر افسوس ہو رہا ہے۔ جدائی بُری ہے اور..... ..."

"اندر آؤ" اس نے یکایک دروازے پر آواز سنکر کہا۔

آنے والے کو پہچان کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ ظاہر ہوئی، یہ دفتر کی ٹائپسٹ تھی جسے اس نے حال ہی میں ملازم رکھا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کی ہمسایہ بھی تھی۔

"مس کلفورڈ! تم ابھی تک نہیں گئیں؟" اس نے نرمی سے کہا "مجھے خیال تھا کہ تم ٹینس میچ دیکھنے چلی گئیں آج —"

"شام کو" ڈیلیا کلفورڈ نے منیجر کا جملہ مسکرا کر پورا کرتے ہوئے کہا "جی ہاں میں جاؤنگی، مگر میں اب تک انتظار کر رہی تھی تاکہ چائے کے سٹ میں چندہ نہ دینے کا سبب بتاؤں۔ تین ہفتہ قبل وہ فہرست بھیجی گئی تھی۔ اس وقت میں بیمار تھی۔ آپ کو یاد ہوگا، دفتر واپس آنے پر دیر ہو چکی تھی یقین مانیئے۔"

"پیاری لڑکی" فرینک شا نے جلدی سے بات کاٹکر کہا "مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس میں کچھ نہیں دیا۔ ابھی تمہاری تنخواہ خود تمہارے ذاتی اخراجات کے لئے کافی نہیں ہے۔"

"لیکن میں آپ کو اس ظاہری بے پروائی کا سبب بتائے بغیر نہیں جا سکتی" ڈیلیا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے "آپ نے یہاں ملازم رکھکر مجھ پر جس قدر عنایت فرمائی ہے میں شکریہ نہیں ادا کر سکتی، مجھے چندہ میں شریک نہ ہو سکنے پر بیحد صدمہ ہوا تھا، لیکن بعد میں خوشی ہوئی، کیونکہ اس سے مجھے ایک ایسی چیز پیش کرنے کا موقع ملا جسے امید ہے آپ اسی طرح پسند کریں گے جس طرح اس چائے کے سٹ کو۔ یہ چیز آپ کو گھر واپس ہونے پر کمرے کے سامنے نظر آئیگی۔"

مسٹر فرینک شا کا چہرہ تمتمانے لگا "کچھ ہی کیوں نہ ہو میں یقین دلاتا ہوں کہ میں اس چیز کو خزانہ کی طرح رکھوں گا" اس نے نرمی سے کہا "کاش تم یہ تحفہ پیش نہ کرتیں! لیکن مجھے ایسا نہ کہنا چاہئے تمہاری اس عنایت کا میرے دل پر بیحد اثر ہوا ہے۔ کسی شخص کے لئے اس سے زیادہ اور کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ اس کو اس بات کا احساس ہو کہ بہت سے آدمی اس کے دوست ہیں۔"

"میرے خیال میں آپ سے کمپنی کا ہر ملازم محبت کرتا ہے" ڈیلیا نے کہا۔ منیجر نے لڑکی کی طرف دیکھا اُسکی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے لیکن وہ اپنے دلی جذبات لڑکی سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ لڑکی کے الفاظ نے اس پر اُس کے اندازے سے زیادہ اثر کیا، کیونکہ ان الفاظ میں ایسی سادگی

اور ایسا خلوص بھرا ہوا تھا جس نے منیجر کے تخیل میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اس کی زبان انتہا جذبات سے بے قابو تھی۔ لڑکی نے کہا "میں نے آپ کے باغ کے لیے گلاب کے دو پودے بھیجے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل آپ نے اپنی پھلواری دکھائی تھی اس میں فقط گلاب کے دو ہی پودوں کی کمی تھی۔ آپ کے مطالعہ کے کمرے کے سامنے تھوڑی جگہ تھی میں نے ان کو اس جگہ رکھنا مناسب تصور کیا۔ مجھے یقین ہے جس وقت آپ کھڑکی کے باہر دیکھیں گے تو آپ کو اسے دیکھ کر یاد آئے گا کہ یہ ہدیہ اس مہربانی اور عنایت کا ایک ادنیٰ صلہ ہے جو آپ نے ایک بیوہ اور اس کی بیٹی کے ساتھ کی ہے۔ یقین مانیے اماں جان بھی اسی قدر ممنون ہیں جس قدر میں۔ آپ نے ہمیں دنیا میں رہنے کے قابل بنا دیا۔ میں — میں آپ کی بےحد شکر گزار ہوں۔ بہرحال اس وقت آپ میرے جذبات اور احساسات پر غور کیجیے میرے طریق بیان اور الفاظ کا لحاظ نہ فرمائیے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

مسٹر فرینک شا کا بدن سن تھا۔ اس نے کھڑکی کے باہر دیکھنا شروع کیا۔

ڈیلیا اس کے حرکات زیر لب سے سمجھی کہ وہ گلاب کے پودوں کی قیمت کا اندازہ لگا رہا ہے لیکن اس کو نہیں معلوم تھا کہ اس تحفے سے منیجر کے دل پر کس قدر گہرا اثر ہوا۔

"آپ ناراض تو نہیں ہوئے؟" ڈیلیا نے دبی آواز سے کہا۔

منیجر یکایک گویا خواب سے چونک اٹھا اور لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک نے دوسرے کو ایک لمحہ بھر دیکھا۔ لمحہ بھر۔ لیکن ڈیلیا اس کے دل کی گہرائیوں میں پہنچ گئی۔

"گلاب؟" منیجر نے زیر لب کہا "کیا وہ تمہارا احترام کرتے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم" ڈیلیا نے معصومانہ انداز سے کہا۔ "اس کی فہرست تھی میرے خیال میں میں نے انھیں ایسے شخص کی خدمت میں پیش کیا ہے جو دنیا میں بہترین انسان ہے جس سے مجھے ملنا نصیب ہوا۔ میں — میرے پاس فقط یہی ایک چیز تھی جس کے متعلق میں خیال کر سکتی تھی کہ آپ پسند کریں گے۔ ورنہ آپ کے پاس کیا نہیں ہے۔ خدا نے آپ کو سب کچھ دیا ہے۔"

منیجر نے کہا "پیاری لڑکی۔ یہ بہترین تحفہ ہے جو مجھے اب تک ملا ہے —"

دروازہ پر آواز نے سلسلۂ گفتگو منقطع کر دیا۔ اس نے اٹھ کر رخصت ہوتے ہوئے اس سے درخواست کی کہ شام کا کھانا اسی کے ساتھ کھائے۔

"اور" اس نے جلدی سے کہا "مجھ کو امید ہے کہ آج شام کو تم اپنی والدہ کو بھی اپنے ساتھ ضرور لاؤ گی۔ کیونکہ اس وقت گلاب کے پودے مناسب مقام پر لگائے جا چکیں گے۔"

"میں ضرور آؤنگی" لڑکی نے آہستہ سے کہا۔
لڑکی کے جانے پر اس نے اپنے ہونے والے جانشین کو آواز دی "ہیرزن! اندر آؤ، کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟"
"جی ہاں" آنے والے نے کہا "میں تجوری کی کنجیاں لینے آیا تھا، میں نے خیال کیا کہیں ایسا نہ ہو آپ حسب عادت انھیں اپنے ساتھ ہی لئے جائیں۔ میں مخل تو نہیں ہوا"
منیجر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کنجیوں کا گچھا نکالا اور ہیرزن کو دیکر کہا "یہ لیجئے مسٹر ہیرزن! میں آپ کی اور کمپنی کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں، خدا کرے تمہارے زیر انتظام کمپنی خوب ترقی کرے۔ مجھے امید ہے کہ ایسا ہی ہو گا۔ مسٹر ہیرزن! میں تم سے دس سال سے واقف ہوں۔"
ہیرزن کا چہرہ اپنے دیرینہ اور تجربہ کار افسر کی تعریف سے تمتما اٹھا، اس نے احسامندانہ طور پر کہا، "میں خلوص دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، آپ نے کمپنی کے منتظمین کے سامنے میری تعریف فرماکر میری بیحد عزت افزائی فرمائی ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کمپنی کا منیجر ہونا میرے لئے کیسے فخر کی بات ہے۔"
مسٹر فرینک شا نے مسکرا کر کہا "ہیرزن تم اس کے اہل ہو، ضروری تھا کہ کمپنی کے منتظمین کو تمہاری اہلیت سے آگاہ کر دیا جاتا۔ شکریہ کی ضرورت نہیں، یہ میرا فرض تھا، اس وقت تمہیں جو روپیہ زائد ملے گا وہ وقت پر کام آئے گا جیسا لوگوں کے کام آتا ہے۔"
"نہیں اس سے زیادہ" ہیرزن نے جلدی سے کہا "میری بیوی، میری پیاری بیوی بیمار اور کمزور ہے میں بغیر روپیہ کے ڈاکٹر کے مشورہ پر عمل نہیں کر سکتا تھا، اب میں اسے مصر یا اٹلی بھیج سکوں گا۔ ایک سال بعد غالباً اس کا بھیجنا بیکار ہوتا۔ آپ کا استعفےٰ میرے لئے بیحد مفید ثابت ہوا، آپ کی سفارش نے مجھے تجارتی دنیا میں نہ صرف بلند مرتبہ دیا بلکہ اس کی بدولت میں پیاری بیوی کی زندگی وصحت کا سامان بھی مہیا کر سکوں گا۔ رخصت ہونے والے منیجر نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا "مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے۔"
اس کے چہرے پر یکایک غم واندوہ کے علامات ظاہر ہوئے لیکن اس کی طبعی مسکراہٹ نے پردہ کا کام کیا۔ اس نے دل میں خیال کیا کہ اس کی زندگی کی پینتالیس بہاریں گذر گئیں اور اس نے تجارتی بکھیڑے میں پھنسکر کبھی اپنی تنہائی کا احساس نہ کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب اسے محسوس ہوا کہ وہ بوڑھا ہو رہا ہے اور اس عمر میں وہ کسی عورت سے شادی کی درخواست نہیں کر سکتا۔ ۴۵ برس ہو گئے اور اس نے کبھی بچوں کے نرم نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لیے۔ ہیرزن اس سے عمر میں دس سال چھوٹا تھا اور زندگی

کالطف اٹھار ہا تھا حالانکہ وہ ۔ وہ جو اس کا افسر تھا فقط زندگی کے دن گذار رہا تھا۔"

"ہیریزن تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟"

"۵ سال"

"اُفوہ!" اس نے زیرلب کہا "تم نے اچھے سن میں شادی کرلی تھی۔ میری عمر کو پہنچکر انسان تنہائی محسوس کرنے لگتا ہے۔ مجھکو تمہاری خوش قسمتی پر رشک ہے۔ اچھا ہیریزن! خدا حافظ، کبھی کبھی مل لیا کرنا۔"

تھے مینجر کے جانے پر وہ دفتر سے باہر نکلا، ایک ٹیکسی کرایہ پرلی اور زیرلب کہنے لگا "ساسون کمپنی مجھے مینجری کے لئے بلارہی ہے۔ دوہزار پونڈ سالانہ ـــ دوہزار ـــ مجھے یقین ہے کہ دس میں نو آدمی ضرور راضی ہوجائیں گے۔ لیکن ـــ لیکن مجھے آزادی کی ضرورت ہے۔"

اس کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ جھلکنے لگی، جب اُسے ڈیلیا کا معصوم چہرہ یاد آیا۔ اُس نے ہیریزن کو کوسنا شروع کیا، اس کمبخت کے آجانے سے ڈیلیا سے وہ سوالات نہ کرسکا جو اس کے لبوں پر تھرتھرا کر رہ گئے تھے۔ اس کی نظروں کے سامنے ڈیلیا کی محبت خیز نظریں پھر گئیں، اس نے دل میں کہا "کیا ڈیلیا مجھ سے محبت کریگی؟ کیا وہ اپنے ۲۲ سال کے مقابلہ میں میری عمر کے پینتالیس سال بہت زیادہ خیال کرے گی؟"

"خیر کچھ بھی ہو" اس نے آہستہ سے کہا "آج شام کو میں اس سے ضرور سوال کرونگا۔ اس کا جواب مسرت بخش ہوتا ہے یا مایوسی انگیز؟"

اس منصوبے کے ساتھ وہ اپنے گھر پہونچا اور سگریٹ سلگا کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا جہاں ایک میز دو کرسیاں اور لکھنے کا سامان رکھا تھا۔ اس نے ساسون کمپنی کا خط نکال کر پڑھا اور اپنی پیشانی دو انگلیوں کے سہارے رکھکر کسی گہرے خیال میں مستغرق ہوگیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ یکایک چونک اُٹھا اور کہنے لگا "نہیں نہیں مجھے منظور کرلینا چاہیئے۔ کونسی چیز اس سے مانع ہے؟ مگر ـــ ڈیلیا؟ ہاں ڈیلیا؟ کیا وہ مجھے قبول کرے گی؟" یہ الفاظ کہتے کہتے وہ یکایک ایک آواز سے چونک پڑا۔ اُس نے پیچھے مڑکر جیمس براؤن کو دیکھا جو سلام کرکے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کہئے آج آپ کی آزادی کا پہلا دن ہے۔ مجھے آپ کی حالت پر رشک ہے۔" اس نے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔

"رشک! کس لئے؟" مسٹر فرینک شا نے کہا۔

"اس لئے کہ آپ کے پاس روپیہ ہے۔ اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں فوراً الیسٹرن فلم کمپنی کا آڈر

لے لیتا اور اس لڑکی سے شادی کرتا جس سے مجھے دلی محبت ہے"

"آپ کو کس قدر روپیہ کی ضرورت ہے؟"

"مگر میں آپ سے لینا نہیں چاہتا"

"میرا یہ مطلب نہ تھا میں فقط معلوم کرنا چاہتا تھا"

"ایک کثیر رقم لیکن آپکے لئے معمولی" آنے والے نے کہا۔

"کیا میں تمہاری محبوبہ کا نام معلوم کر سکتا ہوں؟" مسٹر فرینک شا نے مسکرا کر کہا۔

"ڈیلیا کلفورڈ"

منیجر پر ان الفاظ نے بجلی کا سا اثر کیا، اس کا بدن سن ہو گیا، اس نے دل ہی دل میں کہا" ڈیلیا میری روح، میری جان۔ جمیس میں کونسی ایسی چیز ہے جو ڈیلیا کو اس طرف متوجہ کر سکتی ہے یں عمر رسیدہ ہوں اور جمیس کم عمر۔ نوجوان عورت جوان ہی کو دل دیتی ہے، پھر کیا تعجب ہے اگر ڈیلیا کو جمیس سے محبت ہو"

"کیا ڈیلیا کو تم سے محبت ہے؟" اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں، کیا میں ایسا بیوقوف ہوں، آج مجھے دس ہزار پونڈ قرض دیدو میں تین روز کے اندر اس سے شادی کر کے دکھا دونگا"

"میں عورتوں کیلئے شرط لگانا پسند نہیں کرتا، روپیہ کے متعلق میں غور کر کے جمعرات کو جواب دونگا، اس وقت مجھے چند ضروری خط بھیجنے ہیں، برا نہ ماننا اس وقت بیحد مصروف ہوں"

جمیس مصافحہ کر کے روانہ ہو گیا۔ راستہ میں اس نے دل ہی دل میں کہنا شروع کیا" بیوقوف ہے اسے معلوم نہیں کہ جس کمپنی کا میں نے ذکر کیا ٹوٹنے کے قریب ہے"

فرینک شا نے ساسون کمپنی کا خط اٹھا کر پھر پڑھا اور کہا" مجھے یہ ملازمت ضرور قبول کر لینی چاہیئے" اس نے جیب سے چاک بک نکال کر جمیس براؤن کے نام دس ہزار پونڈ کی رقم خطیر لکھدی۔ یہ اس کی بیس سال کی کمائی تھی۔

"کاش ساسون کمپنی" اس نے زیر لب کہا" بجائے چھ ہفتہ بعد کے مجھے آج ہی بلا لیتی، میں نصف تنخواہ پر چلا جاتا، مجھے کام چاہیئے کام" گذشتہ ہفتہ تم کو اس وقت کا انتظار تھا کہ آزادی سے اپنے باغیچے میں چہل قدمی کیجائے ایک آواز نے آہستہ سے کہا" مجھے ہے۔ کہ آپ اپنے خیال پر قائم ہیں"

مسٹر فرینک شا لکھنے میں اس قدر مصروف تھا کہ اسے ڈیلیا کے گھاس پر چلنے کی آواز نہ معلوم ہوئی اس نے سٹ پٹا کر پیچھے دیکھا اور کہا" ہاں میرا یہی خیال تھا اور میں اب یہ عمل کرتا مگر کام مجھے اپنی طرف

نچ رہا ہے۔ میں بیکاری کی سستی محسوس کر رہا ہوں

"امّاں جان پیچھے آ رہی ہیں، میں گلاب بونے کے لئے دس منٹ قبل ہی آجاتی لیکن راستہ میں ٹرجیمس سے ملاقات ہوگئی۔" ڈیلیا نے کہا۔

"ہاں وہ خوبصورت آدمی ہے۔"

"میرے خیال میں وہ نہایت مکّار، بیوقوف اور دغاباز ہے۔ جسے میں نے اپنی زندگی میں دیکھا ہے" ڈیلیا نے جوش سے کہا۔

مسٹر فرینک شا کے بدن میں ایک برقی لہر دوڑ گئی، اس نے کہا "کیا۔۔کیا ۔ تمکو ۔۔۔ میس کو پسند نہیں کرتیں۔"

"مجکو افسوس ہے، مجکو یاد نہ تھا کہ وہ آپ کے دوست ہیں۔" ڈیلیا نے کہا۔

"کوئی بات نہیں، میں فقط تمہاری رائے دریافت کرنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں اس سے ت ہے۔ بیکاری میں ایسے ہی خیالات پیدا ہوتے ہیں۔"

"میرے خیال میں وہ سخت کوڑ مغز ہے۔ مجھے معاف کیجئے میں نے اس کے لئے بہت سخت الفاظ عمال کئے ہیں۔"

مسٹر شا نے خط اور چیک اٹھا کر چاک کر ڈالا۔

"مس کلفورڈ! کیا آپ میرے ساتھ شادی کرنا منظور کرینگی؟" اس نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

ڈیلیا کا چہرہ سرخ ہوگیا، مردنی چھائی اور پھر سرخی دوڑ گئی۔

"مجکو یہ تجویز اس سے بہتر الفاظ میں پیش کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن میری تمام عمر راست روی میں گذری مجھ میں کوئی خوبی نہیں جو میری سفارش کرسکے۔ میں عمر رسیدہ ہوں، بدصورت ہوں۔ تم حسین ہو، ن ہو، میرے پاس کوئی چیز نہیں جو تم کو میری زندگی کے ساتھ وابستہ کرسکے۔ سوا ۔۔۔ سو میرے کے ۔ ڈیلیا وہ تمہارے لئے حاضر ہے ۔۔۔ خون کا ہر قطرہ جو میری رگوں میں دوڑ رہا ہے تمہاری ت کے لئے حاضر ہے بشرطیکہ وہ تمہارے کام آسکے۔"

"اگر میرے کام آسکے" ڈیلیا کی آنکھوں سے آنسو نکلکر اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ اس نے اس سے بہتر اور کونسی شے ہوسکتی ہے جس کو ایک عورت پسند کرے اور ترجیح دے۔ میرے ے! اس سے بہتر اور کونسا تحفہ ہوسکتا ہے جو تم مجھے دے سکتے ہو۔ یہ بہتر سے بہتر ہے میں نے دعائیں مانگی ہیں کہ تم مجھ سے محبت کرو۔ اور ۔۔۔ اور"

دو جسم آگے بڑھے اور دو دل ہم آغوش ہوگئے۔

سوئیٹ روس اور اُس کا مستقبل

(از مسٹر منوہر لال طالب بی۔اے (آنرز) ایل ایل۔بی۔ چکوال)

سوئٹ روس کی حکومت دنیا کی دیگر حکومتوں سے بالکل مختلف اصولوں پر مبنی ہے۔اس کی ترکیب اور نظام علحدہ ہیں۔اہل روس کی مالی و ملکی حالت،فلاح و بہبود،اور خیالات و اصول کا دنیا کے دیگر ممالک سے کوئی تعلق نہیں بلکہ سچ پوچھیے تو دونوں ایک دوسرے سے متضاد ہیں اسلیئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت دنیا میں روس کی حالت سب سے نرالی ہے جہاں باقی دنیا کے نشیب و فراز اور سرد و گرم کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔جہاں قدیم اقتصادی اصولوں کی لغویت عیاں ہو رہی ہے۔جہاں خزاں کے تمام راستے مسدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۹۱۷ء سے پہلے روس میں زار کی شخصی حکومت تھی،جمہور کی طاقت صفر سے بھی کم تھی اور آبادی جاہل اور مفلوک الحال تھی۔زار روس مطلق العنان بادشاہ تھا،اس کا حکم اپیل و دلیل سے بے نیاز تھا۔بیسویں صدی میں دنیا کا کوئی بادشاہ ایسا خودسر اور مطلق العنان نہ تھا۔بہرحال پہلے بھی روس ایک عجیب ملک تھا اور اب بھی یگانۂ روزگار ہے۔

ہم نے اس سے پہلے مضمون میں دکھایا ہے کہ موجودہ ہندوستان اور زار کے عہد میں روس سے کس قدر مشابہت ہے۔رقبے کی وسعت،آبادی کی کثرت،عوام کی جہالت،جمہور کی غلامی یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے روس اور ہندوستان کی مشابہت ثابت ہوتی ہے۔ہندوستان کے حق میں ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ ایک مستاجر مہذب قوم کے زیرِ سایہ ہے جس کی روایات جمہور کی آزادی سے وابستہ ہیں جو حکمران طاقت کی مطلق العنانی کے منافی ہیں،لیکن روس ایک جابر مطلق العنان زار کا ماتحت تھا۔ہمارے مایۂ ناز حکمران ایک سو ساٹھ سال میں اپنی غربا پروری اور تہذیب گستری کے باوجود نہ ہندوستانیوں کو پہلے سے زیادہ خوشحال بنا سکے اور نہ یہاں کی جہالت دُور کر سکے۔

سوئٹ روس کی کہانی ہی جدا ہے۔وہاں عوام کی حکومت ہے جس کو ہر وقت عام باشندوں کا مفاد مد نظر رکھنا پڑتا ہے چنانچہ سرکاری محاصل سے زیادہ سے زیادہ رقم فلاح عامہ کے محکمات پر خرچ کیجاتی ہے

وہاں نہ سرمایہ داروں کی حکومت ہے اور نہ حکومت سرمایہ دار ہے، تمام دولت مشترکہ ہے۔ اس لئے اخراجات کے بعد جو کچھ بچتا ہے حکومت کی ملکیت ہے۔ سرمایہ دار اسے اکٹھا کر کے بند نہیں کر سکتے۔ اس پر جوا نہیں کھیلا جا سکتا۔ اور اس لئے غربا کو کمانے اور محنت ہی کے کام پر مامور نہیں کیا جاتا۔

ایک بات اور قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ باشندگان سوئٹ روس کو بلا لحاظ مذہب و ملت و قومیت یکساں پولیٹیکل حقوق حاصل ہیں۔ تعلیم و تدریس میں بھی فرقہ وارانہ اصول کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ہر ایک باشندہ خواہ مرد ہو یا عورت تعلیم و تربیت کا مساوی طور پر حقدار ہے اس لیے نہ عورتوں اور مردوں کے حقوق کے جھگڑے ہیں نہ مختلف فرقہ وارانہ جماعتوں کے قضیئے اور نہ مزدور اور سرمایہ داروں میں کوئی کشمکش پولیٹیکل ایجی ٹیشن کا بھی نام و نشان نہیں ہے۔ ہر شخص کو مساوی حقوق اور کامل آزادی حاصل ہے۔

سوئٹ روس نے ایک بات کو خاص طور پر محسوس کیا ہے، اور وہ یہ کہ نہ صرف تعلیم و تدریس سے انسان کے خیالات بدل دیے جائیں بلکہ خود انسان کو تبدیل کر دیا جائے کیونکہ خیالات میں تغیر رونما ہو جاتا ہے اور اس لئے صرف اسی پر کوئی مستقل بھروسا نہیں کیا جا سکتا ہے۔

انسانی فطرت میں خود غرضی بُری طرح جاگزیں ہے۔ سوئٹ روس نے اسے ایک حد تک خارج کرنے کی کوشش کی ہے اس نے بالکل نئے اصولوں پر ایک وسیع اقتصادی اور پولیٹیکل تجربہ کیا ہے جو فی الحال تو کامیاب نظر آتا ہے۔ باقی دنیا کے مدبر آغاز ہی سے اس کے لئے تاریک مستقبل کی پیشگوئی کرتے رہے ہیں مگر یہ ابھی تک تو غلط ثابت ہوئی ہیں آئندہ کا خدا حافظ ہے، بہرکیف روس اس وقت ایک عظیم الشان تجربہ کر رہا ہے۔ اگر وہ چند سال اسی طرح شاہراہ ترقی پر گامزن رہا اور دوسرے ممالک کی ناگفتہ بہ اقتصادی حالت کے مقابلے سے فارغ البالی اور خوشحالی نصیب ہوئی تو اس کے اصول از خود تمام دنیا میں مقبول ہو جائیں گے۔ بہرحال اس وقت روس دنیا کے سامنے ایک نیا راستہ پیش کر رہا ہے جو پرانے اقتصادی اور پولیٹیکل اصولوں اور کہنہ رسم و رواج کو آئندہ کے لئے ناقابل عمل ثابت کر رہا ہے۔ خدا جانے اُسے کامیابی ہوگی یا نہیں، مگر اس کی کوشش نئی قسم کی اور ارادہ نیک ہے اور یہ بات کہ اس کے اصول درست ہیں یا غلط، مستقبل کے ہاتھ میں ہے اور تاوقتیکہ ان اصولوں کا کافی تجربہ ہو جائے کوئی شخص وثوق سے ان کی درستی اور تقلید کی تلقین نہیں کر سکتا۔

مندرجہ اعداد و شمار سے روس کی ترقی کا اندازہ بخوبی لگ سکتا ہے:۔

سال	پیداوار مصنوعات وغیرہ	تناسب
۱۹۱۳	۲۰،۴۰۰،۰۰۰،۰۰۰ روبل	۱۰۰٫۰

	پیداوار مصنوعات وغیرہ		تناسب
۱۹۱۳	۱۹٫۷۹۰،۰۰۰،۰۰۰	روبل	۹۸٫۸
۱۹۱۷	۱۷٫۱۰۰،۰۰۰،۰۰۰	"	۸۵٫۳
۱۹۲۰-۲۱	۹٫۵۰۰،۰۰۰،۰۰۰	"	۴۷٫۴
۱۹۲۴-۲۵	۱۵٫۴۰۰،۰۰۰،۰۰۰	"	۷۶٫۸
۱۹۲۵-۲۶	۱۹٫۳۴۰،۰۰۰،۰۰۰	"	۹۶٫۵
۱۹۲۶-۲۷	۲۱٫۱۳۰،۰۰۰،۰۰۰	"	۱۰۵٫۴
۱۹۲۷-۲۸	۲۲٫۳۴۰،۰۰۰،۰۰۰	"	۱۱۵٫۵
۱۹۲۸-۲۹	۲۴٫۲۵۰،۰۰۰،۰۰۰	"	۱۲۱٫۰

سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں روس زار کے ماتحت تھا سنہ ۱۹۱۷ء میں روس کا انقلاب عظیم ہوا اور پیداوار وغیرہ میں کمی ہوئی۔ انقلاب عظیم کے اثرات سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء تک ظاہر ہیں۔ اس کے بعد سوئیٹ حکومت کے تحت میں ملک کی ترقی شروع ہوئی اور یہ بتدریج جاری ہے۔ سوئیٹ کا مشہور ترمال پنجسالہ پروگرام ایک مکمل اقتصادی پروگرام ہے جو اس وقت اعداد و شمار سے تو روس کے لئے فیض رساں ثابت ہو رہا ہے اس پروگرام میں دو باتوں پر خاص طور پر زور دیا جا رہا ہے۔ سوئیٹ گورنمنٹ کی پہلی کوشش تو یہ ہے کہ سوئٹ روس میں برقی طاقت بافراط دستیاب ہو تاکہ مصنوعات و زراعت وغیرہ وسیع ترین پیمانہ پر اور کم سے کم صرف زر کے ساتھ ہو یعنی چیزیں سستی بنیں اور سستی بکیں۔ دوسری بڑی بھاری کوشش اجتماعی یا سوشلسٹ خیالات کو عملی جامہ پہنا کر اصول اشتراکیت کی توسیع و ترقی مقصود ہے برقی طاقت کے متعلق مندرجہ ذیل اعداد خالی از دلچسپی نہ ہونگے۔

۱۹۱۳	۱۹۴۵،۰۰۰،۰۰۰	کلوواٹ	۱۰۰٫۰ تناسب
۱۹۲۷-۲۸	۵۰۵۰،۰۰۰،۰۰۰	"	۲۵۹٫۶
۱۹۲۸-۲۹	۶۶۰۰،۰۰۰،۰۰۰	"	۳۳۹٫۳

اس پروگرام کی تکمیل میں چند ہی سال میں سہ چند سے بھی زیادہ برقی طاقت موجودہ روس کو ملنے لگی ہے، جس کا اثر تمام ملکی مصنوعات پر بہت ہی خاطر خواہ ہوا۔ چنانچہ ان میں بھی معتدبہ ترقی ہوئی اعداد ملاحظہ ہوں:-

سال	کوئلہ ٹن	کھانڈ ٹن	تیل ٹن	زراعتی مشینری روبل
۱۹۱۳	۲۸،۹(۰۰۰،۰۰۰)	۱۲۹۰(۰۰۰)	۹،۳(۰۰۰،۰۰۰)	۶۷،۰۰۰،۰۰۰
۱۹۲۷-۲۸	۳۵،۴(״)	۱۳۴۰(״)	۱۱،۶(״)	۱۲۵،۰۰۰،۰۰۰
۱۹۲۸-۲۹	۴۱،۱(״)	۱۳۴۰(״)	۱۳،۲(״)	۱۹۲،۰۰۰،۰۰۰

سال	سوتی کپڑا	انجن ہارس پاور	گرم کپڑا
۱۹۱۳	۲۲۵۰(۰۰۰،۰۰۰)	۲۶،۵(۰۰۰)	۹۵
۱۹۲۷-۲۸	۲۷۴۲(״)	۱۰۶،۹(״)	۹۷
۱۹۲۸-۲۹	۲۹۷۰(״)	۱۵۰،۰(״)	۱۰۵

اصول اشتراکیت ذاتی ملکیت کے خیال کے منافی ہے۔ ہم لوگ صدیوں سے ذاتی ملکیت کے اصول کے پابند چلے آئے ہیں۔ روسی بھی صدیوں سے اس اصول کے ماتحت زندگی بسر کرتے چلے آ رہے تھے اس لئے ان کے دماغ میں اس نئے اصول کے لئے جگہ بنانا ایک نہایت لطیف اور مشکل کام تھا مگر اس مشکل کو تین طریقوں پر حل کیا گیا ہے:-

(۱) وضع قوانین۔

(۲) تعلیم

(۳) عملی درسگاہیں۔

نئے قوانین اصول اشتراکیت کی بنا پر بنائے جاتے ہیں۔ مگر صرف مجلس وضع قوانین کا قانون پاس کرنا بے فائدہ ہے۔ جب تک لوگوں کو تعلیم و تدریس کے ذریعہ اس کے بنیادی اصولوں سے واقف اور مانوس نہ بنایا جائے۔ قانون اور تعلیم بھی مل کر مکمل نہیں ہو سکتے جب تک عملی شکل میں انھیں مفید و مقبول نہ بنایا جائے۔ اور لوگ ان پر عمل پیرا ہو کر ان کے فوائد سے واقف نہ ہو جائیں۔ اس لئے روس کے مدبروں نے ان تینوں طریقوں پر عمل درآمد شروع کر دیا ہے۔

کیا مستقبل میں بقیہ دنیا بھی سوئیٹ روس کے اصول اشتراکیت کو قبول کرے گی۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ابھی نہیں دیا جا سکتا پرانے تعصبات بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ پرانے خیالات دل کی گہرائیوں میں چھپے رہتے ہیں۔ خود غرض اور وہ پوچھ لوگ ہر انقلاب کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہتے ہیں۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کو مد نظر رکھ کر فی الحال اس سوال کا دو ٹوک جواب دینا ناممکن ہے۔ البتہ آئندہ تیس چالیس سال کے عرصہ میں اس کا کافی امتحان ہو جائے گا۔

کھوٹی اٹھنّی

(از مسٹر جے کرشن ورما)

ایک مرتبہ کہیں سے میرے پاس ایک خراب اٹھنّی آ گئی، مَیں نے اُسے خزانے میں تبدیل کرنے کی کوشش کی، لیکن خزانچی صاحب غضب کے مقنّن تھے، اُنھوں نے اُسے نہ لیا۔ کئی دنوں تک وہ میرے پاس یوں ہی پڑی رہی۔ ایک روز شام کو مَیں نے اُسے چلانے کا ارادہ کیا۔

جب چراغ جل گئے تو میں ایک پان والے کی دوکان پر پہونچا اور بے پروائی سے بولا "بھئی ایک ڈھولی پان دیدو"

پان والے نے فوراً اچھے پانوں کی ایک ڈھولی میرے ہاتھ پر رکھدی، مین نے پھر اُسی بے پروائی سے اٹھنّی اس کے سامنے پھینک دی۔

تمبولی نے اپنی صندوقچی سے باقی پیسے نکال کر میرے ہاتھ میں دیدیئے، میں بڑا خوش ہوا۔ لیکن میری یہ خوشی دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ تمبولی نے اُسے گھما گھما کر دیکھنا شروع کیا۔ اُس وقت اُس کی نظروں سے کچھ شبہ ظاہر ہو رہا تھا۔ میرے دل پر ایک خوف سا طاری ہو گیا، پھر اُس نے اٹھنّی کو اُنگلیوں پر رکھکر بجایا، اٹھنّی کھوٹی تھی اُس میں اچھی آواز نہ آئی۔ پان والے نے فوراً اُسے میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "بابو جی، یہ نہ چلے گی، دوسری دیدیجئے"۔ اُس وقت میری نگاہوں سے مایوسی جھلکنے لگی مین نے بظاہر بے پروائی دکھاتے ہوئے کہا "اچھی بات ہے اسے نہ کو میں ابھی پیسے لیکر آیا" یہ کہکر میں نے پانوں کی ڈھولی اس کے سامنے رکھدی۔ اُس نے کہا "بابو جی پان لیتے جائیے پیسے پھر مل جائیں گے"، لیکن میں وہاں نہ رُکا، واپس ہوتے ہوئے میں نے کہا۔ "نہیں ابھی رہنے دو میں پھر لے جاؤں گا"

اس جگہ سے نا امید ہو کر میں ایک حلوائی کی دوکان پر پہونچا اور اُس سے بولا:-

"پاؤ بھر بالائی دینا جی"

حلوائی برابر دیں یا لائی کا دونا رکھ کر بولنے لگا۔

میں نے اس مرتبہ اٹھنی اس کے سامنے پھینکی نہیں کہ مبادا حلوائی اس کی آواز سنکر مشتبہ ہو جائے بلکہ اس کے ہاتھ میں رکھدی، وہ اُسے دوکان میں لٹکے ہوئے لیمپ کی روشنی میں دیکھنے لگا۔ پھر بولا "بابوجی، پیسے دے دیجئے، یہ اٹھنی تو خراب معلوم ہوتی ہے۔"

میں نے ذرا بناوٹی ہنسی ہنسکر کہا "ارے بھائی اس میں کیا خرابی ہے؟"

حلوائی "نہیں بابوجی یہ ہم سے کوئی نہ لے گا، آپ بڑے آدمی ہیں اسے سیکڑوں جگہ چلا سکتے ہیں"

"ارے تو سمجھ لو کہ اُن سیکڑوں جگہوں میں یہ بھی ایک جگہ ہے۔" میں نے ہنسکر کہا

"پھر کیا ہوا بابوجی یہ اٹھنی میں نہ لونگا۔"

غرض حلوائی نے بھی اٹھنی نہ لی۔ مجبوراً مجھے بالائی واپس کرنی پڑی۔ وہاں بھی میری ڈال نہ گلی۔ اس کے بعد میں چند اور دوکانوں پر گیا۔ لیکن سب جگہ ناامیدی ہی کا منہ دیکھنا پڑا۔

یکایک میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ میں پھڑک اُٹھا اور خوش خوش بازار کے سرے والی تمبولن کی دوکان پر گیا۔ یہ تمبولن بہت ضعیف تھی۔ بیچاری کو رات میں کم دکھائی دیتا تھا۔ چوک کی آراستہ دوکانوں کو چھوڑکر اس کے یہاں بہت کم لوگ جاتے تھے۔ اس کی دوکان پر وہی لوگ زیادہ تر پان خریدتے جنھیں دھیلے پیسے کا سودا کرنا ہوتا۔ ایسے لوگ اکثر۔ بلا تکلف اس کے یہاں سے اُدھار بھی لے جاتے۔ دوکان میں دو تین ٹوٹے ٹوکرے رکھے رہتے۔ مٹی کے تیل کا ایک چراغ اُس کو روشن کئے رہتا۔

میں اُس کی دوکان پر گیا اور اس سے بولا "مجھے ایک آنہ کے پان دیدو۔"

تمبولن "اچھا بھیا" کہکر پان شمار کرنے لگی شمار کرنے کے بعد اُس نے پان مجھے دیدئے۔

میں نے اٹھنی اُسے دیدی۔ اُس نے اور دوکانداروں کی طرح اس کی جانچ نہیں کی۔ بلکہ دھوتی کے ایک کنارے کی گرہ کھول کر ایک ایک پیسہ شمار کرکے اس نے بقیہ پیسے میرے حوالے کئے میں پیسے لیکر وہاں سے چلدیا۔ لیکن اس مرتبہ میرا دل خوش نہ تھا۔

رات کو جب میں سونے لگا تو مجھے نیند نہ آئی۔ مجھے ایک روحانی اذیت محسوس ہو رہی تھی میرا دل بار بار مجھے نفریں کر رہا تھا اور اس سے مجھے ایک قسم کی مہیب آواز نکلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی تو نے بیچاری غریب کو دھوکا دیا۔ ہر چند میں نے طبیعت بہلانے کی کوشش کی۔ لیمپ کی روشنی تیز کرکے ناول پڑھنے لگا۔ لیکن اس میں بھی میرا جی نہ لگا۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آس

بوڑھی تمبولن کی صورت آجاتی تھی۔ میرے دل میں آیا کہ اسی وقت چلکر اُس کے پیسے واپس کر آؤں لیکن پھر خیالات نے ایک عارضی پہلو بدلا "میں بھی کیسا احمق ہوں، بھلا کیا وہ میرے واسطے دوکان کھولے بیٹھی ہوگی، پھر بیٹھی بھی ہو، میں نے اُسے اٹھنّی کچھ چھپا کر تو دی نہیں، اُس نے اور دوکانداروں کی طرح اس کی جانچ کیوں نہ کی۔ مانا کہ وہ خود دیکھنے سے معذور تھی، پھر بھی اس نے اسے اپنے پڑوسی دوکاندار کو کیوں نہ دکھلا لیا۔ یہ اُس کی غلطی ہے، اس میں میرا کیا قصور؟" لیکن ان خیالات سے تسکین نہ ہوئی۔ دل میں ایک کانٹا سا چبھنے لگا، میں نے اُسے دیدہ و دانستہ دھوکا دیا، میں بیتابی کی حالت میں اُٹھکر ٹہلنے لگا۔ چاہتا تھا کہ کسی طرح صبح ہوجائے تو میں اُس کے پیسے واپس کر آؤں اور اٹھنّی لے آؤں۔ اضطراب کی حالت میں ٹہلتے ٹہلتے مجھ پر کچھ غنودگی چھاگئی اور بستر پر جاکر سوگیا۔

میں نے دیکھا کہ وہی تمبولن دوکان پر بیٹھی رو رہی ہے، چاروں طرف آدمیوں کی بھیڑ لگی ہے۔ بڑھیا رو رو کر کہہ رہی ہے "جس نے میرے ساتھ کپٹ کیا ہے اُسے بھگوان سزا دیں گے" لوگ اُسے سمجھاتے ہیں لیکن اس غریب کے آنسو نہیں تھمتے، میں مجمع میں ایک جگہ چھپا کھڑا ہوں، میری ہمت اس کے سامنے جانے کی نہیں پڑتی، یکایک نہ معلوم کیسے اُس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی، مجھے دیکھتے ہی وہ اور ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ میں عجیب پریشانی کی حالت میں نیچی نگاہیں کئے کھڑا تھا۔

اُس پریشانی کی حالت میں میری آنکھ کھل گئی، میری سانس زور زور سے چل رہی تھی بدن پسینے سے تر تھا، میں اُٹھا اور لیمپ کی روشنی تیز کرکے گھڑی دیکھی، چار بجے تھے، میری جان میں جان آئی۔

صبح ہوتے ہی میں اُسی تمبولن کی دوکان پر گیا، وہ دوکان صاف کر رہی تھی، مجھے دیکھکر اُس نے تعجب سے پوچھا "کہو بھیا اتنے سویرے کیسے آئے؟" میں نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا "میں کل رات تمہیں ایک خراب اٹھنّی دے گیا تھا اُسے واپس لیکر تمہیں پیسے دینے آیا ہوں۔"

اُس نے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر ذرا عاجزانہ لہجے میں بولی "بھیّا میں نے تو اُسے دیکھا تک نہیں۔"

"نہیں وہ اٹھنّی کھوٹی ہے، یہ لو اپنے پیسے۔" یہ کہکر میں نے نو آنے پیسے اُسکے پان کے تختے پر رکھ دیئے، اُس نے مجھے اٹھنّی واپس کر دی، میں مکان واپس آیا، اس وقت میرا دل ایسا خوش تھا گویا مجھے کوئی بڑی فتح حاصل ہوئی ہو۔

تنقید کتب

جنگنامہ عالم علی خاں

مرتبۂ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے۔
پبلشرز:۔ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

یہ مسلسل نظم نواب آصف جاہ نظام الملک و عالم علی خاں صوبیدار دکن کے حالات جنگ پر مشتمل ہے شروع میں مرتب کا ایک مختصر سا مقدمہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جنگ کے اسباب کیا تھے اور اس میں کن کن سرداروں نے شرکت کی اور کہاں معرکہ ہوا۔ اسی مقدمہ میں اس اشتباہ کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کتاب کا مصنف کوئی پنجابی شاعر ہے۔ نظم تاریخی حیثیت رکھتی ہے اور اکثر ان باتوں پر روشنی پڑتی ہے جن کی تلاش و تحقیق میں بہت دقت و پریشانی ہوتی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کا مقصد قدیم اُردو کی حالت کا اندازہ اور اس کا تحفظ ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو نے اب تک کتنی ترقی کی ہے۔ زبان پرانی دکنی اردو ہونے کی وجہ سے بیشتر مقامات پر سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو متروک ہوگئے ہیں بہت سے ایسے ہیں جو کبھی سننے میں نہیں آتے۔ ہماری رائے میں ایسی تمام کتابوں میں غیر مانوس و متروک الفاظ کی فرہنگ ضرور شامل ہونا چاہیئے۔ امید ہے کہ آئندہ کارکنانِ انجمن اس طرف توجہ فرمائیں گے۔ کتاب ٹائپ میں شائع کی گئی ہے۔ حجم ۹۰ صفحات مجلد قیمت ۱۲ ہے۔

شمیم

مصنفہ فیاض علی صاحب بی۔ اے علیگ۔
پبلشرز:۔ صدیق بک ڈپو، لکھنؤ

اُردو میں قریب قریب جتنے ناول شائع ہوتے ہیں وہ عموماً بازاری ہوتے ہیں نہ اُن کی کتابت کی طرف توجہ کی جاتی ہے اور نہ کاغذ ہی کا خیال کیا جاتا ہے اور نہ کوئی جدت و دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے اس میدان میں جس اولوالعزمی سے قدم بڑھایا ہے اس کی زندہ مثال

"شمیم" کی اشاعت ہے۔ ناول کی کتابت، طباعت، کاغذ وغیرہ دیدہ زیب ہے اور چند رنگین تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں جو خاص طور پر اس ناول کے لئے بنوائی گئی ہیں۔ مصنف نے بھی عمومیت سے گریز کرنے کی کوشش کی ہے گو اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی تاہم عام ناولوں سے کہیں بہتر ہے۔

دوران قصہ میں محبت کے فلسفے سے دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ ایک جگہ مذہب کا سوال پیدا ہو گیا ہے جس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اکثر مقامات پر ظرافت نگاری کی کوشش کی گئی ہے لیکن ہم کو افسوس ہے کہ اس سلسلے میں بعض خلاف تہذیب الفاظ اور فقرے بھی استعمال ہو گئے ہیں، مثلاً:-

"اُن کی ماں طلال خورن تھیں اور سب پر حلال تھیں"

"تمہارے ارسطو کی ایسی تیسی" وغیرہ

کہیں کہیں زبان کی بھی غلطیاں رہ گئی ہیں۔

پلاٹ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ "فسانۂ آزاد" کو سامنے رکھا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت آزاد کی طرح اس افسانے کے ہیرو مسٹر شمیم بھی ٹرکی کی جنگ میں شامل ہونے کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ آزاد ابتدائے عشق میں روانہ ہوئے اور شمیم مراحل عشق طے کرنے کے بعد۔ فسانۂ آزاد جس زمانہ میں لکھا گیا تھا اُس وقت کے لئے یہ باتیں موزوں تھیں اب ان کی ضرورت نہیں۔

بہر حال یہ ناول بہت ضخیم ہے اور ۵۰۰ صفحات پر ختم ہوا ہے، اس کے دو حصے ہیں اور دونوں کی یکجائی جلد بندی ہوئی ہے ہر دو حصص کی مجموعی قیمت للعہ ہے۔

مرتبہ خواجہ محمد عبدالحی فاروقی

خلفائے اربعہ

پبلشرز:- مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

اسلام کے خلفائے اربعہ کی زندگی، اُن کے اخلاق و عادات، طریق کار، سیاست اور تمدن کا نظام، مذہبی معرکہ آرائیاں رحم و انصاف وغیرہ وغیرہ صفات کا دلکش اور پر اثر تذکرہ ہے۔ ان واقعات کو جن کے معلوم کرنے کے لئے بڑی بڑی ضخیم تاریخیں دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے نہایت صاف ستھرے پیرایہ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ جامعہ ملیہ کی کتابیں کتابت و طباعت میں کیسی ہوتی ہیں اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں خریدئیے اور پڑھئے۔ حجم ۱۴۷ صفحات، قیمت ۱۰

تفویض

مصنفہ میرزا اعظم بیگ چغتائی۔ جودھ پور۔

مصنف نے مزاحیہ رنگ میں مسئلۂ طلاق پر اپنے نقطۂ نظر سے بحث کی ہے، اور دکھایا ہے کہ اس کے غلط رواج نے عورتوں کو زندہ در گور کر دیا ہے پلاٹ کو "مضحک" بنانے کے لئے چغتائی صاحب نے خود

۔۔زنانہ لباس زیب تن فرمایا ہے بحث بہت کچھ معقول ہے مگر جس پیرایہ میں کی گئی ہے شاید بعض احباب اس کو مستحسن نہ سمجھیں۔ چھوٹی تقطیع حجم ۸۰ صفحات قیمت ۵ر

ہمارا دین

مؤلفہ سید نواب علی رضوی ایم۔اے۔
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی

مذہبی کتاب ہے۔ ارکان اسلام کو مختصر اور جامع طریقہ سے عام فہم اور سلیس اردو میں لکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ حجم ۲۴ صفحات، قیمت ۲ر

نبیوں کے قصے

مرتبہ خواجہ محمد عبدالحی فاروقی۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی۔

نبیوں کے پیش آمدہ واقعات، اُن کے اخلاق و تعلیمات، عوام کو گمراہی سے بچانے کی کوششوں کا حال دلچسپ اور عام فہم پیرایہ میں تحریر کیا گیا ہے۔ کتاب اسلامی نصاب تعلیم میں داخل کرنے کے قابل ہے حجم ۸۰ صفحات۔ قیمت ۶ر

خادماتِ خلق

مترجمہ سیدہ خاتون صاحبہ مرحومہ
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

ان یوروپین خواتین کا تذکرہ ہے جنہوں نے اپنی زندگی خلق اللہ کی خدمت میں بسر کرکے غیر معمولی عزم و استقلال، ہمت و جرأت اور قابلیت و ذکاوت کا ثبوت دیا۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صنف نازک میں اتنی صلاحیت موجود ہے جو اُن کو ممتاز و مؤقر بنا سکتی ہے۔ ہندوستانی خواتین کے لئے اس کتاب کا مطالعہ یقیناً سودمند ہے۔ حجم ۱۲۲ صفحات قیمت ۱۰ر

سعیدی قاعدہ

مصنفہ غفور محمد خاں صاحب
پبلشرز:۔ حاجی محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب کانپور

یہ کتاب بچوں کی ابتدائی تعلیم یعنی د۔ جہ الف کے لئے مرتب کی گئی ہے۔ عمدہ اور صاف چھپی ہے لیکن جابجا سخت الفاظ اور بے معنی جملے پائے جاتے ہیں مثلاً جج کو جل، شب کو سو۔ جج اور شب کا مفہوم بچہ ہرگز نہیں سمجھ سکتا بعض جملے ایسے بھی ہیں جو روزمرہ زبان میں رائج نہیں ہیں مثلاً چل پھرت کر۔ اوٹ کولا کر دھر۔ الفاظ ڈبہ۔ پلہ۔ سیکڑہ۔ ہائے ہوز سے لکھے گئے ہیں حالانکہ اب ان کو الف سے لکھنے کا رجحان ہے اور غالباً سررشتہ تعلیم کی بھی یہی ہدایت ہے۔ قیمت ۱؎ر

گوسوامی تلسی داس (ہندی) مصنفہ بابو شیام سندر داس و پیتامبر دت بڑتھوال - مطبوعہ ہندستانی اکیڈیمی یو۔پی۔ الہ آباد۔ حجم ۲۵۴ صفحات ، قیمت تین روپیہ

گوسائیں تلسی داس جی کی زندۂ جاوید تصنیف رامائن دنیائے علم و ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتی اس نئی ہندی اور کھڑی بولی کی قدردانی کے زمانے میں بھی رامائن ہر خاص و عام کے دلوں کو مسحور کئے ہوئے ہے۔ ہندستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ نے تلسی داس کے سوانحی حالات کو کتابی صورت میں شائع کرکے نہایت باموقع کام کیا ہے۔ اس کتاب میں بھی بہت سے بعید از قیاس واقعات کو جو اکثر مروجہ رامائنوں کا ضروری جزو ہوگئے ہیں نظر انداز نہیں کیا گیا ہے مگر ان کے لئے ایک علیحدہ باب مخصوص کردیا گیا ہے اور ساتھ ہی قابل مصنفین کی تشریح بھی موجود ہے گو وہ کلیتہً اطمینان بخش نہیں کہی جاسکتی۔ بہرحال ہم بھی مصنفین کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر یہ کہدینا مناسب سمجھتے ہیں کہ "مہاتماؤں کے متعلق کئی غیر قدرتی اور معجزہ آگیں باتیں بآسانی پھیل جایا کرتی ہیں اور گرو کی مہاتم بڑھانے کے لئے چیلے انھیں بہت جلد یقین کرلیتے ہیں"۔ ایسی حالت میں یہ بہتر ہوتا کہ ان باتوں کو بالکل چھوڑ ہی دیا جاتا۔

اس کتاب میں بابا بینی مادھوداس جی کا بار بار حوالہ دیا گیا ہے مگر خود مصنفین کو اعتراف ہے کہ باباجی کی کورانہ تقلید مناسب نہیں اور ان کے بیانات مبالغہ سے خالی نہیں ہوتے۔ ایسی صورت میں مصنفین کا اس کتاب کی بنا پر کچھ لکھنا اپنی کوشش کو قابل گرفت بنانے کے مصداق ہے۔ بہرحال اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان اصحاب نے ہر جگہ سے کچھ نہ کچھ مسالہ اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پرانے زمانہ کے لوگوں کا مفصل تذکرہ لکھنا واقعی بڑی جانکاہی کا کام ہے۔

اس کتاب کے تمام ابواب قرینہ سے ترتیب دیے گئے ہیں اور ان میں وہ تمام باتیں جمع کردی گئی جو ایک سوانحعمری میں ہونا چاہیئے۔ آخری پانچ ابواب تو خاص قابلیت سے لکھے گئے ہیں اور مصنفین کی علمی قابلیت اور طباعی کا پتہ دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ان کی ہر بات سے پورا پورا اتفاق کیا جائے۔ دلچسپی اور اہمیت کے لحاظ سے اس کتاب کا یہی جزو سب سے بہترین ہے۔ اسی حصہ میں نظموں کا انتخاب بھی بجا دیا گیا ہے۔ یوں تو ساری کتاب میں بھاشا کی نظموں کا انتخاب اس کثرت سے دیا گیا ہے جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ کتاب کی ضخامت بڑھائی گئی ہے کیونکہ جن نظموں کا سوانحی حالات سے کوئی تعلق نہیں ان کے اس کتاب میں دینے کی ضرورت نہ تھی۔ ان نظموں کے متعلق ایک اور شکایت یہ بھی کی جاسکتی ہے کہ قدیم زمانے کے دقیق نظموں کی صراحت کی بھی اس کتاب میں کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ ہم کو افسوس ہے کہ عمال اکیڈیمی نے بھی اس طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ اس کتاب کی زبان بھی زیادہ سلیس ہوسکتی تھی

ہماری رائے میں اکیڈیمی کو اپنے تمام مطبوعات کی زبان کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے اور مصنفین کو بھی سمجھنا چاہیئے کہ وہ جو کچھ لکھیں اُسے صرف خواص ہی نہیں بلکہ عوام بھی پڑھیں اور سمجھ سکیں۔

ہم کو افسوس ہے کہ کتاب زیر تنقید میں نظموں کے جو اقتباسات دیئے گئے ہیں ان میں متعدد غلطیاں بھی ہیں جن کی وجہ سے اُن کا سمجھنا اور بھی مشکل ہو گیا ہے۔ پھر اگر ان کے کافی حوالے دیئے جاتے تو اُن کو اصلی کتب میں تلاش کرنا آسان ہو جاتا۔ بعض مقامات میں غلط حوالے دیئے گئے ہیں مثلاً صفحہ ۱۷۴ پر کلا دوا رام لے کبندھ (راکشس) ہی کہا تھا نہ کہ جٹایو سے جیسا کہ اس کتاب میں درج ہے۔ بعض مقامات پر کچھ ایسے پر لکھے گئے ہیں جن میں نہ کوئی ربط ہے نہ کوئی سلسلہ جس سے اُن کا پورا مطلب سمجھ ہی میں نہیں آتا ہے۔ ہندی پد اور سنسکرت اشلوکوں کا مطلب لکھنا تو درکنار۔ صفحہ ۱۲۲ پر مرہٹی زبان کے شعر کا مطلب بھی نہیں لکھا گیا۔ ہم کو امید ہے کہ کتاب کے آئندہ اڈیشن میں یہ تمام نقص رفع کردئے جائیں گے اور کتاب کو عام دلچسپی و مطالعہ کی چیز بنا دیا جائیگا۔

کتاب سفید دبیز کاغذ پر سنہری جلد کے ساتھ انڈین پریس میں چھاپی گئی ہے اور ظاہری خوبیوں سے آراستہ ہے۔

(اقبال ورما سحر ہتگامی)

جغرافیہ ضلع کانپور

مرتبہ جناب محمد یعقوب صاحب کلام بی۔ اے

پبلشرز: حاجی محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب کانپور

کتاب پرائمری اسکول کے سلسلۂ درس میں شامل ہونے کے لئے مرتب ہوئی ہے۔ پنڈت اوکا ناتھ صاحب ٹیچر کرائسٹ چرچ ہائی اسکول نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔ کتاب مفید معلوم ہوتی ہے اور اس قابل ہے کہ نصاب میں شامل کی جائے۔ قیمت ۴ر

بھارت ماتا

مصنفہ سید نجم الدین احمد صاحب جعفری بی۔ اے۔

ملنے کا پتہ: محمد حسن و تک اُنوار المطابع لکھنؤ۔

یہ کتاب ہندوستان کے نظام سے متعلق ہے۔ حکومت اور اس کے اجزا فوج عدالت تعلیم زراعت، حفظان صحت، اقتصادیات وغیرہ وغیرہ پر بہتر سے بہتر حصل بحث کی گئی ہے۔ ان تمام تبدیلیوں کا بھی تذکرہ ہے جو حال ہی میں رونما ہوئی ہیں۔ معلومات کے لحاظ سے اس کتاب کا مطالعہ مفید و قیمتی ہے۔

قیمت سالانہ عہ ملنے کا پتہ دفتر ندیم گیا

رسالہ ندیم (گیا)

یہ رسالہ صوبہ بہار کے مشہور شہر گیا سے شائع ہوتا ہے۔ صوبۂ بہار میں اس وقت تک کوئی ایسا رسالہ نہ تھا جو لوگوں کو اردو کی ترویج و اشاعت کی طرف توجہ دلاتا۔ ہم کارکنان

ندیم کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انھوں نے اس مقصد کو بڑی حد تک پورا کر دکھایا ہے۔ رسالہ میں دلکش تصاویر دلچسپ مضامین اور اعلیٰ پایہ کی غزلیں اور نظمیں شائع کرنے کی کوشش کیجا رہی ہے۔ مگر غزلوں کے انتخاب میں کسی قدر سختی کی ضرورت ہے۔ اس وقت ندیم کا جولائی نمبر ہمارے پیش نظر ہے جس میں ایک افسانہ "مایۂ تفریح" کے عنوان سے جناب عبدالقدوس صاحب کے نام سے شائع ہوا ہے اسے دیکھکر ہمارے حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ ادبی فضا میں ایسے ایسے حضرات بھی ہیں جنکو دوسروں کے افکار و محنت کو اپنی ذات سے منسوب کر لینے میں مطلق عار نہیں۔ یہ افسانہ منشی پریم چند صاحب کا ہے اور عرصہ ہوا رسالہ زمانہ میں شائع ہو چکا ہے۔ نیز منشی پریم چند کی نو طبع کتاب "خواب و خیال" میں موجود ہے عبدالقدوس صاحب نے اسے اپنے نام سے منسوب کر کے صرف اتنا کیا ہے کہ جا بجا دو چار لفظ گھٹا بڑھا دئے ہیں اور بس۔ شروع سے لیکر آخر تک کل عبارت منشی پریم چند کی ہے۔ ہم کو امید ہے کہ ایڈیٹر صاحب ندیم آیندہ کیلئے اپنے مضمون نگاروں سے اس بات کی تاکید کردیں گے کہ وہ اس قسم کی حرکت سے باز رہیں ہم کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اردو رسالوں کی کثرت نے ہر قسم کے اہل قلم کو سطح عام پر لاکر کھوٹے کھرے کا فرق باقی نہیں رکھا۔ چنانچہ بعض پرچوں میں پرانے رسالوں کے مضامین بلا حوالہ دوبارہ اس طرح شائع ہوتے رہتے ہیں گویا خاص ان ہی پرچوں کے لئے لکھے گئے ہیں۔ لیکن جب اصلی مضمون نگاروں کے نام بھی بدل ڈالے جائیں تو واقعی یہ سینہ زوری قابل سرزنش ہو جاتی ہے۔

رسالہ جام (فتحپور) یہ ماہوار رسالہ فتحپور سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ مضامین زیادہ تر مقامی حضرات کے ہیں۔ کارکنان رسالہ کو اس کی ترقی کے لئے کوشش کرنی چاہیئے اور رسالہ کا معیار بلند کرنا چاہیئے۔ حجم ۱۶ صفحات چندہ عہ سالانہ دفتر رسالہ جام فتحپور سے طلب فرمائیے۔

رسالہ مسلمہ (جالندھر) ماہوار رسالہ ہے اور مسلم فرقۂ نسواں سے متعلق ہے، مذہبی اعتبار سے اس کے مضامین اچھے ہوتے ہیں۔ سالانہ چندہ ایکروپیہ حجم ۳۰ صفحات۔ دفتر رسالہ "مسلمہ" جالندھر سے طلب فرمائیے۔

رسالہ سفینۂ نسواں (حیدرآباد دکن) یہ رسالہ بھی مسلم فرقۂ نسواں سے متعلق ہے۔ کتابت و طباعت کے علاوہ مضامین بھی اچھے ہیں، تصاویر بھی ہوتی ہیں۔ امید ہے کہ یہ رسالہ صنف نازک میں علمی و اخلاقی معیار قائم کرنے میں کامیاب ہوگا۔ حجم ۴۴ صفحات چندہ سالانہ للعہ ر

صبح و شام

نہرے کوہ کے پردے میں سورج یوں ہوا پنہاں — چھپالے کوئی مہرو جیسے آنچل سے رخِ تاباں

لک نے اپنے ماتھے پر دیا سیندور کا ٹیکا — لرزتا کانپتا پہلا ستارہ چرخ پر آیا

ہ دیکھو آسماں کے ایک جانب نور سا پھیلا — سفینہ ماہ کا بحرِ فلک میں بہہ کے آنکلا

میں سے آسماں تک مرمریں سی چاندنی چھٹکی — فضائے دہر میں ہر سو خموشی موت کی پھیلی

دھر طاری رہی دنیا کے انسانوں پہ مدہوشی — ادھر انجم تھے اپنی انجمن میں محوِ سرگوشی

رضِ شب ہو گئی آخر ستارہ صبح کا چمکا — ادائے فرض کی خاطر دوبارہ مہر آدھمکا

ٹھا انسان بستر سے عمل کی تازگی لیکر — رگوں میں گردشِ خوں دل میں جوشِ زندگی لیکر

بجن کی دیر سے مسجد سے آوازِ اذاں آئی — کھلے غنچوں کے دل ناقوس کے منہ میں زباں آئی

"سحر نے سانس لی موجوں نے لی اٹھ اٹھ کے انگڑائی
نہانے کے لئے پہلی شعاعِ آفتاب آئی"

برسات

(از جناب محمد ظہور حسن صاحب وفا شاہجہاںپوری)

جہاں میں فیض رساں آج پھر ہوئی برسات
ہر ایک ذرہ ہے سرمایہ دارِ حسنِ حیات

نشاط جام بکف ہر طرف گھٹاؤں میں
پیامِ تازگیِ دل خنک ہواؤں میں

نگاہِ شوق کو پھر جذب کر رہی ہے فضا
یہ رنگِ دہر یہ جوشِ بہار ارے توبا

ہر ایک غنچہ و گل غرقِ کیفِ مستی ہے
شراب سی رگِ ہر برگ سے ٹپکتی ہے

چمن چمن ہے خمستاں شجر شجر بیخود
نفس نفس ہے معطر، نظر نظر بیخود

ہر ایک شے میں نمودِ بہارِ تازہ ہے
تمام صحنِ چمن خلد کا نمونہ ہے

بچھے ہیں قطرے ستاروں کی طرح سبزے پر
دکھا رہی ہے زمیں آسماں کا منظر

گمانِ وادیِ ایمن ہے کوہساروں پر
محیطِ عالمِ نغمہ ہے آبشاروں پر

ہر ایک دامنِ وادی ہے دامنِ گلچیں
تمام تختۂ صحرا ہے تختۂ رنگیں

بنی ہوئی ہے دلھن کائنات کیا کہنا
برس رہی ہے شرابِ حیات کیا کہنا

(از مولوی محوی صدیقی لکھنوی (مدراس)

تجھے کیا جو قلبِ ستم زدہ مرا وقفِ حزن و ملال ہے
تجھے کیا جو میں ہوں شکستہ دل، تجھے کیا جو میرا یہ حال ہے
تجھے کیا جو تیرے فراق میں مجھے اپنی زیست وبال ہے
کہ میں خود ہوں پیکرِ درد و غم

تجھے کیا جو کلفتِ روز و شب سے کوئی غریقِ محن رہے
تجھے کیا جو شدتِ سوزِ غم سے ہمیشہ دل میں جلن رہے
تجھے کیا جو کثرتِ داغہائے دروں سے سینہ چمن رہے
کہ میں خود ہوں خوگرِ ہر الم

تجھے فکر کیوں ہے جو اس طرح شب و روز کوئی ملول ہے
مرا چارہ ساز ہے وہ خدا، تجھے فکر میری فضول ہے
جو ستم ہو جانِ عزیز پر مجھے سب خوشی سے قبول ہے
نہ ہو تیری مشقِ جفا یہ کم

تجھے کیا جو دستِ زمانہ سے کوئی وقفِ صدمہ و یاس ہو
ترا دل ہو کس لیے مضطرب، تجھے کیوں یہ خوف و ہراس ہو
مرے حالِ زار کو دیکھ کر، مری جان تو نہ اداس ہو

کہ نصیب کے ہیں یہ سب کرم

جو گھلا رہی ہیں یہ کاہشیں تو گھلانے دے انھیں شوق سے
جو مٹا رہی ہیں یہ گردشیں تو مٹانے دے انھیں شوق سے
جو ستا رہی ہیں یہ کاہشیں تو ستانے دے انھیں شوق سے
کہ نہیں ہیں درخورِ عیش ہم

یہ جو پھر رہا ہوں میں در بدر، یہ جو دوڑتا ہوں میں چار سو
تجھے کچھ خبر بھی ہے یا نہیں کہ ہے صرف تیری ہی جستجو
مرے سینے میں ہے جو اک چبھن، وہ ہے صرف تیری ہی آرزو
نہ مٹے گا دل سے یہ دردِ غم

نہ ہوائے عشرتِ بزمِ مے، نہ اب آرزوئے سرور ہے
مجھے پاسِ عشقِ حبیب ہے، مجھے بس عزیز ہے ایک شے
کہ نہ آئے دامنِ صبر پہ کوئی داغ، یوں ہو یہ راہ طے
کہ مری وفا کا رہے بھرم

تجھے کیا پڑی ہے جو آکے تو کسی غم نصیب کی لے خبر
تجھے کیا جو محوِ بیِ زار کو نہیں کاہشوں سے کبھی مفر
نہ کر اعتنا کبھی تو ادھر، نہ ہو ملتفت مرے حال پر
تجھے اپنے حسن کی ہے قسم

تضمین

(بر غزل منشی درگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی مرحوم)

(از حکم چند آرشد لاہور)

(۱)

بہت غم ہے دلِ اندوہگیں کو ہوا کیا اس کی آہِ آتشیں کو
ذرا روکو نگاہِ سرمگیں کو نہ دو چرکا رگِ جانِ حزیں کو
سنبھالو نشترِ چینِ جبیں کو

(۲)

ادائے حسنِ دل کش مثلِ نشتر نگاہِ ناز آگیں شکلِ خنجر
غضب ہے قہر ہے اے بندہ پرور تمہاری چال ہے آشوبِ محشر
اٹھائے پھرتی ہے سر پر زمیں کو

(۳)

بڑھا حد سے سوا جوشِ تمنا کہاں باقی رہا ہوشِ تمنا
سنو یہ کھول کر گوشِ تمنا کرو خالی نہ آغوشِ تمنا
جو لینا ہو دلِ پہلو نشیں کو

(۴)

کہیں دل کو نہ دردِ دل ستائے کہیں حسرت نہ اپنا رنگ لائے
کوئی آفت نئی سر پر نہ آئے کوئی خارِ تمنا چبھ نہ جائے
نہ چھونا تم دلِ درد آفریں کو

(۵)

جو آئی سر پہ آفت میں نے جھیلی سہی الفت میں زحمت کیسی کیسی
شکایت یا کروں تعریف اُن کی ہوا اچھی مرے نالوں نے باندھی
کہ بھڑکایا مزاجِ آتشیں کو

حبِّ وطن

از پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق از باندہ

الفتِ حبِّ وطن سے تو گرفتاروں میں ہوں
مختصر یہ ہے کہ ناکردہ گنہ گاروں میں ہوں

کر رہا ہوں جان و دل حبِّ وطن پر میں نثار
کچھ بھی ہو لیکن وطن کے ناز برداروں میں ہوں

جذبۂ حبِّ وطن دل میں ہے کب سے جاگزیں
اے جنوں روزِ ازل سے میں وفاداروں میں ہوں

دل میں ہے جوشِ ولا اور لب پہ ہے ذکرِ وطن
ہمصفیرو کچھ نہ پوچھو میں بھی ناچاروں میں ہوں

ابتدا ہی سے ہے دل مستِ مئے حبِّ وطن
انتہائے بیخودی یہ ہے کہ ہشیاروں میں ہوں

الفراق اے داغِ فرقت، المدد حبِّ وطن
دور افتادہ وطن کے میں دل افگاروں میں ہوں

جاں نثارانِ محبت بیچتے ہیں نقدِ دل
مفت دیدیں، کوئی کہہ تو دے "خریداروں میں ہوں"

بادۂ حبِّ وطن مجھکو پلا دے ساقیا
بن پیئے مدت ہوئی میں تیرے میخواروں میں ہوں

چٹکیاں رہ رہ کے دل میں اور لے، یادِ وطن
دور ہوں تجھ سے مگر تیرے طلبگاروں میں ہوں

نام کو تاثیر باقی آہِ سوزاں میں نہیں
اُف لبوں پر کیسے آئے میں تو بیماروں میں ہوں

بختِ خفتہ نے جگایا تھپکیاں دے دے کے شوق
نیند کا ماتے نہ میں ہوں اور نہ ہشیاروں میں ہوں

لطفِ سخن

انتخاب آل انڈیا مشاعرہ گورکھپور

۱۶- جولائی ۱۹۳۲ء کو گورکھپور میں ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا جس کے انتخاب کا سلسلہ اس نمبر سے شروع کیا جاتا ہے امید ہے کہ ناظرین اسے پسند فرمائیں گے۔ مشاعرہ مسٹر بابرٹ صاحب کمشنر گورکھپور ڈویژن کی صدارت میں ہوا اور ہندوستان کے اکثر مشاہیر شعرا نے شرکت فرمائی۔ (ایڈیٹر)

(نواب سائل صاحب دہلوی)

کیا خبر نکلے نہ نکلے آرزو جو دل میں ہے ۔۔۔ ہاں تمنا کی جھلک سی خنجر قاتل میں ہے

پوچھتے کیا ہو تمنائے دلِ پُر آرزو ۔۔۔ جو عدو کے دل سے باہر ہے وہ میرے دل میں ہے

آج وہ بیڑا ترا، کشتی وہ ڈوبی عشق کی ۔۔۔ مندرج اک اک خبر ہر موجۂ ساحل میں ہے

تیر کو دُوں داد یا دل کو سراہوں تیر زن ۔۔۔ تیر میں ہے دل مرا یا تیر تیرا دل میں ہے

(ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی)

خنجرِ خونخوار چل کر اب نئی مشکل میں ہے ۔۔۔ کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے کچھ ہمارے دل میں ہے

خارِ صحرا خود کفِ پا سے الگ ہو جائیں گے ۔۔۔ آپ وہ کانٹا نکالیں جو ہمارے دل میں ہے

کچھ ادب کا اقتضا بھی کچھ تمہارا خوف بھی ۔۔۔ لا نہیں سکتے زباں تک ہم اسے جو دل میں ہے

رفتہ رفتہ مٹ گئے وہ سب ہمارے ذوق و شوق ۔۔۔ انتہا یہ ہے کہ اب حسرت کی حسرت دل میں ہے

(جناب شفیق لکھنوی)

سامنا قاتل کا ہے عاشق بڑی مشکل میں ہے ۔۔۔ کچھ شکایت ہے زباں پر کچھ شکایت دل میں ہے

بحرِ غم میں جوش ہے آئے ہیں گھبرائے ہوئے ۔۔۔ ڈوبنے والوں کا مجمع دامنِ ساحل میں ہے

امتحاں گاہِ محبت میں گیا میں بے دریغ ۔۔۔ ہمتِ دل ہو تو آسانی ہر اک مشکل میں ہے

(جناب عبدالباری آسی لکھنوی)

جلوۂ ماضی ہمارے حال و مستقبل میں ہے ۔۔۔ آرزو دل میں رہیگی دل تھی اور دل میں ہے

اِس گلی کا ذرّہ ذرّہ چاہتا ہے احترام — آرزوئے جبہ سائی اب بڑی مشکل میں ہے
آہ کر اور آرزوئے ماسوا کو پھونک دے — کام لے اُس سوز سے جو سوز تیرے دل میں ہے
میں تو اتنا جانتا ہوں واعظِ ناحق پرست — وہ ترے حق میں نہیں ہے جو تجھے باطل میں ہے

(جناب وصل صاحب بلگرامی)

جتنی دشواری حصولِ آرزوئے دل میں ہے — اتنی ہی لذت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے
بند کی آنکھ اور ہمیشہ کے لئے نیند آ گئی — ہائے کیا فرحت ہوائے کوچۂ قاتل میں ہے

(جناب بسمل الہ آبادی)

گو سمجھتے ہیں مرا ارمان سب کے دل میں ہے — اُن کو اس سے کیا تعلق کون کس مشکل میں ہے
اس طرف بھی ہو نگاہِ لطف اے عالم نواز — اِک جہانِ آرزو آباد میرے دل میں ہے
اِک طرف ذوقِ پرستش اِک طرف شوقِ سجود — ساتھ کعبے کے صنم خانہ ہمارے دل میں ہے
یہ اندھیری رات یہ بحرِ غمِ الفت کا جوش — خیر سے کشتی ہماری دامنِ ساحل میں ہے

(حضرت ابو العلاء حکیم ناطق لکھنوی)

شوق جس کی آب و گل میں اور ہمت دل میں ہے — جب بڑھے اُس کا قدم سمجھو کہ وہ منزل میں ہے
روح پھر قالب میں آنے کے لئے ہے بے قرار — خنجرِ دلکش ابھی شاید کفِ قاتل میں ہے
یا وہ رخصت ہو رہے ہیں یا قیامت ہے قریب — اِک سکوت، اِک انتشار، اک برہمی محفل میں ہے
زندگی کی ہے علامت بحر کا جوش و خروش — موت کا امن و سکوں خاموشیِ ساحل میں ہے
لطفِ دنیا مجھ کو حاصل اب رہا دنیا میں کیا — یعنی ایک اُس کی تمنا سو وہ میرے دل میں ہے
کچھ نہ کچھ ہے ذوقِ ناطق سب کو دردِ عشق سے — یا کسی کی گفتگو میں یا کسی کے دل میں ہے

متفرق غزلیات

(از جناب اختر جوناگڑھی)

کوئی نہ بچا تیری عنایت کی نظر سے — تعلیم فنا دی ہے تری عشوہ گری نے
رہ کر بھی گلستاں میں نشیمن سے رہوں دور — دکھلائے ہیں یہ دن مری بے بال و پری نے
ٹپکا ہے رگِ گل سے لہو صحنِ چمن میں — بلبل کو رُلایا ہے مری نوحہ گری نے

قسمت میں لکھا تھا یہی انجامِ محبت
اختر کو مٹایا تری بیداد گری نے

(از جناب فرخ بنارسی)

لگاوٹ ہی میں قصہ عاشقوں کا پاک ہونا تھا — نگاہِ ناز کو کچھ اور بھی بے باک ہونا تھا

جفائے آشکارا نازِ بیجا کی قیامت ہے — مزاجِ حسن کو کچھ اور بھی چالاک ہونا تھا

ترا حسنِ لطافت درخورِ ذوقِ نظر، تو یہ — مگر احساس حسبِ وسعتِ ادراک ہونا تھا

تغافل ہائے جاناں کی محبت میں شکایت کیا — ادائے بے نیازی پر جبلئے دل خاک ہونا تھا

محبت حسن کے پردے میں زہر آلود نشتر ہے — دلِ بیتاب تجھ کو صاحبِ ادراک ہونا تھا

مدارج روح کے تھے امتحانِ عشق میں مضمر — ستم عاشق پہ دنیا میں تہِ افلاک ہونا تھا

دلِ وحشت زدہ تکمیلِ وحشت میں نمائش کیا — گریباں سے جگر کا چاک پہلے چاک ہونا تھا

حجابِ دیدۂ عرفاں ہے جلوہ حسنِ خودبیں کا — یہ پردہ بھی بئے نظارہ فرخ چاک ہونا تھا

(مسٹر جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی، بی۔ اے)

جمالِ شاہدِ حسنِ ازل خود جلوہ ساماں ہے — ضیائے شمعِ محفل سے فروغِ بزمِ امکاں ہے

ازل سے سوزِ الفت بے نیازِ ساز و ساماں ہے — شرارِ عشق سے خود شمعِ سوزاں گل بداماں ہے

مری صورت سے ظاہر شوقِ دیدِ حسنِ جاناں ہے — نگاہوں سے عیاں وہ راز ہے جو دل میں پنہاں ہے

نہیں جز رحمتِ حق کوئی پرساں جنسِ ناقص کا — مری فردِ عمل میں کائناتِ داغِ عصیاں ہے

شرارِ آتشِ فرقت نے جو کچھ تھا جلا ڈالا — یہی دو بوند خونِ دل تھا وہ بھی حرفِ مژگاں ہے

چھپانا سوزِ الفت کا ہے مشکل لاکھ پردوں میں — لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے

بتوں کا عشق جائز ہے بقولِ حضرتِ غالب — وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے

(از حضرت شارق ایرانی)

سرشکِ غم کا شبابِ تمام کیا کہنا — چھلک رہا ہے محبت کا جام کیا کہنا

ازل کے روز ہی مسجودِ قدسیاں ٹھیرا — خرابِ عشق کا یہ احترام کیا کہنا

مری نشاط کا عالم ارے معاذ اللہ — وہ دستِ شوق وہ لبریز جام کیا کہنا

شجر حجر در و دیوار سب ہیں وجد میں آج — پیام اور پھر اُن کا پیام کیا کہنا

بہار لوٹ رہی ہے قدم قدم پہ ترے — فضائے روح کے نازک خرام کیا کہنا

نہ دوریوں میں ہی تسکیں نہ قربتوں میں سکوں — فریبِ سلسلۂ ناتمام کیا کہنا

بنی ہوئی ہے خود آئینۂ تجلیِ ناز — مری جبینِ نیاز احتشام کیا کہنا

یہ فیضِ خاص جگر کی لطافتیں شارق — کلام اور یہ رنگیں کلام کیا کہنا

علمی خبریں اور نوٹ

افسوس کہ یکم جولائی کو اردو کے مشہور و معروف مصنف و محقق حکیم مولوی محمد نجم الغنی صاحب نجمی رامپوری رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔ آپ علاج کے لئے رامپور جارہے تھے مگر بریلی اسٹیشن تک پہونچ پائے تھے کہ پیام اجل آگیا۔ اور دنیائے ادب سے ایک زبردست عالم و فاضل اُٹھ گیا جس کے علمی احسانات کی یاد عرصہ تک قائم رہیگی۔ آپ نے اپنی تمام عمر اُردو کی خدمت ہی میں بسر کردی، چنانچہ متعدد ضخیم کتابیں آپ سے یادگار ہیں۔ علم معنی و بدیع میں آپ کی مشہور کتاب بحر الفصاحت اپنے قسم کی بہترین اور جامع تصنیف ہے تاریخ اودھ آپ نے پانچ ضخیم جلدوں میں تمام کی، اور نواب سعادت علی خاں بانی سلطنت اودھ سے لیکر واجد علی شاہ تک کے تمام واقعات تحقیق و تفصیل کے ساتھ قلمبند کئے ہیں۔ آپ نے روہیلکھنڈ اور ریاست رامپور کی بھی ایک مبسوط تاریخ لکھی ہے جو دو جلدوں میں شائع ہوچکی ہے۔ ریاست حیدرآباد دکن کی مفصل تاریخ بھی آپکے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ ان کے علاوہ آپ نے تقریباً بیس اور کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ آپ کی سب کتابیں نولکشور پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی ہیں اور وہیں سے مل سکتی ہیں۔ مرحوم کسی زمانے میں مہارانا ہائی اسکول اودے پور کے ہیڈ مولوی تھے۔ آپ رامپور میں ۱۲۷۶ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ خداوند تعالیٰ آپ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

انگلستان کے مشہور اخبار نویس سنکلیر لوئیس جن کو ادبی خدمات کے صلہ میں نوبل پرائز ملا ہے مستقل مزاج اور اپنے کام سے انتہائی انہماک رکھنے والے ادیب ہیں۔ آپ کے استقلال کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ابتدائی زمانہ میں آپ نے مختلف اخبارات کے دفاتر میں کام کیا لیکن کہیں آپ کی خدمات مقبول نہ ہوئیں اسلئے ہر جگہ سے علیحدہ کردیئے گئے۔ لیکن مسلسل دل شکن واقعات آپ کے عزم میں تزلزل نہ پیدا کرسکے اور آپ محنت سے کام کرتے رہے۔ آخر آپ کو اپنی محنت کا ثمرہ نوبل پرائز کی صورت میں ملا۔

مشرقیہ کو تین ہزار پاؤنڈ کا عطیہ دیا ہے۔

جناب افسر صدیقی امروہوی شعرا کا ایک تذکرہ فروغ وطن کے نام سے مرتب کر رہے ہیں، یہ تذکرہ مختصر مگر جامع بیان کیا جاتا ہے۔

ستمبر سے دہلی سے اردو کا ایک نیا رسالہ "آئینہ" سید ابن الحسن صاحب فکر کی ادارت میں شائع ہونے والا ہے۔ نمونہ کا پرچہ منیجر رسالہ آئینہ" دریا گنج دہلی سے مفت طلب کیا جا سکتا ہے۔

برطانیہ کی مجلس تعلیم کے کارکنان نے جن کی تعداد یونیورسٹی کے سات سو کارکنان تک پہونچتی ہے اس بات کی متفقہ تحریک کی ہے کہ چونکہ انگریزی زبان جسے بیس[20] کروڑ افراد بولتے ہیں تلفظ کے لحاظ سے سخت ہے اور اس میں دشواریاں پیش آتی ہیں اس لئے ایک مجلس ترتیب دی جائے جو تحقیقات کر کے انگریزی الفاظ کو لکھنے اور بولنے میں آسان بنانے کی کوشش کرے۔ دیکھئے اس دلچسپ تحریک کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔

خسرو دکن اعلٰحضرت نظام نے مولانا شبیر احمد عثمانی کو "شرح مسلم" (مذہبی کتاب) کی جامع و مبسوط شرح کی تصنیف پر دس ہزار روپیہ کا گراں قدر عطیہ مرحمت فرمایا ہے۔

ہمعصر "نگار" نے لکھنؤ میں عمر خیام کی رباعیات کا ایک قدیم ترین نسخہ دستیاب ہونے کا اعلان کیا ہے اب تک آکسفورڈ یونیورسٹی لائبریری کا نسخہ جو ۱۴۶۰ء میں لکھا گیا ہے سب سے قدیم سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس جدید دریافت سے معلوم ہوتا ہے کہ دستیاب شدہ نسخہ اس سے سینتیس[37] سال قبل کا ہے، نیز اس میں پچپن[55] رباعیات ایسی ہیں جو دوسرے نسخہ میں نہیں ملتیں۔ یہ نسخہ قدیم مخطوطات کے شائق اور ان کی تجسس میں کوشاں رہنے والے مسٹر گوری پرشاد سکسینہ کی حسن کوشش سے دستیاب ہوا ہے۔

ادبی دنیا کے لئے یہ خبر باعث مسرت ہوگی کہ حضرت جگر مراد آبادی کا دیوان "شعلہ طور" بہت جلد شائع

[illegible]
شائع ہو رہا ہے۔

پونا میں شیواجی کے فرزند سمبھاجی کی سوانح عمری کی تکمیل اور اشاعت کے لئے ایک لمیٹڈ کمپنی تیس ہزار روپیہ کے سرمایہ سے قائم کی گئی ہے۔ مسٹر بینڈرے اس سوانح عمری کے ایڈیٹر مقرر کئے گئے ہیں چنانچہ آپ نے نہایت تحقیق و تلاش سے ایسا بہت سا مسالہ بھی فراہم کر لیا ہے جس میں انڈیا آفس اور نواگوا کے انتخابات بھی شامل ہیں۔

افسوس ہے کہ مسٹر فرامرز تارا پورے والا نے اپنی جائے سکونت کبالا ہل بمبئی میں انتقال فرمایا۔ آپ فرم مسرس تارا پورے والا اینڈ سنس پبلشرز اینڈ پرنٹرز کے مالک تھے۔ تقریباً چالیس سال ہوئے جب اس فرم کو موصوف کی والدہ نے خرید کیا تھا۔ اس وقت اس فرم کا نام کوپر لال اینڈ کمپنی تھا، خریدنے کے بعد اس نام کو تبدیل کر کے موجودہ نام رکھا گیا۔ مسٹر فرامرز اور ان کے تینوں بھائیوں نے نہایت محنت و جانفشانی سے کام کیا۔ اور اس فرم کو ترقی کے معراج پر پہونچا دیا۔ کچھ دنوں کے بعد مسٹر بہرام جی تارا پورے والا نے اپنا کاروبار علیحدہ کر لیا۔ اس صورت میں بھی کام انتہائی کامیابی سے چلتا اور ترقی کرتا رہا۔ اس وقت یہ فرم بک سیلروں کی فرموں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ مسٹر فرامرز کی عمر ۶۸ برس کی تھی اور انھوں نے دو لایق بیٹے یادگار چھوڑے ہیں۔

پریم چند

کی تازہ تصنیف

بیوہ

ں کتاب میں بیوہ کے دردناک واقعات
ھے گئے ہیں اور اُنکی ترغیبات کا ذکر کیا گیا ہے
اایک بیکس بیوہ کو آزمائش میں ڈالتے
ہیں
ں کے ساتھ ہی اس مسئلہ کو حل کرنے
ں کوشش بھی کی گئی ہے کہ بیواؤں
ے لئے کس قسم کی زندگی بہترین ہے

حجم ۲۵۰ صفحات

قیمت ایک روپیہ

آج ہی فرمائش بھیجدیجئے

ملنے کا پتہ

منیجر "زمانہ"

نیا چوک - کانپور

ادھر کون آرہا ہے؟

یہ ایک سوال ہے جو رات کے چلنے
والوں سے بُرے بھلے کا شک دور کرنے
کے لئے پولیس کانسٹیبل پوچھتا ہے

لیکن ہماری مندرجہ ذیل دوائیوں کی بابت کسی کو ذرا بھی شک کا موقع نہیں ہر ایک استعمال کرنیوالے کو ان کی بابت پوری اور خاطر خواہ تسلی ہو گئی ہے۔ اگر آپ نے ابھی تک تجربہ نہیں کیا تو اب ضرور تجربہ کیجئے۔

آتنگ نگرہ گولیاں قبض، بدہضمی۔ خون اور مادہ مردمی کی خرابی دیگی جریان، احتلام، بسرعت رقت وغیرہ کو دور کرکے اعلیٰ درجہ کی طاقت و توانائی حاصل کرتی ہیں۔

چندر پربھا گولیاں سوزاک، حبس بول، اور عورتوں کے ہر قسم کے امراض مخصوصہ کی لاثانی دوا ہے۔

جور انتک گولیاں ہر قسم کے بخار کے دفع کرنے میں پوری طرح فتحمند ثابت ہوئی ہیں۔

بال متر گولیاں بچوں کے جملہ امراض کو نابود کرکے تندرست و توانا بناتی ہیں۔

کاسانک گولیاں ہر قسم کی کھانسی اور دمہ کے لئے اکسیر علاج ہے۔

لعوق دمہ دمہ کے حملوں کو چند منٹوں میں دور کرنے کی لاثانی دوا ہے۔

قیمت

ہر ایک دوا فی ڈبیہ صرف ایک روپیہ۔ پانچ ڈبیہ کی دوا چار روپیہ میں علاوہ محصول ڈاک۔

صحت اور تندرستی کی نعمت راہ راست کی استاد اور نہایت عمدہ مضامین سے مزین کتاب کام شاستر بالکل مفت طلب فرمائیے

ویدشاستری منی شنکر گووندجی

جام نگر۔ کاٹھیاواڑ

کانپور ایجنٹ

مسرس عبدالکریم اینڈ سنس مسٹن روڈ کانپور

بانی
ڈاکٹر۔ ایس۔ کے۔ برمن
ڈاکٹر۔ ایس۔ کے۔ برمن
لیمیٹڈ
کلکتہ
ٹریڈ مارک
SKB
رجسٹرڈ
سنہ ۱۸۹۴ء
پچاس سالوں سے ہندوستانی پیٹنٹ دواؤں کا کارخانہ
بخار سے چھٹی کی حالت میں
جوڑی تاپ
(جوڑی بخار و طحال کی دوا)
(REGD)
ہر سال لاکھوں مریض فائدہ اٹھاتے ہیں!
اسکی چار پانچ خوراک پیتے ہی ملیریا (جوڑی بخار) کا آنا بند ہوجاتا ہے یہ خون کو گاڑھا کرتی اور طحال کو گلاتی ہے۔ اسکے استعمال سے اکترا۔ تیہیا چوتھیا بخار جاتا رہتا ہے اور اجابت خلاصہ ہوتی ہے۔
قیمت فی شیشی کلاں پندرہ آنہ ۱۵ محصول دس آنہ ۱۰ار
" " خرد نو آنہ ۹ار " سات آنہ ۷ار
ڈاکٹر برمن کی ملیریا بخار کی گولی
(REGD)
ہڈی میں سمائے ہوئے بخار کو نکالتی ہے!
اسمیں کونین برائے نام بھی نہیں ہے لرزہ کا بخار کہنہ ہوجانے پر یا بخار نہ آکر ہمیشہ کم ہمیشہ رہتا ہے ایسی حالت میں یہ دوا اپنا حیرت انگیز اثر دکھاتی ہے۔ قیمت فی شیشی بارہ آنے ۱۲ار محصول سات آنہ ۷ار
رنگ رنگ
(REGD)
داد کا مرہم۔ نیا یا پرانا کیسا ہی داد خواہ خارش کیوں نہ ہو اسکے لئے یہ تیر بہدف ہے۔ اور طرہ یہ کہ کسی قسم کی سوزش یا تکلیف نہیں ہوتی۔
قیمت فی ڈبہ چار آنہ ۴ار محصول چھ ڈبہ تک سات آنہ ۷ار نمونہ فی ڈبہ دو آنہ ۲ار
نقلی دواؤں سے ہمیشہ ہوشیار رہیئے
دوا کھانے کے پہلے
دوا کھانے کے بعد
نوٹ:۔ ہماری دوائیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ بغرض کفایت محصول ڈاک اپنے مقامی ہمارے ایجنٹ سے خرید کریں۔ نمونہ صرف ایجنٹوں ہی سے مل سکتا ہے۔
صیغہ نمبر ۶۷ پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ
ایجنٹ:۔ کانپور نیا گنج میں مسرس محمد حفیظ محمد نصیر صاحبان

…ٹ جانے اور زخموں کیلئے

…ی بوٹیوں کا حیرت انگیز مرہم

…بک درد کو تسکین دیتا اور نئی کھال پیدا کرتا ہے

…ٹ جانے. خراش. جل جانے. جھلس جانے یا دوسری …ت میں زہرباد کے مہلک خطرات سے بچنے کے لئے …اً زمبک کا مرہم لگائیے. یہ حیرت انگیز تریاق …ت مرہم تمام مضر صحت جراثیم کو نیست و نابود …کے جلد کو متعدی امراض کے اثرات سے بچاتا …. زمبک درد اور کھجلی کو جلد تسکین دیتا ہے …م کو دفع کرتا اور مضبوط نئی کھال پیدا کر کے …ب کا نشان مکمل طور سے مٹا دیتا ہے.

…زمبک ایک بیش بہا مرہم ہے جو اصلی جڑی …وں سے تیار کیا گیا ہے.

…دوا فروش ایک روپیہ اور دو روپیہ چار آنہ فی ڈبیہ کے …ب سے زمبک فروخت کرتے ہیں.

حیوانی چربی سے بالکل پاک صاف

دنیائے شاعری میں
ایک بے بہا اضافہ

شاعر کی راتیں

یہ حضرت جوش ملیح آبادی کی اُن معرکۃ الآرا نظموں کا مجموعہ ہے جو موضوع شب سے متعلق ہیں اور جن کے مناظر و کیفیات کی مصوری میں جناب جوش اپنی نظیر نہیں رکھتے. نہایت دیدہ زیب کتابت و طباعت کے ساتھ بکمال آب و تاب شائع ہو چکا ہے اور مندرجہ ذیل پتہ پر دستیاب ہو سکتا ہے

قیمت علاوہ محصولڈاک عہ،

بعجلت ممکنہ طلب فرمائیے ورنہ طبع دوم کا انتظار کرنا پڑے گا

اعجاز الحق قدوسی

نامپلی جدید مکان ۱۶۷ حیدرآباد دکن

مرتبہ منشی دیا نراین نگم، بی۔اے

جلد ۵۹	ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

تصویر: حضرت شوق قدوائی مرحوم

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت سالانہ ممالک غیر سے ملے ششماہی صہ ہندوستان سے ششماہی سے

قیمت سالانہ ہے

قیمت فی پرچہ ۱۰

منشی احمد علی شوق قدوائی مرحوم

زمانہ

جلد ۵۹ ستمبر ۱۹۳۲ء نمبر ۳

غزل

(از نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی)

تمام دنیا کی شاعری میں مضمون پہلے مقرر ہو جاتا ہے، پھر اُسی مضمون کے مناسب قافیے اختیار کئے جاتے ہیں۔ غزل ایک ایسی صنف شعرا اہل ایران نے ایجاد کی جس میں قافیہ و ردیف مضمون سے پہلے مقرر کر لیتے ہیں، پھر اسی قافیہ و ردیف کے مناسب مضامین اختیار کرتے ہیں۔

قافیہ و ردیف کعبتین یا چوسر کے پانسے ہیں جن میں چھکا بھی نکل آتا ہے، پو بھی نکل آتی ہے تین کانے بھی ہیں پو بارہ بھی۔

یہ دو لوحیں ہیں جن سے مضمون کا طلسم کھل جاتا ہے، یہ وہ میل راہ ہیں جو مضمون کا پتہ بتاتے ہیں، جو شخص پتہ کو سمجھ جاتا ہے منزل مقصود تک پہونچ جاتا ہے، نہیں تو بہک کر گمراہ ہو جاتا ہے۔

غزل گو قرعہ پھینکتا ہے اور اُس کی قسمت کا جو سہم ہے وہ نکل آتا ہے۔

قافیہ و ردیف دو پر پرواز ہیں جس سے کبھی غزل گو عرش تک پہونچ جاتا ہے اور خزانۂ عرش سے مضمون اُڑا لاتا ہے ؂

لے گئی عرشِ معلّٰی پہ مجھے فکر سخن جا پڑا پر تو آئینہ بزانو ہو کر

اس کے علاوہ ردیف میں محاورہ کی شوخی سننے والوں کے دل کو بیچین کر دیتی ہے مرزا داغ مرحوم کو اس باب میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ (لگی ہوئی) ردیف ہے اس میں داغ نے یہ شعر نکالا ؂

جب میں نے آہ کی ہے قیامت اٹھائی ہے　　آواز پہ ہے شورِ محشر لگی ہوئی

(کچھ بھی نہیں) ردیف ہے اس میں یہ شعر نکالا ہے

دھوم ہے حشر کی سب کہتے ہیں یوں ہی وہ ہوئی ہے　　فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

حیرت تو یہ ہوتی ہے (کا) ردیف ہے اس میں زبان کا مزہ دیکھئے ؎

اٹھنا ہی اس کی بزم سے دشوار تھا مجھے　　اور پھر سنبھالنا دل بے اختیار کا

شعر کی اِن دونوں صنفوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صنف میں عروض کا کوئی وزن ہونا کافی ہے جو قریب قریب موسیقی کا ایک وزن ہوتا ہے۔ قافیہ کا ہونا نہ ہونا زبان کی ساخت پر منحصر ہے۔ اور اس جدید صنف میں وزن بھی قافیہ بھی بلکہ ردیف کا بھی ہونا ضرور ہے۔

معنوی اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ اُس میں تسلسل ضرور ہے اور اس میں قافیہ و ردیف جو رستہ بتلائے غزل گو کو اُسی طرف جانا چاہیئے۔ مثلاً محمل کا قافیہ شاعر کو نجد کی طرف لے گیا اور بسمل نے اُسے مقتل کی طرف کھینچا، اس وجہ سے غزل میں تسلسل نہ باقی رہا۔ اور تسلسل نہ ہونے سے شعر کی وہ خوبیاں جو مسلسل بیان کے ساتھ مخصوص ہیں غزل سے فوت ہو گئیں (۱) مثلاً شاہزادہ رخصت مانگ رہا ہے ملکہ سے، قلق نے اس مقام کو یوں ادا کیا ہے:۔

منہ سے بولی نہ کچھ وہ غنچہ دہن　　پاؤں سے پر دبا لیا دامن

یعنی شرم نے منہ سے بات نہ کرنے دی تو شوق نے پاؤں کی حرکت سے کام لیا اور شرم پر غالب آگیا۔ (۲) یا جیسے دو شاہزادے عون و محمد شہادت کے شوق میں نکلے ہیں۔ دونوں بھائیوں نے ساتھ ہی یزید کی فوج پر حملہ کر دیا ہے، تلواریں مارتے ساتھ ساتھ بڑھتے چلے جا رہے ہیں کہ دشمن کی فوجیں دونوں کے درمیان میں حائل ہو گئیں، اب بھائی سے بھائی جدا ہو گیا ہے اس مقام پر دونوں کے یکایک مل جانے کو میر انیس یوں فرماتے ہیں:۔

وہ شیر سا پہنچا جو اُدھر یہ اِدھر آیا　　جاں آ گئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا

یعنی قاتلوں کے نرغہ میں آجانے سے ایک کو ایک کی صورت دیکھنے سے یاس ہو گئی تھی۔ (۳) یا مثلاً حُر کی آمد میں فرماتے ہیں:۔

برچھیوں اُڑتا ہے ذب دب کے فرس رانوں سے　　آنکھ لڑ جاتی ہے دریا کے نگہبانوں سے

گھوڑے کا اڑنا اور دریا کا نظر آ جانا یہ مضمون تو میر صاحب کا حدِ اعجاز کو پہنچ گیا ہے۔ اس کے علاوہ آنکھ لڑ جانے میں یہ معنی ادا کئے ہیں کہ تم نے سادات پر پانی تو بند کیا ہے ہشیار ہو جاؤ اب میں آتا ہوں

غرض مسلسل مضمون میں ایسا سماں بندھ جاتا ہے کہ شاعر کو ایسے موقع بھی مل جاتے ہیں کہ دو لفظوں میں بہت سی باتوں کو ادا کردے غزل گو کو دو مصرعوں میں ایسا میدان کہاں مل سکتا ہے۔

اب ثابت ہوگیا کہ غزل گو شعر کی اس خوبی سے محروم رہتا ہے جسے طلسم یا سحر یا اعجاز کہنا چاہیئے اس میں شک نہیں کہ ایسا سماں باندھ دینا جس میں یہ جادو جگا سکے بڑے بڑے سخن سنجوں کو بھی شاذ و نادر نصیب ہوتا ہے لیکن غزل گو کے لئے تو ممکن ہی نہیں۔

آخر سیدھا رستہ چھوڑ کر اُلٹی چال چلنے کا باعث کیا ہوا؟

سبب اس کا مشہور ہے کہ مبتدی اس قابل نہیں ہوتا کہ شاعرانہ مضمون سوچ کر نظم کرسکے۔ اس کے لئے قافیہ و ردیف اُسے بتائے جاتے ہیں۔ اب قافیہ کو ردیف کے ساتھ ربط دینے کے لئے اُسے مختصر سا مضمون سوچنا پڑتا ہے جو دو مصرعوں میں تمام ہوجائے۔ مثلاً فرہاد و بہزاد و صیاد قافیہ ہو تو وہی کوہ کنی و مصوری و صید افگنی کا مضمون سامنے آئیگا۔

محمل و بسمل و منزل قافیہ ہو تو محمل لیلیٰ کی طرف اشارہ کرے گی۔ بسمل قاتل کا پتہ بتائے گا اور منزل کے لئے تو جادہ پیش پا افتادہ ہے۔

غزل گو کہے ہوئے مضمونوں کو بار بار کہتا ہے۔ وہ فخر اس بات پر کرتا ہے کہ کہنہ مضامین کو ہر مرتبہ لباس نو میں ظاہر کرتا ہے۔ غزل کی ایجاد کا دوسرا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ معنی کو نئی نئی صورتوں میں دکھانے کی مشق پیدا کی جائے۔

اس قیاس کے صحیح ہونے کا بڑا قرینہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں غزل ایجاد ہوئی ہے اُسی زمانہ میں فن بلاغت کی تدوین و تہذیب ہورہی تھی۔

پہلے شیخ المعتزلہ جاحظ نے جو متوکل و معتصم عباسی کا معاصر تھا بیان و تبیین نام ایک مختصر سی کتاب شائع کی جو آج تک گویا درس میں جاری ہے۔ پھر امام عبد القاہر جرجانی نے اسرار البلاغۃ لکھ کر آنکھوں پر سے پردے اُٹھا دیے اور دلائل الاعجاز کی تالیف سے قرآن کے وجوہ اعجاز کو بے نقاب کر دیا۔ انھوں نے جو موتی رولے تھے وہ بکھرے ہوئے تھے۔ علامہ سکاکی نے گوہر شب چراغ چن چن کر ایسی لڑی ڈبیوں کو بھریں کہ فن کی تہذیب و ترتیب اس سے بہتر ہو نہیں سکتی تھی۔

پھر بھی بعض علماء نے سکاکی پر دقیق نظر ڈال کر ترتیب کو بدلا و تحقیق کردی اس کی سیر حاصل تعلیم میں اور بعد اسلام میں جو ایجاد ہوئے تھے۔

آخر میں فاضل تفتازانی نے بڑی جہد کرکے اُس متن متین پر شرحیں لکھ ڈالیں اور اُس کے فیض کو عام کردیا۔ عرب سے لیکر ہندوستان و سمرقند سے لیکر جرجان تک معانی بیان کے درس جاری ہوگئے۔

اس فن کے پڑھنے سے اعجاز قرآن واضح ہوتا ہے، اس سبب سے فن بلاغت جزو مذہب سمجھا گیا۔ خاص کرکے فنِ بیان علمانے اس امر کی تعلیم کے لئے لکھا ہے کہ ایک معنی خاص کو متعدد طریقوں سے ادا کرنے کی صورتیں کیا کیا ہیں۔ مثلاً تشبیہ۔ استعارہ۔ مجاز کنایہ پھر ان میں سے ہر ایک کے اقسام گوناگوں ہیں۔ یعنی ایک معنی خاص کے ادا کرنے کے فن بیان میں سیکڑوں طریقے ہیں جب اس فن کی تعلیم کا رواج عالمگیر ہورہا تھا اُسی زمانہ میں غزل ایجاد ہوئی ہے، یعنی جو پڑھیں اُس کی مشق بھی کریں۔

سعدی کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک غزل کے مضامین ایک ہی طرح کے چلے آتے ہیں، اور بار بار کہے جاتے ہیں۔ یہ سب مضامین عامّۃ الورود ہیں اس لئے کہ فطرۃ انسانی سب میں مشترک ہے، ایک ہی طرح کے ولولے، ایک ہی طرح کی اُمنگیں، ایک ہی قسم کے جذبے سب میں پائے جاتے ہیں، مضمون کہاں سے الگ الگ لائیں گے، طرز بیان کا الگ الگ ہونا البتہ ضرور ہے۔

کلام میں دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں، ایک تو اصل مضمون، دوسرا طرز بیان، ان دونوں میں اصل مضمون کسی کا مال نہیں اس لئے کہ وہ ہر شخص کا مال ہے، ہاں طرز بیان اپنا اپنا الگ ہونا چاہیئے ورنہ سرقہ کا الزام عائد ہوگا۔

طرز بیان ہی وہ چیز ہے کہ جس کے لئے علمائے اسلام نے فنِ بیان کو ایجاد کیا اور غزل گویوں نے اس مشق کو حدِ اعجاز تک پہنچا دیا۔

لکھنؤ کا ایک شاعر زناربند جس کا سارا کلام زمانہ نے شاید تلف کردیا ایک عارفانہ مطلع غزل کا چھوڑ گیا ہے جو دلوں پر لکھا ہوا ہے اور کبھی نہیں مٹنے کا ؏

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں ۔۔۔ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

میرے کرم فرما نواب عبدالرحمٰن خاں شاطرؔ نے اس بیت سے کیا اچھا استنباط کیا ہے:۔

بے محل پڑتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم ۔۔۔ کوئی ہے تجھ پر سوار اے ابلق لیل و نہار

اصل مضمون یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ہر کام مصلحت و حکمت پر مبنی ہوتا ہے، اس مضمون کے ادا کرنے کے دو پیرایے دونوں بیتوں سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ اسے سرقہ نہیں کہہ سکتے۔ سرقہ کہنے کے یہ معنی ہوتے

ہیں کہ اس طرزِ ادا کو ترک کر دیا ہوتا۔ بلکہ بیدل کا یہ شعر:-

چوں کاغذِ آتش زدہ مہمانِ بقائیم　　　طاؤس پرافشاں چمنِ زارِ فنائیم

غالب کے اس شعر سے بہت مشابہ ہے:-

کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز　　　دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

بیدل نے بے ثباتیِ عمر کے بیان میں کاغذِ آتش زدہ کو طاؤس پرافشاں سے تشبیہ دی ہے، غالب نے جوشِ بہار کے بیان میں اس کاغذ کو دام سے اور اس کے شعلہ کو طاؤس سے تشبیہ دی ہے۔ دام وشکار کی نازک تفصیل نے مضمون ہی کچھ کا کچھ کر دیا۔ اس زمانہ کے مضمون نگاروں نے غالب کے کلام سے صدہا سرقے نکالے اور شائع کئے مگر وہ خود ہی نہیں سمجھے اور نہ سمجھیں گے۔ غور سے دیکھئے تو آپ اسے بھی سرقہ نہیں کہہ سکتے۔

مجھے ناصر علی کے اس مصرع سے:-

تپد در آئنہ جوہر چو ذرہ در روزن

غالب کا یہ مصرع یقینی اخذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے:-

پرافشاں جوہر آئینہ میں جیسے ذرے روزن میں

لیکن ذرّوں کا روزن میں پرافشاں ہونا تڑپنے سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے

جلال اسیر کے اس شعر سے بھی ؎

جنوں مستی و ہشیاری آزمود مرا　　　زبسکہ محو تو بودم ز من ربود مرا

دیکھئے مرزا غالب نے کیا خوب استنباط کیا ہے جو قابلِ وجد کرنے کے ہے ؎

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم　　　لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

غزل کے ان دو مصرعوں میں کیا کیا مضامین عالی نکل آتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ آتش نے بھی بے مثل کہا تھا غالب نے اس پر بھی ترقی کی۔ خبر یہ لوگ تو بڑے مرتبہ کے ہیں۔ نواب سید محمد خاں رند جو حقیقت میں رند ہی تھے ان کو دیکھئے اور اس شعر کو دیکھئے:-

میں مسافر ہوں اُتر جاؤں گا پار اک دم میں　　　تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا تیرا

اسی مضمون کو خواجہ میر درد نے اس طرح کہا تھا ؎

[illegible]ق ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط　　　[illegible]ر آ دمیں تو موجِ نسیم وزیدہ ہوں

اسی امید میں کہ شاید کوئی ایسا شعر نکل آئے عمر بھر فکرِ غزل نہیں تھمتی۔ اور تمام اصنافِ شعر ہیچ سمجھتے ہیں

کبھی غزل گو دو مصرعوں میں ایسا مضمون باندھ جاتا ہے کہ وہ مسلسل نظموں میں اس برجستگی سے
اتھ نہیں بندھ سکتا۔ نظیری کا یہ شعر لوگوں کے دلوں پر لکھا اور زبانوں پر جاری ہے ؎

بوے یارِ من ازیں سست وفا می آید　　گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

زا رفیع سودا نے اس سے یہ مضمون استنباط کیا اور اساتذہ کا کلام دیکھنے سے یہی استنباط سب کو
صود ہوا کرتا ہے ؎

کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سودا　　ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ئی یہ خیال کرے کہ میں سودا پر سرقہ کا الزام دھرتا ہوں، یہ ہرگز سرقہ نہیں، یہ مضمون ہر انسان
فطرات میں داخل ہے۔ جس زمانہ میں انگریزی کا مجھے شوق تھا اور گہرے کی نظموں کا ترجمہ کر رہا تھا
مضمون ٹینیسن[1] کے یہاں میں نے اس لباس میں دیکھا:۔

کہ "شگوفوں نے بیخودی میں اپنے عطر دانوں کا عطر لنڈھا دیا۔"

بات وہم میں بھی نہیں آتی کہ نظیری کا یہ مضمون ٹینسن تک پہنچا تھا۔
اسی مضمون کو مونس نے اس طرح باندھا ہے کہ مسدس کے ایک بند میں کربلا کی سرزمین کا
کر کیا ہے جہاں بہار آئی ہوئی ہے۔ ع

بلبلیں پھول لئے پھرتی ہیں منقاروں میں

مصرع پڑھ کر مجھے مرحوم کا یہ کہنا بھی یاد ہے کہ سب صاحب اس مصرع کو یاد رکھیں، اس کے بعد دوسرے
بند میں بنی فاطمہ کے نونہالوں کا ذکر چار مصرعوں میں کیا ہے، بیت یہ ہے:۔

ان کی نکہت جو گذر جاتی ہے گلزاروں سے　　بلبلیں پھول گرا دیتی ہیں منقاروں سے

پ نے دیکھا کس قدر پھیلا کے اس مضمون کو مونس نے کہا کہ اُنھیں کہنا پڑا کہ سب صاحب اس مصرعہ کو یاد رکھیں
بادشاہ کے سبعہ سیارہ میں مرزا علی بہار مرحوم نے اسی مضمون کو سلام میں کیا خوب کہا ہے ؎

باغ میں مدح کی بیتیں جو پڑھ دیتی ہیں　　ڈالیاں جھوم کے پھولوں کو گرا دیتی ہیں

جس مضمون کے لئے مونس مرحوم کو مسدس کے کئی بند کہنا پڑے نظیری و سودا و بہار نے دو ہی مصرعوں
ں نظم کیا ہے۔
طولانی مضمون کو مختصر کرنے کی مشق غزل گو کو ہو جاتی ہے اور ایسا ہونا بھی چاہئیے۔

---

[1] Tennyson

حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، جس کی بدولت دین محمدی کو غیر معمولی جو قبولیت عام حاصل ہوئی
مغربی محققوں اور مورخوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ تمدن ناآشنا اقوام پر اسلام کا نہایت مفید اثر ہوا
ہے اور اس سے ان کی تمدنی اور اخلاقی حالت بہتر ہو گئی ہے۔

اسلام کا انقلاب انگیز اثر عربوں پر
یہ امر مسلمہ ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا انقلاب انگیز اثر عربوں پر ہوا، اسی کے اثر سے انھوں نے صدیوں کے عقائد اور توہمات، رسمیات اور مراسم دفعتہً دریابرد کر دیے۔ ان کی جدی پھوٹ اور موروثی عداوت سینکڑوں سالوں کی باہمی خانہ جنگی اور لوٹ مار، باپ دادا کے مذہبی دستور کی نمائشی تقلید اور سچے مذہب سے بیگانگی یک قلم رخصت ہو گئی۔ لاثانی اتحاد و اتفاق کے علاوہ ان کے سینے میں ایسی تمنا جوش زن ہو گئی جس کی وجہ سے پرانے زمانے میں اہل آسوریہ، اہل ایران، اہل یونان، اہل روما، یا قرون وسطی میں گاث قوم اور زمانۂ حال میں اہل فرانس نپولین کے زیر ہدایت عالمگیر سلطنت قائم کرنے کے خواب دیکھتے تھے۔ اگر حضرت محمد کے دعوئے رسالت سے پہلے کے ملک عرب اور اس کے باشندوں کی حالت پر اجمالی نظر ڈالی جائے تو بخوبی واضح ہو جائیگا کہ اسلام کی بدولت کیسا معرکۃ الآرا تغیر ظہور میں آیا جس کی نظیر اور جگہ تلاش کرنا تحصیل لاحاصل ہے عرب ماقبل از ظہور اسلام کے حالات کا مشہور فرانسیسی محقق ڈوزی یوں لکھتا[1]:-

"حضرت محمد کے زمانہ کے عرب میں بے شمار قبائل تھے جن میں سے بعض تو قصبوں اور شہروں میں مختلف وسائل معاش میں مصروف تھے مگر باقی اپنے گلوں اور ریوڑوں و خیمے سمیت جا بجا پھرتے تھے ان کا نہ تو کوئی مشترکہ مرجع تھا اور نہ مشترکہ مفاد کا احساس نمایاں تھا۔ ایک قبیلہ دوسرے سے آئے دن برسر پرخاش رہتا تھا۔ اُس وقت سرزمین یورپ اپنی علمی ترقیوں پر نازاں تھی مگر اہل عرب ترقی کے نام ہی سے ناآشنا تھے۔"

ماقبل از ظہور اسلام کے زمانہ کو عرب کی تاریخ کا "زمانۂ جاہلیت" پکارنا مسلمان اہل قلم کا دستور العمل ہے۔ نامی مسلم محقق شیخ خدا بخش[2] بیرسٹر اُس زمانہ کے عربوں کے متعلق یوں لکھتے ہیں:-

"ظہور اسلام سے پہلے اہل عرب متحد نہ تھے، جذبۂ وطن پرستی سے وہ محض ناآشنا تھے۔ ان کے لئے قبیلہ ہی سب کچھ تھا، وفاداری اور اخلاق بھی اُسی سے وابستہ تھا، کشت و خون، لوٹ مار اور غیر عورت سے حرام کاری قبیلہ کے باہر روا تھا۔ مختلف قبائل ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے، قصاص اور زر فدیہ

۱؎ دیکھئے "محمد۔ بدھ۔ کرائسٹ" ص۲۲ مصنفہ پروفیسر ایم ڈاڈز مطبوعہ ۱۹۰۵ء۔
۲؎ "کانفرنس آف ریلی جنز" جلد اول ص۱۷۱-۱۷۷ مطبوعہ ۱۹۰۹ء

کا عام رواج تھا۔ نظام تمدن اور نظام حکومت سے وہ محض بیگانہ تھے۔"

کیا اہل عرب بالکل وحشی اور لوازم تمدن سے سر بسر محروم تھے؟ بالعموم مسلم اہل قلم اس نازک سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی کتابوں میں "زمانۂ جاہلیت" کا محاورہ بار بار آتا ہے۔ مگر یورپ کے سب سے مشہور مستشرق اور مورخ رینان کی رائے مختلف ہے۔ چنانچہ وہ رقمطراز ہے:۔

"طلوع اسلام سے پہلے کے عربوں کو جاہل، توہم پرست اور وحشی سمجھنا حقیقت سے بعید ہے۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ وہ بڑے بیدار مغز، راسخ الاعتقاد اور اپنے عقائد کی صحت میں عموماً شک کرتے تھے۔ میری رائے میں تاریخ تمدن میں کوئی تصویر ایسی دلفریب، من موہنی اور دل کو گرویدہ کرنے والی نہیں پائی جاتی جیسی کہ ظہور اسلام سے پیشتر کے ملک عرب کی معاشرت کی کیفیت معلقات میں پائی جاتی ہے۔ افراد کو غیر محدود آزادی حاصل تھی، حکومت اور قاعدہ کالعدم تھا، خودداری اور آن کا خیال بہت اونچا تھا، گو وہ بھیڑ بکریاں چراتے تھے مگر شجاعت اور بہادری کا خیال بھی بہت عام تھا۔ ہو وحسب، کینہ و بغض اور نیز تصوف کی جولانی قابل قدر تھی۔ شعراء دل خوش کرنے والی غزلیں بناتے تھے۔ مذہب کا خیال ان میں عقائد کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ عشق پاکیزہ اور الفت شستہ کے بیحد دلدادہ تھے۔ لیکن اسلام کی اشاعت اور تبعیت سے عربوں کی یہ تمام قابل قدر خصوصیات نابود ہو گئیں۔"[1]

حق اور انصاف کے حامیوں کو یہ بات تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں کہ عرب لوگ تجارت کے بڑے شائق تھے۔ ان کے قافلے شمال میں شام کو، مغرب میں مصر والی سینا، بحیرۂ عرب و یمن کی تجارت خشکی کے رستہ سے اور سمندر کے راستہ سے سندھ، گجرات اور جزائر بحر ہند کی تجارت بھی کیا کرتے تھے۔ نہ صرف ان کے پاس مال و متاع ہی جمع ہو گیا تھا بلکہ اغیار کے ساتھ راہ و رسم ہونے سے ان کے خیالات میں بھی حد درجہ وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے دماغ روشن اور عقل پختہ ہو گئی تھی۔

ملک عرب میں اگر ایک طرف حضرت ابراہیم کا مذہب مروج تھا جس کی رو سے فقط ایک خدا پر ایمان لانا لازم تھا تو دوسری طرف اصنام پرستی، خرافات کی پرستش اور زندگی گزری بزرگوں کی پوجا بھی رائج تھی۔ خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ دیوتا تھے جن کا مصدر اور مرجع خدا اور اس کا قرب تھا۔ ان میں بیشمار اصنام رکھے تھے۔ مکروہ اور مذموم چیزوں کی مورتیاں بھی معبودوں میں شمار ہوتی تھیں۔ قدرت اور آخرت کے خیالات بہت مبہم اور پراگندہ تھے۔ بعض گروہ قدم عالم اور دور تسلسل کے قائل تھے۔ اور بعض آغاز اور انتہا مانتے تھے۔ بعض تناسخ کا اواگون پر بھی اعتقاد تھا، اور یہ مانتے تھے کہ دماغ کے خون سے ہما پیدا ہوتا ہے۔ جو سو سال میں ایک مرتبہ ...

---

[1] ریویو جنرل آف ہسٹری صفحہ ۹۴ تا ۱۰۰

لی زیارت کرتا ہے۔ عربوں کے کئی دستور بہت بُرے اور قابل الزام تھے، ایک آدمی اٹھارہ
کر سکتا تھا جب باپ مرتا تو اس کی جائداد کے ساتھ اس کی عورتیں بھی بیٹے کے ورثہ میں آتی تھیں
ں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا جب لڑکی چھ برس کی ہوجاتی تو باپ اسے سنگار کرکے جاتا، گڑھے میں ڈھکیل
سے مٹی سے اُسے پاٹ دیتا تھا۔ ایک مغربی محقق کا بیان ہے کہ ایک رحم دل آدمی نے دو سو اسی[۲]
کی جانیں بچائی تھیں، جس سے یہ ظاہر ہے کہ دختر کشی کا کیسا ظالمانہ دستور تھا۔ اہل عرب قمار بازی اور
ہ کے بڑے شائق تھے۔ مذموم دستور ہر جگہ تھے۔ ہر ایک قبیلہ ان کا پابند تھا۔ ظہور اسلام سے پہلے کا عربی
بہتر منظوم تھا اور اتنا مبسوط و کثیر تھا کہ بعض باکمال ایک حرف اور وزن کے سو سو شعر کہا کرتے تھے۔
حضرت محمد کی تبلیغ اسلام اور مساعی حسنہ سے جب عربوں نے آبائی عقائد اور مراسم سے انحراف کیا اور اسلام
ان میں حیرت انگیز تغیر واقع ہوگیا، ان کی قلب ماہیت ہوگئی، مذاہب نسبتی اور فلسفۂ دینیات کے شہرہ
ستاد پرنسپل ایم۔ اے۔ فیربرن اس انقلاب عظیم کی بابت لکھتے ہیں:۔

"اہل عرب اس طوائف الملوکی اور انقلاب مذہب و تمدن سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے تھے جن کے سبب سے پُرانی ممتاز قوموں کا نظام تمدن تہ و بالا ہوگیا تھا۔ وہ علم و ہنر سے اپنے بزرگوں کی مانند محض ناآشنا تھے۔ سوائے خدا کے وہ کسی بادشاہ کے آگے سر نہ جھکاتے تھے۔ باوجود اس قدامت پرستی اور بزرگوں کی اندھا دھند تقلید کے جب یورپ میں زوال اور انحطاط رونما ہوچکا تھا تو صدہا سال سے خانہ جنگی میں مصروف رہنے والے عرب قبائل آناً فاناً لق ودق ریگستان سے اُٹھے اور شمال، مغرب اور مشرق پر چھا گئے۔ ان کی لشکر کشیوں کی مزاحمت کی کسی کو تاب نہ رہی۔ بحر اوقیانوس کے ساحلوں سے لیکر وادیٔ سندھ تک عربوں کی شاندار سلطنت قائم ہوگئی۔ مشرق کے کہنہ سال تمدن کے نام لیوا قوموں میں ان کے روک تھام کی ہمت اور قوت نہ تھی۔ مگر ریگستان عرب کے ناتراشیدہ اور اُجڈ لوگ نئے مذہب کی کرامات سے ایک جان اور رشتۂ اخوت میں جکڑے ہوئے تھے، ان کے سینے میں عجیب و غریب جوش موج زن تھا۔ ان کے کارناموں سے ماضی کا کلنک نابود ہوگیا، اور مستقبل نئی روح کی قوت سے سرشار ہوگیا۔ اسلام کی برکت سے ان کا بکھرا ہوا شیرازہ مستحکم ہوگیا۔ ان کی تاریخ ماضی ان کے بزرگوں کے قابل فخر کارہائے نمایاں سے بالکل بیگانہ تھی لیکن اسلام کی بدولت وہ دفعتہً معراج پر جا پہونچے۔ ان کا ستارۂ اقبال ساتویں آسمان پر چمکنے لگا۔ ان کا اقتدار اور غلبہ بیحد بڑھ گیا، بڑے بڑے تاجدار ان کے نام سے تھراتے تھے" حضرت محمد کے نئے مذہب کو قبول کرنے سے عرب دنیاوی عروج و اقبال سے دوچار ہوئے۔

سٹڈیز ان دی فلاسفی آف ریلیجن" صفحہ ۳۹۴ - ۳۹۵

سارے جہان میں ان کی بے پناہ یلغاروں کی دھوم مچ گئی۔ لیکن اس قوم کے اخلاق پر اسلام کا جو اثر ہوا تھا وہ ذیل کے اقتباس سے واضح ہوتا ہے۔ اہل مکہ کی سخت مخالفت کے سبب سے آنحضرت نے اپنے مٹھی بھر معتقدوں کے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کو مجبور ہوئے۔ اسی جماعت کے تھوڑے سے آدمی بھاگ کر ابی سینیا کو چلے گئے تھے۔ ان کے سرگروہ نے دربار ابی سینیا میں یہ بیان[1] کیا:۔

> ہم لوگ جہالت اور وحشت میں سرتک ڈوبے ہوئے تھے۔ ہم بتوں کی پوجا کرتے اور مردار کھایا کرتے تھے۔ ہر قسم کی حرام کاری اور بدکاری ہمارا دستور العمل تھا۔ خاندانی تعلقات کی حقیقت سے ہم محض ناآشنا تھے۔ مہمان نوازی اور ہمسائگی کے فرائض ہم سمجھتے ہی نہ تھے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے قاعدہ سے ہم ہر بات میں ہدایت حاصل کرتے تھے۔ خدا نے اپنے فضل وکرم سے اپنا رسول ہمارے پاس بھیجا جس کی اصل، راست شعاری، صداقت اور بےگناہی سے ہم خوب واقف تھے۔ اس نے ہم کو توحید کا سبق پڑھایا، شرک کی ممانعت کی، امانت میں خیانت نہ کرنے، ترس کھانے، دوسروں کے حقوق کے لحاظ، سب سے پریم کرنے، زیردستوں کے حقوق کی نگہداشت اور بد اور بدکاری سے دور بھاگنے کی تلقین کی۔"

اس سے عیاں ہوتا ہے کہ جو لوگ حضرت محمد پر ایمان لائے ان کے دل منور ہو گئے۔ ان کی وحشی طبیعت بدل گئی اور ان کے اخلاق شستہ اور پاکیزہ ہو گئے۔

پچھلی بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت محمد کی مساعی حسنہ سے ملک عرب میں اسلام کا ظہور ہوا جس کے اثر سے اس ملک کے باشندوں کی کایا پلٹ گئی۔ عرب لوگ صدیوں کے قعر ضلالت سے نکلے اور دفعتہً معراج اوج پر جا پہنچے۔ سارے جہان میں ان کا ڈنکا بجنے لگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت نے کیسا شاندار کارنمایاں انجام دیا ہے جس کی نظیر تاریخ جہان میں ڈھونڈھے نہیں ملتی۔

بانی اسلام کے سوانحی حالات

ظہور اسلام سے تاریخ جہان کے ایک بالکل نئے دور کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا کرشمہ اہل عرب کی کایا پلٹ ہے۔ اس کی بدولت سے ان کے اندر ایک عجیب وغریب جوش پیدا ہو گیا جس سے وہ وادی سندھ اور ترکستان سے لیکر بحر اوقیانوس تک پھیل گئے۔ بیسیوں مختلف نسل قومیں ان کے زیر نگین تھیں جن کی معاشرتی حالت پر اسلامی حکومت کا مستقل اثر ہوتا ہوتا تھا۔ خلفائے عباسیہ کے عہد میں وہ [illegible]

[1] منقول از محمد، بدھ، کرائسٹ، مصنفہ پروفیسر مارکس ڈوڈز۔

کی ترقی کو تحریک عظیم پہونچی۔ دین محمدی حضرت محمدی ذات بابرکات سے وابستہ ہے اگر آپ نہ ہوتے تو یہ عرصۂ وجود میں نہ آتا۔ سب سے پہلے اسلام کی صداقت کا ظہور آپ کے سینہ میں ہوا، آپ نے اس کا دوسروں پر اظہار کرنا اپنا فرض مقدس ٹھہرالیا۔ آپ کے استقلال اور ایمان سے اثر پذیر ہو کر آپ کے عزیزوں اور دوستوں اور ہمسایوں نے آپ کا پیش کردہ مذہب قبول کیا، آپ کی مساعی حسنہ کا یہ نتیجہ ہے کہ اس وقت تیس کروڑ کے قریب مسلمان دنیا میں موجود ہیں۔ آپ کا جو احترام مسلمانوں کے دلوں میں ہے وہ دوسروں کی نظر میں نہیں ہو سکتا مسلمان آپ کو "سید المرسلین" "خاتم النبیین" "سرور کائنات" وغیرہ شاندار ناموں سے موسوم کرتے ہیں ارباب تحقیق کی نگاہ میں بھی آپ ایک ایسے مذہب کے بانی ہیں جس کے نام لیوا جنوبی وسطی اور مغربی ایشیا، اور شمالی افریقہ میں کروڑوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے مناسب ہوگا اگر یہاں پر آپ کے حالات زندگی اور اوصاف و خصائل بیان کئے جائیں۔

ولادت اور شباب

حضرت محمد سنہ ۵ء میں مکہ میں تولد ہوئے تھے، آپ اشرف القبائل قبیلہ قریش سے تھے والد کا نام عبد اللہ ابن عبد المطلب اور والدہ کا نام بی بی آمنہ تھا۔ ماں باپ کی شفقت و محبت سے آپ صغر سنی ہی میں محروم ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے پہلے دادا کی زیر نگرانی پرورش ہوئی۔ بعد میں چچا کے زیر ہدایت تربیت پائی۔ لڑکپن میں آپ جسم کے لاغر اور انتہا درجہ کے تنہائی پسند واقع ہوئے تھے۔ آپ کے رفیق اور ساتھ کھیلنے والے بہت تھوڑے لڑکے تھے، اس وجہ سے اکیلے ریوڑ چراتے اور عالم خیال میں غرق رہا کرتے تھے۔ آپ کے دادا مکہ کے دینی اور دنیوی حاکم تھے جو عربوں کی بت پرستی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ آپ نے دینی تربیت اپنے بزرگوں سے مکہ کے مندر کی شاندار دیواروں کے سایہ میں حاصل کی تھی۔ شروع ہی سے آپ کی طبیعت بڑی ذکی الحس اور نازک خیال واقع ہوئی تھی، عربوں کی معاشرت اور عادات میں جو مذموم اور قابل نفرین باتیں تھیں، آپ کو فطرتاً اُن سے کراہت اور نفرت پیدا ہوگئی تھی شریفانہ اور ارفع جذبات آپ کے مزاج پر غالب رہتے تھے، گو آپ عموماً سوچ بچار میں منہمک رہتے تھے۔ دکھیا لوگوں کے دکھ درد کا آپ کی طبیعت پر بہت گہرا اثر ہوتا تھا۔ جب سن بلوغت کو پہونچے تو قافلہ کے ساتھ شام کو جانا شروع کر دیا، اس سیر و سیاحت کا آپ کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر پڑا۔ تنہائی میں آپ بڑے بڑے منصوبے سوچا کرتے تھے، جوانی نیکنامی اور پاکیزگی کے ساتھ بسر ہوئی، جو اُس زمانہ کی بداخلاقیوں اور مذموم رسموں کے باعث ایک غیر معمولی اور قابل تحسین بات ہے۔ آپ معاملے کے ایسے کھرے تھے کہ اہل تجارت میں امین کے لقب سے مشہور ہو گئے جس کا مطلب یہ ہے کہ لین دین اور کاروبار بھگتانے میں بڑے مستعد، ایماندار اور ہوشیار تھے، اور حق الامر یہ ہے کہ آپ کی بلند نظری، پختہ خیالی اور عالی ہمتی سے اسی قسم کی خوبیوں کی توقع ہو سکتی تھی۔ سنہ ۵۹۵ء میں آپ کا

نکاح بی بی خدیجہ کے ساتھ ہوا۔ جو ایک متمول بیوہ عورت تھیں۔ چالیس سال کی عمر میں آپ نے نبوت کا
دعویٰ کیا جسے سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ، ابوبکرؓ اور ایک دوست نے قبول کیا۔ دوست واحباب شش
و پنج میں تھے۔ کہ آپ کی رسالت پر ایمان لائیں یا اُسے مسترد کردیں۔ مگر اور لوگ بہ حیثیت مجموعی آپ کی
مخالفت پر کمربستہ ہوگئے اور آپ کے دین کو مہلک بدعت قرار دیا۔ اس وجہ سے برسوں تک کشاکش جاری
رہی۔ ایک طرف ایمان اور دوسری طرف جمعیت کثیر تھی۔ آخر کار ۶۲۲ء میں آپ اپنے رفقا سمیت مکہ سے
مدینہ کو ہجرت کر گئے جہاں آپ کا خیر مقدم ہوا۔ سنِ اسلامی اسی انقلاب انگیز واقعہ سے وابستہ ہے۔ مدینہ
سے اسلام کی تاریخ کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ تیرہ برس تک آپ حلم وانکسار، بردباری اور تحمل
سے اپنے دین کی تلقین کرتے رہے۔ آپ کا سب سے بڑا ہتھیار فصاحت اور قوت بیان تھی۔ مگر ابتدا میں
اس کا لوہا بہت تھوڑے لوگوں نے تسلیم کیا تھا۔ مدینہ میں کچھ عرصہ کے بعد ایسے حالات رونما ہوئے
جن کے سبب سے آپ کو تبلیغ دین کے پرانے طریقے میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مدینہ میں ایمانداروں
کی تعداد ہر سال بڑھتی چلی گئی۔ مکہ سے جو لوگ آپ کے ہمرکاب مدینہ پہونچے تھے اُنھوں نے آپ پر یہ واضح
کیا کہ ناکردہ گناہوں کی دادرسی اور حمایت لازم ہے۔ اس لئے ایمانداروں کی جمعیت بہم پہونچائی جس کے آپ
کمانیر اور ہادی بنے۔ اس کا بہت بھاری اثر ہوا۔ عرب سرداروں پر آپ کے اس پُر زور انداز کا رعب
غالب آگیا۔ لوگ دھڑا دھڑ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اس طرح آپ اسلام کے بانی، مبلغ، محافظ بنے۔
اور اپنے معتقدوں کے سردار کہلائے۔ گویا حکومت اور مذہب باہم دگر شیر و شکر ہوگئے۔ یہ کارنامہ بالکل
بے نظیر ہے۔ اور آنحضرت کی لاثانی قوت ارادی اور طاقت روحانی کا عجیب وغریب کرشمہ ہے۔ آپ سے
تقریباً گیارہ سو سال پیشتر بھگوان شاکی منی گوتم بدھ نے اور پونے چھ سو برس پہلے یسوع عیسیٰ مسیح نے
مذاہب قائم کرکے پھیلائے تھے۔ مگر ان کا دنیاوی معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ تاریخ مذاہب میں اگر
کوئی مثال آپ کی ہدایت کے لئے مل سکتی ہے تو حضرت موسیٰ کی ہے جو ملک مصر سے بنی اسرائیل کو جزیرہ نما
سینا کے بیابانوں سے صحیح وسالم نکال کر ملک یہودیہ کو لے گئے اور جامع شریعت مرتب کی جو توریت میں
پائی جاتی ہے۔ غرض وہ ہر حیثیت سے اپنی امت کے سرگروہ تھے۔ لیکن آنحضرت کی جدت اور بالغ نظری
اس بات سے آشکارا ہے کہ آپ نے مذہب کی بنیاد جمعیت اور امت کے جارحانہ طرزِ عمل پر قائم کرکے
اپنی جداگانہ جمہوری حکومت قائم کردی جس سے حکومت اور مذہب آپس میں مخلوط ہوگئے۔ ہجرت
کے بعد مدینہ اسلام کا دار الصدر بن گیا۔ آپ نے جمعیت کثیر کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کی تب اہل مکہ کا رویہ
بدل گیا تھا۔ ہزاروں آدمی جو لات اور عزّیٰ اور منات کی قسمیں کھاتے تھے۔ اسلام میں شامل ہونے آئے۔

اور آپ کے مقلدوں کا شمار روز افزوں ہونے لگا۔ پورے تیئس سال کی رسالت کے بعد تریسٹھ برس کی عمر میں رخصت ہوئے، یہ جون ۶۳۲ء کا واقعہ ہے۔

حضرت محمد کی سب سے پہلی سوانحعمری ابن اسحٰق نے ۱۵۱ھ میں مرتب کی تھی، واقدی نے ۲۰۷ھ میں۔ ابن ہشام نے ۲۱۳ھ میں اور طبری نے ۳۱۰ھ میں آپ کے واقعات زندگی قلم بند کئے تھے۔ زمانۂ مابعد کے مسلمان علما نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں آپ کے کارہائے نمایاں اور حالات زندگی مرقوم ہیں۔ مغربی ماہروں کا یہ خیال ہے کہ عربوں نے آنحضرت کے جو حالات لکھے ہیں ان میں ان عجیب و غریب حوادث کا ذکر نہیں ملتا جو بھگوان بدھ اور دیگر بانیان مذاہب کی ولادت سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے آپ کی پیدائش اور افلاطون، سکندر اور نپولین اعظم کی پیدائش کے کوائف میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ مغربی ماہروں کی رائے میں اس کا بڑا سبب عربوں کی نفسیاتی اور ذہنی خصوصیت ہے، جو واقعات کو فطری رنگ میں دیکھنے اور قدرتی رنگ میں رنگنے کے عادی ہیں اگر فوق الفطرت واقعات کے ظہور کی تلاش ہے تو عربی کتابوں میں نہیں ملیں گے، بلکہ آریہ نسل ایرانیوں کی تصنیفات کی ورق گردانی کرنے سے یہ آرزو پوری ہوگی۔ مشہور جہاں فرانسیسی محقق اور ماہر السنۂ سامی رینان ایرانی تصنیف "حیات القلوب" کے حوالہ سے یوں لکھتا ہے[۱] "جس رات آنحضرت دنیا میں رونما ہوئے اُس وقت بہشت میں ستر ہزار محل لعلوں کے اور ستر ہزار موتیوں کے تعمیر ہوئے تھے۔ لاثانی دولت حسن سے مالامال دائیاں بے بلائے ولادت کے وقت حاضر تھیں۔ آپکے ہمرکاب ایک قرص منور بھی نمودار ہوا تھا جس کی روشنی ملک عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چمک گئی۔ عالم ظہورات میں قدم دھرتے ہی آپ نے آسمان کی طرف آنکھیں اُٹھا کر باواز بلند یوں پکارا "سوائے اللہ کے کوئی خدا نہیں، اور میں اُس کا رسول ہوں"۔ جب آپ تین برس کے ہوئے تو فرشتوں نے آپ کا پہلو چیر کر گناہ کے سیاہ خون کے قطرے دل بھینچ کر نکال ڈالے۔ آپ آگے اور پیچھے دونوں طرف دیکھ سکتے تھے آپ کے لعاب دہن کے اثر سے سمندر کا کھاری پانی میٹھا ہو جاتا تھا، آپ کا سایہ نہ تھا، اور پسینہ موتیوں کے مانند تھا۔" ایران ہی پر کیا موقوف ہے مذکورۂ صدر روایات ملک ہند اور دیگر ملکوں کے مسلمانوں میں بھی مروج ہیں۔

آپ کا حلیہ مبارک اور اوضاع و اطوار — کسی نامی گرامی بزرگ کے سوانحی حالات پڑھتے وقت طبعًا یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ اُس کی شکل و صورت کی اجمالی کیفیت بھی معلوم ہو۔ اس وجہ سے آنحضرت کا مختصر

[۱] "ریلی جنز آف انٹی کویٹی" صفحہ ۱۲۷-۱۲۸

حلیہ بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

دنیا کے بڑے بڑے آدمیوں کی مانند حضرت محمد میانہ قد تھے۔ چہرے سے جو جلال ٹپکتا تھا وہ بادشاہو وبھی نصیب نہیں ہوتا۔ یہ اس امر پر دال تھا کہ خدا نے آپ کو اپنے ہم جنسوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے مور کیا تھا۔ سینہ کشادہ اور بدن گٹھا ہوا تھا۔ سر باوضع اور بہت بڑا تھا۔ ابرو لمبے سیاہ اور خمدار تھے۔ نکھیں سیاہ اور بڑی چمکیلی تھیں جو ایک طرف اعلیٰ درجہ کی ذکاوت اور طاقت تخیل پر اور دوسری طرف اثرات اور حسیات کی تیزی پر دلالت کرتی تھیں۔ دہن مبارک عمدہ اور چوڑا تھا جس سے مروت، ہمدردی اور فراخ دلی مترشح تھی۔ دانت موتیوں کی طرح چمکدار تھے۔ آپ کا ایک معتقد لکھتا ہے۔[1]

"حضور سب سے وجیہ اور سب سے بہادر تھے۔ بشرہ مبارک ایسا دمکتا تھا کہ اس کی مثال یں نہیں ملتی۔ فیاضی میں آپ سب سے بڑھے ہوئے تھے۔" یہ رائے آنحضرت کے محاسن ظاہری کے سبب سے ظاہر کی گئی ہے۔ آپ کی پیشانی میں ایک رگ تھی جو غصہ اور جوش کی حالت میں بہت ابھر آتی تھی۔ اس سے مزاج کی اشتعال پذیری اور ضبط نفس آشکارا ہوتا تھا۔ جب آپ تقریر کرتے تو قوت انی اور روحانی کا جوش بخوبی ظاہر ہوتا۔ بالعموم آپ آہستہ آہستہ بولتے تھے۔ مگر وعظ کے دوران میں طاقت جواز اختیار کرتی تو آواز گونجتی ہوئی مجمع کے انتہائی کونوں تک صاف سنائی دیتی تھی۔ جوش سے بدن ملا اٹھتا تھا۔ آپ کے اوصاف حمیدہ کی طرح چال بھی آپ کی عجیب و غریب سیرت کی مظہر تھی۔ آپ کا م ایسی تیزی سے اٹھتا تھا کہ کوئی ہمراہی آپ کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس سے یہ عیاں ہوتا ہے آپ کو اپنی منزل مقصود کا پختہ پتہ تھا اور آپ کو اس بات کا پورا علم تھا کہ راستے میں کوئی روکاوٹ حائل نہیں ہے۔ تیز روی سے اعلیٰ قوت فیصلہ اور استواری مزاج ظاہر ہوتی ہے۔

آپ اعلیٰ و ادنیٰ کو مساوی سمجھتے تھے۔ ہر ایک سے شرافت اور خلق سے پیش آتے تھے۔ موذی و خبیث پ کے پاس سو سو کوس بھی نہ پھٹکتی تھی۔ صبر و استقلال بے نظیر تھا۔ صبر سے سب کی بات سنتے تھے موں پر بڑے مہربان تھے۔ دوسروں کی راحت و خوشی کا ہر وقت خیال رکھتے تھے۔ شریفانہ برتاؤ کے ث آپ کے معتقد آپ کا بڑا احترام کرتے تھے اور [illegible] گرویدہ ہو جاتے تھے۔ سوال کرنے والے کو کبھی خالی ہاتھ پھیرتے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کی بھی دعوت قبول کر لیتے تھے۔ آپ کے انکسار و خلق کی تعریف کرتا ہوا [illegible] (Gagnier) لکھتا ہے۔ آپ کے طرز عمل سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ آپ اپنے ہم جنسوں کے [illegible] [illegible] سمجھتے تھے کہ آپ تمکنت، رعونت اور شوکت سے سراسر بیگانہ اور نمائش میں یکتا تھے۔ [illegible]

---

[1] منقول از [illegible] [illegible] صفحہ [illegible]

ذات کو قطعاً فراموش کرکے دوسروں کا خیال رکھنا بزرگی اور عظمت کا سب سے بڑا خاصہ ہے۔

خواص ستودہ اور بے نظیر سادگی

حضرت محمدؐ کی ذات میں بعض ایسی بے نظیر خوبیاں جمع ہوگئی تھیں جن کی بدولت اکھڑ عربوں کے دلوں میں بھی آپ کی عظمت کا نقش قائم ہوگیا۔ یہ خوبیاں آپ کے معاصرین میں عنقا تھیں۔ ان عالی خواص میں ایک صفت سادگی بھی تھی جو مہاپرشوں کا مشترکہ خاصہ ہے۔ آپ اپنے اونٹ اور گھوڑے کو بہت عزیز رکھتے تھے، ان کے جسم کا پسینہ اپنی آستین سے پونچھتے تھے، بلی کو اپنے ہاتھ سے روٹی کھلاتے اور پانی پلاتے تھے۔ ایک مرغ کا جو تنظر ٹو کا کام دیتا تھا، آپ کو بڑا دھیان رہتا تھا، آپ کو بچوں سے بیحد الفت تھی حالانکہ اُس زمانہ کے عرب اس خوبی میں قاصر تھے۔ مدینہ کا واقعہ ہے کہ آپ اپنی صاحبزادی کو پیار کررہے تھے کہ مقتدر سردار قیس بن آثم آنکلا پوچھا "حضرت! آپ کس مشغلہ میں مصروف ہیں؟" فرمایا "اپنی بچی سے دل بہلا رہا ہوں"۔ قیس بولا "یا اللہ میرے ہاں کئی لڑکیاں ہوئیں اور ان کی صورت دیکھے بغیر میں نے زندہ گڑھوا دیں، چہ جائیکہ میں آپ کی طرح انھیں سینہ سے لگاؤں"۔ آپ نے برہم ہوکر فرمایا "کمبخت! خدا نے تمہارے دل کو تمام انسانی جذبات شریفہ سے محروم کردیا ہے۔ انسان کو جو بڑی راحت عطا کی گئی ہے تم اس کے احساس سے محض بیگانہ ہو" اولاد کا پیار تمام خوشیوں میں افضل ہے۔ مگر اُس زمانہ کے عرب اس میں بیحد قاصر تھے۔ بی بی فاطمہ کے دو لڑکے حسن اور حسین تھے، آپ انھیں اپنے ساتھ لئے لئے پھرتے تھے اپنی لڑکیوں کو گود میں لیکر بازار چلے جاتے جس پر عرب رؤسا اور شیوخ کو بیحد حیرت ہوتی تھی۔ جب آپ کے لخت جگر ابراہیم کا انتقال ہوگیا تو اس سے آپ کو بیحد قلق ہوا اس کے بیان کی قلم کو طاقت نہیں ہے بقول پروفیسر ڈاڈز یہ سانحہ سب سے بڑا رقت انگیز اور المناک ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ کے الفت اور غم کے جذبات تمام عربوں سے بدرجہا بڑھے ہوئے تھے۔

بقول فرانسیسی مؤرخ ویل "جو کام آپ کرسکتے تھے اُسے دوسروں سے کبھی نہ کرواتے تھے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنے میں آپ کو تامل نہ ہوتا۔ اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں اپنی کسر شان نہ سمجھتے تھے۔ پھٹے پُرانے کپڑوں اور جوتیوں کی مرمت اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، بکریاں آپ دوہتے تھے، گھر کے معمولی کام بھی آپ ہی کرتے تھے، بازار سے سودا اپنے سر پر اٹھا کر لایا کرتے تھے۔ بزرگوں میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنی عظمت اور بزرگی سے سراسر ناآشنا ہوتے ہیں۔ اور یہ وصف حضرت محمدؐ کی ذات میں بدرجۂ کمال تھا آپ کی نجی زندگی سادگی کا نہایت اعلیٰ نمونہ تھی، آپ کے مکان کچے اور کھجور کی شاخوں کے بنے ہوئے جھونپڑے تھے۔ کھجور کی چٹائی بچھا کر زمین پر سوتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے نوکر عبداللہ نے چٹائی پر نرم بستر بچھانے کی

(۱) "ہسٹری آف انٹی کریٹی" صفحہ ۱۳

اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا "مجھے زندگی کی راحتوں سے کیا واسطہ! میرے لیے دنیا بمنزلہ درخت کے ہے جس کے نیچے مسافر بسیرا کر کے اگلی منزل کو روانہ ہوجاتا ہے" زمین پر سونے والے لذیذ غذاوں کے شایق نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے یہ لازم آتا ہے کہ آپ کا کھانا بالکل سادہ قسم کا ہوتا تھا حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ مہینوں تک چولھا ٹھنڈا پڑا رہتا تھا۔ آپ صرف کھجوریں کھا کر اور پانی پیکر بسر اوقات کرتے تھے۔ اگر کوئی معتقد دودھ دیتا تو پی لیا کرتے تھے۔ اگر گوشت مل جاتا تو پھر کسی اور چیز کی حاجت باقی نہ رہتی تھی۔ گر روٹی میسر آتی تو اور کسی شے کی ضرورت نہ تھی۔ آپ دولت دنیا میں اس قدر تہیدست تھے کہ رحلت کے وقت گھر کے چراغ میں تیل تک نہ تھا، تھوڑا سا روپیہ جو گھر میں موجود تھا اُسے آپ نے دنیا سے روانہ ہونے سے چند روز پیشتر غربا میں بانٹ دیا تھا۔ رینان کسی عرب مصنف کا قول نقل کر کے لکھتا ہے "گو مجھے دنیا میں مستورات اور خوشبوئیات سے خاص الفت ہے مگر راحت قلبی مجھے دعا ہی سے حاصل ہوتی ہے"

لاثانی استقلال سادگی معاشرت اور میل جول کی بے تکلفی کے علاوہ آپ میں بعض اور ممتاز خواص بھی تھے دنیا میں جن آدمیوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور تاریخ پر اپنا نقش چھوڑ گئے ہیں جیسے چنگیز خان، سکندر، تیمور، نپولین اعظم، ان سب میں غیر معمولی استقلال تھا۔ بانی اسلام میں بھی یہ وصف اپنے معاصرین سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ ناکامی اور ہزیمت آپ کے نزدیک کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ سخت سے سخت آفتوں میں بھی آپ کا حوصلہ پست نہ ہوتا تھا۔ خطرات میں آپ ہراساں ہونا کبھی جانتے ہی نہ تھے۔ آپ میں ہر ایک آفت سے کوئی نہ کوئی استفادہ حاصل کرنے کی عجیب و غریب صلاحیت تھی۔ ایک دفعہ دشمنوں سے بچنے کے واسطے آپ کو مع ابوبکر ایک غار میں چھپنا پڑا جس پر ابوبکر نے مایوسی کے عالم میں کہا کہ ہم دو آدمی اتنے آدمیوں کا کیا خاک مقابلہ کر سکتے ہیں! مگر آپ نے آہستہ سے فرمایا "ہم دو نہیں تین ہیں۔ خدا بھی تو ہمارے ساتھ ہے" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت کے اندر وہ زبردست اعتقاد تھا جسے خدا کی قربت کا احساس پکارنا واجب ہے۔ اور جس کے بغیر کوئی بڑی مہم سر نہیں ہو سکتی۔ اعتماد علی النفس اور خدا کے فضل کے بھروسہ ہی کی بدولت آپ کو اپنے منتہائے مقصود کی تکمیل میں شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ انھیں دونوں خوبیوں کی برکت سے انسان عروج کے بلند ترین مرحلہ پر پہونچتا ہے۔ بے نظیر استقلال کے ساتھ آپ کے دل میں اپنے دین کی صداقت اس درجہ راسخ ہو چکی تھی کہ اس کی اشاعت کرنا اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد تصور کرتے تھے۔ بلکہ اس سچائی پر اپنی جان نثار کرنے میں آپ کو تامل نہ تھا۔ یہی وہ روحانی قوت تھی جو آپ کی ہر بات، ہر کام اور طرز عمل کی محرک اور ہادی تھی۔ وعظ کے وقت یہ قوت جوش و جذبہ کی صورت اختیار کر لیتی تھی جس میں جول

[۱] سید جسٹس امیر علی "سپرٹ آف اسلام" صفحہ ۲۰۔ [۲] "محمد ہز لائف" [illegible] صفحہ [illegible]

ور رفتار گفتار میں یہی قوت خندہ پیشانی بے تکلفی اور شرافت بن کر ملنے والوں کے دلوں کو موہ لیتی تھی،
س کی قدرت سے آپ نے اپنا اسلام مقبول عام بنایا تھا۔ پروفیسر ڈاڈز رقمطراز ہیں: "اقتدار شخصی اور سیرت
ں بدولت آپ نے اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد حاصل کیا تھا۔ جو لوگ آپ سے واقف تھے وہی پہلے ایمان لائے
ور آپ کے حصول مقاصد کے معاون اور صادق ہی خواہ بنے تھے۔" آپ کی طبیعت میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر
مری تھی، آپ کا رعب سب کو مرعوب کر لیتا تھا، اگر آپ کی ذات میں فطری کشش نہ ہوتی تو دوسروں پر مستقل
ثر نہ ڈال سکتے۔ اگر اپنے ہمجنسوں کو گرویدہ کرنے کی جبلی طاقت نہ ہوتی تو آپ ان کے قلوب کو تسخیر کرنے میں
امیاب نہ ہوتے۔

خدا نے آپ کو غیر معمولی ذہانت اور ذکاوت عطا فرمائی تھی جس کے بغیر کوئی آدمی مہا پرش بننے کی توقع
ہیں کر سکتا۔ آپ بڑے بڑے منصوبے سوچتے اور شاندار خواب دیکھتے تھے۔ آپ کی معاملہ فہمی اور حسن تدبر اور مستعدی
ای تھی، جو کام ضروری معلوم ہوتا اُس کی تکمیل میں کبھی پس و پیش نہ کرتے تھے۔ جن نازک معاملات کا تصفیہ
وراً کرنا لازم تھا ان میں گھڑی بھر کی تاخیر بھی نہ ہونے دیتے۔ ریناں کہتا ہے کہ آپ انتہا درجہ کے عاقبت
ندیش تھے، خوب سوچے سمجھے بغیر کبھی قدم نہ اُٹھاتے تھے۔ قوت متفکرہ کی جولانی، تصور کی روانی اور خیال
ں پاکیزگی میں آپ کا ثانی ڈھونڈھنا محال ہے۔ اپنی قوت تخیل اور مزاج پر جیسا قابو آپ کو حاصل تھا ویسا
وروں میں تلاش کرنا تحصیل لاحاصل ہے۔ آپ کا دماغ ایسا سلجھا ہوا تھا اور قوتِ متخیلہ ایسی بلند پایہ تھی،
اس کی نظیر دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ پروفیسر ڈاڈز کا بیان ہے کہ فطرت شناسی اور تسخیر قلوب کا جیسا مادہ
ولین اعظم میں تھا ویسا ہی آپ کی ذات میں بھی تھا۔ اس خوبی سے آپ نے اپنے تمام معاصرین کو تسخیر کر کے
پنے حسب منشا کام لیا۔

پیغمبر اسلام کے لاثانی کارنامے

اس سے پیشتر اسلام کے تمدنی اور سیاسی اثرات، بانی اسلام کے سوانحی حالات، خصائل و فضائل
کا اجمالی ذکر ہو چکا ہے، اب آپ کے کارہائے نمایاں کا مختصر بیان بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

دین توحید اور اس کا اثر | آپ کا سب سے بڑا اور لاثانی کارنامہ یہ ہے کہ مذہب سے نابلد عربوں کو توحید کا
سبق پڑھایا جس کی کرامات سے انھوں نے بت پرستی اور مذموم رسمیات کو خیرباد کیا اور اُن کے اندر
یک ایسی روح پیدا ہو گئی جس کی تحریک سے وہ اسلام کی تبلیغ کی خاطر ہتھیلی پر جان لئے ہوئے انواع و اقسام

؎ محمد بدھ۔ کرائسٹ، صفحہ ۱۷

کی انہوں کا خوشی خوشی سامنا کرنے کو تیار ہوگئے۔ اگر آپ کی سیرت عربوں سے بدرجہا افضل وارفع نہ ہوتی تو آپ کے خویش واقارب اور دوست و آشنا آپ کے دعویٰ نبوت کے آگے سر تسلیم خم نہ کرتے۔ آپ ہی کے اندر وہ لاثانی روحانی قوت تھی جس سے ابوبکرؓ علیؓ اور عمرؓ کے سینہ میں وہی جوش اور حمیت پیدا ہوئی جو آپ کے سینہ میں جوش زن تھی۔ اسی کے اثر سے وہ اسلام کے لئے ہر قسم کے ایثار سے کام لینے کو کمربستہ ہوگئے۔ یہ اعجاز ہے جس کی اہمیت پر کماحقہ زور دینا دشوار ہے۔ قلیل تعداد اہل حنفہ کے سوا باقی تمام اہل عرب اصنام کے معتقد تھے۔ بہرحال ان بت پرستوں کے درمیان توحید پھیلانا آنحضرت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس امر کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ایک خدا کا عقیدہ آپ کے دماغ کی انوکھی اپج نہیں اختراع نہیں ہے۔ بلکہ یہ عقیدہ بہت پرانا ہے۔ آپ کی ولادت سے چار ہزار سال پہلے رگ وید میں اس کی تلقین ملتی ہے لیکن بائبل میں جیسی واضح تعلیم توحید کی ملتی ہے ویسی کسی اور پرانی مقدس کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ بس مقبول جہاں مقدس کتاب کی ابتدائی آیت میں یوں لکھا ہے "ابتدا میں خدا نے آسمان اور زمین پیدا کی۔" پیدائش کی کتاب کے ابتدائی فصلوں میں اسے "یہوواہ خدا" پکارا گیا ہے۔ شریعت موسوی میں جو احکام عشرہ پائے جاتے ہیں ان کے شروع میں یہ حکم ملتا ہے "میں خداوند تیرا خدا ہوں، میرے سامنے اور دیوتاؤں کی پرستش مت کر۔" ایوب کی کتاب، داؤد کے مزامیر اور صحائف انبیا میں بار بار خالق ارض و سما کا ذکر ملتا ہے۔ مسلمان علما خوشی خوشی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ آنحضرت نے کسی نئے مذہب کی تلقین نہیں فرمائی۔ مرزا ابوالفضل[۱] صاحب یوں لکھتے ہیں:-

> حضرت محمد کا اسلام کوئی نیا مذہب نہیں ہے بلکہ آپ نے اگلے وقتوں کے انبیا و رسولین کے مذہب کی پاکیزگی اور سادگی بحال کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔"

نامی مسلمان محقق شیخ خدا بخش بیرسٹر کا مرزا صاحب سے پورا اتفاق ہے۔ اسلام کے ارکان کی ابتدا کے بارہ میں آپ یوں[۲] لکھتے ہیں:-

> اسلام نے علاوہ یہودیت و عیسائیت کے بہت چیزیں [illegible] عربوں کے رسوم سے لیں اور حسب ضرورت ان میں تبدیلی کی۔ [illegible] آنحضرت نے [illegible] اختیار کئے [illegible] مذہب سے [illegible] ضرورت [illegible] پہنچ سکتے ہیں [illegible]۔

آگے چل کر شیخ صاحب موصوف نے [illegible] متعلق قرآن کریم کا یہ قول پیش کیا ہے:-

---

۱۔ [illegible] مذہب ... ۱۹۱۲ء صفحہ [illegible] ۲۔ [illegible] تاریخ [illegible] ... صفحہ [illegible]۔

"دین محمدی یہودیت، مسیحیت اور زرتشتی مذہب سے ماخوذ ہے، مانی کے مذہب سے بھی کئی باتیں اخذ کی گئی ہیں۔"

اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ انتخابی مذاہب کی تدوین کوئی معمولی کام نہیں تھا، اس کے لئے وسیع معلومات، قوت اختراع اور عقل رسا کی ضرورت تھی جو بفضل خدا آنحضرت کی ذات میں موجود تھی مگر سب سے بڑی اور غور طلب بات یہ ہے کہ توحید کی سچائی کا جیسا راسخ ایمان آپ کے سینہ میں تھا اور جو نور ایمان آپ کے اندر روشن تھا اس سے تمام اہل عرب نامحرم تھے۔ اگر آپ کے دل میں توحید کی حقیقت جاگزیں نہ ہوتی تو دین محمدی کبھی معرض ہستی میں نہ آتا۔

حکومت اور مذہب کا ارتباط

حضرت محمد کا دوسرا کارنامہ بھی اسی پایہ کا ہے یعنی ہجرت کے بعد مدینہ جاکر آپ نے مذہب اور حکومت اور مذہب کو باہم دگر مخلوط کر دیا۔ اس سے امت اور حکومت جماعت اور فرمانروائی آپس میں خلط ملط ہوگئی۔ آپ نے اپنا مذہب اہل عرب کی اصلاح دینی اور دنیوی کے واسطے وضع کیا تھا، لیکن دس بارہ برس کے تجربہ کے بعد آپ پر یہ بات خوب روشن ہوگئی کہ اسلام کی ہستی اور بقا کے واسطے ایک جماعت ایسی چاہیئے جو اس کی ہدایات کے مطابق اپنے دنیاوی معاملات مرتب کرے۔ اس وجہ سے اسلام اور حکومت باہمدگر ایک دوسرے کے دست نگر بن گئے

مشہور زمانہ فلسفۂ دینیات کے جید استاد پرنسپل فیربرن لکھتے ہیں "اسلام مذہب بھی ہے اور حکومت بھی، بلحاظ خیالات واغراض یہ مذہب ہے، مگر آئین و قوانین اور وسائل کے اعتبار سے حکومت ہے اس مذہب کی اصل عربی نہیں بلکہ سامی ہے، مگر حکومت خالص عربی ڈھنگ کی ہے مسلمات مذہب یہود و نصاریٰ سے مستعار ہیں۔ لیکن طرز حکومت آنحضرت کی اختراع اور فطری ہے۔ یہ عالمگیر حکومت کا شاندار خواب ہے جو مقامی دستور، قبیلہ کے اصول انتظام اور عرب کے تمدنی خیالات کا محکوم ہے۔ اس مذہبی حکومت کے بانی حضرت محمد تھے۔ آپ نے اس کے عقائد اختراع نہیں کئے تھے بلکہ ایسے روحانی جوش اور سچی عقیدت سے انھیں عربوں کے روبرو پیش کیا جنھوں نے انھیں قبول کیا۔ ان کا تصور اور ضمیر بمنزلہ کٹھ پتلی بن گیا۔"[1]

مہاراج اشوک نے بدھ مت اور شہنشاہ قسطنطین نے مسیحی مذہب کو راج دھرم قرار دیا تھا مگر مذہب اور حکومت ایک نہ تھے بلکہ ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ لیکن آنحضرت کے چلائے ہوئے دستور کی اگر کوئی نظیر ہوسکتی ہے تو حضرت موسیٰ کی بنی اسرائیل کی سرداری ہے، نبوت اور سرداری باہمدگر تھی جس کی بدولت

---

[1] منقول از "فلاسفی آف دی کرسچین ریلیجن" صفحہ ۲۸۳-۲۸۴ - مطبوعہ سنہ ۱۹۰۳ء

عربوں کے صدہا سال کے اختلافات اور لڑائی جھگڑے بند ہوگئے۔ ان کے درمیان اخوت وخلوص پیدا ہوگیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کے دلوں میں ملک گیری اور اقتدار وغلبہ کی زبردست آرزو پیدا ہوگئی۔ وہ ایک متحد قوم بن گئے اور قرب وجوار کے ممالک کو تھوڑی ہی مدت میں زیرنگیں کرلیا۔

مساوات کا عملی نمونہ

آپ کا تیسرا شاندار کارنامہ مساوات اور جمہوریت کو امر واقعہ بنادینا ہے۔ عیسائی مذہب میں اس کی تعلیم جابجا ملتی ہے مگر اعلیٰ وادنیٰ کا امتیاز کم وبیش پایا جاتا ہے۔ لیکن رسول عربی نے مساوات کو بھی عمل کا جامہ پہنا کر زندہ جاوید بنادیا۔ آپ اپنی ذات میں اس کا سب سے بڑا نمونہ تھے۔ اس کی حقیقت اپنے مقلدوں کے دلوں پر بھی نقش کردی۔ چنانچہ اس عملی نمونہ کی وجہ سے تمام مسلمان اسلامی اخوت کے رشتہ میں منسلک نظر آتے ہیں۔ اسلامی جمہوریت آپ ہی کی دل ودماغ کا نتیجہ ہے۔ آپ کا مسلک اور آپ کا نظام حکومت اور سوشل دستور جمہوری ہے۔ اگر آپ نظر غائر ڈالیں تو ظاہر ہوگا کہ آپ کا دل ودماغ بہت بلند تھا اور اگر اسے ہمہ گیر قرار دیا جائے تو واقعیت سے بعید نہ ہوگا۔

مغرب کے محققین کا یہ خیال ہے کہ آنحضرت نے اپنا دین پھیلانے میں تلوار سے کام لیا۔ آپ کے جانشین اور مقلد بزور شمشیر اسلام کا دائرہ وسیع کرتے رہے۔ فرانسیسی ماہر سان سیر کہتا ہے:۔ "ایک اسلام کے بغیر اہل عرب دنیا کے فاتح اور حکمران نہ ہوتے، اور اصل یہ ہے کہ جنگ وجدال کے بغیر اسلام کبھی قائم نہ ہوتا۔" پرنسپل فیربرن کی بھی یہی رائے ہے۔ پروفیسر ڈوذی کا یہ قول ہے کہ میدان کارزار میں مسلمان بنائے جاتے تھے۔ اور آپ نے عبدالوحید کا یہ خیال نقل کیا ہے "میرا ایمان ایک خدا اور اس تیغ براں پر ہے"۔ لیکن مسلمان علماء یہ رائے تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ تاریخی واقعات سے استدلال کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ شام، عراق العرب، مصر، طرابلس، ایران، ترکستان وغیرہ عرب لشکروں کی بدولت دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ مگر لنکا، جاوا وسماٹرا، جزائر لکادیپ ومالدیپ، جنوبی ہند کے بعض مقامات میں صرف عرب سوداگروں کے اخلاق اور دوستی اور محبت اور خوش معاملگی سے اسلام پھیلا۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے عرب وہند کے تعلقات کے آخری حصے میں اس پر بڑی عالمانہ بحث کی ہے۔

براؤننگ اور غالب

(از سید مقبول حسن احمد پوری، بی۔اے۔)

اشعار کا مطالعہ عموماً تفریح طبع کے لئے کیا جاتا ہے مگر طبائع کے میلان کا انحصار سوسائٹی پر ہے، اور سوسائٹی کی حالت کبھی یکساں نہیں رہتی۔ کبھی وہ تمدن ہند کی صورت میں روحانیت کے ساتھ انہماک ظاہر کرتی ہے کبھی عقل یونان کی ہیئت میں تخئیل و تمثیل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کبھی تمدن اسلام کی برکت سے وہ حریت و اخوت کی علمبرداری کرتی ہے۔ کبھی مادیت سے ملوث ہو کر ہر چیز میں فائدے کا پہلو مدنظر ہوتا ہے۔ نوع انسان کے دماغ میں یہ باتیں نسلاً بعد نسل جاگزیں ہو کر تخئیل کا جزو لاینفک ہو جایا کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ دماغی تفریح پر انھیں باتوں کا اثر پڑنے لگتا ہے۔ مثلاً عہد حال میں تفریح میں بھی فائدہ حاصل کرنے کا خیال شامل ہو گیا ہے۔

سوسائٹی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو ان قوموں سے متعلق ہے جن پر ابھی فقط سوسائٹی کا اطلاق کم از کم اہل مغرب کے نقطہ نظر سے نہیں ہو سکتا۔ ہم ہندوستانی بھی انھیں اقوام کے زمرے میں شامل ہیں جو ابھی تک اسی پرانے خدا کی خدائی کے قائل ہیں جس کو اہل مغرب نے آثار قدیمہ میں شمار کر کے صرف روایات تک محدود کر رکھا ہے۔ شکر ہے کہ ہماری سوسائٹی نے اس معاملہ میں بہت زیادہ ترقی نہیں کی۔ اسی لئے اگر ہم کو خدا کی بنائی ہوئی چیزوں میں کوئی خاص شان نظر آتی ہے تو ہمارا خیال فوراً صانع حقیقی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

غرض ہماری تفریح طبع یا تو حقیقت پر مبنی ہے یا ایسے مجاز پر جو حقیقت نما ہوتا ہے چنانچہ ہماری شاعری میں بھی یا تو اسرار و معارف ہیں یا گل و بلبل اور خط و خال سے متعلق خیالات، لیکن یہ بھی اسرار حقیقی سے الگ نہیں ہیں، مثال کے طور پر یہاں خسرو کی ایک غزل کے چند اشعار کافی ہونگے ؎

اے ز خیالِ ما بروں در تو خیال کے رسد — یا صفتِ تو عقل را لافِ کمال کے رسد

کنگرِ کبریائے تو ہست فرازِ لامکاں — طائرِ ماورانِ ہوا بے پر و بال کے رسد

بر درِ بے نیازیت صد چو حسینِ کربلا — تشنہ بماند در گذر تا بہ زلال کے رسد

ہست بہ تختگاہِ دل جلوۂ تو بروز و شب — لیک بجلوہ پنہاں چشمِ خیال کے رسد

آیتِ رحمت از حرم ہست بلائے حاجیاں — خسرو بت پرست را جز خط و خال کے رسد

ان دو شاعرانہ پہلوؤں کے علاوہ ابھی تک فلسفہ اور افادیت کے خیالات صرف چند شعرا کے کلام تک محدود رہے ہیں مثلاً ایران میں نظیری اور سعدی اور ہندوستان میں غالب و حالی اس سلسلے میں ڈاکٹر بجنوری کی رائے میں تو یہی ہے کہ غالب کا مقابلہ شعرائے مغرب میں ابھی تک کوئی نہیں کر سکا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ غالب شعرائے مغرب سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔ انگریزی شاعر براؤننگ کے خیالات غالب سے ملتے جلتے ہیں مگر بعض جگہ غالب براؤننگ سے آگے نکل گئے ہیں تاہم براؤننگ کو انگلستان کا غالب کہنا نامناسب نہ ہوگا۔

یہاں بے جا نہ ہوگا اگر براؤننگ کی چند اسی خصوصیات پر نظر ڈالی جائے جو غالب سے ملتی جلتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر برڈو صاحب جو لوگ براؤننگ کے کلام کا مطالعہ محض تفریحِ طبع کیلئے کرتے ہیں انکو عموماً خوشی ہوتی ہے کیونکہ براؤننگ کے اشعار اس شخص کو کبھی بھلے نہ معلوم ہونگے جو دماغ پر زور دینے کے خوگر نہیں۔ مگر براؤننگ سے وہ شخص ضرور مستفید ہو سکتا ہے جو ان کے کلام کو ایک بار تفریحاً پڑھے اور دوسری مرتبہ استفادہ حاصل کرنے کے لئے غور سے پڑھے۔ پھر تیسری مرتبہ اس کو عقل و بصیرت حاصل کرنے کے لئے دیکھے۔ چوتھی بار پڑھنے پر ہر شخص براؤننگ کا ہم خیال و معتقد ہو جائے گا۔ غالب کے کلام کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ڈاکٹر برڈو نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جو طالب علم براؤننگ کا بغور مطالعہ کرے گا وہ اپنی محنت سے بہت جلد فائدہ اٹھائیگا۔

غرض اہلِ مغرب کے خیال کے مطابق براؤننگ کا کلام تخیل انسانی و دقیق مسائل سے پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی شاعری سے وہی لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو اپنے تخیل کی ترتیب پر قادر ہونے کے علاوہ اس کو عملی جامہ پہنانے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ براؤننگ کی تلقین یہ ہے کہ پہلے آنکھیں کھول کر غور سے دیکھو اس کے بعد زبان کھولو۔ شاید اسی فلسفیانہ نصیحت سے متاثر ہو کر ڈاکٹر فرنوال نے براؤننگ کی بابت کہا ہے کہ وہ ایک بہادر مرد، بہادر، زندہ دل اور عمیق خیالات رکھنے والا شاعر ہے جس کے کلام کا مطالعہ ہر صاحبِ فہم و بصیرت کے لئے ضروری ہے۔

غالب کی طرح براؤننگ نے اپنے زمانہ کی سوسائٹی کو خوش کرنے کا خیال کبھی نہیں کیا۔ اس کا مسلک تھا کہ زمانۂ ماضی کو بھلا دینا چاہیئے اور حال کی پیچیدگیوں سے بھی بالاتر رہنا چاہیئے لیکن آئندہ کا خیال ضروری ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"ہماری یہ خواہش ہوگی [illegible] مذہب [illegible] خلاف ہماری تصنیفات ہمارے بچوں کی تعلیم [illegible]

تو [illegible] جیسا [illegible] حرف سے جانتے ہیں [illegible] کا کیا نتیجہ ہوگا؟ یہ فکر ہمارے لئے ضروری ہے"

اس مسلک کو براؤننگ نے اپنی شاعری میں خاص طور پر مدِنظر رکھتے ہوئے اپنی مشہور نظم "گرامرین فیونرل"

میں لکھتا ہے :-

"کم ظرف آدمی جو کچھ تھوڑا بہت کرنا چاہتا ہے کر دکھاتا ہے، عالی ظرف آدمی کی بڑی تمنائیں ہوتی ہیں مگر وہ ان کے پورا ہونے سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔ معمولی آدمی ایک ایک کرکے جوڑتا رہتا ہے اور اس کے سنو بہت جلد ہو جاتے ہیں۔ لیکن بلند حوصلہ آدمی کے لئے جو ایک کروڑ پتی بننے کی آرزو رکھتا ہے۔ اکائی کی کمی رہ جانا تعجب کی بات نہیں"

غالب نے اس شرح و بسط کے ساتھ کبھی اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا ہے، وہ اسی بات کو مشرقی رنگ میں مجمل طور پر اس طرح بیان کرتے ہیں :-

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا — حباب موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

اسی مطلب کو مصرعۂ ذیل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے

"وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے"

براؤننگ نے ارتقائے روحانی کے حدود پر بہت کچھ خیال آرائی کی ہے، غالب اُس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ کہتے ہیں

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

براؤننگ کہتا ہے "شکوک" سے دل کو خوشی حاصل ہونی چاہیئے، کیونکہ ان سے تلاش و تجسس کا ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے۔" اسی اعتبار سے ہر حجاب پردۂ ساز ہے کیونکہ حجاب ہی ذریعۂ انکشاف اور حجاب ہی سعی و کوشش کا باعث ہے۔ اس خیال کی مزید تشریح براؤننگ نے اپنی نظم "ربی بن عذرا" میں اس طرح کی ہے :-

"میں جو ہونا چاہتا تھا — اور نہ ہو سکا — (وہی) میرے اطمینان کا باعث ہے"

لیکن اس سے مطلب یہ نہیں کہ سعی کو چھوڑ دیا جائے۔ غالب کا شعر ہے ؎

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز — ناخن پہ قرض اُس گرہِ نیم باز کا

کیونکہ اگر وہ گرہ کٹھن ہے تو اس کے کھولنے میں کوشش بلیغ کے علاوہ غیر معمولی قوت ارادی بھی درکار ہوگی، بالفاظ دیگر جتنا گہرا حجاب ہوگا اتنا ہی زیادہ انکشاف کا ذوق ہوگا۔ مگر اولوالعزمی کا تقاضا یہی ہے کہ کسی کام کو ادھورا نہ چھوڑا جائے "گرہ نیم باز" کا قرض ادا ہو جانا چاہیئے، ناخن کو خواہ مخواہ قرضدار نہ رکھنا چاہیئے، کیونکہ "کام گر رُک گیا روا نہ ہوا" اس لئے براؤننگ کے "گرامیرین" نے مرتے دم تک قواعد صرف و نحو حل کئے کہ یہاں جو ہو سکے ہو جائے باقی جو کچھ رہ جائے گا دوسری زندگی میں ہوگا۔ غالب بھی انھیں

خیالات سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں:-

بقدر ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

دنیوی حجابات کو براؤننگ (Limitations) کہتا ہے جن کے دور کرنے کی براؤننگ یہ دلچسپ ترکیب بتاتا ہے کہ وقت کا پہیا گھومے یا رک جائے مگر خیالات کو کبھی محدود نہ ہونے دو۔ "کمہار (خالق) اور مٹی (مخلوق) پر وقت کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا" (ربی بن عذرا) نیز یہ کہ "دماغی توہمات کا (جو تخیل کی تکمیل میں سد راہ ہوتے ہیں) بہادری سے مقابلہ کر کے ان کو شکست دو کیونکہ زندگی کا وہ حصہ جس کے لئے یہ (یعنی موجودہ حصہ) بنا ہے ابھی آنے کو ہے۔ خدا نے تو ہمیں مکمل بنایا ہے اور ہماری موجودہ ہستی، ہماری زندگی کا صرف ایک ادنیٰ جزو ہے۔ بقول میر تقی

"یعنی آگے چلیں گے دم لے کر"

تکمیل کی آرزو کو مستحکم کرنے اور آگے چلنے کے لئے تیار رہنے کے متعلق غالب کا خیال ہے کہ

"دیتے ہیں ظرفِ بادہ قدح خوار دیکھ کر"

اس پر بھی وہ یہی کہے جاتا ہے کہ

"حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا"

بہر نوع براؤننگ کو ایک قسم کا اطمینان ہے۔ غالب میں بجائے اطمینان کے غم زیادہ ہے۔ براؤننگ کے پیام کا انحصار زیادہ تر اس عقیدے پر ہے کہ دنیا کی ناکامیاں اور مختلف قسم کے شکوک ہی کامیابی اور اطمینان کی دلیل ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "میں تو شکوک کی قدر کرتا ہوں کیونکہ یہ انسانیت کا حصہ ہیں۔ جانور شکوک سے متاثر نہیں ہوتے کیونکہ وہ راکھ کا ڈھیر ہیں جس میں کوئی چنگاری نہیں۔"

مسئلۂ ارتقا کے متعلق براؤننگ کی نظمیں حضرت مولانا روم کے خیالات سے ملتی ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں

تو ازاں روزے کہ در ہست آمدی آتشی یا خاک یا بادی بدی

گر بداں حالت ترا بودے بقا کے رسیدے مر ترا ایں ارتقا

براؤننگ ایسی کوئی تشریح نہیں کرتا، وہ صرف اپنی حالت کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور خدا کا شکر کرتا ہے کہ:-

"(اے خدا) میں تیرے ہاتھ کی صنعت کو نہایت کامل سمجھتا ہوں، اور اس کا دل سے شکر گزار ہوں کہ میں انسان ہوں۔" (ربی بن عذرا)

غالب کو بھی ایسی ہی خوشی حاصل ہے لیکن وہ ارتقائی مدارج کی طرف اشارہ تک نہیں کرتا صرف اسی قدر کہنے پر اکتفا کرتا ہے ۔

دلِ ہر قطرہ ہے "سازِ انا البحر" ہم اُسکے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ہے تجلی تری سامانِ وجود ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

اہلِ مغرب کو "سازِ انا البحر" سے ہم نوا ہونا نہیں آتا، اہلِ مشرق کی نظر اوپر ہی کی طرف رہتی ہے، پیچھے پھر کے دیکھنا اُن کا شیوہ نہیں۔ براؤننگ کا بھی یہی وطیرہ ہے اسی لیے انگلستان میں صرف خاص خاص طبقوں ہی میں اس کی قدر دانی ہوتی ہے

شاعر بہ تقاضائے بشریت کبھی کبھی گردشِ دوراں کی بھی شکایت کرتا ہے۔ براؤننگ اس شکایت کو اپنے الفاظ میں "شکوک" کے پیرایہ میں کرتا ہے، مگر اُن شکوک میں شکایت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ غالب اسی بات کو بہ مقتضائے زندہ دلی نیم شکایت کے پیرائے میں اس طرح ظاہر کرتا ہے

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا؟

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

خیر اس قسم کے خیالات تو جذبات سے متعلق ہیں ان کو عقل سے چنداں واسطہ نہیں کیونکہ چمن میں جو پھول کھلتا ہے اسکا مقصد حسن کا اظہار یا خوشبو تو ضرور ہی ہوتا ہے، یہی حال زندگی کا ہے۔ انسان بھی قدرت کا ایک پھول ہے جو بچے سے لڑکا، لڑکے سے جوان، جوان سے ادھیڑ اور ادھیڑ سے بوڑھا ہو کر دنیا کے اسٹیج پر اپنا پارٹ کرنے کے بعد موت کے پردے میں چھپ جاتا ہے۔ اسلئے نہیں کہ ہمارے آہ و نالہ اور بین و بکا سے وہ پھر واپس آ کر وہی تماشا دکھلانے لگے بلکہ اس لئے کہ وہ اپنے نمائشی لباس کو اتار کر اپنی اصلیت پر آ جائے یا کسی اور تماشے کے لئے تیار ہو کر کوئی اور روپ بھرے، کوئی اور نغمہ گائے اور کسی دوسرے ہی مجلس کے سامنے نئے نئے تماشے دکھائے ۔

حضرت ابراہیم ادہم کے اقوال

سالک وہ ہے جسکے سامنے جہان کی دولت پیش کی جائے تو اسے محبت نہ ہو، بادشاہی دی جائے اور پھر چھین لی جائے تو بھی وہ اس کا غم نہ کرے ۔

اپنی تعریف پر خوش نہ ہو

عارف وہ ہے جس کا دل تفکر میں ڈوبا رہے، اور ہر چیز سے عبرت حاصل کرے ۔

(انتخاب لاجواب)

قوتِ سماعت

(از سید ابوطاہر داؤد۔ بی۔ ایس۔ سی)

ہمارے کان کے دو حصے ہیں، ایک دماغ کے اندر محفوظ ہے، دوسرا باہر کی طرف چہرہ کے ہر ایک بازو میں لگا ہوا ہے۔ کانوں کے اندر کا حصہ بہت نازک ہے، اس کو پوشیدہ کر کے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ باہر کے کان قدرت نے مختلف مقاصد کو مدِ نظر رکھ کر بنائے ہیں، ہر جانور کے ماحول، فطرت اور طرزِ رہائش کی مطابقت سے اُس کے کانوں کی بناوٹ دوسرے جانوروں کے کانوں سے مختلف ہوتی گئی ہے۔ انسان کے کان دل کی شکل کے پتلے اور سُرخ ہوتے ہیں، روشنی ان کے آرپار جا سکتی ہے، لیکن نہ اتنی جیسی کہ شیشہ کے اندر۔ ہاتھی کے کان پنکھے کی طرح ہیں، خرگوش اور گھوڑے کے کان گلاب کی پتی کی طرح نوکیلے اور مضبوط ہیں۔ مرغی اور مینڈک کے بیرونی کان ہی نہیں ہوتے بلکہ اندرونی آلۂ سماعت کی حفاظت کے لئے ڈھکنے کی شکل کے کھال کے ٹھپے سے لگے رہتے ہیں۔

قوتِ سامعہ کا تعلق دماغ سے ہے، آلۂ سماعت کا کام آواز کو صرف دماغ تک پہونچا دینا ہے اس لئے ہم اول الذکر کو ٹیلی فون کا ماؤتھ پیس Mouth Piece کہہ سکتے ہیں اور آخر الذکر کو اس کے ریسیور (Receiver) سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ بیرونی کانوں کے لئے گراموفون کے بھونپو Horn سے زیادہ اور کوئی موزوں تمثیل نہیں۔

آواز کس طرح سے پیدا ہوتی ہے؟ ذیل کا تجربہ وضاحت کے لئے کافی ہے۔ کسی تالاب میں کنکری ڈالو، پانی کے تھرتھراتے ہوئے گھیرے کنکری کے گرنے کی جگہ کے چاروں طرف بن جاتے ہیں، وہ آہستہ آہستہ باہر کو پھیلتے جاتے ہیں یہاں تک کہ آگے جا کر ہلکے ہوتے ہوئے غائب ہو جاتے ہیں۔ در اصل وہ غائب نہیں ہوتے بلکہ اس قدر ہلکے ہو جاتے ہیں کہ ہماری آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے۔ کنکری کے گرنے سے پانی میں حرکت ہوتی ہے وہ حرکت ٹیلی فون کی طرح گھیروں کے ذریعہ تالاب کی سطح پر پھیل جاتی ہے۔

ٹھیک اسی طرح آواز بھی ہوا میں گھیروں کی طرح حرکت پیدا کرتی ہے۔ بولنے والا اپنے گلے کے ذریعہ ہوا کے سمندر میں کنکریاں پھینکتا ہے، جن کا اثر پانی کے تھرتھراتے ہوئے گھیروں کی طرح دنیا کے ایک

سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جاتا ہے، اور محور کے اندر محور بناتا ہوا چلتا ہے، اس طرح آواز ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے گلے میں نرخرے کے اندر کچھ عضلات اور پتلی ہڈیاں ہیں جن کی حرکت سے ہوا میں تلاطم واقع ہوتا ہے۔ اور یہیں سے آواز شروع ہوتی ہے۔ مچھر اپنے منہ سے آواز نہیں پیدا کرتا، بلکہ اپنی پتلی سی سونڈ کو ہوا میں ایک سیکنڈ کے اندر تین سو بار کے قریب ہلا کر آواز کو پیدا کر دیتا ہے۔ مکھی کی بھنبھناہٹ اس کے پروں کی تیز حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔ چڑیوں کے عجیب و غریب سُر انسان کی طرح گلے ہی سے پیدا ہوتے ہیں، البتہ اُن کی پتلی چونچ اور نرخرے کی ساخت انسانی اعضا پر فوقیت رکھتی ہیں آواز کا پیدا ہونا اور ہوا کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرنا بیان کر دیا گیا۔ اب دوسرا سوال کہ آواز کس طرح سنائی دیتی ہے حل طلب ہے۔ کان کے عجیب و غریب ساخت اور اس کے حصوں کے اصطلاحی ناموں کو بیان کر کے آپ کے دماغ پر بار ڈالنا منظور نہیں، صرف اتنا ہی کافی ہے کہ اندر کے کان بالکل گراموفون کے ساؤنڈ بکس کی طرح ہیں۔ کان کے سوراخ کے قریب اندر کی طرف ایک پردہ ہوتا ہے، وہ پردہ بالکل ڈھول یا طبلے کی جھلی کی طرح ہوتا ہے۔ اس جھلی سے لگا ہوا کڑی ہڈی کے تین ٹکڑوں کا بنا ہوا ایک ہتوڑہ سا ہوتا ہے، ہوا کے سمندر میں جو لہریں پیدا ہوتی ہیں وہ کان کے پردے پر آ کر ٹکراتی ہیں، ہتوڑے کو حرکت ہوتی ہے اور وہ کان کی جھلی پر ضربیں لگانا شروع کرتا ہے، اس سے بالکل طبلے کی تھاپ کی طرح آواز پیدا ہوتی ہے، یہ آواز کان کے اندر کی تین جھلی نما نالیوں میں سے ہوتی ہوئی سماعت کی نس کے ذریعے سے دماغ تک پہونچ جاتی ہے اور وہاں اس ہوا کی "بے تار برقی" کے اشاروں کی تشریح ہو جاتی ہے۔ اس طرح ہمارے کان ریسیور (Receiver) ہیں اور دماغ بے تار برقی کا اسٹیشن۔

کان کے اندر کی جھلی اس قدر نازک اور باریک ہوتی ہے کہ تیز آواز کی برداشت نہیں کر سکتی، بچے مذاق میں "کانا باتی" کو کرتے ہیں، منہ قریب لے جا کر زور سے چیخ مارتے ہیں تو کان میں جھنجھنی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آواز جتنی تیز ہوگی اُتنے ہی زور سے وہ ہوا میں حرکت پیدا کرے گی، اس حرکت سے کان کی جھلی پر تھاپ پڑیگی اور اندر کی ہتوڑی اپنی بساط سے زیادہ حرکت کرے گی اور اس طرح جھنجھنی پیدا ہو جائیگی۔ طبلہ پر اگر زور سے تھاپ ماریں تو جھلی پھٹ جائیگی، اسی طرح ہتوڑی اگر زور سے حرکت کرنا شروع کریگی تو کان کے پردے کو نقصان پہونچ جائیگا۔ بادل کی گرج بعض اوقات لوگوں کو بہرا کر دیتی ہے وہ بہرا ہونا یہی ہے کہ جھلی پھٹ جاتی ہے، اسی لئے ہم ایسی آواز سن کر کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں۔ بعض اوقات ہم ہلکے سُروں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں، مگر ایک شخص جو ہم سے بہت فاصلہ

پر بیٹھے وہ سن لیتا ہے۔ اگر اسی کے متعلق ہم کچھ ریمارک پاس کر رہے تھے تو وہ ہنس دیتا ہے اور ہم اسکی تیزیِ سماعت پر تعجب کرنے لگتے ہیں، یہ امر کان کی نزاکت پر موقوف ہے۔

آواز سمندر کی موجوں کی طرح ہوا کے ذریعہ دنیا بھر میں پھیل جاتی ہے لیکن جتنی دور ہوتی جاتی ہے ہلکی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مقام بھی ایسا رہ جائے جہاں ہوا کی حرکت کا اثر نہ ہو سکے۔ اگر ہم یہاں باتیں کر رہے ہیں تو دوسرا شخص ولایت میں بیٹھا ہماری گفتگو سن سکتا ہے بشرطیکہ اس کے کان اس قدر نازک ہوں۔ لیکن چونکہ ایسا نہیں ہے اس لئے ہم نے تار برقی نکال کر اس کمی کو پورا کرلیا۔ انسان قوتِ ارادی کو بڑھا کر فاصلہ پر غالب آسکتا ہے۔ کسی خاص شخص کے خیال میں مستغرق رہنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے ہی بیٹھا ہے۔ گو وہ ہزاروں میل ہی کے فاصلہ پر کیوں نہ ہو۔ اس کی آواز بھی ہمارے کانوں تک خیال کے ذریعہ پہنچ جاتی ہے۔ اور ہم اس سے باتیں کر سکتے ہیں اور اس کی باتیں سن سکتے ہیں۔ سادھو، مہاتما اور درویش یہی پریکٹس کرتے ہیں اور اسی کو مراقبہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

قوتِ ارادی کے علاوہ ہم خود اپنے کانوں کے ذریعے سے بھی بہت دور کی آواز سن سکتے ہیں۔ ابر یہ کے وحشی   اس قدر تیز ہوتے ہیں کہ وہ محض پیڑوں کے تنے ہی پر کان لگا کر آنے والے آدمی کا فاصلہ بتادیتے ہیں۔ جانوروں کا سامعہ اور بھی تیز ہوتا ہے۔ ہرن خفیف سی سرسراہٹ تک سن لیتے ہیں۔ اگر ان کے کان اس قدر تیز نہ ہوں تو وہ بہت آسانی سے پکڑ لئے جائیں۔ خرگوش ہوا کی حرکت کو محسوس کر کے سمجھ لیتا ہے کہ کوئی آرہا ہے۔

انسان قدرت کی دی ہوئی قوتوں کی قدر نہیں کرتا ورنہ اس کی قوتیں بھی دوسری مخلوق کی قوتوں سے پست نہ ہوتیں۔ ہم غل اور شور کے عادی ہوگئے ہیں۔ چاروں طرف چیخ و پکار رہتی ہے۔ کوئی بچے کو مار رہا ہے، تو کوئی روتا چلاتا اور شور مچاتا ہے۔ سڑک پر سے ٹرام، موٹر، گاڑی کھڑکھڑاتی شور ہوتی نکلتی رہتی ہیں۔ اتنی بھاری بھاری آوازیں ہمارے کانوں پر ہتھوڑوں کی طرح پڑتی ہیں اس سے ہم ہوا کی خفیف لرزشوں کو محسوس کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔ بعض خاندان ایسے ہیں کہ جہاں ہر کان اس بات کے عادی ہو جاتے ہیں کہ جب تک کوئی چیخ کر بات نہ کرے ہم سن ہی نہیں سکتے۔ اس لئے جب تک ممکن ہو تنہائی میں رہنا چاہئے۔

اس بیان سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ جہاں تک سماعت کا تعلق ہے اس کو ہم اپنے اندر کے [illegible] پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر یہ بات ہے کہ کان کس مصرف کے ہیں [illegible]

[illegible] سماعت کی حفاظت کرتے ہیں لیکن قدرت کوئی چیز [illegible]

کوئی مضرت ضرور ہوتا ہے۔ اگر حفاظت مقصود ہے تو مینڈک مچھلی اور دوسرے پرندے اس سے کیوں محروم ہیں۔

دراصل ہمارے باہر کے کان گراموفون کے بھونپو ہیں، بھونپو میں ساؤنڈ بکس کی آواز گونجتی ہے اسی طرح کسی قلعہ یا بڑے اونچے مکان میں ہماری آواز گونجتی ہے اور کئی گنا تیز ہو جاتی ہے، اسی طرح ہمارے باہر کے کان میں آواز گونجتی ہے، لیکن یہ گونج اُس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ بات کرنیوالا ٹھیک ہمارے کان کے مقابل بات کر رہا ہو۔ اگر کوئی شخص ہماری پشت پر سے بات کرے تو ہمکو مقابلتہً کم سنائی دیگا وجہ یہ ہے کہ ہمارے کان ہوا کی حرکت کو روک دیتے ہیں اور بیچ میں حائل ہو کر آواز کو کم کر دیتے ہیں گھوڑے کنوتیاں بدلتے ہیں یعنی جس طرف سے آواز آتی ہے کانوں کو اُسی طرف گھما دیتے ہیں لیکن ہم اُن جانوروں کی طرح اپنے کانوں کو گردش نہیں دے سکتے۔ تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے کان قریب بھی ویسے ہی عضلات ہیں جن سے گھوڑے وغیرہ اپنے کانوں کو حرکت دیتے ہیں مگر ہمارے یہاں یہ خشک ہو گئے ہیں، اسلئے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جس زمانہ میں ہم جانور تھے یا ارتقا کے اعلیٰ درجہ پر نہیں پہونچے تھے اس وقت ہم ان کو ہلایا کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ہم اس عادت کو ترک کرتے گئے یہاں تک کہ بالکل ہی بھول گئے۔ ترکِ استعمال سے وہ عضلات جو اس حرکت کے ذمہ دار تھے خشک ہو گئے لہذا اگر باہر کے کان کسیطرح بالکل ہی غائب ہو جائیں تب بھی ہماری سماعت میں کوئی فرق نہ آئیگا بلکہ ایک بیکار چیز کم ہو جائیگی، لیکن اب سوال یہ ہے کہ ہمارے دوست ہمکو بُوچا دیکھکر خوش ہونگے یا متنفر؟

حضرت حسینؓ کے اقوال

صوفی واحد فی الذات ہے، نہ وہ کسی کو جانتا ہے اور نہ کوئی اس کو۔

فقیر وہ ہے کہ ماسوائے اللہ سے مستغنی ہو جائے۔

صبر یہ ہے کہ جسم کے حصے اگر کاٹ کر سولی پر چڑھا دیں تب بھی اُف نہ کرے۔

جو مرنے کو اپنی زندگی سمجھتا ہو اور خود اپنی موت پر آمادہ ہو اُسے کون مار سکتا ہے۔

جن پیروں کو کاٹتے ہو، میں ان کے علاوہ ایسے قدم بھی رکھتا ہوں جو اس وقت بھی دنیا کا سفر کر سکتے ہیں اگر مقدور ہو تو ان کو بھی قطع کر دو۔ جسم سے خون بہا تو اُس کو منہ پر ملکر فرمایا، اس کے دربار میں سُرخرو ہو کر جانا چاہتا ہوں۔ کلائیوں پر یہ خون اس لئے ملتا ہوں کہ نمازِ عشق کا وضو ہو جائے۔

واقعہ

(از مسٹر محمد اسحاق ایم۔اے)

ہاتھ کی سلائی تپائی پر رکھ کر شانتی نے فرصت کی ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا:-

"کامنی بہن ......"

پاس بیٹھی ہوئی لڑکی جو کشیدہ کاڑھنے میں مصروف تھی سر اُٹھا کر بولی:-

"کیا ہے شانتی؟"

"سلائی سے طبیعت اُکتا گئی اب تم ذرا اپنے سسرال کی کہانی سُنا ڈالو"

اس کی ہمجولی سر اُٹھا کر مسکراتی ہوئی بولی "اب اس میں تو کوئی نئی بات نہیں"

شانتی (خفیف خفگی کا اظہار کرتی ہوئی) "تمہیں کہنے کی کوئی بات ہی نہیں معلوم ہوتی۔ اگر یہ باتیں میری زبان سے نکلتیں تو شاید لوگ باور بھی کر لیں لیکن تمہاری باتوں پر کوئی یقین نہیں کر سکے گا"

کامنی "ممکن ہے ایسا ہی ہو"

شانتی نے پھر کہا "اب اپنا حال بیان کر چکو"

کامنی نے ایک ہلکی سی آواز سے کہا "بس یہ سمجھ لو کہ تم جس قدر خوش ہوئیں اسی قدر غمگین ہوئی ہم دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کامنی اس کو ہرگز نہ بھولنا تم ایک مالدار کی بیوی ہو اور میں؟"

نادان کامنی منہ چڑھا کر اپنے نازک ہاتھوں کی ایک مٹھی اُٹھاتے اُٹھاتے ہنس پڑی، بولی،

"جاؤ تم بڑی شریر ہو۔ تم نے جو کچھ کہا سب جھوٹ ہے، اور جھوٹ بولنا بڑا بھاری گناہ ہے"

اُن کی ہنسی سے فضا میں ایک آواز پیدا ہوئی، لیکن شانتی اپنی ضد سے باز نہ آئی پھر پوچھنے لگی

"کیسی گزرتی ہے؟"

کامنی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ عین اسی وقت پاس کے گھر کا دروازہ کھلا اور ایک چھوٹا سا لڑکا دروازے سے منہ نکال کر کہنے لگا

"بھابی: بھائی صاحب کی قمیص کا بٹن ٹوٹ گیا ہے ذرا درست کر دیجئے۔ بھائی صاحب باہر جانا چاہتے ہیں۔"

یہ سنتے ہی شانتی اُٹھ کھڑی ہوئی اور سلائی کی تھیلی اُٹھاتے ہوئے بولی:۔

"لو بہن اب تو میں جاتی ہوں، وقت بھی زیادہ ہو گیا ہے، شام ہو چلی ہے، وہ بھی بغیر چائے پیئے باہر چلے جائیں گے، اچھا اب کل دوپہر کو پھر تم سے ملونگی۔"

مسکراتی اور ایک پر معنی نگاہ ڈالتی ہوئی جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی وہ پڑوس والے گھر میں چلی گئی۔ ٹھیک اسی وقت اس گھر سے بڑی بی کی آواز کان میں آئی:۔

"بیٹی یہ خط لو!"

کامنی نے خط لے لیا اور آسمان کی طرف اس طرح دیکھنے لگی گویا وہ اس سے رحم و کرم کی طالب ہے۔

دوسرے دن دوپہر کو دیوار کے بیچ کا کواڑ کھول کر شانتی آموجود ہوئی اور آواز دینے لگی:۔

"کامنی بہن! کامنی بہن!"

کامنی بچھونے پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔

پہلی آواز شاید اُس کے کان میں نہیں پہونچی، دوسری آواز کے ساتھ ہی وہ اُٹھ بیٹھی۔

شانتی کے بیٹھتے ہی کامنی نے اپنے ہاتھ کا خط اس کی گود میں ڈال دیا۔ شانتی ہنسکر بولی "شاید میاں نے بلایا ہوگا خوب لڑکی ہے تو، شوہر کو قابو میں کرنے کا منتر تجھے خوب آتا ہے چاہے کوئی ملنے پائے نہ ملنے مجھے تو سچ مچ پورا اعتبار ہے۔ اگر یہ منتر مجھے بھی آجاتا تو....."

یہ فقرہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ کامنی خط کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی:۔

"ذرا پڑھ کر تو دیکھو۔"

شانتی پڑھنے لگی۔

پیاری!

آج کل میری طبیعت سخت مضمحل رہتی ہے، تمہارے جانے کے بعد جو بد انتظامیاں اور خانہ داری میں ظاہر ہو رہی ہیں انکا دفعیہ میرے امکان سے باہر ہے، بس تم کو اپنی دیکھ بھال اور خانگی انتظامات کے سرانجام کے لئے اس عمر میں بیاہ لایا ہوں، مجھے اُمید ہے

کہ تم اس سے بخوبی واقف ہوگی اور اگر میں اپنی بیوی کی طرف سے یہ امید رکھوں کہ وہ میرے
حکم کے مطابق چلے تو بیجا نہ ہوگا۔ بہرحال کل تم تیار رہنا میں خود آکر تمہیں لے آؤں گا کیونکہ تمہارے
لانے کے لئے کسی دوسرے کو بھیجنا مجھے گوارا نہیں ہو سکتا۔ فقط۔ تمہارا۔۔۔۔

شادی کے بعد خاوند کی طرف سے کامنی کے پاس یہ پہلا خط آیا تھا۔
مطالعہ کے بعد جب شانتی نے سر اٹھایا تو دونوں کی آنکھیں دوچار ہو گئیں۔ کامنی نے مسکراتے
ہوئے سوال کیا:۔

"پڑھ چکیں؟"

شانتی دبی زبان سے بولی:۔ "ہاں" مگر اس کے چہرے سے بھی ہنسی عنقا ہو رہی تھی۔
احساس غم سے شانتی کا دل چور ہو رہا تھا لیکن پھر بھی اس نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا
"بات تو سچ ہے بہن، تم ایک غریب کی لڑکی ہو کر خوش قسمتی سے ایک ہیرے کے ہاتھ لگی ہو ایشور
تم کو ہمیشہ خوش رکھے، اگر وہ تمھیں یہاں نہ بھی رہنے دیں تو کیا مضائقہ ہے اُنھیں کے گھر کو اپنا گھر سمجھو
اور یہاں کی باتیں بھول جاؤ۔"

مگر شانتی کی طرف سے اس تلقین کا کوئی جواب نہ ملا، وہ اس وقت دوسرے خیالات میں محو تھی
دوسرے دن صبح کو ایک موٹر کار اُس دو منزلہ چھوٹے مکان کے دروازے پر آ لگی، اور اس سے
ایک نہایت موٹا اور بھدے جسم کا آدمی اُترا۔ اس کی پچاس سال کی عمر ہوگی۔ اس کے قیمتی لباس نے
اس کی بدصورتی کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔

شانتی اپنے جھروکے سے دیکھ رہی تھی کہ پشت سے آواز آئی:۔

"بہن"

منہ پھیر کر جو دیکھا تو کامنی کھڑی تھی اور اُس کا چھوٹا بھائی بھی ساتھ تھا۔
کامنی کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی پلنگ پر جو شخص لیٹے ہوئے ورق گردانی کر رہا تھا
اس کی طرف اور پھر شانتی کی طرف ایک نگاہ ڈال کر کامنی نے کہا۔

"تم سے رخصت ہونے کو آئی ہوں، معلوم نہیں پھر تم سے ملنا نصیب ہو یا نہ ہو۔"
شانتی اور اس کے شوہر کشور سے مل کر وہ چپ چاپ چلی گئی، اور اپنے ساتھ ہی بے قرار دل میں لیتی گئی
کشور نے چلتے چلتے کہا "بہن، جہاں رہو خوش رہو"
اس کے بعد کمرے میں خموشی طاری ہو گئی، صرف قریب کے گھر سے کامنی کے بچھڑتے بھائی کے

نے لی آواز سنائی دی۔

"بہن، میں بھی ساتھ چلوں گا۔"

موٹر ہارن بجاتی گلی کوچے کے لوگوں کو آگاہ کرتی ہوئی گذر گئی۔

شانتی نے کچھ دنوں کے بعد کامنی کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:۔

"بہن کامنی! تمہارے باپ بہت بیمار ہیں، تمہاری ماں نے تمہارے نام بہت سے خط روانہ کئے لیکن نہ معلوم کیوں تم نے ایک کا بھی جواب نہ بھیجا، امید کرتی ہوں کہ یا تو تم اس خط کا جواب دوگی یا خود آکر اپنے پتا سے ملجاؤگی۔ کیونکہ اب ان کے زندگی کی بہت ہی کم امید باقی رہ گئی ہے۔ اس لئے وہ تمہیں ایک بار دیکھنا چاہتے ہیں۔ جلد آؤ۔ تمہاری بہن۔ شانتی

جواب آیا:۔

"بہن، تمہارا خط ملا، ماتا کے خطوط بھی وصول ہوئے، لیکن میں نے دیدہ و دانستہ کسی کا جواب نہیں لکھا، والدین نے دھن دولت کی لالچ میں آنکھوں پر پٹی باندھکر مجھے جس کے سپرد کر دیا ہے اسی کے حکم کے مطابق عمل کر رہی ہوں، پتاجی کے درشن تو دور رہے ان کی لاش دیکھنے کے لئے بھی اب میں نہیں جا سکتی۔ امید ہے کہ آئندہ مجھے ان نشتروں سے محفوظ رہنے دوگی۔ میں نے اپنا دل کڑا کر لیا ہے، تمہیں بھی بھول گئی اور والدین کو بھی بھول گئی، سب کچھ بھول گئی اب مجھے صرف اپنے پتی کے حکم پر چلنا یاد ہے۔ ہم ہندوستانی عورتوں کو اپنے خاوند کی فرمانبرداری کے سوا اور کام ہی کیا ہے۔ بہرحال اس صاف گوئی سے معاف کرنا۔ تمہاری بہن کامنی۔

شانتی نے خط پڑھا، کچھ دیر بعد پھر پڑھنے کی کوشش کی، لیکن آنکھوں کے نیچے حروف چیونٹیوں طار معلوم ہونے لگے۔ اس نے کامنی کے والدین کی لاعلمی میں خط لکھا تھا، کیونکہ انھوں نے اس کے وسے ناخوش ہوکر ارادہ کر لیا تھا کہ اب وہ کبھی اپنی بیٹی کا منہ نہ دیکھیں گے۔ شانتی کا خیال تھا کہ اولاد بصور کرے لیکن جب ماں باپ سے معافی کی خواستگار ہوگی تو معافی ضرور ملجائیگی۔ صرف اس خیال اس نے کامنی کو لکھا تھا لیکن اس کا جواب یہ آیا۔

پڑوس میں موت اور انسان کی جنگ ہو رہی تھی، مگر اب یہ جنگ کامنی کے پتا کی موت کے خاتمہ ہوگئی۔

بیوہ ہائے ہائے کرنے لگی، چھوٹے چھوٹے بچے بیتاب ہوکر رونے لگے

چند دنوں بعد کامنی کی ماں اپنے بچوں کو لیکر میکے چلی گئی۔ جب سے وہ اپنے پڑوسیوں کو خط لکھتی رہتی ہیں۔ مگر اُن میں کامنی کا نام تک نہیں ہوتا۔ شاید کامنی نام کا اس دنیا میں انکا کوئی نہ تھا۔

اس خالی گھر کی طرف دیکھکر شانتی کا دل صدمہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا ہے، اُس کے دل میں آتا کہ اسی گھر میں جو چھوٹی سی دنیا آباد تھی اس کے مٹے ہوئے نقوش خیال کی دنیا میں اب بھی نظر آتے ہیں کبھی کبھی وہ اپنے خاوند کشور سے اس کا تذکرہ بھی کرتی ہے لیکن شانتی کو دیکھکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کوئی قیمتی چیز راستے کے گرد وغبار میں گم ہوگئی ہے جو باوجود تلاش کرنے کے باوجود بھی دستیاب نہیں ہوتی

ایک دن دوپہر کو کشور اپنے مقررہ وقت سے بہت پہلے ایک روزانہ اخبار ہاتھ میں لئے ہوئے گھر واپس آیا۔

شانتی نے پوچھا "آج ناوقت کیسے لوٹے خیریت تو ہے؟" کشور نے پرنم آنکھوں سے شانتی کو دیکھا اور اخبار کا ایک صفحہ اس کے سامنے رکھدیا۔ شانتی پڑھنے لگی۔

ایک مظلومہ کی خودکشی

"۱۰ اگست ..... اسٹریٹ ..... نمبر گھر میں ایک عورت نے خودکشی کرلی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اُس کے آوارہ اور شرابی خاوند نے اُس سے بڑھاپے میں شادی کی اور چند دنوں کے بعد اس کی عصمت پر الزام لگایا اور اس کو بلاوجہ مطعون کیا جس کے صدمے سے عورت نے خودکشی کرکے دنیاوی آلام کا خاتمہ کردیا ..... لڑکی کا نام ..... کامنی .....

شانتی کا سر چکرانے لگا۔ اس کی زبان سے بدقسمت ہندوستانی عورت" نکلا اور اپنی نوجوان وخوبصورت سہیلی کو یاد کرکے زار زار رونے لگی۔
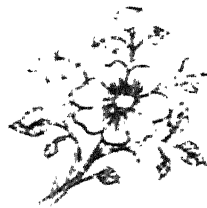
حضرت شوق قدوائی

(از پروفیسر عبدالقادر سروری، ایم۔اے، ایل ایل، بی، ایڈیٹر "مکتبہ")

منشی احمد علی شوق قدوائی ان شعرا میں ہیں جو وسیع ملکی تحریکات کے درمیان رہکر بھی اپنی فکر کی دنیا آپ تعمیر کر لیتے ہیں۔ ایسے شعرا عموماً داخلی رنگ میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کی کائنات ان کے دل کے اندر ہوتی ہے، ان کا احساس خودی اس قدر زبردست ہوتا ہے کہ مشاہدات ان کے اندر جذب ہو کر ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں جس میں شاعری کی ذات کو بڑی حد تک دخل ہوتا ہے۔ داخلی شاعروں کے کلام سے ان کے گرد و پیش حالات کا پتہ مشکل سے چلتا ہے۔ شوق کا بھی یہی حال ہے، ان کے سوانح نگار کے لئے ان کی شاعری میں بہت کم مواد ہے۔

شوق سنہ ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے، قصبہ جگور ان کی جائے پیدائش ہے ان کے والد کاظم علی یہیں کے باشندے تھے۔ شوق کی تعلیم پہلے بدایوں کے ایک اسکول میں ہوئی پھر وہ ریاست رامپور میں عرصہ تک تعلیم پاتے رہے۔ شعر و سخن کا ذوق انھیں بچپن سے تھا، غزل کی مشق آسیر کے پاس شروع کی تھی۔ اور عرصہ تک غزل لکھتے رہے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شوق نے صحافت کو اپنا پیشہ بنانا چاہا، لکھنؤ سے ایک اخبار "آزاد" نکالتے تھے، لیکن اس سعی میں انھیں ناکامی ہوئی اس لئے وہ اخبار کو چھوڑ کر پرتاب گڈھ میں ملازم ہو گئے بھوپال میں بھی ملازمت کی، لیکن آخر میں وہ ریاست رامپور آگئے تھے جہاں "حامد اللغات" کی تدوین کے سلسلہ میں کام کرتے رہے۔

شوق اُن شاعروں میں سے ہیں جو اپنے کلام کو بیحد کوشش سے سرانجام کرتے ہیں، اسی لئے ان کی شاعری میں کہیں کہیں تکلف اور تصنع کے اثر بھی پائے جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندی ماحول اور جذبات کے جو وسیع نقشے شوق نے کھینچے ہیں، اردو شاعری میں خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ شوق کی شاعرانہ سرگرمیاں زیادہ تر سنہ ۱۸۹۰ء کے بعد سے شروع ہوئیں، چنانچہ ان کی پہلی قابل ذکر مثنوی "ترانۂ شوق" سنہ ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔ آخر تک یہ برابر شعر لکھتے رہے۔ اس اعتبار سے کم و بیش پچاس سال کے وسیع زمانے پر ان کی شاعری حاوی ہے۔ "قاسم و زہرہ" سنہ ۱۹۱۵ء میں لکھی گئی

شوق کی طبیعت کے جوہر وقتوں سے چمکتے رہے۔ ان کی آخری عمر کا شعری کارنامہ ان کی مشہور نظم عالم خیال ہے جو کئی حیثیتوں سے اُردو شاعری میں بے نظیر تسلیم کی جاتی ہے۔

شوق کی طبیعت میں بے حد جدت طرازی اور یگانہ روی تھی۔ یہ وصف ابتدا میں کم لیکن آخری زمانہ کی شاعری میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ اپنے اطراف کی غزل گوئی، قومی شاعری اور سیاسی شاعری سے وہ کم سے کم متاثر ہوئے اور پہلے جس کارنامے سے شاعروں کی سطح پر ابھرے اُن کی مثنوی "ترانۂ شوق" ہے۔ "ترانۂ شوق" کے لکھنے کے وقت شوق کے ذہن میں شاعری کے قدیم محاسن ہی معیار بنے ہوئے تھے۔ "ترانۂ شوق" کا مطمح نظر مثنوی "گلزارِ نسیم" ہے۔ اسلوب دونوں کا ایک سا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ "گلزارِ نسیم" میں صناعی زیادہ ہے۔ قصے کے اعتبار سے ترانہ بہت ہی ناقص اور پیچیدہ ہے۔ قصے کے عناصر فوق فطری ہیں، یہ بذاتہٖ کوئی عیب نہیں ہے۔ لیکن پلاٹ اور "گلزارِ نسیم" قدیم مثنویوں کے مقابلے میں بہت ہی ناقص ہے۔ حالانکہ شوق کی مثنوی کے لئے "سحر البیان" اور "گلزارِ نسیم" کے نمونے موجود تھے۔ قصے کی ابتدا بادشاہ کی لاولدی کے غم سے ہوتی ہے۔ اشخاص قصہ سحر البیان کی طرح شہزادہ ماہ عالم، وزیر زادہ اختر، شہزادی یاسمن اور وزیر زادی گلشن ہیں۔ سحر البیان کے قصے کا عمل اور اس کی حرکت کی یکسانیت اور تناسب بھی اس مثنوی میں مفقود ہے۔

شوق کی غزلیں تعداد میں تو بہت کم ہیں لیکن ان کی کیفیت اور ان کا طرز انفرادی ہے۔ وہ زبان بہت سلیس اور بحریں مترنم استعمال کرتے ہیں۔ عورتوں کے جذبات کی مصوری میں شوق کو خاص مہارت تھی۔ غزل میں بھی یہ خصوصیت خاص طور پر نمایاں ہے۔

ذیل کی غزل نمونے کے طور پر پڑھی جا سکتی ہے:-

روح کو آج ناز ہے اپنا وقار دیکھ کر ۔۔۔ اس نے چڑھائی تیوریاں میرا وقار دیکھ کر
قصد گلہ نہ تھا مگر حشر میں جوشِ شوق سے ۔۔۔ ہاتھ مرا نہ رک سکا دامنِ یار دیکھ کر
دیکھ کے ایک بار انھیں دل سے تو ہاتھ دھو چکے ۔۔۔ دیکھیے کیا گزرتی ہے دوسری بار دیکھ کر
آئے ہیں وہ تو پہلے ہی رنج سے صاف ہو رہوں ۔۔۔ آکے کہیں پلٹ نہ جائیں دل میں غبار دیکھ کر
وصل سے گذرے اے خدا، ہاں یہ شگون چاہیے ۔۔۔ صبح کو ہم اٹھا کریں روئے نگار دیکھ کر
کعبہ کو جانا شوق ابھی نیتِ زندگی بخیر ۔۔۔ ہم بھی چلیں گے تیرے ساتھ اب کی بہار دیکھ کر

یہ آخری زمانے کی شاعری کا رنگ ہے۔ اس میں عورتوں کی گفتگو کا پیرایہ حسن پایا جاتا ہے۔ محاورے اور اسلوب دونوں ایسے استعمال کرتے ہیں جو ایک تعلیم یافتہ عورت کی بول چال میں عام طور سے آتے ہیں۔

اس رنگ کی شاعری میں شوق کو خصوصی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، اس کا سبب ان کی نظم "عالم خیال"
کی غیر معمولی کامیابی ہوئی۔

شوق کی شاعری میں خاصہ تنوع ہے، ان کے موضوع شاعرانہ اور علمی دونوں تھے "حسن" "بہار"
اور "ہندوستان کی برسات" کی نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح جذبات کی صورت کشی پر شوق کو
حاصل تھی اسی طرح منظر اور سماں پر بھی وہ کامیابی سے قلم اٹھا سکتے ہیں۔

"حسن" کے عنوان کی نظم، شوق کی اس قدرت کا ایک ثبوت ہے، جو ان کو حکمی اور مشکل مسائل کے
بیان پر حاصل تھی۔ یہ ایک طویل نظم ہے جس میں شاعر نے حسن کی تعریف اور اس کے اجزا سے بحث کی
اور کائنات میں "حسن" کے جو پہلو ظاہر یا مستور ہیں اُن پر روشنی ڈالی ہے۔ نظم کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا
کہ شاعر کے پیش نظر حُسن لبسیط کا تخیل ہے، وہ اسی سے مخاطب ہے اور اشیائے عالم سے اُس کو
تقابل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ذیل کے بیانات ملاحظہ ہوں:۔

اللہ رے! حُسن! تیرے نیرنگ — تو جس میں ہو، لاتی ہے وہ شے رنگ
گلشن کی ہوا، پیام تیرا — پھولوں میں بہار نام تیرا
پردے سے خزاں کے تنگ ہو کر — باہر نکلا جو رنگ ہو کر
کی تو نے لگا کے ہر طرف گشت — گلکاری صحنِ گلشن و دشت
سبزی، سبزے کی خوبی تجھ سے — رنگت پاتی ہے دوب تجھ سے
سرخی سے چمن میں در دہے تو — سرسوں پھولے تو زرد ہے تو
دھانوں میں ترا لباس دھانی — السی پھولے تو آسمانی
تو نخل کے قد سے تن کے پیدا — تو شاخ سے لوچ بن کے پیدا

حسن سے بھی زیادہ خشک مسائل پر شوق کی ایک دوسری نظم ہے جس کا عنوان "سٹیئنس اینڈ رلیجن"
(سائنس اور مذہب) ہے۔ اس نظم میں سائنس اور مذہب کے پیچیدہ اور دقیق مسائل نہایت شگفتہ
انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ سر سید احمد خاں کی تفسیر قرآن کی ناکامی کا بڑا سبب یہ سمجھا جاتا ہے کہ
نے حکمی مسائل کو اپنا معیار بنا کر مذہبی مسائل کو ان پر منطبق کرنے کی کوشش کی تھی، اس میں انھیں
کا سامنا کرنا پڑا۔ اکثر امور میں سید صاحب نے مذہبی عقائد کی تاویل اپنے سطح نظر کے مطابق کر لی
لیکن اس نظم میں شوق نے مذہبی عقائد اور مسائل کو معیار بنایا ہے، اور سائنس کو ان کے مطابق
کی کوشش کی ہے۔ شوق سائنس کو مذہب کا معاون سمجھتے ہیں نہ کہ مخالف۔ ان کا یہ عقیدہ تھا

کہیں بھنگراج دل کو کھینچتا ہے خوش نوائی سے — نہیں مینائیں کم کرتی ہیں آپس کی لڑائی سے

ہزاروں رنگ کی چڑیاں، ہیں شکلیں خوشنما جنکی — ادائیں دلربا جن کی، صدائیں نغمہ زا جن کی

بہار آنے سے خوش ہیں ہر طرف اتراتی پھرتی ہیں — ہوا تو ناچتی پھرتی ہے چڑیاں گاتی پھرتی ہیں

شوق نے "لیل و نہار" کے نام سے ایک طویل مسدس قومی بھی لکھا تھا جو ۱۸۹۴ء کے اجلاس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا گیا۔ یہ مسدس حالی کے مسدس کے مقابلے میں کچھ رتبہ نہیں رکھتا۔ شوق کا ایک اور کارنامہ بھی قابل ذکر ہے۔ "قاسم و زہرہ" کے نام سے انھوں نے ۱۹۱۵ء میں ایک منظوم ڈراما بھی لکھا تھا ڈراما نہ تو اُردو ادب میں کوئی قابل قدر اضافہ ہے اور نہ نظم کے اعتبار سے کچھ اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں سوائے نام کے ڈرامے کی کوئی خوبی نہیں ملتی۔ پلاٹ بہت معمولی، اشخاص قصہ غیر فطری افعال کا مجموعہ اور مکالمات حسن گفتار کی ہر ایک خوبی سے معرّا ہیں۔ صرف زہرہ کی ماں صفیہ کی چلی کٹی باتیں اپنے شوہر قاری کی جناب میں کچھ جان رکھتی ہیں۔

شوق کی شعری قابلیت کا معراج کمال "عالم خیال" میں نظر آتا ہے۔ اس نظم کا موضوع ایک ہندوستانی فراق زدہ بیوی کی یاد شوہر ہے۔ نظم اردو میں بالکل انوکھی ہے۔ صنف لطیف کے نازک اور مشکل جذبات کو شوق نے الفاظ کے ذریعہ جس خوبی سے دکھلایا ہے قابل قدر ہے، زبان میں جو نزاکت، سادگی اور شیرینی ہے۔ اردو کی بہت کم نظموں میں مل سکے گی۔ نظم کیا ہے نسوانی جذبات کا ایک مرقع ہے ایک کے بعد دوسری نفیس تر تصویر نظر کے سامنے سے گذرتی جاتی ہے۔ ایک جگہ شاعر نے دکھلایا ہے کہ بیوی کو شوہر کے آنے کی توقع تھی کہ شوہر کا خط ملتا ہے۔ اس میں معذرت کی گئی تھی کہ وجوہات کی بنا پر جلد آنا ممکن نہیں، اس خط کو پڑھکر لڑکی کے دل میں ایک غیر شعوری خوشی شوہر کی محبت کے ساتھ ساتھ توقع کے خلاف ہوا ہے یاس کے جو جذبات ابھرتے ہیں انھیں ایک بڑے ماہر نفس کے تجزیہ کے ساتھ دکھلایا ہے۔

خط سے بڑی جگہ پہ چوٹ، داغ ہرے ہوئے ہیں آج — تم سے ہزار ہا گلے دل میں بھرے ہوئے ہیں آج

خط ہے تمہارے ہاتھ کا پڑھتی ہوں اس کو بار بار — کھولتی ہوں ہزار بار، چومتی ہوں ہزار بار

جن سے لکھا گیا ہے خط، کاش وہ انگلیاں ملیں — میرا خیال چوم لے، جا کے وہیں جہاں ملیں

خود بھی گئے تم، اور چین چھین کے مجھ سے لے گئے — مجھ کو تڑپ بنا گئے، مجھ کو جنون دے گئے

سب کے جگر میں خون ہے میرے جگر میں درد ہے — سب کا شباب لال ہے، میرا شباب زرد ہے

پہلے تمہیں تھے میرا عشق بن گئے غم، تو کیا کروں — پہلے تمہیں تھے میرا چین، اب ہو ستم تو کیا کرو

تم نہ ستم کرو تو کیوں دل مرا بے قرار ہو — میں نہیں چاہتی کہ تم میرے گناہگار ہو

کیا میں خدا کے سامنے تم کو سزا دلاؤں گی؟ اپنی وفا کے نام کو خاک میں کیوں ملاؤں گی؟

اس میں شک نہیں کہ کہیں کہیں خلاف اصول نفس باتیں بھی قلم سے نکل گئی ہیں۔ لیکن ان سے نظم کی مجموعی خوبی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ جسٹس سر محمد سلیمان نے اس نظم پر تنقید لکھی تھی جو نظم کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس کا ایک جملہ نظم کی بڑی تعریفوں سے زیادہ وقیع ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اس نظم میں عورت کا دل مرد کا قلم بن کر بول رہا ہے"۔

نوٹ کی چنگاری

غریب عیالدار کو کئی دن کی محنت کے بعد پانچ روپے کا نوٹ ملا۔

اور اس کے گھر میں آٹا، لکڑی، دال کچھ بھی نہ تھا، اور وہ خود اور اس کی بیوی اور اسکے بچے کئی دن کے بھوکے تھے

نوٹ نے غریب عیالدار کے گھر کی دردناک حالت دیکھی اور اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ ابھی بازار میں چل کر اپنے آپ کو بیچ دیتا ہوں، تاکہ ان مصیبت کے ماروں کو آٹا، لکڑی، دال مہیا ہو سکے۔

لیکن ابھی رحمدل نوٹ کا یہ ارادہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ سنگدل ساہوکار آیا اور اپنے سود کے حساب میں پانچ روپے کا نوٹ غریب سے چھین کر لے گیا۔ اور اُس نے وہ آنسو نہ دیکھے جو غریب کی آنکھوں میں جھلک رہے تھے نہ اُس نے وہ فریاد کے لفظ سنے جو غریب کے ہونٹوں پر موت کی ہچکیاں لے رہے تھے۔

ساہوکار نے گھر جا کر اپنا نوٹوں سے بھرا ہوا صندوق کھولا، اور اُس میں یہ نوٹ رکھدیا۔ وہاں اس نوٹ نے غریب کی بےکسی کا تصور کیا اور اپنے جلتے ہوئے سینہ سے ایک عالم سوز شعلہ نکال کر اپنے کاغذی پیرہن میں آگ لگالی۔

رات کے وقت وہ نوٹ اور وہ نوٹوں کا صندوق، اور وہ ساہوکار کا گھر سب آگ کے شعلوں میں گھرے ہوئے تھے اور اس آگ کو بجھانے کی طاقت آگ بجھانے والے انجن میں نہ تھی۔

ساہوکار سامنے کھڑا اپنے گھر کی بربادی دیکھتا تھا اور روتا تھا، اور اپنے گھر کے لوگوں پر جھنجھلاتا تھا کہ یہ تم میں سے کسی کی لاپروائی ہے۔ مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ اس غریب کے سینہ کی آگ ہے جسے وہ دوپہر کے وقت پانچ روپے کے نوٹ میں باندھکر لایا تھا۔

(چندن)

تنقید کتب

قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب (اُردو ترجمہ)

شائع کردہ ہندستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ الہ آباد، حجم ۲۳۰ صفحات، قیمت للعہ

یہ کتاب رائے بہادر، مہامہوپادھیائے گوری شنکر ہیراچند اوجھا صاحب کے تین لکچروں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۹ء کو ہندستانی اکیڈیمی کی سرپرستی میں دیے گئے تھے۔ اصل کتاب ہندی زبان میں ہے اور کتاب زیرِ ریویو اسی کا اُردو ترجمہ ہے۔ مترجم اُردو اور ہندی کے مشہور و معروف انشا پرداز منشی پریم چند صاحب ہیں۔ ان تینوں لکچروں کا تعلق اُس زمانہ سے ہے جسے ہند کا زمانۂ وسطیٰ قرار دیا گیا ہے اور جس کی مدت بقول مصنف سنہ ۶۰۰ء لغایت سنہ ۱۲۰۰ء بیان کی گئی ہے۔

مہامہوپادھیائے صاحب اپنے فن کے اُستاد ہیں، اُن کو پرانی باتوں کی تحقیق و تفتیش سے گہری دلچسپی ہے، اور اُنھوں نے اسی موضوع کو اپنا مشغلہ تحریر بنا لیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اُن کی "پراچین لپی مالا" (قدیم رسم الخط) اور "تاریخ راجستھان" یادگار تصانیف ہیں۔ کتاب زیرِ تنقید میں بھی اگرچہ "مذہب و معاشرت"، "ادبیات"، "نظامِ سلطنت وصنعت و حرفت" نامی تین ہی عنوان قائم کئے گئے ہیں، مگر قابل مصنف نے انھیں ہر سہ عنوانات کی جامعیت کے لحاظ سے دورِ متعینہ کی تقریباً سبھی باتوں کو سمیٹ لیا ہے جس سے حالات میں تکمیل کا رنگ نظر آتا ہے۔

شروع میں اس وقت کے مذاہب کی صراحت کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں تین مذاہب کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی ویدک، بودھ، اور جین، آخر الذکر دو مذاہب سے کسی قدر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور اُن کے عقائد پر خاصی روشنی ڈالی گئی ہے۔ البتہ ویدک دھرم کو شاید اس لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس وقت ہندو دھرم میں منتقل ہو کر وشنو، شیو، شکتی پوجا وغیرہ کی مختلف اشکال میں تبدیل ہو گیا تھا۔ انھیں پوجاؤں کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ ہاں ویدک دھرم کا ذکر کرتے ہوئے مصنف صاحب یہ کہنا نہیں بھولے کہ "یگیہ میں جانوروں کی قربانیاں بھی ہوتی تھیں"۔

مگر ہماری رائے میں ان قربانیوں کو ویدک دھرم سے نہیں بلکہ اُسی ہندو دھرم سے منسوب
کرنا قرینِ انصاف ہوگا جو ویدک دھرم کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

ہم موجودہ زمانہ والوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اُس وقت ملک میں مختلف مذہب
کے ہوتے ہوئے بھی ایک عام مذہبی یکرنگی نظر آتی تھی۔ اس یکرنگی کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ بودھ
اور ہندو دھرم ایک دوسرے کی طرز پرستش سے متاثر تھے۔ بودھ اور جین مذاہب نے ہندو دھرم
سے بُت پرستی کا سبق پڑھا اور آخر الذکر نے بودھ اور رشبھ کو اپنے یہاں کے اوتاروں میں شامل کر لیا۔
مذاہب سے قطع نظر ہمیں اُس وقت کی ذاتوں میں بھی اتحاد و ارتباط نظر آتا ہے۔ برہمن
چھتری، ویش، شودر سبھی مل جل کر رہتے تھے، اور ان میں باہمی مناکحت اور خورد و نوش کا ہونا بھی پایا
جاتا ہے۔ اُس زمانہ کے آخری دور تک متعدد ضمنی ذاتوں کا ظہور نہ ہوا تھا اور چھوت چھات کا آخری
دور تک کوئی سراغ نہیں ملتا۔ چھوت چھات کا مسئلہ تو ۱۲۰۰ء کے بعد کا ہے۔ برہمنوں میں
خاندانی تفریق اور شودروں میں پیشہ کے ذاتوں کا وجود ۱۰۰۰ء کے بعد ہوا۔ پھر ذاتوں کی کثرت
کے ساتھ باہمی تفریق کا پیدا ہونا اور بڑھنا بالکل قدرتی امر تھا۔ پیشہ کی بنا پر ذاتوں کی تقسیم کے سلسلہ
میں ہم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ جو برہمن یا چھتری اُس وقت املاک رکھتے تھے وہ سب کائستھ کہلاتے تھے۔

معاشرتی ترقی کے اعتبار سے بھی اُس وقت ہندوستان کی حالت ہر طرح قابل اطمینان تھی۔ اگر
ہماری موجودہ معاشرت سے مغربیت کے عنصر کو خارج کر دیا جائے تو ہمیں سب کچھ اب جیسا ہی نظر
آتا ہے۔ محل، ناٹک گھر، موسیقی خانے، میلے تماشے، کھیل، سوت، اُون اور ریشم کی زنانہ و
مردانہ پوشاکیں، سونے چاندی کے زیور، نہانا دھونا، کھانا پینا وغیرہ سبھی اپنے قدیم رنگ میں ہمارے
لئے ایک کشش رکھتے ہیں، کچھ باتیں تو اب سے بھی بڑھ کر تھیں۔ مثلاً عورتوں کا تعلیم یافتہ و [illegible]
ہونا، پردہ کی محدودیت، بلوغت کی شادی، ازدواج بیوگان وغیرہ۔ پھر ہمارے اُس وقت کے اعلیٰ
اخلاق و اطوار کا تو کہنا ہی کیا جس کی تعریف میں میگاستھینز، ہیون سانگ، الادریسی، مارکو پولو وغیرہ
یکساں رطب اللسان ہیں۔

اس کا ایک خاص سبب اپنے ہی علم ادب کی انتہائی ترقی کا ہونا ہے۔ نظم و نثر کی صدہا کتب
ناول، ناٹک، کتھائیں، ویاکرن، لغت سبھی موجود ملتے ہیں۔ اس سلسلہ میں قابل مصنف نے
چند سنسکرت شعرا کی امتیازی خصوصیت بھی دکھائی ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ نظم تو گویا ان کی گھٹی
میں پڑی ہے۔ مشکل سے کوئی ایسا شعبہ ہوگا جس پر کوئی منظوم کتاب موجود نہ ہو حتیٰ کہ [illegible] کا ذکر کرتے

ہوئے قابل مصنف نے چینی سیاحوں کے بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے بتلایا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں پانچ ہزار دار العلوم تھے جنمیں دو لاکھ بارہ ہزار ایک سو تیس طلبار تعلیم پاتے تھے۔ ان کے علاوہ برہمنوں کے مکانات اور سادھوؤں کے مٹھ مدرسوں کا کام دیتے تھے۔ نالندہ کے شہرہ آفاق دار العلوم میں دس ہزار طلبا پڑھتے تھے جن سے کوئی فیس نہیں لیجاتی تھی بلکہ ان کی تمام ضروریات بھی مفت پوری کی جاتی تھیں تعلیمی کام پر ۱۵۱۰ ہزار اتالیق مامور تھے۔ ریاضیات منطق۔ نجوم، قواعد، طب وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ علاوہ بریں ٹکشن شلا کا جامعہ بھی قدیم ترین تھا جہاں وید، ویاکرن، کاریگری، فن حرب، علم شفا وغیرہ پڑھائے جاتے تھے یہی سلسلہ تعلیم دور متعینہ کے شروع سے آخر تک قائم رہا۔

ترقی فلسفہ کا ذکر کرتے ہوئے قابل مصنف نے صفحہ ۱۰۲ سے ۱۱۲ تک ہمارے چھ درشن شاستروں کی توضیح کی ہے جو زمانہ زیر بحث کے قبل ہی تصنیف ہو چکے تھے۔ اسی خیال سے یہ توضیح محض بیکار ہے۔ موضوع کی مشکلات نے ترجمہ کی مشکلات سے ملکر اس حصہ کتاب کو ناقابل فہم اور بیکار بنا دیا ہے۔ اُس ترقی کے متعلق چند یوروپین علماء کی رائیں بھی درج کی گئی ہیں۔ "شلیگل نے لکھا ہے کہ یورپ کا اونچے سے اونچا فلسفہ ہندوستانی فلسفہ کے شمس نصف النہار کے سامنے ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔"

علم نجوم کی بھی کچھ کم ترقی نہیں ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ زمین کی کشش کے مسئلہ کو نیوٹن نے دریافت کیا تھا مگر ہندوستان میں اُس کے بہت قبل بھاسکر اچاریہ جی نے اُس کشش کا نیز زمین کے گول ہونے کا مفصل ذکر کیا ہے۔ ایک براہمن گرنتھ میں یہ بھی لکھا ہے کہ دن رات کا ظہور زمین کی گردش سے ہوتا ہے اس علم کو چین و عرب نے ہندوستان ہی سے سیکھا تھا۔ اسی طرح علم الاعداد، الجبرا، اقلیدس، ان سبھی علوم کو عرب نے ہند ہی سے سیکھا اور پھر عرب ہی کے ذریعہ اُن کی اشاعت یورپ میں بھی ہوئی۔ قابل مصنف نے علم الاعداد کے ارتقاء کا بیان کئی صفحات پر کیا ہے جو خصوصاً پڑھنے کی چیز ہے۔ اس کا موجد بھی ہندوستان ہی کو ثابت کیا گیا ہے۔

اسی طرح طب اور جراحی کا ذکر کرتے ہوئے قابل مصنف نے لکھا ہے کہ ان باتوں کے لئے بھی یورپ عرب کی وساطت سے ہند ہی کا مرہون منت ہے۔ یہاں کے طبی آلات کی تعداد ایک سو سے اوپر بتلائی گئی ہے، جذام اور چیچک کے ٹیکہ کا ذکر ہے اور دانت اور ناک بنانے کا بھی۔ حیوانات کے متعلق بھی طبی علوم کا ہونا بھی پایا جاتا ہے اور اُن کے علاج کا بھی کافی انتظام نظر آتا ہے شفاخانوں کے بارہ میں تحریر ہے کہ سب سے پہلے اون کی قائمی ہندوستان ہی میں ہوئی۔

ان کے علاوہ اُن سب علوم کا بھی ذکر ہے جو کسی مہذب قوم کے نظام معاشرت کو مکمل بناتے ہیں

سیاست، قانون، اقتصاد، جواہرات، موسیقی سبھی پر معرکۃ الآرا تصانیف کا موجود ہونا دکھلایا گیا ہے۔ ان باتوں کا ہونا ہمیں ذرا بھی حیرت انگیز نہیں معلوم ہوتا جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس وقت بقول ہیولنسانگ سلطنت کی کل آمدنی چار حصوں میں منقسم ہو کر صرف ہوتی تھی اور ایک ایک حصہ سیاسی امور، رفاہ عام، تعلیم، مذہبی جماعتوں کی اعانت، ان چار کاموں کے لئے وقف ہوتا تھا۔

ہندوستانی نظام سلطنت بھی درجۂ کمال پر پہونچا ہوا تھا۔ انفرادی حکومت میں بھی جمہوریت کا شائبہ تھا۔ راجہ کے اختیارات محدود تھے، اس کو وزراء کے مشورہ اور "دھرم گرو" اور برہمنوں کی صلاح سے کام کرنا پڑتا تھا۔ فوجی، عدالتی، ان ہر دو اہم شعبہ جات کے انتظامات بھی مکمل تھے، گانوں کا انتظام گانوں کی پنچایتوں کے سپرد تھا جو تقریباً آزاد ہوتی تھیں۔ ووٹ سے انتخابات کا ہونا بھی پایا جاتا ہے۔ عوام اور مسافروں کی آسایش کے لئے کنوئیں، سڑک، سرائیں سبھی چیزیں تھیں، کاشتکاروں کا تو بہت کچھ خیال رکھا جاتا تھا، اُن کے لئے ہر طرح کی آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کیجاتی تھی جو زراعتی ترقی اور ملکی خوشحالی کا باعث ہوں۔ آبپاشی کے لئے نہریں بھی موجود تھیں۔

دیشی اور بدیشی تجارت کی حالت اب سے بہتر نظر آتی ہے۔ اُس زمانہ میں بحری سفر کی ممانعت نہ تھی۔ غیر ملکی تجارت کا سلسلہ عرب، مصر، فارس، روم، جاوا، سماترا وغیرہ سے قائم تھا جس کے لئے ضرورت و سہولت کے مطابق بحری اور بری راستوں کا سفر اختیار کیا جاتا تھا۔ میگاستھینز نامی چینی سیّاح نے یہاں کی جہازرانی کا ذکر کیا ہے۔ غیر ملکی تجارت کے فروغ کا پتہ اس امر سے چلتا ہے کہ ہند کو برآمد کے ذریعہ صرف روم سے ایک کروڑ روپیہ سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ دور وسطیٰ میں یہاں جہازوں کے علاوہ بمان (ہوائی جہاز) اور "لفٹ" کا بننا بھی پایا جاتا ہے۔

ہندوستان کے کپڑوں کے قدیم صناعی تو مشہور ہی ہے۔ سنگ تراشی اور تعمیر کے اعلےٰ نمونے بھی اُن غاروں، مندروں، ستونوں اور مورتوں میں نظر آتے ہیں جن کی داد یورپین ماہرین فن تک نے دی ہے۔ چنانچہ باڈلی کے مندر کی سنگتراشی کے متعلق کرنل ٹاڈ صاحب فرماتے ہیں کہ "اس حیرت انگیز اور بے مثال کاریگری کی داد دینی قلم کی طاقت سے باہر ہے۔" بیلور کے مندر کی بابت پروفیسر میکڈانل کا بیان ہے کہ شاید ساری دنیا میں ایسا دوسرا مندر نہوگا۔ مسٹر ہیول نے لکھا ہے کہ "ہندوستانی فن تعمیر کا درجہ یورپ اور ایشیا کے تمام دیگر طرزوں سے اونچا ہے۔" اس کے ساتھ ہی ہمارا فن مصوری بھی معراج کمال کو پہونچ گیا تھا۔ اجنتا کی ایک

یر کے جذباتی منظر کی تعریف کرتے ہوئے مسٹر گریفتھ لکھتے ہیں کہ" ساری دنیائے تصویر میں اس
بتر تصویر نہیں مل سکتی۔" ہندوستانی مصوری کے متعلق ہیول صاحب نے لکھا ہے کہ" یورپ
سویریں پر بریدہ سی معلوم ہوتی ہیں، کیونکہ اہل یورپ صرف حسن مادی کے شیدا تھے۔ ہندوستانی
سویر حقیقی کیفیات اور ملکوتی جذبات کا ترجمان ہے۔"

بہر حال کتاب زیر تنقید ایسی قیمتی اطلاعات و معلومات کا گنجینہ ہے جن سے ہماری قدیم معاشرت
فی روشنی پڑتی ہے۔ البتہ تمام کتاب میں کسی نہ کسی حد تک ایک بے ربطی نظر آتی ہے
کو تحریر کی نہیں بلکہ تقریر کی ایک نمایاں خصوصیت کہنا چاہیئے۔ جابجا تکرار کا بھی نقص ہے قابل
ف نے اپنے بیانات کی تائید میں دیگر مصنفین کے حوالہ جات اس کثرت سے دیے ہیں کہ
اُن سے مصنف کے وسیع مطالعہ کا پتہ چلتا ہے وہاں اس کتاب میں اور بخنلیٹی کا لطف بھی
جاتا ہے۔ ہماری رائے میں کتاب کا خاتمہ بہتر اور زیادہ مکمل طریقہ پر ہونا چاہیئے تھا۔

آخر میں ترجمہ کے متعلق بھی چند الفاظ بیجا نہ ہونگے۔ ہم ہندوستانی اکیڈیمی کی کتابوں میں
ثقیل الفاظ کا دیکھنا پسند نہیں کر سکتے جیسے متبحر، معتدبہ، سماع، جالب، جبندر، مستمر، تلمیذ
ت، ربانیت، متبائن، اختصاص تفرقات، محیر العقل وغیرہ وغیرہ۔ اکیڈیمی کا خاص مقصد
و اور ہندی زبانوں کو زیادہ عام فہم بنانا ہے، اور اس کی تکمیل جبھی ہو سکتی ہے جب مشکل
ظ کی بھرمار نہ کی جائے یا کم سے کم اس بات کا ضرور خیال رکھا جائے کہ جہاں سہل لفظ سے
چل سکتا ہو وہاں مشکل لفظ ہرگز استعمال نہ کیا جائے۔

صفحہ ۱۳۴ پر عاطیوں اور صفحہ ۱۷۹ پر جنس طلبار کا مفہوم ہماری سمجھ میں نہ آیا، اسی طرح صفحہ [۱۴]
عبارت عام فہم ہونے کے لئے زیادہ وضاحت کی محتاج ہے۔ صفحہ ۴۴ پر نیچے کی سطر کے بعد
ور عبارت ہونی چاہیئے جو غالباً چھپنے سے رہ گئی ہے۔ کتاب میں کہیں کہیں ایک آدھ چھاپے
غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔

فی الجملہ کتاب قابل قدر و قابل مطالعہ ہے۔ چھپائی موٹے سفید کاغذ پر ٹائپ کے حروف
ہے اور کپڑے کی سنہری جلد لگائی گئی ہے، متعدد عکسی تصاویر بھی شامل ہیں۔

اقبال ورما سحر ہنگامی

رسالہ نیرنگ کا افسانہ نمبر

رسالہ نیرنگ دہلی کا افسانہ نمبر ۲۱۲ صفحات، دل آویز ٹائیٹل اور متعدد تصاویر کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اور جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے یہ نمبر تمام و کمال افسانے سے متعلق ہے بجز چند نظمیں ایسی ہیں جن کو افسانہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اکثر افسانے پلاٹ کے لحاظ سے دلچسپ ہیں کچھ افسانے ایسے ہیں جو صرف تفریح کے لئے لکھے گئے ہیں۔ سجاد حیدر صاحب کا افسانہ "عورت کا انتقام" عورت کی فطرت کے وسیع مطالعہ پر مبنی ہے۔ اسی طرح جناب اسلم صاحب کا افسانہ "فریب تمنا" بھی خوب ہے۔ لیکن آخری حصہ کا طرز بیان غیر سنجیدہ سا ہو گیا ہے۔ جناب اکبر حیدری کا یہ قطعہ بہت خوب ہے۔

مطمئن رہنے کے قابل محفل ہستی نہیں — مرگ در آغوش دنیا بے سبب بستی نہیں

احترام بزم ہستی اور ہیں بالغ نظر — ایک شاعر کی محبت اس قدر سستی نہیں

جناب جوش کی نظم "بیمار حسن بیمار" خصوصیات شعری کی بہترین آئینہ دار ہے۔

کچھ نظموں میں جابجا خامیاں نظر آتی ہیں، معلوم نہیں ان میں کاتب کی عنایت کہاں تک شامل ہے۔ سب سے پہلے جناب عشرت رحمانی ایڈیٹر "نیرنگ" کی نظم ملتی ہے۔ موصوف اس نظم میں فرماتے ہیں:-

داستاں سرائی نے تری کیا کیا مزا دیا — وہ کچھ سنا دیا کہ دلوں کو مٹا دیا

مصرعۂ اولیٰ ناموزوں ہے۔ معلوم نہیں یہ کاتب کی عنایت ہے یا خود عشرت صاحب ہی نے یہ [illegible]

اسی طرح چوتھے بند میں

جادو بیانیوں نے تری مست کر دیا — رگ رگ میں گویا بحر عشق بھر دیا

یہ شعر بھی ناموزوں ہے۔ مصرعہ ثانی میں گویا کا الف تقطیع سے خارج ہو جاتا ہے [illegible]

صفحہ ۶۵ پر جناب راز ردولوی اپنی نظم "نسیم صبح" میں فرماتے ہیں:-

نکہت گلزار و باغ زندگی کی [illegible] — [illegible] دامن ہستی میں نشاط

مصرعہ ثانی صرف الفاظ کی نمائش کے لئے کہا گیا ہے، مفہوم کچھ نہیں۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

بے سکون سرمدی حاصل تری رعنائیاں — [illegible]

[illegible] کہا گیا ہے شاید
اس سے مراد "موجۂ شراب" ہے، موجۂ شراب کو موجۂ خم نہیں کہا جا سکتا یہ ترکیب ہی مہمل ہے

ایک جگہ اور فرماتے ہیں:-

نگہتوں میں تیری رقصاں سبزۂ گلزارِ عشق — ہر نفس ہے اک سرورِ لذتِ اسرارِ عشق

"رقصاں" کا لفظ نظم کرنے کے لئے اکثر شعراء حال بیتاب رہتے ہیں خواہ اس کا محل ہو یا نہو نظم کر جاتے ہیں۔ معلوم نہیں یہاں "رقصاں" کا لفظ کیا سمجھ کر لکھا گیا ہے نگہت کے معنی ہیں خوشبو اور ظاہر ہے کہ خوشبو کے اثر سے سبزہ کس طرح رقص کر سکتا ہے۔ ایسی غلطیاں صرف چند خوشنما الفاظ نظم کرنے کی کوشش میں ہمارے شعراء سے سرزد ہو رہی ہیں۔ جن کی ناکامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ وہ الفاظ کی رعایت سے مفہوم تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ انہیں مفہوم متعین کر کے اس کے اظہار کے لئے بہترین الفاظ تلاش کرنا چاہیئے۔

صفحہ ۶۵ میں جناب ابو الاقبال حضرت عیش فیروز پوری کی ایک غزل طور کے افسانہ کے عنوان سے ہے، جس کا تیسرا شعر یوں لکھا گیا ہے:-

واعظ کی زباں پر ہے ہر وقت سرِ ممبر — یا تذکرہ کوثر کا یا حور کا افسانہ

صحیح املا منبر ہے "ممبر" غلط ہے۔

ایک دوسرا شعر عجب انداز سے کہا گیا ہے:-

ایسا نہ ہو پڑ جائے چھالا لبِ نازک پر — چھیڑو نہ مرے دل کے ناسور کا افسانہ

خدا جانے ہمارے شعراء اپنے معشوقِ دلنواز کی نزاکت کو کہاں تک سراہیں گے۔ اس دورِ ترقی میں جب عورتیں فوج میں شامل ہو رہی ہیں ۱۸۵۷ء سے پہلے کی نزاکت پیش کرنے سے کیا حاصل بہر حال ہمارے شعراء کو ایسے تصنع آمیز اور غیر فطری اشعار سے بچنے کی ضرورت ہے۔

ویدک میگزین (انگریزی) یہ ماہوار رسالہ گورکل کانگڑی کی طرف سے تقریباً بیس سال سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کا مقصد ویدک تعلیم کی اشاعت اور سوامی دیانند کے مشن کو پورا کرنا ہے۔ اس رسالہ میں سناتن دھرم کے مروجہ طریقۂ عبادت پر بغیر دل آزاری نکتہ چینی کیجاتی ہے۔ ویدک دھرم اور آریہ سماج کے متعلق قابلِ قدر مضامین شائع ہوتے ہیں۔
سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے، گورکل کانگڑی ضلع سہارنپور سے طلب کیجئے۔

(نقاد)

مہاتما کا برت

(از جناب اقبال ورما سحر ہتگامی)

آج اے گاندھی! یہ تو نے دفعتاً کیا کر دیا　　قید میں کر کے تپسیا معجزہ سا کر دیا

بھوک کا یوں اپنے فاقوں سے مداوا کر دیا　　تھا اچھوتوں کا جو اک عقدہ اُسے وا کر دیا

تیری اس عقدہ کشائی پر تجھے صد آفریں!

قوم کی اس رہنمائی پر تجھے صد آفریں!

آہ تیرے عہد پر سارا جہاں تھرا گیا　　کل زمیں تھرا گئی کل آسماں تھرا گیا

طبقۂ زیریں پہ ہر کس بیگماں تھرا گیا　　عالمِ بالا میں قلبِ قدسیاں تھرا گیا

الغرض جب یوں سراپے دو عالم ہل گیا

تو وہیں بھگوان کا آسن بھی یکدم ہل گیا

طاقتیں قدرت کی سب بیدار یکسر ہو گئیں　　دستگیری کو تری تیار یکسر ہو گئیں

کل مخالف قوتیں بے کار یکسر ہو گئیں　　ٹلنے کو خود مائلِ ایثار یکسر ہو گئیں

ظاہر و غائب ہوئے تجھ سے موافق جب بہم

چومے آ کر کامیابی نے وہیں تیرے قدم

منتظر جس دن کے تھے وہ دن شتاب آ ہی گیا　　ساحتِ ہندوستاں میں انقلاب آ ہی گیا

کے چہرہ پہ رنگِ بے حجاب آ ہی گیا ساقیِ نو لیکے پھر جامِ شراب آ ہی گیا

آنکھ سے افسردگی ساری نہاں ہو کر رہی

قوم پھر پیرانہ سالی میں جواں ہو کر رہی!

بھر میں پھر تو عجلت سے لگا ہونے وہ کام پیار کے برتاؤ سے کرلے اچھوتوں کو جو رام

ب تھوڑی بہت حل ہو گئی مشکل تمام یعنی انساں کا ہوا انساں کے ہاتھوں احترام

پرتوِ حق اپنا جلوہ کچھ تو دکھلانے لگا

کچھ خدا انساں میں انساں کو نظر آنے لگا

ں اپنی اس نظر کو اور وسعت ہو نصیب اُسکو اس سے بھی فزوں نورِ محبت ہو نصیب

ؤں کو اور قوموں کی رفاقت ہو نصیب یونہی قلبِ ملک کو یک گونہ راحت ہو نصیب

متحد ہو قوم، دکھلائی پڑیں شادی کے دن

ہند میں اے سحر پھر آجائیں آزادی کے دن

(حضرت بسمل الہ آبادی)

دفورِ غم میں قبل از وقت مرجانا ہی بہتر ہے ہوئیں جب مخالف ہوں تو ڈر جانا ہی بہتر ہے

قدم اب کیوں نہیں آگے کو اٹھتے رہروِ الفت سرِ منزل پہنچ کر کیا ٹھہر جانا ہی بہتر ہے

ہم اُن کی بزم میں رکھیں نہ بھولے سے قدم بسمل

زباں سے گو یہ کہتے ہیں مگر جانا ہی بہتر ہے

حقایق و معارف

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

دل ہوتا ہے رو براہ، گاہے گاہے رو لیتے ہیں بھر کے آہ، گاہے گاہے
اِس ڈر سے کہیں "خودی" "نہ بن جائے" "خدا" کر لیتے ہیں ہم گناہ، گاہے گاہے

پامالِ غم، انسان ہوا جاتا ہے بیچارہ پریشان ہوا جاتا ہے
گھٹتا ہے تو آتا ہے فرشتوں کا جمود بڑھتا ہے تو شیطان ہوا جاتا ہے

جو شمع تھی، پروانہ ہوئی جاتی ہے ہر زلفِ صنم، شانہ ہوئی جاتی ہے
تحلیل کی رَو میں ہر حقیقت، اے جوش فریاد، کہ افسانہ ہوئی جاتی ہے

طوفان کے عفریت کو بے بس کر دے اِس برقِ جہاں سوز کو پھر خس کر دے
ہنگامہ بپا ہے علم سے، اے معبود! معصوم جہالتوں کو واپس کر دے

ہاں بچ کے تری زد سے کدھر جائیگی؟ لے جائیگا جس سمت اُدھر جائے گی
دنیا کے حوادث سے نہ گھبرا کہ یہ عمر جس طرح گزارے گا، گزر جائے گی

بہادری

(از منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی)

کیا بتائیں تمھیں ہم چیز شجاعت کیا ہے فلسفہ اسکا ہے کیا، اسکی حقیقت کیا

ہم نے جب دیدۂ تحقیق سے دیکھا ہے اسے کچھ سوا عرش سے بھی پایہ میں پایا ہے اِسے

ہے کھلاتی چمنِ فطرتِ انسانی یہ روح کا بھی ہے مگر جوہر لافانی

شمعِ اخلاق کی لَو، نیّرِ تہذیب کی ضَو حُسنِ باطن کا ہے یہ ایک جلالی پر

صیقلِ آئینۂ جوہرِ ایثار ہے یہ بیگناہی پہ کھڑی ہے جو وہ دیوار ہے

مدعا رحم کا انصاف کا مقصد ہے یہ ان اقالیم کی اک باہمی سرحد ہے

نہیں ہر اک پہ عیاں رازِ نہانی اس کے مختلف جور و ستم سے ہیں معانی ا

صرف ہم ہی نہیں، قائل ہے زمانا اسکا پاک تر، ترک کے پانے سے ہے پانا ا

امنِ عالم کے تحفظ کی سبیل اس سی ہے تیغِ اخلاق اگر ہے تو اصیل اس سی

نام کو بھی نہیں باطل سے ہے رشتہ اسکا عشق کے جذبۂ کامل سی ہے رشتہ اس

حُسنِ صورت کا وجود اسکی بقا میں شامل حُسنِ سیرت کا نشاں اسکی حدوں میں شا

ہے جہاں حسن، شجاعت بھی ہے موجود وہاں ہے جہاں عشق وہیں اسکے ہیں پیدا امکا

بادۂ روح کا پیمانہ ہے رنگیں اس سے حسن اور عشق کا افسانہ ہے رنگیں اس س

دے مدد اہلِ تعدّی کو یہ اسکا نہیں کام کچھ تن و توش کا پابند نہیں اسکا قیام

جب شجاعت کی بدولت ہوئی حیوان کی قدر — کیوں نہ پھر اس سے سمجھے ہر میں انسان کی قدر
شیر ممتاز اگر ہے تو شجاعت سے ہے — اس کا اعزاز اگر ہے تو شجاعت سے ہے
نحصر یہ نہیں دولت کی فراوانی پر — کچھ مدار اس کا نہیں شوکت سلطانی پر
ہے بڑی بات شجاعت کا میسر ہونا — نہیں ہر شخص کی قسمت میں سکندر ہونا
سلسلہ عمر کا گھٹنا ہے اگر تو گھٹ جائے — مدعا اسکا ہے، سر راہِ وفا میں کٹ جائے
یر دستوں پہ کبھی ہاتھ نہ زنہار اُٹھے — حق پرستوں پہ نہ ہرگز کبھی تلوار اُٹھے
ن میں دائم پئے پامالی باطل آنا — جو زبردست ہو صرف اس کے مقابل آنا

ہم نے سمجھی ہے جو کچھ اس کی حقیقت ہے یہی
یہی مردانگی ہے اور شجاعت ہے یہی

ایشور روپ

(از جناب محمود حسن صاحب اسرائیلی)

بولی یہ زرتشت کی جاتی — کیا ہے ایشور کا روپ؟
بولے "دئیے کی جوت ہے جاتی" — "یا جیسے سورج کی دھوپ"
ان کے مرتبو سمجھے یہ جاتی — ایشور سمجھی دیے کی لَو
اگنی میں رہی چکر کھاتی — ایک دیے سے جلائے سَو
پہلے دئیے کی لَو کو پوجا — پھر پوجی سورج کی دھوپ
سورج اور اگنی میں اس کا — ڈھونڈتے پھرتے ہیں یہ روپ
من کے دیپک کو نہ جلایا — جس کی لو ہے ایشور روپ
ہر من میں ہے بر ہی سمایا — کیسی اگنی، کیسی دھوپ

لطفِ سخن

(از جناب ابوالفاضل رازؔ چاندپوری)

فصلِ گل ہے اور دَورِ نرگسِ مستانہ ہے — ہمنشیں! کیا فکر ہے کیوں ہوش کا دیوانہ ہے

مدعی دیوانۂ الفت نہیں، دیوانہ ہے — عشق بازی صرف کارِ ہمت مردانہ ہے

ادعائے جوشِ الفت اور یہ طرزِ سخن! — حیف! تو آدابِ بزمِ ناز سے بیگانہ ہے

فکرِ بیش و کم نہ کر اے میکشِ عالی وقار — اپنے ساقی کی نظر میں تو ہر اک پیمانہ ہے

سوزِ پروانہ مسلّم، جوشِ پروانہ بجا — لیکن اندازِ تپش لاریب گستاخانہ ہے

کیا کہوں اے ہمنشینِ کم نظر، جا الوداع! — ورنہ جس کا کعبہ ہے اسکا ہی یہ بُت خانہ ہے

مرحبا اے سالکِ راہِ محبت مرحبا — درس آموزِ جہاں یہ ہمتِ مردانہ ہے

اے ترے قرباں، تری بندہ نوازی کے نثار — ہر لبِ خاموش و گویا پر ترا افسانہ ہے

باش اے کم ظرف تشنہ لب ٹھہر اے بوالہوس — کچھ خبر بھی ہے، یہ کس کے نام کا پیمانہ ہے

شاد باش اے نرگسِ شہلائے ساقی، شاد باش — اب خیالِ ما سوا سے دل مرا بیگانہ ہے

وادیٔ غربت حریفِ وادیٔ ایمن سہی — رازؔ کی نظروں میں لیکن اُسکا خلوت خانہ ہے

(از جناب فرخؔ بنارسی)

الفتِ ساقی ازل سے میرے آب و گل میں ہے — جس پہ سو میخانے صدقے ہوں وہ مستی دل میں ہے

لذتِ ذوقِ فنا مستور جس کے دل میں ہے — زندگی اس کی حقیقت میں بڑی مشکل میں ہے

کیفِ مستی سے کسے ہے ہوش میں آنے کا ہوش — وہ نشاطِ بیخودی ساقی تری محفل میں ہے

اک علامت موت کی ہے جس کو کہتے ہیں سکوں — زندگی کا رازِ پنہاں اضطراب دل میں ہے

پھونک دے ہاں پھونک دے لے سوزِ پنہاں پھونک دے — آرزوئے ماسوائے دوست جو کچھ دل میں ہے

تیرے وحشی عشق میں کارِ نمایاں کر گئے — اک جہاں آباد ہر ویرانۂ منزل میں ہے

ہوش میں آ قیس لیلےٰ کے نئے مجنوں نہ بن — تیرا ہی حسنِ تصور پردۂ محمل میں ہے

ہاں فریبِ شوق دیتا جا فریبِ جستجو — کچھ نہ کچھ تسکینِ خاطر سعیِ لاحاصل میں ہے

راہِ الفت میں دلِ شوریدہ جلدی کس لئے — لذتِ سرگشتگی کچھ دوریِ منزل میں ہے

ڈوبنے والوں کا افسانہ محیطِ عشق میں — موج کی آغوش میں کچھ دوریِ منزل میں ہے

جس نے کی اِس کی گدائی اُسکو سب کچھ مل گیا — دولتِ کونین فرخ کاسۂ سائل میں ہے

از پروفیسر نارائن پرشاد ورما صاحب مہرؔ

اِن بتوں کا جو مجھے شیوۂ بیداد آئے — یوں انھیں میں بھی ستاؤں کہ خدا یاد آئے

ظلم کی اُن کے یہ شہرت ہے جدھر جاتے ہیں — انگلیاں اُٹھتی ہیں، وہ بانیِ بیداد آئے

کیوں نہ بے چین ہو دل، کیوں نہ ہو بیتاب جگر — آنکھ کے سامنے جب حسنِ خداداد آئے

کھو دیا میں نے، خدا جانے، کہاں دل اپنا — کوئی کچھ یاد دلائے تو مجھے یاد آئے

تھام لینا مجھے اے حضرتِ دل آپ وہیں — یاد جب کوئی رہِ عشق کی افتاد آئے

قابلِ رحم ہے وہ خوگرِ آزار و ستم — نہ فغاں آئے جسے اور نہ فریاد آئے

وہ فغاں کر کے کرے کیوں نہ قیامت برپا — یاد جب مہرؔ کو تجھ سا ستم ایجاد آئے

(پنڈت جگموہن ناتھ صاحب رینہ شوقؔ)

خوب موقع ہے کہ خنجر پھر کفِ قاتل میں ہے — کچھ کہو تو مرنے والو کیا تمہارے دل میں ہے

جوشِ طوفاں، موجِ سرکش، نامرادی یا فنا — جانتا ہے کون اسے کیا دامنِ ساحل میں ہے

ہے وہ مستغنی دورِ بادۂ بزمِ مجاز — دی جو ساقی نے وہ کافی کاسۂ سائل میں ہے

گو ہیں واماندہ بڑھے جاتے ہیں اس امید پر — کچھ سہارا رہروؤں کا آخری منزل میں ہے

لاکھ تم چپ سادھ لو پر چتونیں چھپتی نہیں — تم کہو تو میں بتا دوں کیا تمہارے دل میں ہے

شمع بھی پروانہ بھی مینا بھی ہے مینوش بھی — یہ اداسی سی بتا پھر کس لئے محفل میں ہے

دل کے آئینے سے ہو زائل دوئی کا نہ کام — [illegible] تمہارے عشقِ جاناں جذبۂ کامل میں ہے

تیری سرگردانیوں کی کچھ ہے آخر انتہا — اب بھی غافل دیکھ تو کیا پردۂ محمل میں ہے

امتیازِ حسن رسوا بھی نہ اب دل کو رہا — کس بلا کی دلفریبی صورتِ باطل میں ہے

بادہ و مینا کی تم کو بھی ہوس باقی نہیں — اک جہانِ بیخودی [illegible] میں ہے

شوقؔ یوں پائے طلب کو توڑ کر بیٹھے ہو تم

[illegible] دوریِ منزل میں ہے

(از پروفیسر ڈپٹی لال نم ایم اے)

پریشاں ہوں بہت دردِ نہاں سے — الٰہی اب بلالے اس جہاں سے
کریں گے ہند کی شوکت دوبالا — یہی امید ہے پیر و جواں سے
وہ گر چاہیں غنی دم بھر میں کردیں — نہیں ہے دور کچھ لطفِ شہاں سے
فرشتوں نے کیا آدم کو سجدہ — زمیں ٹکرا رہی ہے آسماں سے
تمنا نے مجھے گردش میں ڈالا — کہاں وہ لے گئی مجھ کو کہاں سے
رواداری کریں گے دونوں باہم — یہ ہے امید ہندو مسلماں سے
نگم ہر دم بجالا شکرِ خالق! — نہ ہو مایوس لطفِ بیکراں سے

(از جناب بسمل الہ آبادی)

توقع ہے مجھے عمرِ رواں سے — وہیں لے جائیگی لائی جہاں سے
جو تھرا کر گری برق آسماں سے — وہ کھُل کھیلی ہمارے آشیاں سے
جلا کچھ اس طرح برقِ تپاں سے — نہیں اُٹھتا دھواں تک آشیاں سے
نہیں رُکتی نہیں تھمتی کوئی دم — شکایت ہے مجھے عمرِ رواں سے
اُٹھانے دے قدم اے ناتوانی — دبا جاتا ہوں گردِ کارواں سے
نظر اُن کی پھری تو پھر ہوا کیا — زمیں پہ گر پڑے ہم آسماں سے
نشاں کوئی نہیں وہ بے نشاں ہے — اسے ڈھونڈھیں نگاہیں کس نشاں سے
فنا کے بعد باتیں کر رہی ہے — ہماری خاک اڑ کر آسماں سے
مجھے اِک اِک قدم پہ مل رہا ہے — پتہ منزل کا گردِ کارواں سے
نظر میں پھر رہا ہے تنکا تنکا — نظر میری پھرے کیا آشیاں سے
اسے کہتے ہیں شوقِ لطفِ منزل — نکل آیا ہوں آگے کارواں سے
مزا دے جائے گا غم کا فسانہ — سنو اس کو مرے دل کی زباں سے
نظر میں ہے فریبِ رنگِ گلشن — قفس کو دیکھتا ہوں آشیاں سے
نہیں ہوتی سخن فہموں کو سیری — کلامِ بسملِ رنگیں بیاں سے

علمی ذوق رکھنے والے حضرات مندرجہ ذیل کتابیں ضرور منگائیں

بزم خیال

اس میں اُردو اور فارسی شعرا کی مجالس کے لطائف وظرائف اور برجستہ گوئی و حاضر جوابی کے نمونے جمع کئے گئے ہیں جو خوش مذاق حضرات کی تفریح کا بہترین سامان ہے۔ قیمت ایک روپیہ

ہندو تیوہاروں کی اصلیت

اس کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب بی۔ اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بستی نے ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور انکی جغرافی کیفیت نہایت واضح اور آسان زبان میں لکھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی و تمدنی انتظام اور ہندو تیوہاروں کی ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے۔ اُردو ایڈیشن کی قیمت فی جلد ۹ر ہندی ایڈیشن کی قیمت جسمیں اردو ایڈیشن کے مقابلہ میں زیادہ تفصیل دیگئی ہے قیمت ۱۲ر

انگریزی افسانوں کا نایاب مجموعہ

(آلام حیات)

انگریزی کے ماہر اہل قلم حضرات کے تصنیف کئے ہوئے نادرۂ روزگار افسانوں کا ترجمہ آلام حیات ہے۔ یہ کتاب آپکی جلوت و خلوت میں بہترین مونس ثابت ہوگی۔ بہترین لکھائی دیدہ زیب چھپائی قیمت صرف ۱۲ر

خیالات عزیز

مجموعہ مضامین مولوی عزیز مرزا صاحب جس کی باضابطہ رجسٹری کی گئی ہے حجم ۲ سو صفحات ٹائیٹل خوشنما رنگین ہے۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ مع تصویر مصنف قیمت عار

بہرام کی رہائی

نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری کے بعد اسکا پڑھنا نہایت ضروری ہے۔ قیمت ۱۲ر

گلزار داغ

فصیح الملک جناب داغ دہلوی کا مقبول دیوان ہے جو حال میں حسن ... کے ساتھ شائع ہوا ہے داغ صاحب کا ... کسی تعارف کا محتاج نہیں قیمت ...

مثنوی سحر

یعنی شگفتہ و دلنشین منظوم حضرت سحر کے شاعرانہ کمال کا اعجاز اول ایڈیشن کی قیمت ۶ر دوسرے ایڈیشن کی قیمت ... کی مصنف نے نظر ثانی بھی کی ہے قیمت ...

مرقع ادب

حصۂ اول و دوم مرتبہ جناب ... مرزا پوری اس میں ہندوستان کے مشہور انشاپرداز شعرا کے وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں جو انھوں نے ... احباب وغیرہ کو لکھے ہیں

حصہ اول ۱۲ر حصہ دوم ...

جلیل قدوائی کی تصانیف

(سیر گل) مختصر افسانوں کا مجموعہ وہ کتاب جس نے مصنف کو حاضرہ کے اہل قلم کی صف اول میں جگہ دلائی۔ آج روسی کہانیوں کی عموماً اور ... کی کہانیوں کی خصوصاً اردو ادب میں ایک عام شہرت ہے لیکن انکے اولین پیش کرنیوالے کی تحریروں کا اعجاز دیکھنا ہو تو سیر گل ملاحظہ فرمائیے قیمت ...

نقش و نگار جلیل قدوائی صاحب کی دل آویز و پر لطف نظموں اور غزلوں کا مجموعہ۔ جلیل صاحب کی نظم میں بھی دہی ... جو اُن کی پاکیزہ و پر سحر نثر میں۔ اگر رنگین و پر تاثیر نظم اور صحیح اور سچی غزل کا لطف اٹھانا ہو تو یہ مجموعہ دیکھئے ...

انتخاب حسرت یعنی سرآمد شاعراں طوطیٔ غزل خواں مولانا حسرت موہانی کے دس دیوانوں کا انتخاب اور جلیل صاحب کے قلم کا لکھا ہوا ایک دلچسپ مقدمہ۔ انتخاب کیا ہے حسرت کے پر لطف رنگین و پر تاثیر کلام کا عطر ہے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:- منیجر زمانہ بک ایجنسی کانپور

فہرست مضامین

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت سالانہ ممالک غیر سے ... ہندوستان سے ...

زمانہ

جلد ۵۹ | اکتوبر ۱۹۳۲ء | نمبر ۴

عصر جدید میں ہندی مصوری

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی۔اے)

سلطنت مغلیہ کے نیست و نابود ہونے سے قبل ہی فنِ تصویر روبہ زوال ہو رہا تھا لیکن ۱۸۶۰ء میں حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ اور اقبال حکومت کے ساتھ ساتھ مصوری بھی معدوم ہونے لگی۔ اب دہلی اور لکھنؤ کے کچھ کاریگر حسبِ استعداد اساتذہ قدیم کی نقالی کا دم بھرتے رہے۔ چنانچہ نقول لینے کا دستور اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اس ضمن میں مصوروں کی کارفرمائیوں کی طغیانی میں سب کی فنی باریکیاں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں۔

اہل دہلی کے عہدِ جدید کی یادگار، کارنامے خور و شبیہوں کے نئے اندازِ عمل کا آئینہ ہیں۔ صرف یہی ایک بات ہے جو ان کی بقائے حیات کی ضامن ہے۔ ان منقول مماثل کی جو مغل مصوروں کے بے مثل نقوش کی متابعت میں صورت پذیر ہوئے ہیں۔ دلچسپی کا اصلی باعث یہی ہے کہ انہیں قدما کی نقاشی سے مناسبت ہے۔ ورنہ وہ بجائے خود متاخرین کے مبتدی ہونے کا زندہ ثبوت ہیں۔ یہی خاندانی روایات کو بے مائگی کے باوجود بھی برقرار رکھنے کے لئے بعض مصور حال [illegible] مساعی میں منہمک ہیں، حالانکہ وہ کسی طرح کامیاب و مشکور نہیں ہو سکتیں۔

عام طور پر مغل حکمرانوں کی تصاویر کی نقلیں حصولِ معاش کا آسان وسیلہ بن گئی تھیں۔ لیکن ان تازہ ترین کرشموں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا نقش و نقاش دونوں زبانِ حال سے متقدمین

کی داد و دہش اور شوخیِ تحریر کے فریادی ہیں، دہلی قلم کے قریب قریب سبھی نام لیوا بانیان مغل اسکول کے بگڑے ہوئے گھروں کے چشم و چراغ ہیں، اور ہنوز اپنے آبا و اجداد کی پیروی میں سر دھن رہے ہیں۔ اب سے چند سال پیشتر تک ان کے مستقل لوازمات و اصطلاحات پر قدامت کا رنگ غالب تھا، جو بلاشبہ ازمنۂ وسطیٰ کے فنِ تصویر سے ان کی ہمرنگی کا مظہر ہے۔ تقریباً پچاس برس پہلے دہلی اسکول کے زیرِ اہتمام ہاتھی دانت پر جو کام ہوا ہے وہ مابعد کی کوششوں سے بہتر و افضل ہے۔

اٹھارھویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے اوائل میں اہل لکھنؤ کی جو روش تھی اس میں بھی مغلوں کی خصوصیات بکثرت نمایاں ہیں۔ یہی باعث ہے کہ دہلی کی بہ نسبت لکھنؤ کے نقش و نگار میں بہت زیادہ دلکشی و بانکپن موجود ہے۔ لیکن اب بدقسمتی سے مغربی تاثرات نے ان کے روئے رنگین پر یک قلم پانی پھیر دیا ہے۔ چونکہ اہالیان اودھ کو شبیہ سازی سے خاص دلچسپی تھی اس لئے نئے دور کے صناعوں نے اپنی ساری توجہ اسی پر مرکوز کر دی۔ لیکن فنی تنزل و ادبار کے بدولت ان کے تمام کارنامے، ان کے مذاق کی پستی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ہر چند کہ راجپوت آرٹ بھی ان دنوں روبہ تنزل تھا۔ تاہم پنجاب کی بعض دور افتادہ پہاڑی ریاستوں کے اہل فن اپنی مخلوق کو عہد حاضرہ کی عام تماثیل سے ممیز کرنے میں منہمک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کامیاب مساعی مختص امتیازات کی سرمایہ دار ہیں۔

انیسویں صدی کے لاہور اور امرتسر وغیرہ مقامات کے سکھ مصوروں نے مشرق و مغرب کی خصوصیات کی آمیزش سے جذبات کو مصوری میں یک گونہ جدت پیدا کر کے ایسی طرز نو ایجاد کی جو متقدمین کی روش سے متجاوز و مختلف ہے۔ یہ خصوصیت شہرۂ آفاق مصور کیہر سنگھ کے کارناموں میں معراجِ کمال پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ باقیات سلف کے بعض مجاور ایسٹ انڈیا کمپنی کے آغاز حکومت میں پٹنہ اور بنگال میں جا کر اقامت پذیر ہوئے اور مشرق و مغرب کے مخلوط انداز میں داد فن دینے لگے۔ یہ لوگ انگریز سوداگروں اور دیگر عمال حکومت کی تکمیل فرمائش میں چھوٹے پیمانہ پر نیم انگریزی طرز کی تصویریں بنا کر اپنا پیٹ پالا کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے بھی چند مستثنیات کے سوائے عام طور پر اصلی اور کامل خط و خال کے نمایاں کرنے میں تشابہ اور دلآویز خطوط سے وہ بات پیدا کی جو اپنے خالقِ حسن کی روح و جان ہے۔

دکن میں فن تصویر کی جس رنگ میں ترویج و اشاعت ہوئی وہ اقطاع شمال کی روش سے قدرے جداگانہ تھی، چنانچہ سولھویں صدی کے دکنی مصوروں کے کارناموں کو پیش نظر رکھ کر

کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایرانیوں کے نقشِ قدم پر چل کر تحفظِ فن کی کوشش کر رہے تھے اور یہ غالباً دکن کی اسلامی ریاستوں کے ترکمان سلاطین کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا یہی باعث ہے کہ اس عہد کے ہندی فن کی ابتدائی کوششیں تیموری خط و خال سے مشابہت تام رکھتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ان میں بتدریج تبدیلِ اسلوب کی جد و جہد نقشِ اولین ہی سے روبکار نظر آتی ہے حتیٰ کہ ایک ہی صناع کی مابعد مصنوعات دہلی قلم کا نقش ثانی معلوم ہوتی ہیں۔ اور سرسری طور پر دیکھنے سے اُن کی شناخت بھی مشکل ہی سے ہوتی ہے۔

فی الحقیقت مغل مصوری کی تمام و کمال خصوصیات کو اس خوبی و خوبصورتی کے ساتھ نباہا گیا ہے کہ دو مختلف النوع داوقات مساعی ایک ہی مصور کے رشحاتِ قلم کا ندرت طراز نمونہ معلوم ہوتی ہیں۔ بعض اہل الرائے کے نزدیک تجدیدِ روش کا سہرا اُن اصحابِ کمال کے سر ہے جو اورنگ زیب کی بے پناہ جور و استبداد کا شکار ہو کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے اور بادلِ ناخواستہ اپنے مولد و ماویٰ کو خیرباد کہہ کر والیٔ دکن کے دور دراز گوشہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ یا جنھوں نے مغل اسکول کا شیرازہ منتشر ہو جانے کے بعد تلاشِ معاش کے حیلے سے اس بصیرت افروز خطہ میں قدم رکھا۔

اٹھارھویں صدی کے اورنگ آباد اور دولت آباد کے مصوروں کی تصویریں شمال کی بہ نسبت قلیل المقدار اور صغیر الوسعت ہیں وہ بالعموم نیم تاریخی موضوعات پر بھی مشتمل ہیں۔ ان میں سے بعض شبیہیں دکن کے ہندو حکمرانوں سے متعلق ہیں۔ ان صناعوں کے شہ پارے ابتک حیدرآباد اور لندن کے [illegible] میں محفوظ ہیں۔

ایک طرف تو بعض وہ تحریریں جنھیں اثباتِ جذب کی فنی کیفیت سے ہمدردی ہے اس امر کی مظہر ہیں کہ دکن مصوروں کی نقاشی کسی صورت بھی اغیار کی منت کشِ احسان نہیں ہوتی تھی۔ قبیلوں کے سینہ سے ہی ابھرتی ہے لیکن دوسری جانب ایسے لاتعداد قصص بھی مدون ہیں جو اس حقیقت کے منکشف ہیں کہ وہ شمالی ہند کے فنِ تصویر سے بالواسطہ متعلق ہے۔ مشہور بنگالی مورخ مسٹر بارانا تھ نے دکنی مصوری کی جمالی کیفیت قلمبند کرتے ہوئے بے پرایہ اور ہیچ ان تین صناعوں کا ذکر کیا ہے۔ اس مختصر تذکرہ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ متذکرہ مصوروں کے مقلدین کا ایک طویل سلسلہ تھا جو برسوں ان کی زیرِ نظر تخیلہ آفاق کے اسباب مہیا کرنے میں مصروف کار رہا۔ لیکن تحری جہاں بین کے باوجود بھی یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ان کی جانفشانی کس سنہ و سال میں شروع ہوئی اور کب نامساعدتِ روزگار نے ان کے دستِ نگیں سے ہمیشہ کے لئے قلم لے لیا۔ اب یہ تحقیق ہے کہ ان کے کچھ عرصہ بعد تنجور اور میسور نامی دو مختلف اسکولوں کا ظہور ہوا۔

تنجور اسکول کے صناعوں کے متعلق مذکور ہے کہ وہ راجہ سرجوجی کے عہد یعنی اٹھارہویں صدی کے آخر میں ہندوستان سے چل کر منزل بمنزل دکن پہنچے۔ مسٹر پرسی براؤن کا خیال ہے کہ اس اسکول کے بانی ہندو

ہونے کے باعث راجپوت اسکول کے مایۂ ناز و افتخار تھے۔ اس حیثیت سے تنجور اسکول راجپوت مصوری کی ایک شاخ قرار پاتا ہے۔ مورخ موصوف کے بیان کے مطابق راجپوت اسکول کے درہم برہم ہونے کے بعد اس کے اراکین خاص تنجور دربار کی سرپرستی کی بدولت اسی کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ اور اس طرح ایک جدید اسکول معرضِ وجود میں آیا۔

ابتدائً اس اسکول کے مقلدین کی تعداد بہت ہی مختصر تھی لیکن آہستہ آہستہ اس میں مزید اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ تنجور کے آخری فرمانروا سیواجی (۱۸۳۳-۵۵ء) کے دور میں کم و بیش اٹھارہ خاندان ایسے تھے جنھوں نے ہاتھی دانت اور لکڑی پر مصوری کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ کام کی نفاست و پاکیزگی کا یہ عالم تھا کہ انھیں اپنے دیگر ہم پیشہ حضرات پر تفوق حاصل تھا۔

انھیں ایام میں ایک خاص قسم کی مصوری کا رواج عام ہو گیا۔ یہ صنعت فنِ تصویر کی اس معینہ طرز کی تھی، جو ہندی کاریگروں کی اصطلاح میں جرہ (Tarah) کے نام سے موسوم ہے۔ اس شعبہ میں لکڑی پر آبی رنگوں سے خط و خال اور جذبات و حسیات تشکل ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی نقرئی و طلائی تاروں، بیش قیمت سنگ ریزوں اور نگینوں سے پچیکاری کی جاتی ہے۔ اس سج دھج کی بعض قدآدم روغنی شبیہیں جو انھیں صنعت گروں کے کمال فن کا نمونہ ہیں ابھی تک پدیہ کوٹ (Pudukottah) کے قدیمی قلعہ اور تنجور کے محل کی زینت کا باعث ہیں۔

سیواجی کی وفات اور درباری صناعوں کی نسل کے اختتام کے بعد تنجور اسکول کا وجود یکسر معدوم ہو گیا، رہے سہے کارکنان نے حالت کس مپرسی میں مصوری سے قطع تعلق کر کے دیگر صنعتوں کی جانب رجوع کیا، کسی کو زرگری مرغوب ہوئی تو کسی نے کارخانوں کی ملازمت پسند کی رفتہ رفتہ ان کی ساری جدت نقش و نگار روز افزوں تفکرات دنیوی، عالمگیر ناقدری اور افسوسناک بد مذاقی کا تختۂ مشق ہو کر طاق نسیاں ہو گئی۔ البتہ کہیں کہیں اس کے مٹے ہوئے نقوش کا چرچا باقی رہ گیا اور اب بھی اس فن لطیف کا کوئی نہ کوئی پرستار مذہبی مضامین کی نقاشی میں اپنی جولانی طبع دکھانے کی دھن میں دیوانہ نظر آتا ہے۔

تنجور اسکول نے اپنے عروج کے زمانہ میں ہاتھی دانت پر شبیہ سازی کے فن میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ اس کی چھوٹے پیمانہ کی تصویروں کا قد و قامت گرد و پیش کی وسعت و گنجائش سے پوری طرح ہم آہنگ ہے ان میں سے بعض بعض کا طول چھ انچ سے بھی زیادہ ہے۔ انکی پسندیدہ ہیئت اجتماعی اور تنہا تماثیل کے مرغوب میں رنگوں کی بوقلمونی مصور کے کامل ادراک فن کا ثبوت دیتی ہے۔ اعضائے انسانی کی تشریح اور فطری سج دھج اور اس کا اتار چڑھاؤ تصنع و تکلف سے اس قدر خالی ہے کہ مصور کے کمال فن کی داد دینی پڑتی ہے۔

بہ استثنائے چند تمام کی تمام تصویریں ہندوؤں کی قومی خصوصیات کی مختلف کیفیتوں کا نمایاں رنگ لئے ہیں۔ ان کی بدولت جسم انسانی کی ظاہری زیبائش اور معنوی خوبیوں کے ایسے ایسے نکتے ظاہر ہوتے ہیں کہ ازمنۂ قدیمہ کے ہندی مصوروں کی رنگین محفلوں کا ہوش ربا منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ کہیں کہیں تو مصور کے کمال فن نے خاموش تحیر مجسمہ کو بھی بحر زندگی کے شورش زا مد و جزر کا ہمنوا بنا دیا ہے۔

اس صنعت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ فن کے عام اصولوں سے کسی موقعہ پر بھی عدول نہیں کیا گیا ہے۔ صناع نے اپنے مخصوص انداز میں عمل پیرا ہو کر اس چابکدستی سے کام لیا ہے کہ اس کے جذبات بہ لب اس کے حسن تخیل کی زبان حال بن گئی ہیں۔ اس تحت میں شاذ و نادر ہی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن کا تجوید دیار سے کچھ نہ کچھ واسطہ ہو۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہر منظر اپنے مقامی رنگ (Local Colour) میں سرتاپا مستغرق ہے۔

انیسویں صدی کے ابتدائی دور اور راجہ کرشن راج کے دوران حکومت میں میسور اسکول اوج و ارتقاء کے انتہائی مدارج طے کر کے عروج کے ساتویں آسمان پر جا پہنچا۔ اس سے پیشتر بھی اس اسکول کو غیر معمولی شہرت حاصل تھی لیکن اس کی تازہ بتازہ کارگذاریوں سے اس کی صدسالہ شہرت دو وقت میں چار چاند لگ گئے ان صناعوں پر راجہ کرشن راج کی جو مربیانہ نوازشیں تھیں ان کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی بدولت تفکیر داد و دہش نے انھیں بیکار حیات سے قطعاً محفوظ بنا دیا تھا

بسا اوقات وہ کسی منتخب موضوع پر درباری مصوروں کو اپنے اپنے کمالات دکھانے کی ترغیب دیا کرتا تھا۔ چنانچہ اکثر معاصرین ایک ہی موضوع پر اپنے اپنے مخصوص انداز میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کے نمونوں میں صرف فنی نکات مابہ الامتیاز ہوتے تھے۔ راجہ کے فیصلہ میں ذاتیات کو کوئی دخل نہ ہوتا تھا اور اس قسم کی معرکہ آرائیاں دربار کے معمولی واقعات ہوتے تھے۔

میسور اسکول کے دستکار بھی والیان تنجور کی طرح ہاتھی دانت پر تصویریں بنانے کے عادی تھے جس کے نمونے شاہی قلعہ میں بکثرت موجود محفوظ ہیں۔ ۱۸۶۸ء میں کرشن راج کی وفات حسرت آیات کے ساتھ یہ اسکول بھی فنا ہو گیا۔ اور گردش لیل و نہار نے وہ منحوس دن بھی دکھا دیا جب اس صناعی کے افق پر ظلمت و ادبار کے سیاہ بادل چھا گئے۔ اور ہندی فن تصویر کا سفینہ زریں زوال و انحطاط کے گرداب میں ہمیشہ کو غرقاب ہو گیا۔

کیمرہ کی ایجاد سے شبیہ سازی کا رواج عام تو ہمیشہ کے لئے مفقود ہو گیا مگر مغرب کے برق صفت اثرات نے فن جلیلہ کی لامحدود پہنائیوں اور غیر متناہی گہرائیوں میں کچھ ایسا رنگ پیدا کر دیا کہ جوشش و جذبات اور وضع و قطع کے ساتھ ساتھ نقش و نگار بھی متغیر ہو گئے۔ اب وہ تنویر حسن و تابش جمال اندازِ شب رفتہ ہو چکی ہمیشہ کے لئے

رخصت ہوچکی تھی۔ قومی خصوصیات کی جگہ مغرب کی عریانی نے لے لی۔ اور واردات قلبی کی دلفریب نیرنگیاں سات سمندر پار کی شوخ رنگی کی زد میں آکر کافور ہوگئیں۔ سب سے پہلے اس تباہ کن طوفان سے راجہ روی ورما کا اسکول دوچار ہوا اور اس کے انقلاب انگیز ریلے میں خس وخاشاک کی طرح بہہ گیا۔

ڈاکٹر جیمس کزنس رقمطراز ہیں کہ جب مسٹرای بی ہیول ہندوستان تشریف لائے تو عام طور پر ہندی مصور اہل یونان کی کورانہ تقلید میں مبتلا تھے۔ لیکن انھیں ایام میں مشرق بعید میں بعض خانہ خدا ہندی فن تصویر کے مردہ قالب میں تازہ روح پھونکنے کی کوشش میں مستغرق تھے۔ اور ان کی مجتہدانہ کوششوں کے خوشگوار نتائج کا پیرس اور لنڈن کی ۱۹۱۴ء کی نمائشوں میں مظاہرہ ہورہا تھا۔ اس جدوجہد کی باگ ڈور ابنیندر ناتھ اور لوگیندر ناتھ ٹیگور کے حسین ہاتھوں میں تھی۔ یہ دونوں حضرات مشہور جاپانی صناع ہیروشیگ (Hiroshige) اور ہوکوسائی کے ہمعصر وہم پلہ ہیں اور انھیں نے بنگال اسکول کا سنگ بنیاد رکھا۔

اس میں شک نہیں کہ بانیان بنگال اسکول نے شاہراہ مقصد پر گامزن ہوکر خاطرخواہ کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے مغرب کی رو میں بہنے کی بجائے اسلاف کی یادگار کو اپنا خضر راہ بنایا اور ابتداءً اجنتا، ایلورا، باگھ اور باغ وغیرہ کے مرقعہائے زنگارنگ کی تقلید کی جس نے ان کو منزل مقصود تک پہنچنے میں مشعل ہدایت کا کام دیا۔ بقول مسٹر جیمس ۱۹۱۶ء میں تقریباً تیس ۳۰ یا اس سے زائد صناع دنیائے مصوری میں اپنے زورقلم کے لئے مشہور تھے، لیکن کچھ ہی عرصہ بعد یہ تعداد دوچند بلکہ سہ چند ہوگئی۔ ان میں متذکرہ شخصیتوں کے علاوہ نند لال بوس، اسِت ہولدار (Asit Haldar) کے۔ ونکٹاپیہ، پرمود چٹرجی، رائے چودھری، وکیل براد کھا تو اور چغتائی، وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات شانتی نکیتن (بنگال) لکھنؤ، میسور، کلکتہ، مدراس دہلی اور لاہور وغیرہ مختلف مقامات سے وابستہ ہیں۔

گو مندرجہ بالا فہرست میں سے بعض نے مسٹر بوس کی طرح قدیم تصاویر کی نقالی سے شہرت دوام حاصل کی ہے لیکن پھر بھی ان کے مرقعوں میں طبع زاد صناعیوں کی بیشمار اور قابل قدر مثالیں ملتی ہیں۔ فرداً فرداً ہر صناع کے کمال فن کے نتائج کا بغور وتعمق مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت ظاہر ہوئے بغیر نہ رہیگی کہ ہندی مصور امتداد زمانہ کے باوجود بھی جاپان وفارس کے طرز قدیم سے مستفید ہوئے ہیں۔

بنگال اسکول بودھ اور راجپوت صناعی کا رہین منت ہے یہی باعث ہے کہ بنگالی مصور نے اپنے پیش رو صناعوں کی طرح کالیداس کی معرکہ آرا تصانیف راماین، مہابھارت، گیتا اور پُران کے بعض کو رنگ وروغن سے حسن صورت عطا کیا ہے، اور اس کی تخلیق بلحاظ روش وپیمانہ مغل آرٹ سے قریب تر

یکساں طرز کی ہے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ رنگوں کی آمیزش اور بیک گراؤنڈ کو جلا دینے میں بنگالی مصور مغربی رنگ میں ڈوب کر چمکتا ہے۔ حالانکہ اس کے مفسر قلم کے جذبات ہر دو کناف کے نیتی اخترافات کو ایک ہی نظر میں الم نشرح کر دیتے ہیں۔ مستشرقین کے نزدیک فلسفہ مقدم اور صناعی مؤخر ہے لیکن اہل مغرب کا نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ تاہم کہنا پڑے گا کہ اجتماع ضدین کی ایسی نادر مثال بنگال کے سوا کسی دوسری جگہ ملنا مشکل ہے۔

غربی و شرقی تہذیب و تمدن میں زمین و آسمان کا فرق ہے، دونوں کے سرچشمہ حیات کا مخرج علیحدہ اور شاہراہ مقصود جداگانہ ہے۔ دونوں اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق مختلف منازل طے کر کے آخری انجام کی جانب گامزن ہیں۔ دونوں کی فنی کیفیت کا موازنہ بیجا نہ ہوگا۔

ہندی مصور خط و خال اور اشکال و صور کو نمایاں کرتے ہیں وہ ان کو زیادہ باریک خطوط کے ذریعے وہ کام کر جاتا ہے جو کسی دوسری طرح ناممکن ہے۔ جذبات و محسوسات کی نقاشی تو اس کا حصہ ہے۔ برخلاف اس کے مغربی صناع جذبات نگاری سے اتنا ہی بے خبر ہے جتنا کہ وہ حسن ظاہری کے نمایاں کرنے میں محتاط ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی ہر کوشش تصنع سے ہم آغوش ہے۔ پھر بھی رنگ، روشنی، سایہ اور سطح کے تناسب و ہم رنگی سے اسمیں جان سی پڑ جاتی ہے۔

مشرق اپنے فنی مماثل میں بھی انفرادی پہلو لئے ہوئے ہے۔ لیکن مغرب اس ضمن میں علم موسیقی کی طرح اجتماعی خصائل سے ہمدوش ہے۔ اور یہی وہ باتیں ہیں جن پر دونوں کی قومی زندگی کا مدار ہے ان امتیازات کو جو قومیت کا نتیجہ ہیں محو و ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش [illegible] نوع انسان کے حق میں مضر ہوگی۔ انھیں پاک مقاصد کو لیکر بنگال اسکول نے اپنے احساس حیات کا ثبوت دیا ہے۔

ہندی مصوری کی بقائے حیات کے لئے بمبئی اسکول آف آرٹ کے پرنسپل مسٹر جون گریفتھ نے ۱۸۷۲ء میں اجنتا کے غاروں کی نقاشی کی نقل لینا شروع کیا۔ لیکن [illegible] کوشش [illegible] رائیگاں ہوئی کہ تمام منقولہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نذر ہو گئیں۔

۱۹۳۰ء میں لارڈ ہارڈنگ کی تحریک پر بمبئی [illegible] [illegible] کی تعلیم میں [illegible] پر تصویر بنانے کا کام شروع کیا۔ اسکول ہذا کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بلڈنگ آف دی جے اسکول میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

کارناموں کا بھی ذکر کیا ہے۔

بمبئی اور دیگر مدرسوں کے ماہرین نے نئی دہلی کی جدید تعمیر، وائسرائے کی تفریح گاہ کو اپنے موقلم کی رنگینیوں سے مزین کیا ہے، میٹنگ ہال نمبر ا کی تمام تر نقاشی بمبئی اسکول کے اراکین کے ندرت طراز قلم کی گلکاریوں کا نتیجہ ہے۔ اس کمرہ کی دیواروں کا رقبہ ۱۵۰۰ مربع فیٹ ہے، ان پر کامل ایک سال تک آٹھ ماہرین فن آبی رنگوں سے حسین وجمیل نقوش مرتسم کرتے رہے ہیں۔ ان تصاویر کا طول بالعموم ۲ فٹ گیارہ انچ، عرض ۲۔ فٹ ساڑھے چار انچ اور عمق ساڑھے نو انچ ہے۔ کہیں کہیں قدما کے انداز ارتسام کی بجنسہ نقل کی گئی ہے۔ مسٹر چے۔ ایم۔ د اس کا کارنامہ مصوری بعنوان مصوری راجپوت طرز کی ایک کامیاب مثال ہے جو غالباً اس فن رنگین کے آغاز کا تاریخی مرقع اور چترلیکھا کا نقش خیالی ہے۔

اقوال زرّیں

بیوی بہترین دوست ہے۔ اور دنیاوی زندگی کے تینوں مدارج کی جڑ ہے۔

کسی محسن کے احسانات کو فراموش کر کے یک بیک ترک تعلق کر لینا بے مروتی ہے۔

دشمن کے علاقے میں بے سوچے سمجھے چلا جانا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

ناتجربہ کار اور بچوں کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انسان بعض اپنے جوش اور غصہ کو کیونکر روکے۔

یہ انتظار نہ کرو کہ جب آسانی پیدا ہو جائیگی تو کام کرو گے، آگے بڑھے جاؤ مایوسی یا ناکامی کا خیال کبھی دل میں نہ لاؤ کیونکہ جب تک تم روک نہ دیئے جاؤ چلا جانا بہتر ہے۔

ہر لمحہ جو ضائع ہو جاتا ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک بہترین موقع کھو دیا گیا۔ کیونکہ اگر لمحہ کو مفید طریقہ پر استعمال کیا جائے تو مثل ایک سرمایہ کے ہے۔

قدرتی اسکول باغ ہے اسمیں بہت سے مدرس مختلف لباسوں میں سبق دے رہے ہیں بعض سبق کانوں سے اور بعض آنکھوں سے سنے جاتے ہیں تم دیکھو اور سنو پھولوں سے پتوں سے اور درختوں کی سرسبزی سے سبق لو۔

(انتخاب لاجواب)

عہ ملاحظہ ہو ہند قدیم کی مصوری مطبوعہ رسالہ زمانہ

اردو کے نثرنگار

از سید حامد حسین بلگرامی بی۔اے۔ (آنرز)

انسان فطرتاً متلون مزاج واقع ہوا ہے جس چیز کو وہ آج پسند کرتا ہے کل اُسی کو ناپسند۔ جس ماحول میں زندگی بسر کرنا آج اپنی خوش نصیبی خیال کرتا ہے اُسی فضا میں دوسرے دن سانس لینا بھی اُسے ناگوار ہوتا ہے۔ جن خیالات کو وہ ایک زمانہ میں اپنی تخیل کا جولانگاہ بناتا ہے کچھ عرصہ بعد انھیں کو طاق نسیان کے حوالے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی زندگی میں تغیر اور اس کے خیالات میں ارتقا نظر آتا ہے۔

بعینہ یہی حالت اقوام کی ہے ہر زمانے کے لوگ کسی خاص شے، کسی مخصوص فضا اور کسی خاص تخیل کو پسند کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے اظہار خیال کے لئے جو اسلوب بیان اختیار کرتے ہیں اس میں بھی ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں کافی تفاوت نظر آتا ہے یہی سبب ہے کہ طرز تحریر نے بھی قوموں کی حیات و ممات کے ساتھ متعدد پلٹے کھائے اور وہ زبان جو ایک زمانہ میں ساشہ دکنی اور تکلفی الفاظ اپنا کام چلا رہی تھی آج اپنے آغوش میں دیس دیس کے پھول لئے ہوئے ہے۔

لیکن ہر کس و ناکس میں یہ قدرت نہیں کہ زبان کے بہاؤ کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیر دے اور زبان کو اس راہ لے جائے جس کو وہ خود پسند کرتا ہے۔ ادبی دنیا میں انسانوں کی حالت بھیڑوں کی سی ہے جو تقلید کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ لیکن ان میں چند ہستیاں ایسی بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو حقیقت اور ضرورت کو سمجھتی ہیں اور اپنے لئے مخصوص اور دلکش روشیں پیدا کرتی ہیں۔ انھیں کو کارنامل سردار و رہنما کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اور یہی اصحاب دوسروں کے لئے خضر راہ کا کام دیتے ہیں۔

اُردو ادب کی تاریخ نثر بھی ان اصولوں سے مستثنیٰ نہیں۔ ایک سے ایک جید نثرنگار گذرے ہیں لیکن ایسی ہستیاں انگلیوں ہی پر گنی جا سکتی ہیں جنھوں نے اسلوب بیان میں وہ تبدیلیاں پیدا کر دیں کہ دوسروں نے ان کی تقلید کر کے اہم علمی خدمات انجام دیں۔

دکنی نثر کو لیجئے اس کا ایک خاص اسلوب بیان ہے جس میں عربی الفاظ کی کثرت سے قطع نظر کر کے سادگی اور بے تکلفی کے جوہر دکھلائے گئے ہیں۔ وثوق کے ساتھ نہیں بتایا جا سکتا کہ اس طرز تحریر کا بانی کون تھا لیکن فی الحال

خواجہ گیسودراز کی معراج العاشقین کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے:-

"نبی کہے تحقیق خدا کے یانے ستر ہزار پردے او جیانے کے ہور اند - بارے کے اگر اس میں سے ایک پردہ اٹھ جائے تو اس کی آنچ تے میں جلوں"

مذکورہ بالا عبارت میں اگر چند دکھنی الفاظ بدل دیئے جائیں تو عبارت بالکل صاف اور ستھری نکل آئیگی لیکن وہ مخصوص اجنبیت جو ترکیب الفاظ میں ہے دل کو لبھانے کے لئے کافی ہے۔ مثلاً "نبی نے کہا" کے بجائے "نبی کہے" محبت اور احترام لئے ہوئے ہے۔ آنچ سے میں جلوں کے بجائے آنچ تے میں جلوں" ایک پرانا نغمہ ہے جو آج بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

یہ طرز تحریر اس زمانے میں بحد مقبول ہوئی کیونکہ اس میں تصنع تھا اور نہ لفاظی، بلکہ مصنف کا اصلی مقصد خیالات کو ذہن نشین کرنا تھا چنانچہ رسالہ جل ترنگ و گل باس (برہان الدین جانم متوفی ۹۹۵ھ مطابق ۱۵۸۶ء) اور احکام الصلوٰۃ کی زبان اسی قسم کی ہے۔

شمالی ہندوستان میں جب کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں ادبی خدمات کا سلسلہ شروع ہوا اور زبان کو وسعت نصیب ہوئی تو میر امن دہلوی نے نو طرز مرصع کی زبان ناپائدار دیکھ اپنے ہاتھ میں شمع ہدایت لی۔ حالانکہ یہ خواہش خود مسٹر گلکرسٹ کی تھی کہ زبان سادہ و سلیس بنائی جائے۔ لیکن طرز جدید جاری کرنے کا سہرا میر امن ہی کے سر رہا۔ در حقیقت میر امن ہی نے اردو ادب کو راہ راست پر لگایا دوسروں نے اس باب میں ان کی تقلید کی۔

میر امن کی زبان صاف و سادہ ہے لیکن اُن کی سی سادگی دوسروں کو برسوں کی محنت پر بھی میسر نہیں ہو سکتی، ان کے چمنستان ادب میں بھاشا کے شاداب پھول اور ہندی محاورات کی شگفتہ کلیاں کچھ اس طرح سے سجی ہوئی نظر آتی ہیں کہ دل خواہ مخواہ لطف و مسرت محسوس ہوتی ہے۔ چہار درویش قصہ کا پلاٹ کسی قدر غیر منتظم ہے لیکن حفظ مراتب کا خیال رکھکر اس نے اس میں جو نظام پیدا کر دیا ہے اس کی مثال ان تاروں سے دیجا سکتی ہے جو بے ترتیبی سے چھٹکے ہونے کے باوجود نظر فریب ہوتے ہیں۔

ملک شام کی شہزادی جن دلکش الفاظ سے مہمان کو اکیلا چھوڑنے پر درویش کو لعنت ملامت کرتی ہے وہ سننے سے تعلق رکھتے ہیں:-

"بس بہت باتیں بنانی مجھے خوش نہیں آتیں۔ بھلا کہہ تو یہ کونسی آؤ بھگت ہے کہ مہمان کو اکیلا اٹھا کر ادھر ادھر پڑے پھرتے ہو۔ وہ اپنے جی میں کیا کہتا ہوگا"

میر امن نے یہاں "شیریں لب" و "دشنام یار" کی لطیف مثال پیش کی ہے جس کو مومن و غالب نے اپنے تخیل پر سناکر

نے زبان کو ادبی تنقیدی تاریخی و معاشرتی ہر ضرورت کے قابل بنانے کی کوشش کی۔ سرسید کے اسکول کا ہر شخص ایک مخصوص طرز تحریر اور اسلوب بیان کا مالک ہوا اور دوسروں نے ان سرداروں کی پیروی کی۔

سرسید نے تمدنی، سیاسی، ملکی، مذہبی ضرورتوں کو محسوس کیا اور زبان کو بھی اس کے اسلوب بیان کے ساتھ بیعت دی۔ یہاں زبان سے وہ کام لینا تھا جس پر قوموں کی موت و زندگی، ان کی تباہی و فلاح کا دار و مدار تھا سرسید نے خالص سلاست کو پیش نظر رکھا۔

حالی نے جس مخصوص انداز سے نفس مطلب ادا کرنا سکھایا قابل تقلید ہے۔ صاف سادہ اور دلچسپ پیرایہ میں بلا کسی الجھاؤ کے خواہ وہ ذہنی ہو یا لفظی حالی اپنا مطلب اس طرح ادا کر دیتے ہیں کہ وہ دل و دماغ پر نقش ہو جاتا ہے۔

مولانا شبلی نے جو بیش بہا خدمات انجام دیں ان کا تو ذکر ہی کیا ہے، چنانچہ لوگوں کی پیروی کی بدولت اس طرز میں فلسفانہ، تاریخی، تنقیدی و ناصحانہ ہر قسم کے مضمون کو ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔

اس کے بعد شمس العلما آزاد دہلوی نے قدیم رنگ کے ساتھ جدید رنگ کی آمیزش کی۔ ان کی طرز تحریر میں ایک خاص دلکشی ہے جو ہمیشہ قائم رہیگی ان کے الفاظ اپنی جگہ میں جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آزاد جس بے تکلفی سے اپنے خیالات کو استعارات و تشبیہات کی رنگینیوں میں ادا کرتے چلے جاتے ہیں وہ پڑھنے اور سننے والوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتی ہے۔ چنانچہ ان کی تصانیف میں مفہوم سے زیادہ ان کا دلکش طرز تحریر دل و دماغ پر مسلط ہو جاتا ہے۔ بہتوں نے ان کی نقل کرنا چاہی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ انھوں نے خود اس میں تنقید یعنی ثنا خوانی اور تاریخی تحقیقات کے نتائج بھی بیان کئے لیکن دوسروں کے لئے یہ راستہ آسان نہ تھا، آزاد خود اپنی راہ کے خضر تھے اور وہی اس پر کامیابی سے چل سکے۔

ناول میں خارجی دلچسپیوں سے انہماک پیدا کر دینا مشکل نہیں لیکن جب خارجی واقعات کی لطافت دلوں پر صحیح اثر طاری کر دے تو اس وقت ناول نویس کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ اس بارے میں سرشار ناول نویسوں کے لئے ہمیشہ ستارۂ ہدایت رہیں گے، اپنے پلاٹ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس اسلوب بیان کی بدولت جو صرف انھیں کے لئے مخصوص تھا۔ سیر کہسار، فسانۂ آزاد وغیرہ زبان اردو میں بیش بہا افسانے ہیں جن کی قدر دلوں میں اس وقت تک باقی رہیگی جب تک زبان اردو کا چشمہ رواں ہے۔ اسلوب بیان میں شایستہ ظرافت با موقع شوخی روانی اور قادر الکلامی نے ان کے لئے ان سرداران نثر اردو میں ایک ممتاز جگہ قائم کر دی ہے۔

آج انھیں حضرات کا اثر زبان پر نمایاں ہے، موجودہ زمانہ میں انگریزی تعلیم نے لوگوں کو دوسرے ممالک کے مشاہیر سے بھی روشناس کر دیا ہے جس کے اچھے اور برے نتائج بھی زبان پر ظاہر ہو رہے ہیں۔ کوئی آسکر وائلڈ

کو پسند کرتا ہے کوئی روسی نثر نگاروں سے متاثر ہو رہا ہے۔ بہرحال موجودہ طرز روش میں کچھ تو تقلید ہے کچھ اجتہاد۔ آجکل نثر نگاری جس سرعت سے ترقی کر رہی ہے اس کی مثال صرف ساون کی جھڑیوں ہی سے لگائی جا سکتی ہے۔ لیکن آج بھی ہمارے ادب کے وہ سردار نسبتاً بہت کم ہیں جو اپنے دلکش اسلوب کی وجہ سے قابل تقلید ہیں۔ آج بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگ اپنا مخصوص اسلوب بیان اختیار کریں جس میں وسعت بھی ہو دلکشی بھی۔ کوشش کی جاتی ہے کہ ہندی اور اردو زبانوں کو دوش بدوش چلایا جائے لیکن ایک طرف اگر عربی و فارسی کی بھرمار ہے تو دوسری طرف سنسکرت کی۔ ہندی الفاظ کی کثرت تعداد پر کسی اسلوب کے جدید یا دلکش ہونے کا انحصار نہیں۔ آپ اپنی اردو تحریروں میں ہر جگہ معرفت کی جگہ گیان لکھیئے۔ لیکن جب تک گیان کے مکمل لوازمات ہمارے دماغ میں نہ آ جائیں اس لفظ کا ہم کو پورا لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔ میر امن کے قلم سے تو ہندی الفاظ اور محاورات ایسے دلکش معلوم ہوتے ہیں کہ آج بھی ان کو استعمال کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن آجکل کی تحریریں زیادہ مقبول نہیں ہو رہی ہیں جن میں اردو کے بجائے خواہ مخواہ عربی یا سنسکرت کے الفاظ استعمال ہو رہے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ میر امن کے یہاں جو لفظ استعمال ہوا ہے اپنی جگہ پر صحیح اور برمحل استعمال ہوا ہے جس سے ذہن اصل مفہوم کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔

بہرحال ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے فلسفۂ خیالات، تمدن تہذیب کو سیکھیں، اور عام منازل ہستی دوش بدوش چلکر طے کریں۔ ہم کو ایک دوسرے کے خیالات و تہذیب سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ یہ فطری و قدرتی بات ہے کہ ایک دوسرے سے بات سنکر اس کا صحیح استعمال کرنے کو جی چاہیگا اس طرح علم و بیان کی خوبیاں تحریریں آ سکتی ہیں ہمارے تخیل ان لوازمات سے بھی حظ حاصل کرنے لگیں گے جو کسی مخصوص ہندی یا عربی لفظ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ممکن ہے رفتہ رفتہ زبان صحیح اصولوں کے مطابق ترقی کے مدارج طے کرے اور اس میں ایک ایسا سردار پیدا ہو جائے جو شمع ہدایت لیکر آگے چلے لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اعتدال اور میانہ روی کی ضرورت یقینی ہے۔

جس طرح دماغ اور ذہن کی ترقی کے لئے عمدہ خیالات کی ضرورت ہے اسی طرح خود زبان کے وجود کے لئے اسکی اصلاح و صحت ضروری ہے خیالات عالیشان عمارتیں ہیں اور زبان اصل بنیاد۔ اگر اس قصر کی بنیادیں ہی ہل گئیں تو عمارت کا خدا حافظ۔ آج بھی دنیا وی ضرورت ان اشخاص کا سنتہک رہی ہے جن کے قلموں کو خدا نے سرداری کی قوت عطا کی ہے۔

عددیات

(از سید نجم الحسن رضوی عشرت موہانی)

تمہید ہندوستان میں شاذ ایسے لوگ ہوں گے جنھوں نے "عددیات" (نیومرالوجی) کا غائر مطالعہ کیا ہو
یا اس علم کو حاصل کر کے اس سے کامل طور پر بہرہ مند ہوئے ہوں علوم مخفیہ (Occultism) اور خصوصیت
کے ساتھ عددیات کا سمجھنا یا اس میں مہارت حاصل کرنا نہایت دشوار ہے لیکن "کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے" اس
مقولہ کے بموجب اس موضوع پر یہ مقالہ سپرد قلم کیا جاتا ہے۔

عددیات کیا ہے عددیات وہ علم ہے جس میں انسانی کیفیات اور خصوصیات کو تاریخ پیدائش یا نام کی
عدد سے معلوم کیا جاتا ہے اور یہ علم انھیں اصولوں کا حامل ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی شخص کی تاریخ
پیدائش یا اس کے نام کی مدد سے اس کی سیرت پر روشنی ڈالنے والے علم کو عددیات کہتے ہیں۔ بظاہر یہ
بات خلاف عقل معلوم ہوتی ہے کہ کسی کی تاریخ پیدائش یا نام کے مخصوص اعداد سے اس کی زندگی کا کوئی تعلق
ہو۔ لیکن جوتش کے معتقد انسانی حیات بلکہ دنیا کے تمام نظام کو ستاروں اور نظام شمسی کا ادنیٰ کرشمہ سمجھتے ہیں
عددیات بھی انھیں اصولوں سے اخذ کردہ نتائج کی عملی شاہراہ ہے۔ لیکن اس کا براہ راست جوتش سے
کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ بذات خود ایک قدیم و مستقل علم ہے

عددیات کا مقصد اس علم میں انسانی سیرت اور کردار اور بعض تاثرات (سماوی و ماحولی) جو زندگی کی کشمکش
میں مدد و معاون ہوتے ہیں ان کا صحیح حال مندرج ہوتا ہے۔ جس کو سمجھ لینے کے بعد کامیابی اور انبساط کو اپنا مطمع
کر لینا آسان ہو جاتا ہے۔ امراض کی قطعی تشخیص اور علاج۔ سماجی زندگی کی تنظیم، اولاد کی تربیت اور مختلف
الوان (Colours) کا جسمانی اور پیدائش انسانی سے گہرا تعلق ظاہر کرنا عددیات کا اصلی مقصد ہے۔
عورت و مرد کے صحیح انتخاب نہ ہونے کے باعث ازدواجی زندگی میں جو خرابیاں رونما ہوتی ہیں ان کا دفیعہ
بھی اس علم کی مدد سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ اس کی اعانت سے ذہنی رجحانات ظاہر ہو جاتے ہیں غرض اس
علم کی رو سے انسانی حیات (عمل اور رد عمل ہر دو) کا تعلق "اعداد" (Numbers) سے ہے۔

تاریخ پیدائش کی اہمیت اس علم میں دو چیزیں اول تاریخ پیدائش اور دوسرے نام سے مدد لی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قدیم ہند و یونانی اور عبرانی سب کے نزدیک تاریخ پیدائش کی ایک خاص اہمیت ہوتی تھی اسی تاریخ کی مدد سے جوتشی زائچے بھی تیار کیے جاتے تھے جن میں تمام آئندہ کے واقعات بقید سنہ و تاریخ درج ہوتے تھے۔ اب بھی ہندوستان میں اکثر اہل ہنود اس کے قائل ہیں اور تاریخ پیدائش کو احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھتے ہیں۔ بہرحال عددیات میں تاریخ پیدائش کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

مفرد اور مرکب اعداد مفرد اور مرکب اعداد کو سمجھنے سے قبل یہ معلوم کر لینا نہایت ضروری ہے کہ علوم ریاضی میں جس قدر اعداد ہیں ان کی ساخت چند مخصوص اعداد کے الٹ پھیر کا نتیجہ ہے۔ ذیل کے اعداد مفرد ہیں (۱-۲-۳-۴-۵-۶-۷-۸ اور ۹-) یہی وہ اعداد ہیں جن کی مدد سے دوسرے اشکال ترتیب پاتے ہیں مثلاً ۱۰ کو لے لیجئے دس کیا ہے، دراصل یہ ایک ہے جس پر صفر زائد کر دیا گیا ہے اس طرح (۱۰) صفر اور ایک کا مرکب عدد ہے چنانچہ ۲۵ کا عدد پانچ اور دو کے امتزاج سے بنتا ہے۔ ایک سے نو تک کے تمام اعداد مفرد کہلاتے ہیں اور ان کے زوائد والے اعداد کو مرکب کہتے ہیں۔ مفرد اعداد کو اساسی اعداد کہتے ہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ان تمام اعداد کا تعلق اجرام فلکی سے ہے (جس کا ذکر آگے آئیگا) یہ تحقیق ہوا ہے کہ سارے عالم کا دار و مدار انھیں "اعداد" کے زیر نگیں ہے۔

ایام ہفتہ اور اس کے اعداد ایک ہفتہ کے دنوں کا بھی تعلق سبعہ سیارات سے ہے اور کیا عجب ہے کہ اسی رعایت سے ہفتہ کے دن قرار پائے ہوں۔ تاریخ پیدائش کے ساتھ ساتھ ان ایام کی تعیین قابل لحاظ ہے اور ان کا شمول تاریخ پیدائش کی قوت میں اضافہ کرتا ہے۔ ذیل میں مختلف ایام ہفتہ کی۔ ستاروں کے اعتبار سے جو قوتیں ہیں لکھی جاتی ہیں۔ اس کے بعد جو جو قوتیں لکھی جائیں گی ان کے سیاروں کا حال لکھا جائیگا تاکہ جب ہم کسی عدد کا ذکر کریں تو ناظرین فوراً اس ستارہ کی خصوصیت پیش نظر رکھ سکیں کیونکہ عدد کا خاصہ وہی ہے جو اس کے متعلقہ ستارہ کا ہے۔ اس امر کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے ورنہ مہارت مشکل ہے۔

ایام ہفتہ اور ان کے اعداد یکشنبہ - ۱-۴ ⊗ +(م) - دوشنبہ - ۲-۷-۵ +(م) سہ شنبہ - ۹ -
چہارشنبہ - ۵ - پنجشنبہ - ۳ - جمعہ - ۶ - شنبہ - ۸ -

اعداد کے متعلقات شمس - ۱ ⊗ قمر - ۲ ⊗ مشتری - ۳ - یورینس - ۴ (م) عطارد - ۵ -
زہرہ - ۶ - نیپچون - ۷ (م) زحل - ۸ - مریخ - ۹ -

نوٹ: (م) مفروضہ علامت ہے اتصال باہمی کی جسکا ذکر حاشیہ پر موجود ہے جو کہ نقشہ ہفتہ کی علامت [illegible]

⊗ شمس و قمر کی قوتوں میں علی الترتیب ۴ اور ۷ کا اتصال ہوتا ہے یعنی شمس کے ساتھ یورینس کا اور قمر کے ساتھ نیپچون کا۔
منزل قمر کا آغاز ۲۱ جون سے ہو کر ۲۰ جولائی کو ختم ہوتا ہے اور منزل شمس ۲۲ جولائی سے ۲۰ اگست تک ہے۔

عدد (۱) کے خصوصیات عدد ایک سے مراد یکم۔ دہم، انیسویں اور اٹھائیسویں (یا تاریخ پیدائش کے وہ اعداد ہیں جن کا مجموعہ والا عدد مفرد (۱) ہے) تاریخ کسی مہینہ کی بالخصوص ۲۱ جولائی سے ۲۰ اگست تک کے زمانہ میں ایک سے بننے والی تمام تواریخ میں پیدا ہونے والے اشخاص میں ذیل کے خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہوں گے۔ ایسے لوگ جن کی تاریخ پیدائش مذکورہ تاریخوں میں ہوگی وہ نہایت درجہ عمدہ شخصیت والے اور اپنے زاویۂ نگاہ اور مقاصد کے پکّے ہوتے ہیں، گو ایسے لوگ لالچی ہوتے ہیں لیکن جس کام یا پیشہ کو اختیار کر لیتے ہیں اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی ضرور ہوتی ہے۔ اپنی ذات پر کسی قسم کی پابندی کو ناپسند کرتے ہیں جس پیشہ یا ملازمت وغیرہ میں داخل ہوتے ہیں اس میں ان کی خواہش پیشوا و رہنما بنکر کام کرنے کی ہوتی ہے۔ اور حکومت کے دفاتر صیغوں میں اس کا موقع انھیں حاصل ہو جاتا ہے۔ جدت اور اختراع ان کا خاصّہ ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسے لوگ عمدہ مکانات تعمیر کرتے یا کراتے ہیں۔ ان سے دیگر قسم کے ایجادات کا بھی ظہور ہوتا ہے۔ آرام کی زندگی بسر کرنے کا انھیں بہت شوق ہوتا ہے۔ ایسے لوگ نہایت خوش نصیب ہمدرد (مگر غیر مرئی طور پر) جلد دھوکہ میں آ جانے والے اور مضبوط ارادہ کے مالک ہوتے ہیں۔ ایثار اور بین الاقوامی خدمات میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ ان کو زیادہ تر امراض قلب، دماغ اور کان کی بیماریوں میں مبتلا رہنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ سوزش چشم، جگر و گردہ کی خرابی ان کی جبلت میں داخل ہوتی ہے۔ ان کی صحت کے لئے خشک آب و ہوا اور دھوپ کی زیادہ ضرورت ہے۔ جدید طریق علاج میں سن باتھ (Sun - Bath) ان کے لئے مفید ہے۔

لباس اور الوان۔ ایک عدد والوں کو کامیابی یا سیارات کے مضر اثرات کو دُور کرنے اور عمدہ اثرات کو حاصل کرنے کے لئے زیادہ تر بھورے رنگ کے کپڑے (ہلکے یا گہرے) پہننا چاہئے ہر قسم کے سنہرے اور زردی مائل الوان یا رنگ کے لباس کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔ سونے یا نشست و برخاست کے کمروں کے تمام پردے بھی انہی رنگوں کے ہوں تو عمدہ اثرات کافی جذب کرتے اور ہماری (انسانی زندگی) پر مؤثر ہوتے ہیں۔

ایام:- وہ تمام دن ان کے لئے سعید اور موزوں ہیں جو ان کی تاریخ پیدائش کا عدد بنتے ہیں یکشنبہ اور دوشنبہ عام طور پر نہایت مبارک ہیں جو کام یا مقصد ان ایام میں شروع یا تکمیل پائیگا اس میں کامیابی ہوگی۔ اور عمدہ نتائج برآمد ہونگے۔

عدد ۲ کے خصوصیات:- عدد ۲ کی پیدائش والوں سے مراد وہ اشخاص (مرد یا عورت) ہیں جنکی

تاریخ پیدائش کسی مہینہ کی دوسری، گیارھویں، بیسویں یا انتیسویں ہو۔ خصوصیت کے ساتھ نمبر ۲ جو ۲۰ جون سے شروع ہو کر ۲۔جولائی یا زیادہ سے زیادہ ۲۵۔جولائی تک ختم ہوتا ہے۔ اس کے درمیان پیدا ہونے والوں کے خصوصیات زیادہ جاذب توجہ ہیں۔ ان تواریخ یا ان کے مثل تواریخ میں پیدا ہونے والے طبعاً شریف خیال پرست اور صناعانہ (Artistic) مذاق رکھتے ہیں عدد (۱) والوں کی طرح انہیں بھی اختراع کا مادّہ موجود ہوتا ہے۔ لیکن کامیابی بہت کم ہوتی ہے۔

دماغی اور ذہنی اعتبار سے یہ بہت قوی ہوتے ہیں برخلاف (۱) عدد والوں کے جسمانی طور پر کمزور ہوتے ہیں۔ جس خیال کی پرورش ان کے دماغ میں ہوتی ہے اس میں جدت طرازی ان کا شیوہ ہے اعلیٰ خیالی اور شرافت نفس کے باعث تجارت یا کاروبار میں خوب روپیہ کماتے اور کامیاب ہوتے ہیں مالی اور تنظیمی امور ان سے بخوبی سرانجام پاتے ہیں۔ سیر و سیاحت (بالخصوص سمندری سفر) کے بہت شائق ہوتے ہیں۔ ان کی طبیعت بے چین اور ذہنیت انقلاب پذیر ہوتی ہے۔ خیالات اور ارادوں میں استقلال نہیں ہوتا۔ تلوّن اور خود اعتمادی کی کمی کا عیب ان میں موجود ہوتا ہے جس سے بچنے کی کوشش نہایت ضروری ہے۔ اگر انھیں نشاط آور ماحول میسّر نہ آئے تو ان کا مجنون ہو جانا کچھ بعید نہیں۔ بعض وقت ان کا میلان موسیقی کی طرف ہوتا ہے۔ انھیں زندگی کے نشیب و فراز سے بہت زیادہ دوچار ہونا پڑتا ہے۔

مراض و دیگر ہدایتیں | ان کو ابتدائی عمر میں دماغ میں پانی بھر جانے والے مرض کا اندیشہ ہے پیچش یا دیگر امراض معدہ کی شکایتیں بھی انھیں لاحق رہتی ہیں۔ آخری حصہ عمر میں استسقاء (جلندھر) یا امراض سینہ شش میں گھر جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ ان کو لازم ہے کہ انتخاب زوجیت میں کافی احتیاط برتیں کیونکہ ان میں مقناطیسی قوت کافی ہوتی ہے اگر اس کا صحیح استعمال نہ کیا گیا تو سخت نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے جہاں تک ہو ایسے افراد جلد شادی نہ کریں جب تک کہ اس کے خوشگوار ہونے کا پورا الیقین نہ ہو جائے۔ ان کے لئے دریائی و سمندری سفر خطرناک ہوتے ہیں۔

لباس - ان کے لئے سبز یا سبزی مائل، نسم کے رنگ کے کپڑے اور لباس مفید ہیں خواہ وہ ہلکے ہوں یا گہرے رنگ کے ہوں۔ سفید لباس بھی پہن سکتے ہیں۔ ہر قسم کے کالے نیلے اور سرخ رنگ کے لباس سے انھیں قطعاً اجتناب کرنا چاہیئے۔ سبز رنگ کے نگینہ والی انگوٹھی پہننا ان کے لئے سودمند سمجھا جاتا ہے۔ سبز رنگ کی چادریں اور پردے حتیٰ کہ لباس بھی یہی ہونا چاہیئے۔

ایام - کسی مہینہ کی دوسری، گیارھویں، بیسویں اور انتیسویں تاریخ والے ایام اور خصوصیت کے

ساتھ منزل قمر کا زمانہ ان کے لئے نہایت سعید ہے۔

عدد ۳ کے خصوصیات :۔اس عدد کی باہمی قوت کا تناسب ۳۔ ۶ اور ۹ ہے کسی مہینہ کی تیسری اکیسویں اور تیسویں تواریخ (بالخصوص ۱۹۔فروری سے ۲۱۔مارچ یا ۲۱۔نومبر سے ۲۱۔دسمبر تک کے زمانہ) میں پیدا ہونے والے اشخاص کی خصوصیات یہ ہونا چاہیئے۔

عدد (۱) والوں کی طرح ان میں بھی قیادت و سرداری کی حرص ہوتی ہے، ضبط اور خوش انتظامی کو پسند کرتے ہیں۔ خودداری، خودرائی اور خود اعتمادی ان کا خاصہ ہے۔ ایسے لوگ سیاسی رہنما نہیں بن سکتے اس وجہ سے کہ انھیں جماعت بندی اور چالبازی مطلق نہیں آتی۔ ان کی خاص کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ قوانین سازی کرتے ہیں اور ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کے وضع کردہ قواعد پورے ہوکر رہیں اسی باعث لوگ ان کے دشمن ہوجاتے ہیں۔ ایسے لوگ اکثر بحری یا فوجی خدمات میں زیادہ شہرت پاتے ہیں۔

امراض :۔ان لوگوں کا وجع المفاصل (گٹھیا) یا اسی قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہونے کا بہت امکان رہتا ہے۔ جلدی امراض، زہریلے پھوڑے پھنسی بھی انھیں ستاتے ہیں۔

لباس اور ایام :بنفشئی یا ارغوانی رنگ کے لباس زیب تن کرنا چاہیئے، رہائشی کمروں میں پردے بھی انھیں رنگوں کے لٹکائے جائیں۔ ان کے مددگار ہمہ قسم کے نیلے، گلابی اور گہرے سرخ ہیں۔ یاقوت کی انگوٹھی بہت مفید ہے۔ ان کے لئے سب سے زیادہ سعید دن پنجشنبہ ہوتا ہے یوں تو سہ شنبہ اور جمعہ بھی موزوں ہیں۔

عدد ۴ کے خصوصیات :۔۴ تاریخ کی پیدائش والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی مہینہ کی چوتھی، تیرھویں، بائیسویں اور اکتیسویں تاریخوں میں کتم عدم سے وجود میں آئیں۔ ایسے لوگ ہر معاملہ کو دوسروں کے مقابل مخالف نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مباحثہ اور مکالمہ میں مخالفانہ سمت ہمیشہ اختیار کرتے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ طبعاً جھگڑالو ہوتے ہیں۔ اس عمل سے ان کے خفیہ دشمن پیدا ہوجاتے ہیں جو ان کے خلاف خفیہ ریشہ دوانیاں کرتے رہتے ہیں۔ اس عدد کے پیدا افراد قانون اور قواعد کے سخت مخالف ہوتے ہیں اور اگر انھیں موقعہ ملتا ہے تو حکومتوں کو اُکھاڑ کر نئی حکومت یا جمہوریت قائم کرتے اور نئے دستور تشکیل دیتے ہیں۔ مادّی حیثیت سے یہ لوگ نہایت بدنصیب ہوتے ہیں دولت کے جمع کرنے کے معاملہ میں وہ سراسر بیگانہ ہوتے ہیں لیکن اگر انھیں کچھ دولت دیدی جائے یا مل جائے تو اس کو بھی اس طرح خرچ کر ڈالتے ہیں کہ سننے والوں کو تعجب ہونے لگتا ہے۔ انھیں ایک

خبط یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں اکیلے ہیں۔ ان کے جذبات بہت نازک اور جلد مجروح ہو جاتے ہیں۔

لباس و ایام ان کو الیکٹرک کلر (چمکیلے) یا ہاف شیڈ (ہلکے رنگ) کے لباس پہننا چاہیئے بہت گہرے رنگوں سے محترز رہنا لازم ہے جو ان کے لئے کسی حالت میں روا نہیں۔ یہ عجیب مزے کی بات ہے کہ عدد (۴) والوں کو عدد (۸) والوں سے قدرتاً مقناطیسی لگاؤ ہوتا ہے اور اگر ان میں ربط ہو جاتا ہے تو اس کا شکست ہونا قیامت تک ممکن نہیں ہوتا۔ مناکحت اور شادی کرتے وقت فریقین اس کلیہ کو پیش نظر رکھیں تو طلاق اور خلع کا نام عدالت تو کیا دنیا سے ناپید ہو جائے۔

ان کے لئے شنبہ یکشنبہ اور دوشنبہ مبارک ایام ہیں۔ اگر یہی ایام عدد ۴ والی تاریخوں میں پڑیں تو دو آتشہ کا لطف آ جاتا ہے

عدد ۵ کے خصوصیات۔ کسی مہینہ کی پانچویں، چودھویں اور تیئسویں تاریخوں والے مولود کو عدد (۵) والا کہتے ہیں ان کے صفات اور خصوصیات میں مزید اضافہ ہوتا ہے جبکہ مولود ۲۱ مئی تا ۲۳ جون یا ۲۱۔ اگست تا ۲۳۔ ستمبر کے مابین تولد ہو۔

ایسے افراد کی دماغی اور ذہنی حالت بہت قوی ہوتی ہے۔ ان میں ہر وقت متضاد قوتیں کارفرما رہتی ہیں یعنی کبھی وہ نہایت حلیم اور کبھی غضب آلود ہوتے ہیں۔ ان کی نظر نہایت ناقدانہ ہوتی ہے اور دوسروں کے عیوب کو خواہ وہ معمولی سے معمولی کیوں نہ ہوں فوراً تاڑ لیتی ہیں۔ ایسے لوگ اپنے خیالات کا اظہار نہایت پر فریب انداز میں کرتے ہیں۔ ان میں بعض عمدہ مقرر ہوتے ہیں مگر ان کی تمہید یا ابتدائی تقریر زیادہ نفع بخش ہوتی ہے کیونکہ آخر میں وہ بے نتیجہ ہو جاتی ہے۔ دماغی فیصلوں کے عدم استقلال کے باعث متعدد پیشے یا کام بار بار اختیار کرتے ہیں۔ ایسے لوگ نہایت راست باز ہوتے ہیں ان کے کردار میں بلا کی لچک ہوتی ہے یعنی جلد اپنی اصلی حالت پر خود کو آتا ان کا شیوہ ہے۔ کسی چیز سے زیادہ زمانہ تک ان کا لگاؤ قائم نہیں رہتا ہے۔ ان کے دوست بہت ہوتے ہیں۔ اگر ایک مر جاتا ہے تو وہ جلد دوسرا دوست پیدا کر کے اس کی جگہ کو پر کر لیتے ہیں۔ ہر قسم کا جوکھیں مرغوب ہوتا ہے۔ ان کی رائیں بلکہ اعمال تک بھی جلد جلد بدلتے رہتے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو تو خود ہی وید سمجھتے ہیں۔ ان کو اشتہاری ادویہ سے بے حد شغف ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی دوا فروش کی دوکان کے قریب سے گذرتے ہیں تو کچھ نہ کچھ خریدے بغیر نہیں رہتے۔

امراض: اعصاب پر اثر انداز ہونیوالی ہر چیز ان کی ذات پر بھی موثر ہوتی ہے۔ عصاب کی کمزوری کے سبب ان کے قوت ہاضمہ میں فتور ہوتا ہے۔ کمزوری کی بیماری یا فالج کا شکار ہو جانا ان کے لئے آسان ہوتا ہے

حلق یا حنجرہ کی بیماریوں کا میلان بھی بہت ہوتا ہے، خاصکر ناک اور آنکھ کی تکالیف انھیں بہت ستاتی ہیں۔

لباس اور ایام:۔ سفید اور ہلکا بھورا رنگ ان کے لئے بہت اچھا سمجھا جاتا ہے۔ یوں تو ہر قسم کے رنگین کپڑے یا پردے استعمال کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ہلکے رنگ کے ہوں۔ ان کو چاہیئے کہ حتی الوسع سیاہ یا سیاہی مائل رنگ سے پرہیز کریں۔ چہارشنبہ پنجشنبہ اور جمعہ خاص دن ہیں (۵ عدد والی تاریخوں میں یہ ایام سونے پر سہاگہ ہو جاتے ہیں) الماس کی انگشتری اور چمکدار زیورات کا استعمال بہت نافع ہے۔ (خصوصاً طبقۂ اناث کے لئے)

عدد ۶ کے خصوصیات۔ کسی مہینہ کی چھٹی، پندرھویں اور چوبیسویں تواریخ اور بطور خاص ۲۰ اپریل یا ۲۴ مئی اور ۲۱ ستمبر تا ۲۴ اکتوبر کے درمیان جنم لینے والے اصحاب کے خواص یہ ہونگے۔

ان کی رائیں مستحکم ہونگی اور وہ لوگ اپنے ارادے کے دھنی ہونگے، ان کو اپنے ماتحتیں یا متعلقین سے بہت محبت ہوتی ہے، اکثر لوگ جابر اور سخت گیر بھی ہوتے ہیں۔ لیکن جن سے یہ محبت کرتے ہیں دل جان سے فریفتہ ہو جاتے ہیں، دل کے مخیر ہوتے ہیں اور دوستوں کے حق میں بہت زیادہ فیاض ہوتے ہیں۔ ۲۱ ستمبر سے ۲۴ اکتوبر تک کے درمیانی مدت کا بچہ ناکام الفت ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت کو عقل سے جانچتے ہیں جس کی وجہ سے لطف باقی نہیں رہتا کیونکہ محبت اور عقل کا اتصال اجتماع ضدین ہے۔ ان تواریخ کے پیدائش والے معلومات حاصل کرنے میں بہت کوشاں ہوتے ہیں اور دقیق مسائل کو اپنا دماغی مرکز بنا لیتے ہیں۔ لاینحل مضامین کو عقل وضمیر کی ترازو میں تولا کرتے ہیں۔ ان کی مخالف خصوصیات دوسری تاریخ والوں میں ہونگی یعنی ان کی طبیعت جلد مشتعل ہو جاتی ہے لیکن سکون ہونے پر خود کو قابل تفریں سمجھنے گئے ہیں، ان کی اشتعال پذیری کے باعث ان کی ہر پہلی کوشش ہمیشہ غلطی پر مبنی ہوتی ہے اسی لئے ان کو چاہیئے کہ جلد شادی کرنے سے پرہیز کریں خصوصاً ہندوستانی مستورات کو بہت احتیاط کرنا چاہیئے۔ خوشنما چیزیں ان کی منظور نظر ہوتی ہیں۔ مصوری و موسیقی وغیرہ انھیں بہت مرغوب ہوتی ہے خواہ وہ خود عمدہ مصور یا گانیوالے نہ ہوں۔ جب کبھی بیرونی طور پر مزاج میں ارتعاش ہو جاتا ہے تو جان تک لڑا دیتے ہیں خواہ وہ کسی مخالفت کی بنا پر ہو یا کسی اور سبب سے لیکن اس وقت وہ اپنے فرائض کو فراموش کر دیتے ہیں۔ ان میں حسد و رشک کا مادہ جبلی طور پر ہوتا ہے اور اسکا اظہار تحریک ہونے پر ہو جایا کرتا ہے۔

امراض۔ اندرونی امراض (عورتوں کو زیادہ تر) ہوتے ہیں، کان کا درد اور سخت دردسر عموماً لاحق ہو جاتا ہے۔

لباس و ایام۔ ہر قسم کے گہرے یا ہلکے نیلے رنگ کے لباس پہننا ضروری ہیں۔ گلابی رنگ کبھی کبھی مددگار رنگ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سرخ رنگ ممنوع ہے چہارشنبہ پنجشنبہ اور جمعہ خاص سعید ایام ہیں۔

عدد ۷ کے خصوصیات:۔ یہ جوڑدار عدد ہے یعنی ۲ اور ۷ کا جفت کھایا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ

ہر وہ شخص جس کی تاریخ پیدائش کسی مہینہ کی سات، سولھویں اور پچیسویں ہو، ان کا عدد (۲) والوں کے ساتھ بخوبی ہوتا ہے۔ ایسوں کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے اور آزاد منش ہوتے ہیں۔

انھیں سفر اور سیاحت کے متعلقہ کتابوں سے گہری دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کے دل میں سفر کا بہت ذوق ہوتا ہے۔ ایسے لوگ بیرون ممالک میں تاجر یا ایجنٹ ہوتے یا نیکر رہنا پسند کرتے ہیں۔ اکثر عمدہ نثار اور شاعر ہوتے ہیں۔ ان کے خیالات سے تصوف کی چاشنی ٹپکتی ہے۔ کاروباری معاملات میں اچھے خیالات و معلومات رکھتے ہیں۔ مذہب کی فرسودہ باتوں سے علحدہ ہوکر خود ساختہ اصول پر عمل پیرا ہوتے ہیں جن کا انحصار غیر المعقول امور پر ہوتا ہے۔ سمندر اور بحری باتوں سے ان کو لگاؤ ہوتا ہے۔

لباس وایام۔ ان کے امراض عدد (۲) والوں کے سے ہوتے ہیں۔ زرد یا بنفشی مائل سبز اور سفید رنگ ان کے لئے موزوں ہیں۔ اول الذکر زیادہ بہتر ہے۔ ان کو سچے موتی کی انگوٹھی پہننی چاہیئے۔ عدد (۲) والوں کے ایام ان کے لئے بھی سعید ہیں۔

عدد ۸ کے خصوصیات:۔ اس پر اسرار عدد کا سمجھنا چنداں آسان نہیں کیونکہ اس میں حیرت انگیز مادی اور روحانی خصوصیات مجتمع ہیں، اسی جہت سے اس کو پہلے پوری طرح تجزیہ کرکے دیکھ لینا زیادہ مفید ہوگا۔

چنانچہ سب سے پہلے ہم عدد مذکور کی ترتیب اور تنوع پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اسکی بناوٹ دو مساوی المرتبہ (بحیثیت ریاضی کی قیمتوں کے نہ کہ بلحاظ عددیات) اعداد سے ہوئی ہے یعنی چار اور چار ملکر آٹھ بنا ہے، اسی لئے اس کی دو قوتیں اور تاثیریں ہیں جن کا تفصیلی حال آپ آگے پڑھیں گے۔ فی الحال اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس عدد کی ایک بسیط طلسمی فضا ہے جس میں انقلاب کے ذریات چلتے ہوئے نظر آتے ہیں یہی اس عدد کی مادی شان ہے۔ دوسرا رخ وہ ہے جس میں فلسفیانہ خیالات، مذہبی خوش عقیدگیاں، بلند خیالی اور عالی ہمتی کے نہایت زبردست اعمال نمایاں ہوتے ہیں۔ جس طرح خود عدد (۸) کے دو پہلو ہیں اسی طرح اس کے خصوصیات میں بھی دو گروہ ہیں، ایک گروہ کو "مثبت" اور دوسرے کو "منفی" سے تعبیر کرتے ہیں۔

عدد آٹھ والوں سے مراد یہ ہے کہ جن نفوس کی تاریخ پیدائش کسی مہینہ کی آٹھویں، سترھویں اور چھبیسویں ہو، لیکن وہ جن کی پیدائش ۲۱ دسمبر اور ۲۶ جنوری کے مابین واقع ہوں تو یہ گروہ مثبت اور جو ۲۶ جنوری اور ۱۹ فروری کے درمیان ہوں ان کو گروہ منفی کہیں گے۔ تفصیل ملاحظہ کیجئے:۔

گروہ مثبت کے زمانہ میں پیدا ہونیوالوں کی قوت ارادی اور قوت ذہنی نہایت عمدہ ہوتی ہے۔ تمام عمر اپنے آپ کو اکیلا اور بیگانہ سمجھتے ہیں۔ تقدیر کا تدبر رہا جگر آن کے قابو سے باہر ہوتے [illegible]

جو انھیں مثل کھلونے کے گھماتا رہتا ہے لیکن اپنی مضبوط قوت ارادی کی وجہ سے آزادانہ زند
کرتے ہیں۔ یہ گروہ آزاد خیالی کے سبب امتیازی شہرت رکھتا ہے، دوسروں سے دبکر رہنا
قطعی ناپسند ہوتا ہے۔ انھیں کسی کی الفت پر پورا اطمینان نہیں ہوتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ
کو بالکل یکہ و تنہا جانتے ہیں۔ دوسروں کی نظریں انھیں غلط جانچتی ہیں اور یہ خود صفائی کرنا نہ
عمدہ شخصیت لیکر پیدا ہوتے ہیں اور اپنی ذات سے مفید کام ہوتے ہیں۔ مذہبی خیالات میں آز
اور معقول پسند ہوتے ہیں۔ متمدن ممالک کے لوگ جن کی پیدائش کا زمانہ یہی ہوتا ہے اتحاد لپ
ہیں اور ان میں جو مذہبی بھی ہوتے ہیں وہ حد درجہ کٹر اور متعصب ہو جاتے ہیں۔ اس گروہ کے
خدمت سے بالا ہو کر اجتماعی خدمات میں منہمک رہتے ہیں۔ چنانچہ خیرات کے بارہ میں ان کا دستو
ہے کہ یہ معمولی بھیک منگوں کو دینا پسند نہیں کرتے بلکہ اجتماعی خدمت کو مدنظر رکھکر اپنی دولت کو کس
یا ادارۂ علمی پر صرف کرنا بہتر سمجھتے ہیں اور تصوف وغیرہ سے انھیں قلبی شغف ہوتا ہے۔ سب سے
بات یہ ہے کہ یہ قابل اور لایق ہستیوں کی ہر طرح سے پرستش کرتے ہیں۔

جو چیزیں یا علم و فن انھیں پسند ہوتا ہے اس پر یہ جلد حاوی ہو جاتے ہیں لیکن اپنی پسند کے خلاف
نہیں چاہتے۔ ان کا مادۂ ایثار اتنا بڑھا ہوا ہوتا ہے کہ انھیں اپنی محبوب ترین چیز حتیٰ کہ اپنا گوشت و خو
نثار کرنے میں دریغ نہیں ہوتا۔ مضبوط سیرت اور ایک ہی وقت میں مقبول و غیر مقبول ہونا ان کی خ
شان ہے۔

امراض | امراض میں سب سے زیادہ اندیشہ ان کو وجع المفاصل کا رہتا ہے، ہاتھ اور پیروں میں
دردوں کا ہونا یا جگر و گردہ کی خرابیاں اور امراض دندان مثل پائریا و عوارض گوش کا ہونا کچھ بعید
گروہ منفی کے خصوصیات ۔ اس گروہ میں وہی تمام باتیں پائی جاتی ہیں جو گروہ مثبت میں ہ
لیکن دونوں میں فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ ان میں وہ خصائص اور کمزوریاں جسمانی سرحد سے
اور دماغی بن جاتی ہیں۔ یہ بھی اپنے آپ کو اکیلا تصور کرتے ہیں۔ اس گروہ کے احساسات نہایت
جلد مجروح ہونیوالے ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کے کردار کا بڑے نازک پیمانہ پر مطالعہ کرتے ہیں۔ دغا
بھی جلد شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب انھیں اس کا احساس ہو جاتا ہے تو وہ ایسی مدافعانہ کار
کرتے ہیں کہ حیرت ہونے لگتی ہے۔ اگر ان کے جذبات میں سکون ہوتا ہے تو وہ سچے رفیق ہم بن جا
اور دوستی میں ایثار سے بھی کام لیتے ہیں مگر جب انھیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دوستی کے پردہ میں انھیں
دیا گیا ہے تو وہ بدلہ لینے میں کسی بات کی پرواہ نہیں کرتے۔ مذہبی اعتقادات میں وہ گروہ مثبت کی

مر گروہ اول کے خلاف یہ عزلت نشینی کے مخالف ہوتے ہیں اور جلسوں اور تماشاگاہوں کا انھیں بہت شوق ہوتا ہے۔ اس پر بھی تنہائی کا خیال دل میں جاگزیں رہتا ہے۔ عام فائدہ رسانی اور دولت کی افزایش اپنے خود ساختہ اصول پر کرلیتے ہیں۔ یہ لوگ قوت ارادی سے اس وقت کام لیتے ہیں جب انھیں اپنے فرائض منصبی کے خاتمہ کا خوف ہوتا ہے یا اس کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں۔

امراض :- انھیں زیادہ تر اعصاب شکم کی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ ان کے اعضا جسم میں ایسا فتور ہوتا ہے کہ معمولی دواؤں سے شفایاب ہونا دشوار ہوتا ہے۔ ان کے ہاتھ پیر سرد رہتے ہیں اور دوران خون نہایت کمزور، دانت کمزور اور ہاتھ پیر ٹوٹنے کے حادثات کا امکان رہتا ہے۔

خصوصیات عمومی :- عدد (۸) والوں کے ایثار اور نیکیوں کا بدلہ ان کی زندگی میں انھیں نصیب نہیں ہوتا بلکہ مرنے کے بعد ان کی شہرت ہوتی ہے اور ان کے نام کو برقرار رکھنے کے لئے مختلف قسم کی یادگاریں قائم کی جاتی ہیں۔ مجسمے بنائے جاتے اور سوانح عمریاں لکھی جاتی ہیں۔ یہ اپنی ذات کو اپنے ہم چشموں اور معصروں سے برتر اور قابل احترام سمجھتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی زندگی میں جو غیر معمولی واقعات پیش آتے ہیں ان میں (۸) کا عدد غالب رہتا ہے۔ ان تاریخوں کے پیدا ہونے والے معمولی لوگوں کی زندگی کا خاتمہ رنج و افسوس کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن ممتاز اور ترقی یافتہ روحوں کی کیفیت جداگانہ ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ان کے شاعرانہ جذبات کا اظہار فلسفیانہ انداز میں ہوتا ہے عموماً یہ اچھے قدردان بھی ہوتے ہیں اور ملک و قیادت کا شوق ہوتا ہے جس پر ایثار کے ذریعہ فتح حاصل کرتے ہیں لیکن شہرت پر ایک گمنامی کا پردہ پڑا ہوتا ہے جس کو موت چاک کردیتی ہے۔ لیکن ایسا ہونا کوئی لازمی بھی نہیں ہے۔ اس عدد کی تریبیں دور کر کے اس کی خوبیوں کو جذب کرنے کی کئی صورتیں ہیں چنانچہ ایک صورت نام کی تبدیلی بھی ہے مگر اس بحث اس موقع پر غیر مناسب ہے آیندہ اگر کبھی عددیات کے دوسرے جزو ترکیبی سے بحث کی گئی تو [illegible] ظاہر ہوگا۔ ہر دو گروہ کے لئے دوران سفر میں طوفان برق و باد کے خطرات و پیش نظر رکھنا چاہیئے جو ان کی زندگی میں ایک بار ضرور ہوتے ہیں۔ جو لیبا اوقات ان کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں۔

لباس وغیرہ - ان لوگوں کو ہر قسم کے سیاہ اور گہرے سیاہی مائل [illegible] رنگ کے کپڑے استعمال کرنا چاہیئے۔ اسی رنگ کی ٹوپی پہنیں اور کمروں میں پردے بھی اسی رنگ کے لگائے جائیں تو بہتر ہوتے ہیں۔ [illegible] پوشاک مضرت رساں ہے۔ عدد (۸) پہننے والے یہ خصوصیت [illegible] بھی ان کے لئے مفید [illegible] شنبہ دوشنبہ سعید ہیں۔ یاقوت، سیاہ موتی کی انگشتری پہنیں [illegible] بھی مفید [illegible]

عدد (۹) کے خصوصیات :- [illegible]

لینا چاہیئے کہ اس کا تعلق ستارہ مریخ سے ہے جس کی سب سے اہم خصوصیت جنگ، خونریزی، عسکریت ا
سباعیت ہے۔ جو لوگ اس عدد کی بنی ہوئی تاریخوں میں جنم لیتے ہیں تو وہ بھی انھی خصائص کے حامل ہوتے
اور یہی ستارہ تمام عمر ان پر حکومت کرتا ہے۔ جس طرح ہم نے عدد (۸) والوں کو دو گروہ میں تقسیم کرکے ہر ایک کی
الگ الگ توضیح کی ہے۔ اسی طرح ناظرین کی سہولت اور عدد کی اہمیت کے خیال سے نو کے بھی دو گروہ
وضاحت کریں گے۔

عدد (۹) والوں سے ماہرین عددیات (*Numerologists*) کی مراد کسی مہینہ کی نویں، اٹھار
اور چھبیسویں کے پیدا ہونے والے ہیں۔ ۲۱۔ مارچ سے ۲۰۔ اپریل کے درمیان جن کی ولادت ہو ان کو گ
مثبت اور ۲۱۔ اکتوبر سے ۲۰۔ نومبر کے ۹ عدد بنانے والی تاریخوں کے پیدایش والوں کو گروہ منفی کہتے
اہل جوتش ان دونوں گروہ کے زمانہ ہائے پیدایش کو "مقام مریخ" (*House of Mars*) کے مثبت
منفی قرار دیتے ہیں۔

جیسا اوپر بتلایا گیا ہے کہ ستارہ کے اثرات انسانی خصائص پر اثر انداز ہوتے ہیں چنانچہ عدد نو والے
کسی قسم کا پیشہ یا کام کرتے ہوں اور کسی قسم کی زندگی بسر کرتے ہوں ان کے رجحانات سے عسکریت اور سپاہیا
فطرت کا ظہور ہوتا ہے اور ایسے لوگ ہر حیثیت سے جنگجو ہوتے ہیں۔ ان میں ضبط و تحمل مطلق نہیں ہوتا۔ اور ادنیٰ
معمولی باتوں پر وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن غصہ فرو ہونے کے بعد انھیں اپنے کئے پر سخت پشی
ہوتی ہے یہ کسی کی تنقید کو برداشت نہیں کر سکتے خواہ وہ ان کا عزیز دوست ہی کیوں نہ ہو۔ اپنے پسند
ہوئے راستہ کو مکمل اور بہتر سمجھتے ہیں۔ بہت کم کسی سے مشورہ کرتے ہیں اور اپنے کاموں میں کسی کی مداخلت
کو بھی روا نہیں رکھتے ہیں۔ اگر کسی دوست نے مداخلت کی تو اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کے
عزم و ارادہ میں استقلال ہوتا ہے۔ چونکہ وہ فطرت صالح لیکر پیدا ہوتے ہیں اس لئے ان کی ذات سے بہ
سی انسانی خدمات انجام پاتی ہیں۔ ان میں فیاضانہ میلان ہوتا ہے لیکن چونکہ ضبط نفس کا مادہ مطلق نہیں
اس لئے انھیں تمام عمر خانگی جھگڑے ستاتے رہتے ہیں۔ کوئی عورت ان کے مزاج پر قابو پا نہیں سکتی حتیٰ کہ ا
کی بیوی بھی ان سے نالاں رہتی ہے۔ اور اگر بیوی نے صبر اور برداشت سے کام لیا تو اولاد سے نبھنا مشکل
ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی عورت نے ان کے دل کو موہ لیا تو یہ قطعی بیوقوف بن جاتے ہیں۔ ان کی صلاحیت
قیادت بھی غصہ کی وجہ سے ناکارہ ہو جاتی ہے۔

ہدایات۔ ایسے لوگوں کا فرض ہے کہ وہ مزاج میں صبر و تحمل پیدا کریں۔ ان کو ہمہ اقسام کے مسکرات و منشی
سے کلی احتیاط کرنا چاہیئے۔ ان چیزوں کی طرف ان کا فطری میلان ہوتا ہے۔ ان کو کھلی ہوا میں زندگی بسر کرنا چا

اخلاقیات کا مطالعہ بھی ان کے لئے ضروری ہے۔ اور سب سے زیادہ ان کو سکونِ دماغ کی ضرورت ہے لہٰذا انھیں زیادہ سونا چاہیے۔

امراض:- اوائل عمر میں بخار اور دمہ وغیرہ امراض ہوتے ہیں۔ جوانی میں درد سر، صرع اور دماغ میں پانی بھر جانے والی بیماریوں کا احتمال ہوتا ہے۔ دانتوں کے امراض بھی ہو سکتے ہیں۔ بڑھاپے میں درد سر، سکتہ اور نرمیٔ دماغ کی شکایات و بیماریاں حملہ کرتی ہیں۔

گروہ سنبلی گروہ جوزا(?) سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ تمام مریخی اثرات جسم سے ہٹ کر صرف ان کے ذہن اور نفس تک محدود رہتے ہیں۔ یہ لوگ دماغی اور ذہنی طور پر جری ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ جسمانی جنگ کو ناپسند کرتے اور دماغی و عقلی مقابلہ چاہتے ہیں۔ خونریزی سے خائف رہتے ہیں۔ اور اسی گروہ(?) سے زیادہ بچے ہوتے ہیں مگر اپنے ارادوں کا انتہا نہیں ہونے دیتے۔ ایسے لوگ قائد ہونے کی بہ نسبت مفکر و مدبر(?) ہونے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ جب ان کی ذہنی قابلیت میدانِ جنگ کے نقشے بدل دیتی ہے تو عجیب شاندار نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ان میں خفیہ مقناطیسی قوت ہوتی ہے اور ان کی قوت تخیلہ نرالے(?) عجائبات(?) پیدا کر دیتی ہے۔ انھیں خفیہ انجمنوں کے بنانے اور ان میں شامل ہونے کا شوق زیادہ ہوتا ہے۔ جب یہ لوگ سائنس یا طب کو پڑھتے ہیں تو بہت اچھے ہپناٹسٹ[1] ہوتے ہیں۔ چونکہ انھیں دماغی کام پسند ہوتا ہے اگر ان کی اس خواہش کی صحیح تربیت نہ کی گئی تو یہ قوت مکاری اور عیاری سے مبدل ہو جاتی ہے۔ یہ گروہ اس کام کو بہت کم اختیار کرتا ہے جس کے لئے اسے سدھایا گیا ہو۔ اپنی زندگی میں نشست پیشے و مشاغل تبدیل کرتے ہیں۔ ان کا مادۂ تقلید اس قدر بڑھا ہوا ہوتا ہے کہ ہر اچھی بری بات کو فوراً اپنا لیتے ہیں مگر اچھی صحبتوں سے زیادہ بری صحبتوں کا اثر ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو بری صحبت میں پھنس کر یہ لوگ بدوں سے بھی دو قدم آگے ہو جاتے ہیں۔

ہدایات:- آغاز شباب میں ان کو بری صحبتوں سے بچایا جائے۔ انھیں مردانہ قوتوں کی حفاظت سے پوری تنبیہ کر دینا والدین اور سرپرستوں کا فرض ہے۔ اخلاقی و مذہبی کتب کا مطالعہ شروع ہی سے کرایا جائے۔ ایسے لوگ ابتدائی عمر میں دبلے پتلے ہوتے ہیں لیکن وسط عمر میں فربہی آ جاتی ہے۔ ان کے لئے پانی کا سفر خطرناک ہوتا ہے۔

امراض۔ مردوں اور عورتوں دونوں میں امراض مخصوصہ ہوتے ہیں۔ خصوصاً زمانۂ شباب میں گردہ، مثانہ کی کمزوری اور دیگر عوارض کا بھی احتمال رہتا ہے۔ جب غدہ کا ایک معتد بہ حصہ کمزور ہوتا ہے تو عفونت(?) [illegible]

---

[1] Hypnotist

میں فتور واقع ہوتا ہے۔

خصوصیات عمومی

عدد نو والے ہر حیثیت سے محارب ہونگے۔ ان کے عمر کے ابتدائی مراحل سخت دشوار ہوتے ہیں لیکن آخر میں ان کے مصمم ارادے اور قابلیت کارآمد ہوجاتی ہے ان کے جذبات جلد مشتعل ہوجاتے ہیں ان کا نصب العین ہوتا ہے۔ خانہ جنگی اور زبان و اعمال میں بندش ہونے کی وجہ سے بری طرح تکالیف میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اپنے آپ کو سراہتے اور گھر کا بڑا سمجھتے ہیں۔ انتظامی جوہر ان میں ہوتا ہے بشرطیکہ ان سے کام کیا جائے ورنہ اس کے برعکس حالات پیدا ہوجاتے ہیں۔ ایسے آدمیوں کے دل پر اگر کسی ناز و انداز کا جادو چل گیا تو یہ بیوقوف بن جاتے ہیں۔ جب عدد (۹) کا پورا اثر ہو خواہ براہ راست یا بالواسطہ تو وہ شخص حد درجہ مغلوب الغضب صاحب طاقت اور تباہ کن ہوتا ہے (خواہ اپنی ذات کے لئے اور دوسروں کے لئے) معمولی طور پر بھی محاربہ ان کے

اعمال کی بنیادی اصول ہوتا ہے۔ اہل جوتش نے عدد (۹) کے لئے نہایت پرمغز نشان قائم کیا ہے وہ قدیم ترین نشان یہ ہے کہ ایک بچھو جو اپنے ہی ڈنک سے اپنی دم کو زخمی کر رہا ہے۔ اور دوسرا نشان یا رمز عدد مذکور کے اعلیٰ صفات کا مظہر ہے وہ یہ کہ ایک عقاب اپنے سر کو آسمان کی طرف بلند کئے ہوئے ہے۔

ان نشانات یا رموز سے حسب ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

نشان اول میں اس عدد کے اس خصوص کو متعین کر کے پیش کیا گیا ہے کہ جس سے اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارنے کا محاورہ چسپت ہوتا ہے۔

دوسرے رمز کا مفہوم یہ ہے کہ وہ روحانی اور ایتھری (Ethereal) عروجی کیفیت ہے جو مادی آلودگی سے پاک ہوکر فضا میں بلند ہوچکی ہے۔ جس سے نو والوں کی روحانی بلندیاں دکھلائی گئی ہیں جو مذکور ہوئیں۔ یہاں تک مفرد یا اساسی اعداد بالتفصیل لکھے گئے۔ ایک قسم کا اور بھی خاکہ تیار کیا گیا ہے جس میں مختلف تاریخہائے پیدائش کے معلوم ہوجانے پر اس کی صحیح پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ کس عمر یا کس سال میں انقلابات زندگی رونما ہونگے جو اہم واقعات پر مشتمل ہوں گے اور زندگی میں کایا پلٹ ہوجائیگی مگر ہم اس کو یہاں پر نظر انداز کرتے ہیں۔

عددیات کا طریق استعمال، اخیر میں ہم ناظرین کی توجہ عددیات کے طریق استعمال کی طرف بھی منعطف کرانا چاہتے ہیں۔ عددیات کی رو سے جب ہم کسی کی تاریخ پیدائش کو سامنے رکھکر تجزیہ سیرت کریں تو ہمیشہ اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ اس فن کا پورا اطلاق انھیں افراد پر ہوگا جنھوں نے عملی اور ذہنی دنیا

میں عمدہ پیرا ہونے کی پوری کوشش کی ہے۔ یوں تو ہر کس و ناکس کے [illegible]
مدد سے روشنی ڈالی جا سکتی ہے لیکن بڑے بڑے لوگوں کی سوانح حیات اور حالات زندگی کو پیش نظر
رکھکر آپکی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو عددیات کی صحت پر یقین کامل ہو جائیگا، ورنہ کی غیر مرئی قوتوں پر
(جو اعداد کے اشکال میں ہیں) اور جو انسان کے پس پشت کارفرما ہیں ایمان لانا پڑیگا۔ یہ علم (عددیات)
تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے۔ تاریخ پیدائش کے منفی اور مثبت گروہ کا لحاظ نہایت ضروری ہے ورنہ مطالعۂ سیرت
میں منزل مقصود تک رسائی محال ہے۔ عددیات کے بیانات کو عام لوگوں کے حالات سے مطابق کرنے کی
کوشش اس علم کی شان سے بعید ہے۔

ہمہ اوست

عین کثرت میں یہ وحدت کا سبق دیدہ میں ہے — ایک ہی نور ہے جو ذرہ و خورشید میں ہے
جس سے انسان میں ہے جوشش جوانی پیدا — اُسی جوہر سے ہے موجوں میں روانی پیدا
رنگ گلشن میں فضائے دامن کہسار میں ہے — خوں رگِ گل میں ہے نشتر میں خلش خار میں ہے
تمکنت حسن میں ہے جوش ہے دیوانے میں — روشنی شمع میں ہے سوز ہے پروانے میں
رنگ و بو بن کے سمایا وہی گلزاروں میں — ابر بن کر وہی برسا کیے کہساروں میں
شوق ہو کر دلِ مجذوب پہ چھایا ہے وہی — درد بن کر دل شاعر میں سمایا ہے وہی

[illegible]

(۲)

جس کی نمود دیکھی چشم ستارہ بیں میں — خورشید میں قمر میں تاروں کی انجمن میں
صوفی نے جس کو دل کے خلوت کدے میں پایا — شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
جس کی چمک ہے پیدا جس کی مہک ہویدا — شبنم کے موتیوں میں پھولوں کے پیرہن میں
صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بنکر — ہنگامہ جس کے دم سے کاشانۂ چمن میں

[illegible]

ملکہ کشور صاحبہ

(از شیخ تصدق حسین بی۔اے۔ ایل ایل۔ بی۔ ایڈوکیٹ)

نواب تاج آرا بیگم نواب حسین الدین خاں کی بیٹی تھیں جو فوج شاہی اودھ میں رسالدار تھے۔ اُن کی چھاؤنی وارڈ سعادت گنج لکھنؤ میں گھنٹہ بیگ کی گڑھیا کے قریب تھی۔ یہ مقام ابتک حسین الدین خاں کی چھاؤنی کے نام سے مشہور ہے۔ حسین الدین خاں کے والد نواب فخر الدین خاں بادشاہ شہنشاہ دہلی کے وزیروں میں تھے۔ نواب تاج آرا بیگم امجد علی شاہ کو بزمانۂ ولی عہدی بیاہی گئیں اور سسرال سے خاتون منتظم بادشہ ہو نواب ملکہ کشور صاحبہ خطاب عطا ہوا۔ ۱۸۴۲ء میں حضرت محمد علی شاہ کے انتقال پر اُن کے بیٹے امجد علی شاہ بعمر تینتالیس ۴۳ سال چھ ماہ چہارم بادشاہ اودھ ہوئے۔ اُنھوں نے ۱۸۴۷ء تک یعنی پانچ برس حکومت کی، اور زمانۂ بادشاہت میں اپنی مرضی اور پسند سے دو اور شادیاں کیں، ایک تو ملکہ گیتی سے اور دوسری ملکۂ عہد سے۔ ملکہ کشور کے بطن سے تین اولادیں ہوئیں۔ سب سے بڑے خورشید حشمت مرزا محمد واجد علی جو بعد کو واجد علی شاہ کے نام نامی سے تاجدار قلمرو اودھ ہوئے۔ دوسرے سکندر حشمت مرزا محمد جواد علی جو فوج شاہی اودھ میں سپہ سالار اعظم ہونے کے باعث خواص و عوام میں جرنیل صاحب کے نام سے مشہور تھے اور تیسری نواب اشرف النسا بیگم جو نواب منیر الدولہ کے بیٹے نواب سرفراز الدولہ سے کتخدا ہوئیں۔

امجد علی شاہ کے زمانۂ ولی عہدی میں ملکہ بہت ہی خوش و خرم رہتی تھیں۔ میاں بیوی میں بہت میل جول الفت اور محبت تھی مگر بادشہ کی دوسری شادی کے بعد دونوں میں ناچاقی ہوئی۔ ابتداءً ملکہ کو اس واقعہ کی اطلاع نہ ہوئی مگر جب یہ منحوس اور روح فرسا خبر اُن کے کانوں تک پہونچی اور اُس کی تصدیق بھی ہوگئی تو اُنھوں نے تین شبانہ روز نہ بادشاہ کا سامنا کیا نہ اُن سے بات چیت کی بلکہ کھانا پینا تک ترک کردیا۔ آخرکار وزیر اعظم و چند اعیان دولت و اعلے عہدے داران سلطنت نے اُن کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض و معروض کیا۔ جس کے بعد اُنھوں نے اپنا خیال بدل دیا اور حسب سابق خوش دلی کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگیں۔ ملکہ کو چھتر منزل چولکھی کوٹھی

اور دوارکا داس کے باغ والی عمارت بہت پسند تھی۔ ان تینوں مقاموں پر وہ بہت شوق سے رہتی تھیں۔ جاڑے کی فصل میں عموماً چھتر منزل میں قیام کرتی تھیں اور معمولاً کسی کھڑکی کے پاس جھک کر جھلملی سے دریا اور سڑک کی سیر کیا کرتی تھیں۔ اکثر اوقات وہ کسی غریب و بیکس عورت کو طلب کرتیں اور انعام و اکرام سے اُس کو خوش کر کے رخصت کر دیتیں۔

جو لکھی کوٹھی کو وہ موسم گرما کے لئے موزوں خیال کرتی تھیں اور باغ والی کوٹھی کو برسات کے لئے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے ملکہ چند روز کے لئے چھتر منزل میں فروکش تھیں اور چڑھے ہوئے دریا کی سیر کر رہی تھیں کہ دفعتاً انھوں نے خادماؤں کو پکار کر کہا کہ دیکھو ایک بڑھیا دریا میں بہتی چلی جاتی ہے فوراً جاؤ اور آدمیوں کو بھیج کر اُس کو نکلوالو۔ چنانچہ خادمائیں تیزی سے گئیں اور آدمیوں کو بھیجا۔ غریب بڑھیا کا جھونپڑا سیلاب کی وجہ سے بہہ گیا تھا۔ وہ چھپر کا ایک کونا پکڑے بہتی چلی جاتی تھی حسب الحکم ملکہ نوکر اس کو آن واحد میں دریا کے باہر نکال لائے جب اُس کا جسم خشک ہو گیا تو کپڑے پہنا کر ملکہ کے روبرو حاضر کی گئی۔ ملکہ نے اس کی پر درد سرگذشت سنی اور جب اُن کو معلوم ہوا کہ اُس کا کوئی والی وارث نہیں ہے اور اُس کے کل رشتہ دار لقمۂ اجل ہو چکے ہیں تو انھوں نے بڑھیا کا تین روپیہ ماہوار گذارہ مقرر کر دیا جو اُس زمانہ میں اُس کے لئے اطمینان و فراغت سے زندگی بسر کرنے کو بالکل کافی تھا۔

کوٹھی سے ملا ہوا ایک بڑا باغ تھا جس کے چاروں طرف بلند دیواریں تھیں۔ برسات میں چھینٹا پڑنے کے بعد جب خوشگوار ٹھنڈی ہوا چلتی تھی تو ملکہ اپنی پیش خدمتوں کے ہمراہ جن کی تعداد ایک سو سے کچھ زیادہ ہوتی تھی روشوں پر چہل قدمی کرتی تھیں۔

ملکہ اپنے مذہب کی بہت پابند تھیں۔ رات کو دیر سے آرام کرتیں اسی وجہ سے صبح بیداری میں دیر ہوتی، ملازمین کی مدد سے ہاتھ منہ دھو کر روغنی کلیہ اور بالائی کا ناشتہ کر کے اپنے توشہ خانہ میں چلی جاتی تھیں جہاں مولوی صاحب پردہ کے آڑ میں بیٹھ کر کلام پاک پڑھ کر اُن کو سنایا کرتے تھے۔ اپنے شوہر نامدار کے انتقال کے بعد وہ خود رات گئے تک قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتی تھیں۔ اُن کی استعداد علمی بھی اچھی تھی اور فارسی بخوبی لکھ پڑھ لیتی تھیں۔

گرمیوں میں خاصہ نوش کرنے کے قبل وہ قوت اور مقوی موتیوں کا شربت بھی استعمال کرتی تھیں۔ پوشاک تبدیل کر لینے اور دربار کرنے کے بعد خاصہ چنا جاتا تھا۔ ملکہ کا خاصہ مختصر مگر نہایت ہوشیار اور واقف کار باورچی تیار کرتے تھیں۔ دربار شاہی کا خاصہ اُن کے خاص باورچی اور رکابدار باہر کے باورچی خانوں میں تیار کرتے تھے۔ جب بادشاہ ملکہ کے ساتھ خاصہ نوش کرنے کو تشریف لاتے تھے تو شہنائی نوازشہنائی بجاتے تھے بادشاہ کا

کھانا نقرئی کشتیوں اور سینیوں میں آتا تھا، دوپہر کو ایک توپ بھی داغی جاتی تھی جس سے معلوم ہو جاتا تھا کہ اب بادشاہ دسترخوان پر خاصہ تناول کرنے بیٹھے ہیں۔

شام کا کھانا بعد مغرب کھایا جاتا تھا۔ شام کو بھی قریب قریب دن کے ایسے بیس پچیس قسم کے نہایت نفیس اور خوش ذائقہ کھانے ہوتے تھے، یعنی دو تین قسم کے پلاؤ، کئی قسم کے کباب، کئی رنگ کے شوربہ دار اور ترکاری دار سالن، شیر برنج، مزعفر، خرمے اور مٹھائیاں وغیرہ وغیرہ۔ ملکہ ہمیشہ چمچہ سے کھانا کھاتی تھیں، ہاتھ سے نہیں کھاتی تھیں اور خاصہ سے فراغت کرنے کے بعد دونوں وقت حقہ نوش کرتی تھیں۔ محلسرا میں ایک بڑا کمرہ کھانا کھانے کے لئے مخصوص تھا، کھانے کے ساتھ چھوٹی چھوٹی تپائیاں اور چوکیاں کمرہ میں لاکر اُن پر نقرئی ظروف رکھدیے جاتے تھے۔ اور ملکہ اپنی مسند پر ایک بڑے پرتمتن زردوزی گاؤتکیہ سے لگ کر بیٹھتی تھیں فرش پر گراں بہا قالین بچھے ہوتے تھے، چوکیاں اور تپائیاں بھی جن پر کھانے کے برتن رکھے جاتے تھے اکثر خالص چاندی کی ہوتی تھیں۔ شاہی دسترخوان بانات کے دو بڑے ٹکڑوں کا ہوتا تھا جس پر گل و بوٹے بنے ہوتے تھے۔ دسترخوان کے نیچے اتنا ہی لمبا چوڑا چمڑے کا ٹکڑا ہوتا تھا جو دسترخوان کے نیچے چاروں طرف ٹانک دیا جاتا تھا۔ کھانے کے وقت دسترخوان کمرہ کے وسط میں بچھادیا جاتا تھا اور کل کھانے اس پر چن دیئے جاتے تھے۔ شربتوں اور حقوں کو سرد کرنے کے لئے برف بکثرت استعمال ہوتی تھی۔

کھانے سے فراغت کرکے جب ملکہ اپنی خوابگاہ میں آرام کرنے تشریف لیجاتی تھیں تو ہمیشہ کسی قصہ گو عورت سے کوئی قصہ یا داستان سنا کرتی تھیں۔ قصہ گو ملکہ کے مزاج کے موافق قصہ میں تبدیل کردیتی تھی یعنی اگر غنیہ بُلانے کا مقصد ہوتا تھا تو ایک خواب آور روکھے پھیکے قصہ سے جو طول دیکر آہستہ سے بیان کیا جاتا تھا یہ منشا پورا ہو جاتا تھا۔ اگر یہ غرض ہوتی تھی کہ قصہ سُنکر دلبستگی ہو اور طبیعت میں فرحت و تازگی پیدا ہو یا غم غلط ہو تو کوئی دلچسپ داستان موثر و شگفتہ الفاظ خوش آیند لہجہ اور دلآویز پیرایہ میں بیان کی جاتی تھی۔ بعض اوقات اس میں بہت وقت صرف ہوتا تھا۔ اور قصہ گو کو قصہ کی دلآویزی پر ملکہ کوئی بیش قیمت چیز انعام میں عطا کرتی تھیں۔ اُن کی سرکار میں چار قصہ گو عورتوں کے رسم تھے۔ جب قصہ گو باریابی پاتی تھی تو ملازمین کی باری بدل دی جاتی تھی اور جب وہ رخصت ہوتی تھی تو پھر نوکروں کی بدلی ہوتی تھی۔

ملکہ کو خود بھی قصہ کہنے کا بہت شوق تھا اور کبھی کبھی اپنے نوکروں اور متوسلین کو سنایا کرتی تھیں اُن کے قصے بعض مذہبی رنگ کے ہوتے تھے مگر قصہ گو عورتیں ہر قسم کے افسانے بیان کرتی تھیں جنمیں بادشاہوں امیرزادیوں کے عشق و محبت فقیروں کے بادشاہ اور شاہوں کے گدا ہو جانے اور پریوں اور راجہ اندر

کے دربار کے حالات وواقعات ہوتے تھے۔

موسم سرما میں جب ملکہ حمام کرتی تھیں تو بڑی تیاریاں ہوتی تھیں۔ ان کے نوکروں کو دن بھر محنت شاقہ برداشت کرنی پڑتی تھی۔ حوضوں میں ٹھنڈا پانی اور آب گرموں میں گرم پانی بھر دیا جاتا تھا۔ سب سامان سویرے سے تیار ہو جاتا تھا۔ حمام والے دن ملکہ اور نہلانے والی عورتیں دن بھر کی مشقت کے لئے تیار ہو جاتی تھیں۔ ملکہ کے نہلانے کے وقت بجائے صابن کے بیسن استعمال ہوتا تھا جیسا کہ اس زمانہ کا عام دستور تھا۔ دو یا تین بہت قدیم خادمائیں جو ملکہ کے ہمراہ کنوار پنے سے رہتی تھیں حمام کراتی تھیں۔ حمام کے وقت ملکہ کے جسم پر کثرت سے بیسن ملا جاتا تھا اور نیم گرم پانی سے دھو ڈالا جاتا تھا۔ ہر حصہ جسم کو بار بار اسی طریقہ سے صاف کیا جاتا تھا جس سے حمامی اور ملکہ دونوں یکساں خستہ ہو جاتے تھے۔ محل خانہ شاہی میں خواجہ سرا بھی موجود تھے بلکہ اس وقت ہر رئیس اعظم کے محل میں حسب رواج زمانہ خواجہ سرا ضرور ہوتے تھے مگر ملکہ ان کو پسند نہ کرتی تھیں۔ ان سے صرف درباروں جلوسوں اور ایسے ہی دوسرے موقعوں پر شان و شوکت بڑھانے کا کام لیا جاتا تھا۔ حمام سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔

زنانہ پہرہ داریاں بھی محلسرا میں موجود تھیں جو ڈیوڑھیوں و زنانہ درجوں کے پردوں میں وردی پہنے اور ہاتھ میں پستول یا قرولی لئے پہرہ پر موجود رہتی تھیں۔ ملکہ ان کو بھی پسند نہ کرتی تھیں و ان کے معاملات میں بہت کم دخل دیتی تھیں۔ پرانے طریقے بدستور جاری تھے۔ مگر ان میں نمائش اور تصنع بہت کم تھا۔ درحقیقت ملکہ تکلف اور نمائش کے اس قدر خلاف تھیں کہ بجز سخت ضرورت کے وہ دردولت کے باہر بہت کم جاتی تھیں۔ ہاتھی، اونٹ، گھوڑوں سوار و پیدل سپاہیوں اور ہر قسم کے پہرہ داروں کا جلوس جو حسب دستور ان کی سواری کے ہمراہ ہوتا تھا ان کے لئے بار خاطر ہوتا تھا۔ ان کو دستکاری نفیس پوشاک اور اعلیٰ درجہ کے جواہرات کا بہت شوق تھا لیکن ضابطہ کی شاہی پوشاک زیب تن کرنے سے وہ گھبراتی تھیں۔ اکثر جلوس والی سواری سے واپس آ کر کوچ پر دراز ہو جاتی تھیں و کہتی تھیں خدا کا شکر ہے کہ اس زحمت سے نجات پائی۔ یہ بڑی ہی تکلیف دہ رسم ہے۔

امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد وہ بحیثیت والدہ بادشاہ وقت حسب دستور دربار "جناب عالیہ" کے خطاب سے ملقب ہوئیں۔ اس سانحۂ دلگداز کے بعد انھوں نے کبھی نتھ نہیں پہنی جو سہاگ کی علامت خیال کی جاتی ہے مگر اپنے دوسرے بیش بہا مرصع زیورات اور شاہانہ شاہی پوشاک حسب موقع استعمال کرتی رہیں اور بیوہ ہو جانے کے بعد بھی ان کی سواری کے ساتھ ویسا ہی جلوس ہوتا تھا جو ان کے شوہر کی حیات میں ہوتا تھا۔ یہ بات نواب خاص محل کو بہت شاق گذرتی تھی کیونکہ فرمانروائے وقت [illegible]

کے محل خاص ہونے کی حیثیت سے وہ اس جلوس کو اپنا حق سمجھتی تھیں۔ ملکہ لمبا سفر ہاتھی پر نقرئی ہودج میں یا اپنی شاہی پالکی میں کیا کرتی تھیں جس کو سُرخ وردی پہنے ہوئے کہار اُٹھایا کرتے تھے۔

ہر محل میں ملاقات کے کئی کمرے ہوتے تھے جن کے بیچ میں عموماً ایک گول میز رکھی رہتی تھی جو کسی کمیاب لکڑی یا سنگ مرمر یا بلور یا چاندی کی بنی ہوتی تھی جس پر ہر قسم کی آرائشی چیزیں مثلاً چینی کے خوشنما ظروف یا طلائی نقرئی اور چمکدار روغنی برتن، گملے، گھڑیاں، وغیرہ رکھی رہتی تھیں۔ یہ اشیا دہلی چین یا یورپ کی بنی ہوتی تھیں۔ میز کے چاروں طرف ولایتی طرز کے کوچے دنگل بھی ہوتے تھے جن پر قیمتی چمکدار اور بوٹیدار سوتی یا ریشمی کپڑے منڈھے ہوتے تھے۔ اسی طرح ہر کمرے میں ایک مسہری قیلولہ کے لئے رہتی تھی جس پر قیمتی پلنگ پوش پڑا رہتا تھا۔ محل سرا میں دو طلائی مسہریاں بھی تھیں جن کو نواب سعادت علی خاں نے بنوایا تھا۔ واجد علی شاہ دونوں کو اپنے ہمراہ کلکتہ لے گئے تھے اور دونوں کے چوکھٹے یکے بعد دیگرے ضرورتاً گلوا ڈالے تھے۔

ایک موقع تو یہ تھا کہ ایک روز ایک شخص خاص قسم کے پرندوں کا ایک جوڑا جو اپنے گھنے پروں کی خوبصورتی اور چال ڈھال کی خوبی کے لئے مشہور تھا، شاہ معزول کی خدمت میں بغرض فروخت لایا، دونوں کے سروں پر ایک کلغی سی تھی جس سے اُن کی خوشنمائی بہت بڑھ گئی تھی۔ اعلیٰ حضرت کو یہ جوڑا بہت پسند آیا، قیمت دریافت کی تو فروشندہ نے پچاس ہزار روپیہ بتلائے۔ بادشہ نے فرمایا خیر پچاس ہزار سہی، اور خزانچی کو طلب کر کے حکم دیا کہ قیمت ادا کر دو لیکن اُس وقت تحویل میں صرف پینتیس ۳۵ ہزار روپیہ نکلے اور اتنی رقم اتفاقی اور غیر معمولی اخراجات کے لئے عموماً محفوظ رکھی جاتی تھی چنانچہ خزانچی نے قبل دوسری تنخواہ کے وصولیابی کے کل رقم ادا کرنے میں پس وپیش کیا، اس پر بادشہ بہت ناراض ہونے لگے۔ لہذا کل رقم بطور جزو قیمت کے ادا کر دی گئی۔ مگر پندرہ ہزار پھر بھی باقی رہے، اور نہ اس وقت نہ اور زر نقد موجود تھا اور نہ بطور قرض دستیاب ہو سکا اسی ضغطہ و مخمصہ میں ایک مسہری کا چوکھٹا توڑ کر گلا دیا گیا۔ اور باقی ماندہ قیمت ادا کر دی گئی۔

ملکہ کے خزانہ کی نگرانی زنانہ پہرہ دارنیاں کرتی تھیں اور اس سے متصل ایک اور کمرہ تھا۔ جس کو تہ خانہ کہتے تھے مگر جیسا کہ اس لفظ کا عام مفہوم ہے یہ درجہ زیر زمین نہ تھا جس میں گرمی کی شدت سے محفوظ رہنے کے لئے دن کو آرام کرتے ہیں بلکہ فاضل کپڑوں اور جواہرات وغیرہ کے رکھنے کی جگہ تھی۔ اس تہ خانہ میں ایک بڑا صندوق روپیوں اور اشرفیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جس کو تشبیہاً کھپری کہتے تھے۔ یہ صندوق امجد علی شاہ کے والد حضرت محمد علی شاہ نے تہ و اکر

وہاں رکھوا دیا تھا تاکہ صرف اشد ضرورت کے وقت اُس سے کام لیا جائے مگر یہ کل رقم واجد علی شاہ کے زمانہ میں صرف ہوگئی۔

واجد علی شاہ نے اپنی ایک شادی زمانۂ بادشاہت نواب علی نقی خاں وزیر اعظم کی صاحبزادی نواب رونق آرا بیگم سے کی تھی جن کو اختر محل کا خطاب دیا تھا۔ اس شادی کے بعد بادشاہ اپنے خسر علی نقی خاں کی بہت خاطر تواضع کرنے لگے اور باوجود ملکہ کی فہمایش اور خلاف دستور قدیم ہونے کے ان کو اکثر دربار میں مسند شاہی پر بٹھا لیتے تھے۔ بادشاہ کی اس عنایت و بے تکلفی سے وزیر اعظم کی بیوی کو بڑا گھمنڈ ہوگیا تھا۔ ایک مرتبہ وہ ملکہ سے ملاقات کرنے وقت مقررہ سے کچھ قبل آگئیں۔ ملکہ بیدار ہوچکی تھیں مگر ان کو اپنی شان اور دبدبہ کا بڑا خیال تھا اور کسی کی مجال نہ تھی جو اس معاملہ میں خلل انداز ہوسکتا۔ اس لئے اُنھوں نے کہلا بھیجا ابھی ملاقات کا وقت نہیں آیا ہے تھوڑی دیر توقف کیجئے۔ بیگم صاحب کو یہ بات بہت ناگوار گذری اور برافروختہ ہوکر بآواز بلند کہنے لگیں کیا میں ملکہ کی ماں نہیں ہوں کیا میری بیٹی بادشاہ کو نہیں بیاہی ہے جو اس طرح کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کے اور کئی جملے ادا کئے۔ مگر ملازمین نے جواب دیا اس میں ہم لوگوں کا کیا قصور ہے ہم لوگ تو ملکہ صاحبہ کے تابع فرمان ہیں، ہم لوگوں سے شکایت بیکار ہے۔ چنانچہ وقت مقررہ پر بیگم صاحب کو شرف ملاقات حاصل ہوا۔ ملکہ نے بہت اعزاز و احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا معمولی مراسم ادا ہونے کے بعد بیگم صاحب نے ملکہ سے اُن کے ملازمین کی شکایت کی۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے ہی اُن کو ایسا حکم دیا تھا اُن کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے اور یہ بھی فرمایا کہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ آپ نے ادنیٰ ملازموں سے زبان لڑانا پسند کیا۔ اس پر بیگم صاحبہ نے مناسب الفاظ میں معذرت نہیں کی بلکہ بلا اجازت حاصل کئے تیہے میں اُٹھ کر چلی گئیں۔ اُسی روز سہ پہر کو ملکہ نے بادشاہ سے اس واقعہ کا ذکر کرکے فرمایا کہ جب تک بیگم صاحب اپنی کج خلقی کی معذرت نہ کریں گی میں آیندہ اُن سے ہرگز نہ ملونگی۔ بادشاہ نے نائب السلطنت کو طلب کرکے کل ماجرا بیان کیا جس پر دوسرے ہی روز بیگم صاحب ملکہ کے دربار میں حاضر ہوکر معافی کی خواستگار ہوئیں۔

علاوہ دیگر خوبیوں کے وہ نہایت ہی نیک سرشت اور عالی دماغ خاتون تھیں۔ سلطنت میں اُن کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔ ریزیڈنٹ اور اراکین سلطنت بوجہ اُن کی نیک نفسی، دوراندیشی اور معاملہ فہمی کے ان کو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ کبھی کبھی بادشاہ کو فہمایش بھی کرتی تھیں مگر بسبب کی بزرگی، تجربہ کاری و تدبر کے وہ ان کا بہت لحاظ اور ادب کرتے تھے، کبھی کسی بات کا جواب نہ دیتے تھے۔

ضبطی سلطنت سے قبل ریزیڈنٹ نے ایک کونسل آف ایجنسی یعنی مجلس نظامت قائم کرنیکی تجویز

پیش کی تھی اس میں والدہ محترمہ بادشاہ سلامت کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے کہ وہ نہایت ہی ہوشمند اور بیدار مغز خاتون ہیں۔ اور اصلیت بھی یہ ہے کہ بعد الحاق اودھ انھوں نے انگلستان جانے کا جو عزم بالجزم کیا اور باوجود ضعیف العمری کے جس استقلال اور تندہی سے انھوں نے سات سمندر پار جاکر بحالی سلطنت کی جان توڑ کوشش کی وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ ریزیڈنٹ نے اُن کی فہم و فراست کا جو اندازہ کیا تھا وہ سر مُو غلط نہ تھا۔

قبل ضبطی سلطنت ایک عہد نامہ بھی منجانب سرکار انگلشیہ فرمانروائے اودھ واجد علی شاہ کی منظوری کے لئے پیش کیا گیا تھا جس کی رو سے ملکی و فوجی اختیارات قطعی طور پر برٹش گورنمنٹ کے ہاتھوں میں چلے جاتے مگر بادشاہ کا خطاب شاہ اودھ قائم رہتا۔ اس میں یہ بھی مذکور تھا کہ بادشاہ کا مناسب اعزاز و احترام کیا جائے گا۔ اور قصر سلطانی، دلکشا اور بیبیا پور کی املاک میں سوائے سزائے موت صادر کرنے کے ان کو کل اختیارات رہیں گے۔ بارہ لاکھ روپیہ سالانہ بطور گزارہ ملے گا اور اُن کے یک جدی قرابت داروں کو بسر اوقات کے لئے وثیقہ علیحدہ سے ملیگا۔ جنرل اؤٹرم ریزیڈنٹ نے ۳۰ جنوری ۱۸۵۶ء کو گورنمنٹ کا منشا نائب السلطنت نواب علی نقی خاں پر ظاہر کردیا۔ یہ خبر وحشت اثر سنکر وہ بہت حیرت زدہ اور سراسیمہ ہوئے اور شاہان گذشتہ اور حکمران موجودہ کے طرز حکومت میں مقابلہ و موازنہ کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اب ہر صیغہ میں اصلاحات ہوگئی ہیں۔ مگر ریزیڈنٹ نے انھیں باور کرایا کہ فوج کا داخلہ ایک ضروری امر ہے اور گورنمنٹ کا منشا پورا ہوکے رہیگا۔

دوسرے روز حسب قرارداد وزیر اعظم نے ریزیڈنٹ سے پھر ملاقات کی اور مسودہ عہد نامہ اور اعلان ضبطی سلطنت پڑھنے کے بعد کہا کہ بادشاہ نے میری معرفت کہلا بھیجا ہے کہ مجھے سرکار انگلشیہ کا خادم تصور کیجئے میں نے اس کے ہر فرمان کی تعمیل کے لئے بسر و چشم حاضر ہوں۔ اس پر ریزیڈنٹ نے جواب دیا کہ بادشاہ سلامت کو اختیار ہے کہ انگلستان جاکر اس بارہ میں اپنے موافق فیصلہ کرانے کی کوشش کریں مگر جو احکامات صادر ہو چکے ہیں وہ قطعی اور لابدی ہیں، ان میں کوئی ترمیم اور تنسیخ محال ہے۔ پھر وزیر اعظم سے مخاطب ہوکر کہا کہ آپ اعلیٰ حضرت سے کوئی دن مقرر کرائیے تاکہ اُس روز عہد نامہ لیکر میں اُن کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔ یکم فروری ۱۸۵۶ء کو بادشاہ نے ریزیڈنٹ کو ایک درد انگیز خط اس مضمون کا تحریر کیا کہ میں نے کبھی دیدہ و دانستہ کوئی فعل ایسا نہیں کیا جو سرکار انگلشیہ کی برہمی کا باعث ہوتا۔ برخلاف اس کے سرکار کے ادنیٰ سے ادنیٰ خادم کو بھی خوش کرنے کی سرامکانی کوشش کی گئی اور جو ہدایات منجانب سرکار موصول ہوئیں ان پر پورے طور سے عملدرآمد کیا گیا۔ مثلاً لارڈ ہارڈنگ کی فہمائش کے بعد پورے ملک میں جو نیا

نظام حکومت جاری کیا گیا وہ روزِ روشن کی طرح سب پر عیاں ہے چٹھی کے آخر میں نہایت عاجزانہ طریقہ سے ریزیڈنٹ سے یہ بھی التجا کی گئی تھی کہ وہ گورنر جنرل کو سمجھا بجھا کر جدید طرزِ عمل اختیار کرنے سے باز رکھیں۔

اسی روز جناب عالیہ کی طلبی پر ریزیڈنٹ نے زرد کوٹھی میں اُن سے اس امید پر ملاقات کی کہ وہ نہایت فہمیدہ خاتون ہیں غالباً وہ بادشاہ کو مجوزہ شرائط کے منظور کرنے پر رضامند کر دیں گی بروقت داخلہ صحن دولت سرا میں مجمع کثیر تھا مگر سب لوگ حسب سابق بہت ادب اور اخلاق سے پیش آئے۔ جناب عالیہ بھی بادشاہ کے خط کی طرح منت سماجت کرنے لگیں اور کہا آخر یہ بتائیے بادشاہ نے کیا خطا کی ہے جو سرکار اس قدر ناراض ہے اور خاتمۂ گفتگو پر زور دیکر التجا کی کہ سرکار تھوڑی مہلت عطا کرے تاکہ اس درمیان میں پورے طور پر اصلاحات عمل میں لائی جائیں اور سرکار کو بھی معلوم ہو جائے کہ بادشاہ کو ہمارے مشورہ پر عمل کرنے کا کتنا خیال ہے۔ مگر صاحب موصوف نے رکھے پن سے انکار کر دیا اور ملکہ کو یقین دلایا کہ اگر بادشاہ شرائط عہد نامہ منظور نہ کریں گے تو جو مراعات اُن کے ساتھ کئے گئے ہیں اُن سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

۱۲- فروری ۱۸۵۶ء کو سلطنتِ اودھ ضبط ہو کر مقبوضات سرکار میں شامل کر دی گئی۔ اس کا ملکہ کو بڑا قلق ہوا اور انھوں نے فرمایا میں انگلستان جاؤنگی۔ وہاں کی ملکہ بھی صاحب اولاد ہیں میں اُن سے ملکِ سلطنت کی واپسی کی التجا کرونگی۔ یہ سنتے ہی ملازمین اور متوسلین میں سینہ زنی ہونے لگی اور کہرام مچ گیا۔ ملازمین نے عرض کیا سرکار کو تو دریا سے بھی خوف معلوم ہوتا ہے بڑے بڑے سمندروں کو حضور کیسے پار کریں گی مگر ملکہ مصمم ارادہ کر چکی تھیں اور فرمانے لگیں جو کچھ ہو میں جاؤنگی ضرور، اور اُن کے ایما سے بہار النسا اُن کی مصاحب خاص سفر کی تیاری کرنے لگیں جب سامانِ سفر لیس ہو گیا تو ملکہ چند ملازمین خاص کو ہمراہ لیکر اپنے بیٹے شاہ معزول کے پاس کلکتہ روانہ ہو گئیں، باقی عملہ کو یا جواب دیدیا یا پنشن دیدی گئی۔

ملکہ اور نواب خاص محل میں بعض وجوہات سے رنجش تھی۔ کلکتہ پہونچکر ملکہ نے خیال کیا کہ زندگی حباب کی طرح ناپائدار ہے۔ اس کا کوئی اعتبار اور بھروسہ نہیں ہو سکتا اس پر تنہا بحری سفر درپیش ہے، اگر انگلستان جانے سے قبل صفائی ہو جائے تو بہت بہتر ہے۔ اسی خیال سے وہ ایک روز نواب خاص محل کے کمرہ میں اچانک چلی گئیں۔ خاص محل نے اُن کو آتے ہوئے دیکھ لیا اور جلدی سے اُٹھکر کمرہ کے باہر چلی گئیں۔ ملکہ نے بہار النسا سے مخاطب ہو کر کہا دیکھو میں بزرگ ہو کر تو اُن کو منانے آئی ہوں اور وہ مجھ سے اغماض کرتی ہیں۔ انھوں نے میری توہین اور رسوائی میں کوئی کسر

اٹھا نہیں رکھی۔ میں نے تو کبھی ان کو کوئی تکلیف پہونچائی نہ ملال کا موقع دیا۔ یہ سنکر بہار النسا فوراً خاص محل کے ملازمین کے پاس گئیں اور اپنی بہن ملکہ رشک عالم سے بھی سفارش کرائی اور جیسے ہی ملکہ واپس آنے کو مڑی تھیں کہ خاص محل کمرہ میں آکر ان کے گلے سے چمٹ گئیں اور ساس بہو میں میل ہو گیا۔

ابتدا میں بادشہ نے خود ولایت جانے کا عزم کیا تھا مگر ان کو ایک ایسا مرض لاحق ہو گیا کہ طبیبوں نے بحری سفر اختیار کرنے سے منع کر دیا۔ ملکہ اس وقت بھی اپنے ارادہ پر قائم رہیں اور ۱۰۔ جون ۱۸۵۶ء کو وہ مع مرزا سکندر حشمت جرنیل صاحب وولی عہد پرنس حامد علی و مولوی مسیح الدین کا کوروی مختار عام شاہ معزول و بہار النسا وغیرہ انگلستان روانہ ہو گئیں۔ جب ملکہ جہاز پر سوار ہو کر رخصت ہونے لگیں تو یہ سوچکر کہ پھر جیتے جی ملاقات ہو یا نہ ہو وہ اپنے بیٹے شاہ معزول اور ان کے بچوں سے ملکر بہت ہی زار و قطار روئیں۔ کل ایک سو دس آدمی اس شاہی قافلہ میں تھے۔ پانچسو صندوق اسباب کے ہمراہ تھے۔ بدقسمتی سے بمقام سویز آدمی کی بغل سے وہ خاصدان سمندر میں گر پڑا جس میں بلسٹھ عدد جواہر بیش بہا جناب عالیہ کے تھے۔ غوطہ خوروں نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ ۲۰۔ اگست ۱۸۵۶ء کو یہ قافلہ لندن میں داخل ہوا۔ کپتان برڈ (Captain Bird) جو زمانہ حکومت واحد علی شاہ میں اسسٹنٹ ریزیڈنٹ تھے وہ الحاق اودھ کے مخالف ہونے کی وجہ سے اب جناب عالیہ کی طرف سے بحیثیت ان کے سکریٹری کے بحالی مملکت کے لئے پیروی کرتے تھے۔ جناب عالیہ کی ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات بھی ہوئی جو بہت امید افزا تھی مگر شومی قسمت کہ اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ میں غدر و ہنگامہ برپا ہو گیا جس سے انگلستان کی مخلوق کو اس قافلہ سے پرخاش سی ہو گئی کہ یہ سب فتنہ و فساد انھیں لوگوں کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ یہ رنگ دیکھکر آفتوں کی ماری اور فلک کی ستائی ملکہ مع اعزہ و ملازمین ملک فرانس کے دار السلطنت شہر پیرس میں چلی گئیں جہاں شکستہ خاطر ہو کر وہ کچھ دنوں کے بعد بیمار پڑیں اور بصد حسرت و یاس اپنے لواحقین اور ہموطنوں سے دور عالم غربت میں دنیا سے سدھار گئیں اور وہیں ان کی لاش سپرد خاک کی گئی۔ ان کی رحلت کے چند یوم کے بعد مرزا سکندر حشمت نے بھی انتقال کیا۔ سلطنت فرانس کی طرف سے ان کا جنازہ فوجی اعزاز کے ساتھ اٹھایا گیا۔ ان کے بعد ان کی خورد سال لڑکی رافت آرا بیگم نے بھی انتقال کیا اور دونوں سرزمین فرانس میں دفن کئے گئے۔ بہار النسا مکہ معظمہ زیارت کے لئے چلی گئیں، اور قافلہ کے باقی ماندہ لوگ ناشاد و نامراد ہندوستان واپس چلے آئے۔

واجد علی شاہ کو ماں بھائی اور بھتیجی کا آگے پیچھے دُور دراز ملک میں ہمیشہ کے لئے بچھڑنے
کا جو صدمہ عظیم ہوا اُس کا اندازہ کرنا مشکل ہے گویا جیسے سر پر آرا چل گیا۔
بادشاہ بیگم صاحب محل خاص شاہ زمن غازی الدین حیدر نے شہزادہ مُنّا جان کی حمایت
ہیں شاہ نصیر الدین حیدر کے دانت کھٹے کردیے تھے۔ مجادلہ اور مقاتلہ تک کی نوبت آگئی تھی
ر ہمت نہ ہاریں۔ لیکن حق یہ ہے کہ جیسا مردانہ وار مقابلہ مصیبتوں کے سیلاب کا ملکہ کشور نے کیا
ر کبر سنی میں جس استقلال اور ثابت قدمی سے بادِ حوادث کے جھونکوں کو آخر وقت تک برداشت
تی رہیں وہ انھیں کا حصہ تھا۔
ملکہ کے نام کا ایک محلہ کشور گنج وارڈ سعادت گنج لکھنؤ میں اکبری منڈی سے متصل آباد تھا
ب وہ بھی ٹوٹے ہوئے دل کی طرح بالکل اُجڑا ہوا سنسان پڑا ہے۔ مگر ایک نہایت خوبصورت
ید کشمیری محلہ وارڈ سعادت گنج لکھنؤ میں اُن کی یاد تازہ کرنے کو اب تک موجود ہے۔ ایک مرتبہ
، زور شور کی آندھی آئی تھی کہ اس کے دونوں مینار گر پڑے تھے مگر گنبد اب تک قائم ہیں۔

اقوالِ زرّیں

زندگی کی امیدوں کا انحصار محنت پر ہے۔ جو کاریگر اپنا کام مکمل کرنا چاہتا ہے اس کو سب سے پہلے
اپنے ہتھیار تیز کرنا چاہیئے (کنفیوشس)

یہ حد درجہ کی بیہودگی ہے کہ کسی شخص سے محض اس لئے حسد کیا جائے کہ اس کے ہمسایوں کے
پاس اس سے زیادہ دولت ہے (ڈیوک آف آرگائل)

بیدِ مجنوں اگر لرزنے سے ہٹ جائے تو ممکن ہے کہ عشق میں استقامت پیدا ہو سکے۔ (کیمبل)

کسی شخص کی حالت کو بہتر بنانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اسے ویسا ہونے کا یقین دلایا جائے جیسا
کہ وہ فی الحقیقت نہیں ہے

قوائے جسمانی و نفسیاتی کا نشوونما

از مسٹر جے۔ آر۔ رائے صاحب جرنلسٹ لاہور

انسان کے جسم کی مختلف جسمانی، اخلاقی اور عقلی قوتوں کے نشوونما کا جو خیال عرصہ سے ڈاکٹری کے ماہروں کے ذہن نشین ہے اُس میں تحقیقات جدید نے حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ علم طب کے کہنہ سال اور مسلمہ مسلّمات کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ مثلاً جدید علم غدود سے ثابت ہوا ہے کہ ہمارے جسم کے اندر بے نالی کے چھ غدود ہیں جو مختلف ناموں سے مشہور ہیں۔ ان کے اندر سے ایک خاص عرق نکلتا ہے جسے اصطلاح میں ہارمون کہتے ہیں۔ اس عجیب و غریب عرق کے طلسمی اثر سے ہمارے جسمانی اور نفسیاتی قویٰ نشوونما پاتے ہیں۔

امریکہ کے نہایت مشہور ڈاکٹر ایل۔ برمن جو اس علم کے سب سے بڑے مسلمہ اُستاد سمجھے جاتے ہیں اس مضمون میں ہم ان کی معرکۃ الآرا کتاب کی معلومات ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔

ہمارے بدن کے اندر دو قسم کے غدود ہیں، ایک تو نالی دار ہیں۔ جیسے منہ کے غدود۔ جبڑے کے نیچے کے غدود۔ آنسوؤں کے غدود۔ وغیرہ۔ ان سے رطوبتیں خارج ہو کر نالیوں کے ذریعہ سے باہر نکلتی اور مختلف اعضائے جسم کے افعال کے لئے تحریک کا باعث ہوتی ہیں۔ مثلاً لبلبہ کی رطوبت معدے میں جا کر روغنی اجزائے غذا کی تحلیل میں کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ جگر سے صفرا نالیوں کے وسیلہ سے معدے میں جا کر عمل انہضام کو تقویت دیتی ہے۔ لعاب دہن جو منہ کی گلٹیوں سے خارج ہوتا ہے کھانے کے ہاضمہ میں بہت نفع بخش ثابت ہوتا ہے۔ یہ تمام غدود نالیدار گلٹیاں کہلاتی ہیں غدود خلیات کے مرکب ہیں، جن سے بافتیں اور اعضا بنتے ہیں۔ ہر ایک گلٹی بجائے خود ایک مختصر سا کارخانہ ہوتا ہے۔ جس کی رطوبت توانائی اور بقائے حیات کے کام آتی ہے جو گلٹی کی خلیات کی نقل و حرکت سے برآمد تی ہے۔ غدۂ عرقیہ (پسینہ کی گلٹی) سے پسینہ نکلتا ہے۔

غدود کی دوسری قسم بغیر نالی کے ہے۔ ان کے اندر رطوبت پیدا ہوتی ہے۔ جو جوہر غدۂ (ہارمون) کہلاتی ہے۔ مگر وہ نالی کی عدم موجودگی میں باہر نہیں نکل سکتی بلکہ جب خون دورہ کرتا ہوا ان غدود

کے اندر پہونچتا ہے۔ تو جوہر غدہ اس کے ساتھ مخلوط ہوتا ہے۔ جس کے اثر سے حیرت انگیز نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ اسی جوہر کی کرامت سے دیو قد اور بونے۔ فاتر العقل، اور اعلیٰ درجہ کے ذہین، دبلے پتلے اور موٹے۔ کریہہ صورت اور حسین۔ رنگ روپ اور دیگر تمام خواص جسمانی اور اختلاف ظاہری رونما ہوتے ہیں۔ نفسیاتی خصائل بھی اسی جوہر کے اثر سے ظہور میں آتے ہیں۔ صغرسنی میں لڑکے لڑکیاں جوان مردوں اور عورتوں کے جو خواص طبعی نمایاں کرتی ہیں۔ اس کا محرک اولی بھی یہی جوہر ہوتا ہے۔

دو غدود دماغ کے اندر ہوتے ہیں جو غدود نخاعیہ کہلاتے۔ دو گلے کے نچلے حصے میں ہوتے ہیں جو غدود ورقیہ کے نام سے مشہور ہیں کیونکہ ڈھال کی شکل کے ہیں۔ دو غدود گردوں کی ٹوپیوں پر ہوتے ہیں، اور دو اعضائے نسل میں واقع ہوتے ہیں۔ بدمعاش اور بدچلن آدمی بھی ان ہی غدود کے اثر کے سبب سے بنتے ہیں۔ نصف صدی کی جامع تحقیقات سے ان غدودوں کے افعال فطری بالکل واضح ہو گئے ہیں۔ ان کا جوہر خون میں شیر و شکر ہو کر تمام اعضا کی چستی اور تقویت کا محرک ہوتا ہے۔

اگر ماہروں کا نظریہ صحیح ہے تو تمام کرشمہ ہائے جسمانی۔ نفسیاتی۔ اخلاقی و عقلی کا مبدا اور محرک اصلی یہی مادہ ہے۔ چنانچہ امریکہ کا نامی ماہر بارکر جو غدود کی تحقیقاتی انجمن کا پریسیڈنٹ ہے کہتا ہے کہ

"اب یہ امر واضح ہے کہ انسان کے جسم کی ظاہری ہیئت بڑی حد تک بے نالی کے غدود کے فعل سے رونما ہوتی ہے۔ جس کے افعال کا چھوٹی عمر میں بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ ہمارا قد اور چہرہ۔ بازوؤں اور ٹانگوں کی لمبائی، کولھے کی ہڈی کی موٹائی اور وضع۔ جلد کے نیچے چربی کی مقدار اور اجتماع، عضلات کی چستی اور توانائی۔ آواز اور نرخرہ کا گہراؤ، اور جذبات کا ظاہری اظہار بذریعہ اعضائے خاص۔ جوہر غدود پر موقوف ہے۔ اس کے مقدار کے تناسب سے مختلف نتائج مرتب ہوتے ہیں۔"

پروفیسر برمن اس سے بھی سبقت لے گئے ہیں، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:۔

نصف صدی کی جامع اور مسلسل تحقیقات سے یہ خوب ظاہر ہو چکا ہے کہ انسان کی طبعی اور غیر طبعی زندگی پر بے نالی کے غدود کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کی نفسیاتی کیفیت بھی اسی پر رونما ہوتی ہے۔ اشخاص کی تقسیم اسی کے اثر کے مطابق کی گئی ہے۔ خاندان اور افراد ہی پر کیا موقوف ہے بلکہ قوموں اور نسلوں کی جداگانہ خصوصیات اور ظاہری اختلافات ان ہی کے اثر سے مرتب

ہوتے ہیں۔ جوہر محرکہ کے اثر سے موروثی قوی کا تعین ہوتا ہے۔ جسمانی نمو اور عقلی ترقی بھی اسی کے اشارے سے رونما ہوتی ہے۔ وہ بھی اسی کے حسب ایما ظہور میں آتے ہیں۔ زندگی کے تینوں چکروں کے اعمال حیات پر بھی یہی حاوی ہے۔ اگر جوہر محرکہ کی مقدار میں کچھ فرق آجائے، تو توازن بدن تہ وبالا ہو جاتا ہے۔ اور کئی قسم کی شکایات عارض ہو جاتی ہیں۔ من اور جسم دونوں بہت گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ قصہ کوتاہ فطرت انسانی اسی کی محکوم ہے اور جیسے ان غدود پر قابو ہو وہ فطرت انسانی کا مالک ہے۔ پچاس سال کی تحقیقات سے یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا ہے جس کا علم ہر کس وناکس کو ہونا چاہیئے۔ ہر ایک بات سے جو ظاہر ہوئی ہے یہ ثابت ہے کہ غدود کا جوہر ہماری ہستی کے راز سربستہ پر حکمران ہے، یہ زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اس کی حقیقت کا سراغ لگانا نہ صرف ترکیب جسم کا انکشاف ہے۔ بلکہ ہماری روح کی کیمیا بھی اسی سے عیاں ہوگی۔ انسان کے بدن کے اندر جتنے عمل ہوتے ہیں وہ خلیات کے وسیلہ سے ظہور میں آتے ہیں۔ ان کے اندر جو جوہر بنتے ہیں وہ دیگر خلیات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جس کے باعث زندگی کے گوناگوں عمل ظہور میں آتے ہیں زندگی جسم اور روح اسی کارخانہ میں تیار ہوتی ہے جس کے اندر شور وغل سنائی نہیں دیتا۔ ہر قسم کے حقائق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان غدود کے افعال کا مخلوق ہے۔ ڈاروین، ہکسلے اور اسپنسر جنھوں نے انسان کی اصلیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس راز سے سراسر ناآشنا تھے۔"

نامناسب نہ ہوگا اگر اس انقلاب خیز انکشاف کی سرگزشت بیان کی جائے۔ بواڈ وا اٹھارھویں صدی میں پیرس میں ڈاکٹر تھا جسے خدا نے عجیب وغریب ذکاوت عطا کی تھی، چنانچہ وہ دربار شاہی میں معالج مقرر ہو گیا۔ اس وجہ سے رؤسا اور اہل زر اس کے پاس آیا کرتے تھے مگر اسے تحقیقات کا بھی شوق تھا۔ خوردبین تیار ہو چکی تھی، اس وجہ سے اس نے خون کا مشاہدہ کر کے ۱۷۸۲ء میں نتائج شائع کئے۔ اس نے ہیجڑوں اور اسی قسم کے آدمیوں اور عورتوں کے حالات کی بھی چھان بین کی۔ اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ غدود اعضائے تناسل کی رطوبت کا مرد وعورت کی مردانہ یا نسوانی قوت اور طبیعت پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کی تحقیقات سے بے نالی کے غدود کی رطوبتوں کے انکشاف کا آغاز ہوا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ماہروں نے یہ ثابت کیا کہ اعضا اور بافتیں خلیات کے مرکبات ہیں گویا ہستی کی اکائی خلیہ قرار دیا گیا تھا۔ بے نالی کے غدود کی رطوبتوں کے اخراج کا مسئلہ انیسویں صدی کے پہلے ربع میں طے ہو گیا تھا مگر جسم کی نمو میں ان رطوبتوں کا کیا فائدہ ہے اس کا اس وقت کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ تشریحات کے نامی استاد ہنلے کا یہ خیال تھا کہ ان کا اثر جسم پر خاک بھی نہیں ہوتا

نے ثابت کر دیا۔ کہ جگر سے جو خون دل کو آتا ہے اُس کے اندر چینی زیادہ ہوتی ہے۔ اس دریافت سے پرانے خیالات تہ و بالا ہو گئے۔ جو ہر باطن سے جگر کے اندر کے نشاستہ حیوانی کی چینی علٰحدہ ہو جاتی ہے۔ ادھر انگریز ماہر اڈیسن نے بھی کلاہ گردہ کے غدود کی بیماری کے نتائج کی تحقیقات شائع کر دی جس سے جلد کی رنگت بدل جاتی ہے۔ اور یہ تانبے کے مانند دکھائی دیتی ہے۔ امریکہ میں براؤن سیکرڈ نے اپنی جداگانہ تحقیقات سے غدود کی باطنی رطوبتوں کا مسئلہ حل کر دیا۔ اس لئے کئی جانوروں کے گردے کے غدود علٰحدہ کر دیئے تو وہ چوبیس یا اٹھتا نیس گھنٹے میں بہت کمزور ہو گئے اور پھر جلد مر گئے۔ جب ایک کاٹا گیا تو بڑا فرق عیاں نہ ہوا مگر جب دوسرا کاٹا گیا تو وہ فی الفور مر گیا۔ مگر جب دوسرے جانور کا خون اس جانور کے اندر داخل کیا گیا جس کے گردے کے غدود کاٹ دیئے گئے تھے تو وہ کچھ دیر تک زندہ رہا جس سے ثابت ہوا کہ کلاہ گردے کے غدود سے کوئی ایسی چیز خارج ہوتی ہے۔ جو زندگی کے لئے ضروری ہے۔

جرمن ماہر شیف نے کتوں کے غدود درقیہ پر تجربے کیئے جن کے کاٹنے سے وہ جلد ہی مر گئے۔ کئی ڈاکٹروں نے گھینگھے کی بیماری کے ساتھ خاص علامات ملاحظہ کئے جیسے دل کا بڑھنا اور اختلاج قلب لاحق ہونا۔ آنکھیں باہر کو ابھر آنا۔ اضطراب اور بے چینی عارض ہونا۔ سنہ ۱۸۵۰ء میں انگریز ڈاکٹر کرلنگ نے فاترالعقل آدمیوں کے حالات سے جو سل سوس نے صدہا سال پہلے لکھے تھے یہ معلوم کیا کہ ان لوگوں کا غدود درقیہ نہیں ہوتا۔ پھر ہڈیوں کی بیماری اور جلد موٹی بھدی ہو جانے کی بیماری کی تحقیقات ہوئی۔ تجربے کئے گئے۔ آخر کار یہ غدود درقیہ کے فعل کے نقص کے نتائج ثابت ہوئے دو انگریز ماہروں نے غدود کے جوہر ثابت کر دیئے جس سے غدود کے علم کی تکمیل ہو گئی۔ اب مناسب ہے کہ غدود کے افعال فطری کا کچھ حال لکھا جائے۔

غدود درقیہ ہوا کی نالی کے اوپر حنجرہ کے پاس دو رنگدار لوتھڑوں کا مرکب ہوتا ہے جو ایک نالی کے ذریعہ سے آپس میں پیوست رہتے ہیں۔ گھینگھے کے سبب سے اس غدود کی طرف ڈاکٹری ماہروں کا خیال عرصہ دراز سے رجوع چلا آتا ہے۔ اس کی بابت پہلے سے یہ خیال ہے کہ یہ نر اور مادہ کے اعضائے نسل سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ ادنیٰ ترین ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کی حالت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا واسطہ اعضائے نسل کی نالیوں سے ہے۔ بلکہ اسے معاون اور ضمیمہ سمجھنا چاہیئے۔ اگر بڑے بڑے جانوروں کی حالت دیکھی جائے جن کے اجسام مکمل اور نہایت پیچیدہ ہیں تو یہ تدریج بڑا دکھائی دیتا ہے اور دماغ سے اسکا خاص لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔ جب نفسانی جذبہ اشتعال پذیر ہوتا ہے یا عورتوں کے ایام ماہواری شروع ہوں۔ یا اگر حاملہ عورتوں کے دیکھا جائے تو غدود پھولا ہوا ظاہر ہوتا ہے جیسے کہ

خلق اعضائے نسل سے ثابت ہے۔ باعتبار وزن دودھ دینے والے جانوروں میں سب سے زیادہ اور
مچھلیوں میں ہلکا ہوتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی والے جانداروں کے درمیان بتدریج بڑھتا جاتا ہے۔ اس سے
دسے جو جوہر محرکہ برآمد ہوتا ہے۔ اس کا اثر جلد اور جلد کے بالوں پر ہوتا ہے۔ جلد کی نمی اور رطوبت
ی اسی کے اثر سے نکلتی ہے۔ ہڈیوں کی نمو اور حجم بھی اسی کے تابع ہے۔ بالخصوص ہاتھ اور پاؤں اور چہرے
، ہڈیوں پر اس کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ کھوپڑی کا حجم بھی اسی کے زیر اثر رہتا ہے۔ ذہانت اور دماغ کے اندر کی
بوٹی بلندیوں (تلافیف) کی پیچیدگی بھی اسی جوہر محرکہ کا کرشمہ ہے۔ اگر غدود درقیہ کو ضرب شدید لگے
باندار کا جسم بڑھنے سے رک جاتا ہے۔ جلد، ڈھانچہ اور دماغ پر سخت برا اثر پڑتا ہے۔ ماہروں نے تجربوں سے
ت کر دیا ہے کہ جانوروں کی صورت اسی غدود کے وسیلہ سے تبدیل ہو سکتی ہے۔ پس غدود کاٹ دیا یا اس میں
ترمیم کردی۔ یا جوہر درقیہ کو دوسری چیزوں میں مخلوط کر کے جب اور جانداروں کو کھلایا جائے۔ تو ان کے قد
صورت میں نمایاں فرق ہو جاتا ہے۔ خوردبین سے دیکھنے سے غدود درقیہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اسفنج
کے اندر نہایت باریک بلبلے پائے جاتے ہیں۔ اس کے اندر آئیوڈین ہوتا ہے جس سے جوہر کی مقدار
خاص اثر ہوتا ہے۔ زندگی کے اعمال کی تیزی اور سستی اسی جوہر پر موقوف ہے۔ اگر اس کی مقدار زیادہ
، تو غذا کے جلد ہضم ہو کر جذب جسم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آکسیجن بھی بہت خرچ ہوتی ہے۔ اس سے قوت
انی بہم پہونچتی ہے جو حرارت یا کام کرنے میں کام آتی ہے۔ چلنے پھرنے میں چستی، بھاگنے دوڑنے
تیزی اسی طاقت کا ظہور ہے۔ غذا کے انہضام اور کاربالک ایسڈ گیس کے اخراج سے اندازہ ہو جاتا
لہ قوت مغیرہ کس رفتار سے کام کرتی ہے۔ اور اسی سے حرارت کی اکائیوں کا حساب ہو سکتا ہے۔ اگر ایک جاندار کے
جوہر درقیہ آج کھلائے تو قوت انجذاب میں خاصی تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ غدود درقیہ کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اسکے جوہر سے خون کے اندر
ین کی فطری مقدار قائم رہتی ہے۔ جو چیزیں ہم کھاتے ہیں ان میں آئیوڈین نہیں ہوتی۔ صحت کے لئے اس چیز کا ہونا ضروری
اگر اس میں کمی ہو جائے تو گھیگھے کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ جگر کے افعال بہت گوناگوں ہیں ان کے
ئیوڈین لازم ہے۔ جوہر درقیہ بافتوں کے اندر جمع رہتا ہے۔ مگر سخت محنت کے کام کے بعد اس کی
میں فرق آجاتا ہے۔ مصنوعی جوہر درقیہ کا خاص بیماریوں پر تجربہ کیا گیا ہے جس سے تسلی بخش نتائج مرتب
ئے ہیں۔ جب غدود درقیہ کا فطری فعل بگڑ جاتا ہے اور اس سے جوہر محرکہ تھوڑا نکلتا ہے یا بند ہو جاتا ہے
تر انعقل پیدا ہوتے ہیں۔ جو ہضم میں دیکھنے میں آتے ہیں اور اس کی علامات لڑکپن ہی میں دیکھنے میں آتی
ہڈیاں بڑھنے سے رک جاتی ہیں سینہ باہر نکل جاتا ہے اور ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اعضائے نسل بیکار ہو جاتے
مرغی کے انڈے چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ یہ نقصان جانوروں میں غدود درقیہ نکال ڈالنے کے بعد رونما

ہوتے ہیں۔ انسانات کی کیفیت یہ ہے کہ غدود درقیہ کے بگڑ جانے کے بعد وہ فاتر العقل، غلیظ اور بھدے ہوجاتے ہیں۔ جلد کھردری اور بھدی ہوجاتی ہے اس پر سے چھلکے اترنے لگتے ہیں۔ جسم پر بڈھوں کی طرح جھریاں پڑجاتی ہیں۔ جلد پر سوزش نمودار ہوجاتی ہے اور سخت معلوم ہوتی ہے۔ بالوں کی چمک جاتی رہتی ہے۔ اور وہ بہت برے معلوم ہونے لگتے ہیں اور جھڑ جاتے ہیں۔ بدن کی گرمی گھٹ جاتی ہے اور جسم میں خون کی کمی کے علامات نمایاں ہوجاتے ہیں، قوت مزاحمت گھٹ جاتی ہے۔ ننھے بچوں میں بھی غدود درقیہ کے نقص یا عدم موجودگی کے سبب سے کئی علامتیں عیاں ہوجاتی ہیں۔ گو تیس چالیس سال پہلے اس قسم کی بیماریوں کا علاج محال تھا مگر اب جوہر درقیہ کے مرکب تیار ہوگئے ہیں جن کے کھانے سے بیماری رفع ہوجاتی ہے، بشرطیکہ جلد علاج کیا جائے۔ اس جوہر کی کمی سے جلد، بال، ہڈیاں، عضلات، چربی، دماغ۔ ذکاوت، نشوونما پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ قوت ادراکیہ، علم و ہنر کا اکتساب، عادات بننا، آڑے موقعہ پر اوسان قائم رہنا اور ان سے مناسب کام لینا۔ قوا طبعیہ کی نمو، قوت مردانہ کا ظہور وغیرہ وغیرہ سبھی غدود درقیہ کے حاجتمند ہیں۔ جتنے فوائد غدود درقیہ کے پہلے بیان ہوچکے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے اثر سے زہر کی سمیت جسم میں اثر پذیر نہیں ہوسکتی یعنی جوہر درقیہ کے طفیل زہر کی سرایت بہت گھٹ جاتی ہے۔ مہلک جراثیم خون میں جلد برا اثر نہیں دکھا سکتے۔ اس اعتبار سے غدود درقیہ محافظ جسم و صحت زندگی ہے۔ جراثیم کے اندر جو زہر ہوتا ہے۔ اس کا اثر خلیات میں نہیں ہونے پاتا۔ جوہر درقیہ مانع آتا ہے۔ اگر اس کا مرکب کھلایا جائے یا سوئی کے ذریعہ سے بدن کے اندر داخل کیا جائے۔ تو بہت مفید اثر پیدا کرتا ہے۔

غدود نخاعیہ کے فوائد غدود نخاعیہ (Pitnitany Glaa) دماغ کے پیندے میں ناک کی جڑ کے پیچھے کی طرف واقع ہوتا ہے یہ بافتوں کا مجموعہ مٹر کے دانہ کے برابر اور رنگ میں سفید پیلا سا ہوتا ہے۔ اس کا حجم اتنا چھوٹا ہے کہ اس کی طرف ماہروں کا عرصہ تک دھیان ہی نہیں رجوع ہوا۔ گو ارسطو کے زمانہ سے ان کے افعال و فوائد کی بابت خیال آرائیاں ہوتی چلی آتی ہیں۔ گو بظاہر یہ غدود ایک وجود ہے مگر دراصل اس کے دو حصے ہیں۔ دونوں کے افعال جدا ہیں اور ان سے جو جوہر محرکہ نکلتا ہے وہ بھی جدا جدا ہوتا ہے۔ ایک اگلا اور دوسرا پچھلا حصہ کہلاتا ہے۔ یہ فطرت انسان کا سب سے زیادہ بیش بہا خزانہ" قرار دیا گیا ہے۔ اعلیٰ درجہ کی خوردبین سے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس غدود میں تین مختلف قسم کے خلیات ہوتے ہیں۔ ان کے اندر خون جاتا ہے۔ غدود نخاعیہ کا جوہر اس کے ساتھ مخلوط ہوجاتا ہے۔ اگلے حصے سے شفاف جوہر نکلتا ہے جو اس مادہ سے شیر و شکر ہوجاتا ہے جو ریڑھ کی ہڈی کے اندر ہوتا ہے، اور اعصاب کو مرطوب کرتا ہے اور ریڑھ کی ہڈی کا مادہ کھوپڑی کے اندر کے غدود کا جوہر ہوتا ہے۔ اعصاب اور جوہر غدہ کا میل جول ان کے

تعلقات کے استحکام کا نشان ہے۔ اب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غدود کے اگلے حصہ سے جو جوہر نکلتا ہے اس سے ہڈیوں اور بافتوں کی نموترقی پکڑتی ہے۔ غدود نخاعیہ کے فعل کے نقص کے سبب سے ہاتھ، پاؤں، سر، کان ناک اور جبڑے بہت بڑے بڑے ہو جاتے ہیں۔ بعض ماہروں نے چوہوں پر تجربے کرکے اپنے نظریہ کی صحت ظاہر کی ہے۔ اب یہ بات بخوبی ثابت ہو گئی ہے کہ غدود نخاعیہ قوتِ جسمانی پر حکمران ہے۔ جیسے غدود درقیہ قوت جسمانی کی ترقی پر حاوی ہے۔ ایک ماہر نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اس غدود کے جوہر کا اعضائے تناسل پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے اور خواہش نفسی اور قوت مردانہ کو تحریک دیتا ہے۔ ایک ماہر نے جوان جانوروں کے غدود نخاعیہ کا ایک حصہ کم عمر کے جانوروں میں پیوست کر دیا تو وہ جلد ہی بالغ ہو گئے اور مادہ سے میل کرنے کی قوت کا اظہار کیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غدود نخاعیہ نہ صرف نمو ہی پر حاوی ہے بلکہ جسمانی پختگی اور بلوغت بھی اسی کے زیر اثر ہے۔ ماہروں نے غدود نخاعیہ کے جوہر سے مرکبات تیار کر لیے ہیں۔ جو اس کے نقص سے پیدا شدہ امراض کے معالجہ کے کام آتے ہیں۔ لڑکپن اور جوانی دونوں عمروں میں غدود نخاعیہ کے فعل کی ضرورت ہوتی ہے جس سے غدود درقیہ اور غدود کلاہ گردہ کے فعل عمدہ حالت میں رہتے ہیں۔ جب اگلے حصہ کے جوہر کا مرکب استعمال کیا جائے یا سوئی سے بدن میں داخل کیا جائے تو غدود درقیہ اور غدود کلاہ گردہ کے فعل میں تیزی اور اعضائے تناسل میں چستی پیدا ہو جاتی ہے۔ غدود نخاعیہ کے دونوں حصوں کے جوہروں سے وسطی نظام اعصاب اور مغز کے سفید مادہ اور ریڑھ کی ہڈی کی قوت کی تولید ہوتی ہے۔ اگر جسم میں خلاف معمول زیادہ قوت پیدا ہو جائے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ غدود نخاعیہ سے بکثرت جوہر خارج ہو کر خون میں ملتا رہتا ہے۔

غدود کے پچھلے حصہ سے جو جوہر نکلتا ہے اس کا اثر بافتوں کی تومندی خون کی شریانوں کے عضلی ریشہ مثانہ، رحم اور انتڑیوں پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ اگر کسی سوئی کی نوک سے ذرا سا جسم میں داخل کر دیا جائے تو خون کے بہاؤ کا زور بڑھ جاتا ہے۔ گردے سے پیشاب اور عورت کی چھاتیوں سے بکثرت دودھ نکلتا ہے مثانہ اور رحم اس کے اثر سے سکڑ جاتے ہیں۔ خون کے اندر جو نمک ہوتا ہے اس پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ اس کے سبب سے اس کی بجلی پہنچانے کی صلاحیت اثر پذیر ہوتی ہے۔ اگر اسے کاٹ کر الگ کر دیا جائے تو ناتوانی اور نقاہت کے ساتھ چلنے کی قوت اور بھوک بھی جاتی رہتی ہے۔ گرمی گھٹ جاتی ہے اور دو تین دن میں مر جاتا ہے۔ اگر فقط اگلے حصے کا کوئی جز نکال دیا جائے تو جلد تنگ ہو جاتی ہے۔ بال جھڑ جاتے ہیں ذہنی مرگی اور نیند کا غلبہ اور مٹھائی کھانے کا میلان زور پکڑ لیتا ہے۔ زنانہ دم کے جنسی خواص بدل جاتے ہیں۔ نیند اور بیداری کی کیفیتیں اسی کے تابع رہتی ہیں۔ اگر لڑکپن میں ذہنی بلوغت سے پہلے

غدود نخاعیہ کا فعل تیز ہوجائے تو ہڈیاں بھی ہوجاتی ہیں، اور دیو قد انسان پیدا ہوجاتا ہے۔ مگر ایسے
آدمی بہت ہوتے ہیں جن کا غدود نخاعیہ چست اور تیز ہوتا ہے۔ ان کی قوت دماغی بہت اعلیٰ پایہ کی ہوتی
ہے۔ ان کے غدود کے پچھلے حصہ کی حرکت تیز ہوتی ہے مگر اگلے حصے کا فعل بھی چست ہوتا ہے۔ اس وجہ سے
ان کا جسم تو بہت زیادہ نہیں بڑھتا مگر دبلے پتلے اور بڑے تیز اور بیدار مغز ہوتے ہیں لیکن دیو قد آدمی کے
اگلے حصہ کے غدود کی تیزی سے جسم بڑھتا ہے۔ بعض دفعہ رسولی کے سبب سے بھی غیر معمولی نموئے بدن
رونما ہوتی ہے۔ اگر جوانی میں اگلے حصہ کی تیزی بڑھ جائے تو ناک، کان، ہونٹ اور آنکھیں بڑھ جاتی ہیں
اور بہت بھدی ہوجاتی ہیں۔ چونکہ یہ پہلے ہی لمبے ہوتے ہیں اس وجہ سے یہ بڑے قوی ہیکل اور ڈراؤنے
معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں سر درد کی سخت شکایت ہوتی ہے، کبھی کبھی طبیعت مغموم اور اداس ہوجاتی
ہے۔ مرد ہمت سے اس مرض کو برداشت کرتا ہے مگر عورتیں خودکشی کرلیتی ہیں۔ اگر غدود نخاعیہ کے
دونوں حصے بڑھ جائیں تو انسان لمبا اور پتلا ہوجاتا ہے۔ اس کے خون کا زور بڑھ جاتا ہے اور قوت
رجولیت تیز ہوجاتی ہے۔ دماغی قوت بھی بہت تیز ہوجاتی ہے، اس میں قوت اختراع ہوتی ہے، قوت
برداشت بھی۔ مگر مزاج میں قدرے خشونت اور بربھی واقع ہوجایا کرتی ہے، چاہے وہ کتنی مقوی
خوراک کھائے مگر وہ کبھی فربہ نہ ہوگا۔ کبھی کبھی سخت دردسر کی شکایت ہوجاتی ہے جس کا سبب یہ ہوتا
ہے کہ اس کے غدود میں کبھی سوجن پیدا ہوجاتی ہے۔

غدود ورقیہ کے فعل سے قوت بہت پیدا ہوتی ہے، خلیات کی فعلیت میں چستی پیدا ہوجاتی ہے
مگر غدود نخاعیہ سے یہ قوت تبدیلی اختیار کرتی ہے جس سے دماغ اور اعضائے تناسل کی توانائی زور
پکڑتی ہے۔ اگر اول الذکر قوت پیدا کرتا ہے تو مؤخر الذکر صرف کرنے کے درپے رہتا ہے۔ کام کرنے کی
صلاحیت اس کے فعل فطری پر موقوف ہے۔

غدود کلاہ گردہ کلاہ گردہ کے غدود دو ہیں اور ہر ایک کے غدود نخاعیہ کے مانند دو حصے ہیں اور یہ آپس
میں ملے رہتے ہیں۔ ایک غدود دائیں اور دوسرا بائیں جانب ہے۔ رنگ پیلا چربی کے مانند ہوتا ہے
اسلاف اور متاخرین انھیں گردوں ہی کا حصہ سمجھتے رہے۔ ریڑھ کی ہڈی والے تمام جانوروں میں
گردوں کے غدود ہوتے ہیں۔ سور ما جانوروں کے بڑھے ہوئے اور ڈرپوک جانوروں کے بہت چھوٹے
ہوتے ہیں۔ خارجی حصے سے جو جوہر نکلتا ہے اس کا اثر نر اور مادہ کے ظاہری خواص پر بہت گہرا ہوتا ہے
ظاہری صورت کے علاوہ مرد و عورت کی دماغی قوتوں پر بھی اس کا اثر رونما ہوتا ہے۔ اگر ان غدود میں
رسولی یا کوئی اور نقص پیدا ہوجائے تو کئی عجیب علامات رونما ہوتی ہیں۔ اگر رحم ہی میں جنین اس نقص

سے متاثر ہو جائے تو لڑکی میں مردانہ خواص نمودار ہو جاتے ہیں۔ وہ عورت نہیں بلکہ دیکھی جاتی ہے جیسے ہیجڑے جو پیدائش سے مرد و عورت کے ملے جلے خواص لیکر پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آپریشن کر کے دیکھا جائے تو ان کے نچلے اعضا میں عورتوں کی مخصوص نسوانی صفت یعنی اوری (بیضہ رحم) پائی جائے گی۔ اگر پیدائش کے بعد خارجی غدود کے فعل میں ردوبدل ہو تو تین چار سال کی لڑکی کے ایام ماہواری شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے پستان بڑھ جاتے ہیں، قد اور موٹائی میں جلد بڑھ جاتی ہے۔ بال لمبے لمبے ہو جاتے ہیں غرض وہ چودہ سال کی لڑکیوں کے جسمانی اور دماغی صفات سے بہرہ ور ہو جاتی ہے۔ اگر چھ سات سال کے خارجی غدود میں نقص پیدا ہو جائے تو وہ چند ہی مہینوں میں تنومند ہو جاتا ہے مگر قد میں چھوٹا ہوتا ہے وہ بالغ آدمی کے سے خواص سے بہرہ ور ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان غدود سے ایسا جوہر برآمد ہوتا ہے جس سے انسان جلد بالغ ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی تیس سالہ عورت اس مرض میں مبتلا ہو جائے تو اس کے جسم پر بہت بال اگ آتے ہیں، کچھ ڈاڑھی اور مونچھ کے آثار بھی نمایاں ہونگے۔ اس کے عضلات سخت ہو جائیں گے، آواز گہری تیز ہو جاتی ہے۔ اور وہ محنت شاقہ کی اہلیت اور توانائی حاصل کر لیتی ہے اس کے ایام ماہواری بے قاعدہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے نسوانی مخصوص صفات بدل جاتے ہیں وہ مردانہ خواص سے آراستہ ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی عورتوں کے یہ دیکھا جاتا ہے کہ گردے کے بیرونی غدود میں رسولی بن گئی ہے جس سے یہ تمام علامات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب آپریشن سے یہ رسولی کاٹ دی جائے تو مردانہ خواص نابود ہو جاتے ہیں اور وہ پرانی نسوانی خوبیوں سے پھر سے دوچار ہو جاتی ہے۔ اس غدود کے جوہر سے دماغ پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کے اندر اسی قسم کا فاسفورس والا مال پایا جاتا ہے جو مرکزی نظام اعصاب کے اندر ہوتا ہے۔ اس سے دماغ کے نمو کو تحریک پہونچتی ہے۔ یہ چیز اور کسی غدود کے جوہر میں نہیں پائی جاتی۔ دماغ کے خلیات کا انحصار اسی جوہر پر موقوف ہے۔ اگر خارجی غدود کے حجم کا بڑائی داخلی غدود سے زیادہ نہ ہو تو دماغ بڑھ نہیں سکتا۔ اور اگر انسان کو باقی جانوروں پر فوقیت ہے تو اس کا اصل سبب اسی غدود کا حجم ہے۔ جانوروں پر تجربے کر کے اس غدود کے فوائد واضح کئے گئے ہیں۔ جب کسی جانور کا خارجی غدود کاٹ دیا جائے تو زہر کی علامات نمایاں ہوتی ہیں۔ وہ خوراک چھوڑ دیتا ہے، سخت قسم کی سستی اور نقاہت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، جسم لاغر ہو جاتا ہے آخر کار مر جاتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب خلیات بدن اور خون کے اجزائے ترکیبی کا تناسب ٹوٹ جاتا ہے۔ تو زہر پیدا ہو کر جانور کی موت کا موجب ہوتا ہے۔ تحقیقات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خون کے ...یسڈ کی مقدار میں سخت برہمی واقع ہو جاتی ہے۔ جب قوت ...ی سے غذا کا جوہر خون میں جذب

ہوتا ہے، تو پھر وہ خلیات کے ضروری کیمیات ہیں بدل جاتا ہے۔ اس ردوبدل کے اثر سے زہر برآمد ہوتا ہے اگر یہ جلد دور نہ کیا جائے تو زندگی کا رشتہ قطع ہوجاتا ہے۔ جسم کے اندر ہی اس کا انسداد ہے یعنی یہ ایسڈ زائل ہوتا رہتا ہے۔ خون اور خلیات کے اندر جو کیمیائی مواد جیسے بائی کاربونیٹ آف سوڈا وغیرہ ہوتے ہیں۔ ایسڈ ان کے ساتھ گھل مل جاتا ہے۔ اس وجہ سے زہر کی سرائت برباد ہوجاتی ہے گردے کے بیرونی غدود کے جوہر سے یہ فطری عمل ہوتا رہتا ہے۔ خارجی غدود کے جوہر سے جلد کی رنگت بنتی ہے جس کے سبب سے دھوپ کا اثر محسوس نہیں ہوتا۔ دماغ اور اعضائے تنسل کے خلیات پر بھی اس غدود کے جوہر کا گہرا اثر پڑتا ہے۔

گردے کے داخلی غدود کی نسبت بیحد جامع تحقیقات کی گئی ہے۔ اس کے متعلق کوئی بات باقی نہیں رہی۔ اس میں بہت سے عصبی خلیات ہوتے ہیں جو نظام شرکی کے اعصاب کہلاتے ہیں۔ تجربے سے اس غدود کے جوہر کی ایک نرالی خاصیت یہ ظاہر ہوئی ہے کہ اگر ذرا سا بدن میں داخل کیا جائے تو خون کا زور بڑھ جاتا ہے۔ یہ جوہر غدودوں کے اندر جمع رہتا ہے۔ اگر ان کے اندر اس کی مقدار گھٹ جائے تو خون میں بڑھ جاتی ہے۔ جب غصہ یا خوف غالب آجاتا ہے تو یہ جوہر دفعتاً غدود سے خارج ہوکر خون میں جا ملتا ہے۔ جس کے سبب سے خون کی حدت اور نظام اعصاب کا اشتعال اور جوش بیحد بڑھ جاتا ہے جگر سے چینی کی زیادہ مقدار نکلکر خون میں ملجاتی ہے۔ جگر اور تلی کے ذخیرہ خون سے لال ذرے بڑی کثرت سے خون میں مل جاتے ہیں جس کے سبب سے جلد، عضلات اور دماغ میں خون کا بکثرت اجتماع ہوجاتا ہے۔ دل اور نبض کی حرکت تیز ہوجاتی ہے۔ سانس تیز تیز چلنے لگتا ہے۔ کانوں اور آنکھوں کی قوت بہت بڑھ جاتی ہے۔ غرض اس سے جسم کی تنومندی اور قوائے جسمانی اور دماغی کی توانائی بہت بڑھ جاتی ہے۔ اب یہ جوہر کیمیائی ترکیب سے بنا لیا گیا ہے۔ اس غدود کے جوہر کا بہت عجیب اثر ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لینا چاہیئے کہ تحقیقات سے یہ ظاہر ہوگیا ہے کہ لڑنے بھڑنے کی طاقت اور جوش کلاہ گردے کے غدود سے حاصل ہوتا ہے۔ آڑے وقتوں میں اسی کی تحریک کام آتی ہے۔ حارحیت اسی کے سبب ایسا واقع ہوتی ہے۔ غصہ اور خوف کے جذبات اسی جوہر کے تابع ہیں۔ اگر بدن میں یہ جوہر کم ہے، یا اس کی مقدار بہت گھٹ جائے تو صدمہ سے طبیعت نڈھال ہوجاتی ہے۔ دل بیٹھ جاتا ہے سخت غصہ یا ریلوے کے تصادم سے یا کسی عزیز کے مرنے کی ناگہانی خبر سے فوری موت واقع ہوتی ہے نظام اعصاب کی کمزوری جس کے سبب سے نیند نہیں آتی۔ دماغ بخوبی کام نہیں کرتا۔ دل میں بے چینی سی رہتی ہے۔ جسم ناتوان معلوم ہوتا ہے۔ یہ علامات گردے کے غدود کے جوہر کی قلت کے ہیں۔

ان کے سوا اعضائے نسل کے غدود بھی ہیں۔ دو غدود بچپن کی نشوونما پر حاوی قرار دیے گئے ہیں۔ مگر سب سے ضروری غدود درقیہ اور نخاعیہ اور کلاہ گردہ کے ہیں۔ جو جسمانی قوائد اور نفسیاتی خواص پر حاوی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا ذکر قدرے تفصیل سے دیا گیا ہے۔ اس قدر اور کہنا ضروری ہے کہ مختلف غدود کے جوہروں کے مرکبات تیار کیے گئے ہیں۔ جو ان آدمیوں کو دیے جاتے ہیں۔ جن کے جسم میں کسی خاص غدود کے جوہر کی قلت سے خاص قسم کی شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس سے ڈاکٹری کے پرانے خیالات تہ و بالا ہو گئے ہیں۔ ایک نیا طریقہ علاج مروج ہوا ہے جس سے بیسیوں شکایات کا کامیابی سے علاج کیا جاتا ہے۔

پرانے ہندو اور یونانی اطبا نے عام طور پر چار خلط تسلیم کیے ہیں۔ صفرا۔ سودا۔ خون اور بلغم۔ ان کی کمی بیشی کے سبب سے آدمیوں کے چار اقسام مقرر ہوئے تھے۔ صفراوی۔ سوداوی بلغمی اور خونی۔ جس خلط کا غلبہ ہوتا ہے، اسی کے سبب سے اس کی قسم معین ہوتی ہے۔ یہی کیفیت غدود کے جوہروں کی ہے۔ ایک گروہ میں غدود درقیہ کے جوہر والے۔ دوسرے میں غدود نخاعیہ کے جوہر والے اور تیسرے میں غدود کلاہ گردہ کے جوہر والے۔ بعض لوگوں میں ایک غدود کے جوہر کے سبب سے زیادہ اثر نمایاں ہوتا ہے۔ بعض میں دوسرے کا۔ بعض میں تیسرے کا۔ اور بعض میں کسی جوہر کی قلت ہوتی ہے۔ بعض ان سب کے مرکب ہوتے ہیں۔ ان سب کے خواص الگ الگ ہوتے ہیں۔ قد اور چہرے کے علاوہ خواص عقلی اور مزاج بھی علیحدہ ہوتے ہیں۔ کوئی بڑا ذہین۔ کوئی کند ذہن۔ کوئی خوش مزاج کوئی چڑچڑا اور ذرا ذرا بات میں گلے پڑنے والا ہوتا ہے۔ بقول پروفیسر [illegible] یہ تمام خصوصیات جسمانی و دماغی اور نیز مزاج غدودوں کے جوہروں کے سبب سے [illegible] ہوتی ہے۔ ان کا اثر نہایت گہرا اور مستقل ہوتا ہے۔ دیو قد اور بونے۔ پتلے۔ لمبے۔ موٹے۔ [illegible] چھوٹے و دیگر قسم کے انسان انہی کے اثر سے بنتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ غدود کا کیسا عجائب [illegible] اثر ہے۔

ہندوستان کی پُرانی سبھیتا (ہندی)

مصنفہ ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب الہ آباد یونیورسٹی ۔ مطبوعہ ہندستانی اکیڈیمی، یو-پی- الہ آباد
حجم ۶۱۴ صفحات ، مجلّد، قیمت چھ روپیہ

(از حضرت اقبال ورما سحر ہتگامی)

ہندوستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ اردو ہندی میں محققانہ کتابیں شائع کرکے قابل قدر ادبی خدمت
ام دے رہی ہے۔ کتاب زیر تنقید بھی اسی نوعیت کی کتاب ہے گو مصنف نے ہندوستانی محققین کے بجائے
دہ تر یورپین مورخین ہی کی تقلید کرنا مناسب سمجھا ہے۔

شروع سے لیکر بارھویں تیرھویں صدی تک کے زمانہ کو ہندوستان کی پُرانی تہذیب کا زمانہ قرار دیا گیا ہے۔
ات کے لئے زمانۂ قدیم کی مختلف مذہبی و ادبی کتب کی مدد سے لکھے گئے ہیں، مگر ہرپّا اور مہنجیداڑو کے آثار
یہ کو جو ابھی حال میں برآمد کئے گئے ہیں اور جنھیں چھ سات ہزار برس قبل کی تہذیب کا مظہر خیال کیا جاتا ہے،
دل کے پہلے والے یعنی غیر آرین زمانہ سے منسوب کیا گیا ہے، حالانکہ اگر بقول لوکمانیہ تلک جی رگ وید کا
نہ از کم آٹھ ہزار سال قبل مسیح (جیسا کہ اس کتاب میں درج ہے) بھی مان لیا جائے تو آثار مذکور کا تعلق ویدک
ب کے زمانہ سے بآسانی ثابت ہو جاتا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہرپّا اور مہنجیداڑو کی تہذیب ویدک تہذیب
زیادہ ترقی یافتہ معلوم ہوتی ہے۔

رگ وید کے متعلق کہا گیا ہے کہ "وہ ۱۲۰۰ قبل مسیح یا یوں کہئے کہ ۱۵۰۰ ق-م میں ضرور موجود تھا اور ممکن ہے
ں کے بہت پہلے لکھا گیا ہو"۔ حالانکہ ہمارے سنکلپ کا منتر ویدوں کے آغاز کا تعین تقریباً دو ارب سال
کرتا ہے۔ زند و اوستھا کو یورپین بھی چار ہزار سال کی تصنیف بتلاتے ہیں اور اس میں یہ تحریر ہے کہ جب
ن میں ویدوں کا پرچار تھا تو وہاں دھرم بہت پھیلا ہوا تھا۔ اس سے بھی ویدوں کی قدامت کا پتہ لگتا ہے۔
ڈبلیو۔ ہنٹر صاحب تو ویدوں کی مدت کو "نامعلوم" قرار دیتے ہیں۔ اُس کے بعد براہمن گرنتھوں (ویدوں
اسیر) کا بھی ۱۵۰۰ لغایت ۱۰۰۰ ق-م میں تصنیف ہونا کہا گیا ہے جنھیں مسٹر تلک نے جوتش کے حساب سے

بارہ ہزار برس سے قبل کا بتلایا ہے۔ بات یہ ہے کہ تفاسیر نہ کو ویدوں کے ہزاروں برس بعد مرتب ہوئیں۔ یعنی اُس وقت جب ویدوں کے سمجھنے کی کافی قابلیت لوگوں میں باقی نہ رہ گئی تھی۔ بقول لالہ لاجپت رائے صاحب ویدوں اور براہمنوں کی زبان کا فرق ہی اُن کا زمانہ بعید کے بعد لکھا جانا ظاہر کرتا ہے

سوتروں کا زمانہ چھ سات صدی ق۔م بتلایا گیا ہے۔ اس سے بھی اکثر ہندوؤں کو اختلاف ہوگا کیونکہ سوتروں (مختصر ترین بیانات) کے لکھنے کی ضرورت اُس وقت پڑی جب یادداشت میں اس قدر قوت نہ رہی کہ ویدوں کے منتر یا اون کی تفاسیر دماغ میں کماحقہٗ قائم رہ سکیں۔ اس کے لئے بھی سات آٹھ سو برس سے کہیں زیادہ عرصہ درکار ہے۔ سوتروں کا شمار بھی ویدک زمانہ ہی میں ہوتا ہے۔

اس کے بعد مصنف نے پانچ چھ صدی قبل مسیح کے اندر اندر چھ شاستروں، بودھ اور جین گرنتھوں اور مہابھارت و رامائن سبھی کا لکھا جانا تحریر کیا ہے۔ یہ سب باتیں مشکوک ہیں۔ شاستر بھی سوتر ہی ہیں لکھے گئے ہیں اور سوتر کے ہزاروں برس بعد رامائن و مہابھارت وغیرہ مرقوم ہوئیں۔

اس کتاب سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ پہلے رامائن کا واقعہ رونما ہوا یا مہابھارت کا۔ البتہ جہاں اُن کے لکھے جانے کا ذکر ہے وہاں پہلے مہابھارت درج ہے۔ پھر رامائن۔ اگر مصنف کا خیال ترتیب واقعات کے متعلق بھی ایسا ہی ہے تو وہ صحیح نہیں مانا جا سکتا۔ مہابھارت کی عالمگیر جنگ سے اُس تہذیب کو قریب قریب خاتمہ ہو چکا تھا جس کا انحطاط رامائن ہی کے زمانہ سے شروع ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو تہذیب اس تباہی کے اثر کو آجتک زائل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ایسی حالت میں یہ کس طرح یقین کیا جا سکتا ہے کہ رامائن واقعہ مہابھارت کے بعد ہوا؟ تاریخی نظر سے اس واقعہ کو ہوئے تقریباً پانچ ہزار سال ہو گئے ہیں جس کی تائید آئین اکبری، یونانی مورخین کے کتب اور پروفیسر میکس ڈنکر کے بیان سے ہوتی ہے۔ اور رامائن کا واقعہ اس سے کہیں پہلے کا ہے۔

یونانی تہذیب کی تاریخ اس طرح مرتب کی گئی ہے کہ جن جن باتوں کا ذکر ویدوں وغیرہ مذہبی کتب میں ہے وہی اُس وقت کے اعتبار سے مروّج سمجھ لی گئی ہیں۔ مگر مصنف نے لفظ شاید کا استعمال بھی کثرت سے کیا ہے۔ بہر حال ویدوں میں اگر دشمنوں کی بربادی کی پرارتھنا ہے تو اس کی بنا پر قابل مصنف کی رائے ہے کہ رگ وید میں غیر آرین لوگوں کے ساتھ لڑائی کی کشمکش موجود ہے۔ چونکہ سوت کے لئے بددعا ہے اس لئے کثیر الازدواجی بھی ثابت ہے۔ جس دیوتا کے نام پر جتنے زیادہ منتر ہیں وہ مصنف کی رائے میں اتنی عظیم القدر خیال کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں جین دھرم کی صراحت میں بہت طوالت سے کام لیا گیا ہے بلکہ بعض موقعوں پر پڑھنے

و ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ تاریخ نہیں بلکہ کسی مذہبی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ صراحت مشکلات
معترانیں جنھیں ہم اکیڈیمی کی مطبوعات میں دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے۔ بہر حال ہماری رائے میں قابل
ن کو صرف یہ دکھلانا چاہئیے تھا کہ اس مت سے اُس وقت کی تہذیب و تمدن پر کیا اثر پڑا۔ اسی طرح
اس، بھوبھوتی، بان بھٹ وغیرہ کے ناٹکوں اور نظموں کے اقتباسات بکثرت دیئے گئے ہیں۔ اس
زبان کی ارتقائی کیفیت کا اظہار تو ہو نہیں سکتا کیونکہ اصل کتابیں سنسکرت میں ہیں، اور اگر وقتی
کی کیفیت کا مقصود تھا تو وہ بہت محدود اور نامکمل طریقہ پر کیا گیا ہے۔
ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے باوجود اس ضخیم کتاب میں عام دلچسپی کا بہت بڑا سامان موجود ہے اور اُس
ری پرانی تہذیب کی رفعت کا بہت کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ ہڑپا اور مہنجیداڑو کے آثار سے اس بات
پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت بھی مکان، تالاب، کنوئیں، نالیاں، حمام، گاڑیاں، کھانا، کپڑا، زیور،
چیزیں تقریباً آجکل کی طرح ہیں۔ بقول یونانی مورخین اشوک کے زمانہ میں چوری اور مقدمہ بازی بہت
قرض کے وقت گواہوں کی ضرورت ہوتی تھی اور گھروں کے لئے چوکیداروں کی ضرورت نہ تھی۔
ئی کا بند و بست بھی کافی تھا۔ مصوری اور سنگتراشی کا کام بھی بہت قابل تعریف ہوتا تھا خصوصاً
ں کو تراش کر اُن میں مناظر بنانے کا رواج عام تھا چنانچہ اجنٹا کی گپھائیں جو بقول مصنف ۵ء
تیار ہوئے آجتک موجود ہیں۔
مذہبی رواداری بھی ہندوستان کی بہت پرانی خصوصیت ہے۔ اشوک اور کنشک نے ہندو مذہب
تھ وہی برتاؤ قائم رکھا تھا جو خود ہندو راجاؤں کے عہد میں ہوتا تھا۔ مہانداری کو ہندوستانی
ب کی جان سمجھنا چاہئیے۔ چنانچہ مہمانوں کی خاطر و تواضع پر ہمیشہ سے زور دیا جاتا رہا ہے۔ ہندو، بودھ
، سبھی مذاہب میں تزکیۂ نفس کی بڑی قدر ہے۔
اس کتاب سے شروع سے آخر تک زمینداری سسٹم کی تائید ہوتی ہے۔ ملک میں متعدد ریاستوں
ریعہ فیڈرل نظام حکومت کا ہونا پایا جاتا ہے۔ شہنشاہوں کے انفرادی حکومت بھی غیر ذمہ دارانہ نہیں ہے
عایا کو مطلق العنانی کے روکنے کا اختیار ہے۔ ووٹ یا رائے کے ذریعہ انتخاب کا ہونا بھی پایا جاتا ہے۔
مات کے فیصلہ کے لئے پنچایت سسٹم کا رواج بھی ثابت ہے۔ چینی سیاح فاہیان کا بیان ہے
ت راجاؤں کے زمانہ میں سزائے موت کا رواج نہ تھا۔ "سلطنت کا انتظام معقول تھا۔ رعایا خوشحال
سراؤں اور اسپتالوں میں کھانا اور دوا وغیرہ بالکل مفت ہوتی تھی۔
کسی قوم کی ارتقائی حالت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ طبقۂ اناث کی کیا حالت ہے

کو یہ بھی بہت اطمینان بخش نظر آتی ہے۔ پردہ کا نہ ہونا، سن بلوغت میں رضامندی سے شادی بہ حیثیت پردہ
رتوں کا تعلیم یافتہ ہونا، اور بحث و مباحثہ میں شریک رہنا، ان کا واجبی احترام، یہی باتیں دیتی ہیں بلکہ
کتاب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کی حالت اب سے کہیں بہتر تھی اور وہ آزادانہ طور پر زندگی
کرتی تھیں۔

یہاں تہذیب کا اثر بیرونی ممالک و جزائر تک بھی پھیلا ہوا تھا۔ سماٹرا۔ جاوا، بالی وغیرہ میں اب
س کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ اُس تہذیب کی پائداری کی خاص وجہ یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ
کو وقتی حالات کے موافق بنالیتی تھیں

قابل مصنف نے کتاب کو بہت سلاست، روانی اور صفائی کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی ہے اور
اص مقامات کو چھوڑ کر ہر جگہ ان کی کوشش کامیاب ہوئی ہے۔ کتاب کی قیمت البتہ کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے

نہتّا رانا

ہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی (اُردو بک اسٹال۔ بیرون لاہوری گیٹ لاہور قیمت ۱۲؍)

(از پنڈت منوہر لال زتشی صاحب)

جناب کیفی دہلوی کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں آپ اُردو کے کہنہ مشق شاعر اور نثار ہیں اور اُردو
ں ناٹک کو رواج دینے میں آپ نے کافی حصہ لیا ہے۔ جناب کیفی کی یہ نئی کتاب جس کو آپ نے تاریخی ناٹک
پچھلے سال شائع ہوئی ہے اسمیں گیارھویں صدی عیسوی کے ہندو مسلمانوں کی تصویر کھینچی
۔۔ اور ان دونوں گروہوں کے جنگ و آشتی کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب آج کل
وستانیوں کو بتلاتی ہے کہ دین و ملت، ملک و زمان کے سخت سے سخت اختلافات کے باوجود
انسان رہتا ہے اور رحم و انصاف، ہمدردی اور محبت کے جذبات ان اختلافات کے با وجود
ور ظاہر کرتے ہیں۔ رانا گجراج اور محمود غزنوی دونوں کے کیرکٹر تعصب اور تنگ سے دور
روشنی میں پیش کئے گئے ہیں اور قصہ کی دلکشی اور اس کے اخلاقی سبق دونوں اس بات کی
کرتے ہیں کہ اُردو پڑھنے والے جناب کیفی کی اس نئی تصنیف کو پڑھیں اور اسکی قدر کریں

شاعری میں درسِ عمل کی تلاش

(از خانصاحب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی، بی۔ اے)

روح الہام مدد، ذہنِ پر اسرار مدد — کلکِ خوش کار مدد، فکرِ گہربار مدد
جوہرِ نطق مدد، طبعِ فسوں کار مدد — مرحلہ سخت ہے اے دیدۂ بیدار مدد
نقش ہے جو مرے دل پر وہی تحریر کروں
صدق سے کذب کو بھولے سے نہ تعبیر کروں

شاعری کیا ہے؟ وہ فطرت کی زبانِ شیریں — سیکھنے اور سکھانے سے جو آتی ہی نہیں
اُس طرف سے جو نہ ہو بارشِ دُرہائے ثمیں — نوکِ خامہ سے نہ ٹپکے کبھی شعرِ رنگیں
مشغلے اور ہیں، کر قصد نہ اس وادی کا
شاعری نام نہیں وقت کی بربادی کا

مَیں نے مانا کہ تجھے نظم کی قدرت بھی ہے — یہ تو کہہ طبع میں رفعت بھی ہے جدت بھی ہے؟
تربیت یافتۂ دامنِ فطرت بھی ہے — دل ترا خلوتیِ رازِ حقیقت بھی ہے؟
یہ نہیں ہے تو پھر اشعار میں تاثیر کہاں
آتشِ تیز کہاں، شعلۂ تصویر کہاں

شاعری اصل میں کیفیتِ وجدانی ہے — تو سمجھتا ہے فقط لذتِ نفسانی ہے
یا گدایانہ امیروں کی ثناخوانی ہے — یاد رکھ، یاد رکھ انجام پشیمانی ہے
فکرِ شہرت ہے اگر، اور ندامت ہوگی
اپنی اوقات سے اِک دن تجھے نفرت ہوگی

درحقیقت ہے اگر شعر کا جوہر تجھ میں — شکر کر جلوۂ صد رنگ ہے مضمر تجھ میں
محو ہے نورِ سحر، تابشِ اختر تجھ میں — بستے ہیں حسن کے انفاسِ معطر تجھ میں
معجزہ ہوگا ترا شعر مسیحائی کا — روح کو دیگا جو پیغام توانائی کا

شاعری ہدیۂ فطرت ہے مگر فن بھی ہے — کچھ اصول ایسے ہیں جن پر اسے قدغن بھی ہے
باغبانی کے لئے حاجتِ گلشن بھی ہے — طائرِ قدس کو درکار نشیمن بھی ہے

ابتدا ہوتی ہے اس جا سے زباں دانی کی
لفظ و تخئیل نے مل کر ہی جہانبانی کی

برمحل صرفِ تراکیب ہو، تخئیل بلند — استعارے جو دل آویز ہوں تمثیل پسند
لفظ و معنی کے توازن سے ہو تکمیل بلند — خسروِ شعر کے ہو فرق پہ اکلیل بلند

کچھ تصنع کو ہو دخل اور نہ آورد کو دخل
مے سرجوش میں جس طرح نہیں دُرد کو دخل

کوئی خامی نہ ہو انداز کی رعنائی میں — نقص رہ جائے نہ مضمون کی گیرائی میں
خونِ تخئیل نہ ہو قافیہ پیمائی میں — رنگ بھرتا ہے کوئی لالۂ صحرائی میں

سادگی وہ ہو بچھی جائے نزاکت جس پر
تازگی وہ ہو کہ گل کھائے لطافت جس پر

ڈھونڈتے پھرتے ہیں جو شعر میں ترغیبِ عمل — اُن کی مشکل ہے عجب عقدۂ لاینحل
دونِ ہمت کا ہو الفاظ سے کیا خاک بدل — گرم اشعار سے کھلتا ہے کہیں غنچۂ شل

کام کرنا ہے جنھیں کام کیا کرتے ہیں
مکتبِ شعر میں یا درس لیا کرتے ہیں؟

پیش کرتے ہیں مثالیں عرب و یوناں کی — جیسے اُن میں بھی نہ تھا جذبۂ قومی باقی!
جیسے اُن میں بھی تھی مضبوط ارادوں کی کمی! — جیسے اُن کی بھی طبیعت میں تھی راحت طلبی!

کلفتِ دل کا سبب قید تھی دیواروں کی
ماں کی لوری نہیں جھنکار تھی تلواروں کی

جو ہوں ساونت وہ اوروں کے اُبھارے سے لڑیں — نغمۂ چنگ و دف و نے کے سہارے سے بڑھیں
جو ضعیف اُٹھیں وہ عورت کے پکارے سے بڑھیں — دھنی تلوار کے ابرو کے اشارے سے پھریں

بندہ پرور یہ حقیقت ہے تو بزدل تھے عرب
ورنہ کیوں عورتوں سے جوش کے سائل تھے عرب

وہ جری تھے زن و فرزند بھی تھے اُنکے جری — اُن کو غیرت کوئی دلوائے ضرورت ہی نہ تھی
ایک دل، ایک زباں، ایک ہی منزل سب کی — سیل کی طرح بڑھے سیدھ جدھر کی باندھی
مشغلہ یہ بھی دمِ جنگ رہا کرتا تھا
کوئی گاتا تھا رجز کوئی پڑھا کرتا تھا

سنیئے یونان کی اب ایک لڑائی کا حال — اہلِ فارس سے ہوا گرم جو میدانِ قتال
فتح فارس کی ہوئی اُن کو ہوا سخت ملال — کیونکہ جرأت میں تھا اسپارٹا آپ اپنی مثال
لکھا ایتھنز کو سامان نہ لشکر بھیجو
ہم کو لڑوائے جو ترتیب سے : فنسر بھیجو
ٹرٹیئس شہرۂ آفاق جو شاعر تھا گیا — وہ اپاہج تھا لڑائی سے اُسے مس ہی تھا
ہو کے آزردہ و مایوس یہ آپس میں کہا — ہم نے منہ پھوڑ کے کیا مانگا تھا اور کیا پایا
طیش کھاتے رہے، بکتے رہے، خاموش ہوئے
جنگ در پیش تھی یہ صدمے فراموش ہوئے
آخر کارِ لڑائی کا جو ہنگام آیا، — نظم پڑھ کر اُنھیں شاعر نے ابھارا، ایسا
صاعقہ بن کے ہر اک فوجِ مخالف پہ گرا — فتح جب تک نہ ہوئی مڑ کے نہ پیچھے دیکھا
ہاتھ میدان رہا خرم و دل شاد پھرے
جن کو اندیشہ غلامی کا تھا آزاد پھرے
ملک کے واسطے مرنے سے نہ ڈرتا تھا کوئی — تیغ کے گھاٹ اُترنے پہ تھے آمادہ سبھی
شاعری کی جو کرامات تھی بس اتنی تھی — اُن میں تنظیم کی خامی تھی وہ پوری کر دی
اپنے کس بل پہ جو اُن کو نہ بھروسا ہوتا
فوج کی فوج، کہ اک شخص بلایا ہوتا ؟
حالی و اکبر و اقبال نے کیا کیا نہ کہا — نوحے کا، طعنے کا، شکوے کا اثر کچھ بھی ہوا
جوش نے نعرۂ مستانہ سنایا تو کیا — بے حسی ہے وہی، انداز وہی غفلت کا
آپ تو شعر سے کھوئی ہوئی عظمت مانگیں!
وہ گھڑی کو بھی نہ ہم غم سے فراغت مانگیں؟

جگنو

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس)

کوئی تجھ کو جہاں میں کرمکِ شب تاب کہتا ہے — کوئی تجھکو جہاں گوہرِ نایاب کہتا ہے

کوئی کہتا ہے تجھ سے نورِ عرفاں آشکارا ہے — کوئی کہتا ہے تو عرشِ بریں کا ایک تارا ہے

شبِ تاریک میں سب کو لبھاتی ہے چمک تیری — دلوں کے واسطے پیغامِ رحمت ہے جھلک تیری

کبھی تو حسن اپنا اہلِ دنیا کو دکھاتا ہے — کبھی کچھ سوچ کر روئے منور کو چھپاتا ہے

وجودِ نور میں تیرے ہی سرِ کُن فکاں مضمر — تری ہستی میں ہے وہ سرِّ رازِ دو جہاں مضمر

چراغِ خانۂ تاریک ہے تو بے نواؤں کا — زکوٰۃِ نور سے بھرتا ہے تو کاسہ گداؤں کا

کبھی وارفتہ کرتا ہے جہاں کو روئے روشن سے — چھپا لیتا ہے گاہے حسن کو اپنے ہی دامن سے

ترا ممنونِ منت ہے الم خانہ غریبوں کا — ہوا ظلمت کدہ روشن تجھی سے بدنصیبوں کا

کہاں سے تو نے یہ اندازِ معشوقانہ سیکھا ہے — کہاں سے اس بلا کا غمزۂ مستانہ سیکھا ہے

اڑائی ہے کہاں سے یہ ادائے جبیں تو نے — یہ سیکھے ہیں کہاں ناز و اندازِ حسیں تو نے

مرے جگنو مرے ظلمت کدہ میں نور افشاں ہو
کبھی غمخانۂ ناشاد بھی بزمِ چراغاں ہو

کسبِ کمال اور طولِ عمر

(از منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی)

حاصل ہے میرے دل میں جگہ اس خیال کو — کچھ ضد ہے طولِ عمر سے کسبِ کمال کو

تعجیل سے جہاں بھی ہے تکمیل رنگ و بو — ہے قطع درمیان سے وہیں رشتۂ نمو

جلتے ہی جس چراغ کے شعلہ بھڑک اُٹھا — افسردگی سے جلد اُسے سامنا ہوا

قطرہ وہ جس میں شورشِ دریا کا ہے ظہور — ہوتا ہے جلد چشمِ جہاں سے نہاں ضرور

دعوئے عام گو مری تحریر میں نہیں — لیکن ہے واقعات سے یہ قابلِ یقیں

تصویر تھا سکندرِ اعظم کمال کی — کچھ اس کو سنّ و سال سے نسبت مگر نہ تھی

نیا سے جلد منہ کو اُسے موڑنا پڑا — سب کچھ شباب ہی میں یہاں چھوڑنا پڑا

ویدیت وادیوں کا وہ سرتاجِ بے مثال — وحدت کے فلسفہ میں تھا حاصل جسے کمال

شنکر جو متّصف تھا ہزاروں صفات سے — محروم قدرتاً تھا مطوّلِ حیات سے

عرفی کہ بزمِ شعرِ عجم کا چراغ تھا — اس پھول سے بہار پہ ایراں کا باغ تھا

جس وقت نیند آئی اُسی وقت سو گیا — خاموش خاص عہدِ جوانی میں ہو گیا

انگلینڈ کا سخنورِ مشہور جان کیٹس — وہ بادشاہِ ملکِ سخن نوجوان کیٹس

اپنے شباب ہی میں جہاں سے گزر گیا — یہ باکمال موت کے پہلے ہی مر گیا

وہ لکھنؤ کا شاعرِ معجز بیاں نسیم — فخرِ زمان و نازشِ ہندوستاں نسیم

ہے مثنوی اک آئینہ جس کے کمال کا — اس کو بھی جلد حکم ملا انتقال کا

درگا سہائے ساقیِ خمخانۂ سرور — کھاتا ہوا ئے گلشنِ باغِ جناں ضرور

لیکن کمالِ فن کی بدولت نہ جی سکا — جی بھر کے جامِ بادۂ ہستی نہ پی سکا

وہ روحِ پاک شمعِ شبستانِ معرفت — تھے رام تیرتھ آہ دُرِ کانِ معرفت

وقفِ سرورِ باطن و صرفِ جمالِ ذات — دنیا میں جلد ہوگئے محوِ خیالِ ذات

آخر کرے گا کون کہاں تک شمار اور — ایسی ملیں گی ہم کو مثالیں ہزار اور

لیکن مجھے بھی دل سے یہی ہے پسند بات — بیکار ہے طوالتِ افسانۂ حیات

جب مقصدِ حیات کی تکمیل ہوگئی — منشائے کائنات کی تکمیل ہوگئی

پھر باغِ زندگی میں سکونت فضول ہے — پھر قیدِ عنصری کی اذیت فضول ہے

ہوں کاش میں بھی شاد حصولِ کمال سے — وابستہ سعی ہو مری حسنِ مآل سے

کچھ غم نہیں اگر میں زیادہ نہ جی سکوں، — لیکن مئے کمالِ سخن چھک کے پی سکوں

چھوڑوں گا نقش بعدِ فنا میں کمال کا — ثمرہ ملے گا زندگیِ لازوال کا

لیکن یہ اپنے بس کی مِنّو نہیں ہے بات
حائل ہیں میری راہ میں میرے مقدرات

علمی خبریں اور نوٹ

ملک کے ہر طبقہ کے ساتھ مہاتما گاندھی کی دلی محبت کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ آپ نے تحریک خلافت کے زمانہ میں اردو سے بھی خاصی واقفیت حاصل کرلی اور اب بھی کبھی کبھی آپ اپنے اردو داں دوستوں کو اردو ہی میں خط لکھتے ہیں، چنانچہ اگست گذشتہ میں آپ نے یروڈا جیل سے ڈاکٹر محمد عالم صاحب کی صحت دریافت کرنے کے لئے انکی بیگم صاحبہ کو ایک پوسٹ کارڈ اردو خط میں بھیجا تھا جس کی بجنسہ نقل درج ذیل ہے:-

"پیاری بہن - آپ کا خط ملنے سے مجھے بہت خوشی ہوئی، ڈاکٹر صاحب کا خط مجھے مل گیا تھا، آپ کا خط آنے سے اور بھی پتہ ملا- میری امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو آرام ہوتا ہوگا، مجھے خبر دیتی رہیو- سردار (پٹیل) مہادیو (ڈیسائی) اور میری طرف سے ڈاکٹر صاحب کو بندے ماترم دیجئے- خدا کی مہربانی سے ہم سب اچھے ہیں- امید رکھتا ہوں کہ خط پڑنے میں آپ کو تکلیف نہیں ہوگی"

اس خط میں املا کی صرف دو خفیف غلطیاں ہیں یعنی پڑھنے کو پڑنے اور تکلیف کو تکلیف لکھا گیا ہے مگر اس خیال سے کہ مہاتما جی نے حال ہی میں اردو سیکھی ہے اور انھیں اس کی تحریر کا بھی بہت کم موقعہ رہتا ہے یہ لغزشیں قابل شکایت نہیں ہوسکتیں۔ مہاتما جی نے اردو کی خاطر جتنی کوشش کی ہے ہمارے دیگر ہموطن اس کا عشر عشیر بھی کریں تو اس کی ترقی کی کوئی حد نہ رہے۔

شمس العلما مولانا شبلی مرحوم نے پیغمبر اسلام کی جس عظیم الشان سوانح عمری لکھنے کا بندوبست کیا تھا اسکو اب ان کے فاضل جانشین مولانا سلیمان ندوی نے انجام بخیر تک پہونچا دیا۔ سیرۃ النبی کی آخری جلد جس کا حجم سات سو صفحات ہے حال ہی میں شائع ہوگئی ہے اس کی قیمت اعلیٰ کاغذ پر آٹھ روپیہ اور دیسی کاغذ پر چھ روپے بلا محصول ہے۔ شائقین دار المصنفین اعظم گڈھ سے طلب فرمائیں۔

پچھلے ماہ مولانا عبدالماجد دریاآبادی کی تازہ تصنیف مولانا محمد علی مرحوم کی سوانح عمری بھی اردو اکیڈمی جامعہ ملیہ دہلی کی طرف سے شائع ہوگئی ہے۔

مولانا عبدالحلیم صاحب شرر کا مشہور رسالہ دلگداز جو مولانا کے انتقال کے بعد بھی کچھ عرصہ تک لکھنؤ سے نکلتا رہا اب صاحب مرحوم کے لائق فرزند مولوی محمد صدیق حسن صاحب اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو کی ایڈیٹری میں عنقریب اورنگ آباد دکن سے شائع ہوگا۔

قومی کتب خانہ لاہور کے اہتمام میں ایک انگریزی اردو ڈکشنری تیار ہوئی ہے جس میں انگریزی الفاظ، ان کے صحیح تلفظ، ہر لفظ کے انگریزی چار دو مترادفات دیدیئے گئے ہیں۔ ان خوبیوں کے باوجود صرف ڈھائی روپیہ قیمت مقرر کی گئی ہے۔

امریکہ کا مشہور کروڑ پتی راک فیلر علم و ادب کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک ٹرسٹ قائم کر گیا ہے حال ہی میں اس ٹرسٹ نے لندن یونیورسٹی کو افریقہ کی مختلف زبانوں کی تحقیقات کے لئے تین ہزار پونڈ سالانہ کا عطیہ دیا ہے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ دنیا کے تقریباً بیس کروڑ آدمی انگریزی زبان سے واقف ہیں مگر انگریزی کے بہت سے الفاظ کا املا اور تلفظ مشکل ہے۔ چنانچہ سات سو یونیورسٹی پروفیسروں نے بورڈ آف ایجوکیشن برطانیہ کے پاس درخواست بھیجی ہے کہ اس بارے میں آسانیاں پیدا کرنے کے لئے چند اہل زبان کا ایک میشن قائم کیا جائے۔

برطانیہ کے مشہور عجائب خانہ لندن میں اخبارات کی بھی ایک لائبریری ہے جس میں [illegible] سے لیکر اب تک کے تمام اخبارات کی جلدیں محفوظ ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس لائبریری میں اخبارات کی پونے تین لاکھ جلدیں ہیں جو الماریوں کے خانوں میں رکھی گئی ہیں لیکن اگر انہیں پھیلا کر پہلو بہ پہلو رکھا جائے تو اس کا سلسلہ چودہ میل لمبا ہوگا۔

بقول پروفیسر گلبرٹ مرے یوں تو واقعات کے ریکارڈ کی حیثیت سے پرانے اخبارات بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتے ہیں لیکن ان تحریروں سے اس وقت کے عوام کے جذبات اور احساسات کا صحیح پتہ لگ سکتا ہے۔

جرمنی میں روزانہ اخبارات کی تعداد میں خاصی ترقی ہو رہی ہے چنانچہ پہلے تین ہزار تین سو ساٹھ روزانہ

اخبارات شائع ہوتے تھے مگر اب انکی تعداد بڑھکر چار ہزار سات سو تین ہوگئی ہے۔ ان میں سے ۹۷۶ ملک کی مختلف سیاسی پارٹیوں کے اخبارات ہیں۔ ان میں سے ایک اخبار کے صرف پچپن خریدار ہیں اور زیادہ کر زیادہ اشاعت رکھنے والا پرچہ ۵ لاکھ ساٹھ ہزار چھپتا ہے۔

انگلستان کے مشہور و معروف اخبار ٹائمس نے یکم اکتوبر گذشتہ سے اپنا پرانا ٹائپ بدلکر نئے نمونے کا اہتمام کرنا شروع کیا ہے۔ جدید ٹائپ کے حروف بنانے اور تراشنے میں لاکھوں روپیہ کے صرف کے علاوہ دو سال کا عرصہ لگا۔ کل تین لاکھ ساٹھ ہزار کمپوزنگ فرمے درکار تھے۔ ٹائپ کے لیئے پچیس ٹن لوہا گلایا گیا اور قریب چار سو کالم مستقل مضامین کے نئے ٹائپ میں از سر نو کمپوز کیئے گئے۔ یہ تمام سامان ۳۰ ستمبر کے بارہ بجے رات تک تیار ہوگیا تھا جس سے یکم اکتوبر کا پرچہ بلا کسی رکاوٹ کے اپنے وقت مقررہ پر شایع ہوگیا۔ اور لطف یہ کہ اسی تاریخ سے دنیا بھر میں جہاں جہاں دیواروں، کھڑکیوں یا دروازوں وغیرہ میں ٹائمس کے اشتہارات ہیں ان کی عبارت نئے نمونے کے حروف میں تبدیل کردی گئی اور ٹائمس کے دفتر کی تمام اسٹیشنری بھی نئے طرز کی استعمال ہونے لگی ہے۔

ہر مد میں ٹائمس کے انتظامات نہایت اعلیٰ ہیں جملہ اس کے ہر صیغے میں بیدریغ روپیہ صرف کیا جاتا ہے، چنانچہ یورپ کے اکثر ملکوں میں اس کے خاص نامہ نگار متعین رہتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی اکثر اوقات اس نے بڑے بڑے قابل مدبروں اور عالی مقام اخبار نویسوں کو اپنا قائم مقام بنا کر بھیجا اور حال میں اس نے ہندوستان میں ایک مستقل نامہ نگار بھیجکر اپنی الوالعزمی کا مزید ثبوت دیا ہے۔ یہ لاکھوں روپیہ جو آئے دن ٹائمس اور انگلستان و یورپ کے دیگر اخبارات خرچ کیا کرتے ہیں ان کے عام قدر دانوں ہی کی جیب سے آتا ہے۔

چند روز میں لندن کے وسطی حصہ میں اخبارات کی چھپائی کے متعلق عجیب حیرت انگیز تجربہ ہونیوالا ہے وہاں پر چھ مختلف مقامات پر برقی آلات نصب کر دیئے گئے ہیں جن کے ذریعہ سے بجلی کے شارچوں کی مدد سے بارہ بجے رات سے لے کر آٹھ بجے صبح تک فضائے آسمانی پر چیدہ چیدہ خبریں بجلی کے روشن حروف میں سینما کی طرح لکھی جایا کرینگی اور لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے بیٹھے انھیں پڑھ لیا کریں گے۔ اس اخبار کا نام نائٹ اسکائی ٹیلیگراف (رات کا آسمانی تار) ہوگا۔ ہندوستان میں اخبارات انواع و اقسام کی پابندیوں اور دقتوں کی وجہ سے زمین پر بھی باقاعدہ شائع نہیں ہوسکتے مگر انگلستان نے اپنے اخبارات آسمان پر شائع کرنیکا بھی انتظام کرلیا

اس سال ادبیات کا نوبل پرائز انگلستان کے نامور مصنف جان گالزوردی کو دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے انگلستان کے تین نامور ادیب رڈیرڈ کپلنگ۔ ایٹس اور برنرڈ شا کو یہ اعزاز حاصل ہو چکا ہے۔ اور اب گالزوردی کو بھی دنیا کے لافانی انشا پردازوں کی صف میں جگہ مل گئی حالانکہ وہ خود ہمیشہ نمود ونمایش اور شہرت سے اور تزک واحتشام سے دور رہ کر خاموشی سے دنیا کی ادبی خدمت کرنا ہی اپنا فرض سمجھتے رہے ہیں تین سال ہوئے کہ ملک معظم نے آپ کو آرڈر آف میرٹ کا اعزازی نشان عطا فرمایا تھا۔ اس سے پہلے "سر" کا خطاب بھی آپ کے لئے تجویز کیا گیا تھا لیکن آپ نے اسے منظور نہیں کیا۔ اب ۶۵ سال کی عمر میں آپ کو دنیا کا سب سے بڑا علمی انعام ملا ہے جس پر سبھی طرف سے "حق بحقدار" کی صدا بلند ہو رہی ہے۔ گالزوردی نے روزمرہ زندگی کے گرد و پیش کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ انکے ناول۔ ڈرامے اور مختصر افسانے سبھی انسانی زندگی کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں۔ مظلوم پست و پامال طبقوں کے ساتھ گالزوردی کو انتہائی ہمدردی ہے۔ زندگی کے متعلق انکا نقطۂ نظر نہایت بلند واقع ہوا ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق اور ذلیل سے ذلیل مجرم کو بھی وہ نفرت وحقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے کیونکہ ان کا دل دردمند سرچشمۂ محبت ہے جس میں ہر کس و ناکس کے لئے ہمدردی کی گنجایش ہے یہی انسان دوستی گالزوردی کی خصوصی شان ہے۔ مجرم کو دیکھکر وہ سوسائٹی کو متہم کرتے ہیں جسکے بیدردانہ سلوک کی بدولت اسکا جوہر شرافت مفقود ہو گیا جب کبھی وہ زندگی سے متعلق اپنا تخیل پیش کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ واقعی انسان کتنا اولوالعزم اور بلند پایہ ہوسکتا ہے۔ گالزوردی نے انگریزوں کی روزمرہ زندگی کی سچی اور مکمل تصویریں پیش کی ہیں لیکن تبدیل نام کے ساتھ دنیا کے ہر گوشے میں انکے قصوں اور ڈراموں کے افراد موجود ملیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ گالزوردی کے ڈراموں کے ترجموں سے ہر شخص لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ وہ بجا طور سے گالزوردی دنیا کے بہترین مصنفوں میں شمار ہونے کے لائق ہیں جس خاص سلسلہ کتب پر یہ انعام ملا ہے اسکی تیاری میں گالزوردی کو پچیس سال لگے ہیں۔ ۹ ۔ چھ طولانی اور چار کسی قدر مختصر ناول اور کئی چھوٹے چھوٹے قصے ہیں جن میں زمانہ حال کے معاشرتی تناقض اور عہد جدید کی باہمی کشمکش کی صحیح صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ ہندوستانی اکیڈیمی کی بدولت گالزوردی کے تین ڈراموں کا ہندی ترجمہ شائع ہو گیا ہے اور اردو میں بھی عنقریب ہی دو ایک ڈرامے طبع ہو جائیں گے۔

نوبل پرایز سویڈن کے ایک دولتمند شخص نوبل کے نام سے موسوم ہیں اور اسی کے ترکہ سے دیے جاتے ہیں۔ ادبیات کے علاوہ سائنس اور قیام امن وغیرہ کے بھی انعامات مقرر ہیں۔ ان انعامات کا آخری فیصلہ شاہی سویڈش اکیڈیمی آف لٹریچر کرتی ہے جسکے فاضل ارکان کو فیصلے کیلئے خدا معلوم دنیا بھر کی کتنی تصانیف اور کتنے ہزاروں کی کتابیں پڑھنا پڑتی ہونگی۔ انعام کی مقدار آٹھ ہزار پاؤنڈ یعنی تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہے۔ ہندوستان میں بھی ادبیات کا نوبل پرائز ڈاکٹر ٹیگور کو اور سائنس کا انعام سر رمن کو مل چکا ہے۔

حال میں مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کا تازہ ترین ناول "فل بوٹ" شائع ہو گیا ہے، یہ تین حصوں میں منقسم ہے اور اسمیں اکیس باب ہیں۔ یہ ناول بھی آپ کے ظریفانہ طرز تحریر کا عمدہ نمونہ ہے

"شعلۂ طور" کے نام سے حضرت جگر مرادآبادی کا دوسرا دیوان مطبع مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے چھپکر شائع ہوا ہے۔ تعارفی نوٹ مولانا سید سلیمان ندوی نے تحریر فرمایا ہے۔ اسکا حجم ۱۲۰ صفحات ہے لیکن اسکی ہر ایک سطر سے شاعر کی بیخودی و بیخبری اور جوش و سرمستی ترشح ہوتی ہے۔ حضرت جگر کا شمار اُردو کے بہترین غزلگو شعرا میں ہے اسلئے قدردانانِ شعر و سخن کے لئے اس دیوان کی ڈھائی روپیہ قیمت گراں نہ ہونا چاہیئے۔

لاہور کے اولوالعزم رسالہ نیرنگ خیال نے حال میں ڈاکٹر اقبال کے نام سے ساڑھے چار سو صفحات کا ایک ضخیم اقبال نمبر شائع کیا ہے۔ اسمیں علامہ ممدوح کے حالات اور ان کے ادبی کارناموں پر بہت سے قابل قدر مضامین ہدیۂ ناظرین کئے گئے ہیں حجم و مضامین و تصاویر وغیرہ سبھی لحاظ سے یہ خاص نمبر نیرنگ خیال کے تمام سابقہ نمبروں سے سبقت لیگیا ہے جسپر ہم اپنے ہمعصر کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔

عالیجناب مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب کی ذات گرامی اُردو ادب کے لئے بھی باعثِ فخر ہے۔ آجکل حیدرآباد میں آپکی مشہور مثنوی "پریم درپن" کا مکمل قلم تیار ہو رہا ہے چنانچہ اسکے عنوان وغیرہ کی ترتیب وغیرہ کے لئے حضرت نیاز فتحپوری ایڈیٹر نگار کی خدمات حاصل کی گئی ہیں موصوف آجکل اسی خدمت کے سلسلے میں حیدرآباد میں مقیم ہیں

ہمکو یہ سُنکر بہت مسرت ہوئی کہ ہمارے محب حضرت جوش ملیح آبادی کا مکمل کلام عنقریب جامعہ عثمانیہ کی طرف سے تین جلدوں میں شائع ہونیوالا ہے۔

حال میں آپ کی چند نظمیں "شاعر کی راتیں" کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ اس چھوٹے سے مجموعہ میں بھی جوش صاحب کی چند لاجواب نظمیں ہیں۔ جوش کا کلام کیا بلحاظ لطف زبان اور کیا باعتبار مطالب شاعری و بلند خیالی آپ ہی اپنا جواب ہے اور تشبیہ و استعارہ میں اس وقت جوش کا کوئی حریف ہی نہیں ہے۔ شائقین اس مجموعے کو اعجاز الحق صاحب قدوسی نامپلی مکان نمبر ۱۶ حیدرآباد کے پتہ سے طلب فرمائیں۔

THE WOMAN'S TONIC
الٹراس کارڈی آئل یعنی اکسیر اول
ڈاکٹر اس کو جسمانی صحت کے لئے بہترین دوا قرار دیتے ہیں
ہر گھر میں اس کا رہنا نہایت ضروری ہے
ماں بہن اور بیٹی کے واسطے بہترین دوائی
Rio Chemical Co;
79, BARROW STREET
NEW YORK (U.S.A.)
ہندو شعرا
خواجہ عشرت لکھنوی کی جدید تالیف چار سو پچاس گزشتہ و موجودہ
ہندو شعرا کے حالات موثر و دلکش قابل دید چیدہ اشعار
تذکرہ آب بقا گزشتہ و موجودہ شعرا کے حالات
شاعری کا مکمل سٹ چار جلدوں میں
لغات اردو مکمل سٹ
حال اردو ہندی اور اردو کی حقیقت الفاظ کا فرق
اصلاح زبان اردو ۔ متروکات کی تشریح
ترجمان فارس ۔ اردو سے فارسی بنانیکی آسان ترکیب
زباندانی ۔ اردو کے مستند قواعد
اصول اردو ۔ صرف و نحو کے مختصر قواعد
المشتہر
مینیجر عشرت بکڈپو ۔ احاطہ خان ساماں لکھنؤ
سناٹوجن
سے
ریا کی کمزوری پر فتح حاصل کیجئے
ں کے مشہور ڈاکٹر ایچ ۔ ڈبلو ۔ ایس لکھتے ہیں
ریا کی کمزوری کے لئے مسلمہ طور سے سناٹوجن
ب سے زیادہ موثر دوا ہے ۔
ین ملیریا سے شفا بخشیگی لیکن بخار کے بعد کمزوری
ی فتحیاب نہ ہوگی ۔
ز سر نو طاقت حاصل کرنیکا صرف یہی طریقہ ہے کہ کمزور
و صحیح غذا دیجائے یہ غذا سناٹوجن ہے ۔
سناٹوجن جسم اور خون میں ٹھیک وہی اجزا داخل کرتی
ن سے قوت بنتی ہے اور تعجب انگیز تھوڑے وقت
ی نیا خون بناتی ہے ۔
ج ہی سے سناٹوجن کا استعمال
شروع کر دیجئے
SANATOGEN
اصلی مقوی غذا
سب دوا فروشوں اور بازاروں سے مل سکتی ہے ۔
ی پیکنگ کے دوران میں سناٹوجن ہاتھ سے نہیں چھوئی جاتی ۔

اصلی جرمن آٹومیٹک الارم پستول

کے لئے دھوکہ بازوں سے پرہیز کریں. تمام ہندوستان
میں صرف ہمارے پاس مل سکتا ہے اسکی صداقت میں
اعلان ہے کہ ایک ہفتہ تک اس پستول کو حسب اشتہار ایک
ایک نقطہ آزمائیں اگر ذرہ برابر فرق ہو تو ہم اپنے خرچ سے واپس
لینے کو تیار ہیں. یہ پستول جیسا کہ بلاک سے ظاہر ہے پانچ انچہ لمبا اور چار اونس وزندار ہے جو لسترا اور جیب میں بآسانی آسکتا ہے. در حقیقت یہ
اس قدر خوفناک ہے کہ دیکھتے ہی دہشت طاری ہوجاتی ہے اسمیں ہر وقت دس وارد کارتوس ایک ساتھ رکھے جاتے ہیں ضرورت پر فوراً گھوڑا دبانے سے
یکے بعد دیگرے کارتوس اس زور سے چلتا ہے کہ جس سے چور. ڈاکو. بدمعاش اور درندے پرندے کا کلیجہ دہل جاتا ہے. یہ ممکن نہیں کہ پستول کی بناوٹ
اور اس کی آواز سے ایک سکنڈ کے لئے کوئی دشمن سامنے کھڑا ہو جائے. یعنی صرف ایک آواز پر چور. ڈاکو وغیرہ اور بڑے سے بڑا خونخوار
جانور بھی بھاگ جاتے ہیں. یورپ اور ہندوستان کے بڑے بڑے سینما میں یہی پستول استعمال کیا جاتا ہے. جنگل یا کھیتوں
یا ہمراہ زر نقد لے کر سفر کرنے والوں کو در حقیقت جان کا ساتھ دینے والا ہے. یورپ کے بڑے بڑے ہتھیار بنانے
والوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ یہ پستول در حقیقت جان بچانے والا ہے.

قیمت سات روپیہ (مغہ) محصول آٹھ آنہ (۸/) پستول کے ہمراہ ۳۰ کارتوس مفت اکسٹرا ۵۰ کارتوس کی قیمت ایک روپیہ (عہ)

اے. ایچ. اینڈ کو پوسٹ بکس ۵۰۰۱ بمبئی نمبر ۹

A.H. & Co. Post Box 5001 BOMBAY, 9.

اصلی بالا ہونیکی سب سے بڑی تصدیق یہ ہے کہ گورنمنٹ نے صرف بنگال اور برہما کے لئے لائسنس لگا دیا ہے بقیہ تمام ہندوستان میں تمام مقامات پر بلا لائسنس رکھ سکتے ہیں

دلچسپ اور قابل قدر کتابیں

الاحسان مولوی محمد احسان الدین صاحب کی تالیف ہے اس کتاب میں لفظ صوفی کی تحقیق اور تصوف کی ترقی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ۴۰ صفحات قیمت ۸/

فلسفۂ جنگ ایک مشہور و معروف روسی تصنیف کے تحت میں فلسفۂ جنگ پر عالمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ حجم ۰۰ صفحات قیمت ۴/

روٹھی رانی ایک دلچسپ اور سبق آموز افسانہ جس میں راجپوت عورتوں کی جرأت کا مرقع پیش کیا گیا ہے حجم ۹۶ صفحات۔ قیمت ۶/

مشاہیر یونان و رومہ یونان اور رومہ زمانۂ قدیم میں علم و حکمت کے مرکز تسلیم کئے گئے ہیں یہ کتاب انھیں ہر دو مقامات کے بڑی بڑی ہستیوں کا تذکرہ آپ کے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کو سید ہاشمی صاحب نے انگریزی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

نوحۂ زندگی مصورِ غم علامہ راشد الخیری کو کون نہیں جانتا یہ انھیں کی وہ تصنیف ہے یہ ایک دلچسپ اور سبق آموز قصہ ہے۔ ۵۰ صفحات قیمت ۱۲/

جنگ یورپ سید محمد ابراہیم صاحب عجمی نے گذشتہ جنگ عظیم کی لرزہ خیز جنگ کا مفصل ذکر کیا ہے پر مغز معلومات اور اعداد و شمار دیئے ہیں ۴۰۰ صفحات قیمت ۸/

اسرار رنگون مسٹر داؤد کا ایک نہایت دلچسپ و نتیجہ خیز ناول ہے۔ ہر بات کو اصلی سطح پر لا کر پیش کیا گیا ہے بہت بڑی حد تک یہ ناول سچے واقعات سے مرتب ہوا ہے ۱۷۲ صفحات۔ قیمت عہ/

سلومی اسکر وائلڈ کے مشہور ڈرامہ سالومی کا ترجمہ ہے جسکو حضرت مجنوں نے نہایت محنت سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ قیمت ۸/

آغائی صاحب مولانا عبد الحلیم شرر مرحوم کی تصنیف ہے اس میں مرزا آغا علی خاں لکھنؤ کے نامور رئیس کا تذکرہ نہایت دل آویز پیرایے میں دکھایا گیا ہے۔ حجم ۱۴۴ صفحات قیمت عہ/

حسن بن صباح ملک کے شہرۂ آفاق مصنف مولانا شرر مرحوم کی تصنیف ہے اس میں حسن بن صباح (جو فرقۂ اسماعیلیہ کا ایک زبردست رکن تھا) کے دلچسپ حالات درج ہیں۔ ۴۰۰ صفحات قیمت ۶/

البیرونی علامہ بیرونی طبعیات اور ریاضیات کا زبردست عالم گذرا ہے اس کتاب میں اسی کے حالات زندگی ہیں جسکو سید حسن صاحب برنی نے ترتیب دیا ہے۔ ۰۰ صفحات قیمت ۸/

برکات سلطانی نواب سلطان جہاں بیگم والی بھوپال کے مختصر حالات زندگی مع تذکرۂ تصانیف۔ دلچسپ پیرایہ میں دکھایا گیا ہے۔ حجم ۰۰ صفحات

قربان گاہ حسن حضرت نیاز فتحپوری کا ایک دلکش شاہکار ہے یہ ایک نہایت دلچسپ افسانہ ہے حجم ۴۴ صفحات قیمت ۴/

مخزن الفوائد محمد رفیع صاحب رضوی نے ہندوستان کے اوزان اور سکوں کی شرح کے متعلق پر از معلومات تحقیق صحیح کی ہے۔ صفحہ ۲۳۰ صفحات قیمت ۸/

لیڈی ڈاکٹر مصنفہ ڈاکٹر رامیشور دیال سہا مخلص مواذ نامہ بیماریوں کی علامات و ہومیو پیتھک علاج۔ ہر گھر میں رہنے کے قابل ہے قیمت ۸/

آلام حیات انگریزی کے ماہر اہل قلم حضرات کے تصنیف کئے ہوئے ۱۲ دردناک افسانوں کا ترجمہ آلام حیات ہے یہ کتاب اپنی جلوت و خلوت میں بہترین مونس ثابت ہوگی بہترین لکھائی دیدہ زیب چھپائی قیمت ۸/

زمانہ پریس کانپور سے طلب فرمائیے

سیرت محمد علی
شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی
سیرت کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ صحیح اندازہ
کر سکیں گے کہ محمد علی کا دل اسلامی جذبات سے
کس قدر لبریز تھا اور قوم و ملک کے لئے اس نے
کیا کیا خدمات انجام دیں۔ تمام حالات آپ
سیرت میں پڑھیں۔
۲۰×۲۶ کے سائز پر تقریباً ۶۰۰ صفحات
کتابت و طباعت نہایت عمدہ
متعدد فوٹو
قیمت تین روپئے
مکتبہ جامعہ میں اردو کی کتابوں کا ایک
بہت بڑا ذخیرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔
مکتبہ جامعہ دہلی

مرتبہ:- دیانرائن نگم، بی-اے

جلد ۵۶	نومبر ۱۹۳۲ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

تصاویر:- "درخت کے سایہ تلے" (اٹھارھویں صدی کی راجپوت مصوری کا نمونہ)

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

فی پرچہ ۴ ؎ قیمت ممالک غیر سے سالانہ مع محصول ڈاک ششماہی ؎ ہندوستان کیلئے ششماہی ؎ قیمت سالانہ

یکم اکتوبر سے ہم نے اپنے

کٹ پیس اور سکنڈ ہینڈ گرم کوٹوں

کے نرخوں میں حیرت انگیز کمی کر دی ہے ہماری پرائس لسٹ منگا کر ہمارے
نرخوں کا دوسروں سے مقابلہ کریں موسم نزدیک ہے اگر روپیہ پیدا کرنا چاہتے ہو
تو ہم سے مال منگا کر اپنے شہر یا قصبہ میں تجارت شروع کر دیں نہایت منفعت
بخش تجارت ہے۔ ہمارا کٹ پیس کا مال ہندوستان بھر میں مقبول ہو چکا ہے
ہماری ایک صد دو صد اور تین صد روپیہ کی گانٹھیں ہزاروں بے روزگاروں
کو مالا مال کر چکی ہیں۔ سچ پوچھا جائے تو بے روزگاروں کا صحیح علاج
کٹ پیس و سکنڈ ہینڈ گرم کوٹوں کی تجارت ہے نام نہاد تاجروں
کے چکنے چپڑے الفاظ سے بچیں اور ہمارے نرخنامہ کا بغور مطالعہ کریں
ہمارا دعویٰ ہے کہ اس قدر کم نرخوں پر اس قدر اعلیٰ اور عمدہ مال
جیسا کہ ہم بھیجتے ہیں آپ کو کسی دوسری جگہ سے نہ ملے گا۔

سیٹھ اینڈ سامرس ۱۳-۱۱-۱ لفنسٹن سرکل فورٹ بمبئی

TRADE MARK

۱۲ ار میں ۳ گھڑیاں ۶ شیشی اوٹو اور ۹۲ انعام

ہمارے مشہور اوٹو موتیا کی چھ شیشی ۱۲ ار میں جو خریدینگے ان کو تین
گھڑیاں ایک ریلوے ٹائم ڈمی پاکٹ واچ ایک بی ٹائم پیس مضبوط
مشین والی گارنٹی ۵ سال اور ایک گولڈ گلٹ ڈمی رسٹ واچ
ایک فاؤنٹین پین گریٹ گولڈ گلٹ نب کے ساتھ ایک انگوٹھی
اور بہت سی بیش قیمت پیکنگ خرچ ۱۰ ار الگ۔

دی امریکن کامرشیل اسٹور پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۱۰ کلکتہ

وقت وقت پر آب حیات
آتنک نگرہ گولیاں

[طا]قت دینے کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہو چکی ہیں۔ قیمت فی ڈبیہ ۳۲۔ گولیاں ایک روپیہ

چندر پربھا گولیاں

سوزاک اور شباب کی ہر شکایت کی لاثانی دوا ہے فی ڈبیہ ۱۶ گولیاں ۱۶ یوم کی خوراک	ایک روپیہ
کاساتنک گولیاں ہر قسم کی کھانسی کیلئے امرت۔ قیمت فی ڈبیہ ۵۰ گولیاں	ایک روپیہ
ہیضہ کی گولیاں ہیضہ کے مرض کو تھوڑی ہی دیر میں مکمل شفا بخشتی ہیں فی ڈبیہ ۳۰ گولیاں	ایک روپیہ
جور آتنک گولیاں قدیم سے قدیم اور نئے بخار کی جڑ کو نابود کر دیتی ہیں فی ڈبیہ ۴۰ گولیاں	ایک روپیہ

ویدشاستری۔ جام نگر۔ کاٹھیاوار

"درخت کے سایہ تلے"
اتھارہویں صدی کی راجپوت مصوری کا نمونہ

زمانہ

جلد ۵۹ نومبر ۱۹۳۲ء نمبر ۵

مصوّری

(از منشی جگیشور ناتھ بیتاب۔ بی۔ اے)

انسانی خمیر میں جذبۂ تخلیق روزِ ازل ہی سے ودیعت ہوا ہے یہی باعث ہے کہ انسان عام موجودات
ب یا تعمیر میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس کی تمام مصنوعات میں سے بعض صوری حسن کی حامل ہوتی ہیں
معنوی صفات کے باعث وقیع خیال کی جاتی ہیں۔ بعض چیزیں اس کی مادی ضروریات کی تکمیل
مد و کارآمد ہوتی ہیں اور بعض نظر نوازی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

ہ اشیاء جو فن و کمال کے اعیانی و مطابق بن جاتی ہیں تعمیر خاص اغراض و مقاصد کے تمکے کے لئے عمل میں
ور حسن اتفاق یا ارادتاً جن کے عناصر کے ظہور ترتیب میں کوئی ایسی خوبی یا خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے جس کے
سے حظِ روح، مسرتِ قلب اور ایک کیف سرمدی حاصل ہوتا ہے۔ ورنہ جسمانی و روحانی ضروریات کی
ورت سے معرّا یا مملو ہر دو اقسام کی صنعت یکساں اہمیت رکھتی ہے۔

نسکرت ادب میں کلا (कला) یا فن کی دو قسمیں ہیں:۔

پ یوگی کلا (उपयोगी कला) اور (۲) للت کلا (ललित कला)

صنف میں زرگر، آہن گر، معمار، کمہار اور نقاش وغیرہ شامل ہیں۔ اور دوسری قسم تمام دیگر فنون
استو کلا (वास्तु कला) یا صنعتِ تعمیر، مورتی کلا یا بت سازی، چتر کلا یا مصوری، سنگیت کلا
کاویہ کلا یا شاعری پر مشتمل ہے۔

فنونِ لطیفہ دو مختلف اصناف میں تقسیم کئے جاتے ہیں، ایک تو وہ جن کی سحر کاری سے باصرہ محظوظ ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو سامعہ کو رام کر لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے بت سازی اور فن تعمیر کی طرح مصوری بھی نشاط باصرہ و عشرتِ نظر کی محرک ہے۔ معمار، بت تراش اور مصوّر تینوں ایک خاص آدھار (आधार) یا تمثیل کے محتاج ہو جاتے ہیں جس کی متابعت کئے بغیر وہ اپنے فریضہ سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر ان کی کاوش تخلیق کا بغور مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ یہ تمثیلی اہمیت علی الترتیب کم ہوتی جاتی ہے۔

معمار کی کامیابی کے لئے تو صرف تمثیل کی پابندی ہی کافی ہے لیکن بت ساز کا خوش فکر اور چابکدست ہونا ضروری ہے۔ اُسے کسی پیکرِ ذی روح کا بے جان نقش ثانی کندہ کرنے میں اپنی قدرتِ تخلیق کے ساتھ اسی تناسب سے شانِ خلاقی کے جوہر بھی دکھلانے پڑتے ہیں لیکن مصوّر اس سے بھی آگے جاتا ہے اور نقوش و خطوط کے علاوہ ایک ماہر نفسیات کی طرح کیفیات دل و دماغ کی باقاعدہ توضیح کرتا ہے۔

عرض و طول کی یکسانیت بُت تراش کے مرحلہ کو آسان بنا دیتی ہے اور وہ اپنی تمثیل کا ہمرنگ و ہم صورت مجسمہ بنا کر کھڑا کر دیتا ہے جسے لطیف جذبات سے کوئی مس نہیں ہوتا۔ لیکن مصوّر کی تخلیق اتنی بے حس نہیں ہوتی وہ اپنے کردار کے دل کی دنیا کو اس کے بشرہ، اس کی ادا و انداز میں اس طرح روشن کر دیتا ہے کہ اہل نظر سے اس کے جذباتِ قلبی اور محسوسات باطنی بھی پوشیدہ نہیں رہتے۔

مصوری کا آغاز یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ رسم الخط اور فن تحریر کی ایجاد سے پہلے اظہار روادات اور عرضِ مدّعا کا ابتدائی وسیلہ حروف و الفاظ کے استعمال کی بجائے یہی متعینہ حرکات و سکنات تھیں جو صفحۂ قرطاس پر ہیئت پذیر ہو کر مصوّری کی بنیاد ہو گئیں۔ صفحات تاریخ اور ماہرین فن کی تلاش و تحقیق اس امر کی شاہد ہیں کہ پتھر اور دھات کے زمانے سے بہت پہلے ہی سرزمین ہند میں مصوّری کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ کیمور او بندھیاچل کی وادیوں، سنگھان پور اور مرزا پور کی پہاڑیوں کے دامن میں ایسے بیشمار مناظر مستور ہیں جو اس دعوے کی زبانِ حال سے تائید کرتے ہیں۔

نیم وحشی انسانوں، جنگلی ہاتھیوں، بارہ سنگھوں خرگوشوں اور بھینسوں وغیرہ حیوانات کا اجتماع و نیز خونخوار درندوں کے شکار کے مہیب مناظر اب سے ہزارہا سال پیشتر کی (Cogul) کوگل (اسپین) کی مصوّری سے جو آرگنیشین (Aurignatian) نسل کے پرداز تخیل کی رہین منت ہے بالکل مشابہ ہے اس سے ظاہر ہے کہ ہزاروں برس پہلے مصوّری کا دیگر مروّجہ فنون میں شمار ہوتا تھا لیکن عقل رسا اس کے آغاز کا زمانہ تعین کرنے سے قاصر ہے۔

مختلف اقسامِ مصوری مصوری کے قدیم ترین مماثل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصور بڑے بڑے پتھروں پر اپنے

چتر لکشن کے مصنف نے نوآموز حضرات کے لئے بعض ہدایات بھی درج کی ہیں جن کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ معاشری اخلاقیات کی بنا پر وہ تمام مناظر ممنوع قرار دیئے گئے تھے جو جمالیات کے خلاف ہیں یا ہو سکتے ہیں علاوہ بریں بعض ایسی قیود بھی عاید کی گئی تھیں جن کی پابندی ہر کس و ناکس پر لازم تھی۔ مثلاً مصور کا فریضہ تھا کہ اشخاص یا متعلقہ واقعات کی تفصیلات کو شرح و لبسط کے ساتھ واضح کرے۔ اُن میں کہیں قطع و برید اور ایزاد و اضافہ سے کام نہ لے۔ جملہ اشکال مکمل و متناسب ہوں اور حرکات و سکنات جذبات کے پہلو بہ پہلو اس طرح نمایاں کی گئی ہوں کہ وہ اجتماع کی ہم آہنگی کا دم بھرنے کے علاوہ اپنی اپنی جگہ پر موزوں ہوں۔

قدمانے بشرہ کی مختلف حالتوں کو نو استھانوں میں تقسیم کیا تھا۔ ان میں (۱) رجو استھان یعنی سامنے کی حالت (۲) سچاک یعنی ترچھی حالت (۳) دویردکشناک یعنی وہ حالت جس میں دونوں آنکھیں قدرے نمایاں ہوں اور (۴) پارشو گات یعنی ایک رخی حالت کو خاص اہمیت دی گئی تھی۔ ان استھانوں کی بنیاد برہم سوتر نامی خط پر رکھی گئی تھی جو خاکہ بناتے وقت ایڑی سے چوٹی تک کھینچا جاتا تھا۔

بدقسمتی سے ہندی مصوری کی اصطلاحی معلومات کے ذرائع نہایت محدود ہیں۔ بعض مغربی مصنفین نے شاذ و نادر بر سبیل تبصرہ چند اصطلاحات بھی رقم کر دی ہیں، چنانچہ طوعاً و کرہاً انھیں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے کاک برن کا خیال ہے کہ ہندی مصوروں نے بھی ابتداءً انھیں قدیمی رنگوں کا استعمال روا رکھا تھا جو عام طور پر دیگر ممالک میں مستعمل تھے۔ سنسکرت کی پرانی تصنیفات حتیٰ کہ اپنشدوں میں بھی برش اور مصوروں کا ذکر آیا ہے۔ اولاً یہ برش بعض درختوں کی چھال سے بنایا جاتا تھا، پھر گلہری اور دیگر جانوروں کے بالوں کا استعمال ہونے لگا۔ گیرو کے رنگ کا رواج عامیانہ رنگ لئے ہوئے تھا۔ ایک قسم کے پھل اور لوہے کی خاکستر کی آمیزش سے سیاہ رنگ تیار کیا جاتا تھا۔

دیواروں پر تصویریں بنانے سے پہلے چکنی مٹی اور گوبر ملا کر پلاسٹر کیا جاتا تھا پھر اُس پر ہلکی سفیدی پھیری جاتی تھی۔ اس کے بعد آبی رنگوں سے تصویریں اُبھاری جاتی تھیں۔ وٹرروولیس (Vitruvius) اور پلینی (Pliny) کی توضیحات سے پتہ چلتا ہے کہ اہل اٹلی بھی اس عمل سے واقف تھے۔ چونکہ پلاسٹر خشک ہونے سے پیشتر تصویر کا مکمل ہو جانا ضروری ہوتا تھا۔ اس لئے صرف اسی قدر تہہ جمائی جاتی تھی جس پر مصور مقررہ وقت میں اپنا کام تمام کر سکے۔ اس کے علاوہ سطح کا جس قدر حصہ عریاں رہ جاتا تھا اُسے چھیل دیا جاتا تھا۔ اور پھر از سر نو تہہ چڑھائی جاتی تھی۔

ہندی کاریگروں نے تہہ چڑھانے اور جوڑ ملانے میں اس درجہ کمال دکھایا ہے کہ ہزار ہا برس کے بعد بھی جوڑ کا نشان ملنا تو درکنار کہیں شبہ بھی نہیں ہوتا۔ اہل یورپ کے ہاں یہ بات نظر نہیں آتی۔

تصویروں کو جلا دینے کے لئے بعض پھلوں کا گودا، چربی، سور کا دانت اور کوڑیاں وغیرہ کام میں لائی گئی ہیں۔

دیواروں پر کی مصوّری کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ سطح پر استرکاری کر کے پلاسٹر خشک کر لیا جاتا تھا۔ اور مصوّر اپنا عمل شروع کرنے سے پہلے اُسے پانی سے تر کر کے اُس پر سفیدی کی باریک تہہ جماتے تھے سنہ عیسوی سے بہت پہلے مصر اور میسو پوٹامیہ میں یہ عمل رائج تھا۔ بودھوں کے نظامِ عمل اور طریقۂ کار میں مصری صناعوں سے اس درجہ مشابہت ہے کہ ان کے رشتۂ اتحاد میں منسلک ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ہندی کاریگر بالعموم سرخ سیاہ زرد سبز خاکی آسمانی اُودے اور لاجوردی وغیرہ رنگوں کا استعمال کرتے تھے اور سطح کو مثل آئینہ چمکا دیتے تھے۔ اس ضمن میں فرانس کی عہدِ حال کی مصوری اور بودھوں کے انداز قدیم میں بہت کچھ مطابقت پائی جاتی ہے۔

"بودھ اپنے مناظر کی سُرخ رنگ سے حاشیہ آرائی کرتے تھے اور اس میں حسبِ موقعہ و محل بغرضِ اصلاح سیاہ اور خاکی رنگ استعمال کرتے تھے۔ اور پھر موڈل یا ابتدائی ہلکے نقوش کی جھلک، سیاہ و سفید رنگوں سے عکاسی کر کے تصویر میں جان ڈال دیتے تھے۔" (ہیرگھم) "گلابی، زعفرانی، ارغوانی، بسنتی، دھانی اور چمپئی رنگوں کی زیبائش سے ان کی مصنوعات اس درجہ حسین و رنگین بن گئی ہیں کہ زمانہ کے تخریبی اثرات کے باوجود ہنوز وہی شان وہی رونق ہے۔" (براؤن)

راجپوتوں اور بودھوں کی اصطلاحی مشابہت اِن دونوں اسکولوں کے ہم مخرج ہونے کی دلیل ہے۔ جدول کی تکمیل میں راجپوت مصوّر بودھوں کے نقشِ قدم پر گامزن ہوا ہے۔" (اے۔اسمتھ)

مغلوں کے عہد میں بھی تمام ضروری اشیاء ہندی مصوّر کی خود ساختہ ہوتی تھیں۔ کاغذ کی ایسی کتنی ہی قسمیں تھیں جن پر صناع اپنا زورِ قلم صرف کرتے تھے۔ ان میں سے بعض بہت مشہور تھیں، مثلاً:۔

(۱) حریری یا ریشمی (۲) دولت آبادی (۳) ہندی (۴) سیالکوٹی (۵) مغلی اور (۶) کردی یا میسوری یہ کاغذ بانس، پٹ سن، ٹاٹ اور ٹول (Tuni) یا کپاس سے بنایا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ایک خاص قسم اور بھی تھی جو سنی (Sunni) کہلاتی تھی۔ یہ سن اور دیگر چھالوں کے مرکب سے تیار کی جاتی تھی۔ بعض کتب میں ایرانی اور اصفہانی کاغذ کا بھی ذکر آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیرونجات سے بھی اس مقصد کے لئے کاغذ کی خرید و فروخت ہوا کرتی تھی۔ ان تمام کاغذوں کا رنگ بادامی ہوتا تھا۔ مصوّر سطح کی تیاری سے قبل کوڑی وغیرہ گھس کر کاغذ کو چکنا اور ہموار کر لیتا تھا۔ پھر اُس پر اپنے مخصوص رنگ میں نقوش کی تشکیل کرتا تھا۔

پہلے خاکہ بنایا جاتا تھا جس کی تیاری میں گیرِیکا نامی رنگ لگایا جاتا تھا۔ جو بالکل کچا ہوتا تھا اور بآسانی اُٹھ سکتا تھا۔ کاجل سے جدول نمایاں کی جاتی تھی۔ اور دیگر رنگ کا رنگ انواع و اقسام کی معدنیات و نباتات سے خاص کیمیائی اصولوں پر تیار کرتے تھے۔ مثلاً زرد رنگ ملتانی مٹی سے اور سبز رنگ برگ حنا وغیرہ سے بنایا جاتا تھا۔ مغل مصور ہرن[1] کی جربی پر اپنی تمثیلوں کا عکس لے لیا کرتے تھے، جو "چربہ[2]" کہلاتا تھا۔ اس چربہ کی مدد سے ایک تصویر کی بآسانی متعدد نقلیں لی جاسکتی تھیں۔

مغلوں کا "حاشیہ" سیاہ خط کی سادہ جدول کی بجائے "گلکاری" اور "بیل بوٹوں" کا نادر نمونہ ہوتا تھا۔ جس میں کہیں کہیں طلائی رنگ کا بھی استعمال کیا جاتا تھا جسے "ٹِکّہ" یا "ٹکلی" کہتے تھے۔ کبھی "زر افشانی" سے بھی جدول مزین کی جاتی تھی۔ جسے شفق کہتے تھے۔ بسا اوقات سنہری رنگ کے ذرات کو منتشر کرکے تصویر کو جلا دی جاتی تھی۔ اسے غبار بولتے تھے۔ حاشیہ کو خوشنما اور رنگا رنگ پھولوں سے آراستہ کرنا جھاڑ مشہور تھا۔

مصوّر کا قلم اونٹ، بکرے، گھوڑے اور گلہری وغیرہ کے بالوں سے بنتا تھا۔ ان میں سے بعض تو اس قدر نفیس ہوتے تھے کہ بال سے بھی زیادہ باریک خط کھینچنے کی قدرت رکھتے تھے۔ جزیرۂ لنکا میں ایک خاص قسم کی گھاس ہوتی تھی جو "تیلی تنہ" مشہور تھی۔ اس کے نرم و باریک ڈنٹھل سے بہترین برش بنائے جاتے تھے۔ بسا اوقات مصوّر اپنی تصویر رنگنے میں خالص پانی کا بھی استعمال کرتا تھا۔ اس عمل کو "آبینہ" کہا جاتا تھا۔ کشمیری مصوّر اس عمل سے مناظر کی عکاسی کرنے میں طاق تھے۔ رنگوں میں اکثر گوند، شکر، گڑ اور السی وغیرہ حل کردی جاتی تھی۔

بعض صناعوں نے کپڑے اور کرمچ پر بھی تصویر سازی کے جوہر دکھائے ہیں۔ شہنشاہ ہمایوں نے اپنے کتب خانہ کے لئے "حمزہ نامہ" کی ایک نقل کرمچ پر اتروائی تھی۔ اس نایاب کتاب کے چند اوراق پریشاں ہنوز مغربی عجائب گھروں کی زینت ہیں۔ مصوّری کی اس صنف کی اور بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ اتنی مقبول نہ ہوئی جتنی کہ بعض دوسری قسمیں مرغوب و مشکور ہوئیں۔ ابتداءً روغنی رنگوں کو بھی پسندیدہ نظر سے نہ دیکھا گیا۔ کہتے ہیں کہ جب جہانگیر کے حضور میں دو تصویریں پیش کی گئیں تو اس نے ان میں سے ایک کو صرف اس بنا پر ناپسند کرکے واپس کردیا کہ وہ روغنی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جنوبی ہند میں روغنی تصویریں اکثر و بیشتر نظر آجاتی ہیں مگر ان سب پر مغربی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ عہدِ حال کے مصوّر قدما کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کر رہے ہیں چنانچہ انھوں نے بھی داد و فن دینے کے لئے آبی رنگوں کا انتخاب کیا ہے۔

[1] مغل مصور بالعموم ہندو تھے اور ہرن کی چربی اسلئے استعمال کرتے تھے کہ وہ پاک خیال کیجاتی تھی۔ [2] چربی ہی کی نسبت سے یہ عکس چربہ کہلاتا ہے۔ [illegible]

اردو شاعری اور حب وطن

(از سید اعجاز حسین ایم۔ اے لیکچرر الہ آباد یونیورسٹی)

محبت شعر کی جان اور شاعر کا ایمان ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ادب اس سے خالی ہو۔ اردو شاعری میں اس کا سکہ اس قدر رواں رہا ہے کہ ظاہر بیں نظروں نے یہی سمجھا کہ اس میں بجز گل و بلبل یا حسن و عشق کی داستان کے اور کچھ نہیں۔ لیکن جس طرح ہر جگہ حسن سے مراد محض حسنِ ظاہری نہیں اور عشق کا مطلب صرف عشق مجازی تک محدود نہیں اسی طرح ہر شعر میں گل سے مراد گلاب یا اور کوئی پھول نہیں اور بلبل سے مراد چڑیا نہیں، گو کہیں کہیں یہ الفاظ اپنے اصلی معنوں میں بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ مگر کبھی معشوق کبھی داغ جگر یا داغ دل کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ اسی طرح بلبل سے اکثر اوقات ہمارے شعرا نے پیکر انسان یا ایک عاشق مزاج انسان مراد لیا ہے جس کی رگوں میں ہوتے ہوئے محبت کے دریا موجزن ہیں۔ بلکہ جس کی ہستی کو سراپا محبت سمجھنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ گر محبت کو محض انسان اور خدا تک محدود کرنا سخت تنگ نظری ہوگی۔

ارباب تصوف کا ذکر ہی کیا جن کو ہر شے میں حسن ازل کی جھلک نظر آتی ہے اور جو سب سے عشق رکھتے ہیں، دوسرے طبقوں میں بھی کثرت سے ایسے لوگ ملیں گے جن کو بے جان چیزوں سے بھی الفت ہوتی ہے۔ بلبل کو جو اپنے آشیانہ سے محبت ہوتی ہے محتاج بیان نہیں پھر جب یہ ممکن بھی ہو سکتا ہے تو کیا آشیانہ سے مراد صرف چند تنکوں کا گھونسلا ہی ہوگا یا کسی انسان کے وطن کی طرف بھی اس سے اشارہ ہو سکتا ہے۔ عہد حاضر کے مشہور شاعر ڈاکٹر اقبال نے بھی ہندوستان سے محبت ظاہر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

سودا کے یہاں بھی چند اشعار ایسے ہیں جن سے ہمارے بیان کی تائید ہوتی ہے

مژدہ یہ ہم صفیروں کو پہنچے تھیں کہ تم بھی　　جو دم تھے تنگ بہت زندگی کی حسرتوں سے

لو ٹکڑوں سے سمال نے کنج قفس کو ہو دیا　　ہے پہنچے چمن تک چہچہے قفسوں سے

نے رات چین مجکو آہ و فغاں سے اپنے　　نے دن پڑوسیوں کی راحت ملامتوں سے
دیکھو اثر تو خاطر نالہ کی ٹک ہمارے　　پہونچا ہے دل سے لب تک سخت زحمتوں سے
سودا وطن کو تج کر گردش سے آسماں کی　　آوارہ غربتی ہے پھر اتنی مدتوں سے

آتش و دیگر اساتذہ بھی آشیاں وغیرہ انھیں معنوں میں استعمال کرتے ہیں، مثلاً:-

آتش:- قدم بھاری ہمارا ہوگا ہم پر باغِ عالم میں　　وہ ٹہنی پھٹ پڑیگی جس پہ اپنا آشیاں ہوگا
شاد:- ہمارے بعد یہ ہے حال ہمصفیروں کا　　اس آشیاں میں صدا دی اُدھر پکار آئے

کون کہہ سکتا ہے کہ اگر صاف وصریح الفاظ میں یہی بات کہی جاتی تو اتنا ہی اثر اور لطف باقی رہتا۔

بہر حال اُردو شاعری میں حبِّ وطن کی کمی نہیں ہے، وطن کی قدر وطن چھوٹنے پر معلوم ہوتی ہے۔ میر کو جب اکبر آباد چھوڑنا پڑا تو نہایت یاس وحسرت کے ساتھ رخصت ہوئے ہیں، اس وقت جو اُن کے دل پر گذری تھی اُس کا نقشہ چند الفاظ میں یوں کھینچتے ہیں ؎

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی　　در و بام پر چشم حسرت پڑی
کہ ترکِ وطن پہلے کیونکر کروں　　مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں
دلِ مضطرب اشکِ حسرت ہوا　　جگر رخصتانے میں رخصت ہوا

یہی ایک واقعہ نہیں بلکہ اکثر وطن اور یارانِ وطن کی محبت دل کو بیچین کر دیا کرتی تھی اور حسرت ویاس کے لہجہ میں سب کو یاد کیا کرتے تھے۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے　　جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

یہی حال سودا کا تھا، دلّی اُجڑ چکی تھی، اہل کمال رخصت ہو رہے تھے، نواب اودھ جوہر شناس تھے اُنھوں نے مرزا کو برادر مشفق و مہربان لکھکر لکھنؤ بلایا، مگر ان کو وطن چھوڑنا شاق تھا ابھی کچھ ایسے باہمت قدرداں موجود تھے کہ جن کے سہارے پر اُنھوں نے لکھنؤ جانا پسند نہ کیا اور نواب کو ایک رباعی لکھ کر بھیج دی

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک　　آوارہ ازیں کوچہ بر آں کو کب تک
حاصل بھی اس سے نہ کہ دنیا ہوئے　　بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

آتش کی حب الوطنی کے ثبوت میں یہ واقعہ پیش کر دینا کافی ہوگا کہ ان کا ایک شاگرد تلاش معاش کے لئے وطن چھوڑ کر پردیس جانا چاہتا تھا۔ آخری رخصت کے لئے جب حاضر ہوا تو ان سے پوچھا کہ حضور بنارس جاتا ہوں وہاں کے متعلق کوئی فرمایش ہو تو بجا لاؤں کہنے لگے اور تو کچھ نہیں ہاں وہاں کے

کو میرا اسلام کہدینا حیرت سے پوچھنے لگا کہ حضور کیا وہاں کا خدا دوسرا ہے جواب دیا جب یہاں و ہاں
خدا ایک ہے تو پھر گھر چھوڑنے کی کیا ضرورت جو کچھ قسمت میں ہوگا یہیں مل جائیگا۔ آتش نے وطن
محبت کا اظہار متعدد مقامات پر کیا ہے۔ اور ایسے اشعار لکھے ہیں جن کے ہر ہر لفظ سے وطن کی محبت
ٹپکتی ہے :-

پاؤں شل ہوگئے تھے ٹھوکریں کھاتے کھاتے ہم غریبوں کو خدا ہی نے وطن دکھلایا

ان کو وطن ہی نہیں بلکہ اہل وطن سے بھی الفت ہے۔ دیکھئے کس مزے میں امید اور شکایت کا اظہار کرتے ہیں :-

غربت زدوں کے حال کا افسانہ چھیڑتے ہوتی اگر طبیعت اہل وطن درست

اس سے زیادہ حب الوطنی کا اظہار اور کیا ہو سکتا ہے۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں :-

وہ آدمی نہیں جسے حب وطن نہ ہو

یہ ہے کہ خواجہ آتش نے جس جوش اور محبت کے ساتھ اپنے حب وطن کا اظہار کیا ہے۔ اس کی
دوسروں کے یہاں مشکل سے ملتی ہے۔ مگر پھر بھی جس انداز کے ساتھ ذوق مرحوم نے اپنے یہاں یہ
ت نظم کئے ہیں وہ بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ نہ صرف وطن اور اہل وطن سے محبت ہے بلکہ وطن
کی ہر شے ان کو عزیز ہے۔ فرماتے ہیں :-

بلبل قفس میں کوئی ہم تک ہے پہونچتا گل برگ جیسے غربت میں تنفیقات وطن کا غذ

دہلی برائے نام دہلی رہ گئی تھی، لکھنؤ اور دکن میں قدر دانی اور فیاضی کے دریا موجیں مار رہے تھے
اہل کمال جوق جوق ادھر جا رہے تھے، مگر اس شناور بحر محبت کے لئے وطن کے سنگریزے جواہرات
سے کم نہ تھے۔ ان میں وہ مقناطیسی اثر تھا کہ جس نے دوسری طرف نظر اٹھانے نہ دیا۔ بلکہ اس کو
استغنا و حب وطن سمجھکر صاف صاف کہہ دیا ؎

گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں قدر سخن کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

جس کو اپنے وطن سے محبت نہیں اور جس کو نہیں ہے اسکو کس حیرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں

آخر چمن سے نکہت گل کر گئی سفر خانہ بدوش کو نہیں الفت وطن کے ساتھ

غالب نے ۱۸۵۷ء میں دلی کو جس بری طرح اجڑتے ہوئے دیکھا اس کا ان کے دل پر اتنا گہرا
اثر ہوا کہ ہمیشہ خون کے آنسو رویا کئے چنانچہ اس زمانے کے اکثر خطوط میں اپنے درد دل کا حال او

اہل وطن کی داستانِ غم نہایت دردانگیز پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"یہاں اغنیاء اور امراء کے ازدواج اور اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں، اس مصیبت کی تاب لانے کے لئے جگر چاہیئے"

مگر غالب نے وطن کا مفہوم صرف دلی تک محدود نہیں رکھا۔ لکھنؤ کی تباہی پر بھی ایک خط میں لکھتے ہیں

"ہائے لکھنؤ کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گذری، اموال کیا ہوئے، اشخاص کہاں گئے خاندان شجاع الدولہ کے زن و مرد کا کیا انجام ہوا"

دراصل وہ تمام ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے تھے، اس کے جاہ و جلال عظمت و وقار کو مٹتے دیکھکر ان کا دل بھر آتا ہے، خون کے آنسو روتے ہیں اور کہتے ہیں:۔

ہندوستان سایۂ گل پایہ تخت تھا جاہ و جلال عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ

ہر داغ تازہ یک دل داغ انتظار ہے عرضِ فضائے سینہ دردِ امتحاں نہ پوچھ

عجب کیا کہ ہندوستان ہی کی مصیبت اور بربادی پر یہ کہا ہو ؂

جوئے خوں بہنے دو آنکھوں سے کہ ہے شامِ فراق میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہوگئیں

ظفر کو بھی جو محبت وطن سے تھی محتاج بیان نہیں، مگر قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس وطن کو انھوں نے اس قدر عزیز رکھا اُس نے مرحوم کو تاج و تخت درکنار قبر کے لئے بھی دو گز زمین دینا گوارا نہ کیا۔ کیا عجب ہے ظفر مرحوم کو رنگون میں دمِ نزع غالب کا یہ شعر یاد آیا ہو:۔

رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور

بہر نوع ظفر کے کلام میں بہت سے اشعار ہیں جس میں حبِ وطن کا عنصر موجود ہے۔ دیگر شعرا کا بھی یہی حال ہے۔ چنانچہ جب کبھی یہ لوگ اپنا شہر چھوڑ کر دوسری جگہ گئے ہیں وطن اور اہل وطن کی یاد ان کے دل کو ہمیشہ بے چین کئے رہتی تھی۔ امیر مینائی نے کیا خوب کہا ہے:۔

وطن کی یاد ہے لیل و نہار غربت میں یہی ہے ایک بڑی غمگسار غربت میں

تڑپ گیا صفت برق یہ دلِ مضطر برس پڑا اگر ابرِ بہار غربت میں

وطن سے باہر ہوتے ہی اہلِ وطن نے جو صدمے دیئے تھے وہ بھی باعثِ ملال نہیں رہے۔

جو دوستانِ وطن نے دیئے تھے داغ امیر میں جانتا ہوں اُنھیں لالہ زار غربت میں

داغ بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہے" ان کا شیشۂ دل وطن کی بربادی سے چور چور ہے، یوں تو غزلوں میں بھی اس کا اکثر اظہار کیا ہے لیکن دلی کی بربادی پر جو شہر آشوب لکھا

اس کا ہر بند پڑھکر دل بھر آتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلی   بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دلی
جواب کا ہیکو تھا لاجواب تھی دلی   مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلی
پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

یہاں کی شام تھی مانند صبح نورانی   یہاں کے ذرے میں تھی مہر کی درخشانی
یہاں کے سنگ سے تھا تیرہ لعل رمانی   یہاں کی خاک سے ہوتا تھا آئینہ پانی
یہ شہر وہ تھا کہ سایہ بھی نور تھا اس کا
چراغ رنگ تجلیٔ طور تھا اس کا

برنگ بوئے گل اہل چمن چمن سے چلے   غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے   قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے
مقام امن تھا ڈھونڈھا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا سے پناہ بھی نہ ملی

کہاں تک آہ لکھوں اس کا حال بربادی   کہاں تک آہ کہوں آسماں کی جلادی
کسی کو قید محن سے نہیں ہے آزادی   کہ داغ داغ ہے دل ہر کوئی ہے فریادی
الٰہی پھر اسے آباد و شاد دیکھیں ہم
الٰہی پھر اسے حسب مراد دیکھیں ہم

اوپر کی سطروں میں زیادہ تر غزلیات کے اشعار ہدیۂ ناظرین ہوئے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اردو شاعری کے قریب قریب ہر صنف میں حب وطن کے جذبات کی جھلک موجود ہے۔ چنانچہ مرثیہ میں بھی اکثر اس قسم کے خیالات ملتے ہیں۔ مثلاً میر انیس ایک جگہ فرماتے ہیں:-

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں   راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں
سو شکل ہوں پھر دھیان لگا رہتا ہے گھر میں   پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں
سنگِ غمِ فرقت دل نازک پہ گراں ہے
اندوہ غریب الوطنی کاہش جاں ہے

گو راہ میں ہمراہ بھی ہو راحلہ و زاد   جاتی نہیں انسان کی خاطر ناشاد

جب عالم تنہائی میں آتا ہے وطن یاد ہر گام پہ دل مثل جرس کرتا ہے فریاد

اک آن غم و رنج سے فرصت نہیں ہوتی

منزل پہ بھی آرام کی صورت نہیں ہوتی

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ایک بڑا سیاسی انقلاب شروع ہوا، وطن اور اہل وطن کی بربادی پر قوم و وطن کا خیال پیدا ہوا۔ یہ مغرب کا احسان ہے کہ اس نے مشرق میں آزادی کی روح پھونک دی۔ ہندوستان میں بھی بیداری کے آثار پیدا ہوئے، ہر جگہ وطن پرستی کا چرچا ہونے لگا۔ اور ہر شخص نے حسب استعداد اس جذبہ کے اظہار کرنے کی فکر و تدبیر کی چنانچہ اردو کے شعرا نے بھی رفتہ رفتہ اس معرکہ میں قدم بڑھانا شروع کیا۔ حالی نے حب وطن، کے نام سے ایک مثنوی لکھی جس میں تمام تر کوشش کی گئی ہے کہ لوگوں کو وطن کی طرف توجہ دلائی جائے، اور اس کی حالت سے آگاہ کیا جائے۔ آزاد نے بھی ایک خاص عنوان سے حب وطن کے حقیقی معنی سمجھائے اور اس آگ کو اور بھی تیز کر دیا۔ نیا اور دلچسپ میدان دیکھ کر دوسروں نے بھی قدم بڑھائے۔ اس معرکہ میں خاص طور سے قابل ذکر اقبال اور چکبست ہیں۔ اقبال کی نظمیں زبان زد خلائق ہیں، تمام ہندوستان ان کے ترانہ سے گونج رہا ہے، بچہ بچہ کی زبان اُن کی قومی نظموں سے لطف اندوز ہے۔ چکبست کے دیوان کا بہت بڑا حصہ اسی شاعری کا ذمہ دار ہے۔ انھوں نے زلف و گیسو کے بجائے آہنی زنجیروں اور قومی ایثار کے ذکر سے اپنا دیوان آراستہ کیا ہے۔ ہر شعر سے وطن یا حبِّ وطن کی قدر و بزرگی ٹپکتی ہے۔ گو وہ اب اس دنیا میں نہیں مگر ان کی قومی نظمیں اب بھی گرمیِ محفل کا باعث اور ان کا نام زندہ رکھنے کی کے لئے کافی ہیں۔ اس دورِ جدید کا ایک اثر یہ بھی ہوا ہے کہ غزلوں میں بھی حب وطن کے جذبات پہلے سے زیادہ جگہ پانے لگے، کسی نے صاف اور کسی نے پوشیدہ طور پر حب وطن کا اظہار کیا۔ حب الوطنی کی سرحد سیاسی تحریک سے ملی ہوئی تھی، ہمارے شعرا نے بھی اس میں قدم رکھا اور گلہائے عقیدت کو مادر ہند کے خدمت میں نذر کیا۔ اکبر مرحوم نے کبھی ہنسا کر اور کبھی طنز کے پیرایہ میں وطن اور اہل وطن کے سدھارنے کی فکر کی۔ ان کے ایک ایک شعر نے وہ کام کیا جو کئی تقریروں سے بھی نہ نکلتا۔

کہتا ہوں میں ہندو و مسلمان سے یہی اپنی اپنی روشوں پہ تم بنے نیک رہو

لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بنجاؤ موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

کیسی ہی سلطنت ہو سب خوش نہ رہ سکیں گے گر ترک ہے تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا

رعایا کو مناسب ہے کہ باہم دوستی رکھیں حماقت حاکموں سے ہے توقع گرم جوشی کی

حسرت موہانی کا کیا کہنا وہ سراپا حب وطن ہیں اور ان کا دیوان جوش و درد کا [illegible]
کبھی وطن کی محبت میں آپ بیتی نظم کرتے ہیں تو بے ساختہ منہ سے آہ نکل جاتی ہے۔ ان کی زندگی قومی
ایثار کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

مولانا صفی بھی اکثر غزلوں میں وطن کے درد کا اظہار کرتے ہیں، ایک جگہ کہتے ہیں :-

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے　　آشیاں اُجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے

موجودہ قومی تحریک اور باہمی نفاق کے متعلق کیا خوب کہا ہے۔

ایسی گھڑی میں دوستو رخنہ گری ہے خودکشی
ہم بھی اسی جہاز میں تم بھی اسی جہاز میں

تین چیزیں

بہادری، شرافت اور خلوص کو عزیز رکھو
اخلاق، قابلیت اور مسرت کی قدر کرو۔
ظلم، تکبر اور احسان فراموشی سے نفرت کرو۔
مذہب۔ انصاف اور ہمدردی کی عزت کرو۔
بے ایمانی، خودنمائی اور عداوت کو نظرانداز کرو۔
حسن، فیاضی اور آزادی سے مسرور رہو۔
تندرستی۔ دولت اور اچھے چال چلن کے لئے کوشش کرو
سچائی۔ سلامتی اور صفائی قلب کے لئے التجا کرو۔
مہربانی، اچھے اطوار اور خوش باشی کو پسند کرو۔
چاپلوسی، وہم اور فوری دوستی کا یقین نہ کرو۔
کاہلی۔ بیکار باتوں اور فوری فیصلہ کو چھوڑ دو۔
اچھی کتابوں۔ اچھے دوستوں اور اچھے کاموں میں اضافہ کرو۔
اپنی عزت۔ ملک اور تمدن کے لئے جنگ کرو۔
مزاج۔ نفسیات اور زبانوں کو قابو میں رکھو۔
رنج۔ نقصان اور موت کے مقابلہ کیلئے تیار رہو۔

عزت صدیقی

چندر گپت اعظم

(از ٹھاکر جے۔آر۔رائے صاحب جرنلسٹ۔لاہور)

موریہ خاندان کا بانی چندر گپت اعظم نہ صرف ہند قدیم ہی کا سب سے بڑا تاجدار فاتح ہے۔ بلکہ زمانہ قدیم کا کوئی حکمران اس کی ہمسری کا دم نہیں بھر سکتا جس معیار سے دنیا نے بڑے بڑے فاتحوں اور فرمانرواؤں کے معیار زندگی کے رو سے چندر گپت اعظم کے کمالات پر نگاہ ڈالی ہے۔ وہ دنیا کے تمام حکمرانوں میں سب سے بڑا شمار ہونے کے قابل ہے۔ اس نے قدیم زمانے کی سب سے بڑی سلطنت اپنی قوت بازو سے قائم کی تھی اور اس کا ایسا جامع اور اعلیٰ نظام حکمرانی وضع کیا تھا کہ زمانۂ حال کی ترقی یافتہ قومیں اپنی اعلیٰ تمدنی ترقیوں کے باوجود اس میں کوئی اضافہ نہیں کر سکی ہیں۔

چندر گپت کا حسب و نسب مغربی ماہرین تاریخ چندر گپت کی ابتدا بہت ادنیٰ اقرار دیتے ہیں جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ وساکھ دت کے ناٹک مدرا راکشش کا جو ساتویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے تتبع کرتے ہیں بعض اسے مگدھ کے دلاور حکمران مہاپدم نند کا سپہ سالار اور نزدیکی رشتہ دار گمان کرتے ہیں۔ ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ اسے پنجاب کے کسی راجہ کا بیٹا ظاہر کرتی ہے۔ لیکن زمانہ قدیم کے بودھ اور جینی گرنتھوں کی جانچ پڑتال سے ظاہر ہوتا ہے کہ چندر گپت کے باپ دادا مہاتما بدھ کی قوم شاکیہ کی ایک شاخ سے تھے۔ اس کی کیفیت یوں مذکور ہے کہ راجہ بیسٹر ودڈھب نے جب شاکیہ قوم پر حملہ کیا تو اس کے چند آدمی نقل مکان کر کے چلے گئے۔ وہ ہمالہ کے دامن میں ایک ایسے خطہ میں جا نکلے جو کئی سڑکوں کا مرکز تھا۔ بڑا پرفضا اور شاداب تھا جنگل میں بیشمار مور تھے وہاں پر انھوں نے بستی بنائی۔ مکانات کی وضع مور ایسی مرتب کی۔ ہوتے ہوتے یہ مقام موری نگر مشہور ہو گیا۔ آریہ ورت کے لوگ اس خطے کے لوگوں کو موریہ پکارنے لگے۔ اسی قوم کا بہادر راجہ چندر گپت کا باپ تھا جو اپنی قوم کے دشمنوں سے لڑتا ہوا کام آیا۔ بیوہ رانی کا بھائی اسے پشپ پور لے گیا جہاں پر باپ کی وفات کے چند ہفتے بعد چندر گپت پیدا ہوا تھا۔ مگر ماں بھی جلد ہی عالم بالا میں اپنے بلند ہمت شوہر سے جا ملی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ رانی مرتے وقت اسے کسی گوالے کی عورت کے حوالہ کر گئی تھی۔ بہر حال یہ بات قرین قیاس ہے کہ چندر گپت کی نانا اور ماموں کے ہاں پرورش ہوئی۔ اسے سب جنگی ہنر اور علوم سکھائے گئے۔

ڑا ہی ذہین اور نڈر اور ہر ہنر میں یکتا تھا۔ ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی دور کے تاجدار نے
راجہ کے ہاں بہت بڑا شیر پنجرے کے اندر بند کرکے بھیجا اور یہ شرط پیش کی کہ پنجرہ کا دروازہ کھولے
اسے بھگا دیا جائے، سب درباری ہار گئے اتفاق سے چندر گپت وہاں پر جا نکلا اُس وقت وہ پندرہ
سال کا لڑکا تھا جب اُس نے شیر کا ماجرا سنا تو پنجرے کے پاس جاکر خوفناک شیر کو غور سے دیکھا
سلاخیں اور آگ منگائی، جب سلاخیں گرم ہوگئیں تو شیر کے بدن میں بھونک دیں۔ چند ہی منٹ
شیر پانی بن کر بہ نکلا۔ دراصل وہ شیر موم اور مصالح سے بڑی ہنرمندی سے بنایا گیا تھا۔ اوروں کی آنکھ
کھا گئی مگر چندر گپت اصلیت کو بھانپ گیا جس سے اس کی غیر معمولی تیز فہمی اور ذہانت عیاں ہے۔
چندر گپت کی ولادت سے بہت پہلے دیگر پہاڑی قوموں کے ساتھ موری قوم بھی والی مگدھ کی
ہو چکی تھی۔ وہ بڑا ظالم اور سفلہ حکمران تھا۔ جب چندر گپت جوان ہوا تو پہاڑی سرداروں نے مگدھ
آزاد ہونے کی ٹھانی، بہت سے جوان بھرتی کرکے فوج تیار کی گئی اور چونکہ چندر گپت کی بیباکی دلاوری
ہوشیاری پر سب کو بھروسہ تھا اس لئے اسے اس کا کمانیر بنایا گیا۔ چانک جو نندا کو نیست و نابود
نے کا حلف اُٹھا چکا تھا چندر گپت کا نام سُنکر اس کے پاس چلا گیا اور اس منصوبہ میں شامل ہوگیا۔
گپت میدان میں اُترا اور نندا کی سپاہ کو پے در پے شکست دیکر پریشان کردیا۔ مگر جب خاص لشکر
یا لاڑا تو چندر گپت کی کچھ پیش نہ گئی۔ اگر وطن کو لوٹ کر جاتا تو شاہی لشکروں سے دامن چھڑانا محال
اس لئے غالباً چانک کے حسب ایما چند وفاداروں کے ساتھ پنجاب کی طرف چلا آیا۔ یونانی لکھتے ہیں
ب چندر گپت لڑکا ہی تھا تو وہ سکندر سے ملنے کو آیا تھا۔ مگر سکندر اس کی بے تکلفانہ بات چیت
رہ خاطر ہوگیا۔ اس لئے اس کا سر قلم کئے جانے کا حکم دیا۔ مگر چندر گپت بڑی عجلت اور دلاوری سے
ندر کے ڈیرے سے نکل بھاگا۔ ایک درجن یونانی شہسواروں نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ کسی کے
نہ آیا۔ اُس وقت سکندر کو اس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یہی بیباک لڑکا ایک دو سال کے اندر
یری سلطنت پنجاب و سندھ کے تمام نشانات مٹا دیگا۔ سکندر کے ظالمانہ برتاؤ سے چندر گپت پر یہ
ن ہوگیا کہ یونانی حملہ آور آپ ہی سفاک اور سفلہ ہے جیسا کہ نندا ظلم دوست اور بے رحم ہے۔ اس پر
اس نے دونوں کو ٹھکانے لگانے کی ٹھانی۔ یونانی کہتے ہیں کہ چندر گپت سکندر کو مگدھ پر لشکر کشی
کی ترغیب دینے کو گیا تھا اور یہ قرین عقل ہے۔ نندا کے جور و ستم سے سبھی نالاں تھے۔ اس وجہ سے
ت کی بات نہیں کہ چندر گپت سکندر کو شہ دینے گیا تھا۔ اگر پنجاب کے سرداروں سے لڑتے لڑتے
ں سردار اور ان کے سپاہی دل شکستہ نہ ہوگئے ہوتے تو سکندر ضرور تاجدار مگدھ سے مقابلہ کرنے

کو میدان گنگا میں اُترا جس کے پاس دو لاکھ پیدل بیس ہزار رسالہ نو ہزار جنگی ہاتھی اور چھ ہزار رتھ تھے گو نندا بڑا ظالم تھا مگر بڑا دلاور اور کارواں سپاہی اور بلند پایہ مدبر تھا۔ سکندر نے فقط لشکر کثیر سے بارہ چودہ گھنٹے کی سخت معرکہ آرائی کے بعد پورو کو زیر کیا تھا۔ دارا ثالث شاہ ایران عیاش بزدل اور گھٹیا حکمران تھا۔ اس وجہ سے سکندر کامیاب ہو گیا تھا مگر نندا کا راج ہمالہ کی ترائی سے بندھیاچل تک اور برہمپتر سے الہ آباد تک پھیلا ہوا تھا۔ اسے سکندر شکست دینے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔

چندر گپت کے کارنامے

اکتوبر ۳۲۶ ق م میں سکندر جہلم کے راستہ سے سندھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ نومبر ۳۲۵ ق م میں وہ پٹالہ سے براستہ مکران ایران کے صدر پرسی پولس کو چلا گیا جہلم سے روانہ ہونے سے پہلے سکندر نے دو وائسرائے اور کئی گورنر مقرر کئے۔ ان کے زیر کمان کافی یونانی فوج تھی۔ راجہ ٹکشلا کی سپاہ بھی ان کے ساتھ شراکت عمل کو آمادہ تھی۔ اسی طرح سندھ کا بھی وائسرائے اور گورنر مامور کیا تھا۔ پنجاب سے سکندر کی روانگی کے بعد چندر گپت نے سرداران پنجاب کو سمجھا بجھا کر ایک جتھا بنایا جس کی تکمیل میں یونانی گورنر یوداس کے ہاتھ سے پورو کے مارے جانے سے بہت جلدی کامیابی ہو گئی۔ جب سکندر سندھ سے چلا گیا تو چندر گپت نے یونانی گورنروں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ٹکشلا کی سپاہ اس کے علاوہ تھی جو اقبال سکندری قائم رکھنے کو تلی ہوئی تھی۔ معرکے شروع ہوئے ہر جگہ سکندر کے گورنر اور کمانیر شکست کھاتے رہے۔ دو سال سے کچھ کم عرصہ میں بیاس سے سوات چترال تک اور پشاور سے سندھ تک تمام ملک یونانیوں سے خالی کرا لیا۔ یونانی گورنر اور لشکر تحس نحس ہو گئے۔ اس کا بہت مستقل اور وسیع اثر ہوا۔ اس وجہ سے یہ کارنامہ بہت شاندار ہے۔ مغربی ماہر اس جنگ آزادی کو "بغاوت" کے ناملائم لفظ سے یاد کرتے ہیں جس کا "سرغنہ" چندر گپت قرار دیا گیا ہے۔ یونانی مورخ لکھتے ہیں کہ چندر گپت نے سرحدی لٹیروں کی جمعیت فراہم کر کے یونانی سپاہ کو شکست دی تھی۔ اگر پورو کی تربیت یافتہ سپاہ یونانی فوجوں کو مغلوب نہ کر سکی تو کیا لٹیروں کی ان گھڑ جمعیت ناقابل تسخیر یونانی جرنیلوں اور ان کی آزمودہ کار سپاہ کو زیر کرنے کی امید کر سکتی تھی؟ ہرگز نہیں۔ یونانی بیانات بے سروپا اور مہمل ہیں۔ مغربی ماہر اس لاثانی فاتح تاجدار کے کمالات سے دانستہ چشم پوشی کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اس کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ اس نے یونانی سلطنت کے قدم نہ جمنے دیئے اس وجہ سے قصداً اس کے کارناموں پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔

یونانی لشکروں اور ان کے کمانیروں کو ملیامیٹ کرنے کے بعد چندر گپت اس ملک کا فرماں روا بن گیا۔ اس نے بہت جلد آئین و قوانین وضع کئے۔ اس کام میں چانک کی دانائی سے اُسے بڑی مدد ملی پھر اس نے سپاہ اور سامان مہیا کر کے ستلج اور گنگا کے درمیانی حکمرانوں کو گانٹھ کر نندا کی سرکوبی کی ٹھانی نندا چندر گپت کی فوج کشی سے بے خبر تھا اس لئے اس نے سرحد کے کمانیروں کو حملہ آور کی مزاحمت کی سخت

مگر سپاہ اور رعایا سبھی نندا کے مظالم سے نالاں تھے۔ نندا کے سرحدی کمانیر حمایت و لشکروں
یں سخت ناکام رہے۔ آخر کار وہ خاصے کی سپاہ کے ساتھ خود میدان میں اُترا اور اپنے سب منشا
غام پر چھاؤنی ڈال کر مورچہ بندی کر لی۔ وہاں دو ٹوک گھمسان کا رن پڑا۔ نندا کی کاروائی و حکمت
تبال کے سامنے خاک میں مل گئی۔ اس کی سپاہ کو شکست فاش ہوئی۔ وہ خود بھی میدان میں
، پر چندر گپت نندا کی بے قیاس دولت، سامانوں اور لشکروں پر قابض ہو گیا۔ ایک ہی حملہ
پتر سے لیکر گنگا جمنا کے سنگم تک کا ملک اس کے قبضہ میں آ گیا۔ چنانچہ اول مرتبہ آریہ ورت ایک
سلطنت کی بنیاد پڑی جو برہمپتر سے پشاور تک اور سوات سے سندھ تک پھیل گئی۔ اس وقت
ر چوبیس پچیس برس کی تھی۔ اس نے چانک کو اپنا وزیر اعظم مقرر کر کے نظام حکومت وضع کیا جسکی
ت کے سامنے زمانۂ حال کے اچھے سے اچھے آئین کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ غالباً اسی زمانہ میں
جکماری دُھردا سے ہوئی جو اُس کے بڑے ماموں کی بیٹی تھی۔ اُس دور اقتادہ زمانہ میں مو
دی کا رواج تھا جیسا کہ اب دکن میں بھی پایا جاتا ہے۔ ۳۲۱ ق م میں چندر گپت کی
ہوئی۔ ملکی انتظامات سے فارغ ہو کر چندر گپت نے مالوے اور سوراشٹر (کاٹھیاواڑ)
ا کی۔ اور ان زرخیز و شاداب ملکوں کے تاجداروں کو مغلوب کیا۔ پھر راجدھانی کی طرف فتحمندانہ
لوٹ آیا۔ بعد ازاں چندر گپت نے کوہستان بندھیاچل طے کر کے دکن کی طرف چڑھائی کی
راجاؤں کو مطیع کیا جہاں اب ممالک متوسط، برار، ریاست حیدر آباد، خاندیس، مہاراشٹر، ریاست
اس کے وسطی اور شمالی اضلاع (شمالی سرکار) واقع ہیں۔ غرض ۳۱۵ ق م سے پہلے پہلے سارا
ن فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔
ت کا سب سے بڑا شاندار جنگی کارنامہ سلیوکس ظفرمند کی شکست فاش ہے جس سے نہایت
نتائج مرتب ہوئے۔ سکندر کے مرتے ہی اس کے جنرل اس کی سلطنت کے تخت کے خواہاں
ن سلیوکس اور انٹگناس اپنے کو سب سے زبردست اور ہوشیار سمجھتے تھے اس وجہ سے وہ
جانشین گمان کرتے تھے۔ دونوں میں معرکے شروع ہو گئے جو دس بارہ برس تک رہے۔
لے ۳۱۲ ق م میں اپنے حریف کو مغلوب کر کے اپنے و ایشیائی مقبوضات کا شہنشاہ
ند کا لقب اختیار کر لیا۔ پھر جھٹ پٹ اس نے پنجاب اور سندھ زیر و فتح کرنے کے مقصد

ت چوتھی کے سال کی بابت ماہروں میں اختلاف رائے ہے۔ اکثر ۳۲۱ ق م میں تسلیم کرتے ہیں یہی روایت
ق م ہے بعض ماہرین کا ان دونوں بیانوں سے اختلاف ہے۔

اعلان کردیا۔ اپنے مطیع حکمرانوں کو حکم دیا کہ سپاہ اور سامان لے کر ملک ہند پر چڑھائی کرنے کو آمادہ رہیں۔ چنانچہ کئی سال کی تیاریوں کے بعد سلیوکس بے شمار سپاہ اور سامان لے کر ملک ہند پر چڑھ آیا۔ ادھر اب کے تین اضلاع کے مالک پورو کی بجائے چندر گپت اعظم تھا جس کا سارے ملک ہند میں ڈنکا بج رہا تھا۔ اس نے سلیوکس کے حملہ کی خبر پا کر شاندار تیاریاں کیں، چھ لاکھ سپاہ لے کر جہلم کے کنارے پر حملہ آور کی پیشوائی کو تیار ہو گیا۔ سلیوکس اپنے آقائے نامدار سکندر کی طرح شاندار فتح حاصل کر کے شمالی ہند کو قبضہ میں لانے کے سنہرے خواب دیکھ رہا تھا چندر گپت نے اسے مصلحتاً سرحد اور اٹک سے بے روک ٹوک اتر آنے دیا۔ اس کا منشا غالباً یہ تھا کہ سلیوکس کو اس بیباکی اور رعونت کا مزا چکھائے۔ سنہ ۳۰۲ ق م میں جانبین کا خونی معرکہ شروع ہوا، پہلے ہلّہ کے انجام سے حملہ آور کو سخت مایوسی ہوئی۔ یونانی یہ گمان کرتے تھے کہ ہندو ہمارے نام ہی سے ڈر کر میدان سے بھاگ کھڑے ہونگے مگر اس کے بجائے وہ ڈٹ کر ٹھہرے رہے۔ یونانی رسالے بگٹٹ حملے کرتے تھے اور ہاتھیوں کی سد سکندری سے ٹکرا کر لوٹ جاتے تھے۔ پھر جب موریہ تیر اندازوں نے تیروں کی بارش کی تو یونانی پیدل اور گھڑ چڑھے گھونگھٹ کھا کر سراسیمہ ہو کر بھاگ نکلے کیونکہ استرابو لکھتا ہے کہ ہندو سپاہیوں کے پاس قد آدم کمانیں تھیں تین تین گز لمبے تیر تیزی سے کمانوں سے نکلتے تھے کہ ان کی زد سے نہ ڈھال اور نہ چار آئینہ جسم کو محفوظ رکھ سکتا تھا۔ قصہ کوتاہ ہفتوں کی معرکہ آرائیوں کے بعد سلیوکس پر یہ روشن ہو گیا کہ ہند و حلوائے بے دود نہیں بلکہ لوہے کے چنے ہیں۔ اس نے صلح کی درخواست کی۔ چندر گپت نے رضامندی ظاہر کی، شرائط صلح یہ طے ہوئے کہ سلیوکس افغانستان اور بلوچستان چندر گپت اعظم کی نذر کرے اور چندر گپت فقط پانچ سو ہاتھی اسے دے۔ سلیوکس نے اپنی بیٹی بھی چندر گپت کے الواس میں داخل کی۔ اور یہ قرار پایا کہ دربار پاٹلی پتر میں سلیوکس کا سفیر رہے۔ یہ معاہدہ سنہ ۳۰۳ ق م میں طے ہوا تھا۔ اس سے سلطنت ہند کی سرحد ہندوکش کی جنوبی ڈھلوانوں سے جا ملی۔ ادھر مغرب میں ہرات سیستان اور مکران سے جا ملی۔ انگریز ماہر وی۔ اے اسمتھ لکھتا ہے کہ سلیوکس پر فتح پانے کا یہ انجام ہوا کہ سلطنت موریہ کو وہ فطری سرحد حاصل ہو گئی جو مغلوں کو تھوڑی سی مگر انگریزوں کو ذرا بھی نصیب نہ ہو سکی۔ سلیوکس کی شکست فاش کو تسلیم کرنے سے مغربی ماہروں کو صاف انکار ہے۔ پرنسپل ای۔ بی۔ ہیول (ہے ول) نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف آرین رول ان انڈیا میں یہ تسلیم کیا ہے کہ سلیوکس نے سخت شکست کھائی۔ جس کی وجہ سے نہ صرف وہ جلدی سے پسپا ہی ہو گیا بلکہ بعید ذلت آمیز عہد نامہ لکھنے کو مجبور ہوا تھا جس کی رو سے اس نے اپنی بیٹی چندر گپت کے محل میں داخل کی۔ اور بہیر میں افغانستان اور بلوچستان کے صوبے اس کے نذر کر دیئے۔ اور آپ صرف سو ہاتھی لینے پر اکتفا کی۔ وی۔ اے۔ اسمتھ نے بھی کچھ اسی قسم کی رائے[1] ظاہر کی ہے۔ مگر باقی قریب سب ماہرین

---

[1] ارلی ہسٹری آف انڈیا" صفحہ ۱۳۵ مطبوعہ ۱۹۲۴ء

پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ای۔ ڈبلیو۔ ٹامس کا قول ملاحظہ ہو: سلیوکس کے لئے
بھاری ثابت ہوئی، وہ اٹک سے اترآیا لیکن یا تو کوئی لڑائی ہوئی نہیں، اگر ہوئی تو فیصلہ کن نہ
ال سلیوکس کو چندرگپت کے مقابلہ میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس وجہ سے اس نے معاہدہ کیا،
وسے اسے بے روک ٹوک پسپا ہوجانے کی اجازت مل گئی۔ یونانی مقبوضات جو وادی کابل تک
بت کی نذر کرکے پانچسو ہاتھی حاصل کئے۔ یہ وہ سلیوکس کی بیٹی کے چندرگپت اعظم کے محل میں
نے کے واقعہ کو مشکوک کہتے ہیں" یہی حال اوروں کا ہے۔ کئی سال کی تیاریوں کے بعد سلیوکس
ان اور کروفر کے ساتھ چندرگپت اعظم کے ملک پر حملہ کرتا ہے۔ حملہ آور کو مصلحتاً چندرگپت اندرون
ں آنے دیتا ہے تاکہ اُسے ایسی شکست دی جائے کہ وہ سلامتی کے ساتھ اپنی سلطنت میں واپس
ے اُس وقت غالباً پشاور سے آگے تک چندرگپت کا راج تھا اس وجہ سے سلیوکس ڈیڑھ سو میل
ک سلطنت موریہ کے اندر گھسا چلا آیا۔ آخرکار سخت معرکے ہوئے جن میں حملہ آور کو ایسی شکست
کہ وہ اپنی سلطنت کے مشرقی صوبے چندرگپت اعظم کے حوالہ کرنے کو مجبور ہوگیا اور اپنی بیٹی بھی
رکی۔

ں مورخین جہلم کے دوسرے معرکہ کی اہمیت دانستہ نظر انداز کرتے ہیں جس کی رو سے پورس کی شکست
ن کی پردغا ہلاکت کا قرار واقعی انتقام لیا گیا، اور ملک ہند کی عظمت و حرمت سارے جہان میں
ونکہ اُس وقت مغرب میں سلیوکس کے سوا اور کوئی بڑا تاجدار نہ تھا۔ اس نے اپنی رعونت تو
ئی اور اس کی یاداش میں دو تین لاکھ مربع میل رقبہ کھو دیا، اور اپنے ہمچشموں کی نگاہوں
خوار ہوا۔ سلطنت ہند ہرات سے آسام تک اور سوات چترال سے مدراس کے آگے تک
ں کا ہر ایک پہلو بائیس سو میل سے زائد تھا۔ سنِ عیسوی سے ادھر اتنی عظیم الشان سلطنت
یکھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ جہلم کے کنارے پر سلیوکس کو جو شکست عظیم ہوئی تھی اس سے ملک ہند
، کا سرتاج بن گیا۔ مہاراجہ ادھراج چندرگپت اعظم کی کاروائی، شجاعت اور تدبر کا تمام دنیا میں
بات یہ ہے کہ اگر مغربی ماہر چندرگپت اعظم کے لاثانی کارنامے تسلیم کریں تو ان کے سب سے
ندر کی ہیٹی ہوتی ہے جسے وہ سلف کا سب سے بڑا سپہری قرار دیتے ہیں زمین آسمان
تے ہیں۔ چندرگپت ہندو اور ایشیائی ہے اسکندر یورپ کا پہلا فاتح ہے جس نے ایران کا
کے ملک ہند کا شمالی حصہ زیر کرکے گوروں کی شوکت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ سلیوکس

ری آف انڈیا" جلد اول ص ۴۲۳ مطبوعہ سنہ ۱۹۲۱ء

بھی گورہ تھا جس نے چندرگپت اعظم کے ہاتھوں ایسی بھاری شکست کھائی۔ کہ سارے جہان میں رسوائی ہوگئی، مگر نتائج کے اعتبار سے معرکۂ جہلم دنیا کے عظیم ترین ڈو ٹوک معرکوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اس سے ملک ہند اور نیز دنیا کے لئے پولٹیکل اور اقتصادی دونوں قسم کے مستقل نتائج مرتب ہوئے۔

سلطنت موریہ کی لاثانی وسعت

چندرگپت اعظم کی سلطنت کی وسعت کی نسبت بھی مورخین میں بڑا اختلاف رائے ہے۔ ونسنٹ اسمتھ لکھتا ہے "اٹھارہ سال کے عرصے میں چندرگپت نے پنجاب اور سندھ سے یونانی حکومت کے نشانات مٹا دیئے، سلیوکس ظفرمند کو پسپا اور خوار کیا، اور شمالی ہند اور اریانہ کے بڑے حصے کا اپنے کو سب سے بڑا حکمران قرار دیا۔ ان کارناموں کی وجہ سے وہ تاریخ دنیا کے نہایت بڑے بڑے اور کامیاب تاجداروں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔" کئی ماہروں کا یہ خیال ہے کہ چندرگپت کا راج کوہستان بندھیاچل کے آگے دکن میں نہ تھا جن کی نسبت ان کا یہ خیال ہے کہ کافی ثبوت نہیں ملتا۔ مگر ہیول لکھتا ہے کہ فتح دکن کے بعد چندرگپت اور اس کا وزیر اعظم سلطنت کے استحکام کے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ اس نے عالمگیر سلطنت قائم کرنے کی کوشش نہ کی۔" پلوطارک لکھتا ہے "چندرگپت نے چھ لاکھ سپاہ لیکر سارے ملک ہند کو تاراج کرکے مطیع ومحکوم کیا تھا۔" جسٹن لکھتا ہے "چندرگپت سارے ہندوستان پر قابض تھا۔ مدراس کے نامی گرامی محقق راؤ بہادر ڈاکٹر کرشن سوامی آئنگر اپنی مشہور تاریخ جنوبی ہند میں یہ لکھتے ہیں کہ تامل زبان کے سب سے مشہور مصنف مامل نار نے کئی مرتبہ اپنی ایک قابل قدر تصنیف میں یہ ذکر کیا ہے کہ پرانے زمانے میں آریہ لشکروں نے جنوبی ہند پر حملہ کیا اور مارتے مارتے کوہ پوڈیل واقع ضلع تناولی تک جا پہونچے۔ ان لشکروں کا ہراول دستہ کوشل قوم کے جوانوں کا بتایا جاتا ہے۔ تامل زبان کے دو اور بڑے بڑے مصنفوں کی کتابوں سے بھی مامل نار کے بیان[۱] کی تائید ہوتی ہے ڈاکٹر بی۔ ایس۔ رائس ریاست میسور کے محکمہ اثریات کے مہتمم اعلیٰ نے عرصہ تک تحقیقات کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی ہے کہ چندرگپت کا راج ریاست میسور کے وسط تک پھیلا ہوا تھا۔ جس سے یہ ظاہر ہے کہ موجودہ شہر مدراس سے سیدھے خط میں موریہ راج منگلور تک پھیلا ہوا تھا۔ اگر تامل زبان کی کہنہ سال تصنیفات کے بیان سے چشم پوشی کی جائے تو رائس کا بیان کلیتہً قابل اعتبار ٹھہرتا ہے۔ وی۔ اے۔ اسمتھ نے بھی موریہ سلطنت کی جنوبی حد اسی خط سے ملتی جلتی قائم کی ہے

[۱] پولیٹیکل ہسٹری آف انشنٹ انڈیا صفحہ ۱۶۷

دو باتیں غور طلب ہیں۔ برہمپتر اور دہانہ گنگا سے لیکر کاٹھیاواڑ گجرات اور سندھ تک سارا ملک زیر کرنے کے بعد چندر گپت دکن کی طرف کیوں نہ بڑھ سکا؟ کیا وہاں پر کوئی بڑا تاجدار ایسا تھا کہ جس سے چندر گپت خائف تھا؟ یہ گمان سراسر بے معنی ہے۔ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سارے بھارت ورش کو زیر کر کے ایک چھتر تلے لانے کا متمنی تھا۔ اس سے پہلے کے تاجداروں کو چکرورتی راج نصیب نہ ہوا تھا۔ بہر حال چندر گپت جنوبی ہند کو فتح کرنے سے کسی صورت میں باز نہ رہ سکتا تھا۔ اس نے دکن فتح کیا اور غالباً مدراس سے آگے تک گیا تھا جیسا کہ مامل نار وغیرہ کا بیان ہے۔ اخیر میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ جین روایت کی رو سے جسے ونسنٹ اسمتھ معتبر سمجھتا ہے۔ چندر گپت اعظم اسی زمانہ کے سب سے بڑے جینی مہاتما بھدر باہو سوامی کا معتقد بن گیا اور تاج اپنے بیٹے بندسار کے حوالے کر کے دکن کو چلا گیا۔ اس کے ساتھ بارہ ہزار اور جینی جاتری بھی شمالی ہند سے گئے تھے۔ کیا کوئی تاجدار اتنے بڑے قافلہ کو اپنے ملک میں گھسنے دیتا۔ ریاست میسور کے جنوبی حصے میں جینی تیرتھ شرون بیلگولہ ہے جہاں چندر گری پہاڑی ہے۔ جینی روایت کی رو سے چندر گپت نے بارہ برس تک اسی جگہ تپسیا کر کے جان دی تھی۔ کیا چندر گپت اعظم جس کا سکہ آسام سے ہرات اور مکران تک مروج تھا کبھی یہ بات گوارا کر سکتا تھا کہ اپنی وسیع سلطنت کے باہر کسی اور تاجدار کے ملک میں جا کر تپسیا کرتا اور جان دیتا؟ ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے ہم کیسے مان لیں کہ چندر گپت اعظم کا راج بندھیاچل کے آگے دکن میں نہ تھا؟

اگر زمانہ حال کے برہما اور آسام کو خارج کر دیا جائے۔ پھر نیپال اور افغانستان اور بلوچستان کو سلطنت ہند کے موجودہ رقبہ میں شامل کر دیا جائے تو چندر گپت کی سلطنت کا رقبہ انیس لاکھ مربع میل کے قریب ظاہر ہوتا ہے۔ رہی آبادی اس کی بابت ہمارا یہ تخمینہ ہے کہ یہ بیس پچیس کروڑ نفوس کے مابین ہوگی۔ سلطنت رومہ کی انتہائی عروج کے زمانے میں بارہ کروڑ سے زائد مردم شماری نہ تھی۔ یونانیوں کا بیان ہے کہ پورو کے راج میں (۲۷۰۰) دیہات قصبات تھے جن میں تین سو شہر ایسے تھے جن کی آبادی پانچ پانچ ہزار آدمیوں کی تھی۔ ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ پنجاب کی شمال مغرب کی سرحد کا جو علاقہ سلطنت ایران میں ملحق تھا اس کی آبادی سب سے زیادہ گنجان تھی۔ چندر گپت سے پہلے فقط سلطنت ایران وسعت کے اعتبار سے سنسار کی سب سے بڑی سلطنت تھی جس کا رقبہ بارہ چودہ لاکھ مربع میل کے مابین تھا۔ چندر گپت سے تین سو برس بعد مذہب مسیحی کے بانی کی وفات کے وقت قیصر آگستس کی سلطنت یورپ ایشیا اور افریقہ میں پھیلی ہوئی تھی جس کا رقبہ سلطنت موریہ سے

۱؎ بیشتر مورخین یہ بیان کرتے ہیں کہ ملا بار سے لیکر سندھ تک دارا گشتاسپ نے فتح کیا تھا جب سے [illegible] خراج میں جاتا تھا۔ پروفیسر ولیم جیکسن کا یہ بیان کہ بیاس تک ملک پنجاب دارا کے زیر نگیں تھا۔ یقینی ہے۔

کم تھا۔ البتہ بڑاجن کی سلطنت کی وسعت اس سے بڑھکر تھی۔ گذشتہ دو سو سال میں چین۔ روس اور برطانیہ کی سلطنتوں کی مساحت سلطنت موریہ سے کہیں بڑھکر پائی گئی ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ سن عیسوی سے پہلے دو تین ہزار برس کی تاریخ سے ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ کسی تاجدار نے چندر گپت اعظم سے زیادہ بڑی سلطنت قائم کی تھی۔ سن عیسوی کے بعد بھی تقریباً اٹھارہ سو برس تک کسی حکمران نے اتنے بڑے رقبہ پر حکومت نہ کی تھی جتنا چندر گپت کے زیرنگیں تھا

چندر گپت اعظم کا نظام سلطنت

چندر گپت اعظم کی بڑائی محض ملک گیری اور جنگی کارناموں کی وجہ سے نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بڑا عالی دماغ مدبر بھی تھا۔ اس نے اپنی وسیع وعظیم سلطنت کے حسن انتظام کی واسطے جو آئین حکومت جاری کیا تھا زمانۂ حال کی بڑی بڑی متمدن قوموں کے لئے بھی ایک نمونہ ہے۔ بڑے بڑے مدبر چندر گپت اعظم کے اصول اوسیہ کا تتبع کرتے ہیں فی زمانہ مغرب کی گئی بڑی حکومتوں کے ہاں کمیٹی کا رواج تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی وزیر اکیلا کچھ نہیں کر سکتا بلکہ چند ماہروں کے مشورہ کے مطابق کارروائی کرتا ہے۔ برطانیہ کا صیغہ تجربات کا وزیر اور بورڈ ہے۔ امریکہ میں محکمۂ خارجہ کے وزیر کے ساتھ ایک خاص کمیٹی بھی مقرر ہے۔ مگر چندر گپت اعظم نے اب سے بائیس سو برس پیشتر اپنے ہر ایک وزیر کے ساتھ ماہروں کی کمیٹیاں شامل کر رکھی تھیں جس کا ذکر سلیوکس کے سفیر مگستھنیز نے اپنی قابل قدر کتاب میں قلمبند کیا ہے یہ کتاب ضائع ہو چکی ہے مگر اس کے اقتباسات اور یونانی کتابوں میں ملتے ہیں۔ وزیر جنگ کے ساتھ تیس ماہروں کی چھ کمیٹیاں شریک کار تھیں، ایک پیدل سپاہ کی، ایک رسالوں کی ایک جنگی ہاتھیوں کی، ایک رتھوں کی، ایک باربرداری اور کمسریٹ کی اور ایک بحری معاملات کی ذمہ دار تھی۔ یہی حال صیغہ مالیات کا تھا۔ پاٹلی پتر، اجودھیا، کوشام بمبئی، اجین، تکشلہ وغیرہ کی میونسپل کمیٹیاں چھ چھ چھوٹی کمیٹیوں میں منقسم تھیں۔ ان میں سے ایک کمیٹی اموات و پیدائش کا صحیح اندراج کرنے کی ذمہ دار تھی۔ اہل شہر کے مکانات مع تفصیلات دربارۂ حقیت درج رجسٹر کراتی اور مردم شماری کا اہتمام کراتی تھی۔ دوسری کمیٹی پاٹلی پتر میں پردیسی مسافروں، سوداگروں، سفیروں وغیرہ کی خاطر تواضع کرنے پر مامور تھی۔ چندر گپت نے اپنے مطیع حکمرانوں اور کئی جمہوری قوموں کو مقامی معاملات کا اختیار عطا کر رکھا تھا۔ تکشلہ، اجین اور دکن میں والسرائے تعینات کر رکھے تھے۔ ایک انگریز ماہر راوی ہے کہ چندر گپت کا دفتر شاہی نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا۔

فی زمانہ نہروں اور سڑکوں کا ذکر خیر کیا جاتا ہے مگر ان کا بانی یہی چندر گپت اعظم تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ زراعت کی خوشحالی نہروں سے ہے، اس وجہ سے دریاؤں تالابوں اور بندوں سے پانی مہیا کر کے کاشتکاروں سے آبیانہ وصول کرتا تھا۔ گرنار (جوناگڈھ) میں جھیل سدرشن بنائی گئی تھی۔ سلطنت کے اندر چاروں طرف سڑکیں تھیں جس کا

اتصال دکن اور مالوے سندھ۔ پنجاب اور اودھ کی سڑکوں سے ہوتا تھا۔ کوشام بمبئی سے ایک سڑک زمانہ حال کی جھانسی، اجین سے گجرات کاٹھیاواڑ، سندھ اور ایران کو جاتی تھی۔ دوسری ہستناپور، کرو کشیتر سے ٹکشلہ، پشاور، کابل، قندھار اور ہرات کو جاتی تھی۔ تیسری دکن کی طرف جاتی تھی۔ سڑکوں پر مسافر خانے اور پیاؤ بنے ہوئے تھے۔ چوراہوں پر ایسے تختے لگے ہوئے تھے جن پر مختلف مقامات کے فاصلے اور نام مندرج تھے۔ سڑکوں پر کوسوں کے پتھر نصب تھے۔ جابجا پولیس کے تھانے اور ڈاک خانے تھے خفیہ پولیس تھی اور اخبار نگاری کا خاص محکمہ تھا جسے مسلمان بادشاہوں نے اپنے زمانہ میں بڑی توسیع دی۔ چندر گپت نے شمار و اعداد کا بھی ایک محکمہ قائم کیا تھا۔ مغربی قوموں نے اپاہجوں اور بڈھوں کی پرورش حال ہی میں اپنی حکومت کے ذمہ لگائی ہے مگر چندر گپت کے زمانہ میں غریب خانے (آشرم) تھے جہاں کنگال لاوارث بڈھے اپاہج سرکاری خرچ سے پرورش پاتے تھے۔ اگر مال مسروقہ پولیس کی کوشش سے برآمد نہ ہوتا تو ہرجانہ سرکار کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ چندر گپت کو رعایا کی بہتری کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اس کے لئے وہ ہر نوع کی تجاویز اختیار کرتا رہتا تھا۔ ایک نرالا دستور سماج کا تھا جس کی رو سے عوام کی تفریح طبع کے سامان مہیا کئے جاتے، فوجی کرتب اور جنگی کھیل تماشے دکھا کر لوگوں کے اندر جنگجوئی کا حوصلہ پیدا کیا جاتا تھا۔ رنگ گھر اور اکھاڑے بھی ہر جگہ سرکار کی طرف سے بنے ہوئے تھے جہاں دل بہلاؤ کے واسطے کھیل تماشے دکھائے جاتے تھے

بہر حال اگر ایچ جی ویلز کے خیال کی رو سے کسی فاتح تاجدار کے کارناموں کا اس امر سے اندازہ کیا جائے کہ اس نے بنی آدم یا ابنائے ملک کو کیا فائدہ پہونچایا تو چندر گپت اعظم اشوک کے سوا تمام دنیا کے تاجداروں کا سرتاج ہے۔ اگر ملک و قوم کی اقبال مندی اور شوکت آسمان پر پہونچانے والا انسان وطن پرست کہلانے کا مستحق ہے تو چندر گپت سب سے بڑا قوم پرست ثابت ہوتا ہے۔ اس نے ملک ہند میں چکرورتی راج قائم کر کے اتحاد و یگانگت قائم کر دی۔ خانہ جنگیاں موقوف کر کے امن و سکون قائم کیا جس سے ابنائے ملک میں تمدنی ترقی ہوتی ہے۔ بھارت ورش کے مختلف حصوں اور نسلوں کی باہمی مغائرت دور کر کے باہمی موافقت اور یک رنگی پیدا کر دی۔ چندر گپت سے پہلے دنیا کی نگاہوں میں ملک ہند فقط ایک جغرافیائی نام تھا جس کی نسبت بہت سے افسانے سنے تھے۔ مگر اس کی بدولت اس ملک کی عظمت و شوکت ستارۂ آسمان پر جا پہونچی۔ ملک ہند کے بین الاقوامی تعلقات بہت خوشگوار تھے جس سے تجارت اور صنعت چمک گئی۔ غیر ملکی ہند کو تجارت اور سیاحت وغیرہ کی اغراض سے آنے لگے۔ غیر طاقتوں نے سفارتی تعلقات قائم کئے۔ مارشمین کے بیان کے مطابق چندر گپت [illegible] کے زمانے میں ہندوؤں نے جاوا، سماٹرا، ملایا اور ہند چینی میں بستیاں آباد کی تھیں جو کئی سو برس بعد تمدن و گہوارہ اور شان دار سلطنتوں کا مبدا و مرجع بن گئیں۔ چندر گپت کو اپنی رعایا کی خوشحالی کا بڑا خیال تھا۔ اس وجہ سے

نہریں کھدوائیں تاکہ کھیتی ترقی کرے، مسافروں اور سوداگروں اور جاتریوں کی آمدورفت کے لئے چاروں
طرف سڑکیں بنوائیں اور ان کی آسائش کے لئے مسافرخانے اور سرائیں تعمیر کرائیں۔ نظام حکومت نہایت
عمدہ تھا جس سے جان و مال محفوظ تھا، رعایا کی تفریح طبع کے لئے سماج جاری کیا۔

چندرگپت نے اپنی ہمت، حکمت، کاروانی، عالی حوصلگی اور قوت بازو سے ایسی عظیم الشان سلطنت قائم کی
جس کی ثانی سن عیسوی سے پہلے کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس اعتبار سے وہ دنیا کے تمام بڑے بڑے فاتح حکمرانوں
میں سب سے بڑا شمار ہونے کے قابل ہے۔ نتائج کے اعتبار سے اس کے کارنامے مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کی
قائم کی ہوئی سلطنت ۱۳۷ برس رہی۔ اگر اس کا پوتا اشوک اس کے نقش قدم پر چلتا تو سلطنت موریہ کی عظمت
و شوکت صدہا سال تک رہتی اور ملک ہند کی مابعد کی تاریخ نہایت شاندار ہوتی۔ اشوک کی پالیسی سے ہندو
عظمت برباد ہوگئی جس سے پانچ سو برس تک آریہ ورت غیر ملکی حملہ آوروں کا تختۂ مشق اور ہندو حکمرانوں کی
خانہ جنگی کا اکھاڑہ بنا رہا حتیٰ کہ سلطنت گپتا کے تاجداروں نے پھر سے ملک ہند کو اغیار سے آزاد کرا کے ہندو
حکومتی شوکت بحال کردی۔

چندرگپت ہر بات میں سکندر اعظم سے بہتر تھا۔ اخلاق میں سکندر چندرگپت کا پاسنگ بھی نہیں۔ ملک گی
میں چندرگپت سکندر سے کئی درجے اعلیٰ جرنیل اور کارداں تھا۔ تدبر میں وہ یکتا تھا۔ سکندر نے ایران کے بڑ
حکومتی نظام کو برقرار رکھا جس سے ظاہر ہے کہ وہ ملک داری میں قاصر تھا۔ چندرگپت اعظم کا نظام حکومت
حال کے مدبروں کے لئے نمونہ کا کام دیتا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہے کہ ملک گیری اور ملک داری دونوں میں چ
لاثانی تھا۔

چندرگپت اعظم نے چوبیس سال تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ پھر پرانے دستور کے مط
تاج اپنے بیٹے بندسار کے حوالہ کر کے تارک الدنیا ہوگیا۔ یہ ۲۹۷ ق م کا واقعہ ہے۔ جینی روایت سے
ہوتا ہے کہ چندرگپت اعظم نے مسلسل سولہ خواب دیکھے تھے جن سے اس کی طبیعت پریشان تھی۔ جوتشی
دانشمند اس کی دل جمعی نہ کر سکے۔ اتنے میں جینی مہاتما بھدر باہو سوامی پاٹلی پتر میں وارد ہوگئے۔ چندرگپ
خوابوں کی تعبیر کر کے ان کی دل جمعی کر دی، اس پر وہ ان کا مرید ہوگیا۔ پھر بارہ ہزار جاتریوں کو ساتھ
چلا گیا۔ چندر گری واقع شرون گولہ (جسن۔ ریاست میسور) میں جا کر تپسیا کرنے لگا۔ بارہ سال بعد ۲۸۵ ق
جگہ جان دی، وہاں پر اسکی یاد میں ایک مندر بنایا گیا تھا جسے "چندرگپت بستی" پکارتے ہیں۔ چندرگپت ا
تھا جس پر اہل ہند جتنا فخر کریں کم ہے۔ اسکی شرافت اس بات سے ظاہر ہے کہ اس نے ملک ہند کی حدود
اندر لوٹ کھسوٹ کر لیا غلام نہ بنایا حالانکہ اسکے پاس سات لاکھ سپاہ تھی جس سے وہ ایران اور مغربی ایشیا
... نکو دیکھنا گوارا نہ کیا جس سے اُنکی تہذیب و شرافت نفسی اور نک

نواب روشن الدولہ

(از خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

نواب روشن الدولہ مرزا محمد حسین خاں عرف مرزا نتھو نواب اشرف علی خاں کے چھوٹے بیٹے تھے۔ نواب اشرف علی خاں نواب آصف الدولہ بہادر کے رفیق خاص تھے ہر وقت حاضر خدمت رہتے تھے اور سرکار کمپنی کے خیر خواہ مشہور تھے۔ نواب آصف الدولہ ان کے خلوص سے بہت خوش تھے۔ نواب اشرف علی خاں کے بڑے بیٹے نواب شرف الدولہ مرزا عباس علی خاں نواب آصف الدولہ کے داماد تھے اور چھوٹے بیٹے مرزا محمد حسین خاں کو نواب روشن الدولہ کا خطاب بھی نواب آصف الدولہ نے دیا تھا۔

مرزا وزیر علی خاں کی شادی بھی نواب اشرف علی خان کی دختر سے ہوئی تھی، اور اس دھوم سے ہوئی تھی کہ آج تک لکھنؤ میں اس شان و شوکت کی شادی نہیں ہوئی۔

ابھی نواب آصف الدولہ سریر آرائے سلطنت تھے کہ نواب اشرف علی خاں نے انتقال فرمایا اور آغا ابو طالب کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔ چالیس لاکھ روپیہ متروکہ نکلا۔ نواب آصف الدولہ بہادر نے حکم دیا کہ شرعی قاعدہ کے بموجب تقسیم کیا جائے لیکن فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر نے فضل علی خاں کی معرفت کرنل بیلی صاحب کو سمجھا بجھا کر نواب اشرف علی خاں کے خاص محل والدہ نواب روشن الدولہ کے مہر میں دلوا دیا، ان کا نام نواب طیبہ بیگم تھا اس طرح باقی تمام ورثا محروم رہ گئے۔

اسی زمانے میں نواب آصف الدولہ بہادر جنت آرامگاہ ہو گئے۔ ابھی تھوڑے دن گزرے تھے کہ طیبہ بیگم بھی ہیضہ میں مبتلا ہو کر فردوس بریں کو سدھاریں اور وہ سب متروکہ شرف الدولہ مرزا محمد عباس اور نواب روشن الدولہ کو ملا۔ خورد محل سے جو دو لڑکے مرزا بہادر علی خاں اور اشرف الدین خاں تھے وہ محروم رہ گئے۔ نواب روشن الدولہ نے کوٹھی روشن الدولہ کے نام سے ایک عالی شان عمارت بنوائی جس میں اب ڈپٹی کمشنر بہادر اجلاس فرماتے ہیں، اور ڈپٹی کلکٹر بھی اسی عمارت میں کچہری کرتے ہیں، نذر کچہری بھی اسی میں ہے۔ غرض انھوں نے فیاضی کے ساتھ چند ہی روز میں تمام روپیہ خرچ کر ڈالا۔ نواب روشن الدولہ کسی چکلے کے ناظم بھی

ہو گئے تھے۔ نواب غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا معتمد الدولہ آغا میر نے نواب روشن الدولہ کی لڑکی سے اپنے فرزند نواب نظام الدولہ کی نسبت ٹھہرائی۔ اس شادی میں بھی نواب روشن الدولہ نے اپنی سیر چشمی سے بہت روپیہ صرف کیا۔ نواب معتمد الدولہ نے کئی روز پیشتر سے توڑہ بندی شروع کی۔ کم سے کم فی کس سات روپیہ کا توڑا تقسیم ہوتا تھا، دونوں اپنی سخاوت کا امتحان دے رہے تھے، الائچی اور مصالحہ کی کشتیاں روزانہ تقسیم ہوتی تھیں۔ رخصتی کے وقت محلات شاہی اور امرا کو عطر وغیرہ کی کشتیاں پیش کی گئیں۔ اور عملے کو جوڑے تقسیم ہوئے۔ صرف مداریہ حقہ جو اس وقت ایک پیسہ کو ملتا تھا پندرہ ہزار روپیہ کا خریدا گیا، جا بجا نقار خانے قائم ہوئے اور آئینہ بندی کی گئی، جب شربت پلائی کا وقت آیا اور نواب معتمد الدولہ بہادر کے سامنے گلاس پیش کیا گیا تو کسی نے کہا نواب روشن الدولہ بہادر فرماتے ہیں اس وقت وزیر اعظم کی بلند حوصلگی کا امتحان ہے۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ ہم نے نظامت کے سولہ لاکھ روپیے جو نواب کی طرف بقایا ہے اس شربت پلائی میں دیلے۔

یہ خبر نواب غازی الدین حیدر کو ہوئی تو نواب معتمد الدولہ سے دریافت کیا کہ تم نے نظامت کا روپیہ شربت پلائی میں دیدیا، انھوں نے عرض کی کہ حضور روشن الدولہ نے اسی قلیل رقم پر قناعت کی ورنہ اگر کچھ عذر کرتے تو دوسرے سال کی تحصیل بھی معاف کر دیتا، کیونکہ یہ معتمد الدولہ کا امتحان نہ تھا بلکہ بندگان عالی کی ہمت کی آزمائش تھی الحمد للہ کہ اس میں بھی غلامان حضور پورے اترے جو حضور ہی کا صدقہ ہے۔ اس جواب پر بادشاہ نہایت خوش ہوئے۔

غازی الدین حیدر بادشاہ کے انتقال کے بعد اپنی فضول خرچی اور عیش پرستی اور فیاضی کی وجہ سے نہایت پریشان حال رہنے لگے۔ اور نصیر الدین حیدر بادشاہ کے دربار میں اس وجہ سے کہ نواب معتمد الدولہ بہادر سے خصوصیت ہے نہیں جاتے تھے۔ بیچارے راجہ بختاور سنگھ اپنی عالی ہمتی سے ان کے کفیل ہوتے تھے۔ شاہ نصیر الدین حیدر کے دربار میں نہ جانے کا سبب ایک اور بھی بیان کیا جاتا ہے یعنی بادشاہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں جب نواب بہو بیگم صاحبہ نے فیض آباد میں انتقال فرمایا تو بادشاہ نے ضبطی مال تروکہ کے لئے صاحب عالم مرزا نصیر الدین حیدر کو ہمراہ راجہ بختاور سنگھ و نواب روشن الدولہ فیض آباد روانہ کیا۔ چنانچہ وہاں سے ایک کروڑ روپیہ اور بیس صندوق جواہر کے داخل خزانہ شاہی ہوئے باقی تمام زر و جواہر تلف کر دیا گیا اس سے کچھ بدگمانی صاحب عالم کو پیدا ہو گئی تھی، تاہم غازی الدین حیدر بادشاہ کے زمانے تک نواب روشن الدولہ کا شمار رفقائے خاص میں تھا اور ان کا احترام برقرار تھا۔

جب نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے اور نواب منتظم الدولہ وزیر ہوئے تو وہ نواب روشن الدولہ کی حالت

سے بخوبی واقف تھے اپنی نیکنامی سمجھ کر ان کو طلب کیا اور کہا نواب معتمد الدولہ نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا اب میری طرف سے آپ کو پانچسو روپیہ ماہوار مقرر کیا جاتا ہے۔ اور بادشاہ سے بھی ان کی صفائی کرادی۔

حسن اتفاق سے نواب منتظم الدولہ عہدۂ وزارت سے موقوف کئے گئے تو بادشاہ نے اپنے اراکین سلطنت سے مشورہ کیا کہ اب کس کو وزارت کا عہدہ دیا جائے۔ اکثر نے نواب روشن الدولہ کے متعلق رائے دی۔

بادشاہ بیگم یعنی والدہ نصیر الدین حیدر نے بھی امامی بیگم کے ذریعہ سے اور آتو جی قدسیہ بیگم کی تائید سے وقت شب خلوت میں ایک عرضی نواب کی تقرری کے بارے میں پیش کی۔ اس طرح حسن تدبیر سے کچھ ایسے اسباب جمع ہوگئے کہ تمام عملہ اور تمام محلات کی بارسوخ عورتیں نواب روشن الدولہ کی تائید میں تھیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ نواب روشن الدولہ نے اپنی فیاضی اور ہمت سے سب کو ہموار کر لیا تھا۔ بہرحال اب بہت دنوں کے بعد وہ خلعت وزارت سے سرفراز ہوئے۔ حسب دستور جب کرنیل لو صاحب کے پاس نذر وزارت پیش کی تو انھوں نے حیرت سے کہا کہ آپ کو وزرائے ماضیہ کے حالات سے پوری واقفیت ہے کہ کس کس خرابی سے نکالے گئے، پھر دیدہ و دانستہ اس عارضی عہدے کو آپ نے کیوں قبول کیا؟ نواب نے کہا میری بیکاری اور خانہ نشینی کا حال تو آپ کو بخوبی معلوم ہے۔ اتنے زمانے تک راجہ بختاور سنگھ کفیل رہے۔ گھر میں کچھ دولت باقی نہ تھی، قرض ملتا نہ تھا عسرت نے گھر دیکھ لیا تھا، موت کا سامنا تھا۔ میں نے دل میں کہا افلاس کی موت سے وزیر اعظم مشہور ہوکر مرنا غنیمت ہے۔

جب رفتہ رفتہ نواب کو تمام عملہ پر اختیار کلی حاصل ہوگیا تو اپنی قوم کے لوگ کمبوہ کی بھرتی ہونے لگی۔ نواب نہایت فضول خرچ تھے وہی رفتار شروع ہوگئی۔ مگر فیاضی ایک ایسا جوہر ہے جو تمام عیوب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ عین اسی زمانہ میں نواب قدسیہ محل کا انتقال ہوگیا اور بادشاہ و تمام اراکین سلطنت سیاہ پوش تھے۔ بادشاہ بیگم نے جو یہ حال سنا تو محبت اولاد کے سبب سے بیقرار ہوکر بادشاہ کے پاس آئیں۔ ماتم پرسی کی اور کلمات تشفی فرمائے کہا کہ خدا تم کو سلامت رکھے ایسی ایسی سیکڑوں عورتیں خدمت میں آئیں گی۔ یہ سیاہ پوشی اداب سلطنت کے خلاف ہے۔ بادشاہ نے کہا کیا آپ کو نہیں معلوم ہے کہ یہ سرتا سر موت کیسی ہولناک واقع ہوئی اور اس خودکشی کا ذمہ دار میں خود ہوں اس لئے جس قدر غم و افسوس مجھے ہو کم ہے۔ اعتماد الدولہ میر فضل علی کی وفات کا تو اس قدر آپ نے ماتم برپا کیا تھا، آپ کو اگر محبت ہوتی تو میرے ساتھ شریک ماتم ہوکر لباس سیاہ پہنکر تشریف لاتیں۔ بیگم صاحبہ نے کہا میں تو ماتمی لباس

فقط عزاداری سید الشہدا کے غم میں ہنتی ہوں اور مجھے معلوم ہے ارکین سلطنت نے تم کو میری طرف سے بہکا دیا ہے۔ یہ اشارہ تھا نواب روشن الدولہ کی طرف حالانکہ اسمیں ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ جب نواب روشن الدولہ نے سُنا تو انھیں یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح بادشاہ کی دلچسپی کا کوئی سامان پیدا کیا جائے اور تمام عملے کو یہی فکر تھی۔ جب چار مہینے کے بعد بادشاہ نے لباس ماتم اُتارا، لوگوں نے بہت سے صاحبان حسن وجمال کا تذکرہ پیش کیا مگر کوئی پسند خاطر نہ ہوا تو نواب روشن الدولہ نے نواب سراج الدولہ کی بہن کے حسن وجمال وشرافت کی تعریف کی بلکہ ایک روز پس پردہ اس کی صورت بھی دکھادی چنانچہ یہ شادی نہایت دھوم دھام سے ہوئی۔ مگر افسوس ہے کہ تھوڑے زمانے کے بعد کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ بادشاہ کو اس نئے محل سے نفرت ہوگئی۔ یعنی شادی کے بعد بادشاہ نے کئی لاکھ روپیہ اور کئی بدریاں دوشالوں کی اور بہت سے تھان جامہ وار کے اور مختلف اقسام کے تھان مرحمت فرمائے، اور حکم دیا کہ ان کو اپنے عزیز واقربا میں تقسیم کردو کہ تمہاری عزت اور ہماری نیک نامی کا باعث ہو۔ دلھن تو کم سن بچہ تھی، ان کی والدہ شریفہ نے وہ سب نقد وجنس اپنے قبضہ میں رکھا اور کچھ تقسیم نہیں کیا۔ دوسرے دن بادشاہ نے دریافت کیا کہ اگر وہ نقد وجنس تقسیم ہوگیا ہو اور کچھ اور چاہتے ہو تو بھیج دیا جائے۔ دلھن تو خاموش رہی خوشدامن صاحبہ نے فرمایا "عالیجاہ ہم لوگ شریف زادیاں ہیں، ہمارا فرض ہے کہ سلطنت کی ترقی کے دعاگو رہیں نہ کہ سرکار کا گھر لٹائیں۔ یہ سُنتے ہی بادشاہ آگ ہوگئے اور فوراً محل سے برآمد ہوکر راجہ غالب جنگ مہتمم ولوہری سے فرمایا ہم نے اس نئے محل کو کنگلا محل خطاب دیا، اور اپنا تاج منگوالیا اس پر بھی سرکار سے پندرہ سو روپیہ ماہوار وثیقہ نسلاً بعد نسل مقرر ہوگیا۔ اس کے بعد عملے والوں نے ان کی کنجوسی کے واقعات بیان کئے، منجملہ ان کے ایک خبر یہ بھی تھی کہ شادی سے جو پلاؤ وشیرمالیں وغیرہ بچی تھیں سب سکھا کر جمع کی گئی ہیں۔ غرض اس طرح یہ خاندان اسی حرص سے بدنام ہوگیا اور اس شادی کو بادشاہ نے اپنے حق میں بدیمن تصور کیا۔ اور نواب روشن الدولہ سے بہت ناراض ہوگئے اکثر ان کی شکایت بھی زبان پر آجاتی تھی، ارکین سلطنت نے عرض کیا اگر حضور کو ایسا ہی گمان ہے تو آپ خاصہ کی خدمت وزیر سے نکال لیجئے، فرمایا کہ دشمن کو مطمئن رکھنا بہتر ہے کہ کوئی حجت باقی نہ رہے

ایک روز رات کے وقت بادشاہ لبسواری ہسپ نواب روشن الدولہ کی کوٹھی پر چاندنی رات میں تن تنہا تشریف لائے۔ جیسے ہی آمد کی خبر ہوئی نواب فوراً پیشوائی کو حاضر ہوئے، نذر گذرانی، فرمایا میں نہیں سمجھ سکتا کہ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے جو ناحق میری جان کے دشمن ہیں۔ اسی طرح زینے سے کوٹھی میں داخل ہوئے۔ وہاں جلسہ ارباب نشاط گرم تھا، سندر بائی مُجرا کر رہی تھی بہت خوش ہوئے۔ اس جلسہ

نشاط نے بادشاہ کو مسرور کر دیا۔

کچھ زمانے سے بادشاہ کے دل پر اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے یورپین لیڈیوں کو رخصت کیا کہ اب نہ میں رہوں گی اور نہ تم ہم کو دیکھو گی۔ سب بیبیاں دعا دینے لگیں کہ خدا حضور کو سلامت رکھے ہم نے آپ کی بدولت بہت عیش کیا۔ شراب سے قطعاً توبہ کر لی حالانکہ حاذق طبیبوں نے کہدیا کہ ترک شراب سے آپ کی زندگی کا خطرہ ہے۔ آخر پینتیس ۳۵ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔

جب محمد علی شاہ بادشاہ ہوئے نواب روشن الدولہ بدستور سابق وزارت پر مقرر ہوئے۔ اب بادشاہ نے محاسبہ شروع کیا جن لوگوں نے نصیر الدین حیدر بادشاہ کے زمانے میں غبن کیا تھا برسر محاسبہ آئے۔ چونکہ بادشاہ کی انّا نواب روشن الدولہ کے خلاف تھیں اس لئے سب سے پہلے انھیں سے محاسبہ کیا گیا۔ کئی لاکھ نقد و جنس داخل خزانۂ عامرہ ہوا اور رستم نگر کی جائداد بھی ضبط ہوئی۔ کیونکہ جب نواب روشن الدولہ بادشاہ کی نعش پر آئے تھے تو انھوں نے بہت سے ناجائز الفاظ ان کی شان میں کہے تھے۔

راجہ لال جی بخشی فوج، راجہ الفت رائے، مجلس رائے بخشی، راجہ شیر چند، دھنیا مہری سب کا مال ضبط ہوا۔ آخر میں نواب روشن الدولہ پر بھی غبن کا الزام عائد ہوا۔ چنانچہ ریزیڈنٹ صاحب کی معرفت ان سے بائیس لاکھ روپیہ لیکر ان کو فارغ خطی ملی، اور بادشاہ نے ان کو حسب دستور سابق عہدۂ وزارت پر رکھنا چاہا لیکن انھوں نے منظور نہ کیا۔ جنرل لو صاحب نے ہرچند سمجھایا کہ بادشاہ کی صرف ایک شرط ہے کہ کمبوہ کو اپنے پاس نہ آنے دو اور تم بدستور سابق وزیر رہو اس میں تمہارا کیا نقصان ہے اگر انکار کرو گے تو فاقہ کشی کر کے مر جاؤ گے۔ سبحان علی خاں کمبوہ کو چھوڑ دو وہ بدنفس آدمی ہے۔ جنرل صاحب کے علاوہ ان کے بیٹے اور بی بی نے بھی فہمایش کا کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا کہ جب دونوں سرکاروں کی یہی مرضی ہے تو وزارت پر قناعت کرو اس میں بہتری ہے، مگر نواب نے اپنی شامت اعمال سے کسی کی بات قبول نہ کی اور کانپور چلے گئے۔ وہاں بیٹا بھی ان سے تین لاکھ روپیہ لیکر الگ ہو گیا۔

راجہ رسدھان کا علاقہ تین لاکھ کا خریدا تھا وہ بھی ہاتھ سے نکل گیا، مانڈو لال کا علاقہ خریدا وہ بھی نہ ملا۔ آخر فقر و فاقہ میں زندگی بسر کر کے کانپور میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

مسٹر رامزے میکڈانلڈ وزیراعظم برطانیہ

(از مسٹر کمار، ایڈیٹر "ینگ بلڈر" کراچی)

مسٹر رامزے میکڈانلڈ وزیر اعظم سلطنت برطانیہ کی کامیابی کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ بھلا یہ کس کو خیال ہو سکتا تھا کہ یہ بچہ جس نے ماہی گیروں کے ایک گمنام گاؤں میں غریب ماں باپ کے گھر پیدا ہو کر لوکل بورڈ کے مکتب میں تعلیم پائی تھی اور ۱۲½ شلنگ ہفتہ وار مواجب پر لندن میں ایک انوائس کلرک کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا تھا، ایک روز دنیا کی ایک عظیم الشان سلطنت کا مدار المہام بن جائے گا۔ اور چار دانگ عالم میں وہ نام پائیگا جو آج تک کسی مزدور پیشہ شخص کے حصہ میں نہیں آیا۔ گو میکڈانلڈ کو آغاز شباب سے ہی شہرت اور ناموری کی ہوس تھی لیکن اُس کی بڑی سی بڑی اُمید آخر یہی ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے ہم پیشہ مزدوروں کی زندگی کو ذرا فارغ البال بنا سکے اور بس۔

شادی اوائل عمر میں مسٹر میکڈانلڈ پر ہنری جارج کی کتاب "Progress and Poverty" (تہذیب اور افلاس) کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ چنانچہ جب ۱۸۹۴ء میں مسٹر کیئر ہارڈی نے آزاد لیبر پارٹی قائم کی تو میکڈانلڈ اُس کا گرمجوش ممبر بن گیا۔ لیکن اس کے عروج کا ستارہ حقیقت میں اس روز طلوع ہوا جس دن اُس نے لارڈ کیلون کی بھتیجی مارگریٹ ایتھل سے شادی کی۔ اس خاتون کی مالی امداد سے میکڈانلڈ افلاس کی تاریک کوٹھری سے نکلکر فارغ البالی کی شاہراہ پر چلنے کے قابل ہو گیا۔ ایک شخص جو میکڈانلڈ کے خاندان سے اچھی طرح واقف ہے، یوں لکھتا ہے:

> "مسز میکڈانلڈ ایک فرشتہ سیرت خاتون ہیں۔ انھیں دل و دماغ کی بہت سی قوتیں عطا ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے مسٹر میکڈانلڈ جیسے کندہ ناتراش کو ایک مہذب انسان بنا کر اس کے اندر زندگی کے لطیف پہلو کا وہ احساس پیدا کر دیا جس سے وہ مطلق بے خبر تھا۔ بہر حال یہ کہنا ہرگز بیجا نہ ہوگا کہ مسٹر میکڈانلڈ کی زندگی کو کامیاب بنانے میں اُن کی بیوی کا خاص حصہ ہے۔"

پہلی فتح گو مسٹر میکڈانلڈ پہلی بار بموقعہ الیکشن Southampton. کی طرف سے "Independent Labour Party" کی طرف سے پارلیمنٹ کے ممبر بننے میں ناکامیاب رہے۔ تاہم

آپ نے مزدور پیشہ لوگوں پر یہ بات بخوبی ظاہر کردی کہ جب تک اُن کی سب پارٹیاں متفق ہوکر ایک جماعت نہ بن جائینگی اُن کی کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۰ء میں لیبر پارٹی باضابطہ طور پر قائم ہوگئی سب سے پہلے ۱۹۰۶ء میں اس پارٹی کے چھ ممبر پارلیمنٹ کی ممبری پر سرفراز ہوئے۔

اہنسا کا پیامبر انھیں ایام میں مسٹر میکڈانلڈ کو دو نامور اصحاب کی دوستی کا فخر حاصل ہوا۔ اول مسفیلڈ کالج کے پرنسپل مسٹر فیربرن[1]، دوسرے جان مارلے[2]، جو بعد میں وزیر ہند ہوکر لارڈ مارلے کہلائے۔

جنگ یورپ کے زمانے میں ایک روز یکشنبہ کے دن ایک شخص لندن کے سبزہ زار[3] میں صابن کی خالی پیٹی پر کھڑا دھواں دھار تقریر کر رہا تھا، چاروں طرف خلقت کا ہجوم تھا۔ لیکچرار کہہ رہا تھا:-

"میں آج تک لارڈ لینسڈاون کی مخالفت کرتا رہا ہوں لیکن خوشی کی بات ہے کہ آج میں کھڑا ہوکر برملا اعلان کرنے کے قابل ہوا ہوں کہ صلح کے بارے میں جو رائے لارڈ موصوف نے ظاہر کی ہے مجھے اس کے ساتھ کلی اتفاق ہے۔ میرا ذاتی عقیدہ بھی یہی ہے، لارڈ لینسڈاون کی رائے نہایت سلیم ہے"

دوران تقریر میں حامیان جنگ نے لیکچرار کا خوب مضحکہ اُڑایا، اُس کے لفظ لفظ پر قہقے لگائے اور جب کچھ بن نہ پڑی تو لیکچرار پر حملہ کرکے اس کی وہ گت بنائی کہ ناگفتہ بہ۔ پولیس والے کھڑے دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے لیکچرار کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا لیکن اُس کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ اُس کے دوست مشکل سے اس کی جان بچاکر نکال لائے۔

آج وہی لیکچرار سلطنت برطانیہ کا وزیر اعظم ہے۔ اس سے بڑھکر اور کونسا افسانہ ہوگا۔

کام کرنے کی طاقت اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر رچرڈ نے حال ہی میں اپنی تصنیف (Indian Dust خاک ہند) میں لکھا ہے کہ اُنیس سال قبل جب مسٹر میکڈانلڈ رائل کمیشن کے ممبر ہوکر ہندوستان آئے تو آپ نے ان سے ملاقات کرنے کے بعد حسب ذیل الفاظ قلمبند کئے تھے۔

"اس میں شک نہیں معلوم ہوتا کہ مسٹر میکڈانلڈ ابرڈین کے سنگ مرمر کے بت کی طرح بے حد طاقت کے مالک ہیں" یہ بالکل صحیح ہے، عوام کو یہ بات معلوم نہیں کہ مسٹر میکڈانلڈ کو سلطنت برطانیہ کی حکومت کا بار اپنے کندھوں پر اُٹھانے کے لئے ذاتی آرام کی کس قدر قربانی کرنا پڑی ہے۔ اُن کی آنکھیں ایسی کمزور ہیں کہ دوبار ان پر جراحی عمل کی نوبت آچکی ہے، خوف تھا کہ کہیں بینائی جواب ہی نہ دے جائے۔ اس پر بھی آپ نے اپنے پبلک فرائض کو ذاتی آرام پر ترجیح دی۔ کیا یہ کوئی معمولی بات ہے کہ ملک معظم آپ کی بیمار پرسی کو ہسپتال میں تشریف فرما ہوئے اور جب تک آپ ہسپتال میں رہے ہر روز شاہی باغ سے پھولوں کے تحفے بھجواتے رہے۔ ع

---

[1] Principal Fairburn [2] John Morley [3] Chapham Common

رعایا چنیں شہریارے چنیں

سارے ہندوستان کی آنکھیں اب مسٹر میکڈانلڈ وزیراعظم کی طرف بے قرار ہو کر تک رہی ہیں کہتے ہیں کہ آنکھوں والے نابیناؤں کی بہ نسبت زیادہ حیادار ہوتے ہیں۔ خدا کرے ایسا ہی ثابت ہو۔

(ماخوذ از انڈین ٹٹ بٹس)

درس عبرت

(از حضرت سادق دہلوی)

(۱)

کیا کھلتے ہیں راز بادہ پیمائی میں
لذت ہے خرابات کی رسوائی میں
آنکھیں ہوں تو ساغر میں خدا کو دیکھے
زاہد نہ چھپے گوشۂ تنہائی میں

(۲)

ہم کیا کہیں نشہ میں ہے لذت کتنی
لذت نہیں اس قدر ہے عبرت جتنی
اے قطرۂ مے گر کے بتا دے سر خاک
ہے عالم ہستی کی حقیقت اتنی

(ہمایوں)

مرزا قلندر

(از جناب سلیم جعفر)

دسمبر کا مہینہ تھا۔ کڑاکے کے جاڑے پڑ رہے تھے اور ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ مرزا قلندر اپنے گھر کی چھوٹی سی کوٹھری میں دروازہ بند کئے اکیلے چارپائی پر بیٹھے چھت کی طرف دیکھ اور دل ہی دل میں کچھ سوچ رہے تھے۔ ایک کونے میں گھڑے کے نیچے کا آدھا حصہ راکھ سے بھرا رکھا تھا۔ مرزا حقہ پیتے تھے اس لئے کھانا پکانے کے بعد جو انگارے چولھے میں رہ جاتے انھیں اس میں دبا دیتے۔ پڑے پڑے جی گھبرایا حقہ پینے کا خیال آیا کہ یونہی وقت کاٹیں۔ بار بار ارادہ کرتے ہیں کہ اٹھیں لیکن ہاتھ پاؤں کام نہیں دیتے۔ سردی کے مارے لحاف سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ کبھی کبھی اِدھر اُدھر کروٹ لے لیتے۔ کچھ دیر تک تو خیر کروٹیں بدلتے رہے آخر مجبور ہو کر اٹھ بیٹھے۔

لیکن اب چارپائی سے نیچے اترنے کو دل نہیں چاہتا۔ خیر جی کڑا کر کے پاؤں لٹکا دیئے تو تاہین لیا کہ چارپائی سے ٹھیکرے تک جانا ہفت خوان رستم طے کرنے سے کم نظر نہیں آتا۔ اس لئے بیٹھے سستاتے رہے۔ دو ایک سانس لیکر اٹھ کھڑے ہوئے پھر ذرا دم لیا اور چل کر ٹھیکرے تک پہنچے۔ کونے سے حقہ اٹھایا۔ کئی دفعہ بغیر تازہ کئے پی چکے تھے جی چاہا کہ تازہ کرلیں مگر اس کے لئے صحن میں جانا پڑتا اس لئے ہمت نہ پڑی۔ بہرحال چلم بھری، ذرا دم لیا اور حقہ لیکر چارپائی پر آلیٹے۔ لحاف خوب لپیٹ لیا صرف منہ کھلا رکھا۔ لیٹے لیٹے حقہ پیتے اور دھوئیں کو جو چھت کی طرف جارہا تھا غور سے دیکھتے جاتے تھے۔ گویا سوچ رہے تھے کہ دھواں آسمان کی طرف یوں جاتا ہے۔ زمین کا رُخ کیوں نہیں کرتا۔ اسی عالم میں آنکھ لگ گئی۔

مرزا عمر کی اس منزل میں پہنچ چکے تھے جب ہاتھ پاؤں بس میں نہیں ہوتے، کان بھی سنتے ہیں نہ بری۔ آنکھیں دُور کی چیزیں دیکھنا چھوڑ دیتی ہیں۔ دانت سخت غذا کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو سوڑے چیختے ہیں کہ خدا کے لئے اس ارادے سے باز آؤ۔ اس زمانے میں لوگ خدا کی اس نعمت سے بھی بہت کچھ محروم ہو جاتے ہیں جو بادشاہوں کو اپنے محلوں اور غریبوں کو اپنے جھونپڑوں میں نصیب ہے جسے زبردست زبردست سے نہیں چھین سکتا۔ وہ وقت نہیں ہوتا کہ سرِ شام چادر تان کر سوئے تو سورج نکلے پڑوسیوں کے گھروں کی کھٹ پٹ اور ان کے بچوں کے غل غپاڑے سے آنکھ کھلی۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے کہ ذرا سا کھٹکا ہوا اور آنکھ کھل گئی جیسے جھوٹ موٹ

تن کر سو رہے تھے۔ پڑوسی کی چھت پر سے ان کی چھت پر بلّی کودی اور یہ جاگ اُٹھے کہ دھماکے کی آ[واز]
کہاں سے آئی۔ کروٹ لی تو چارپائی کی چرچراہٹ نے ہوشیار کر دیا۔ جسم کے اور حصوں کی طرح دماغ [بھی]
بے وفائی کرتا ہے، اس کی خشکی دو چار گھنٹے سے زیادہ سونے نہیں دیتی۔

بیچارے مرزا کیونکر رات بھر سو سکتے تھے۔ گھنٹے دو گھنٹے سوئے ہونگے کہ کروٹ بدلی اور آنکھ کھل [گئی]
کچھ دیر پڑے پڑے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چھت تکتے رہے۔ آخر کھانسی آنے لگی اور جب یہ بند نہ ہوئی
ناچار اُٹھ بیٹھے، دو ایک دفعہ اور کھانسے کھنکھارے، مشکل سے کھانسی رکی تو چھینکیں آنے لگیں۔ ا[یک]
بلا سے پیچھا چھوٹا کہ دوسری میں پھنس گئے۔ کچھ دیر تڑا تڑ چھینک پر چھینک آئی، آخر اس آفت سے بھی نجا[ت]
ملی اور خدا کا شکر بجا لائے۔

اس ڈر سے کہ کہیں پھر کھانسی نہ ستائے کوئی گھنٹہ بھر لیٹے لپٹائے بیٹھے رہے، بیکاری بھی بڑ[ی]
بلا ہے۔ طلب والا بیکار بیٹھا نہیں کہ طلب یاد آئی نہیں، مرزا کو حقہ سوجھا، رینگتے ہوئے آگ کے ٹھیکرے ک[ے]
پاس پہونچے، چمٹے سے راکھ کریدی کوئلے جل بجھے تھے، ہوا کے سناٹوں کی آواز سن سن کر دم خشک ہوا جا[تا]
ہے۔ ہمت جواب دے رہی ہے مگر پہاڑ سی رات کاٹے نہیں کٹتی مجبوراً چولھے کے پاس کوئلے کے ڈھیر میں
سے تھوڑے سے لاکر انھیں سلگانے کا ارادہ کیا۔ مگر دروازہ کھولکر باہر نکلتے ہی معلوم ہوا کہ کسی نے برف م[ی]
ں ڈھکیل دیا ہے۔ تھر تھر کانپنے لگے دانت سے دانت بجنے لگا۔ ذرا ٹھہرا اور سنبھل کر جلدی سے چولھے
کے پاس پہونچے، کوئلوں کی مٹھی بھری کچھ پھوس لیا اور تیر کی طرح لوٹے۔ کوٹھری میں گھستے ہی جھٹ
ہاتھ خالی کر دروازہ بند کیا۔ اب جان میں جان آئی، دونوں چیزیں اُٹھا ٹھیکرے کے پاس آکر دم لیا۔
ہلکان کر دینے کو اتنی محنت کم نہ تھی، ٹھیکرے میں کوئلے اور پھوس رکھ کر دیا سلائی دکھائی، آگ جلی
ذرا گرمی پہونچی اور حواس بجا ہوئے۔ حقہ بھر کر پلنگ پر آ بیٹھے، تھوڑی دیر میں کمر دکھ گئی، لیٹ گئے حقہ
پیتے پیتے سو گئے۔ صبح سے پہلے ایک دفعہ اور آنکھ کھلی۔ حقہ پینے کو جی چاہا۔ لیکن دبکے ہی پڑے رہے [اور]
سو گئے۔ ابھی اچھی طرح اُجالا نہ پھیلا تھا کہ جاگ پڑے مگر لیٹے ہی لیٹے کروٹیں بدلتے رہے۔

سورج نکلا، دھوپ پھیلی، اُٹھ بیٹھے، ضروریات سے فارغ ہو کر چولھا جلایا۔ پہلے حقہ بھرا پھر ہانڈی
چڑھائی، بیٹھے بیٹھے سینے میں درد اُٹھا، مرزا کا ماتھا ٹھنکا مگر کچھ پرواہ نہ کی۔ رفتہ رفتہ درد بڑھ گیا جیسے
تیسے روٹی پکائی گھبرا کر گھر بند کر کے شفاخانہ کی راہ لی۔

محلے کے چوراہے سے کوئی سو قدم کے فاصلے پر جا رہے تھے۔ سامنے سے سیٹھ مایا رام دو نوکر ساتھ
لئے نظر پڑے۔ سیٹھ جی بوڑھے تھے انھیں شکایت تھی کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا صبح شام ٹہلا کر[و]

وہ اس وقت ٹہلنے نکلے تھے۔ انھیں اپنا بھاری بھرکم جسم سنبھالنا دوبھر تھا۔ مرزا کو بیچ سڑک میں آتے دیکھ کر ایک نوکر چلایا "بڑے میاں راستہ چھوڑ کر چلو"۔ مرزا نے اس بوڑھے مالدار کو حسرت سے دیکھا، اس کی حالت سے اپنی بیکسی کا مقابلہ کر کے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور آہستہ آہستہ ایک طرف ہو گئے۔

شفاخانہ بھی خاصا دور تھا مگر مرزا گرتے پڑتے جا ہی پہونچے۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا، جواب ندارد، وہ اس وقت ثروت خاں زمیندار دولت نگر سے مصافحہ کر رہے تھے۔ زمیندار صاحب ہاتھ ملا کر بے تکلف ایک کرسی پہ بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مزاج پرسی کے بعد پوچھا "کیونکر تشریف لانا ہوا"

ثروت: کیا عرض کروں، رات بھر اباّ نے سونے نہ دیا، کھانسی اُٹھتی رہی، سارا گھر پریشان رہا، نیند حرام ہو گئی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی

ڈاکٹر: (پریشان صورت بنا کر) بہت افسوس ہوا۔ مگر گھبرانے کی بات نہیں۔ میں ابھی چل کر دیکھے لیتا ہوں۔

ثروت: بڑی نوازش ہوگی، جلد چل سکیں تو بہتر ہے۔

ڈاکٹر: ابھی لیجیے، گنگا (شفاخانہ کا فرّاش) جلدی سے ایک تانگا لے آ۔ اوشُدھے پرشادجی (کمپاونڈر) ذرا تھرمامیٹر اور اسٹےتھس کوپ (وہ آلہ جس سے ڈاکٹر دل کی حرکت کا پتا لگاتے ہیں) دیدینا"۔

گنگا فوراً تانگا لینے روانہ ہو گیا اور ڈاکٹر ثروت خاں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "کہیے، ننھے میاں کا کیا حال ہے"

ثروت: آج تو انگلی میں ذرا کم تکلیف ہے۔

ڈاکٹر: جب تک انگلی بالکل اچھی نہ ہو جائے، آپ انھیں پتنگ نہ اڑانے دیں۔ ورنہ ڈور کی رگڑ سے زخم اور گہرا ہو جائے گا"

ثروت: بجا۔ لیکن بچہ ہی تو ہے، آنکھ بچا کر دن میں ایک آدھ پیچ لڑا ہی لیتا ہے۔

ڈاکٹر: اس کا تو آپ کو خیال ہی رکھنا چاہیے۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ گنگا نے آ کر کہا "حضور تانگا حاضر ہے"۔ ڈاکٹر صاحب مع ثروت بیٹھ کر چلدیے مریضوں میں سے بعض تو نکل کر برآمدے میں ٹہلنے لگے بعض وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اور بعض زمین پر۔ مرزا بھی کھڑے کھڑے تھک گئے تھے وہ بھی ایک کونے میں جا بیٹھے۔ قریب قریب ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر صاحب واپس آئے۔ آتے ہی نسخہ لکھا اور کمپاونڈر سے تاکید کر کے کہا "اسے فوراً بنا کر ثروت خاں صاحب کے ہاں بھیجدو"

اس کے بعد صورت دیکھ دیکھ کر مریضوں کا حال پوچھنے اور نسخے لکھنے لگے جن کی ظاہری حالت درست تھی ان کی پرسش پہلے ہوئی، جو پھٹے حال تھے، ان کی بعد میں نوبت آئی۔ مرزا ہاتھ سے سینہ دبائے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ سب سے آخر میں ڈاکٹر نے ان سے پوچھا "بڑے میاں، کیا شکایت ہے"

مرزا: کیا عرض کروں، درد کے مارے بیتاب ہو رہا ہوں۔ سینے میں تیر سے چھبتے ہیں۔

ڈاکٹر: (نسخہ لکھتے ہوئے) رات ہوا تیز تھی، باہر تو نہیں نکلے"

مرزا: جی ہاں، اتفاق تو ہوا تھا۔

ڈاکٹر: (نسخہ دیتے ہوئے) لو، دوا لے جاؤ، سردی سے بچنا۔

مرزا: جناب مجھے رات بھر کھانسی آتی رہی

ڈاکٹر: ہاں میں سمجھ گیا۔

مرزا: درد بہت ہو رہا ہے مجھ سے چلا نہیں جاتا۔

ڈاکٹر: تمہاری حالت تو ایسی نہیں معلوم ہوتی۔ گھر جاؤ کل اپنے لڑکے کو بھیج دینا، وہ حالت بیان کر کے دوا لے جائے گا۔

مرزا: بندہ پرور، یہاں تو پہلے ہی سب پر فاتحہ پڑھ چکے۔ شفاخانہ ہی میں رکھ لیجئے، کرم ہوگا۔

ڈاکٹر: اوشدھی پرشاد جی انھیں وارڈ نمبر ۹ کے تیسرے کمرے میں رکھنا، وہاں ایک پلنگ خالی ہے۔

اوشدھی: بڑے میاں ادھر آجاؤ۔

مرزا نسخہ لیکر اس کمرے کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے جہاں دوائیں بنا بنا کر دی جا رہی تھیں مریضوں کی بھیڑ تھی۔ کمپاؤنڈر اوروں کو دوا بنا بنا کر دیتا رہا، کبھی کبھی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا کر تھوڑی دیر کو غائب ہو جاتا۔ غرض مرزا پھر تھک کر ایک کونے میں جا بیٹھے۔ گھنٹہ بھر بعد فرصت ہوئی، باہر نکل کر مرزا کو ساتھ لے وارڈ میں پہونچا، ایک لوہے کے پلنگ کی طرف جس پر دو موٹے موٹے کمل پڑے تھے اشارہ کر کے بولا "بڑے میاں اس پر لیٹ جاؤ، میں دوا بھیجتا ہوں"

کمپاؤنڈر تو یہ کہکر چلتا ہوا، مرزا نے پلنگ کو غور سے دیکھا، یہ لوہے کا پلنگ اور صرف ایک کمل بچھانے اور ایک اوڑھنے کو، یہ تو ہڈیوں میں چبھے گا، لیکن کرتے کیا، دوا کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ بڑی دیر میں وارڈ قلی دوا لے کر آیا۔ مرزا نے طاق میں جو گلاس رکھا تھا اس کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "بھائی اس گلاس میں تھوڑا سا پانی لا دو تو دوا پی کر کلی کر لیں"

قلی۔ میاں یہ میرا کام نہیں، بھشتی آئے تو بھروا لینا۔

بیچارے مرزا چپ ہو رہے کہ دوسرے کونے پر نظر پڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مریض جو کھاتا پیتا معلوم ہوتا ہے دو موٹے موٹے گدّے بچھائے پڑا ہے۔ وہ وہی قلی اُس سے پوچھ رہا ہے "کہئے کسی بات کی تکلیف تو نہیں"۔ مرزا تاڑ گئے کہ جو گدّا انھیں ملنا چاہیئے تھا اس پر اس کا قبضہ ہے۔

جوں توں کر کے دن کاٹا، شام ہوئی کمپاؤنڈر وارڈ میں چکر لگاتے لگاتے ان کے پاس بھی آیا، اور بولا "بڑے میاں۔ دوا کی دو ہی خوراکیں پیں"۔

مرزا: جی ہاں، بھشتی دیر میں آیا، پانی نہ تھا کہ کلّی کرتا اس لئے سب خوراکیں نہ پی سکا"۔

کمپاؤنڈر: اچھا تو یہ تیسری خوراک پی کر سو رہنا، کل اور دوا دیں گے۔

مرزا: پنڈت جی مجھے حقّے کی عادت ہے، اگر دو کش ملجاتے تو بڑا احسان ہوتا۔

کمپاؤنڈر: یہاں حقہ کہاں، بازار سے بیڑیاں منگالو۔

مرزا: پنڈت جی، مجھے کیا معلوم تھا کہ درد اتنا بڑھ جائیگا اور مجھے یہیں رہنا پڑیگا۔ میں تو گھر سے ایک پیسہ بھی لیکر نہیں چلا، آپ ہی کچھ انتظام کر دیجئے، اچھا ہو جاؤنگا تو کوڑی کوڑی دیدونگا۔

کمپاؤنڈر: بڑے میاں یہ شفاخانہ ہے، بنک یا ساہوکار کی دکان نہیں۔

کمپاؤنڈر یہ کہہ کر دوسرے مریض کے پاس جاکر باتیں کرنے لگا "آج ڈاکٹر صاحب نے جو دوا دی ہے بہت اچھی ہے، رات کو خوب نیند آئے گی، صبح تک طبیعت بحال ہو جائیگی، آپ جانیں اس کا نام بیماری ہے جاتے ہی جاتے جائیگی، گھبرائیے نہیں، پرسوں بڑے ڈاکٹر صاحب آئیں گے انھیں بھی دکھا دیں گے۔ کسی بات کی تکلیف تو نہیں"۔

مریض: آپ کی مہربانی ہے، کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔

کمپاؤنڈر: ہسپتال آپ ہی کا ہے تکلیف نہ اٹھائیے گا۔

یہ گفتگو سن کر مرزا حیران ہو گئے۔

دوا پی کر مرزا رات کو دس بجے سو لئے مگر تھوڑی ہی دیر میں سردی سے آنکھ کھل گئی۔ جو کمبل بچا رکھا تھا اُسے بھی اوپر ڈال لیا۔ اب دُہری مصیبت میں پھنس گئے، ادھر پلنگ اور چبھنے لگا ادھر سردی بھی ختم ہونے ہی کو کم ہوئی۔ ساری رات کچھ سوتے کچھ جاگتے رہے۔ صبح ہوئی تو سینے میں کل سے زیادہ درد تھا۔

آٹھ بجے ڈاکٹر صاحب وارڈ میں گشت لگاتے ہوئے مرزا کے کمرے میں داخل ہوئے۔ پہلے اس مریض کا حال پوچھا جس کی خاطر اس گدّے سے کی جا رہی تھی جس پر مرزا کا حق تھا۔ انھوں نے جس ہمدردی سے اس سے باتیں کیں اُس سے مرزا اگلے دن کا برتاؤ بھول کر یہ سمجھ بیٹھے کہ ڈاکٹر صاحب ہمدردی کے پتلے ہیں اور اُن

کا دل موم سے زیادہ نرم ہے. ہاں وہ بھول گئے کہ یہ دل روپے کی آنچ سے گرماتا اور مفلسی کی ہوا سے پتھر بن جاتا ہے.

ڈاکٹر صاحب کچھ دیر باتیں کر کے مرزا کی طرف مخاطب ہوئے :-

"بڑے میاں کیا حال ہے؟"

مرزا : کیا عرض کروں ، ساری رات سردی کے مارے اکڑتا رہا، کل سے حقہ نصیب نہیں ہوا، مرض سے زیادہ یہ مصیبت ہے. لیجئے یہ کنجی لیجئے، للہ کسی کو میرے گھر بھیج کر میرا حقہ اور بچھونا منگا دیجئے."

ڈاکٹر: میں مرض کا حال پوچھتا ہوں اور تم حقہ اور بچھونے کا ذکر کرتے ہو، یہ کیا بے تکی باتیں ہیں ."

مرزا : (مایوسانہ) کل سے دوا پی رہا ہوں مگر درد کچھ بڑھتا ہی جا رہا ہے، سانس لیتا ہوں تو اور زیادہ تکلیف ہوتی ہے."

ڈاکٹر: (بات کاٹ کر) تم کو نمونیا ہے، دونوں پھیپھڑوں پر اثر ہے ، دوا پیتے رہو۔

مرزا کا دل ٹوٹ گیا.

ڈاکٹر صاحب سب کمروں کا گشت کر کے کمپاؤنڈر سے یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں کرسی پر جا دھمکے :

"وارڈ نمبر ۵ کے تیسرے کمرے میں جو مریض ہے اُس کو دوا بھیج دینا."

ڈاکٹر کے جانے کے بعد مرزا ٹکٹکی باندھے چھت کو دیکھ رہے تھے حالت غیر ہو رہی تھی مگر انھیں اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا، آنکھوں کے سامنے ساری زندگی کا نقشہ کھنچ گیا جس میں بچپن سے بڑھاپے تک کی تمام تصویریں تھیں مگر ہر تصویر نکبت و فلاکت کے رنگ و روغن سے تیار کی گئی تھی.

کمرہ "ہائے مفلسی" کی اچانک صدا سے گونج اُٹھا، اس کے بعد آہستہ آہستہ ہچکیوں کی دو آوازیں آئیں مرزا کی گردن ڈھلک کر ایک طرف جھک گئی اور اُنھوں نے دنیا سے ہمیشہ کے لئے منہ موڑ لیا.

شفا خانے کے انتظام سے مرزا شہر خموشاں میں پہنچا دیے گئے جہاں شاہ و گدا میں کوئی فرق و امتیاز نہیں

تخفیف کی بھینٹ

(از مسٹر لچھمی نراین دھون لکھنوی)

"جس دن فرشتۂ موت تیرے در پر دستک دیگا تو کیا پیشکش کرے گا۔"

"میں اپنے مہمان کو خالی ہاتھ نہ جانے دونگا۔ اپنے ظرفِ حیات کا تحفہ اس کے سامنے رکھدوں گا۔"

"ایامِ خزاں اور موسمِ گرما کی راتوں کے جمع کئے ہوئے خوشہ ہائے انگور، اپنی مصروف زندگی کی سینتی ہوئی کمائی بطور ارمغان پیش کرونگا، جب فرشتۂ موت میرے دروازے پر آکر دستک دیگا میں اُسے خالی ہاتھ نہ جانے دوں گا۔"

ڈاکٹر ٹیگور، گیتانجلی

منشی نوندہ رائے ایک قصبے میں رہتے تھے، بھگوان کا دیا سب کچھ تھا، شادی ہوئی مگر مدت دراز تک خانہ بے چراغ رہا۔ میاں بی بی کو نہال آرزو کے بے ثمر ہونے کا بڑا رنج تھا مگر اپنی قسمت پر شاکر تھے۔ بارے شاخِ تمنا بارآور ہوئی اور خانۂ تاریک میں گوہرِ شب چراغ کا ظہور ہوا، دروازے پر شادیانے بجنے لگے۔ منشی جی کے دل کے ارمان نکلے۔ ان کے دروازہ سے کوئی محروم نہ پھرا۔ مگر ولادت کا جشن ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ امراض طاعون نے منشی جی کو کشاں کشاں لیجا کر شمسان پر تودۂ خاکستر کر دیا۔ سچ ہے شادی اور غم توام ہے۔ بیوہ پر یکبارگی کوہِ الم ٹوٹ پڑا۔ دل کے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔ ہمسایہ لوگ نوزائیدہ کو منحوس قرار دیتے تھے مگر مشیتِ ایزدی سے کوئی عہدہ برآ ہوا ہے۔ پھر معصوم بچے کا کیا قصور؟ انسانی زندگی ابدی نہیں عارضی ہے، جو پیدا ہوا ضرور ناپید ہوگا۔ اور ایک روز طائرِ روح کو اپنا قفسِ عنصری ترک کرنا پڑیگا۔

صبر کی سل کلیجہ پر رکھکر بیوہ بچے کو منشی جی کی یادگار سمجھتی تھی اور اُسی کا مُنہ دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔ رات کو جب آنکھ کھلتی تو سوچتی کہ اگر منشی جی قضائے الٰہی سے فوت ہو جاتے اور میری گود خالی رہتی تو زندگی وبال ہو جاتی۔ بھگوان اسے پروان چڑھائے اور عمرِ طبعی عطا کرے۔ بہرحال دن جاتے دیر نہیں لگتی۔ لڑکا ہلال سے بدر ہوا، تحصیل علم کر کے دفتر سرکاری میں ملازم ہو گیا۔ اب ماں کو فکر ہوئی کہ بار مناکحت سے بھی سبکدوشی حاصل ہو جائے۔ ضعیفی آگئی معلوم نہیں کس وقت امرِ ناگزیر لاحق ہو۔ تو لڑکے کو روٹیوں کا بھی ٹھکانا نہیں ہے۔ غرض جابجا سے پیام آنے لگے۔ مگر لڑکے نے ماں سے یہی کہا کہ ابھی ملازمت کو دو ہی سال گزرے ہیں مستقل ہونیکی بھی نوبت نہیں آئی جبتک مستقل نہ ہو جاؤں آپ کسی کو زبان نہ دیجئے۔ ماں نے ہرچند سمجھایا مگر لے سود آخر بدرجہ مجبوری سکوت اختیار کیا۔ گو اس کو بھی وہ اپنی

شومیِ بخت پر محمول کرتی رہیں۔ سسرال اور مائکے دونوں جگہ کوئی ایسا بزرگ نہ تھا جو ماں کی خاطر لڑکے کو نشیب و فراز سمجھا کر راہ راست پر لے آتا۔

غلہ کی قدرے ارزانی ہوئی، کاشتکاروں نے ادائگی لگان میں تساہلی کی، آمدنی کم ہوئی، کمیٹیاں بٹھائی گئیں، مصارف کے مختلف مدات کی کمی پر غور ہونے لگا۔ آخر طے پایا کہ عارضی ملازم ہٹا دیئے جائیں اور مستقل ملازمین کی تنخواہ میں دس فیصدی کی تخفیف کی جائے۔ اخباروں میں اس تحریک پر شور و شغب ہوا۔ منشی نوندہ رائے کے لڑکے کو بھی بڑا قلق ہوا جب اپنی بڈھی ماں اور اپنی بے بضاعتی پر نظر ڈالتا تھا تو اس کا خون خشک ہو جاتا تھا۔ غرض چند ہی دنوں میں اشتہا نے جواب دیدیا، آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے، چہرہ پر زردی چھا گئی اور چپ چپ گم گم رہنے لگا۔ ماں پوچھتی کہ ایسا کیا روگ ہو گیا۔ چوتھائی سے بھی کم غذا رہ گئی، کسی حکیم ڈاکٹر کو دکھاؤ، علاج کرو، میری ضعیفی کی لاٹھی تمہیں ہو، اپنا نہیں تو کم از کم میرا خیال تو کرو۔ مگر وہ ماں کو صرف یہ جواب دیکر ٹال دیا کرتا تھا کہ کام کی کثرت سے طبیعت پریشان رہتی ہے۔ ماہ دو ماہ میں یہ بات باقی نہ رہیگی کوئی عارضہ ہو تو علاج کروں۔

وہ دفتر میں سب سے پیشتر جاتا اور سب کے بعد واپس آتا، اس طرح اپنے افسر بالا دست کو بہت کچھ پرچا لیا تھا جس سے یک گونہ امید بندھ گئی تھی کہ شاید اس کی جگہ تخفیف میں نہ آئے۔ ایک دن سر دفتر صاحب نے بھی اپنے کمرہ میں طلب کر کے فرمایا کہ چونکہ ہم تمہارے کام سے بہت خوش ہیں اس لئے ہم نے سفارش کی ہے کہ تم اپنی اسامی سے نہ ہٹائے جاؤ مگر ہمیں اسکی منظوری کی بہت کم امید ہے۔ اتنا البتہ ہمارے اختیار میں ہے کہ اگر سفارش کی شنوائی نہ ہوئی تو تم کو سب کے بعد علیحدہ کیا جائیگا۔ تم ماشاء اللہ خود فہمیدہ ہو جب آمدنی کم ہو جائیگی تو مصارف بھی لا محالہ کم کرنا پڑینگے۔ تم دیکھتے ہو کہ تمہارے ہی دفتر سے اب تک پچیس آدمی برخاست ہو چکے اور دس کے نام پرسوں کل ان لوگوں کو بھی مطلع کر دینا، اچھا جاؤ مستعدی سے کام کرو۔ خدا تمہاری مدد کرے گا۔" جب ایک ایک کر کے چالیس آدمی الگ ہو گئے تو منشی نوندہ رائے کے لڑکے کو امید ہونے لگی کہ سر دفتر کی سفارش نے اسے بچا لیا۔ مگر پہلی تاریخ کو اسکی میز پر ایک بند لفافہ ملا، چاک کر کے پڑھا تو معلوم ہوا کہ سر دفتر صاحب کا تبادلہ ہو گیا اور اسکی جگہ بھی تخفیف میں آگئی۔ یہ خط کیا تھا پیام موت، ساری دنیا آنکھوں میں تاریک ہو گئی۔ دفتر کا کام اس دن کچھ نہ ہوا، شام کو گھر واپس آنے کے بجائے وہ ریل کی پٹری پٹری دو چار کوس نکل گیا اور سنسان جگہ پر پہونچکر باطمینان تمام پٹری پر سر رکھکر لیٹ گیا۔ صبح کو لاش جو پاش پاش ہو گئی تھی تھانے پر اٹھا کر لائی گئی اور قصبہ بھر میں کہرام مچ گیا۔ نوجوان ہونہار تخفیف کی دیوی کے بھینٹ چڑھ گیا۔

تنقید کتب

مقدمات عبدالحق (حصۂ اول) مرتبۂ مولوی مرزا محمد بیگ اسپیشل تعلقدار نظام ساگر دولت آصفیہ حیدرآباد دکن
حجم ۴۹۰ صفحہ سے زائد۔ تقطیع چھوٹی ۲۰×۳۰ مجلد قیمت تین روپیہ

ملنے کا پتہ: مکتبۂ ابراہیمیہ۔ اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سکریٹری انجمن ترقی اُردو کا نام تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ کے علمی کارناموں اور زبان اردو کی مہتم بالشان خدمات سے سبھی واقف ہیں۔ آپ زمانۂ حال کے ادیبوں کی صفِ اولین میں ہیں۔ ادب اُردو پر آپ نے جو احسانات کئے ہیں وہ کبھی محو نہیں ہو سکتے

فی زمانہ مولفین و مصنفین کی کثرت کے ساتھ مقدمہ نگاروں کی تعداد بھی روز افزوں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت کم مقدمے پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ مقدمہ کیا چیز ہے اسکا جواب نواب صدر یار جنگ بہادر نے کیا خوب دیا ہے، فرماتے ہیں:۔

جب آپ کاروبار کے کسی ممتاز مرکز پر گزرینگے تو دیکھیں گے دوکانوں کے سامنے کا ایک حصہ سلیقہ اور دلفریب طریقہ سے آراستہ سب سے اول دیدہ نواز ہوگا، یہ اپنی دلفریبی سے نگاہ کو اپنی جانب متوجہ کریگا اور متوجہ ہونے پر جب نگاہ تفصیل کی جویا ہوگی تو وہ بتائیگا کہ آپ کو جو جنس دکان پر ملیگی وہ کیا ہے۔ بعینہٖ یہی حال ایک کتاب کے مقدمہ کا ہے کہ وہ آپ کو دلکش طریقہ سے بتاتا ہے کہ کتاب میں کیا ہے۔ پیش طاق کے واسطے دو شرطیں تھیں سلیقہ اور تفصیل، بعینہٖ یہی دو شرطیں ایک مقدمہ کے واسطے ہیں۔ لکھنے میں اس کا سلیقہ ہو کہ دلکش پیرایہ میں کیا لکھا جائے اور کیا نہ لکھا جائے، کتاب کا کونسا حصہ نمایاں کیا جائے اور کونسا مخفی رہے تفصیل ایسی ہو کہ کتاب پڑھنے کے بعد مایوسی نہ ہو، بلکہ یہ اعتراف ہو کہ مقدمہ نگار راست نگار تھا۔ اگر مقدمہ نگار مطالب کتاب میں ترقی پیدا کر سکے اور پڑھنے والوں کے لئے مناسب موقعہ مزید معلومات بہم پہونچا دے۔ اس طرح کہ یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کتاب پڑھوا رہا ہے تو اس کو کمال مقدمہ نگاری ماننا چاہیئے۔"

اگر نواب صدر یار جنگ بہادر کی پیش کردہ کسوٹی پر مولوی عبدالحق صاحب کے فاضلانہ مقدمات کو کسا جائے تو وہ اس معیار پر تمام و کمال صحیح اترینگے۔ مولوی صاحب جس موضوع پر قلم اُٹھاتے اس پر پورا عبور کر کے اُٹھاتے ہیں

اور کتاب، مصنف کتاب اور موضوع کتاب تینوں پہلوؤں کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیتے ہیں۔ آپ نے جس کتاب پر مقدمہ لکھا ہے اس کے مطالب پر اس قدر محققانہ بحث کی ہے کہ بعض اوقات مقدمہ اصلی کتاب سے بھی زیادہ دلچسپ بنگیا ہے۔ آپ کتاب کے حُسن وقبح دونوں سے نہایت دلآویز طریقے سے بحث کرتے ہیں زبان نہایت سلیس اور زوردار ہوتی ہے

کتاب زیر نظر میں چودہ مقدمات ہیں جنھیں کتاب کی صورت میں ایک جگہ جمع کر کے قدر دان مرتب نے ادب اردو پر بڑا احسان کیا ہے۔ ہر مقدمہ کے پڑھنے سے لکھنے والے کے تبحر علمی اور محنت وجانکاہی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ نقد وبحث کے بیشمار اسلوب نظر آتے ہیں، ہر طرف معلومات کے انبار لگے ہوئے ہیں جن سے ہر ذی علم اور صاحب ذوق شخص لطف اندوز ہو کر بصیرت حاصل کر سکتا ہے۔ درحقیقت جس تحقیق و تدقیق سے مولوی صاحب نے کام لیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ چنانچہ اعظم الکلام۔ معرکۂ مذہب وسائنس اور تمدن ہند، کے مقدمات سے مولوی صاحب کی نکتہ رسی اور باریک بینی بخوبی واضح ہو جاتی ہے

ہم کو افسوس ہے کہ اس کتاب میں کتابت کی اس قدر غلطیاں رہ گئی ہیں کہ آخر میں ایک جزو کا غلطنامہ شامل کرنا پڑا۔ بہر حال بحیثیت مجموعی کتاب اس قابل ہے کہ ہر کتب خانہ کی زینت بنے۔

باغ وبہار مرتبۂ مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے سکرٹیری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔ مع مقدمہ وفرہنگ الفاظ تقطیع ۲۲×۱۸ قیمت مجلد پانچ روپیہ غیر مجلد ۴/ عہ۔ ملنے کا پتہ: انجمن ترقیِ اُردو اورنگ آباد دکن۔

"باغ وبہار" جسے "قصۂ چہار درویش" بھی کہتے ہیں لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ہند کے زمانے میں میر امّن دہلوی نے اُردو کے مشہور مربّی وسرپرست جان گلکرسٹ صاحب کے حکم وایما سے لکھی تھی۔ زبان کی فصاحت اور سلاست کے باعث یہ داستان اس قدر مقبول خاص وعام ہوئی کہ ابتک اس کی لاکھوں جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔ اصل کتاب سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے اس لئے اس کی تعریف وتوصیف کی کوئی ضرورت نہیں۔ قلعہ معلّی دہلی کی صاف شستہ اور سلیس زبان ہے جس پر ہزار فصاحت وبلاغت قربان ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے اور خود میر امّن نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے "یہ قصہ چار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زر بخش جو اُن کے پیر تھے اُن کی طبیعت ماندی ہوئی۔ تب مرشد کے دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور بیمارداری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی۔ تب انھوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصہ کو سُنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہیگا جب سے یہ قصہ فارسی میں مروج ہوا" لیکن مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے مقدمہ میں تحقیق وتدقیق کے بعد ثابت کیا ہے کہ اصل قصہ امیر خسرو دہلوی

کا لکھا ہوا نہیں ہے ورنہ اُن کی تصانیف میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔ اُن کی رائے میں اصل فارسی قصہ کسی دوسرے بزرگ کا لکھا ہوا ہے، گو یہ ممکن ہے کہ امیر خسرو نے اس کو اپنے پیر کو سنایا ہو۔

علاوہ بریں فاضل مقدمہ نگار نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ میرامّن دہلوی نے اپنا قصہ فارسی قصہ سے ترجمہ نہیں کیا بلکہ بجائے فارسی کے اُردو کتاب "نوطرز مرصع" سے اخذ کیا ہے جس کے مؤلف میر محمد حسین عطا خاں متخلص بہ تحسین ساکن اٹاوہ تھے۔ اس رائے کے ثبوت میں فاضل مقدمہ نگار نے قصہ فارسی، نوطرز مرصع اور باغ و بہار تینوں کی عبارتیں متوازی درج کر کے یہ راز افشا کر دیا ہے کہ فارسی قصے کا ترجمہ نہ نوطرز مرصع ہے نہ باغ و بہار بلکہ باغ و بہار میں اکثر و بیشتر "نوطرز مرصع" کا تتبع کیا گیا ہے، حتیٰ کہ میرامّن نے اس کے بعض جملے اور فقرے تو تمام و کمال اپنی کتاب میں بجنسہٖ نقل کر لئے ہیں۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ نوطرز مرصع کی عبارت رنگین اور سرتاپا تشبیہات و استعارات سے مملو ہے لیکن باغ و بہار کی عبارت روزمرہ بول چال کی فصیح و سلیس زبان ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے جس تحقیق و بلند نظری سے اس مقدمہ میں کام لیا ہے اس کا ایک مختصر نمونہ ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ باغ و بہار کے متعلق آپ لکھتے ہیں:-

"اس میں سیکڑوں محاورے اور الفاظ ایسے ملتے ہیں جو آجکل بول چال یا تحریر میں نظر نہیں آتے۔ بہت سے ایسے ہیں جو آنکھ سے اوجھل ہو جانے اور نہ جاننے کی وجہ سے استعمال میں نہیں آتے اور بعض ایسے ہیں جو اب متروک ہو گئے ہیں۔ ہماری زبان کا دارومدار ایک مدت تک شاعروں پر رہا اور شاعری کا میدان زیادہ تر غزل کے لئے وقف تھا، وہ ایسا تنگ کہ اس میں زبان کی کہاں تک کھپت ہوتی جس طرح شاعر شاعر سے سند لیتا ہے عام پڑھے لکھے لوگ بھی شاعری کی زبان کو زبان مانتے ہیں۔ لغت نویسوں نے بھی اکثر انھیں کی پیروی کی، اور دیوانوں کو ٹٹول کر الفاظ اور محاورے جمع کر دیئے۔ بہت سے لفظ یونہی پڑے رہ گئے اور کسی نے خیال بھی نہ کیا۔ اب ضرورت ہے کہ ایسے لفظوں کو جو آڑے وقت پر کام آنے والے ہیں اور جن کے مفہوم کو دوسرے لفظ اس خوبی سے ادا نہیں کر سکتے گمنامی سے نکالکر کام میں لایا جائے۔ مثال کے طور پر چند لفظ یہاں لکھے جاتے ہیں:-

"جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے" گھر سینا، بہت اچھا محاورہ ہے۔ بیاری سینا اب بھی بولتے ہیں۔

"جتنے آدمی وہاں کے ہزاری ہزاری نظر پڑے" یعنی خاص و عام، امیر و غریب۔

"منہ پر روہٹ آئی" یعنی رونق آئی۔ "بت کہاو" یعنی بات چیت۔ "گھوڑے کو ننگیانا" یعنی ایڑ دینا

"تیسرا درویش کوٹ باندھ بیٹھا" یعنی ایک خاص طرز نشست سے بیٹھا۔ "جب پر چھا ہوا" یعنی خبر پھٹ گئی۔ الغرض اسی قسم کے بیسیوں لفظ ہیں جو غور اور استعمال کے قابل ہیں۔"

مقدمہ میں ایسی بہت سی ترکیبیں اور باتیں دکھائی گئی ہیں جو امتداد زمانہ سے متروک ہو گئی ہیں لیکن باغ و بہار میں موجود ہیں۔ الغرض یہ کتاب اور اس کا مقدمہ ہزاروں خوبیوں اور معلومات سے مملو ہے، تقاضائے بشریت سے ایک آدھ جگہ البتہ خفیف امور میں نظر ثانی کی ضرورت باقی رہ گئی ہے۔

بہر حال کتاب ہر کتب خانہ میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔ اس کے آخر میں چھ صفحہ کی ایک فرہنگ بھی شامل ہے جس میں غیر مانوس الفاظ کی شرح کر دی گئی ہے۔

صبوحی از حضرت ساغر نظامی۔ مطبوعہ محبوب المطابع دہلی صفحات ۵۶۔ انگریزی رسالوں کی وضع پر دو آہنی کاجوں سے سلی ہوئی جسمیں ایک ریشمی پھند نہ دار ڈوری پڑی ہے۔ کتابت وطباعت و کاغذ دیدہ زیب شروع میں حضرت ساغر نظامی کی تصویر۔ قیمت مجلد عہ جو بلحاظ حجم زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ ملنے کا پتہ: ساغر بکڈپو نوگزہ میرٹھ

حضرت ساغر عہد جدید کے ایک خوش فکر و نوجوان شاعر ہیں، یہ کتاب آپ کی غزلوں کا ایک مختصر مجموعہ ہے جسے آپ نے "نالۂ نا تمام" کے نام سے موسوم فرمایا ہے۔ تمام غزلوں میں شروع سے آخر تک حضرت سیماب اکبر آبادی کی سی تڑپ نظر آتی ہے حسن فطرت کی عقیدتمندانہ پرستش حضرت ساغر کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے کہیں کہیں مظاہر قدرت کو روحانی رنگ میں بھی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن بحیثیت مجموعی سے ساغر صاحب کی شاعری پر حسن پرستی ہی کا رنگ غالب ہے۔ لفظ لفظ سے عشق پنہاں کا اضطراب اور دل کی بیکلی نمایاں ہوتی ہے۔ تاہم کہیں کہیں ساغر اس دنیائے آب و گل میں رہتے ہوئے بھی فہم و ادراک سے بالاتر ایک نورانی عالم کی جھلک دیکھنے لگتے ہیں جس کا دروازہ روحانی شعور رکھنے والے انسان کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ اپنے اس قول کے ثبوت میں اس مجموعے کی پہلی غزل کے تین اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

وہم و خیال سے بروں، وہم و خیال میں بھی آ	عالم حال سے بلند، عالم حال میں بھی آ
طور جلال ہو چکا۔ کوئی نڈھال ہو چکا	زور جلال ہو چکا۔ بزم جمال میں بھی آ
تیرے بغیر نا تمام تکملۂ حیات ہے	حد کمال سے فزوں، حد کمال میں بھی آ

بعض حکما کا خیال ہے کہ انسان اور دیگر موجودات عالم کی تہ میں ایک ہی روح ہے اور مظاہر عالم اور ادراک انسانی روحانیت و فطرت کے میل کے باعث ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، اس کے توسط سے ہم ایک بہتر عالم تک پہونچ سکتے ہیں۔ اسی نظریہ کو پیش نظر رکھکر اشعار ذیل مطالعہ کیجئے:۔

ہر رنگ میں نمود تھی تیرے جمال کی	تو چھپ کے بھی ہزار طرح آشکار تھا
کہتا میں کیوں کسی سے غم دل کا ماجرا	جس نے دیا تھا غم وہ مرا غمگسار تھا

دل بن کر سینہ میں کھو جا، پھر آنکھوں سے پیدا ہو جا — او قطرہ کہلانیوالے، دریا بن جا، دریا ہو جا

جنگل جنگل پھر دیوانے، مٹ کر ذرہ ذرہ ہو جا — گرد صحرا ڈھونڈھنے نکلے، اتنا تو آوارا ہو جا

دل میں سو آنکھیں پیدا کر، تاروں کی اک دنیا ہو جا — ذوقِ نظر کو وسعت دے لے اور محو نظارا ہو جا

حسن کو صرفِ سیر جہاں کر، برقِ نظر کو شعلہ چکاں کر — چھپ کر اپنا راز عیاں کر، پردہ میں بے پردا ہو جا

حسنِ اخلاق کی کیفیت ملاحظہ ہو ؎

عجز و نیاز ظاہر میں ہے، اوج و فراز باطن پنہاں — سورج ہے تو ذرہ ہو جا، دریا ہے تو قطرا ہو جا

"ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" اس مضمون کو ساغر نظامی نے کس پیرایہ میں ادا کیا ہے ؎

معراج عشق صادق حسنِ نیاز میں ہے — محمود بھی بنے گا پہلے ایاز ہو جا

تصوف کا آخری درجہ فنافی اللہ کا ہے جو شخص اس درجہ میں پہونچ جاتا ہے وہ اپنے ہوش میں نہیں رہتا۔ اسی مضمون کی طرف اس مصرعہ میں اشارہ ہے کہ ع "آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد"۔ ساغر نظامی نے اسی مضمون کو اس طرح باندھا ہے:۔

میخانۂ ازل میں رہی بیخودوں کی جیت — ان میں جو ہوشیار نہ تھا، ہوشیار تھا

آشنائے حسن پر ادراکِ ہستی ہے حرام — تجھ سے جو محرم ہوا، دنیا سے نامحرم ہوا

الزامِ بیخودی یہ مرے کس نے رکھدیا — خود رعبِ حسن پردۂ نظارہ پوش تھا

تنویرِ حسنِ دوست وداعِ شکیب تھی — پڑتے ہی اک نگاہ نہ میں تھا نہ ہوش تھا

ہاں نہ قائم رکھ سکا میں پاس آدابِ خودی — اس سے کیا شکوہ جو اپنے ہوش سے بیگانہ تھا

مندرجہ ذیل شعر میں زاہد ریاکار کو خلوص نیت کی تلقین کس عمدہ پیرایہ میں کی ہے۔

میں نے جو کبھی دل سے اک سجدہ کیا ہوتا — کعبہ مری عظمت میں سجدے میں گرا ہوتا

اشعار ذیل بھی نفس مضمون اور طرز بیان دونوں لحاظ سے قابلِ داد ہیں:۔

قاتل بنکر دادِ جفا لے، یا دل بنکر لطفِ وفا لے — یہ بھی ممکن وہ بھی ممکن، اب تو جانے جیسا ہو جا

سجدے میں ہوں کیفِ مستی، پوچھنے آئے ہوش کی بستی — ہے یہی دیر پرستی، دیر میں رہ کر کعبا ہو جا

کثرت رنگ و بو کا ساغر راز سمجھ میں آجائیگا — یا صبحِ میخانہ بنجا، یا شامِ میخانا ہو جا

مندرجہ بالا شعر میں "صبح بنارس" اور "شام اودھ" کے بجائے کس قدر دلفریب صبح و شام پیدا کئے گئے ہیں

یا دل سے باہر آجا، یا دل نواز ہو جا — اعداز بننے والے تفصیلِ راز ہو جا

کبتک پڑی رہینگی پیشانیاں زمیں پر — آج اپنی رہگذر میں سجدہ نواز ہو جا

صرفِ نوائے دل ہو، بنجائے گا دل آخر   آہنگِ ساز ہو کر، ہمرنگ ساز ہو جا

کہتے ہیں جسے موت سب اس دہر میں ساغر   دھندلا سا تخیل ہے مری بے خبری کا

جل جلا کر بہہ گیا ساغر اپنا لختِ دل   کچھ کباب ہو گیا۔ کچھ شراب ہو گیا

ہر جگہ جوشِ تمنا کا نیا عالم ہوا   آنکھ میں آنسو، جگر میں داغ، دل میں غم ہوا
باغ کی دوشیزگی، غمگیں ہوئی میرے لئے   مر گیا جب میں تو کلیوں میں مرا ماتم ہوا

درد کا درماں باندازِ دوا ہو جائے گا   جتنی پی لوں گا دل اتنا ہی ہرا ہو جائیگا
تری نظروں سے لیکر پوچتا ہوں رنگ مستی کا   بڑا نازک طریقہ ہے مری کافر پرستی کا

کسی صاحب کا شعر ہے ؎

دوستی کا ہو زمانے میں بھروسا کس پر   تو مجھے چھوڑ چلا اے دلِ شیدا کس پر

اسی خیال کو ساغر نے اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

دوستوں سے بھی مروت کا تقاضا نہ رہا   اب کسی پہ مجھے دنیا میں بھروسا نہ رہا

انگریزی شاعر کے اس قول کو کہ "نہ دیوار ہائے سنگین قید خانہ بن سکتی ہیں نہ آہنی سلاخیں قفس" ساغر صاحب نے اس طرح ظاہر کیا ہے :-

جذب دل کی تجھے صیاد کشش کیا معلوم   آہ کھینچی تو قفس ہی میں گلستاں ہوگا

بعض اشعار کے مضامین گو عامیانہ ہیں مگر طرز ادا خاص، مثلاً :-

دل کی بربادی کا افسوس نہیں غم یہ ہے   تیرے چھپنے کے لئے اب کوئی پردا نہ رہا
چھین لیں رقیب نے میری کامیابیاں   میری حسرتوں کا چور کامیاب ہو گیا
پیرہن جسم پہ باقی ہے بہار آنے تک   ہاتھ نکلے تو نہ دامن نہ گریباں ہوگا
وہ ہمکنار شوق تھے، شامِ بہار تھی   دامانِ آرزو سبدِ گل فروش تھا
چھپ کر نگاہِ مست سے بیہوش کر دیا   میری خبر نہ تھی، تمہیں اپنا تو ہوش تھا

حکمائے رواقئین (Stoics) کے فلسفۂ قنوطیت یعنی "دنیا ہیچ است و کارِ دنیا ہمہ ہیچ" نے

اہل مشرق کو جتنا نقصان پہونچایا ہے اتنا کسی دوسری تعلیم نے نہیں پہونچایا، ساغر نظامی نے بھی اس شعر میں اسی فلسفہ Pessimism کی پیروی کی ہے ؎

ہوش رہیگا جب تک باقی، دنیا ہرگز ترک نہوگی　　ہوش سپرد دنیا کر کے دنیا سے بیگانا ہوجا

غرض اس مختصر سے مجموعے میں صدہا جواہرات درخشاں اور بیسیوں خذف پارے بھرے ہوئے ہیں جواہرات کے نمونے آپ ملاحظہ کر چکے اب تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ ہو ؎

جزرومد سا پیدا ہے دل کے ہر تحرک میں　　ان کے حسن کو شاید آج ہوش ناز آیا

پہلے مصرعہ میں "تحرک" کا لفظ بجائے "حرکت" استعمال کیا گیا ہے جو نہایت ثقیل و غیر مانوس ہے۔

خاک دامن میں صبا بھر کے لئے جاتی ہے　　دفن کیا آج کوئی بے سروساماں ہوگا

خاک اُڑانے والی ہوا کو "صبا" نہیں کہتے۔

حشر میں عذر جفا کے لئے کام آئے گا　　سیکھ لیں آپ بھی انداز پشیماں میرا

غالباً پشیمانی کی جگہ "پشیمان" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

اب تو کچھ اشک ہیں کچھ ٹوٹے ہوئے کانٹے ہیں　　کبھی پھولوں سے بھی لبریز تھا داماں میرا

پہلے مصرعہ میں "ٹوٹے ہوئے کانٹے" بُری طرح کھٹک رہے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے کانٹوں کا دامن میں ہونا جنون کی علامت نہیں بلکہ عقل و فہم کی دلیل ہے۔

عشوۂ برہم کو دے اذن جراحت افگنی　　یہ جنوں اور یہ تکلف نشتر نقاد کا

مصرعۂ اولیٰ میں "جراحت افگنی" کی ترکیب پسندیدہ نہیں، ممکن ہے فارسی کے اساتذہ نے استعمال کی ہو مگر اُردو میں دیکھنے میں نہیں آئی۔

باریاب حسن کی محفل میں مراد دل ہوتا　　کاش یہ جام شکستہ کسی قابل ہوتا

مصرعہ اولیٰ میں "حسن" کی ح تقطیع سے گرتی ہے۔ مگر دنیا کی کوئی چیز سقم سے خالی نہیں ہے لیکن ارباب ذوق اس مختصر مجموعہ غزلیات میں اکثر و بیشتر باتیں قابل قدر پائیں گے۔

مسدس حالی

دار الاشاعت کانپور نے اس مشہور و معروف مسدس کو کانپور کے مشہور مطبع انتظامی میں غیر معمولی اہتمام سے نفیس و دبیز کاغذ پر چھپوا کر اور خوشنما جلد کے ساتھ شائع کیا ہے۔ تقطیع جیبی اور جلد انگریزی وضع کی نہایت خوشنما

جس پر طلائی حروف میں "مسدس حالی" تحریر ہے۔ کتاب کی کتابت، طباعت، آرایش و زیبایش نہایت نفیس و دلفریب ہے۔ ایک مطلّا و مذہّب لوح بھی ہے اس کی قیمت غالباً ایک روپیہ ہے۔

یہ مسدس اس قدر مشہور ہو چکا ہے کہ اس کے بند بند عوام کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں، پلیٹ فارم پر لکچرار، مجالس و مساجد میں واعظین اس کے اشعار پڑھکر اپنے مواعظِ حسنہ کو تقویت دیتے ہیں۔ اس اڈیشن کے لئے مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے ایک تنقیدی مقدمہ لکھا ہے جس میں مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کے سوانح حیات سے تفصیلی بحث کرنے کے بعد مسدس پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اس مقدمے کے بعد مولانا حالی کا پہلا دیباچہ اور مسدس "مدوجزر اسلام" درج ہے۔ بعدہٗ مولانا حالی کا دوسرا دیباچہ اور اس کے بعد مسدس کا ضمیمہ ہے۔ آخر میں مولانا حالی کی مشہور و معروف "عرض حال بجناب سرورِ کائنات علیہ افضل الصلوٰت واکمل التحیات" بھی لکھا دی گئی ہے۔

یہاں پر یہ عرض کر دینا بھی بے موقعہ نہ ہوگا کہ یوں تو یہ مسدس سیکڑوں بار چھپ چکا ہے لیکن اس کا بہترین اڈیشن مطبع نامی کانپور میں مولوی رحمت اللہ رعد مرحوم کے اہتمام سے شائع ہوا تھا لیکن اب وہ اڈیشن نایاب ہو گیا ہے۔ مگر دارالاشاعت کانپور نے اس اڈیشن میں نہ صرف مطبع نامی کے اڈیشن کی خصوصیات کو قائم رکھا ہے۔ بلکہ اس میں مشہور اسلامی عمارات، اسلامی آثار اور مشاہیر اسلام کی ۱۶ تصویریں اور عہد عروج اسلام کے زمانے کے دو نقشے بھی ہدیۂ ناظرین کئے گئے ہیں۔

ہم کو بھروسہ ہے کہ اس اڈیشن کی کافی قدردانی ہوگی تاکہ دارالاشاعت کانپور کو اسی طرح دوسری مقبول عام کتابوں کے نفیس اڈیشن شائع کرنے کا حوصلہ ہو۔

مثنوی صبح امید یہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی مشہور و معروف مثنوی ہے جس کے پڑھنے سے مسلمانوں کی گذشتہ عظمت و شوکت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ جو قوم کسی زمانہ میں اس اوج و ترقی پر تھی وہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر اب بھی دنیا کے لئے بہت کچھ کر سکتی ہے۔ مطبوعہ انتظامی پریس کانپور۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ جلد مع نام کتاب و فوٹو مطلّا و مذہب۔ لوح پر فوٹو میں ایک دلفریب اسلامی منظر۔ صفحات ۳۲۔ قیمت غالباً ۸/ دارالاشاعت کانپور سے مل سکتی ہے۔ شروع میں مولانا شبلی کا فوٹو ہے۔

اتحاد کانفرنس الہ آباد

(از محمد یعقوب خاں صاحب کلام بی۔اے)

وطن پرست مورخین کے قلم حقیقت رقم سے ہندوستان کی جو نئی تاریخ لکھی جائیگی اس میں ۱۷۔نومبر کا مبارک دن یقیناً جلی اور مطلا سرخی سے لکھا جائیگا۔ کیونکہ جس طرح گنگا جمنا اور سرسوتی کا سنگم ہو کر الہ آباد میں تربینی کی بنیاد پڑی اسی طرح اس مبارک تاریخ میں الہ آباد ہی میں ہندو مسلم اور سکھوں کا سیاسی اتحاد تجویز ہو کر ہندوستان میں ایک مشترکہ قومیت کی بنیاد پڑ گئی ہے۔ اس موقعہ پر مدتوں کے بچھڑے ہوئے بھائی دل کھول کر باہم بغلگیر ہوئے اور آپس کے فرقہ وارانہ تنازعات کا جو آئے دن ہوتے رہتے تھے ہمیشہ کیلئے خاتمہ تجویز کیا۔ درحقیقت جب ہمت بلند اور طلب صادق شامل حال ہوتی ہے تو سفینۂ مساعی ہمیشہ ساحل مراد تک پہونچ جاتا ہے۔ اول اول گاندھی جی کی پرنگیا کا یہ کراماتی نتیجہ ہوا کہ جو مشکل ہزاروں سال سے حل نہ ہوئی تھی وہ ہفتہ بھر میں حل ہو گئی۔ اس کے بعد چند محب وطن ہندو مسلمانوں نے جن کے پہلو میں دل اور دل میں قومی درد تھا۔ اس امر کی جدوجہد کرنا شروع کی کہ کسی طرح ہندو مسلم اور سکھ اختلافات مٹ جائیں۔ اور مادرِ وطن کے افق پر آفتاب اتحاد کی ضیا بار شعاعیں پرتو فگن ہوں۔ اس میدان صلح و اتفاق میں سب سے پہلا صحیح قدم یہ اٹھایا گیا کہ وسط ماہ ستمبر میں بمقام لکھنؤ اتحاد بین المسلمین کی بنا ڈالی گئی۔ جب اس میں کامیابی ہو گئی تو مسلمانوں کی متفقہ تجاویز الہ آباد میں اتحاد کانفرنس کے سامنے پیش ہوئیں۔ کانفرنس مذکور کی منتخب کمیٹی نے ۳۔ نومبر سے کام کرنا شروع کیا اور اس کا سلسلہ ۱۷۔ نومبر تک جاری رہا جس کا نتیجہ مفاہمت باہمی کی صورت میں نمودار ہوا۔ چونکہ کمیٹی کی آخری کارروائی کے وقت عیسائی نمایندے موجود نہ تھے اور بعض مسائل بعد میں بھی پیش کئے گئے تھے اس لئے ان سے متعلق مسائل اب پھر کمیٹی کے آیندہ اجلاس میں جو دسمبر میں ہوگی پیش کئے جائیں گے۔ اور جب کانفرنس مفاہمت باہمی کے متعلق کمیٹی کی رپورٹ منظور کرلیگی تو جملہ تجاویز ایک عظیم الشان آل انڈیا پارٹیز کانفرنس کے اجلاس میں پیش ہونگی جس میں ملک کی تمام مشہور سیاسی اور فرقہ پرست انجمنوں کے نمایندے مدعو کئے جائیں گے۔ اس کانفرنس میں عورتوں، عیسائیوں، اینگلو انڈین، زمینداروں، مزدوروں، تاجروں اور اہل حرفہ سبھی کے نمایندے شامل ہونگے۔

لیکن اس کانفرنس کے منعقد ہونے سے قبل تمام مسلم جماعتوں کی ایک نمایندہ کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہونے والی ہے جہاں یہ تمام فیصلے تصدیق و توثیق کی غرض سے تمام جماعتوں کے نمایندوں کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ اس کے بعد آل انڈیا پارٹیز کانفرنس الہ آباد یا لکھنؤ یا دہلی میں منعقد کی جائیگی اور ان فیصلوں کے متعلق عام منظوری حاصل کی جائیگی۔ اتحاد کانفرنس کی منتخب کمیٹی نے جو فیصلے اب تک کئے ہیں وہ ناظرین کی آگاہی کے لئے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

تحفظ مذاہب و معاشرت

مختلف اقوام و ملل کے بنیادی حقوق کے متعلق جو دفعات ہندوستان کے دستور اساسی میں شامل ہونگے ان میں اس بات کی ضمانت کی جائیگی کہ جملہ اقوام متعلقہ کے تمدن، رسم الخط زبان، مذہبی تعلیم، مذہبی عقائد و اعمال اور مذہبی اوقاف محفوظ ہونگے۔ قوانین شخصی (پرسنل لاز) کی حفاظت کے لئے دستور اساسی میں خاص دفعات شامل کی جائینگی۔ مختلف صوبجات کی اقلیتوں کے سیاسی و دیگر حقوق کی حفاظت کا کام حکومت مرکزیہ کے متعلق اور اس کے دائرۂ اختیارات میں داخل ہوگا۔

قوانین شخصی

کسی ملت کے قوانین شخصی (پرسنل لاز) میں ترمیم نہ کی جائیگی بجز ایسی صورت کے کہ کوئی ملت مجالس قانون ساز میں اپنے نمایندوں کے ذریعہ سے خود اس قسم کی خواہش کا اظہار کرے اور رائے عامہ ان نمایندوں کی حامی و موید ہو۔ مسلمانوں کے جو قوانین شخصی اس وقت برطانوی ہند میں نافذ ہیں ان کے اندر کوئی تبدیلی نہ ہو سکے گی بجز اس کے کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق ہوں (یعنی جو قوانین اسلامی اصولوں کے منافی ہیں انھیں تبدیل کیا جا سکے گا۔)

مذہب پر اثر انداز ہونیوالے مسودات قانون

اگر کوئی ایسا مسودہ قانون منظور ہو جائے جس کے متعلق کسی مجلس قانون ساز میں کسی ملت کے ¾ نمایندوں کی یہ رائے ہو کہ وہ ان کے مذہب یا مذہبی معاشرت پر اثر انداز ہوتا ہے یا جس کے متعلق مجلس مذکور کے ¾ اراکین کا یہ خیال ہو کہ اس سے رعایا کے بنیادی حقوق پر اثر پڑتا ہے تو ان نمایندوں یا اراکین کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ مسودۂ قانون کی منظوری کے بعد ایک ماہ تک صدر مجلس کے سامنے اپنا اعتراض پیش کریں، جو اس اعتراض کو گورنر یا گورنر جنرل کے پاس (جیسی صورت ہو) بھیجدیگا۔ جو اس کے بعد لازمی طور پر اس مسودۂ قانون کو ایک سال کے لئے ملتوی کردیگا۔ اور اس مدت کے گذرنے کے بعد وہ مسودہ پھر مجلس قانون ساز میں دوبارہ پیش کیا جائیگا۔ اگر اس مرتبہ بھی مجلس مذکور اس میں کوئی ایسی ترمیم یا تنسیخ نہ کرے جس سے وہ اعتراض رفع ہو جائے تو گورنر یا گورنر جنرل کو اس کے منظور کرنے یا نہ کرنے کا پورا اختیار رہیگا

م جواز کے لئے وہ مسودۂ قانون سول عدالت عالیہ میں پیش کیا جا سکے گا۔ اور اس
جس پر قانون مذکور اثر انداز ہوتا ہو بایں بنا مقدمہ دائر کر سکیں گے کہ اس قانون سے
قوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ پنجاب۔ بمبئی۔ بہار اور صوبہ متحدہ میں جو مخصوص تحفظ
اس پر اس تحفظ کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

ت مرکزیہ کی مجلس وزارت میں حتی الامکان مسلمانوں۔ سکھوں اور دیگر اقلیت والی کثیر التعداد
ستانی قوم میں شامل ہیں رواج کے ذریعہ سے داخل کیا جائیگا۔ پہلے دس سال میں ایک
حکومت میں سکھوں کو دی جائیگی۔ صوبجات کی حکومتوں میں صوبوں کی اہم ہندوستانی
روایتی حیثیت سے لحاظ رکھا جائیگا۔

موں کا تقرر ایک غیر جانبدار پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ سے ہوگا اور یہی کمیشن مختلف
ت کا معیار مقرر کریگا۔ اور ان کی اہمیت کا لحاظ رکھے گا۔ اور یہ اصول بھی مدنظر رکھیگا
لک کی سرکاری ملازمتوں میں منصفانہ حصہ حاصل کرنے کا یکساں موقعہ بہم پہونچے۔ پنجاب
ن میں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی نمایندگی ہوگی اور اسی طرح تمام صوبجاتی پبلک
ں میں صوبہ کے خاص خاص فرقوں کی نمایندگی ہوگی۔ یہ تجویز منظور کی گئی ہے کہ سات
یٹی جس میں تین ہندو، دو مسلمان، ایک سکھ اور ایک عیسائی ہونگے فریدارکان کو
ل کرنے کے اختیار کے ساتھ مقرر کی جائے۔ اور یہ کمیٹی ایسی اسکیم پیش کرے جس کے
جہ بالا اصولوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔

س امر پر اتفاق ہوگیا ہے کہ تمام ہندوستان میں فوج اور عدالت کے دروازے ملک
کے لئے کھلے رہیں گے۔ دونوں محکموں میں قابلیت کے معیار پر بھرتی ہوگی جو سیاسیات
صوبہ سے بالاتر ہوگی۔

| اختیارات مابقی (Residuary Powers) کے متعلق اس امر پر اتفاق ہوگیا ہے کہ
باتی حکومتوں کے اختیارات کی فہرستیں تفصیل کے ساتھ بنا دی جائینگی اور مرکزی حکومت کو صوبوں کے
ن لینے کا حق حاصل نہ ہوگا۔ جو مضمون خاص طور پر کسی فہرست میں موجود نہ ہوگا وہ
ین سے اپنے تعلق اور مناسبت کے اعتبار سے تقسیم کیا جائیگا۔ مشتبہ مضامین کے
، و شبہات کا آخری فیصلہ سپریم کورٹ کے اختیار میں ہوگا! فوری ضرورت کے موقعہ پر
ں مرکزی حکومت کی رائے غالب رہیگی۔

مرکزی مجلس قانون ساز | اس امر پر اتفاق ہوگیا ہے کہ مرکزی مجلس قانون ساز میں برطانوی ہندکی مجموعی نشستوں میں سے ۳۲ فیصدی نشستیں مسلمانوں کے لئے اور ۴½ فیصدی نشستیں سکھوں کے لئے مخصوص رہیں۔

صوبوں کی قانونی کونسلوں میں پاسنگ | اس امر پر اتفاق ہوگیا ہے کہ آیندہ دس سال تک صوبوں کی قانونی کونسلوں میں وہی پاسنگ قائم رہیگا جو مسلم اقلیتوں کو برطانوی فیصلہ سے قبل حاصل تھا۔

بلوچستان | اس کانفرنس کی رائے میں باقاعدہ دستوری حکومت کے فوائد بلوچستان کو بھی ملنا چاہئیں اس مقصد کے حاصل کرنے کے طریقہ پر بعد میں غور کیا جائیگا۔

صوبۂ سرحد | صوبۂ سرحد کو بھی اسی قسم کا نظام حکومت حاصل ہوگا جیسا کہ دیگر صوبجات کو دیا جائیگا۔

بنگال | (۱) نشستوں کی تخصیص کے ساتھ مشترکہ انتخابات کا طریقہ قائم ہونا چاہیئے (۲) مسلمانوں کو اکیاون فیصدی اور ہندوؤں و دیگر اقوام کو جو عام انتخابات میں شامل ہیں، ۴۷ فیصدی نشستیں دیجائینگی اور دونوں صورتوں میں مخصوص حلقہائے انتخاب بھی شامل ہونگے۔ (۳) دس سال کے بعد نشستوں کی تخصیص اور مخصوص انتخابی حلقے خودبخود ختم ہوجائیں گے (۴) ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو مزید نشستیں حاصل کرے اور مسلمانوں و ہندوؤں کے درمیان جس تناسب پر اتفاق ہوا ہے اس کے متعلق دونوں قوموں کے حقوق کو پورا کرنے کے لئے نشستوں کو تقسیم کرے اور دفعہ ۱ و ۲ میں جو معاملات مذکور ہیں ان کا تصفیہ کرے۔ (۵) مسلمانان بنگال کو مخلوط انتخاب اسی صورت میں قبول ہوگا کہ انھیں تمام ایوانوں میں اکیاون فیصدی نشستیں ملیں۔ (۶) ہندو اور مسلمان دونوں باہم ملکر جدوجہد کریں گے کہ مرکز اور صوبوں میں فوراً مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم ہوجائے۔ (۷) نشستوں کی تخصیص ختم ہوجائے تو بالغوں کے لئے رائے دہی کا حق فوراً تسلیم کرلیا جائیگا۔ (۸) مندرجہ بالا تمام دفعات ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔

پنجاب | اس پر اتفاق ہوگیا ہے کہ مندرجہ ذیل انتظامات پنجاب میں آئندہ دس سال تک نافذ رہیں گے: (۱) پنجاب کی وزارت میں کم از کم ایک ہندو اور ایک سکھ ضرور ہوگا۔ (۲) مجلس وزارت مجلس قانون ساز کے سامنے ذمہ دار ہوگی۔ (۳) اگر کسی مسودۂ قانون پر یا وزارت کی کسی پالیسی پر مجلس قانون ساز میں تمام اقلیت والے فرقوں کے ⅔ اراکین بایں خیال اعتراض کرینگے کہ وہ مسودہ یا پالیسی امتیازی ہے یا کسی اقلیت کے مخصوص مفاد پر مضر اثرات ڈالتی ہے اور وہ اعتراض وزارت صحیح تسلیم کرلے تو اس مسودۂ قانون یا پالیسی کو واپس لے لیا جائیگا۔ اگر وزارت نے اعتراض مذکور کو صحیح تسلیم نہ کیا تو معاملہ تصفیہ کے لئے حکومت مرکزیہ کی مقرر کردہ عدالت ثالثی (ٹریبونل) کے سپرد کیا جائیگا جس میں تین ہندوستانی جج ہونگے

اوران ججوں میں کسی ایک فرقے کے دو جج نہیں ہونگے۔ مگر جس فرقے کو شکایت ہوگی اس کا ایک جج ضرور ہوگا۔ اس ٹربیونل کا فیصلہ ایک ماہ کے اندر صادر ہوجائیگا اور صوبجاتی حکومت کو اُسے قبول کرنا پڑے گا۔ اگر وزارت اس کو قبول کرنے سے انکار کریگی تو اُسے مستعفی ہونا پڑے گا۔ اگر اسی قسم کا کوئی مسودۂ قانون کسی غیر سرکاری رکن کی طرف سے پیش کیا گیا اور اس پر اعتراض کیا گیا تو اس میں بھی یہی طریق عمل اختیار کیا جائیگا۔ مندرجہ بالا تحفظ صوبۂ متحدہ، بہار اور بمبئی میں بھی نافذ العمل ہوگا۔ (۴) مجلس قانون ساز میں مخصوص حلقہائے انتخاب کو شامل کرکے نشستوں کا تناسب اس طرح رکھا جائیگا کہ مسلمان اکیاون فیصدی، سکھ بیس فیصدی، ہندو ستائیس فیصدی، عیسائی انگلو انڈین اور یورپین دو فیصدی۔ یہ بھی تجویز ہے کہ مجلس قانون ساز کی نشستیں بجائے ۱۷۵ کے دو سو کردی جائیں۔ مگر نشستوں کا تناسب وہی رہیگا جو اوپر بیان کیا گیا۔ (۵) مندرجہ بالا تمام دفعات آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

سندھ | اس امر پر اتفاق ہوگیا ہے کہ سندھ کو علحدہ صوبہ بنا دیا جائے اور اسے اتنی ہی خود مختاری حاصل ہو جتنی کہ برطانوی ہند کے دوسرے بڑے صوبوں کو دی جائے اور جس قسم کے تحفظات دوسرے صوبوں کو دیئے گئے ہیں اسی قسم کے تحفظات سندھ کی اقلیتوں کو بھی دیئے جائیں۔ یعنی

(۱) مجلس وزارت مجلس قانون ساز کے سامنے ذمہ دار ہوگی اور اس میں کم از کم ایک وزیر ضرور ہندو ہوگا۔

(۲) پنجاب فارمولا کی دفعہ ۳ میں جس مسودۂ قانون یا پالیسی کا ذکر کیا گیا ہے اس پر وہی طریق عمل ہوگا جو اس فارمولا میں مذکور ہے۔

(۳) الف۔ شہری و دیہاتی حلقہائے انتخاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے حق رائے دہی کا معیار یکساں ہوگا

ب۔ دس سال کے بعد اس اصول کو قائم رکھتے ہوئے جو الف میں بیان کیا گیا ہے اس امر کی کوشش کیجائیگی کہ فہرست رائے دہندگان میں مختلف فرقوں کا تناسب منعکس ہو۔

ج۔ طریق انتخاب مخلوط ہوگا اور تمام ایوان میں ہندوؤں کے مخصوص حلقوں کو شامل کرنے کے بعد ہندوؤں کے لئے ستائیس فیصدی نشستیں مخصوص ہونگی۔ اگر دس سال کے بعد ہندوؤں نے خواہش ظاہر کی تو ان کے لئے نشستوں کی تخصیص تناسب آبادی کے اعتبار سے کردی جائیگی۔ اور انھیں مزید نشستوں کے لئے مقابلہ کا حق حاصل ہوگا۔

د۔ لوکل باڈیز میں اور اس نمایندہ مجلس میں جو بذریعہ قانون قائم کی جائے انتخاب مخلوط و مشترکہ طریقے سے ہوگا۔ اور اکثریت کے لئے نشستوں کی کوئی تخصیص نہیں ہوگی۔ البتہ اگر اقلیت کی طرف سے یہ مطالبہ ہو کہ اس کے لئے نشستیں مخصوص کردی جائیں تو اکثریت و اقلیت دونوں کی نشستیں

تناسب آبادی کے اعتبار سے مخصوص کردیجائیں گی۔

ھ۔ سرکاری ملازمتوں کے لئے بھرتی کا اختیار پبلک سروس کمیشن کو ہوگا۔ کم از کم ½ سرکاری ملازم ہندو ہونگے۔ ساٹھ فیصدی عہدے کھلے مقابلہ کے لئے رکھے جائیں گے اور چالیس فیصدی فرقوں کا تناسب درست کرنے کے لئے ہونگے۔ ملازمتوں میں سندھیوں اور سندھ میں رہنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔

و۔ کوئی امتیازی قانون نافذ یا کوئی امتیازی ٹیکس عائد نہ کیا جائیگا۔ اور کسی شخص کو اس کی ذات عقیدہ یا رایوں کی وجہ سے اقتصادی حقوق حاصل کرنے سے محروم نہ کیا جائیگا۔ اس میں خرید وفروخت اراضیات پیشے اور حرفے بھی داخل ہیں۔

ز۔ انتظامی اور عدالتی شعبہ جات کو الگ کردیا جائیگا۔

ح۔ سندھ میں ایک چیف کورٹ یا ہائی کورٹ ضرور قائم کیا جائیگا۔

علیحدگی سندھ کے متعلق یہ معاہدہ تمام فرقہ وارانہ تصفیہ کا ایک جزو ہوگا۔ اگر یہ تصفیہ کسی وجہ سے بحیثیت مجموعی قبول نہ ہو تو سندھ کا تمام معاملہ بھی ختم ہوجائیگا۔

مخلوط انتخاب | اس پر اتفاق ہوگیا کہ تمام انتخابات میں مشترکہ مخلوط طریقہ انتخاب اختیار کیا جائیگا لیکن آئندہ دس سال کے لئے مولانا محمد علی مرحوم کا فارمولا مندرجہ ذیل ترمیم کے ساتھ نافذ ہوگا:۔

ان امیدواروں میں سے جو اپنے فرقے کے تیس فیصدی ووٹ حاصل کریں گے صرف وہی امیدوار کامیاب قرار پائے گا جسے مجموعی طور پر سب سے زیادہ ووٹ حاصل ہونگے۔ اگر کوئی امیدوار ایسا نہ ہوا جسے اپنے فرقے کے تیس فیصدی ووٹ حاصل ہوں تو ان دو امیدواروں میں سے جنھیں اپنی قوم کے سب سے زیادہ ووٹ ملے ہوں وہ امیدوار کامیاب شمار ہوگا جس کی مجموعی تعداد ووٹوں کی زیادہ ہو۔ دس سال بعد تیس فیصدی کا یہ قاعدہ خود بخود ختم ہوجائیگا لیکن اس سے قبل ہی ہر فرقہ کو آزادی حاصل ہوگی کہ وہ اس قاعدہ کو چھوڑ کر خالص مخلوط انتخاب قبول کرلے۔

مرکزی ذمہ داری | کانفرنس کی پختہ رائے ہے کہ ہندوستان کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور باشندگان ہند کی آئندہ فلاح کا یقین دلانے کیلئے اس امر کی ضرورت ہے کہ مرکز میں ایسی حکومت قائم کی جائے جو باشندگان ہند کے سامنے پوری طرح ذمہ دار ہو اور جسے قومی حکومت کے جملہ حقوق حاصل ہوں۔ اسلئے یہ کانفرنس مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت ہند پر ہندوستانی باشندوں کو اقتدار دیدیا جائے اور صرف ایسے تحفظات قائم رکھے جائیں جو ہندوستان کیلئے مفید ہوں اور جنکی مدت بذریعہ قانون

خاتمہ | اس پر اتفاق ہوگیا کہ اس تصفیہ کے مختلف حصے آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور یہ تمام تصفیہ ناقابل تقسیم ہے اسلئے اس کا نفاذ بحیثیت مجموعی ہونا چاہئیے۔

میکش محبّت

(از پروفیسر سنت پرشاد کوکب مدہوش ایم۔اے)

جوشِ صہبائے محبت دل کے پیمانہ میں ہے　　بادۂ شہلائے الفت میرے میخانہ میں ہے
سوزِ موسیٰ مشتعل اس دل کے پروانہ میں ہے　　وادیِ ایمن کا قصہ میرے افسانہ میں ہے
میکشِ الفت ہوں میں بادہ فروشِ عشق ہوں
خاک کا پُتلا نہیں ہوں میں سرِ دوشِ عشق ہوں

چشمۂ کوثر ہے دل میں جس سے میں مخمور ہوں　　عشق کے میں نے پئے ہیں خم کے خم میں چور ہوں
جل گیا ہوں سوزِ الفت سے میں کوہِ طور ہوں　　یا کلیم اللہ کے سوزِ نہاں کا نور ہوں
میرے دل کے شوقِ بے پایاں کا ہر سو جوش ہے
لوگ کہتے ہیں کہ یہ مینوش ہے مینوش ہے

نرگسِ شہلائے شوخ مست کا بیمار ہوں　　چُور ہوں مسرور ہوں مخمور ہوں سرشار ہوں
لغزشیں ہیں زلزلہ انگیز وہ مے خوار ہوں　　آتشِ مے دل میں ہے میں کوہِ آتشبار ہوں
شعلہ ہائے دل پہونچ جاتے ہیں جب افلاک پر
ٹوٹ آتے ہیں مری آہوں سے تارے خاک پر

سوزِ صد بلبل نہاں میری غزل خوانی میں ہے　　اضطرابِ برق دل کی شعلہ افشانی میں ہے
ہستیِ عاشق تمامی کیفِ وجدانی میں ہے　　ایک دریا جوش کا اس دردِ پنہانی میں ہے
سوزِ الفت کا ازل ہی سے میں لذت گیر ہوں
حُسن کے پھندے میں خود آیا ہوا نخچیر ہوں

تاج محل

(از جناب طالب چکوالی بی۔اے۔ ایل ایل بی)

چاندنی راتوں کا خوابِ دلفریب — نقرئی راتوں کا حسنِ دیدہ زیب
ماہ صورت دلربا کی یادگار — حسرتِ دیدارِ رخسارِ بہار
ایک عاشق کے وفا کی داستاں — صورتِ تکمیل عہدِ جانِ جاں
پاسِ عہدِ یار کا آئینہ دار — یادگارِ لطفِ ایامِ بہار
حسرتِ خاموش کا دلکش مزار — صورتِ تسکینِ قلبِ بیقرار
مدفنِ صد آرزوئے دل فریب — اک سرابِ چشمۂ صبر و شکیب
کشتۂ آلام کا رنگیں نقاب — بحرِ یاس و غم کا نورانی حباب
پردہ دارِ زخمہائے دل فگار — یادگارِ ہستیِ ناپائے دار
حسرتِ خاموش سیمیں پیرہن — مثلِ دختِ ماہ نورانی بدن
سادگی میں چاندنی سے بھی حسیں — چاندنی میں قصرِ فردوسِ بریں
تاجِ پیمانِ وفائے تاجدار — عکسِ جاں افزائے رخسارِ نگار
یادگارِ الفتِ شاہِ جہاں — روضۂ ممتاز فردوس آشیاں

فنِ تعمیرات کی تکمیل — تاج
دردِ احساسات کی تشکیل — تاج

جزیرہ نہوہ کا بحری سفر

(از جناب محمود اسرائیلی)

بحر کی سیر کو لچھمی[1] پہ جو نکلا میں کل
کہا احباب نے چلتا ہے جو نہوہ[2] کو تو چل

وہ جزیرہ ہے عجب معدنِ خوبی واللہ
لعل بنجائے پہونچ جائے جو سنگِ اسفل

وقت فرصت تھا شبِ ماہ تھی اور فصلِ بہار
اس سے بہتر نہ تھا تفریح و تنزہ کا محل

عرض کی میں نے مجھے عذر نہیں بسم اللہ
قصہ کوتاہ کہ پل میں گئے ساحل سے نکل

دلکشی بحر کی لکھنے کو تو لکھتا ہوں میں
خامۂ شوخ کہیں ہاتھ سے جائے نہ اُچھل

میں وہ شاعر ہوں، مری فکرِ رسا کے حامل
نہ مسدس نہ مخمس نہ قصیدہ نہ غزل

بزم میں کھینچ چکی کلکِ چمن کے خاکے
رزم میں کرچکی ہمت کی سناں پر صیقل

دیکھئے اس کی گہر ریزیاں اس بحر میں بھی
کہ مجھے بحر کا کرنا ہے بیانِ مجمل

مہر و مہ بن کے چمکتے تھے سمندر میں حباب
فرشِ گیتی پہ نظر آتا تھا گردوں کا بدل

بحر کے چہرے کو چھونے بھی نہ پائی تھی نسیم
اس کے تیور پہ نزاکت سے پڑے سیکڑوں بل

فرشِ مخمل پہ تھی آغوش کشا سبز پری
غلطی تھی جو سمجھتے تھے اُسے تختِ جبل

قصرِ نیلم میں کھڑا آئینہ تکتا تھا مہر
گلِ صد برگ کی ڈالے ہوئے رنگین ہیکل

کرنیں خورشید کی ڈھاتی تھیں غضب وقتِ غروب
جیسے حوروں کے لٹکتے ہوں فلک سے آنچل

یوں سمندر کے کنارے تھی چراغوں کی قطار
نیلگوں ساری پہ ہو جیسے سنہری جدول

[1] لچھمی جہاز کا نام ہے۔ [2] نہوہ بمبئی کے قریب ایک جزیرہ ہے۔

عکس مہتاب پہ اس طرح تھا موجوں کا ہجوم
جیسے رخسار پہ ہوں گیسوئے پرپیچ کے بل

حسنِ دلکش کو بڑھاتی تھی ہر اک موج لطیف
چہرۂ ماہ پہ تھا آبِ رواں کا آنچل

بحر کی سطح سے پیدا تھی گلستاں کی بہار
موج تھی شاخِ چمن۔ ورطۂ رقصاں تھا کنول

آب کو آب دیئے جاتی تھی مہ کی تنویر
شاعروں کے لئے تھی موجِ رواں تیغِ اجل

دُور سے چشم کی صورت نظر آتے تھے جہاز
چشمِ بدمست بھی وہ جس میں لگا ہو کاجل

بحر کے بادۂ رنگیں کے کٹورے تھے بھنور
اور ہر موج مصفّا تھی چھلکتی چھاگل

قطرۂ آب میں تھی آبِ گہر جلوہ فروز
جس کو سینے میں چھپا لیتے تھے آ کر بادل

بحر کی پریاں ہوا کھانے چلی آئی تھیں
جن کو مینارۂ[1] دکھاتا تھا گلابی مشعل

سیکڑوں قوسِ قزح بن کے بگڑ جاتی تھیں
آگ سی جل میں نظر آتی تھی اور آگ میں جل

ایک آئینۂ قدرت تھا سمندر محمود
جس کے ہر جوہرِ تابندہ میں تھا حسنِ ازل

رباعیات

(۱)
فطرت کا سخن ہے ہمہ تن گوش رہو
گر ذوقِ حقیقت ہے تو مدہوش رہو
مطرب ہے خدا، راگ ہے اسکا دنیا
یہ راگ جو سننا ہے تو خاموش رہو

(۲)
اے زیست! شعاعِ آسمانی تو ہے
فانی بھی ہے پھر بھی جاودانی تو ہے
جس نے کیا ظلماتِ جہاں کو روشن
انوارِ خدا کی وہ نشانی تو ہے

(ہمایوں)

[1] روشنی کا مینارہ جس سے گلابی روشنی نکلتی تھی۔

حافظ شیرازی کی ایک غزل

ہمارے دوست سید مقبول حسین صاحب بی۔اے نے اس مشہور و معروف غزل کا عام ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا ہے جس کو ہم ناظرین کے تفنن طبع کے لئے درج ذیل کرتے ہیں۔ اُردو داں اصحاب اس کو سلیس اُردو کہیں گے اور ہندی خواں حضرات اسے ٹھیٹھ بھاشا سمجھیں گے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہی ہمارے دیہاتوں کی [illegible] زبان ہے۔ شیراز کی شراب کو جس خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ ہمارے دوست نے ہندی شیشے میں بھرنے کی کوشش کی ہے وہ بہت قابل داد ہے (ا۔ ز)

(غزل حافظ شیرازی)

این چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم — ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم
ہر کسے روز بہی می طلبد از ایام — مشکل این ست کہ ہر روز بتر می بینم
ابلہاں را ہمہ شربت ز گلاب و قندست — قوت دانا ہمہ از خون جگر می بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں — طوق زریں ہمہ در گردن خر می بینم
دختران را ہمہ جنگ ست و جدل با مادر — پسران را ہمہ بدخواہ پدر می بینم
ہیچ رحمے نہ برادر بہ برادر دارد — ہیچ شفقت نہ پدر را بہ پسر می بینم

پند حافظ بشنو خواجہ برو نیکی کن
زانکہ این پند بہ از گنج گہر می بینم

(ترجمہ از سید مقبول حسین بی۔اے ۔ سمہ پوری)

۱۔ ایسا کچھ اندھیر مچا ہے دُنیا چکر کھاوے
روگ اک ہے سارے جگ کو چین نہ کوئی پاوے
ایسا کچھ اندھیر مچا ہے

۲۔ گیت بھلائی کا اپنی جس کو دیکھو وہ گاوے

بات کٹھن[1] تو یہی ہے پیارے اور بگڑتا جاوے
ایسا کچھ اندھیر مچا ہے

۳۔ مایا مورکھ[2] کے پلّے ہے گھی اور دودھ اڑاوے
بھوجن[3] بھوکا گیانی اپنا آپ کلیجہ کھاوے
ایسا کچھ اندھیر مچا ہے

۴۔ لال عماری والا ہاتھی بھاری بوجھ اٹھاوے
لادی ڈھونے والا گدہا چندن[4] تلک لگاوے
ایسا کچھ اندھیر مچا ہے

۵۔ کنیا[5] کے اب دیدے دیکھو ماتا[6] سے لڑ جاوے
پُتر[7] پتا سے آنکھ لڑا کے اپنی دھونس جماوے
ایسا کچھ اندھیر مچا ہے

۶۔ ترس سگے بھائی کو اپنے بھائی پر نہ آوے
بالک اپنے سگے پتا میں پریم کی باس نہ پاوے
ایسا کچھ اندھیر مچا ہے

۷۔ گر کی بات بتاویں حافظ جو کوئی دھیان لگاوے
جگ میں نیکی کے لگ بھگ تو کنچن ڈھیر نہ آوے
سچ تو اسے مقبول کہا ہے

دورِ جدید

(از جناب بسمل الہ آبادی)

دیکھنے والوں کو حاصل لطفِ دنیا کچھ نہ تھا ۔۔۔ اس نے دیکھا اس نظر سے جیسے دیکھا کچھ نہ تھا
اس طرح کہتے ہوئے مغموم بسمل بھی پھرے ۔۔۔ کیا سرِ دربار اچھا تھا تماشا کچھ نہ تھا

---

[1] مشکل [2] بیوقوف [3] کھانا [4] صندل [5] لڑکی [6] ماں [7] بیٹا

لطفِ سخن

(جناب ابوالفاضل راز چاند پوری)

وہ ذوقِ عشق نہیں دل میں اب وہ جوش نہیں ۔۔۔ بجا ہے آپ کا کہنا، میں خود فروش نہیں
سُنے گا کون، سناؤں کسے فسانۂ دل ۔۔۔ سخن فروش ہے دنیا، سخن نیوش نہیں
حریفِ اہلِ محبت ہے چرخِ بد باطن ۔۔۔ بہوش باش کہ یہ دورِ نائے نوش نہیں
خموش واعظِ شیریں بیاں، جزاک اللہ ۔۔۔ میں حق نیوش نہیں، ہاں میں حق نیوش نہیں
یہ برہمن ہے، یہ شیخِ حرم، یہ پیرِ مغاں ۔۔۔ یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی مے فروش نہیں
یہ ضبط و نظم، یہ نصفت شعاریِ ساقی ۔۔۔ کہ میکدے میں کہیں شورِ نائے نوش نہیں
یہ لطفِ خاص، یہ چشمِ کرم، جزاک اللہ ۔۔۔ رہینِ ہوش و خرد کوئی بادہ نوش نہیں
مریدِ نرگسِ مخمور ہوں، زہے قسمت ۔۔۔ خدا کا شکر، مجھے فکرِ نائے نوش نہیں
دیارِ غیر میں لطفِ وطن کہاں اے راز ۔۔۔ وہ ہمنفس، وہ سخنور، وہ حق نیوش نہیں

(از جناب جلیل قدوائی ایم۔اے)

ایک ناکامِ محبّت پہ نہ بیداد کرو ۔۔۔ پہلے ہی خاک ہے دل اور نہ برباد کرو
کون کہتا ہے مجھے شاد کہ ناشاد کرو ۔۔۔ تم ہو مختار، جو چاہو ستم ایجاد کرو
یہ زباں سے جو کہا تم نے یہ ناکافی ہے ۔۔۔ نگہِ ناز سے کچھ اور بھی ارشاد کرو
جذبۂ شوق سے لیتا ہوں میں اپنے اب کام ۔۔۔ تم کو بھی میری قسم ہے جو مجھے یاد کرو
چار ہی دن میں وہ سب قول و قسم بھول گئے ۔۔۔ یہی پیمانِ محبت تھا ذرا یاد کرو
سعیِ برباد کے اب ذکر سے کیا حاصل ہے ۔۔۔ سعیِ برباد کو اب اور نہ برباد کرو
قدر دانی کے عوض پیش کرو ہدیۂ شکر ۔۔۔ بلبلو! قید پہ کیوں شکوۂ صیاد کرو؟
جیرتی بن کے جو آنا ہے تو آؤ ورنہ ۔۔۔ دوستو! نامِ محبت کا نہ برباد کرو

رات ساری تو کٹی اُن کے تصور میں جلیل — صبح کا وقت ہے اللہ کو اب یاد کرو

(پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق)

دیکھیے حشر میں کیسی مری رُوداد رہے — مجکو کیا یاد رہے اُن کو نہ کیا یاد رہے
اُسی بیرحم سے ہاں شکوۂ بیداد رہے — پاس رسوائی مگر اے لبِ فریاد رہے
نغمہ سنجی تری او بلبلِ ناشاد رہے — آہ و زاری بھی نہ بے مرضئ صیاد رہے
وار کھاکر بھی تڑپنا نہ ہمیں یاد رہا — دیکھتے پاس سے ہم جانبِ جلاد رہے
دل کی بیتابی و حسرت کا کھنچا ہو نقشہ — رنگ اُڑتا ہوا تصویر کا بہزاد رہے
امتحاں دونوں کا ہوجائے تو جھگڑا ہی مٹے — یا تو فریاد مری یا تری بیداد رہے
رہرو ملکِ عدم جاتے ہیں کیسے خاموش — سچ ہے بھولا ہوا قصہ انھیں کیا یاد رہے
دلکو پہلو سے نکالوں کہ پڑا رہنے دوں — جو کہیں آپ وہی آپ کا ارشاد رہے

(از سید محمد جعفر قدسی جائسی)

چھڑے کہیں یہ دو عالم میں حسن و عشق کا ساز — ہو ایک تیسری ہی آواز یا مری آواز
حقیقت اپنی سمجھ بیٹھے کہ طلسمِ مجاز — کہاں کا سوز کہاں کا الم کہاں کا گداز
یہ اک نگاہ میں کیا کر گیا کوئی غماز — کہ ساز و سوز میں پہلا سا اب ہی سوز نہ ساز
سُنے جو گوشِ حقیقت نیوش سے کوئی — ہے ایک ہی وہ تری ہو کہ ہو مری آواز
خبر نہیں ہے کہ یہ کس نے کردیا پیدا — نظر میں ذوقِ تماشا جگر میں سوز و گداز
اُدھر یہ ضد کہ رہے آئنہ ہی پیشِ نگاہ — اِدھر یہ شوق کہ حاصل ہو لطف راز و نیاز
حقیقتاً یہی اسباب کامرانی ہیں — جنھیں سمجھتا ہے ناکامیاں حریصِ مجاز
کمند بن گئی مرغِ دلِ حزیں کے لئے — بڑھا یا سلسلۂ زلفِ خوب عمر دراز
صعوبتِ شبِ فرقت نے ساز چھیڑا ہے — جو بات منہ سے نکلتی ہے دل کی ہے آواز
چلے گا کیا کوئی دنیا میں آنکھ بند کیے — قدم قدم پہ ہے جب ہر جگہ نشیب و فراز

سُنا ہے راہِ محبت میں مرمٹا قدسی
مگر تھا وہ بھی خدا بخشے عاشقِ جانباز

علمی نوٹ اور خبریں

حیدر آباد کے مولوی سید محمد احمد صاحب ایم۔ اے نے میر کی تمام مثنویات کا بڑی تحقیق و تلاش کے بعد متعدد قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جس میں میر صاحب کی سوانح حیات اور شاعری پر بلند پایہ تنقید بھی کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ مثنویات میر کے نام سے عنقریب شایع ہونیوالا ہے۔

ناظرین زمانہ یہ سنکر خوش ہونگے کہ ہندستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ نے سید علی عباس حسینی ایم۔ اے لکچرار جوبلی کالج لکھنؤ کو جن کے کئی مختصر افسانے اس "رسالہ میں شایع ہو چکے ہیں" رفیق تنہائی اور دیگر افسانے" نامی کتاب کے صلے میں پانچ سو روپیہ کا ادبی انعام دینا منظور کیا ہے۔ ہم اس اعزاز پر اپنے مکرم دوست کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔

انگلستان کے ایک نقاد ادب کی رائے ہے کہ فرانس کے ہر دلعزیز اخبارات انگلستان کے مشہور اخبارات کے بہ نسبت بہت متین اور سنجیدہ ہوتے ہیں چنانچہ فرانس کے کسی کثیر الاشاعت اخبار میں سینما ایکٹریسوں کی تصویریں وغیرہ شائع نہیں ہوتیں، اور نہ ادنیٰ مذاق کے مضامین ہی درج کئے جاتے ہیں۔

جوہر سخن کے نام سے مولانا کیفی چریاکوٹی نے ہندستانی اکیڈمی کی فرمایش سے اُردو شاعری کے ابتدا سے لیکر زمانہ موجودہ تک کے شعرا کے مختصر حالات زندگی اور کلام کا قابل قدر انتخاب کیا ہے، جو آجکل زیر طبع ہے۔

خواجہ عبد المجید صاحب بی۔ اے کے اہتمام سے لاہور میں اُردو زبان کا ایک مکمل لغت "جامع اللغات اُردو" کے نام سے تیار ہوا ہے جسمیں اردو۔ ہندی۔ فارسی۔ عربی اور سنسکرت کے کثیر التعداد الفاظ اور محاورات فراہم کرنے کے علاوہ اقوال اور ضرب الامثال اور مشاہیر عالم کے سوانحی حالات اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ یکجا کرنے کی کوشش کیگئی ہے۔ اس لغت کا حجم تقریباً ڈھائی ہزار صفحات کا ہوگا اور خریداروں کی سہولت کی غرض سے یہ لغت اُنچاس نمبروں میں

تیس ماہوار حصوں میں شایع کیا جائیگا۔ پہلا حصہ جنوری ۱۹۳۳ء سے شایع ہوگا۔ قیمت فی حصہ ۸؍ مقرر کیگئی ہے شایقین جامع اللغات کمپنی، پوسٹ بکس نمبری ۳۳۔ لاہور کے پتے سے طلب فرمائیں۔

غازی کمال پاشا صدر جمہوریہ ترکی نے حال میں ترکی کے اخبارات کے ایڈیٹروں سے یہ درخواست کی ہے کہ فارسی عربی اور یوروپین زبانوں کے بہت سے الفاظ کو جو ترکی زبان میں خواہ مخواہ رائج ہو گئے ہیں ترک کرکے ان کی جگہ قدیم ترکی الفاظ اور محاورات کو استعمال کریں

کچھ عرصہ ہوا کہ ہمعصر "کشمیری" لاہور نے "اخلاق سوز لٹریچر" کے عنوان سے ایک نوٹ لکھا تھا جو ہمارے اہل قلم اور اہل مطبع دونوں کے غور کا مستحق ہے۔ ہم اسکی اہمیت کے لحاظ سے اس نوٹ کو یہاں پر بجنسہ درج کئے دیتے ہیں۔ ہمارا ہمعصر لکھتا ہے:

"یہ امر بیحد خطرناک ہے کہ اردو زبان میں اخلاق سوز لٹریچر نہایت سرعت سے پیدا ہو رہا ہے۔ اردو کے بہت سے رسائل نے خلاف اخلاق افسانے، ڈرامے، غزلیں اور پست قسم کے جذبات انگیز مضامین اور عریاں تصاویر شائع کرنا اپنا مقصد حیات قرار دے دیا ہے۔ علاوہ ازیں علم نوعی اور فلم سازی وغیرہ کے نام سے شرمناک کتابیں اور تصاویر بھی دھڑا دھڑ شائع ہو رہی ہیں۔ یہ بات ہماری قوم کے مستقبل کے لئے زبردست خطرہ ہے جس کے انسداد کی طرف ہمیں فوری توجہ کرنی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں ہمیں اپنے اکثر قومی اخبارات سے بھی شکوہ ہے۔ کیونکہ اس بات میں انکی خاموشی کی کوئی وجہ جواز ہمیں نہیں معلوم ہوتی۔ اسکے علاوہ اس قسم کے لٹریچر کے بیشمار اشتہارات انکے صفحات میں شائع ہو رہے ہیں۔ جو بیحد قابل افسوس امر ہے۔" (کشمیری لاہور۔ مورخہ ۲۴۔ اکتوبر ۳۲ء)

اعلیٰحضرت نظام دکن نے مہابھارت کے ایک مہتم بالشان ایڈیشن کے لئے دس ہزار کا گرانقدر عطیہ عنایت فرمایا ہے۔

خریداران زمانہ کی خدمت میں ضروری اطلاع

جن صاحبوں کی خریداری ماہ جنوری سے شروع ہوتی ہے انکا حساب آئندہ یعنی دسمبر کے پرچہ کے ساتھ ختم ہو جائیگا اور آئندہ سال کی قیمت واجب الوصول ہو جائیگی۔ لہذا گزارش ہے کہ ایسے تمام اصحاب جنوری ۱۹۳۳ء تک کا سالانہ چندہ مبلغ پانچ روپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں ورنہ جنوری ۳۳ء کا رسالہ سالانہ قیمت کے لئے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ (V. P. P.) ارسال ہوگا۔

بذریعہ منی آرڈر زمانہ کی قیمت ۵؍ میں بھیجی جاسکتی ہے لیکن قیمت طلب ویلیو پی ایبل پیکٹ میں ایک پانچ آنے کا صرفہ برداشت کرنا ہوگا کیونکہ ۲؍ فیس کے علاوہ ہر ویلیو پے ایبل کو بذریعہ رجسٹری بھیجنا ضروری ہے جس کی فیس اب ۳؍ رہے۔

منی آرڈر بھیجنے والے اصحاب کوپن میں اپنا پورا نام و پتہ اور (جہانتک ممکن ہو) اپنا نمبر خریداری صاف و خوشخط تحریر فرمائیں تاکہ رقم مرسلہ کا صحیح اندراج ہوسکے جن صاحبوں کو آئندہ خریداری جاری رکھنا منظور نہو وہ براہ کرم دسمبر نمبر کے پہنچنے کے بعد فوراً ہی اطلاع دیدیں تاکہ ان کی خدمت میں جنوری کا رسالہ نہ بھیجا جائے اور وہ قیمت طلب (V.P.P.) پیکٹ کی واپسی کی زحمت سے اور دفتر مزید نقصان سے محفوظ رہے۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کا زمانہ آخر ماہ دسمبر تک اور جنوری ۱۹۳۳ء کا زمانہ وسط جنوری تک شائع ہو جائیگا۔

Peps پیپس

ھانسی۔زکام۔نزلہ۔گلے کے زخم اور سوزش کو

انس کے ساتھ فائدہ پہونچانیوالی عجیب وغریب ٹکیاں

ہندوستان کی آب وہوا میں پھیپھڑوں، سینے کی بیماری اور گلے کو اچھا کرنے کے لئے "پیپس" کی
ے نظیر اور حیرت انگیز دوا خاص طور پر تیار کی گئی ہے۔

جونہی پیپس کی ٹکیہ منہ میں گھلتی ہے۔ اس
ے طاقتور شفا بخش ابخرے اُٹھتے ہیں اور سانس
ے ساتھ سیدھے پھیپھڑوں میں پہونچتے ہیں گلے
ی نسوں اور سانس لینے کی نازک نلیوں کے واسطے
ت زود اثر تسکین دہ اور شفا بخش دوا ہے۔

پیپس کی ٹکیاں گلے میں پھنسنے والا بلغم نکالتی
ہوائی نلیوں کو صاف کرتی ہیں۔ ان سے تکلیف دہ
ھانسی بھی رفع ہو جاتی ہے۔

یہ آپ کو ناگہانی کھانسی۔ ٹھنڈ گلے کے زخم۔
رم۔ دمہ اور دوسری سینہ اور پھیپھڑوں کی بیماری
ے محفوظ رکھے گی۔

پیپس کی ہر ایک ٹکیہ پر
نقرئی غلاف چڑھا ہوا ہے

تمام دوا فروش ایک روپیہ فی شیشی
میں پیپس فروخت کرتے ہیں

ایجنٹ: مسرز اسمتھ اسٹین اسٹریٹ
اینڈ کو لیمیٹڈ۔ انٹالی۔ کلکتہ
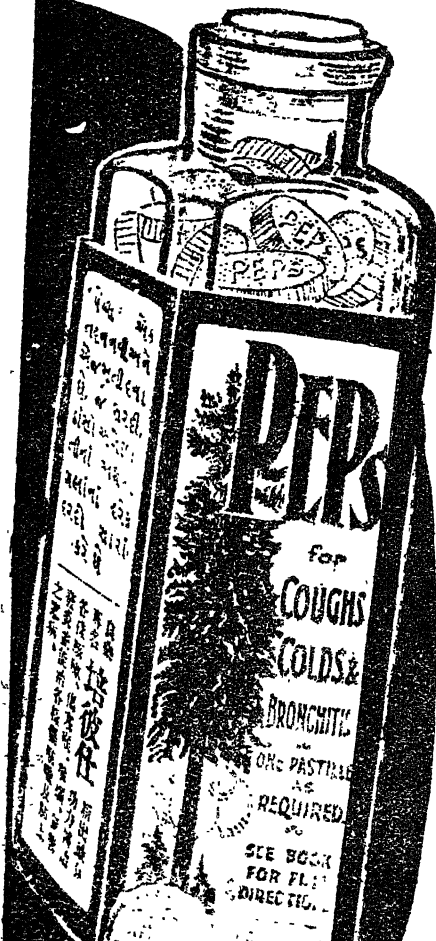
زمبک Zam-Buk
اکزیما۔ پھوڑے پھنسی اور زخموں کیلئے
جڑی بوٹیوں کا حیرت انگیز مرہم
زمبک زخم یا دیگر جلدی امراض کو جادو کی طرح شفا بخشتا ہے۔
یہ حیرت انگیز مرہم کیمیاوی طور پر بیش قیمت اور نایاب جڑی بوٹیوں کے تیل اور جوہروں سے تیار کیا جاتا ہے۔ زمبک میں جراثیم کش تریاق صفت خاصیتیں موجود ہیں۔ یہ جراثیم کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ خون میں سمیت نہیں ہونے دیتا۔ ورم کو تحلیل کرتا ہے اور تمام مادۂ فاسد کو خارج کر دیتا ہے۔ نئی اور عمدہ جلد پیدا کرتا ہے
زمبک سب انگریزی دوا فروشوں کے یہاں دستیاب ہوتا ہے۔
ایجنٹ: مسرز اسمتھ اسٹینس اسٹریٹ اینڈ کمپنی لیمیٹڈ۔ انٹالی۔ کلکتہ
حیوانی چربی سے پاک و صاف
فی ڈبیہ قیمت ایک روپیہ یا دو روپیہ چار آنہ
CONTAINS NO ANIMAL FAT
IS PURELY HERBAL
Zam-Buk
"RUB IT IN"
FOR CUTS · BURNS
BRUISES
SCALDS · PILES
ITCH · DELHI SORES
PRICKLY HEAT · ULCERS
BOILS · ABSCESSES
BITES & STINGS

ALETRIS CORDIAL RIO
THE WOMAN'S TONIC
الٹرس کارڈی آئل یعنی اکسیر نسوان
ڈاکٹر اس کو جسمانی صحت کیلئے بہترین قرار دیتے ہیں
ہر گھر میں اس کا رہنا نہایت ضروری ہے
ماں بہن اور بیٹی کے واسطے بہترین دوائی
Rio Chemical Co.
79 BARROW STREET
NEW YORK (U.S.A.)
ہندو شعراء
خواجہ عشرت لکھنوی کی جدید تالیف چار سو پچاس گزشتہ و موجودہ ہندو شعراء کے حالات و منثور و دلکش قابل دید چیدہ اشعار
قیمت
تذکرہ آب بقا۔ گزشتہ و موجودہ شعراء کے حالات
شاعری کا مکمل سٹ چار جلدوں میں
لغات اردو مکمل سٹ
حال اردو۔ ہندی اور اردو کی حقیقت اور الفاظ کا فرق
اصلاح زبان اردو۔ متروکات کی تشریح
ترجمان پارسی۔ اردو سے فارسی بنانے کی آسان ترکیب
زباندانی۔ اردو کے مستند قواعد
اصول اردو
المشتہر منیجر عشرت بکڈپو احاطہ خانساماں لکھنؤ
ایک کمزور آدمی کس طرح اپنی مردانہ طاقت بڑھا سکتا ہے
ایک کمزور آدمی کس طرح اپنی جسمانی طاقت اور مردانہ قوت کو بڑھا سکتا ہے؟ ہزاروں ڈاکٹروں نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ
"سناٹوجن کے استعمال سے"
مشہور عالم طبیب ڈاکٹر مرگلر ایک ایسے مریض کا ذکر کرتے ہوئے جسکی مردانہ قوت انتہائی کمزور ہو گئی تھی بیان کرتے ہیں کہ سناٹوجن کے استعمال کے چھ ہفتہ کے بعد اسکے مریض کو پورے طور پر قوت مردمی حاصل ہو گئی۔"
سناٹوجن نے اس شخص کو جو فائدہ پہنچایا ہے وہ آپ کو بھی پہنچ سکتا ہے۔ سناٹوجن کی بدولت آپکی تندرستی بہت اچھی ہو جائیگی اور آپ کو پورے طور پر مردانہ طاقت حاصل ہوگی اور کے ساتھ ہی ساتھ سناٹوجن کے ذریعہ آپ کو کمزوری و ناطاقتی کی ہر علامت پر غلبہ حاصل ہو جائیگا۔
اس مشہور مقوی غذا کو آج ہی سے استعمال کرنا شروع کر دیجئے
ہر ایک انگریزی دوافروش اور دوکاندار اسکو فروخت کرتا ہے
SANATOGEN
اصلی مقوی غذا
ہاتھ سے نہیں چھوٹی جاتی

اصل مال ہونیکی سب سے بڑی تصدیق یہ ہے کہ گورنمنٹ نے صرف بنگال اور برما کیلئے لائسنس

رجسٹرڈ

مرتبہ: دیا نراین نگم بی۔اے۔

جلد ۵۹ | دسمبر ۱۹۳۲ء | نمبر

فہرست مضامین

تصاویر:۔ یسوع مسیح صلیب پر۔ سر علی امام مرحوم۔

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت ممالک غیر سے سالانہ ۔ ششماہی ۔ ہندوستان کیلئے ۔ ششماہی ۔

یکم اکتوبر سے ہم نے اپنے
کٹ پیس اور سکنڈ ہینڈ گرم کوٹوں
کے نرخوں میں حیرت انگیز کمی کردی ہے ہماری پرائس لسٹ منگاکر ہمارے نرخوں
کا دوسروں سے مقابلہ کریں موسم نزدیک ہے اگر روپیہ پیدا کرنا چاہتے ہو تو ہم سے
مال منگاکر اپنے شہر یا قصبہ میں یہ تجارت شروع کردیں نہایت منفعت بخش
تجارت ہے ہمارا کٹ پیس کا مال ہندوستان بھر میں مقبول ہوچکا ہے ہمارا
ایکصد دوصد اور تین صد روپیہ کی گانٹھیں ہزاروں بیروزگاروں کو مالا
کرچکی ہیں سچ پوچھا جائے تو بے روزگاروں کا صحیح علاج کٹ پیس
وسکنڈ ہینڈ گرم کوٹوں کی تجارت ہے نام نہاد تاجروں کے چکنے
چپڑے الفاظ سے بچیں اور ہمارے نرخنامہ کا بغور مطالعہ کریں ہمارا
دعویٰ ہے کہ اس قدر کم نرخوں پر اس قدر اعلیٰ اور عمدہ
مال جیسا کہ ہم بھیجتے ہیں آپ کو کسی دوسری جگہ سے نہ
مل سکے گا۔

ہیتھ اینڈ سامرس ۱۳-۱۱ الفنسٹن سرکل فورٹ بمبئی

۱۲/ میں ۳ گھڑیاں ۶ شیشی اوٹو اور ۱۹۲ انعام

ہمارے مشہور اوٹو موتیا کی چھ شیشی ۱۲/ میں جو خریدینگے ان کو تین
گھڑیاں ایک ریلوے ٹائم ڈمی پاکٹ واچ ایک بی ٹائم پیس مضبوط
مشین والی گارنٹی ۵ سال اور ایک گولڈ گلٹ ڈمی رسٹ واچ
ایک فاؤنٹین پین گرٹ گولڈ گلٹ نب کے ساتھ ایک انگوٹھی اور بہت سی
بیش قیمت اشیا مفت پیکنگ خرچ ۱۰/ الگ

دی ایرعن کامرشیل اسٹور پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۱۰ کلکتہ

ممیرا اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر آر۔ کرار صاحب بہادر سی۔ آر۔ ایس فیلو آف کیمسٹری لن

جس کی بابت لندن، کلکتہ، پنجاب، آگرہ میڈیکل کالج کے سند یافتہ ڈاکٹروں۔ نوابوں اور راجاؤں معزز حکما صاحبان۔ ڈپٹی
ومعزز یوروپین انگریزوں وغیرہ نے بعد تجربہ لکھا ہے۔ کہ
آنکھوں کی بیماری و ترقی روشنی کے واسطے مفید ہے اور سب سے بہتر زود اثر دوا ہے ملک روس وافریقہ کے معزز ڈاکٹر
ہندوستان کے حکیموں وڈاکٹروں نے آنکھوں کی بیماریوں میں اور دوا کو چھوڑ کر اس سرمہ کو استعمال کیا

ہمارے سرمہ کا امتحان اور اس میں کامیابی

نگاہ ناپ کر سرمہ لگائیے دو ہفتہ میں روشنی بڑھ جائیگی اور جملہ نقائص دور ہوجائیں گے عینک کی ضرورت نہیں
دھند، ڈھلکا، آنسو بہنا، سرخی، سوزش، آنکھوں کے سامنے اندھیرا، پلکوں کے اندر کی سرخی، گوہانجی دور ہوتی ہے۔ کمزور نگاہ
ناگاسوئی میں بہت جلد ڈال لیجئے۔ پربال، سبل، جالا، پھولا، ابتدائی موتیابند، ناخونہ، آنکھوں کے سامنے ڈورا سا آنا بند ہوجاتا ہے۔ لگ
سے آنکھ کا کان اور سرخی بہت جلد صاف کرتا ہے اور امراض چشم سے محفوظ رکھتا ہے۔ قیمت فی تولہ تین روپیہ محصولڈاک ۶

ملنے کا پتہ: منیجر نجم کمپنی۔ نیا چوک۔ کانپور

اس کا علاج
زمبک
سے کیجئے
جو کٹے یا جلے ہوئے مقامات
اور زخموں کے لئے طلسمی مرہم ہے
ذرا سے کٹے جلے ہوئے زخم سے کبھی لاپروائی نہ برتیے
اس سے ناسور اور زہریلے زخم پیدا ہونے کا اندیشہ
رہتا ہے۔ تھوڑا سا زمبک کا مرہم زخم پر لگانے سے
زہرباد اور دوسری خطرناک بیماریوں سے حفاظت
ہو جاتی ہے۔ زمبک کیمیاوی طور پر بیش بہا اور
نایاب دواؤں کے تیل اور جوہروں سے تیار کیا جاتا ہے۔
اسمیں حیرت انگیز تسکین دہ اور شفا بخش خاصیت ہوتی ہے
یہ جراثیم کو ہلاک کرنے والی بیش قیمت دوا ہے۔ زمبک سے
کٹی ہوئی کھال کے نشان غائب ہو کر نئی اور عمدہ جلد نکل آتی ہے
زمبک اکزیما، ناسور، داد، بوائین سنج، زخم پھوڑے اور بواسیر
کے لئے یکساں فائدہ بخش ہے۔
سب جگہ انگریزی دوا فروش
زمبک ایک روپیہ و ڈھائی
روپیہ فی ڈبیہ کے حساب سے
فروخت کرتے ہیں۔
ایجنٹ:۔ مسرس اسمتھ اسٹینس اسٹریٹ
اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ اشاعی کلکتہ
حیوانی چربی سے پاک ہونے کی ضمانت کی جاتی ہے۔
زمبک
Zam Buk

ہند و شعراء
خواجہ عشرت لکھنوی کی جدید تالیف چار سو پچاس گذشتہ و موجودہ ہندو
شعراکے حالات موثر و دلکش قابل دید چیدہ اشعار
تذکرہ آب بقا گذشتہ و موجودہ شعرا کے حالات
شاعری کا مکمل سٹ چار جلدوں میں
لغات اردو مکمل سٹ
حال اردو ہندی اور اردو کی حقیقت الفاظ کا فرق
اصلاح زبان اردو - متروکات کی تشریح
ترجمان پارس - اردو سے فارسی بنانیکی آسان ترکیب
زباندانی - اردو کے مستند قواعد
اصول اردو - صرف و نحو کے مختصر قواعد
المشتہر
منیجر عشرت بکڈپو - احاطہ خانساماں لکھنو
ALETRIS CORDIAL RIO
THE WOMAN'S TONIC.
الٹرس کارڈیئل یعنی اکسیر نسواں
ڈاکٹر اس کو جسمانی صحت کے لئے بہترین دوا قرار دیتے ہیں
ہر گھر میں اس کا رہنا نہایت ضروری ہے
ماں بہن اور بیٹی کے واسطے بہترین دوائی
Rio Chemical Co;
79, BARROW STREET,
NEW YORK (U.S.A.)
وقت وقت پر آب حیات
آتنک نگرہ گولیاں
طاقت دینے کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہو چکی ہیں - قیمت فی ڈبیہ ۳۲ گولیاں ایک روپیہ
چندر پربھا گولیاں
سوزاک اور پیشاب کی ہر شکایت کی لاثانی دوا ہے فی ڈبیہ ۱۶ - گولیاں ۱۶ - یوم کی خوراک ایک روپیہ
کاسانتک گولیاں ہر قسم کی کھانسی کیلئے رام بان - قیمت فی ڈبیہ ۵۰ گولیاں صرف ایک روپیہ
ہیضہ کی گولیاں ہیضہ کے مرض کو تھوڑی ہی دیر میں مکمل شفا بخشتی ہیں فی ڈبیہ ۳۰ گولیاں ایک روپیہ
جورانتک گولیاں قدیم سے قدیم اور نئے بخار کی جڑ کو نابود کر دیتی ہیں فی ڈبیہ چالیس گولیاں ایک روپیہ
المشتہر
ویدشاستری - جام نگر - کاٹھیاواڑ

زمانہ

جلد ۵۹ — دسمبر ۱۹۳۲ء — نمبر ۶

خدائے سخن حضرت میر

(از پروفیسر سید مسعود حسن رضوی۔ ادیب ایم۔اے)

بارھویں صدی ہجری کی پہلی چوتھائی گزرنے کے بعد اکبر آباد کی زمین پر ایک ستارہ نمودار ہوا جو شاعری کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکا۔ کون اُردو داں ہوگا جو میر محمد تقی میر سے واقف نہ ہو۔

خدائے سخن حضرت میر کے والد بزرگوار ایک صوفی منش، درویش صفت بزرگ تھے۔ نام محمد علی تھا مگر اپنے زہد و اتقا کی بدولت علی متقی کہلاتے تھے۔ ایک مرتبہ اثنائے سفر میں ان کی نظر کیمیا اثر نے بیانہ کے ایک نوجوان کو ایسا متاثر کیا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر اُن کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ آخر شوق کی رہنمائی سے اس کو منزل مقصود کا پتہ مل گیا۔ اکبر آباد پہونچکر اس نے میر علی متقی کا دامن ایسا مضبوط پکڑا کہ مر کے چھوڑا۔ میر تقی کی تربیت اسی تارک دنیا درویش سید امان اللہ کی گود میں ہوئی۔

ابھی میر صاحب کی عمر صرف دس برس کی تھی کہ سید امان اللہ نے انتقال کیا۔ اس حادثہ نے ان کو سخت صدمہ پہنچایا اور اُن کے والد تو اس غم میں ایسے پڑے کہ پھر نہ اُٹھے۔ باپ کی ناوقت موت سے میر صاحب پر مصیبتوں کا دروازہ کھل گیا۔ سوتیلے بڑے بھائی نے کل ترکہ پر قبضہ کرکے اُن کو ستانا شروع کیا۔ جب اپنے گھر میں بیٹھنے کا ٹھکانا نہ رہا۔ تو اُنھوں نے معاش کی تلاش اور علم کے شوق میں دہلی کا رخ کیا۔ وہاں ان کے اُنھیں برادر یوسف کے خالو سراج الدین علی خاں آرزو موجود تھے جو علم و فضل میں اپنے زمانہ میں یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے۔ میر صاحب نے اُنھیں کے یہاں قیام کیا مگر وہ سرچشمۂ علم اُن کے لئے محض ایک سراب ثابت ہوا۔

خان آرزو کی بے توجہی اور بدسلوکی سے تنگ آکر میر صاحب نے اُن کے یہاں کے قیام کو سلام کیا۔ خواجہ محمد باسط نے اپنے چچا امیر الامرا، نواب صمصام الدولہ سے ان کی سفارش کی اور نواب نے ان کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیا۔ ایک ذی علم بزرگ میر جعفر عظیم آبادی نے اُن میں تحصیل علم کا شوق دیکھکر اُن کو بڑی محبت اور دلسوزی سے پڑھانا شروع کیا۔

کچھ زمانہ کے بعد امروہہ کے ایک سید سعادت علی خاں سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے ان کی طبیعت کا رنگ دیکھکر ریختہ میں شعر کہنے کی صلاح دی۔ ان امروہوی سید صاحب کی مزاج شناسی نے وہ ساز چھیڑ دیا جس کے نغموں سے تھوڑے ہی دنوں میں سارا شہر گونج اُٹھا۔

خواجہ میر درد کے والد خواجہ ناصر عندلیب کے یہاں ماہوار مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ میر صاحب ان مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ خواجہ ناصر ایک صاحب کشف بزرگ تھے۔ انھوں نے میر کا کلام سُنکر ابتدا ہی میں اُن سے کہدیا تھا کہ ایک دن تم میر مجلس ہوجاؤگے۔ آخر وہ پیشین گوئی پوری ہوکر رہی۔ جب اتفاقات زمانہ نے اس محفل کو درہم برہم کر دیا تو میر صاحب اپنے یہاں ہر مہینے مشاعرہ کرنے لگے۔

میر صاحب نے وہ زمانہ پایا تھا کہ دہلی کی سلطنت بالکل کمزور ہوگئی تھی۔ امیروں جاگیرداروں اور صوبہ داروں کی باہمی جنگیں، احمد شاہ درانی کے حملے اور مرہٹوں کی تاخت و تاراج سے ایک ہلچل پڑی ہوئی تھی، شہر تباہ ہو رہے تھے، آبادیاں ویران ہو رہی تھیں، خاندانی عظمتیں مٹ رہی تھیں، آبائی دولتیں لٹ رہی تھیں۔ میر صاحب زمانہ کے یہ غیر معمولی اور تیز رفتار انقلابات دن رات اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اپنی ذات پر ان کا اثر محسوس کرتے تھے۔

اِس دورِ انقلاب میں میر صاحب کئی مسلمان امیروں اور متعدد ہندو راجاؤں کے دامنِ دولت سے وابستہ رہے۔ جہاں جاتے تھے لوگ اُن کو آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ وہ اپنے انھیں ہندو مسلمان مربیوں کے ساتھ جنگوں کے میدانوں میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں ہم اُن کو کبھی سفارت کی اہم خدمات انجام دیتے ہوئے دیکھتے ہیں اور کبھی دو فریقوں میں مصالحت کی کوشش کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ اِن حالات سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر ہونے کی حیثیت سے جو عظمت میر صاحب کو حاصل تھی اُس کے علاوہ بھی اُس عہد کے بڑے بڑے لوگوں کی نظر میں میر کی شخصیت اور وقار اور اُن کی معاملہ فہمی، نیک نیتی اور بے تعصبی کا اعتبار تھا۔

ایک زبردست اور وسیع سلطنت کے ضعف سے نتائج کا جو سلسلہ شروع ہوجاتا ہے وہ کہیں جاکر ختم ہو لیکن طوائف الملوکی، خانہ جنگی، خانماں بربادی اور شریف گردی کی منزلیں ضرور پیش آتی ہیں۔ میر صاحب کے زمانہ میں دہلی انھیں منزلوں سے گزر رہی تھی اور شرفائے دہلی ترکِ وطن پر مجبور ہو رہے تھے۔ میر صاحب

ایک مدت تک انقلابوں کے ہاتھوں تکلیفیں اُٹھاتے رہے مگر دہلی کی سکونت ترک نہیں کی۔ آخر جب گزارو
کی کوئی صورت نہ رہی تو ۱۱۹۷ھ ہجری میں نواب آصف الدولہ کی طلب پر لکھنؤ گئے۔ نواب نے تین سو روپے
ماہوار وظیفہ مقرر کردیا۔ اُس زمانہ کے تین سو آج کے تین ہزار سمجھنا چاہیئے۔ اس معقول وظیفے کی بدولت میر صاحب
عزت اور خوشحالی سے بسر کرنے لگے۔ آخر ۱۲۲۵ھ میں لکھنؤ ہی میں انتقال کیا۔ کچھ کم سو برس کی عمر پائی۔

میر صاحب بڑے متوکل، ذی حس اور غیور بزرگ تھے۔ ان صفتوں نے ان کو نازک مزاج بھی بنا دیا تھ
ان کی خودداری بڑے سے بڑے امیروں کی خوشامد اور بیجا ستائش کو جائز نہ رکھتی تھی۔ اُن کی صاف دلی او
انصاف پسندی معائب کے اظہار میں بیباک اور محاسن کے اعتراف میں فیاض تھی۔ وہ قناعت کا مجسمہ تھے
بعض اوقات فاقوں میں بسر کی مگر کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ لیکن قناعت کا وفور احسانمندی کے احسا
پر غالب نہیں آگیا تھا۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی اعانت کا بالاعلان شکریہ ادا کرتے تھے۔ نازک دماغ ایسے تھے
کہ بڑے سے بڑے نفع کو ٹھکرا دیتے تھے مگر کوئی خلاف مزاج بات برداشت نہ کر سکتے تھے۔ وہ شیشے کا دل
اور فولاد کا جگر رکھتے تھے۔ بڑی بڑی کڑیاں جھیل سکتے تھے مگر کڑی بات نہ اٹھا سکتے تھے۔ وہ اپنے کمال سے
بخوبی واقف تھے مگر ایسے خود بیں نہ تھے کہ کسی اور کا کمال اُن کو نظر نہ آتا ہو۔

میر صاحب کو فطرت نے ایک درد بھرا دل عطا کیا تھا، جن گودوں میں انھوں نے تربیت پائی، جن
تکلیفوں میں اُن کی زندگی بسر ہوئی، اور جو انقلابات اُن کی آنکھوں نے دیکھے۔ ان سب کے اثر نے اُن ک
سراپا درد بنا دیا اور دنیا اور اسباب دنیا کو اُن کی نظر میں بالکل بے وقعت کر دیا۔ اسی استغنا، بلند خیالی
اور دردمندی نے اُن کی شاعری میں وہ شان پیدا کر دی جو کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ عشق
و محبت بھی میر کی طبیعت کا ایک فطری عنصر تھا جس کو اُن کے والد کی تعلیم اور میر امان اللہ کی مثال نے
اتنی ترقی دی کہ وہ تمام دیگر عناصر پر غالب آگیا۔ میر صاحب کی شاعری کو عشق کی زبان کہیں تو زیبا ہے

میر کے لئے شاعری نہ کوئی صنعت تھی نہ تفنن طبع کا ذریعہ، بلکہ شاعری اُن کی ذات کا ایک جزو او
اُن کی طبیعت کا ایک عنصر تھی۔ وہ شاعر پیدا ہوئے تھے۔ اپنی شاعری کا موضوع بیشتر وہ خود ہی ہیں۔ لیکن
اُن کی یہ انانیت اکثر ذاتی اور انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ انسانیت کا ایک نمائندہ ہونے کی حیثیت سے
فطرت نے اُن کو لطیف و شریف جذبات اور عالمگیر محبت و ہمدردی عطا کی تھی۔ اُن کا معیار انسانیت
بلند تھا جس میں استغنا اور عزت نفس کو بہت بڑا درجہ حاصل تھا۔ اُن کا دل درد اور ہمدردی سے ا
قدر لبریز تھا کہ وہ کسی کی مصیبت دیکھ نہ سکتے تھے چونکہ ان کی شاعری اُن کے قلبی کیفیات کی صحیح تفسیر
اس لئے وہ بھی انھیں شریف جذبات اور بلند خیالات سے بھری پڑی ہے۔ میر صاحب کی شاعری سے

ی سچی تصویر تصور کی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

زبان میں انتہا کی صفائی، بیان میں حد کی دلکشی اور زور۔ کلام میں ترنم، خیالات میں سادگی، جذبات میں بلندی، طبیعت میں دردمندی۔ انسانی فطرت کے دقیق سے دقیق رازوں تک نگاہ کی رسائی، وارداتِ قلبی کی صحیح ترجمانی، میر کی شاعری کے خاص خصوصیات ہیں۔ ان خصوصیات نے میر کی شاعری کو درد و اثر کا ایک طلسم بنادیا ہے۔ اور میر کو غزل گوئی کا سب سے بڑا استاد منوادیا ہے۔ یہ فخر صرف میر ہی کو حاصل ہے کہ اُن کے ہمعصروں سے لیکر آج تک کے اکثر باکمال شعرانے اُن کے کمال کا پرزور لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں:-

(مرزا سودا)

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ   ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

شیخ مصحفی

اے مصحفی تو اور کہاں شعر کا دعوے   پھبتا ہے یہ اندازِ سخن میر کے منہ پر

شیخ ناسخ

شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں   آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

(خواجہ آتش)

آتش بقولِ حضرتِ سودا شفیقِ من   ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

(مرزا غالب)

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقولِ ناسخ   آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں
ریختی کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب   سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

(ذوق)

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب   ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

(عیش)

ہے سچ تو یہ شعرائے جہاں میں عیش فقط   کلام میر ہے البتہ دلپذیر اپنا

میر مجروح

یوں تو ہیں مجروح شاعر سب فصیح   میر کی پر خوش بیانی اور ہے

رند

شیخ ناسخ خواجہ آتش کے سوا بالفعل رند   شاعرانِ ہند میں کہتے ہیں طرزِ میر ہم

تیرا کلام کتنا مشابہ ہے میر سے — عاشق ہیں رند ہم تو اسی بول چال کے

عرش

لاکھ تقلید کیجئے اے عرش — پر کب انداز میر آتا ہے

شاد لکھنوی

میں ہوں وہ طوطیِ ہندوستاں شاد — زباں جس کی ہے مثلِ میر اُردو

مولوی اسمٰعیل

یہ سچ ہے کہ سودا بھی تھا اُستادِ زمانہ — بیری تو مگر میر ہی تھا شعر کے فن میں

مرزا داغ

میر کا رنگ برتنا نہیں آساں ای داغ — اپنے دیواں سے ملا دیکھیے دیواں ان کا

(جلال لکھنوی)

کہنے کو جلال آپ بھی کہتے ہیں وہی طرز — لیکن سخن میر تقی میر کی کیا بات

امیر مینائی

شاعری میں امیر کی خاطر — میر اپنی زبان چھوڑ گئے

(امداد امام اثر)

لیکن اثر جو چشمِ حقیقت سے دیکھیے — کوئی غزل سرا نہ ہوا میر کی طرح

(لسان العصر اکبر)

میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبر — ناسخ و ذوق بھی جب چل نہ سکے میر کے ساتھ

(حسرت موہانی)

... ... — بیشک ہے حسرت سخن میر ابھی تک

مولانا صفی لکھنوی

ابیات غزل میں حسن تاثیر وہی — ہر نغمۂ دلکش میں بم و زیر وہی

حافظ کا جو فارسی میں رتبہ ہے صفی — اُردو میں بھی ہے مرتبہ میر وہی

تمام شعرا کے دیوان اس نظر سے دیکھے جائیں تو شاید ہی کوئی قابل ذکر شاعر ایسا نکلے جس نے کسی نہ کسی عنوان سے میر کی تعریف شاعرانہ کمال کا اعتراف نہ کیا ہو۔ اس زمانے کے متعدد شاعروں نے میر کی مدح میں مستقل نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو مرزا ماتم عزیز لکھنوی، حضرت اثر لکھنوی اور جناب فرخ

بنارسی کی نظمیں اس موضوع پر میری نظر سے گزری ہیں۔ چونکہ اس مختصر مضمون میں ان نظموں کی گنجائش نہیں
اس لئے میں نے اُن کو تلاش بھی نہیں کیا۔

غزل میں تو میر کا کوئی مقابل ہے ہی نہیں۔ مثنوی میں بھی اُن کا پایہ بہت بلند ہے۔ اور اردو میں وہ واسوخت
کے موجد ہیں۔ دیگر اصنافِ سخن میں بھی میر صاحب نے اپنے شاعرانہ کمال کے جوہر دکھائے ہیں مگر اُن کے کمالِ
غزل گوئی کے سامنے اور کسی چیز پر نظر نہیں پڑتی۔

میر کی شہرت صرف اُردو شاعری کی حیثیت سے ہے مگر اُن کی متعدد تصنیفات فارسی نظم و نثر میں بھی موجود
ہیں۔ اُن کی جتنی تصنیفیں اب تک مل چکی ہیں ان کے نام اور مختصر کیفیت یہاں درج کی جاتی ہے۔

۱-۶- **اردو غزلوں کے چھ دیوان**۔ جن میں چند قصیدے بھی شامل ہیں۔

۷- **دیوان ہفتم**۔ اس میں غزلوں اور قصیدوں کے علاوہ میر کی تمام نظمیں جمع کر دی گئی ہیں۔ ان نظموں میں
مثنویاں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ میر کی مثنویوں کا ایک مجموعہ عالیجناب سر شاہ محمد سلیمان صاحب
چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ نے چند سال ہوئے مثنویات میر کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

۸- **دیوان مراثی**۔ یہ سلاموں اور مرثیوں کا مجموعہ ہے اور میر کا جو مطبوعہ کلیات آج کل دستیاب ہوتا ہے
اس میں شامل نہیں ہے۔ مگر اس کا ایک قدیم قلمی نسخہ راقم کی نظر سے گزرا ہے اور اُس کی ایک نقل راقم
کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۹- **دیوان فارسی**۔ اس کا جو نسخہ میرے پاس ہے اس میں بہت سی غزلیں، متعدد رباعیاں، ایک
مثنوی اور ایک مسدس شامل ہے۔

۱۰- **نکات الشعرا**۔ یہ اردو شاعروں کا سب سے پہلا تذکرہ ہے۔

۱۱- **ذکر میر**۔ اس کتاب میں میر نے کچھ اپنے اور زیادہ تر اپنے زمانے کے حالات لکھے ہیں۔ یہ سلطنت مغلیہ
کے آخری عہد کی مستند تاریخ ہے۔

۱۲- **فیض میر**۔ یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں میر نے چند صوفی درویشوں کے چشم دید حالات نہایت
دلکش فارسی عبارت میں لکھے ہیں۔ اس دلچسپ رسالے کو راقم نے پہلے پہل ۱۹۲۹ء میں ایک مقدمہ
اور اُردو ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔

۱۳- ایک قصہ فارسی نثر میں۔ یہ وہی قصہ ہے جس کو میر نے اپنی اُردو مثنوی شعلۂ عشق میں نظم کر دیا ہے
ان کتابوں میں سے دیوان فارسی، ذکر میر اور فیض میر کا ایک ایک قدیم قلمی نسخہ راقم الحروف کے کتب خانے
میں موجود ہے۔ اور نمبر ۱۳ میں جس فارسی قصہ کا ذکر ہے اس کا ایک قلمی نسخہ ریاست رامپور میں ایک صاحب کے پاس ہے

میر کی ان تصنیفات سے ظاہر ہے کہ وہ فارسی کے زبردست انشاپرداز اور شاعر بھی، مورخ بھی تھے، افسانہ نگار بھی تھے اور فلسفی بھی تھے۔ افسوس ہے کہ اُن کے قلم سے نکلی ہوئی اُردو نثر کی کوئی کتاب دستیاب نہیں ہوئی۔ لیکن فورٹ ولیم کالج میں اردو کتابوں کی تصنیف کے لئے اُن کا بلایا جانا ثابت کرتا ہے کہ اُن کا شمار اُردو کے اعلیٰ درجہ کے نثاروں میں تھا۔

بھارت ماتا

(از جناب تصدق حسین)

آؤ بھارت ماتا کے کنول جیسے حسین، اور دنیا کے سب سے بڑے پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر پڑی ہوئی برف کے مانند پاکیزہ پاؤں کو چوم کر اُسے پرنام کریں۔

بھارت ماتا ہماری ماں ہے، ہم نے اُس کی کوکھ سے جنم لیا ہے، ہماری رگوں میں اسی کا اناج لہو بن کر گردش کر رہا ہے، ہماری زندگی کی بہاروں میں اسی کا سرود شہریں امرت جل حسن و شباب بن کر زندہ ہے، ہماری طاقت و جوانمردی اس کے پھلوں کے طفیل ہے۔

ذرا اپنی غفلت و بے پروائی کی آنکھیں کھول کر دیکھو، تو تمہیں اپنی محترم ماں کا ایک ایسا دلنواز، اس قدر روح پرور جلوہ دکھائی دیگا کہ تم اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محو ہو کر رہ جاؤ گے اور تمہارا دل اسکی عظمت کے آگے فرش راہ بن جائے گا۔

وہ دیکھو! وہ کس طرح رانیوں کی طرح سر اٹھا کر کھڑی ہے۔ اُسکے سر پر ہمالہ کے برفانی پانیوں میں دھلے ہوئے مقدس پھولوں کا مکٹ ہے، اُسکے گلے میں پنجاب کے البیلے دریاؤں کی پنج لڑی مالا ہے اسکے کندنی جسم کو وہ بے نظیر و بے عدیل ساڑی زیب دے رہی ہے جسکی تیاری میں بنگال نے اپنی بے پناہ کاریگری اور بمبئی نے اپنی انتہا درجہ ختم کر دی ہے اور اسکے کناروں پر گنگا اور جمنا کے قیامت تک نہ میلے ہونیوالے فیتے لگے ہیں۔ کتنے خوبصورت کس قدر عظیم الشان۔

اور اسکے پاؤں میں وہ جادو کا جزیرہ لوٹ رہا ہے جو تاریخ میں اپنے چاندی کے بازاروں، سونے کے محلوں، اور مردوں کو بھی زندہ کر دینے والی بوٹیوں کے لئے مشہور ہے۔

لوگ اسکی عظمت کو دیکھتے ہیں، اور حیران ہوتے ہیں۔ مگر ہم اسکے بیٹے اسکی عظمت کی طرف سے بے پروا ہیں۔

بھارت ماتا یہ دیکھتی ہے، اور اسکی آنکھوں میں رنج و افسوس کے آنسو آ جاتے ہیں۔

(چندن)

حضرت یسوع مسیح اور انکا مذہب

(از ٹھاکر جے۔آر۔ رائے۔جرنلسٹ)

دنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض مقبول عام مذاہب بلند پایہ اور عالی دماغ اشخاص کی مساعی حسنہ سے معرض وجود میں آئے ہیں۔ ویدک دھرم کسی فرد واحد کی ذات سے منسوب نہیں ہے۔ مگر یہودیت حضرت موسیٰ سے، پارسی مذہب زرتشت سے، جین مت وردھ مان مہابیر سے۔ بدھ مت ساکمنی گوتم بدھ سے اور اسلام حضرت محمدؐ سے منسوب ہیں۔ لیکن مسیحی مذہب کے بانی پربھو مسیح مسیحی اعتقاد کی رو سے مجسم خدا ہیں۔ آپ کے پیرو آپ کو اپنا معبود ازلی اور دنیا کا مکتی داتا سمجھتے ہیں۔ حضرت مسیح کے معتقد یورپ اور ہر دو امریکہ کے علاوہ آسٹریلیا اور ہر براعظم میں پائے جاتے ہیں جن کا شمار تازہ تخمینہ کی رو سے ساٹھ کروڑ سے اوپر ہے۔ غرض مسیحی اقتدار مہذب دنیا کے تمام مشاغل علوم و فنون اور تمدن کے ہر شعبہ میں آشکار ہے۔ مسیحی ارباب فکر کے سرتاج اور فلسفۂ دینیات و الٰہیات کے سب سے بڑے استاد پرنسپل اے ایم فیربرن رقمطراز ہیں:۔

مسیح کی شخصیت تاریخ عالم میں سب سے بڑی ہے۔ اس کے اندر جو قوتیں مخفی تھیں وہ یزدانی تھیں اور انسان کی روح پر حکمراں رہتی ہیں۔ انھیں قوتوں کی کرامات سے تاریخ اقوام کے سب سے بڑے انقلابات وقوع میں آئے ہیں جن سے ترقی تمدن کو عظیم ترین تحریک پہونچتی چلی آئی ہے۔ اور اس کے دل و دماغ پر بڑا اثر ہوتا چلا آیا ہے۔ مسیح کے خیالات نے ارباب فکر و دانش کے دل و دماغ پر بڑا گہرا تسلط حاصل کر رکھا ہے۔"

ساکمنی گوتم چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط میں پیدا ہوئے تھے۔ اور حضرت محمدؐ کی ولادت سنہ ۵۷۰ء میں واقع ہوئی تھی حضرت مسیح دونوں کے بین بین ہیں، ایک سے ساڑھے پانچ سو برس بعد اور دوسرے سے پانچسو ستر سال پہلے دنیا میں ظہور پذیر ہوئے۔

آپ کا لڑکپن | آپ نسل کے یہودی تھے جو سلف کی سب سے مغرور اور متعصب قوم تھی، اور اُسے حضرت ابراہیم کی اولاد اور خدا کی منظور نظر ہونے کا بڑا فخر تھا۔ آپ حضرت مریم کے بطن سے شہر بیت اللحم کی تاریک و تنگ سرائے کے اصطبل میں تولد ہوئے مگر لڑکپن اور شباب قصبہ ناصرہ میں بسر ہوا جس کی وجہ سے آپ مسیح ناصری

مشہور ہیں۔ روایت ہے کہ آپ کی ولادت کی خبر میدان کے گڈریوں کو دی گئی تھی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ درماندہ، لپست حال اور کنگال لوگوں کی اخلاقی اور روحانی حالت سنوارنے کو آئے تھے۔ کوئی فوق العادت واقعہ آپ کی ولادت سے وابستہ بیان نہیں کیا جاتا۔ البتہ ضرور لکھا ہے کہ چند مجوسی یہودیہ میں ایک انوکھا ستارہ طلوع دیکھکر فلسطین پہونچے۔ جن کا گمان یہ تھا کہ وہاں پر کوئی بڑا آدمی پیدا ہوگا۔ سرائے کے اندر جاکر انھوں نے مولود کے درشن کئے، اور سونا لوبان وغیرہ کی بھینٹ چڑھائی۔ فرمانروائے یہودیہ (ہیرودیس) کے حکم سے شیرخوار بچوں کے قتل عام سے خائف ہوکر آپ کے والدین آپ کو لیکر مصر چلے گئے جہاں وہ چند سال تک قیام پذیر رہے پھر اپنے وطن ناصرہ کو لوٹ آئے۔ جہاں زمانۂ طفولیت اور شباب بسر ہوا۔ مگر اناجیل میں اس زمانہ کے واقعات کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ لوقا میں اتنا ہی لکھا ہے "بچہ نشو و نما پاتا اور روحانی حیثیت سے بڑھتا رہا، وہ حکمت و دانش سے معمور تھا، خدا کی رحمت اس کے شامل حال تھی"۔ آپ کے بارھویں سال کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ آپ اپنے والدین کے ساتھ عید فسح کی تقریب پر یروشلم گئے، غالباً رشتہ دار اور محلے والے بھی ان کے ہمراہ تھے۔ جب زیارت سے فارغ ہوکر واپس لوٹے گئے تو ان کا گمان تھا کہ آپ رشتہ داروں کی ٹولی میں ہونگے مگر پہلی منزل پر پہونچکر جب آپ کو تلاش کیا اور نہ پایا تو وہ بہت رنجیدہ ہوئے۔ تلاش کرتے کرتے جب وہ پھر یروشلم گئے تو آپ کو ہیکل کے اندر بڑے بڑے علما کے حلقہ میں قیل و قال کرتے پایا، جس سے والدین کو حیرت اور مسرت ہوئی۔ لوقا لکھتا ہے کہ "جن لوگوں نے بھی اس کی باتیں سنیں، اس کی ذہانت و ذکاوت اور دانشمندانہ سوالات پر متحیر ہوئے"۔

گمان غالب ہے کہ آپ لڑکپن میں قومی دستور کے مطابق ہیکل میں تعلیم پاتے اور قصبہ کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ جب بالغ ہوئے تو اپنے طور پر نجاری کا کام کرنے لگے جس سے بسر اوقات ہوتی۔ غرض اپنی محنت ہی سے معقول روزی پیدا کرتے تھے۔ جس سے کنبہ کا گزارا ہوتا تھا۔ یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ آپ رشتہ داروں اور محلہ والوں سے مروت سے پیش آتے، ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتے اور سب سے ہمدردی کا برتاؤ روا رکھتے تھے۔

<u>پرچار۔ کارنمایاں</u> | آپ نے تیس سال کی عمر میں اپنے مذہب کی اشاعت کا مصمم ارادہ کیا تھا۔ علاقۂ فلسطین کا رقبہ دس ہزار مربع میل ہے۔ اور اس کے شمالی حصہ میں ضلع گلیل (رقبہ سولہ سو میل) ہے جس کے اندر آپ نے دو تین برس تک پرچار کیا تھا۔

یہاں سے رخصت ہوکر آپ یوحنا بپتسمہ دینے والے کے پاس گئے جو اس وقت دریائے یردن کے کناروں پر اشاعت مذہب کے کام میں مصروف تھا۔ اس سے بپتسمہ پایا۔ مسیحی علما اس کی یوں توضیح کرتے ہیں کہ یوحنا سے اصطباغ لیکر آپ نے اپنی سابقہ زندگی اور اس کے مشاغل کو خیرباد کہہ دیا۔ اور خدا کی خدمتگزاری

کے مشن کو خوش آمدید کہا، بہر حال یہ واقعہ دونوں قسم کی زندگی کے درمیان حد فاصل کا کام دیتا ہے۔ اس سے
فارغ ہو کر آپ نے جنگل کی راہ لی، جہاں عالم تنہائی میں چالیس دن تک سوچ بچار میں منہمک رہے۔ اصل یہ ہے
کہ یہودی لوگ عرصہ دراز سے اپنے نبیوں کی پیش گوئیوں کے مطابق المسیح کے ظہور کے لئے چشم براہ تھے تاکہ
وہ انھیں رومی تسلط سے آزاد کرکے ان کی قومی شوکت بحال کرے۔ اس وجہ سے آپ کے سامنے یہ سوال
درپیش تھا "کیا میں اپنے کو پولیٹیکل لیڈر کی حیثیت سے ظاہر کروں یا اُستاد روحانیت بنوں؟" اگر آپ
یہودیوں کی توقع کے مطابق روش اختیار کرتے تو ہر قسم کے حالات کی موافقت و مساعدت سے آپ عروج
واقبال سے دوچار ہوتے۔ لیکن دنیاوی منصوبوں کی کامیابی مکروفریب بے ایمانی اور دغا کے بغیر ممکن نہیں
جو آپ کے اس ارفع اور پاک مقصود آخری کے منافی تھا جس کی تکمیل کے لئے آپ دنیا میں ظہور پذیر ہوئے
تھے۔ اس لئے "آسمان کی بادشاہت" یعنی روحانی سلطنت قائم کرنے کی ٹھان کر بیابان سے لوٹ آئے۔
غرض دنیاوی جاہ و جلال سے روگردانی کرکے آپ نے دوامی فلاح روحانی کے لئے اپنی زندگی اور قوائے
عقلیہ و روحانیہ کو مخصوص کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا

شروع میں آپ نے ہیکلوں کے اندر جا کر تلقین کی۔ مگر عوام کی دلچسپی اور اشتیاق کے باعث جلد ہی
اس طریقہ سے دست بردار ہونا پڑا۔ جہاں لوگ جمع ہو جاتے۔ خواہ میدان ہوتا یا دامن کوہ یا جھیل کا کنارہ
آپ بے تامل تقریر شروع کر دیتے تھے۔ آپ کے خیالات لطیف اور ارفع تھے مگر اسلوب بیان ایسا سادہ
تھا کہ جاہل اور گنوار بھی اس سے بخوبی مستفید ہوتے تھے۔ آپ اپنے مطالب تمثیلات اور حکایات سے
واضح کرتے تھے جس سے سننے والوں کے دلوں پر آپ کا مطلب اچھی طرح نقش ہو جاتا تھا۔ استادان تنقید
اور ماہران فن ادب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نیک سامری کی حکایت جس میں انسانی ہمدردی
کا جامع خیال پیش کیا گیا ہے۔ دنیا کی تمام کہانیوں سے بڑھکر دلفریب اور مقبول عام ہے۔ متی اور
لوقا دونوں لکھتے ہیں "آپ کی تقریر سے سننے والے دنگ رہ جاتے تھے۔ آپ صاحب اختیار کی طرح
بولتے تھے"۔ آپ کا پہاڑی وعظ اخلاق کا افضل ترین ضابطہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سے چند خیالات
پیش کرنا خالی از لطف نہ ہوگا:۔ "اگلوں سے کہا گیا تھا کہ زنا مت کرو مگر میں یہ کہتا ہوں کہ جو آدمی بری
نظر سے کسی عورت کو دیکھتا ہے وہ اپنے دل میں زنا کاری کا مرتکب ہوتا ہے۔ اگلوں نے کہا تھا کہ آنکھ
کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، مگر میں یہ کہتا ہوں کہ بدی کا مقابلہ نہ کرو، اگر کوئی تمہارے داہنے
گال پر تھپیڑ رسید کرے تو تم اپنا بایاں گال بھی اس کے سامنے کردو۔ اگلوں نے کہا تھا کہ اپنے پڑوسی سے
پیار مگر دشمنوں سے نفرت کرو، مگر میں کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرو۔ اور اپنے ستانے

والوں کے حق میں دعائے خیر کرو۔"

آپ رات دن اپنے ہمجنسوں کی دنیاوی اور جسمانی بہبودی اور روحانی فلاح کے کام میں اس قدر منہمک رہتے تھے کہ سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔ اگر ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی آپ کے پاس آتا تو اُسے مایوس نہ کرتے اور ہر ایک انسان کی مشکل آسان کرنے کو ہر وقت کمربستہ رہتے تھے۔ دکھیاروں کا دکھ دُور کرنے میں ذرا تامل نہ ہوتا۔ آپ کے رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، جہاں رات ہو جاتی وہیں سو رہتے لوگ بھی خوشی خوشی آپ کی خدمت کو حاضر رہتے۔ مگر آپ کی ضروریات نہایت مختصر تھیں اس لئے کسی پہ بارگراں نہ ہوتا تھا۔ آپ کو ہر طرف یکرنگی و شادمانی اور حسن و جمال کے نشانات نظر آتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ آپ یاس و حسرت سے محض ناآشنا تھے، ہر بات میں دل خوشگوار امید دل کا مرجع بنا رہتا تھا۔ اس وجہ سے ریاضت اور تپسیا کو فلاح دارین کا واحد وسیلہ نہ کہتے تھے۔ جو کچھ کھانے کو میسر آتا خوشی خوشی کھا لیتے، گوشت۔ روٹی دال ترکاری۔ دودھ گھی۔ پھل وغیرہ سبھی چیزیں مرغوب تھیں کسی چیز سے خاص رغبت یا کراہت نہ تھی۔ گو اس پر فریس آپ کو طعنے بھی دیتے تھے۔ مگر آپ نے اپنے پیروؤں کو رسمیات اور کھانے پہننے، رہنے سہنے کی پوری آزادی دی ہے۔ کیونکہ آپ کے مذہبی اصولوں کا تعلق قول و فعل سے نہیں بلکہ نیت، ارادت اور باطن سے ہے۔

بہر حال دو ڈھائی سال کے وعظ و پند کے بعد ہر کس و ناکس آپ کی مدح سرائی کرنے لگا۔ مگر یہ بات یہودی قوم کے بزرگوں کو جو روایات قدیم کے دلدادہ تھے اور جن کی عزت و حرمت اور معاش اس بات سے تھی کہ عوام بزرگوں کے راستے سے سرمو تجاوز نہ کریں مسیح کی تعلیم بہت ناگوار ہوئی؛ اور اُنھوں نے باہمی مشورہ سے آپ کو نقصان پہونچانے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ آپ کو گرفتار کر کے صدر کاہن کے روبرو پیش کیا گیا اُس نے آپ سے پوچھا کہ "خدا کے واسطے بتا کیا تو ہی المسیح پسر خدا ہے؟" آپ نے اس کے جواب میں کہا کہ آپ خود ہی فرماتے ہیں۔ لیکن آئندہ آپ ابن آدم کو خدا کے دائیں طرف بیٹھا اور آسمان کے بادلوں پر آتا دیکھیں گے۔" یہ سردار کاہن اور اس کے رفقا کے نزدیک کفر تھا جس کی سزا یہودی شریعت کے مطابق موت تھی۔ چنانچہ دشمنوں نے آپ کو بے حد رسوا اور ذلیل کیا۔ پھر رومی گورنر پنطس پلاطس کے حضور میں لے گئے۔ اس نے پوچھا "کیا تو یہودیوں کا بادشاہ ہے؟" آپ نے جواب دیا "آپ خود ہی فرماتے ہیں۔" اس کے سوا اور کوئی بیان نہیں دیا۔ پلاطس کی نگاہ میں آپ ناکردہ گناہ اور بے جرم ظاہر ہوئے۔ مگر یہودیوں کی تالیف قلوب کے خیال سے آپ کو دو اور ڈاکوؤں کے ساتھ صلیبی موت کی سزا دیدی۔ چنانچہ شہر کے باہر آپ صلیب پر لٹکائے گئے اور آپ کی صلیب پر جلی حروف میں یہ اعلان

بیان کیا گیا کہ "یہ یہودیوں کا بادشاہ مسیح ہے۔" خدا کی قدرت دیکھئے کہ بیابان میں آپ نے یہودیوں
بادشاہ بننے سے انکار کیا تھا مگر آپ اسی جرم میں سزایاب ہوئے۔ جب آپ صلیب کی اذیت میں مبتلا
ے تو کہا جاتا ہے کہ کئی عجیب واقعات ظہور میں آئے۔ مثلاً دن دھاڑے تاریکی چھا گئی۔ بڑی ہیکل
ے پردے کے دو صاف ٹکڑے ہو گئے، زلزلہ آ گیا، چٹانیں پھٹ گئیں اور کئی قبریں کھل گئیں وغیرہ وغیرہ
ن واقعات سے رومی دستہ کے سردار اور یہودیوں کے گماشتے خائف ہو گئے اور کہنے لگے "واقعی یہ خدا کا
بیٹا تھا۔" آپ کے متمول معتقد یوسف نے گورنر کی اجازت سے لاش صلیب سے اتاری، اُسے کفنا کر
پنے باغ کے کنارے ایک غار میں رکھ دیا۔ اور اس کے دروازہ پر ایک بھاری پتھر اڑا دیا۔ دوسرے دن
رومی پلاطس کے پاس گئے اور یہ کہا "وہ مکار کہا کرتا تھا کہ میں تیسرے دن جی اُٹھوں گا اس وجہ سے قبر
پہرہ لگا دینا چاہیئے تاکہ اس کے شاگرد اس کی لاش کو چرا کر نہ لے جا سکیں، اور یہ مشہور نہ کر سکیں کہ
سیح زندہ ہو گیا ہے۔" چنانچہ قبر کے دروازے پر مہریں لگا کر پہرہ تعینات کر دیا گیا۔ تیسرے روز سبت کے دن
عورتیں آپ کی قبر دیکھنے کو آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ پتھر لڑھک کر دور جا پڑا ہے اور پہرہ دار دہشت زدہ ہیں
ر فرشتہ ان سے کہہ رہا ہے کہ "مسیح یہاں نہیں ہے تم جھانک کر دیکھ لو اور جلد اس کے شاگردوں کو مطلع کر دو
سیح زندہ ہو گیا ہے، وہ تم سے پہلے گلیل پہونچ جائے گا۔" اس پر وہ وہاں سے فوراً واپس گئیں۔ راستے میں
ب انھیں آپ کے درشن ہوئے تو اُنھوں نے پاؤں پکڑ لئے جس پر آپ نے کہا کہ "گھبراؤ نہیں اور میرے
ھائیوں کو خبر دو کہ میں گلیل کو جاتا ہوں وہیں ملاقات ہوگی۔" اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ مسیح نے گیارہ شاگردوں
ر معتقدوں کو درشن دیئے اور چالیس دن تک وہاں رہے، اور وقتاً فوقتاً اپنے معتقدوں کو درشن دیتے رہے
سیحی عقیدے کے مطابق آپ نے رخصت ہونے سے پہلے فرمایا کہ "آسمان اور زمین پر مجھے اختیار دیدیا
یا ہے تم سب قوموں کو خوشخبری دو اور باپ بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو۔ دنیا کے اخیر تک میں
مارے ساتھ ہوں۔"

سیحی مذہب کے اصول | یہاں پر مسیحی مذہب کے اصول اساسی کا مختصر تذکرہ بھی بے موقعہ نہ ہوگا۔ مسیحی مذہب کا بنیادی
تصور "آسمان کی بادشاہت" ہے۔ بقول پرنسپل فیربرن "اس سے یہ مراد ہے کہ خدا کی حکومت ہمارے سینے
یں رونما ہو اور ہماری روزمرہ کی معاشرت راستی و پاکیزگی اور اطمینان قلبی و محبت کے اصولوں کے ماتحت ہو۔"
روفیسر جے۔ آر۔ کے قول کے مطابق بھی آسمان کی بادشاہت کا یہی مفہوم ہے کہ "خدا کی ارادت ہمارے دل اور
جملہ مشاغل زندگانی پر متسلط ہو کر ہر وقت ہماری ہدایت کرے۔" بعبارت دیگر تمام بنی آدم اپنے تعلقات فی مابین
در ہر قسم کے کاروبار میں راستی اور نیکی، محبت اور سچائی سے ہدایت پذیر ہوں۔

مسیح کا تصورِ خدا ہر ایک بڑے مذہب کا مرکزِ ثقل اور اس کی ہستی کا مدار عقیدۂ خدا ہے۔ یونانیوں کا سب سے بڑا دیوتا یعنی خدا زیوس اور رومیوں کا جوپیٹر (Jupiter) اور پرانے ایرانیوں کا اہورامزدا تھا۔ یہودیوں کا خدا یہوواہ تھا گو توریت اور صحائف انبیا میں توحید کی سب سے واضح تعلیم ملتی ہے۔ مگر اسلاف کا تصورِ خدا بہت محدود تھا۔ ہر ایک قوم اسے اپنا مخصوص خدا سمجھتی تھی۔ یہودی بھی اس عام کمزوری سے بیگانہ نہ تھے۔ گو یہوواہ رب العلمین، خالق اور ہمہ جا حاضر و ناظر تھا۔ اس سے آدمی ہمیشہ لرزاں و ترساں رہتا تھا۔ حضرت مسیح نے خدا کو باپ کے نام سے پکارا جس سے یہ تمام خیالات تہ و بالا ہو گئے ہیں۔ باپ کا لفظ گو عامیانہ ہے لیکن بنی آدم کی زبان پر قدیم الایام سے متسلط ہے۔ اس کے ساتھ انسان کا نہایت ارفع اور دائمی رشتہ وابستہ ہے جو پریم کے مترادف ہے۔ بقول پرنسپل فیربرن "اس تصور سے آفرینش و قیام کی بخوبی توضیح ہوتی ہے۔ ہمارے قوائے متخیلہ اور متصورہ، حاسۂ روحانی اور حاسۂ اخلاقی سب میں خدا باپ کی طرح ہماری رہنمائی کرتا ہے۔" خدا روح ہے اور جو آدمی اس کی عبادت کرتے ہیں روح و راستی سے واسطہ رکھتے ہیں۔ "خدا محبت ہے۔" راستی اور محبت اس کی ذات میں مجتمع ہیں۔ فرطِ محبت سے خدا بنی آدم کی دائمی بہتری چاہتا ہے۔ راستی کی وجہ سے وہ اس کی فلاح سچائی اور نیکی کے ذریعہ سے انجام دینے کا خواہاں ہے۔ محبت دائمی ہے اور خدا کی ذات میں اس کی نہ کبھی ابتدا ہوئی اور نہ انتہا ہوگی۔ یہ محبت جو مجہول نہیں معروف ہے محب اور محبوب کے درمیان ایک مستقل باہمی رشتہ ہے۔ اسی کی تحریک سے خدا نے عالمین اور انسان پیدا کئے تاکہ محبت کما حقہٗ اظہار پائے۔ اسی کی تحریک سے وہ انسان کی فلاح دارین کا طلبگار رہتا ہے اور اس کے لئے سبیل پیدا کرتا ہے۔ خدا کی حکومت راستی اور محبت کی حکومت ہے۔"

تصورِ انسان انسان کی بابت بھی مسیح نے رفیع و برتر خیال پیش کیا ہے۔ باپ کے خیال کے ساتھ بیٹے کا خیال لازمی ہے اس لئے خدا کے فرزند ہونے کی وجہ سے ذلیل سے ذلیل اور سب سے گروہ اور حقیر ترین آدمی بھی شرافت و حرمت کے درجے پر سرفراز ہو جاتا ہے۔

پرنسپل فیربرن کا خیال ہے کہ "انسانی ہمدردی اور محبت مسیح کی ذات میں مجسم صورت میں آشکارا ہوئی ہے۔ آپ کا تن اور من اپنے ہمجنسوں کی خدمتگزاری کے لئے تھا۔ وہ اوروں کے لئے جئے اور انھیں کے لئے مصلوب ہوئے۔ اپنے ستانے والوں سے مروت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ صلیب کی اذیت سے بڑھکر اور کوئی بڑا عذاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن مسیح نے جاں کنی کی حالت میں بھی یہی دعا کی "اے باپ تو انھیں معاف کر، کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔" اس سے زیادہ باہمی محبت کا اظہار اور کیا ہو سکتا ہے۔"

تصورِ اخلاق مسیح نے انسانی اخلاق کا بھی نہایت اعلیٰ معیار قرار دیا ہے۔ آپ نے فعلِ مستحسن کو نظر انداز کر کے اس کا مدار اور مبدا ارادت اور نیت کی پاکیزگی کو ٹھہرایا ہے اور اس کا تعلق باطن سے قرار دیا ہے۔ آپ نے کہا

ہے کہ دوسروں سے ایسا برتاؤ کرو کہ جیسا تم چاہتے ہو۔ کہ وہ تمہارے ساتھ کریں" یہی آپ کی تعلیم کا لب لباب ہے
دوسروں کے ساتھ راستی اور محبت کا برتاؤ نیک اجر حاصل کرنے کے ارادے سے نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ خدا کے
فرزندوں سے اس کے سوا اور کسی سلوک کی توقع نہیں ہوسکتی۔ اگر خدا باپ سے پیار کرو تو اس کے بیٹوں سے
کس طرح نفرت ہوسکتی ہے؟ خدا سے محبت مسیح سے الفت اور اپنے ہمجنسوں سے پیار کرنا ہے۔ اس محبت
کا اظہار خدمت خلق میں ہونا چاہیئے۔ بہر حال مسیح نے تمام بنی نوع انسان کے اتحاد باہمی اور مساوات کا
اعلیٰ خیال پیش کیا ہے اور یہی آپ کا مذہب اور مسلک ہے۔

اقوال زرّیں

تیس سال سے کم عمر کا آدمی جو موجودہ زمانہ کی قومی اقتصادی تنظیم کا مطالبہ کرنے کے بعد بھی باغی نہیں
بنتا تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ احمق ہے۔ (جارج برناڈشا)

آجکل کے لوگ جھوٹ۔ فریب۔ ظلم اور قتل وغارت کے واقعات برداشت کرسکتے ہیں لیکن کسی
نیئے خیال کی اشاعت برداشت نہیں کرسکتے۔ (ہیریسن)

اپنی پوری کوشش سے برائیوں سے بچتے رہنا اور ایسی باتوں سے فائدہ اٹھانا جن کا فائدہ اٹھانا
ہمارے اختیار میں نہیں ہے، اسی کا نام ہوشیاری ہے۔ (رسکن)

آسودگی حاصل کرکے خواب میں بھی غرور نہیں ہونا چاہیئے جیسے آب رواں میں برتن ٹھہر نہیں سکتا
ویسے ہی آسودگی یا دھن دولت کبھی ٹھہر نہیں سکتی۔ (گردھرداس)

اس وقت تمہارا ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔ اب سے چالیس برس بعد تمہارے پورے دن بھی شاید
اتنے قیمتی نہ ہوں گے۔ (شیکسپیر)

تپسیا سے منو کامنا پوری ہوتی ہے۔ بوڑھوں کی سیوا سے دانائی ملتی ہے۔ بہت منتر کرنے سے سکھ
پراپت ہوتا ہے۔ اور اپنے دھرم پر درڑھ رہنے سے سورگ کا دوار کھل جاتا ہے۔ (مہاراج یدھشٹر)

جو منیہ آتما کو گالی دیتا ہے: وہ ویسا ہی ہے جیسا آکاش پر تھوک پھینکنے والا۔ تھوک سے
آکاش تو گندہ نہ ہوگا۔ اُلٹے وہ لوٹ کر اُسی کے جسم کو ناپاک بنادیگا۔ (بھگوان بدھ)

پُرانا ایندھن جلانے، پُرانا چاول کھانے کو، پُرانا دوست اعتبار کو اور پُرانا گرنتھ پڑھنے کو مفید ہوتا ہے۔ (کہاوت)

سوئیٹ روس میں زچہ اور بچہ کی نگہداشت

(از مسٹر منوہر لال طالب بی۔ اے ایل ایل۔ بی۔ وکیل۔ چکوال)

مشہور نیچرل شاعر ورڈسورتھ نے کہا ہے کہ "بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے" مراد یہ ہے کہ بچہ ہی کچھ عرصہ کے بعد آدمی بن جاتا ہے۔ پنجابی میں بھی کہا کرتے ہیں "دیوار بنیاد پر جاتی ہے۔ اگر بنیاد درست نہ ہوگی تو دیوار بھی درست نہ بن سکے گی"۔ فارس والے بھی کہتے ہیں "چوب تر را چنانکہ خواہی پیچ"۔ ہمارے ہندو فلاسفر بھی اسی بات پر زور دیتے ہیں کہ بچپن ہی میں جوانی کی عادت کی بنیاد پڑتی ہے۔ اس لئے بچہ کی جتنی بھی حفاظت کیجائے مناسب ہے۔ غرض دانایان مشرق و مغرب سبھی بچہ کی خاطر خواہ حفاظت پر زور دیتے ہیں اور بچوں کو قوم کی بہترین میراث سمجھتے ہیں۔ قوم کو جس طرح آئندہ بنانا ہو اُسی سانچے میں بچوں کو ڈھالنا چاہیئے۔ خالی لوح دل پر جو چاہیئے لکھ لیجئے۔ طفلانہ دل و دماغ کو جس طرح چاہیئے موڑ لیجئے۔

اس حقیقت سے ہم بھی واقف ہیں اور دیگر ممالک بھی۔ لیکن ہندوستانی بے بس اور سیاسی طور پر غلام ہیں اسلئے اپنی بہبودی کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ مگر دیگر ممالک کا یہ حال نہیں۔ وہ بچہ اور زچہ کی حفاظت کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ اُن میں نہ بچوں میں اتنی موتیں ہوتی ہیں اور نہ وضع حمل میں اتنی عورتیں لقمۂ اجل ہوجاتی ہیں۔ ہم اس مختصر سے مضمون میں یہ دکھلانے کی کوشش کرینگے کہ سوئیٹ روس نے اس پہلو میں کیا کیا ہے؟

اگر کوئی قوم یہ فیصلہ کرے کہ فلاں کام اس کے لئے مفید ہے اُسے کرنا چاہیئے۔ مثلاً حکومت منہ قومی فلاح کے لئے ضروری سمجھے کہ ہر ایک شخص روزانہ کم سے کم دو چھٹانک سوت کاتے۔ تو اس کا ایک طریقہ تو یہ ہوگا کہ وہ اس کے متعلق ایک قانون بنائے جس کی رو سے ایسا نہ کرنے والے کو جرمانہ یا قید کی سزا دی جاسکے۔

دوسرا طریقہ یہ ہوگا کہ تعلیم کے ذریعہ لوگوں کے دلوں پر اس کی ضرورت و اہمیت نقش کی جائے اور ان کو بتایا جائے کہ یہ نیک اور کام کا کام ہے۔ تفریح کا بھی ذریعہ ہے اور فالتو وقت کو روپیہ

ہیں تبدیل کرنے کا بھی طریقہ ہے۔ ہندوستان کے لوگ زراعت سے فراغت پاکر کم سے کم سال میں چھ ماہ بیکار رہتے ہیں۔ اس لئے اپنی مالی حالت کو ترقی دینے کی غرض سے ہم سب کو روزانہ کم سے کم دو چھٹانک سوت کاتنا چاہیئے۔ یہ طریقہ تعلیم و تبلیغ کا ہے۔

ایک تیسرا طریقہ بھی ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے ہر شہر اور قصبہ میں غریبوں کے لئے "چرخہ گھر" کھول دیئے جائیں جہاں سرکار کی طرف سے چرخے مفت مہیا کئے جائیں مدد کوٹی موجود رہے۔ سکھلانے والا اُستاد بھی مستعد ہو، اور ان لوگوں کو یہ فرض ادا کرنا سکھائے۔ اس سے رفتہ رفتہ دیکھا دیکھی کام چور لوگ بھی اپنے فرض ادا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جائیں گے۔

حکومت ان تینوں ذرائع میں سے تکمیل مقاصد کے لئے کوئی ذریعہ منتخب کر سکتی ہے۔ مگر بہتر یہی ہوگا کہ سبھی ذرائع کو بیک وقت استعمال کیا جائے۔ اس سے وقت کی بچت ہوگی اور نتائج بھی بہت اچھے برآمد ہونگے۔

سوئیٹ روس نے زچہ اور بچہ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ہر سہ ذرائع استعمال کئے ہیں یعنی:۔

۱۔ قانون،

۲۔ تعلیم،

۳۔ عملی درسگاہ،

سب پر عملدرآمد کیا گیا ہے۔ اسی سے اس نے اتنے قلیل عرصے میں حیرت افزا نتائج دکھلا کر دنیا کو انگشت بدنداں کر دیا ہے۔ اس وقت دنیا کی توجہ اگر کسی ایک نقطۂ خیال پر مرکوز ہے تو وہ سوئیٹ روس کے مختلف شعبہ ہائے حکومت اور اصولہائے اشتراکیت اور ان کے نتائج ہیں۔

اس تعلق میں سوئیٹ روس کی مساعی جمیلہ کی تہ میں ایک بنیادی اصول کام کرتا ہے کہ ہر ایک بچہ کا یہ پیدائشی حق ہے کہ اُسے کسی قسم کی قیود کے بغیر ترقی کی انتہائی منزل تک پہونچنے کے ذرائع اور سہولتیں بہم پہونچائی جائیں۔ وہ لوگ نہ صرف بچوں کی اموات میں کمی اور زچہ و بچہ کی حالت کا سدھار اور اچھے ہسپتال قائم کرنے کی فکر میں ہیں بلکہ وہ تو مادریت کو مدارج نسوانیت کا ارفع ترین درجہ تصور کرتے ہیں اور چونکہ مرد اور عورت میں بلحاظ سیاسی و شہری حقوق کوئی امتیاز روا نہیں رکھتے وہ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ سوئیٹ روس نے یہ کام پورے انہماک سے ۱۹۲۱ء سے شروع کیا اور مذکورہ بالا تینوں طریقوں پر بیک وقت عمل پیرا ہو گیا۔

روس نے عورت اور مرد کے حقوق میں اختلاف ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ شادی، وراثت وغیرہ کے

متعلق مساوی قوانین پاس کئے۔ والدین کے فرائض مقرر کرکے ان کی پابندی بدرجۂ احسن کرائی۔ بچوں کو سن بلوغ تک پہونچنے تک کافی امداد دیئے جانے کا قانون پاس کیا۔ عورتوں کے متعلق قانون ہے کہ سولہ برس سے کم کوئی عورت کسی کارخانہ میں ملازم نہیں رکھی جاسکتی۔ اور کئی کارخانے ایسے ہیں جن میں عورتوں کے کام کرنے کی قطعی ممانعت ہے۔ کسی کارخانے میں کسی عورت سے سات یا آٹھ گھنٹہ یومیہ سے زیادہ کام نہیں لیا جاسکتا۔ سال میں ہر عورت کو دو ہفتہ کی باتنخواہ رخصت ملتی ہے۔ زچگی سے دو ماہ پیشتر اور دو ماہ بعد ہر عورت کو باتنخواہ چھٹی ملتی ہے۔ بچہ پیدا ہونے پر وظیفہ ملتا ہے اور نو مہینہ تک ملتا رہتا ہے۔ اس تمام خرچ کا ذمہ دار مالک کارخانہ ہے۔ نیز اُسے بچہ والی عورت کو تین تین گھنٹہ کے بعد نصف گھنٹہ کی چھٹی بچوں کی خبر گیری کے لئے دینا پڑتی ہے۔

بچوں کی حفاظت کا انتظام بھی نہایت معقول ہے۔ کوئی شخص چودہ سال سے کم عمر کے بچہ کو کسی بھی کام پر نہیں لگا سکتا۔ چودہ سے سولہ سال کے بچوں کو خاص وجوہات ہونے پر لگایا جاسکتا ہے مثلاً یتیم ہو یا اس کے علاوہ خاندان میں کوئی اور کمانے والا نہ ہو۔ یا اس کام کی کوئی اور خاص وجہ ہو۔ ان حالات میں اُن سے چار یا زیادہ سے زیادہ چھ گھنٹہ روزانہ کام لیا جاتا ہے۔ ہفتہ میں بیالیس گھنٹہ کی چھٹی لازمی ہے۔ سال میں اُن کو ایک مہینہ کی رخصت ملتی ہے۔ (عام مزدوروں کو دو ہفتہ کی) اُن کے لئے عدالتیں بھی علیحدہ ہیں جہاں سزا نہیں دی جاتی بلکہ اُن کی اصلاح کی کوشش کی جاتی ہے۔

صرف قانون سے کوئی مطلب حل نہیں ہوسکتا ہے۔ تعلیم و تدریس سے اس کو بہت امداد ملتی ہے۔ روس میں صحت عامہ کے اصولوں کی وسیع پیمانہ پر تعلیم دی جاتی ہے۔ پبلک کو اپنے فرائض سے آگاہ کیا جاتا ہے اور انھیں بتلایا جاتا ہے کہ حکومت، سوسائٹی اور نئی تہذیب جو روس دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے اس کے متعلق کیا فرائض ادا کرتے ہیں۔ سوئیٹ روس اس پروگرام کو کتنا ضروری سمجھتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگ سکتا ہے کہ اس کام کے لئے سررشتۂ تعلیم کے ماتحت ایک علیحدہ محکمہ قائم ہے۔

صحت عامہ کے متعلق لیکچروں، اشتہاروں، کتابوں اور نمائشوں وغیرہ سے پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ زچہ کے لئے ہدایات اور بچہ کو پالنے کے طریقوں پر لیکچر دئے جاتے ہیں۔ صحت عامہ کے انچارج افسروں کو ڈاکٹری تعلیم کے علاوہ خاص تربیت حاصل کرنا پڑتی ہے۔ ۱۹۲۵ء میں حکومت کی طرف سے تین سو اکیس (۳۲۱) کتابیں شائع کی گئی تھیں جن میں اکسٹھ رفاہ عام سے متعلق تھیں۔

عورتوں اور بچوں کے لئے بہت سی درسگاہیں بھی قائم ہیں۔

۱۹۲۵ء میں عورتوں کے لئے ۵۱۰ ہسپتال تھے جن میں زچگی، ضبط ولادت، و متعلقہ بیماریوں پر ہفت

رائے دی جاتی ہے طبی معائنہ کیا جاتا ہے اور اگر ضرورت ہو تو حاملہ کے فائدہ کے لئے مناسب ہدایات جاری کی جاتی ہیں۔ زچگی کے خطرات کو کم کرنے کی غرض سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ وضع حمل سے پہلے حاملہ اسپتال میں پہونچ جائے۔ ۱۹۲۷ء میں شہروں کے ستر فیصدی اور گاؤں کے بارہ فیصدی بچے سرکاری ہسپتالوں میں پیدا ہوئے۔ ۱۴،۶۶۰ مریضوں کے لئے شہری ہسپتالوں اور ۳،۰۵۲ کے لئے دیہاتی ہسپتالوں میں جگہ ہے۔ اگرچہ روس جیسے وسیع ملک کے لئے یہ تعداد کافی نہیں لیکن ۱۹۱۴ء کے اعداد سے مقابلہ کرنے پر نمایاں ترقی ظاہر ہوتی ہے۔ تب ۶،۷۹۸ نشستیں تھیں۔ اب ان کی تعداد ۱۴۵۲۹ ہے۔

ایک قسم کی اور درسگاہیں بھی تین سال تک بچہ کی حفاظت کے لئے ہیں۔ تمام بچوں کا باقاعدہ و بالتفصیل طبی معائنہ کیا جاتا ہے اور بشرط ضرورت وبائی اور چھوت سے ہونے والی بیماریوں سے حفاظت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا جاتا۔ ۱۹۱۶ء میں سارے روس میں صرف چھ ایسے مرکز تھے۔ ۱۹۲۷ء میں ان کی تعداد ۱۳۹۸ ہو گئی۔ بچوں کا گھروں میں بھی جا کر طبی معائنہ ہوتا ہے اس کا مطلب گھروں کی صفائی کا معائنہ بھی ہوتا ہے اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنا مقصود ہوتا ہے کہ معصوم بچوں کے قانونی حقوق کو زائل تو نہیں کیا جا رہا ہے بچوں کے لئے دودھ اور مخصوص غذاؤں کے باورچی خانے بنے ہوئے ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں اکثر فیصدی بچوں کی نگہبانی ان طریقوں پر ہوتی تھی۔ روس کے پنجسالہ پروگرام پر عمل درآمد کی وجہ سے ان درسگاہوں کی ضرورت بڑھ گئی ہے اور آجکل یہ بہت مفید کام کر رہی ہیں۔ فیکٹریوں اور بارکوں میں بھی ایسی درسگاہیں کھلی ہوئی ہیں۔ ان کا نمایاں اثر یہ ہے کہ جہاں ۱۹۱۳ء میں بچوں کی شرح اموات ۲۷،۳ تھی وہاں ۱۹۲۷ء میں صرف ۱۸،۷ رہ گئی۔ اب اس سے بھی کم ہو گئی۔

اسکول جانے والے بچوں کا کام "سنٹرل ریسرچ انسٹیٹیوٹ" کے ذمہ ہے۔ اس کی متعدد شاخیں روس بھر میں پھیلی ہوئی ہیں ان میں جسمانی تربیت کا جو بچوں کو اپنے ملک کی حفاظت اور مستعدانہ کام کرنے کے لائق بنا دے خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ اس سے مراد جسمانی ورزش کے علاوہ چوبیس ۲۴ گھنٹہ کا پروگرام بھی شامل ہے جس میں ورزش، کھیل، جمناسٹک سب کچھ شامل ہے۔

بچوں کو جسمانی اور دماغی تکالیف کو دور کرنے کے لئے بھی ایک خاص محکمہ مقرر ہے۔ مختلف عمر کے بچوں کے لئے مختلف اسکول ہیں۔ تپ دق کے مریض بچوں کے لئے جنگل میں اسکول بنے ہوئے ہیں۔ جو ان کام کرنے والوں کا سالانہ معائنہ ہوتا ہے۔ بیماروں کے لئے ہسپتال اور شفاخانے موجود ہیں۔

اس تمام معاشرتی تنظیم کی تہ میں مندرجہ ذیل اصول کام کرتے ہیں:-

(۱) جمہور کی جسمانی، اخلاقی اور دماغی بہبودی کی کوشش کرنا حکومت کا سب سے بڑا فرض ہے، خواہ اسے

پالیسی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے یا انسانی ہمدردی کے لحاظ سے۔ یہ فرض حکومت کا مقدس ترین فرض تصور ہونا چاہیئے۔

(۲) رفاہ عام کے کام حکومت ہی کے ذریعہ انجام پا سکتے ہیں۔ پبلک کا کوئی ممبر یا سوسائٹی لطور خود انجام نہیں دے سکتی۔ کیونکہ نہ تو اس وسیع پیمانہ پر کرنے کی کسی کو ہمت ہو سکتی ہے اور نہ انھیں حکومت کے کسی قانون کو جو ان کے تمام کئے کرائے کو کالعدم کر سکتا ہے رد کرنے کی اہلیت ہوتی ہے۔

(۳) جب تک قانون تعلیم اور امداد سبھی باتیں ایک خاص نظام کے ماتحت نہ ہونگی ملک و قوم کو ان سے خاطر خواہ نفع نہ پہونچ سکے گا۔

زچہ و بچہ کی امداد اور بہبود کے اس سہ گانہ پروگرام میں روس کو جو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کی مثال دنیا کے سامنے ہے۔ اہل بصیرت اس سے فائدہ اُٹھائیں۔

شہنشاہ اور اُس کی ملکہ

آفتاب کا بیٹا نئے سونے کے تخت پر جلوہ افروز ہے اور اس کے آس پاس اس کے چاں گرد مصاحب بیٹھے ہیں۔ اس کے جسم پر جواہرات چمک رہے ہیں اور وہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تاروں کے درمیان چاند چمکتا ہے۔

مصاحب سنجیدگی سے سیاسی امور پر بات چیت کرتے ہیں لیکن شہنشاہ کا خیال کھلی کھڑکی کی راہ سے باہر چلا گیا ہے۔

باہر باغ کی بارہ دری میں ایک قیمتی چوکی پر ملکہ بیٹھی ہے اور اسکے آس پاس اُسکی مہ جبین راج سکھیاں ہیں وہ انہیں ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے پتوں میں خوبصورت پھول گھرا ہوا ہو۔

وہ سوچتی ہے شہنشاہ دربار میں ضرورت سے زیادہ ٹھہرتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ اپنا پنکھا ہلاتی ہے اور شہنشاہ کے ہونٹوں پر عنبریں ہوا بوسہ دیتی ہے۔

شہنشاہ اپنے دل میں کہتا ہے۔ میری پیاری ملکہ نے اپنا پنکھا ہلایا ہے اور مجھے اپنے لبوں کی خوشبو بھیجی ہے۔

شہنشاہ اپنے جواہرات کے لباس میں چمکتا ہوا اُٹھتا ہے اور باغ کی بارہ دری کی راہ لیتا ہے۔ مصاحب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور خاموش رہ جاتے ہیں

(چینی شاعر ٹو فو)

ہندوستان کی آبادی

(از جناب اقبال بہادر صاحب سکسینہ)

ہندوستان کی آبادی گزشتہ مردم شماری کے لحاظ سے پینتیس ۳۵ کروڑ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آبادی روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ اور اگر ملک کی دولت اور پیداوار میں اضافہ نہ ہوا تو اس کا نتیجہ روز افزوں افلاس کی شکل میں نمودار ہوگا۔ ہم کو اس مضمون میں یہ دیکھنا ہے کہ آبادی اور پیداوار کی ترقی میں کیا مناسبت ہے اور پیداوار کی ترقی کی کہاں تک گنجایش ہے۔

سرکاری اعداد و شمار کے لحاظ سے مردم شماری کی افزونی کا حساب حسب ذیل ہے۔

(اعداد ہزاروں میں دیئے گئے ہیں)

سال مردم شماری	تعداد	ترقی
۱۸۷۲	۲۰، ۶۱، ۶۲	
۱۸۸۱	۲۵، ۳۸، ۹۶	۲۳٫۲
۱۸۹۱	۲۸، ۷۳، ۱۴	۱۳٫۲
۱۹۰۱	۲۹، ۴۳، ۶۱	۲٫۵
۱۹۱۱	۳۱، ۵۱، ۵۶	۷٫۱
۱۹۲۱	۳۱، ۸۹، ۴۲	۱٫۲
۱۹۳۱	۳۵، ۲۹، ۸۶	۱۰٫۶

اوپر دئے ہوئے اعداد کی بنا پر سرکاری خیال یہ ہے کہ اوسطاً آبادی کی ترقی پانچ فیصدی ہوئی ہے لیکن در اصل ترقی اس سے کم ہے اور اُس کے دو وجوہ ہیں۔

(۱) ہر مردم شماری میں قبل کی بہ نسبت رقبہ میں اضافہ ہوا ہے۔

(۲) طریق مردم شماری ہر مرتبہ پیشتر سے زیادہ صحیح ہوتا گیا ہے۔

اِن دونوں باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے یہ بتایا جاتا ہے کہ گزشتہ پچاس سال میں آبادی کی اصلی ترقی بیس فیصدی ہوئی ہے یعنی دس سال میں چار فی صدی یا ۴ء سالانہ۔

اب ہم آبادی کی افزونی کا ایک دوسرے طریقہ سے معازنہ کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ حساب لگایا جائے کہ ہر مربع میل میں کتنے نفوس رہتے ہیں۔ ذیل کے نقشہ میں یہ حساب مندرج ہے (اعداد ہزار دنیں ہیں)

سال مردم شماری	تعداد آبادی	رقبہ مردم شماری	اوسط آبادی فی مربع میل
۱۸۷۲	۲۰،۹۱،۶۲	۱۰،۰۰	۲۰۶
۱۸۸۱	۲۵،۳۸،۹۶	۱۳،۷۲	۱۸۵
۱۸۹۱	۲۸،۷۳،۱۴	۱۵،۹۱	۱۰۴
۱۹۰۱	۲۹،۴۳،۹۱	۱۷،۶۶	۱۶۷
۱۹۱۱	۳۱،۵۱،۵۶	۱۸،۰۲	۱۷۵
۱۹۲۱	۳۱،۸۹،۴۲	۱۸،۰۵	۱۷۷
۱۹۳۱	۳۵،۲۹،۸۶	"	۱۹۵٫۵

اوپر کے نقشہ پر غور کرنے سے مندرجہ ذیل نتائج مترتب ہوتے ہیں:۔

(۱) ہندوستان ۱۸۷۲ء میں زیادہ گنجان آباد تھا بہ نسبت موجودہ حالت کے۔ کیونکہ اوسط ۱۸۷۲ء میں ۲۰۶ تھا اور اب ۱۹۵٫۵ ہے۔

(۲) ۱۸۹۱ء تک اوسط آبادی فی مربع میل گھٹتا گیا جو ۱۸۹۱ء میں ۱۶۷ تھا۔

(۳) ۱۸۹۱ء کے بعد آبادی ترقی کر رہی ہے مگر بتدریج۔

(۴) گزشتہ تیس سال میں آبادی نے ۱۶ فیصدی ترقی کی ہے یعنی نصف فی صدی سالانہ۔ گزشتہ دس سال میں یعنی ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان آبادی کا اضافہ ضرور غیر معمولی ہے۔ اس کی وجہ صاف تو یہ ہے کہ شمار کانگریس کے پروپیگنڈا کی وجہ سے بالکل صحیح نہیں ہو سکا۔

(دوسرے ملکوں کا اوسط آبادی)

ذیل کے نقشہ میں چند دیگر ممالک کا اوسط آبادی فی مربع میل درج ہے جس سے ظاہر ہے کہ بیشتر ملکوں میں ہندوستان سے کہیں زیادہ آبادی گنجان ہے۔ آبادی ہر ملک میں زمین کی زرخیزی، آب و ہوا ملک کی حالت، امن و امان کے لحاظ سے، رسل و رسائل کے ذرائع، آبپاشی کے ذرائع اور صنعتی و حرفتی حالت کے لحاظ سے ہوا کرتی ہے۔ ہندوستان میں سب سے بڑی کمی جو ہے وہ یہ ہے کہ یہاں صنعت و حرفت کے ذرائع

بالکل محدود ہیں صنعتی ممالک میں آبادی کا اوسط زراعتی ممالک کے دوچند سہ چند تک ہو جاتا ہے کیونکہ
انھیں اپنے ملک کی زمین سے سامان خوراک پیدا کرنا نہیں پڑتا۔ مثال کے طور پر انگلستان کو لیجیے جس کا
اوسط آبادی چھ سو سے اوپر ہے یعنی ہندوستان سے سہ چند۔ وہاں کے لوگ دوسرے ملکوں کی پیداوار
پر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ انگلستان کی خوراک کا ساٹھ فیصدی حصہ دیگر ممالک سے آتا ہے۔

بلجیم	۶۵۴	جرمنی	۳۳۲	ممالک متحدہ امریکہ	۳۲
انگلستان	۶۴۹	جاپان	۲۱۵	نیوزیلینڈ	۱۸،۱
نیدرلینڈ	۵۴۴	فرانس	۱۸۴		

(ہندوستان کا رقبہ)

ہندوستان کے رقبہ اور کاشت کے متعلق مندرجہ اعداد سرکاری رپورٹ سے لئے گئے ہیں:
ہندوستان کا کل رقبہ ۶۷ کروڑ ایکڑ ہے۔ جس میں سے ۸ کروڑ سترہ لاکھ ایکڑ جنگل ہے اور ۱۴ کروڑ
لاکھ کاشت کے ناقابل ہے اور ۱۵ کروڑ پچاس لاکھ ایسا ہے جس پر کاشت ہو سکتی ہے مگر ہوتی نہیں ہے
اور ۴ کروڑ اسی لاکھ ایسا ہے جس پر وقتاً فوقتاً کاشت ہوتی رہتی ہے۔ ۲۲ کروڑ اسی لاکھ ایکڑ پر کاشت
ہوتی ہے جس میں سے تقریباً ۵ کروڑ پر آبپاشی ہوتی ہے۔ بیس کروڑ ایکڑ میں سامان خورونوش پیدا کیا جاتا
اور باقی پر وہ فصلیں ہوتی ہیں جن کو کمرشیل کراپ (تجارتی پیداوار) کہتے ہیں جیسے جوٹ (سن)
ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً ایک تہائی رقبہ ایسا ہے جس پر کاشت نہیں ہو سکتی۔ ایک
پر کاشت ہوتی ہے اور ایک تہائی اب بھی ایسا ہے جس پر کاشت مزید ہو سکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا
اب بھی کاشت میں سو فیصدی ترقی ہو سکتی ہے۔ ان اعداد و شمار کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان
آبادی کی ترقی کے ساتھ کاشت میں اضافہ ہونا لازمی ہے اور اگر یہ اضافہ ہوتا گیا تو کوئی وجہ نہیں ہے
ملکی دولت اور شخصی دولت میں اضافہ نہ ہو۔

(برٹش ہندوستان اور دیسی ریاستیں)

برٹش انڈیا میں ۷۷ فیصدی آبادی ہے گو رقبہ صرف ۶۱ فیصدی ہے۔ دیسی ریاستوں میں آبادی
برٹش انڈیا کی تقریباً ۱/۳ ہے گو رقبہ ۱/۲ ہے۔ برٹش انڈیا کا اوسط آبادی ۲۲۶ ہے بعد دیسی ریاستوں کا

(آبادی کی تفریق)

کل ہندوستان میں اناث کی تعداد ۱۷ کروڑ دس لاکھ چونسٹھ ہزار ہے اور ذکور کی ۱۸ کروڑ ۱۹ لاکھ
ہزار ہے۔ مذہب کے لحاظ سے تقسیم یہ ہے:

ہندو	۲۳،۸۳،۳۰،۰۰۰	اضافہ ۸ فیصدی
مسلمان	۷،۷۷،۴۳،۰۰۰	" ۱۱ "
عیسائی	۵۹،۶۱،۷۹۴	" ۲۵ "
سکھ	۴۳،۰۶،۴۴۲	" ۳۳ "

(صوبہ وار تقسیم)

ہندوستان کی حالت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ کس صوبہ میں کتنی آبادی ہے اور کتنا رقبہ ہے۔ ذیل کے اعداد اس شمار میں مدد کرتے ہیں :۔

صوبہ	رقبہ		آبادی
اجمیر میرواڑہ	۲۷۱۱	مربع میل	۵۶،۰۲،۹۲
انڈمن نکوبار	۳۱۴۳	"	۲۹،۴۶۳
آسام	۵۳،۰۱۵	"	۸۶،۲۲،۲۵۱
بلوچستان	۵۴،۲۲۸	"	۴،۶۳،۵۰۸
بنگال	۷۶،۸۴۳	"	۵،۰۱،۲۲،۵۵۰
بہار و اُڑیسہ	۸۳،۱۶۱	"	۳،۷۵،۹۰،۳۵۶
بمبئی معہ سندھ	۱۲۳،۶۲۲	"	۲،۲۲،۵۹،۹۷۷
برما	۲۳۳،۷۰۷	"	۱،۴۶،۶۵،۹۱۸
ممالک متوسط و براڑ	۹۹،۸۷۶	"	۱،۵۴،۷۲،۶۲۸
کورگ	۱،۵۸۲	"	۱،۶۳،۰۸۹
مدراس	۱،۴۲،۲۶۵	"	۴،۶۷،۴۰،۹۴۴
سرحد مغربی و شمالی	۱۳،۴۱۹	"	۲۴،۲۵،۰۷۶
پنجاب	۱،۰۰،۴۳۹	"	۲،۳۵،۸۰،۸۵۱
ممالک متحدہ	۱،۰۶،۲۹۵	"	۴،۸۴،۰۰،۷۶۳
برٹش ہندوستان	۱۰،۹۴،۳۰۰	"	۲۷،۱۲،۷۳،۰۰
آسام کی ریاستیں	۸،۴۵۶	"	۶،۲۵،۶۰۶
بلوچستان کی ریاستیں	۸،۴۱۰		۴،۰۵،۱۰۹

ریاست	رقبہ		آبادی
بڑودہ	۸،۱۲۷	مربع میل	۲۴،۴۳،۰۰۷
بنگال کی ریاستیں	۵،۴۳۴	"	۹،۷۳،۳۱۶
بہار و اڑیسہ کی ریاستیں	۲۸،۶۴۸	"	۴۶،۴۳،۴۵۶
بمبئی کی ریاستیں	۶۳،۴۵۳	"	۴۴،۵۹،۰۸۱
وسطی ہند و گوالیار	۷۷،۸۸۸	"	۶۶،۱۵،۱۲۰
ممالک متوسط کی ریاستیں	۳۱،۱۷۶	"	۲۴،۷۸،۵۱۹
حیدرآباد	۸۲،۶۹۸	"	۱،۴۳،۹۵،۴۹۳
جموں و کشمیر	۸۴،۲۵۸	"	۳۶،۴۵،۳۳۹
مدراسی ریاستیں	۱۰،۶۹۶	"	۶۷،۵۴،۳۹۹
میسور	۲۹،۴۷۴	"	۶۵،۵۷،۸۷۱
سرحد مغربی و شمالی	۲۵،۵۰۰	"	۲۲،۵۹،۲۸۸
پنجابی ریاستیں	۳۷،۰۵۹	"	۴۹،۱۰،۰۰۵
راجپوتانہ	۱،۲۸،۹۸۷	"	۱،۱۲،۲۵،۷۱۲
سکم	۲،۸۱۸	"	۱،۰۹،۹۱۵
ممالک متحدہ کی ریاستیں	۵،۹۴۹	"	۱۲،۰۶،۰۷۰
میزان کل	۷،۱۱،۰۳۲	"	۸،۱۲،۳۷،۵۶۴
کل ہندوستان	۱۸،۰۵،۳۳۲	"	۳۵،۲۹،۸۶،۸۷۶

ڈنسٹی یا اوسط آبادی فی مربع میل کے حساب سے مندرجہ ذیل اعداد قابل غور ہیں:-

برٹش صوبجات						دیسی ریاستیں	
بنگال	۶۵۰	بمبئی	۲۱۸	بلوچستان	۱۵	بڑودہ	۲۶۶
بہار و اڑیسہ	۴۵۸	اجمیر میرواڑہ	۱۸۴	انڈمن	۹	میسور	۲۱۰
ممالک متحدہ	۴۵۱	ممالک متوسط برار	۱۹۰			حیدرآباد	۱۵۲
سرحدی ممالک	۳۸۰	آسام	۱۵۲			سنٹرل انڈیا و گوالیار	۱۱۸
مدراس	۳۲۰	کورگ	۱۰۰			راجپوتانہ	۷۸
پنجاب	۲۰۶	برہما	۶۰			کشمیر	۴۰
						سکم	۳۰

(گاؤں اور شہر)

ہندوستان میں ۶ لاکھ سے اوپر گاؤں ہیں اور شہروں کی تعداد دو ہزار سے اوپر ہے۔ شہری آبادی کا تناسب ادس فیصدی ہے۔ کل ہندوستان میں بمبئی شہر سب سے زیادہ آباد ہے یعنی ۴۵۰۰۰ فی مربع میل، دوسرے نمبر پر جے پور ہے جسمیں فی مربع میل آبادی ۴۰۰۰۰ ہے۔ سورت اور پشاور میں آبادی ۳۰،۰۰۰ فی مربع میل ہے۔ احمد آباد۔ بنگلور۔ کانپور۔ بنارس میں آبادی ۲۰،۰۰۰ فی مربع میل ہے۔ مدراس کراچی۔ آگرہ۔ امرتسر۔ الہ آباد۔ سری نگر۔ مدورا۔ بریلی۔ میرٹھ۔ ترچنا پولی۔ شولاپور۔ ڈھاکہ۔ راولپنڈی میں ۱۰،۰۰۰ فی مربع میل سے زائد ہے۔ حیدر آباد۔ لاہور۔ پونہ۔ مانڈلے۔ ناگپور۔ پٹنہ۔ اجمیر۔ جبلپور میں آبادی فی مربع میل ۵۰۰۰ سے زائد ہے اور لکھنؤ۔ رنگون اور دہلی میں آبادی ۱۰۰۰ فی مربع میل سے زائد ہے یہ حساب ڈنسٹی یا آبادی فی مربع میل پر ہے۔ کل آبادی کے لحاظ سے شہروں کی پوزیشن حسب ذیل ہے:-

شہر	آبادی	شہر	آبادی
۱۔ کلکتہ معہ ہوڑہ	۱۴،۱۹،۳۲۱	۱۷۔ ناگپور	۲،۱۵،۰۰۳
۲۔ کلکتہ خاص	۱۱،۹۶،۸۴۳	۱۸۔ بنارس	۲،۰۵،۳۱۵
۳۔ بمبئی	۱۱،۵۷،۸۵۱	۱۹۔ الہ آباد	۱،۹۳،۹۱۴
۴۔ مدراس	۶،۴۷،۲۳۰	۲۰۔ مدورا	۱،۸۲،۰۰۰
۵۔ دہلی	۴،۴۷،۴۴۲	۲۱۔ سری نگر	۱،۷۳،۹۴۹
۶۔ لاہور	۴،۲۹،۷۴۷	۲۲۔ پونہ	۱،۶۳،۱۰۰
۷۔ رنگون	۴،۰۰،۴۱۵	۲۳۔ پٹنہ	۱،۵۸،۲۳۰
۸۔ حیدر آباد دکن	۳،۷۷،۰۰۶	۲۴۔ مانڈلے	۱،۴۴،۹۹۹
۹۔ احمد آباد	۳،۱۰،۰۰۰	۲۵۔ جے پور	۱،۴۴،۱۷۹
۱۰۔ بنگلور	۳،۰۶،۴۶۵	۲۶۔ بریلی	۱،۴۴،۰۳۱
۱۱۔ لکھنؤ	۲،۷۴،۶۵۹	۲۷۔ ترچنا پولی	۱،۴۱،۶۴۰
۱۲۔ امرتسر	۲،۶۴،۸۴۰	۲۸۔ ڈھاکہ	۱،۳۸،۵۱۸
۱۳۔ کراچی	۲،۶۰،۹۳۹	۲۹۔ میرٹھ	۱،۳۶،۷۰۹
۱۴۔ کانپور	۲،۴۳،۷۵۵	۳۰۔ شولاپور	۱،۳۵،۶۳۲
۱۵۔ آگرہ	۲،۲۹،۷۶۴	۳۱۔ اندور	۱،۲۷،۳۲۷
۱۶۔ ہوڑہ	۲،۲۲،۴۰۸	۳۲۔ جبلپور	۱،۲۴،۴۷۵

۳۳- پشاور	۱،۲۱،۰۶۶	۳۷- بڑودہ	۱،۱۲،۰۶۲
۳۴- اجمیر	۱،۱۹،۵۲۴	۳۸- مرادآباد	۱،۱۰،۵۶۲
۳۵- ملتان	۱،۱۹،۴۵۷	۳۹- سیلم	۰۲،۱۸۱
۳۶- راولپنڈی	۱،۱۹،۲۸۴		

(ہندوستانی ممالک غیر میں)

تقریبًا ۱۶ لاکھ ہندوستانی ممالک غیر میں ہیں جس میں تقریبًا دو تہائی مرد ہیں۔ کل کا ⅘ ہندو ہیں اور باقی کے نصف مسلمان۔ مدراس سے اسّی فیصدی گئے ہیں۔ دیگر صوبے جن میں سے زیادہ تر باشندگان ممالک غیر کو گئے ہیں بمبئی۔ پنجاب۔ ممالک مغربی وشمالی سرحد، اور بنگال ہیں۔

(پیشوں کے لحاظ سے تقسیم)

زراعت	۷۱ فی صدی
زراعت معہ گلّہ بانی و دیگر ملحق کام	۷۳ "
صنعت وحرفت	۱۰ "
تجارت ورسل ورسائل	۶ اور ۲ فیصدی
انتظام ملک وپولیس فوج	۱½ "
امورخانہ داری اور بیکار	۷½ "

اوپر کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ زراعت، وکاشتکاری ہی ایک ذریعہ معاش ہے جس پر تقریبًا ¾ آبادی کا انحصار ہے تجارت کی ترقی اور بنگال بمبئی۔ بہار واڑیسہ کی کانوں کے کارخانوں اور ملوں کے باوجود یہ صوبے سب سے زیادہ کاشتکاری پر انحصار رکھتے ہیں یعنی ان صوبوں میں اور صوبوں کی بہ نسبت کاشتکاروں کا تناسب زیادہ ہے۔ صنعتی وحرفتی کارخانے ممالک متحدہ۔ پنجاب اور بمبئی کے صوبوں میں زیادہ ہیں جن میں سے دو اول الذکر میں چھوٹے پیمانے کے کارخانے ہیں۔ فی الحال تقسیم کار کے اعداد سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کاشتکاری کی ترقی ہے صنعت تنزل پر ہے مگر تجارت بڑھ رہی ہے۔ اسی کے ساتھ فقیروں اور خانہ بدوشوں کی تعداد میں کمی ہے مگر جرائم پیشہ کی تعداد بڑھ رہی ہے۔

(تندرستی)

ہندوستان کی تندرستی روز بروز گرتی جاتی ہے۔ پہلے اوسط عمر ۲۵ سال تھا مگر اب صرف ۲۲ سال ہے اس کے مقابلہ میں نیوزیلینڈ میں ۶۵ سال ہے۔ امریکہ میں ۵۶ ہے اور انگلستان میں ۵۰ ہے۔ جاپان میں بھی

۲۷ سال ہے۔ ہندوستان میں اعداد پیدائش سے معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش انگلستان سے دوچند ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اوسط پیدائش ۳۶ فی ہزار ہے اور اموات کا اوسط ۲۵ فی ہزار ہے۔ اس کے اسباب خاصکر تین ہیں (۱) بخار (۲) معدہ کی شکایتیں۔ (۳) سینہ و پھیپھڑہ کی بیماریاں۔ مختلف امراض سے کتنی جانیں تلف ہوتی ہیں وہ ذیل کا نقشہ ظاہر کرتا ہے :-

ہیضہ $1\frac{1}{2}$ فیصدی - یہ مشرقی صوبوں میں زیادہ تر اثر کرتا ہے۔

چیچک $\frac{1}{2}$ "

پلیگ $\frac{1}{2}$ "

بخار $14\frac{1}{2}$ " یہ شمالی صوبجات ممالک متوسط، برار، بمبئی میں خاص طور پر قاتل ہوتا ہے۔ مغربی ہندوستان میں خاصکر دق اپنا اثر دکھلاتا ہے ان میں $\frac{1}{2}$ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ملیریا کا شکار ہوتے ہیں۔

دست و پیچش ۱ "

دمہ وغیرہ $1\frac{1}{2}$ "

دیگر تمام امراض $6\frac{1}{2}$ "

ہندوستان میں اموات بچگان کی تعداد دل ہلا دینے والی ہوتی ہے۔ یہ انگلستان سے $2\frac{1}{2}$ گنا ہے یعنی ۱۷۲ فی ہزار۔ بچوں کی اموات کل اموات کا $\frac{1}{2}$ حصہ ہوتی ہیں۔ پچیس فیصدی بچے ایک برس کی عمر تک پہونچنے ہی میں راہیِ ملک عدم ہو جاتے ہیں۔ چالیس فیصدی بچے پہلے ہفتہ ہی میں موت کا نوالہ بن جاتے ہیں اور ساٹھ فیصدی ایک مہینہ تک زندہ رہتے ہیں۔ اموات کی تعداد ان صوبوں میں زیادہ ہے جہاں پیدائش کا نمبر بھی زیادہ ہے۔ مثلاً ممالک متحدہ آگرہ و اودھ۔ ممالک متوسط۔ لیکن مدراس میں کم ہے جہاں پیدائش کی تعداد بھی کم ہے۔ بڑے شہروں میں خاص طور پر زائد ہے۔ مثلاً :-

بمبئی میں	۵۵۶	فی ہزار	مدراس میں	۲۰۲	فی ہزار
کلکتہ "	۳۰۶	"	کراچی "	۲۴۹	"
رنگون "	۳۰۳	"	دہلی "	۲۳۳	"

اس کے اسباب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باشندگانِ ہندوستان میں تاب و تواں کی کمی ہے اور اس کی ذمہ داری مندرجہ ذیل باتوں پر ہے :-

(۱) معاشرت کا ادنیٰ معیار، کھانے پینے کی کمی۔ خورد و نوش میں عدم تناسب جن کا ذمہ دار افلاس ہے۔
(۲) مکان یا جائے بود و باش میں صفائی کا فقدان جسمانی صفائی کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن بیرونی صفائی کی طرف

خیال نہیں کیا جاتا۔ مثلاً مکان میں کافی ہوا کا گذر نہیں ہوتا اور ایک ایک مکان میں اتنے نفوس
رہتے ہیں جن کی ان میں گنجایش نہیں ہوتی۔ گاؤں گندے ہوتے ہیں، ہر طرف گندگی کے آ
دکھائی پڑتے ہیں۔ جانوروں کے گوبر گھر کے کوڑا کرکٹ کا گھر کے ہر طرف انبار لگا رہتا ہے، سڑا کر
مکان کے باہر چہ بچے اور گڈھوں میں پانی سڑا کرتا ہے اور آب و ہوا کو خراب کرتا ہے۔ گاؤں کے
پینے نہانے اور کپڑے دھونے سبھی کام میں لائے جاتے ہیں۔ ان سب کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بیمار
پھیلنے پر سیکڑوں انسان نذر اجل ہو جاتے ہیں۔

(۳) خراب سوشل رسم و رواج۔ باشندگان میں اس قدر بے پروائی ہے اور وہ اس قدر رسم و رواج کے غا
ہوتے ہیں کہ چاہے نقصانات کچھ بھی ہو مگر جیسا باپ دادا کرتے چلے آئے ہیں ویسا ہی کریں گے۔ ا
یہ خیال نہیں ہوتا کہ تندرستی پر تبدیل شدہ حالات میں کیا اثر پڑتا ہے۔

(۴) صغر سنی کی شادی وغیرہ۔ یہی نہیں کہ شادی صغر سنی میں ہوتی ہے بلکہ بچے پیدا ہونے کا سلسلہ بھ
نوعمری ہی میں شروع ہو جاتا ہے جب والدین کی ہڈیاں خود ہی پختہ نہیں ہونے پاتیں بچوں کی خام ر
تو کچھ تعجب نہیں۔ اس کے ساتھ ہی دائیوں کے کرتوت بھی شامل ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پیدا ہو
ہی زندگی بار دوش ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر باشندگان کم ہمت، بودے، لاپرواہ ہوں
عین حالات کے موافق ہے۔

(انجام)

معلوم ہوتا ہے کہ ۱/۲ خلق خدا ۵/۴ کے برابر ہے شکنجہ ڈھیلا ہے اسکو کسنے کی ضرورت ہے۔ یہ عذر کہ ملک
افلاس کا مسکن ہے عذر لنگ ہے۔ ہمکو خواب ہستی سے بیدار ہونے کی ضرورت ہے جسمانی حالت باطنی
بیرونی دونوں، پڑوس کی حالت، گاؤں کی حالت، شہر کی حالت سب کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ا
اس کام کا آغاز گھر ہی سے ہونا چاہیئے۔ ورزش جسمانی، سادی غذا، صاف آب و ہوا یہ تین بڑے جز
ہیں جن کو کام میں لانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ آبادی کے بڑھنے سے فائدہ کیا ہے قدرت اپنا بدلہ لے
رہیگی۔ اگر ہم قدرت کے قانون کے خلاف عمل کرتے رہیں گے تو سوائے اسکے اور کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا کہ اموا
کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو۔ اوپر یہ بتایا جا چکا ہے کہ کاشتکاری کی ترقی اچھی ہو سکتی ہے کیونکہ رقبہ
کاشت میں بہت بڑے اضافہ کی گنجایش ہے اسکے ماسوا ترقی یافتہ ذرائع کے استعمال کرنے سے موجو
رقبہ کی پیداوار دو چند سہ چند ہو سکتی ہے اسلئے ہمکو محض اس بات سے کہ آبادی بڑھ رہی ہے خوف نہیں
کھانا چاہیئے۔ خدا کی قدرت سے ہمارے ذرائع بھی افراط سے ہیں اگرچہ ہم ان سب کو کام میں نہیں لاتے۔

ترقی کے اصول

(سوامی رام تیرتھ جی مرحوم کے ایک لکچر کا ملخص)

(از سید محمد عسکری طباطبائی بی۔اے)

ترقی کے اصول۔ (۱) کام

آؤ ذرا دیر کے لئے اپنے گرد و پیش فطرت کے کارناموں پر غور کریں۔ چشموں کی روانی میں درس حکمت ہے، پتھروں کے جمود میں موعظۂ حسنہ ہے" ہمارے پاس تک غیر مشتبہ عبارت میں یہ پیام پہونچتا رہتا ہے کہ "دم بدم لو برابر کام کئے جاؤ"۔ "روشنی ہمیں بصارت بخشتی ہے" یہی سرچشمہ حیات ہے، ذرا دیکھئے تو کہ اس سے اس سوال کے حل میں کیا مدد ملتی ہے۔ چراغ ہی کی مثال لے لیجئے اُس کی تابندگی و درخشانی کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ تیل بتی کا خیال نہیں کرتا ہے اور تیل جلے جاتا ہے بتی اپنے تئیں مٹائے جاتی ہے جسکا لازمی نتیجہ فروغ و تابندگی ہے۔

اگر تم اپنے جسم کے لئے راحت و آرام کی تلاش میں ہو اور اپنا وقت عیش طلبی میں ضائع کرتے ہو تو یقین جانو تمہاری ترقی کی کوئی امید نہیں دوسرے لفظوں میں کاہلی موت ہے۔ اور کام کاج زندگی۔ تالاب کے بند پانی اور بہتے ہوئے دریا کو دیکھو۔ دریا کا موتی ایسا پانی ہمیشہ صاف و شفاف تازہ و دلکش ہوتا ہے۔ دوسری طرف تالاب کا گندا پانی کس قدر متعفن اور بیماری پھیلانے والا ہوتا ہے۔ اگر تم کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو محنت کے راستے پر چلو، دریا کی سی مستقل روانی اختیار کرو۔ اُس آدمی کے لئے کوئی اُمید نہیں جو اپنی قوتوں کے استعمال میں دریغ کرتا ہے۔ دنیا کے اصول پر کاربند ہو کر آگے بڑھتے رہو۔ کام۔ کام اور لگاتار کام یہی کامیابی کا پہلا اصول ہے۔

(۲) ایثار

صاف و سفید چیزوں سے ہر شخص محبت کرتا ہے۔ سیاہ چیزیں ہر جگہ نفرت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں حالانکہ نہ سرخ سرخ ہے اور نہ سبز سبز۔ گلاب میں یہ دلکش رنگ اسی لئے ہے کہ وہ اس رنگ کو جذب نہیں کرتا ہے۔ سورج کی کرنوں کے تمام دوسرے رنگ کھا بیٹھ جذب کر لیتے ہیں لیکن ان لوگوں نے بھی نہیں دیکھا جو اُس نے رد کر دیا تھا اس کے چہرہ کا غازہ بن گیا۔ اسی طرح سیاہ چیز روشنی کے تمام رنگوں کو

قبول کرلیتی ہے اور اپنی تازگی و سبزی اُسی رنگ سے حاصل کرتی ہے جسے قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔
سیاہ چیزیں نہ کسی رنگ کو جذب کرسکتی ہیں اور نہ کسی کو واپس، اُن میں نہ ایثار ہے نہ فیاضی جو کچھ حاصل کرتی ہیں اُس کا عشر عشیر بھی واپس نہیں کرتیں۔ فطرت کہتی ہے "جو اپنے ہمسایوں کو اپنی کمائی دینے سے انکار کریگا وہ سیاہ کوئلے کی طرح سیاہ رو ہوگا" حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ دوسروں کو دیا جائے، سفید رنگ کا راز ایثار کلّی ہے جو کچھ پاؤ فوراً اپنے پڑوسیوں میں لٹا دو۔ سفید چیزوں سے یہ خوبی اخذ کرو اور تم کامیاب ہوگے۔ سفید سے میری کیا مراد ہے؟ سفید آئینہ، سفید موتی، سفید برف، اور ہر مظہر صدق و صفا۔ پس ایثار و قربانی کا مادہ پیدا کرو۔ اور جو کچھ کماؤ دوسروں کو دیدو، خود غرضی سے کام نہ رکھو، تم بھی سفید نورانی ہو جاؤگے۔ بیج کے لئے درخت ہونے سے پہلے اپنی ہستی کا مٹا دینا ضروری ہے۔ کامل ایثار و قربانی کا ہر معلّم میرے بیان کی تصدیق کرے گا کہ علم کی روشنی سے جس قدر دوسروں کو فائدہ پہونچایا جائیگا اُسی قدر اس میں ترقی ہوگی۔

۳۔ خود فراموشی

ہر تقریر کرنے والا جانتا ہے کہ تقریر کرتے وقت اگر دل میں یہ خیال آگیا کہ میں تقریر کر رہا ہوں تو ساری خطابت تشریف لیجاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ کام میں اپنی ہستی بھلا دیجائے، اُس میں بہ دل و جان محو ہوجانے ہی پر کامیابی نصیب ہوگی۔ اگر تم کو کسی بات کی فکر ہے تو ہمہ تن فکر بن جاؤ اگر تم کوئی کام کرنا چاہتے ہو تو اس میں فنا ہو جاؤ پھر کامیابی تمہاری زر خرید لونڈی ہو کر رہیگی۔

۴۔ عالمگیر محبت

محبت بھی کامیابی کی بنیاد ہے، دوسروں سے محبت کرو اور دوسروں کی محبت حاصل کرو۔ اسی میں نجات ہے۔ ہاتھ کو اگر زندہ رہنا ہے تو اُسے جسم کے ہر حصے سے محبت کرنا چاہئیے، اگر وہ اپنے تئیں علحدہ کرلے اور سوچے کہ میری محبت سے تمام جسم کیوں مستفید ہو تو اس کے لئے بقا کی کوئی صورت نہیں کیونکہ اس طرح اپنی خود غرضی بنا ہینے کے لئے وہ منہ تک غذا بھی نہ پہنچائے گا جو اُس نے قلم یا تلوار کی مدد سے حاصل کی ہے۔ مگر وہ اُسی وقت نشو و نما پا سکتا ہے جب دیگر اجزائے بدن سے اپنا تعلق قائم رکھے اور کل کے فائدے ہی میں اپنا فائدہ تصوّر کرے۔

موالات محبت کا خارجی اظہار ہے۔ مجھے اس پر زور دینے کی ضرورت نہیں، مگر موالات کی بنیاد خالص اور مستقل محبت پر رکھو، محبت کرو اور تم کامیاب ہو جاؤگے۔ جو تاجر اپنے خریداروں کا فائدہ مدّنظر نہیں رکھتا ہے کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ترقی کرنے کے لئے اُسے اپنے گاہکوں سے محبت کرنا چاہیئے۔

دل وجان سے اُن کا پاس کرنا چاہیئے۔

۵۔ بے خوفی

ایک دوسری بات جو قابل توجہ ہے وہ بے خوفی ہے، ہر شخص کو اس کا تجربہ کرنا چاہیئے۔ ایک نگاہ میں شیر رام اور دشمن مطیع ہو سکتے ہیں۔ ایک بہادرانہ اقدام میں فتح حاصل ہوتی ہے۔ میں ہمالیہ کے گھنے جنگلوں میں مارا مارا پھرا ہوں مجھے شیر، چیتے، بھالو، بھیڑیئے اور زہریلے سانپ سبھی ملے۔ لیکن کبھی کسی نے کوئی نقصان نہیں پہونچایا۔ اکثر میں نے جنگلی درندوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر دیکھا، نگاہیں ملائیں اور خوفناک جانور مغلوب ہوگئے۔ وہ جنھیں دنیا ہیبت ناک کہتی ہے دُم دبائے چلے گئے۔ سچ ہے "بیخوف ہو جاؤ اور کوئی بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

تم نے دیکھا ہوگا کہ کس طرح ایک کبوتر بلّی کے آگے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شاید وہ یہ خیال کرتا ہے کہ چونکہ وہ بلّی کو نہیں دیکھ رہا ہے اس لئے وہ بھی اُسے نہ دیکھتی ہوگی۔ مگر نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ بلّی کبوتر پر جھپٹتی ہے اور ایک ہی جست میں اُسے چٹ کر جاتی ہے۔ بیخوفی سے شیر تک کو قابو میں کیا جا سکتا ہے اور جو ڈرے اُسے بلّی بھی مار سکتی ہے۔

تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ کانپتے ہوئے ہاتھ سے تم کسی پیالے میں کوئی سیال شے کبھی ٹھیک سے نہیں اُنڈیل سکتے ہو۔ وہ یقیناً گر جاتی ہے لیکن برخلاف اس کے ایک مطمئن اور بے جھجک ہاتھ کس قدر آسانی کے ساتھ یہی کام ایک قطرہ بھی ضائع کئے بغیر انجام دیتا ہے۔ اس مقام پر فطرت کی فصیح زبان پھر تم کو سبق دے رہی ہے۔

ایک مرتبہ جہاز پر ایک پنجابی سپاہی بیمار پڑا، ڈاکٹر نے دوا ے موت تجویز کی کہ اسے سمندر میں ڈال دیا جائے مگر کسی طرح سے سپاہی کو معلوم ہوگیا چنانچہ وہ بے اندازہ قوت کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا اور ڈاکٹر کے پاس پہنچکر اپنا طپنچہ سیدھا کرکے بولا "تم مجھے بیمار کہتے ہو؟ دیکھو میں ابھی تم کو گولی مارے دیتا ہوں۔" ڈاکٹر نے فوراً اسے تندرستی کا سرٹیفکیٹ دیدیا۔ القصہ مایوسی کمزوری کی علامت ہے اس سے بچو۔ اور یاد رکھو قوت بیخوفی سے آتی ہے اس لئے میرا کہنا مانو اور ہمیشہ بیخوف رہو

۶۔ خود اعتمادی

سب سے آخر میں لیکن سب سے زیادہ اہم ترقی کا اصل اصول، کامیابی کی واحد کنجی خود اعتمادی ہے۔ اگر کوئی مجھ سے زندگی کے فلسفے کو ایک لفظ میں بیان کرنے کی فرمایش کرے تو میں خود اعتمادی کہدونگا۔ خود اعتمادی خود شناسی ہے۔ اس لئے اے انسان اپنے نفس کو پہچان اور خود اپنی مدد کر

خدا تیری مدد کرے گا، یقیناً کرے گا۔ خدائے لایزال و برتر حقیقت و صداقت ہے جو تجربہ کی منتظر ہے اسلئے ہمیشہ اپنے اوپر بھروسہ کرو اسی طرح جو تم چاہو حاصل کر سکتے ہو۔ دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے

شیر جنگل کا بادشاہ ہے وہ اپنی ذات پر بھروسہ کرتا ہے اس لئے وہ اس قدر مضبوط اور توانا ہے ہاتھی جنھیں یونانیوں نے پہلے پہل ہندوستان میں دیکھکر "کوہِ رواں" کا خطاب دیا تھا ہمیشہ اپنے دشمنوں سے ڈرتے ہیں وہ ٹولیوں میں رہتے ہیں اور رات کے وقت سنتری اُن کی محافظت کرتے ہیں کیونکہ ہاتھی اپنی قوت پر بھروسہ نہیں کرتا وہ اپنے تئیں کمزور سمجھتا ہے اس لئے کمزور رہتا ہے۔ شیر کا ایک دلیرانہ حملہ ان کے سارے گروہ کو تتر بتر کر دیتا ہے حالانکہ ایک ہاتھی چاہے تو اپنے پاؤں ہی سے کئی شیروں کو کچل ڈالے۔

دو بھائیوں کا ایک نہایت سبق آموز قصہ بیان کیا جاتا ہے، اُنھوں نے باپ کی جائداد سے برابر کا ترکہ پایا تھا لیکن چند ہی سال کے بعد ایک مفلس و قلاش ہوگیا اور دوسرا دس گُنا امیر ہو گیا جب مفلس بھائی سے اس کا سبب پوچھا گیا تو اُس نے کہا "میرا بھائی ہمیشہ کہتا تھا، جاؤ۔ جاؤ۔ میں کہتا تھا آؤ۔ آؤ۔" یعنی وہ مخملی گدّوں پر لیٹا ہوا اپنے نوکروں سے کہا کرتا تھا "جاؤ یہ کرو۔ جاؤ وہ کرو" اور دوسرا خود ہمیشہ مستعد رہتا تھا اور نوکروں کو اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے بلاتا تھا "آؤ۔ یہ کرو۔ یہ کرو" جس نے اپنی اور اپنے نوکروں کی قوت پر بھروسہ کیا اُس کی دولت بڑھی جس نے نوکروں ہی پر سب کام چھوڑ دیا اس کی دولت چلی گئی۔

انسان اپنی قسمت کا آپ ہی بنانے والا ہے۔ میرے مذہب کے اہم اور ضروری اصول کیلئے کے یہ الفاظ ہیں:۔

"انسان کے لئے بہترین عقیدہ یہ ہے کہ وہ سمجھے کہ مجھ سے پیشتر دنیا نہیں تھی، یہ میری ہی تخلیق ہے میں نے ہی سورج کو سمندر سے بلند کیا اور چاند نے اپنے تغیرات میرے ہی ساتھ شروع کئے"

ایک مرتبہ تم بھی اس کا احساس کر لو، تم بھی آزاد اور کامیاب ہوگے۔ ایک مرتبہ اسکا یقین کر لو پھر دیکھو کہ کس طرح قعرِ مذلت بہشتِ کامرانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

———※———
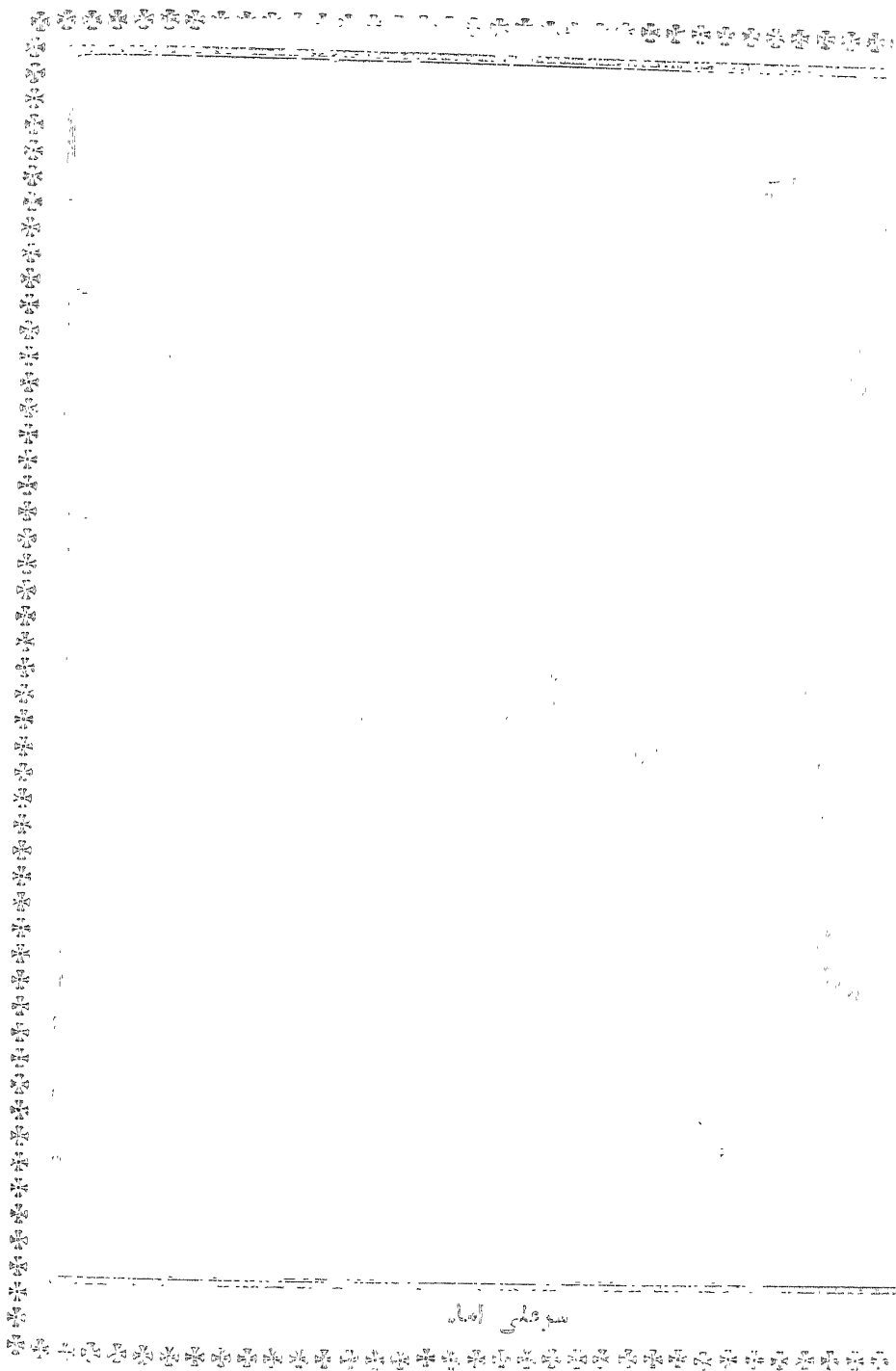
سر علی امام

پیدائش اُس وقت جبکہ ہندوستان میں عموماً مگر یو۔پی و بہار میں خصوصاً مسلمانوں کے سر پر ظلمت اور جہالت کی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، پٹنہ کے قریب قصبہ نیورہ کی افق سے ایک آفتاب اور ایک ماہتاب کا طلوع ہوا۔ یہ شمس و قمر سید علی امام اور سید حسن امام تھے۔ ان کے والد ماجد شمس العلما سید امداد امام ہیں۔ سید علی امام ۱۱۔فروری ۱۸۶۹ء کو برج حمل سے شرف وجود میں آئے تھے۔

خاندان آپ ایک قدیم خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے جو موضع کراے پرسرائے ضلع پٹنہ میں تقریباً سات سو برس سے آباد ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت زید شہیدؓ سے ملتا ہے۔ اگرچہ قدیم زمانہ میں پشتہا پشت سے کشور سیف اور اقلیم قلم دونوں پر حکومت چلی آتی تھی لیکن آخری زمانہ میں صرف شمشیر قلم پر قبضہ رہ گیا تھا۔ شرافت و نجابت اور علم و فضل ورثہ آبائی تھا، مگر چار پشتوں سے اس خاندان کو قانونی موشگافیوں سے خاص شغف و انہماک رہا ہے۔ چنانچہ سر علی امام کے پردادا خان بہادر سید امداد علی صاحب انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں عہدۂ ججی پر ممتاز تھے اور ان کے جد امجد خان بہادر سید وحید الدین صاحب پہلے ہندوستانی تھے جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ سخن سنجی و سخن فہمی گھٹی میں پڑی تھی۔ سر علی امام کے پدر بزرگوار نواب سید امداد امام خود بھی شاعر ہیں اور اثر تخلص فرماتے ہیں۔ آپ بے نظیر علمی قابلیت رکھتے ہیں، ایک بے بدیل حکیم، ایک بے مثل شاعر، ایک سحر طراز ادیب اور ایک بہت بڑے مصنف ہیں۔ عربی، فارسی، اردو، ہندی، انگریزی، لاطینی زبانوں میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ ادب، شاعری، زراعت، حکمت وغیرہ علوم و فنون میں آپ کی تصنیف کردہ کتابیں مشہور ہیں۔ بعض کا ترجمہ یورپین زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ سر علی امام کے علم و فضل اور تدبر و سیاست دانی کی تعریف علامہ سر محمد اقبال نے مندرجہ ذیل دو شعروں میں جس عمدگی اور خوش اسلوبی سے فرمائی ہے وہ موصوف کا ہی حصہ ہے۔ حضرت اقبال سر علی امام کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:۔

اے امام! اے سید والا نسب ۔۔۔ دودمانت فخر اشراف عرب

سلطنت را دیدہ افروز آمدی ۔۔۔ عقل کل را حکمت آموز آمدی

عادات وخصائل سر علی امام کے اوصاف پسندیدہ اور اخلاق حمیدہ کے متعلق ایک صاحب نے بہار سے مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر "سچ" کے نام ایک خط کے دوران میں بالکل سچ لکھا ہے کہ:-

"ان کی سیاست دانی، قانونی قابلیت وغیرہ کی تو ایک دنیا معترف ہے اور اس حیثیت سے مرحوم کے ماتم کرنے والے بہت سے نکلیں گے مگر میرا ماتم اس سر علی امام کا ہے جس کے خمیر میں مشرقی نہیں بلکہ اسلامی آداب و اخلاق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جس کی زبان سے قرآن مجید کی آیات، عربی قصائد کے اشعار اور فارسی محاورے بات بات پر نکلتے تھے، جو دیکھنے میں ذی وجاہت بیرسٹر اور "اپ ٹو ڈیٹ جنٹلمین" مگر دل کا سادہ اور فقیر منش تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مرحوم کو کتنے لوگوں کے نان و نمک کا ذریعہ بنایا تھا۔ کتنی بیوائیں اسی کی ذات سے آرام کی زندگی کاٹ رہی تھیں۔ کتنے مساکین کی مرحوم مستقل اعانت کرتے تھے۔ اس کا حال ان کی موت کے بعد معلوم ہو رہا ہے .... پھلواری میں ہر ماہ کی گیارہ کو موئے مبارک کی زیارت ہوتی ہے۔ پانچ۔ چھ برس ہوئے مرحوم ایک گیارھویں میں آئے۔ موئے مبارک کی زیارت کرتے ہی اس قدر رقت اور گریہ طاری ہوا کہ لوگ اٹھا کر مجلس سے باہر لائے۔" (سچ - ۱۱- نومبر ۳۲ء)

اسی سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"مرحوم سے میری ملاقات ایک بار کی بھی نہ تھی، صرف ایک آدھ جلسہ میں میں نے دور سے دیکھا تھا۔ کوئی دو سال ہوئے لکھنؤ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آمنا سامنا ہوا۔ نیشنلسٹ مسلم پارٹی کے صدر کی حیثیت سے آئے تھے، ساتھ میں استقبال کرنیوالوں کا ایک ہجوم تھا۔ سامنا ہوتے ہی معاً انھوں نے سلام میں سبقت کی۔ میں شرم سے کٹ گیا کہ ایک ہیٹ پوش، زرق برق سوٹ والا کس طرح ایک کھدر کی عبا پہننے والے پر بازی لے گیا مشرقی شرافت، انسانیت اور اسلامی آداب معاشرت کے وہ پتلے تھے۔ بارہا اس قسم کے واقعات سننے میں آئے۔ حکومت اور انگریزیت رکھنے والے مسلمانوں کی درحقیقت دو مختلف جماعتیں ہیں۔ ایک وہ گروہ ہے جس کے دل و دماغ، روح سب پر انگریزیت اور لامذہبیت چھا چکی ہے، یہ یکسر اپنی حقیقت کو بھولے ہوئے ہیں، اللہ۔ رسول، مذہب، قرآن اور اپنی موت کا انھیں کبھی بھولے سے بھی دھیان نہیں آتا۔ دوسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جو دل سے پختہ مسلمان ہیں، شریعت اور شارع دونوں کی محبت اور عظمت دل میں رکھتے ہیں، صرف اپنی بعض عملی کمزوریوں یا دنیوی مصلحتوں کی بنا پر صرف ظاہری طور پر انگریزیت اختیار کئے ہیں۔ سر علی امام بھی اسی دوسرے گروہ میں تھے۔ ان کی "صاحبیت" محض اختیاری تھی"۔

تعلیم وتربیت مرحوم کی ابتدائی زندگی کچھ کراے پر سرائے اور کچھ نیورہ میں گزری۔ فارسی و عربی کی ابتدائی کتابیں گھر پر پڑھنے کے بعد آپ کو ڈسٹرکٹ اسکول آرہ میں داخل کر دیا گیا۔ پھر وہاں سے کچھ دنوں تک

پٹنہ کالیجیٹ اسکول میں پڑھتے رہے۔ آپ نے پندرھویں سال ہی میں (۱۸۸۷ء) کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ بعدازاں پٹنہ کالج میں داخل ہو کر چند ماہ تک پڑھتے رہے۔ ماہ ستمبر ۱۸۸۷ء میں آپ کو بغرض تعلیم قانون انگلستان بھیجدیا گیا۔ وہاں سے آپ تین سال بعد بیرسٹری کی سند لیکر ۱۸۹۰ء میں ہندوستان واپس آگئے۔ اسی سال آپ کے ساتھ آپ کے دو بہت گہرے دوست سر عبدالرحیم جج مدراس ہائی کورٹ اور مسٹر جسٹس شاہدین پنجاب چیف کورٹ بیرسٹری پاس ہوئے تھے۔ آپ نے ۱۸۹۰ء میں کلکتہ ہائیکورٹ میں پریکٹس شروع کی اور پٹنہ میں قیام کیا۔ قانونی حلقوں میں بہت ہی جلد آپ کا سکہ جمگیا اور آپ نے بہت جلد منازل ترقی طے کر کے ہندوستان بھر میں اول درجہ کی پوزیشن حاصل کرلی۔ گواہوں سے جرح کرنے میں آپ ایک خاص ملکہ رکھتے تھے۔ واقعات کی ترتیب اور شہادت کی تحلیل میں آپ کو ید طولی حاصل تھا۔ پٹنہ میں آپ نے ۱۹۰۹ء تک پریکٹس کی اور دولت کے انبار لگادیے۔

خصوصیات | سر علی امام مرحوم و مغفور ایک بینظیر مقرر تھے۔ انگریزی اور اردو میں فی البدیہہ یعنی بغیر کسی تیاری کے ہر موضوع پر ایسی تقریر کرتے تھے جو دلنشین ہو جاتی تھی۔ ادب اردو سے خاص شغف تھا، صاف ستھری اردو لکھتے تھے۔ مشاہیر شعرائے اردو، فارسی و عربی، و انگریزی کا بہت کلام ازبر تھا جو آپ موقعہ و محل دیکھکر برجستگی کے ساتھ کام میں لاتے تھے۔ پرائیویٹ گفتگو اور عام تقریروں میں بھی حسب موقعہ دو چار شعر ضرور استعمال کیا کرتے تھے۔ مذہبی علوم سے خاص انہماک تھا۔ کبھی کبھی باوقات فرصت فن باغبانی میں بھی کسی قدر دلچسپی لیتے تھے۔ طبیعت میں فیاضی و سخاوت بہت تھی۔ سائلین، مساکین اور نادار طلبا کی سراً و علانیاً بہت کچھ مدد فرمایا کرتے تھے۔

مذہب | سر علی امام گو مذہباً امامیہ یعنی شیعہ تھے لیکن درحقیقت ان کا مذہب صلح کل تھا۔ تعصب و تنگدلی ان کے پاس تک نہ پھٹکی تھی۔ ان کے دل میں قوم کا سچا درد تھا۔ اور سر سید علیہ الرحمہ کے دھواں دھار لکچروں اور ان کی مقناطیسی شخصیت کے اثر نے سر علی امام کو قوم کا فدائی، سیدھا سچا مسلمان اور ایک بے غرض اور فقیر منش انسان بنا دیا تھا۔

خدمات | سنہ ۱۸۹۰ء میں آپ انگلستان ہی میں تھے جب انڈین نیشنل کانگریس کی طرف سے پہلا وفد انگلستان بھیجا گیا جس میں مسٹر جارج یول، مسٹر سر بندرو ناتھ بنرجی، مسٹر مدھولکر، مسٹر آرڈلے نارٹن اور مسٹر مورو پنتھ جوشی شامل تھے، سر علی امام بھی اس وفد کے ساتھ ہو گئے اور برطانوی پبلک کے سامنے مادر ہندوستان کی خوب خوب وکالت کی۔ اس زمانہ میں سر سید کی قومی تحریک زوروں پر تھی۔ سر علی امام نے بھی سر سید کے ساتھ ملکر خوب کام کیا چنانچہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ کی بے نظیر کامیابی سر علی امام

ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھی۔ اس کے بعد آپ علی گڑھ کالج کے لائف ٹرسٹی بنا دیے گئے۔

آپ نے قومی خدمات کے میدان میں کس طرح قدم رکھا؟ اس کا حال آپ نے مشہور سیاح اور جرنلسٹ سنت نہال سنگھ سے ایک مرتبہ خود اس طرح بیان کیا کہ "انڈین سول سروس کے ایک اعلیٰ عہدیدار جو میرے والد کے دوست تھے مجھ سے فرمانے لگے کہ "میاں تمہاری روایات ماضی، تمہاری ذاتی قابلیت، اور تمہاری قابل نمونہ سیرت و کردار اس قابل نہیں کہ تم دنیا میں صرف اپنے لئے زندہ رہو، بقول شخصے کہ مرنا بھلا ہے اس کا جو اپنے لئے جیے' تم کو خدا نے اس قابل بنایا ہے کہ تم پبلک خدمات کے میدان میں قدم رکھو اور جس قدر ہو سکے ملک اور قوم کی خدمت کرو"۔ اس نصیحت سے متاثر ہو کر سر علی امام بیرسٹری کے تنگ گوشہ سے نکلکر پبلک خدمات کے کھلے میدان میں آگئے، اور بانیان مسلم لیگ کے دوش بدوش مسلمانوں کی رہنمائی کرنے لگے۔ ۱۹۰۸ء میں جب بمقام پٹنہ بہار پراونشل کانفرنس کا پہلا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو اس کی صدارت سر علی امام نے ہی کی۔ اسی سال کے اواخر میں آپ نے مسلم لیگ کے اس مشہور و معروف اجلاس کی صدارت فرمائی جو امرتسر میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں جو خطبۂ صدارت آپ نے ارشاد فرمایا تھا وہ بلحاظ وسعت نظر اور محبت وطن دنیا بھر میں مشہور ہے۔ تمام خطبہ شروع سے آخر تک پڑھ کر دیکھیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حب وطن کا ایک دریائے ناپیدا کنار موجیں مار رہا ہے۔ اب تک ہندوستان کے مسلمان اس لغو خیال میں تھے کہ وہ عرب و عجم کے رہنے والے ہیں۔ ہندوستان میں ان کا محض عارضی طور پر قیام ہے۔ مگر سر علی امام نے اپنے خطبہ میں صاف کہدیا کہ :۔ " ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا"

سر علی امام تحریر فرماتے ہیں :۔

"ہم ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمان اپنی مادر وطن سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی کہ دیگر اقوام جو ہندوستان میں آباد ہیں۔ ہمارا دامن ہندوستان کے ساتھ قرنہا قرن کے رشتۂ ائتلافات (ایسوسی ایشنز) سے وابستہ ہے۔ ہم مادر وطن کی عزت و احترام میں کسی قوم سے کم نہیں ہیں۔"

۱۹۰۹ء میں سر علی امام کلکتہ ہائیکورٹ میں گورنمنٹ آف انڈیا کے اسٹینڈنگ کونسل مقرر ہوئے چنانچہ اس حیثیت سے آپ نے بہ نیت ڈمراؤں راج کے مشہور و معروف مقدمہ میں بمقام آرہ پیروی کی۔ اس کے بعد ۱۹۱۰ء میں آپ کو لارڈ منٹو نے حکومت ہند کا ممبر قانون مقرر کیا۔ چنانچہ اس عہدۂ جلیلہ پر آپ پانچ برس سے کچھ زیادہ عرصہ تک فائز رہے، اور ماہ دسمبر ۱۹۱۵ء میں علاحدہ ہوئے۔ گورنمنٹ ہند کے مشیر قانونی کی حیثیت سے یوں تو سر علی امام نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے لیکن آپ کے دو کارنامے ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ایک تو یہ ہے کہ سر علی امام کے صلاح و مشورہ سے بہار و

اڑلیسہ کو بنگال سے علیحدہ کرکے ۱۹۱۲ء میں ایک جداگانہ صوبہ بنایا گیا۔ اور دوسرا یہ ہے کہ سر علی امام کے اثر نے لارڈ ہارڈنگ کو ہندیان ماورائے بحر کے آلام و مصائب کو دور کرنے کی طرف مائل کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہمارے ہم وطنوں کو جنوبی افریقہ میں بےحد ستایا جا رہا تھا۔ بوئر لوگ تو ہندوستانیوں سے اس لیے نفرت کرتے تھے کہ انھوں نے جنگ جنوبی افریقہ میں انگریزوں کی مدد کی تھی، اور خود انگریز ہندوستانیوں کو حقیر و ذلیل سمجھتے تھے۔ اس طرح گویا جنوبی افریقہ کے ہندوستانی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان دانہ کی طرح پس رہے تھے۔ سر علی امام کے اثر سے لارڈ ہارڈنگ کی گورنمنٹ نے ہندیان ماورائے بحر کی حمایت کی اور ہندوستانیوں کے پیروں سے وہ زنجیریں کاٹ کر پھینک دیں جنھیں عرف عام میں "انڈنچرڈ لیبر" کہتے ہیں اور جس کی بدولت ہندوستانی "بھاڑے کے ٹٹو" یا "بھرتی کے قلی" بنے ہوئے تھے۔

جب بہار و اڑلیسہ کو جداگانہ صوبہ بنایا گیا تو اس وقت سر ریجنالڈ کریڈک ہوم ممبر تھے اور انھیں کا حق تھا کہ جدید صوبہ کے لفٹنٹ گورنر بنائے جائیں۔ لیکن سر علی امام کے اثر سے لارڈ ہارڈنگ نے سر ریجنالڈ کو صوبہ برہما میں بھیج دیا۔ دوسرا واقعہ مچھلی بازار کانپور کی مسجد کا ہے۔ اس زمانہ میں سر جیمس مسٹن ممالک متحدہ کے گورنر تھے۔ اور مسلمانوں کے جذبات بھڑک کر ایک خوفناک صورت اختیار کر گئے تھے۔ یہ سر علی امام ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ لارڈ ہارڈنگ بہ نفس نفیس کانپور پہنچے اور اس جھگڑے کا بوجہ احسن خاتمہ کر دیا۔

لا ممبری سے سبکدوش ہو کر سر علی امام چند روز کے لئے انگلستان تشریف لے گئے لیکن اپریل ۱۹۱۶ء میں واپس آ کر پٹنہ ہائی کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے۔ آپ کی قانون دانی کا سکہ پبلک اور گورنمنٹ پر اس قدر بیٹھا ہوا تھا کہ ستمبر ۱۹۱۷ء میں آپ پٹنہ ہائی کورٹ کے ایک مستقل جج مقرر کر دیے گئے لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہا کیونکہ ۱۹۱۸ء میں صوبہ بہار کی اگزیکیٹو کونسل میں آپ مسٹر شرف الدین مرحوم کی جگہ ممبر مقرر ہو گئے، یہ سلسلہ بھی چند روز نہ رہا کیونکہ اگست ۱۹۱۹ء میں آپ کو ہز اگزالٹڈ ہائینس حضور نظام دکن نے طلب کر کے اپنا وزیر اعظم مقرر کیا، جہاں آپ چار سال تک نہایت محنت و خوش اسلوبی سے فرائض وزارت انجام دیتے رہے جس کے صلہ میں خسرو دکن نے آپ کو نواب مؤتمن الملک کا خطاب عطا فرمایا۔ ابھی آپ حیدرآباد کی وزارت عظمیٰ پر ہی فائز تھے کہ ۱۹۲۰ء میں ضرورت پڑی کہ لیگ آف نیشنز میں کسی ہندوستانی کو ہندوستان کا نمائندہ بنا کر جنیوا بھیجا جائے۔ چنانچہ گورنمنٹ نے اس کام کے لئے سر علی امام ہی کو منتخب کیا۔ اس طرح آپ ہندوستان کے سب سے پہلے ہندوستانی نمائندہ تھے جو مجلس اقوام میں شریک ہوئے۔

۱۹۲۱ء میں نمائندہ ریاست حیدرآباد کی حیثیت سے آپ پھر انگلستان تشریف لے گئے۔ اس مرتبہ

آپ کا مقصد استرداد برار تھا، جس کا استمراری پٹہ لارڈ کرزن نے سابق نظام سے لے لیا تھا۔ افسوس کہ سخت کوشش کے باوجود سرعلی امام کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ریاستوں کا قاعدہ ہے کہ وہاں اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ دار کے خلاف بھی ریشہ دوانیاں ہوتی رہتی ہیں، یہی واقعہ حیدرآباد میں سرعلی امام کو پیش آیا، غرض شہریار اور وزیر دکن میں کچھ بدمزگی پیدا ہوگئی اور سرعلی امام کو قبل از وقت مستعفی ہوکر حیدرآباد سے واپس آنا پڑا۔ چنانچہ آپ پھر پٹنہ آکر بیرسٹری کرنے لگے۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو سرعلی امام نے سلطنت کی غیرمعمولی خدمت انجام دی ان کا خیال تھا کہ اگر ایسے آڑے وقت میں برطانیہ کو ہندوستان نے مدد دی تو ممکن ہے کہ دولت برطانیہ غریب ہندوستان کے حال پر بھی ضرور کچھ عنایت فرمائے۔

جنگ کے زمانہ میں ایک روز سرعلی امام ولایت میں نیشنل لبرل کلب کے اندر بیٹھے تھے، سہ پہر کا وقت تھا آپ کے ایک طرف ڈیلی نیوز کے ایڈیٹر مسٹر اے۔ جی۔ گارڈنر بیٹھے تھے اور دوسری طرف سنت نہال سنگھ، ان کے علاوہ اور بھی متعدد انگریز اور ہندوستانی جنٹلمین موجود تھے، چائے کا دور چل رہا تھا، اور سرعلی امام فرما رہے تھے کہ "لارڈ ہارڈنگ نے صرف پولیس کی مدد سے ہندوستان پر حکومت کی کیونکہ باقاعدہ فوجوں سے تمام ہندوستان خالی ہوگیا تھا۔ اور یہ بات ہر شخص کو معلوم تھی بایں ہمہ ہندوستان میں وہ امن وسکون رہا کہ کسی شخص نے بھی دم نہ مارا۔ نہ کہیں ہنگامہ ہوا نہ فساد، الغرض اہل ہند نے برطانیہ کے ساتھ ایسے وقت میں وفاداری دکھائی جو سخت نازک اور خطرناک تھا۔ اگر ہندوستان والے ایسے وقت میں خاموش بھی بیٹھے رہتے تو یہ بھی کچھ کم احسان نہ تھا لیکن اُنھوں نے برطانیہ کی امداد و اعانت میں دولت اور خون عزیز کے دریا بہا دیے۔ پھر کیا وجہ کہ جس آزادی کی حفاظت کے لئے یوروپ اس قدر خونریزی کر رہا ہے اس سے غریب ہندوستان ہی محروم رہے"

اس تقریر پر ایک انگریز جو پاس ہی بیٹھا تھا بول اُٹھا کہ ہندوستان میں تو ہندو اور مسلمان ہر وقت دست بگریباں رہتے ہیں، ایسی حالت میں اگر برطانیہ نے ہندوستان کا نظم ونسق خود ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دیدیا تو وہاں آپس میں خونریزی ہوگی اور خون کی گنگا جمنا بہہ جائیں گی۔ مگر سرعلی امام نے فوراً ہی جواب دیا کہ ہندو اور مسلمان کے جھگڑے بھائیوں کے جھگڑے ہیں۔ دُنیا میں کونسا ملک ایسا ہے جہاں آپس میں جھگڑے نہیں ہوتے۔ ان تنازعات باہمی کا اگر دنیا میں کوئی علاج ہے تو فقط حکومت خود اختیاری ہے۔

عقائد سیاسی بہرحال سرعلی امام پکے قوم پرست تھے، وہ ہمیشہ اس بات کے ساعی رہے کہ ہندوستان

کے فرقہ وارانہ مناقشات کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوجائے۔ اس میں شک نہیں کہ ۱۹۱۰ء تک آپ فرقہ پرستی کے حامی تھے لیکن اس کے بعد آپ پر یہ روشن ہوگیا کہ اس سے ہندوستان میں فرقہ وارانہ مناقشات کا ہونا لازمی ہے جو ہندوستان کی تباہی کا باعث ہوگا۔ چنانچہ آپ نے فرقہ پرستی کے تنگ حصار سے نکل کر قوم پرستی اختیار کرلی اور مرتے دم تک اسی عقیدہ پر قائم رہے۔ ۱۹۳۱ء میں مسلم نیشنلسٹ کانفرنس لکھنؤ کی صدارت بھی آپ ہی نے فرمائی تھی۔ آپ موجودہ اتحاد کانفرنس الہ آباد کی کامیابی کے دل سے آرزومند تھے۔ لکھنؤ کانفرنس میں بوجہ علالت طبع شریک نہ ہوسکے تھے لیکن آپ نے مولانا شوکت علی کی خدمت میں مبارکباد کا پیغام ارسال فرمادیا تھا۔

وفات جب ۱۹۳۱ء میں سرعلی امام دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے لندن تشریف لے گئے تھے تو آپ کی صحت وہیں سے خراب ہونا شروع ہوگئی تھی۔ چنانچہ اسی ناسازی طبع کے باعث آپ قبل از اختتام کانفرنس ہی ہندوستان واپس آگئے تھے۔ آپ کو ایک عرصہ سے اختلاج قلب کی شکایت تھی اور اس منحوس مرض کا اکثر دورہ ہوتا رہتا تھا، اس کے ساتھ دیگر عوارض بھی رونما ہونے لگے تھے جن سے باوجود علاج افاقہ نہ ہوا۔ آپ کلکتہ بھی تشریف لے گئے مگر یہاں کے علاج سے بھی افاقہ نہ ہوا تو آپ پٹنہ واپس آگئے اور وہاں سے رانچی تشریف لے گئے مگر یہاں آپ کے پرانے مرض کا دورہ ہوا اور بالآخر ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو مادرِ ہند کا یہ مایۂ ناز سپوت اور سرزمین بہار کا یہ نام آور فرزند ملک و قوم کو داغ مفارقت دے گیا۔ مرحوم نے ایک بیوہ یعنی لیڈی امام، چھ صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں چھوڑی ہیں۔

شہر کی لکشمی

(رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک تازہ نظم کا ترجمہ)

از جناب ظفر قریشی۔ بی۔ اے دہلوی

سرسوتی شہر میں قحط پڑا،
لوگوں کی چیخ پکار سے آسمان ہلنے لگا۔
مہاتما بدھ نے اپنے چیلوں کو جمع کیا اور ایک ایک سے پوچھا:-
"تم میں سے کون ہے جو بھوکوں کو کھانا کھلانے کی ذمہ داری لینے کو تیار ہے؟"
رتناکر، شہر کے دولتمند سوداگر اور گورو سیوک چیلے نے جواب دیا: "میرے مالک شہر کا شہر بھوکوں مر رہا ہے، میرے پاس اتنی دولت نہیں ہے کہ سب کو کھلا سکوں۔"
جے سین، گاؤں کے مکھیا نے جواب دیا: "آقائے نامدار! میرے خون کا آخری قطرہ آپ کی سیوا کے لئے موجود ہے، میرا دل غریبوں کی مصیبت پر روتا ہے مگر کیا کروں خود اپنے گھر میں غلہ نہیں ہے۔"
دھرم پال، زمیندار نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "میرے کھیتوں پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھوتوں کا سایہ ہو گیا ہے، سب جل گئے، اتنے دام بھی نہ ہونگے کہ راجہ کو لگان دے سکوں۔ بڑا غریب ہوں، کیا کروں!"

سب کے جواب صاف تھے، سب لوگ ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔
مہاتما بدھ کی مایوس نظریں قحط زدہ شہر کی طرف اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے آخری حصۂ شب میں ستارے چمک رہے ہوں۔
آنند پانڈے بھکاری کی نوجوان لڑکی لجاتی شرماتی ہوئی مجمع سے اٹھی اور مہاتما بدھ کے چرن چھو کر نرم و شیریں لہجے میں بولی:-
"مالک! میں بھکارن ہوں مگر اس ذمہ داری کو اپنے سر لیتی ہوں، بھوک کے مارے جو لوگ چلا رہے ہیں

، یا وہ سب میرے بچے ہیں، میں ان کی سلم پری لے لے شہر بھر بھر و ملی ."

سب حیران تھے کہ ایک بھکاری کی لڑکی جو خود بھکارن اور دانے دانے کو محتاج ہے کیونکر تمام شہر کو کھانا پہنچانے کی ذمہ داری لے سکتی ہے۔

ایک نے پوچھا "تم کیونکر ایسی زبردست ذمہ داری اپنے سر لے سکتی ہو؟"

لڑکی نے مجمع کے سامنے سر جھکا کر جواب دیا "میرے پاس فقیروں کا چینل ہے اور میرے لئے یہی کافی ہے اور مجھے اس پر بھروسہ ہے، اس کی بھیک کبھی خالی نہیں جاتی۔ میں تم سب لوگوں سے بلکہ سارے شہر سے غریب ہوں سب سے حقیر اور سب سے کمتر ہوں، لیکن مجھے اپنے اوپر بھروسہ ہے جب بھیک مانگنے تمہارے سامنے آؤنگی تو تم مجھے جھڑک نہیں سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ تم کبھی مجھے خالی ہاتھ واپس نہ جانے دو گے۔"

"میں تمہاری ہمدردی حاصل کر لونگی، کیونکہ بہت حقیر ہوں، اور یہ کشش حقیر چیز ہی میں ہوتی ہے۔ میرے پاس غلے کے بہت بڑے ذخیرے ہیں۔ کہاں، وہ آپ ہی لوگوں کے گھروں میں ہیں۔"

"شہر کے امیروں سے مانگ مانگ کر غریبوں کو کھلاؤنگی۔ اگر تم نے میری مدد کی تو میرا چینل ہمیشہ بھرا پڑا رہیگا۔ جو روٹی ٹکڑا مانگ مانگ کر لایا کرونگی غریبوں کو کھلا دیا کرونگی۔ میرا دل بہت فراخ ہے، گھبرانے کی بات نہیں۔ مالک پر بھروسہ کرو اور ایک دوسرے کی مدد کرو۔ کال دور ہو جائے گا!!"

اکبر الہ آبادی اور کرزن فیشن

ہندوستان کے نامور ادیب و شاعر مرحوم سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی نئی روشن خیالیوں کے باوجود مشرقی تہذیب کے دلدادہ اور نہایت پابند وضع بزرگ تھے۔ داڑھی منڈانے کا رواج تو خیر ہندوستان میں عام تھا لیکن آپ کے سامنے لارڈ کرزن کی تقلید میں مونچھیں منڈوانے کا فیشن ہندوستان میں نیا نیا رائج ہوا تھا۔ مرحوم اکبر الہ آبادی کو اس سے سخت نفرت تھی چنانچہ آپ نے اس کی ہجو میں حسب ذیل قطعہ بھی ارشاد فرمایا تھا۔

کر دیا کرزن نے زن مردوں کی صورت دیکھئے — آبرو چہرے کی سب فیشن بنا کر پونچھ لی
سچ یہ ہے انسان کو یورپ نے ہلکا کر دیا — ابتدا داڑھی سے کی وانتہا میں مونچھ لی

اتفاق سے اکبر الہ آبادی کے ایک دوست مسٹر عبدالغفور خاں علیگ نے بھی اپنی مونچھوں کو نئے فیشن کی قربانگاہ پر نذر کر دیا جب وہ مرحوم اکبر الہ آبادی سے ملنے کے لئے آئے تو مرحوم اپنے دوست کی نئی ہیئت کذائی دیکھ کر بہت ہنسے اور دوستوں کو مخاطب کر کے بیساختہ فرمایا ؎

دیکھ عبدالغفور خاں کی طرف — مرد خوش حال اس کو کہتے ہیں
چار ابرو کا یاں صفایا ہے — فارغ البال اس کو کہتے ہیں

سُدھا

(رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک قصہ۔ ترجمہ از مسٹر سلیم جعفر)

کانتی چندر کچھ زیادہ عمر کے آدمی نہیں، لیکن بیوی کے مرنے کے بعد انھوں نے اپنی دوسری شادی نہیں کی، اور جانوروں کے شکار سے دل بہلانے لگے۔ ان کا جسم لمبا، چھریرا اور مضبوط ہے، نگاہ تیز ہے اس لئے ان کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔ ان کے ساتھ پہلوان ہری سنگھ اور چھکن لال، استاد خاں صاحب گویّے، میاں صاحب وغیرہ بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ بیکار مصاحبوں کی بھی کمی نہیں۔

دو چار شکاریوں اور دوست واحباب کو لیکر کانتی چندر دریا کے کنارے شکار کھیلنے گئے۔ ندی کے بیچ میں دو بڑی کشتیوں میں جا کر ٹھہرے۔ ان دو کشتیوں کے علاوہ اور دو چار کشتیاں بھی ساتھ تھیں جنمیں نوکر چاکر اور مصاحبوں کا ڈیرا تھا۔ گاؤں کی بہو بیٹیوں کا نہانا دھونا ایک حد تک بند ہوگیا۔ بندوقوں کی آواز سے بحروبر دن بھر گونجا کرتا تھا اور شام کو استادوں کی تانوں سے گاؤں کے لوگوں کی نیند حرام تھی۔

کانتی چندر ایک دن صبح سویرے اپنی کشتی میں بیٹھے اپنے ہاتھ سے بندوق کی نال صاف کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں قریب سے بطخ کی آواز سنائی دی۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا ایک لڑکی دونوں ہاتھوں سے دو بطخیں سینے سے لگائے گھاٹ پر کھڑی نظر آئی۔ ندی چھوٹی تھی اور معلوم ہوتا تھا گویا بہہ نہیں رہی ہے جہاں تہاں طرح طرح کی سیوار پھیلی تھی۔ لڑکی نے دونوں بطخوں کو پانی میں چھوڑ دیا لیکن اس اندیشہ سے کہ کہیں ہاتھ سے نکلکر دُور نہ چلی جائیں انھیں پاس ہی رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس سے پہلے وہ انھیں پانی میں چھوڑ کر چلی جایا کرتی تھی لیکن آج کل شکاریوں کے ڈر سے بےخوف چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔

اس لڑکی کی سج دھج نرالی ہی تھی۔ گویا قدرت نے اسے ابھی سانچے میں ڈھال کر جان ڈال دی ہے اس کی عمر کا پتہ لگانا دشوار تھا۔ مگر اس کے چہرے پر ایسا بھولا پن برستا تھا جیسے ابھی تک دنیا کے رنگ ڈھنگ سے واقف ہی نہیں، اور ابھی تک جوانی کے آنے کی خبر ہی نہیں ملی۔

دم بھر کے لئے کانتی چندر بندوق کی نال صاف کرنا بھول گئے، معلوم ہوتا تھا کہ خواب دیکھ رہے ہیں ایسی جگہ اور یہ چہرہ، انھیں خواب میں بھی اس کی امید نہ تھی، لیکن کسی راجہ کے محل کی نسبت یہ چہرہ یہیں اچھا

معلوم ہوتا تھا۔ سونے کے گلدان کی نسبت پھول درخت پر ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس دن جاڑوں کی شبنم کے قطروں اور صبح کی دھوپ سے ندی کے کنارہ کا سماں بہت ہی دلفریب نظر آتا تھا جس میں وہ بھولا بھالا چہرہ دیکھکر کانتی چندر مست ہوگئے۔

مگر وہ لڑکی یکایک ڈر کر اور رونی صورت بنا کر جلدی سے دونوں بطخوں کو گود میں لیکر منہ ہی منہ میں کچھ کہتی ہوئی گھاٹ سے چلدی۔ کانتی چندر نے سبب دریافت کرنے کے لئے کشتی کے باہر آکر دیکھا۔ ان کا ایک پیارا مصاحب محض چھیڑنے کے لئے ان بطخوں کی طرف شست لگا رہا تھا۔ کانتی چندر نے فوراً پیچھے سے بندوق چھین کر اس کے گال پر ایک تھپڑ رسید کیا۔ اتفاقیہ طور سے رنگ میں بھنگ دیکھکر وہ مصاحب وہاں سے چل دیا۔ کانتی چندر پھر کشتی میں جاکر بندوق صاف کرنے لگے۔

تھوڑی دیر میں کانتی چندر نے ایک کبوتر پر بندوق چلائی۔ کبوتر چھرہ لگ کر کچھ فاصلہ پر گر پڑا۔ شکار کا پتہ لگانے کے لئے کانتی چندر اُس چھوٹے سے گاؤں میں گئے۔ انھیں بہت محنت نہیں کرنی پڑی کیونکہ ایک گھر کے دروازہ پر پیپل کے درخت کے نیچے وہی لڑکی بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ اُس کی گود میں وہی گھائل کبوتر تھا۔ اور لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رو اور کبوتر پر ہاتھ پھیر رہی ہے۔ پاس ہی کے ایک درخت کے تھالے سے آنچل بھگو بھگو کر پیاسے کبوتر کے منہ میں پانی نچوڑ رہی ہے۔ پالوبلی بھی دونوں پیر پھیلائے للچائی نظروں سے دیکھ رہی ہے لیکن وہ لڑکی انگلی دکھا دکھا کر اس کی بڑھی ہوئی ضد کو بار بار توڑ دیتی ہے۔

گاؤں میں دوپہر کے سناٹے میں یہ درد انگیز منظر دیکھتے ہی کانتی چندر کے دل پر نقش ہوگیا۔ درخت کے پتوں میں سے دھوپ چھن چھن کر لڑکی پر پڑ رہی تھی۔ قریب ہی ایک موٹی تازی گائے گھاس چر کر بیٹھی جگالی کر رہی تھی اور سر اور کان ہلا کر مکھیاں اڑاتی جاتی تھی۔ ہوا سے ہلتی ہوئی پتیوں کی آواز بھی آتی تھی۔ سویرے جو لڑکی ندی کے کنارہ جنگل کی پری کی طرح دکھائی دی تھی وہی یہاں دوپہر کو مجسمہ محبت اور گھر کی دیوی بنی دکھائی دی۔

کانتی چندر بندوق لئے ہوئے اس لڑکی کے پاس بڑھے چلے گئے مگر تھوڑی دیر بعد وہ یکایک جھجھک کر رہ گئے، اس وقت ان کی کیفیت اس چور کی طرح تھی جو مال مسروقہ سمیت پکڑ لیا جائے ان کے دل میں خیال آیا کہ کسی طرح ثابت کریں کہ کبوتر اُن کی بندوق سے زخمی نہیں ہوا۔ ابھی کانتی چندر سوچ ہی رہے تھے کہ اس کو کیونکر چھیڑیں کہ کسی نے گھر کے اندر سے آواز دی "سُدھا" لڑکی جیسے چونک پڑی۔ پھر آواز آئی "سُدھا"۔ اس پر وہ لڑکی جلدی سے کبوتر کو لیکر گھر چلی گئی۔ کانتی چندر نے اپنے دل میں کہا، نام تو بہت ہی پیارا ہے۔ سُدھا!

کانتی چندر کشتی پر واپس آئے، بندوق رکھی اور اُسی گھر کے صدر دروازہ پر آموجود ہوئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سر گھٹے پنڈت جی جن کی صورت سے اطمینان ظاہر ہوتا تھا چبوترے پر بیٹھے بھگت مال پڑھ رہے ہیں۔ کانتی چندر نے پنڈت جی کے مقدس چہرہ کا جس سے سنجیدگی اور اطمینان عیاں تھا اس لڑکی کے چہرہ سے جس سے رحم مترشح ہوتا تھا مقابلہ کیا۔ اور پنڈت جی کو نمسکار کرکے بولے "مہاشے پیاس لگی ہے کیا لوٹا بھر پانی مل سکتا ہے"۔ برہمن نے تعظیم و تکریم سے بٹھایا اور اندر سے کچھ بتاشے اور لوٹا بھر پانی لاکر مہمان کے سامنے رکھ دیا۔

کانتی چندر پانی پی چکے تو پنڈت جی نے پوچھا کہ "آپ کون ہیں"؟ انھوں نے اپنا پتہ بتاکر پنڈت جی سے کہا کہ "مہاشے اگر میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں تو اس کا بجا لانا اپنا فخر سمجھوں گا"۔

پنڈت جی کا نام "نوین چندر بنرجی" تھا۔ بولے "بیٹا تم میری کیا خدمت کرسکتے ہو، میری صرف سُدھا نامی ایک لڑکی ہے اس کو کسی کے پلّو سے باندھ دینا ہی ایک کام باقی ہے۔ آس پاس کے مقامات میں کہیں کوئی اچھا، لائق، خاندانی لڑکا نہیں دکھائی دیتا، دُور جاکر پتہ لگانے کی استطاعت نہیں۔ گھر میں بھگوان کی مورتی ہے اُسے چھوڑ کر کہیں جانا نہیں ہوسکتا"۔

کانتی چندر: "اگر آپ مجھ سے کشتی پر مل سکیں تو میں ایک اچھا خاندانی لڑکا بتا سکتا ہوں"۔

کانتی چندر نے گاؤں میں جاسوس چھوڑ رکھے تھے انھوں نے جس سے پوچھا اُس نے سدھا کے چال چلن کی تعریف کی۔

دوسرے دن نوین چندر جب کشتی پر آئے تو کانتی چندر نے ڈنڈوت کرکے بٹھایا اور باتوں ہی باتوں میں جتایا کہ وہ ان کی لڑکی سے شادی کرنے کے آرزومند ہیں۔ پنڈت جی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی، سُنکر حیران ہوگئے۔ خیال ہوا کہ کانتی چندر کو دھوکا ہوا۔ پوچھنے لگے "تم میری لڑکی سے شادی کروگے"؟

کانتی چندر: "اگر آپ رضامند ہوں تو میں تیار ہوں"۔

نوین چندر: "سدھا کے ساتھ"؟

کانتی چندر: "ہاں!"

نوین چندر: (اطمینان کے ساتھ) "تم نے ابھی تو اس کو دیکھا سنا بھی نہیں ہے"؟

کانتی چندر نے اس انداز سے کہ گویا واقعی اُسے نہ دیکھا تھا۔ کہا، "اس کی آپ فکر نہ کریں"۔

نوین نے خوش ہوکر کہا، "میری سدھا تو بہت اچھی لڑکی ہے، گھر گرستی کے کام میں اس کا جواب نہیں جیسے تم اس کو بغیر دیکھے ہی بیاہنے کو تیار ہو ویسے ہی میں بھی دعا دیتا ہوں میری سدھا ہمیشہ تمہاری رضاجوئی

کر کے تم کو خوش و خرم رکھے"

ماگھ کے مہینے میں شادی قرار پائی۔

گاؤں کے رئیس مجو مدار بابو کے پرانے گھر میں بیاہ کا سامان کیا گیا۔ جب وقت آیا تو پالکی پر سوار ہو کر روشنی اور باجے گاجے کے ساتھ دولھا آن پہونچا۔

شادی کے وقت ایک بار مانگ میں سیندور لگانے کے موقع پر دولھانے دولھن کی طرف دیکھا۔ سندھا شرم سے سر جھکائے تھی اس لئے کانتی چندر اُسے اچھی طرح نہ دیکھ سکے۔ جوش مسرت سے آنکھیں خیرہ سی ہو گئیں۔

خاندان کی رسم تھی کہ دولھا گھر میں جا کر منہ جھٹلایا کرتا تھا۔ کانتی چندر کو اندر جانا پڑا۔ وہاں ایک عورت نے زبردستی دولھا سے دولھن کا گھونگھٹ کھلوایا۔ گھونگھٹ کا کھلنا تھا کہ کانتی چندر جیسے چونک پڑے۔ یہ تو وہ لڑکی نہیں ہے! جیسے اچانک اُن پر بجلی گر پڑی ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ دم بھر میں وہاں کی روشنی بجھ گئی اور اس تاریکی نے گویا نو عروس کا چہرہ بھی چھپا لیا۔

کانتی چندر نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ دوسری شادی نہ کرونگا، تقدیر نے اس عہد کو اس طرح دل لگی کر کے چٹکی بجاتے بجاتے خاک میں ملا دیا۔ بہت سے اچھے اچھے پیغام آئے اور کانتی چندر نے منظور نہ کئے۔ دولت کا لالچ اور حُسن کی دلفریبیاں ان کے ارادے میں تزلزل نہ پیدا کر سکیں، بلند مرتبہ خاندانوں سے تعلق کا خیال ان کے استقلال میں خلل انداز نہ ہو سکا۔ مگر آخر میں ایک گاؤں جس سے وہ واقف نہ تھے اور ایک ناواقف کے گھر میں انھیں یوں ذلیل ہونا پڑا۔ اب لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔

پہلے سسر پر غصہ آیا کہ مکار نے لڑکی دکھائی اور شادی کی اور کے ساتھ۔ مگر خیال آیا کہ نوین چندر نے تو لڑکی دکھائی ہی نہیں۔ وہ بیاہ سے پہلے لڑکی دکھانے کو راضی تھے مگر میں ہی نے انکار کر دیا۔ اب اپنی عقل کے قصور کو کسی پر ظاہر نہ کرنا چاہیئے۔

زہر کا سا گھونٹ پی گئے مگر چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ سسرال کی عورتوں کا ہنسی مذاق بُرا معلوم ہونے لگا، کچھ خود پر کچھ اوروں پر غصہ آ رہا تھا۔

اسی اثنا میں اِن کی دولھن جو پاس ہی بیٹھی تھی کسی نامعلوم خوف کے باعث زور سے چیخ اٹھی اور ایک خرگوش کا بچہ اس کے پاس سے دوڑتا ہوا نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس دن والی لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور خرگوش کے بچے کو پکڑ کر اس کے گال پر گال رکھ کر پیار کرنے لگی۔ "یہ کہہ کر "وہ پگلی آ گئی" اس سے سب عورتیں اشارہ کر کے وہاں سے چلے جانے کو کہنے لگیں۔ مگر اس نے اس پر دھیان نہ دیا۔ دولھا دولھن کے

سامنے بیٹھ گئی اور بچوں کی طرح شوق سے دیکھنے لگی کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک عورت نے اُسے پکڑ کر زبردستی وہاں سے ہٹا دینا چاہا۔ کانتی چندر نے کہا، کیوں ہٹاتی ہو اسے بیٹھی رہنے دو۔ اس کے بعد اس لڑکی سے مخاطب ہوئے، تمہارا نام کیا ہے؟

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا اور ان کا منہ تکنے لگی اور جتنی عورتیں وہاں بیٹھی تھیں سب ہنس پڑیں۔

کانتی چندر نے پھر پوچھا "تمہاری بطخیں اچھی ہیں؟"

اس نے کچھ جواب نہ دیا اور بے تکلف ان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھا کی۔

کانتی چندر نے ہمت کر کے پھر پوچھا "تمہارا وہ کبوتر اچھا ہو گیا؟" اس کا بھی کچھ جواب نہ ملا۔ سب عورتیں اس طرح ہنسنے لگیں گویا دولہا کو بہت بڑا دھوکا ہوا۔

آخر کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ لڑکی گونگی اور بہری ہے۔ گاؤں کے چرند و پرند ہی اس کے ساتھی ہیں اس دن سُدھا کی پکار سنکر جو وہ گھر میں چلی گئی تھی یہ محض اُس کا خیال تھا۔

کانتی چندر یہ سنکر دل ہی دل میں بہت حیران ہوئے، جس کے نہ ملنے کی وجہ سے وہ دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے تقدیر کی خوبی سے اسی سے نجات پا کر انھوں نے اپنی خوش قسمتی پر ناز کیا۔ اپنے دل میں کہنے لگے۔ اگر میں اسی لڑکی کے باپ کے پاس پہونچتا اور وہ میری التجا پر اس لڑکی کو کسی طرح میرے سر منڈھنے کو راضی ہو جاتا تو کیا ہوتا۔

جب تک انھیں اس لڑکی کے ہاتھ سے نکل جانے کا رنج تھا اور اس کی محبت نے بے چین کر رکھا تھا اپنی بیوی کے بارہ میں کہنا چاہیے، ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ انھیں اس کی پرواہ بھی نہ تھی کہ پاس ہی دل کی تشفی کا کوئی سامان ہے یا نہیں۔ لیکن جیسے ہی اُنھوں نے سنا کہ وہ لڑکی گونگی اور بہری ہے اُن کی آنکھوں کے سامنے سے دنیا پر جو سیاہ پردہ پڑا تھا اُٹھ گیا۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر بجا لائے اور موقع پا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اس وقت انھیں اپنی بیوی لکشمی سے زیادہ خوبصورت نظر آئی۔ اتنی دیر کے بعد ان کی سمجھ میں آیا کہ یہ نوین چندر کی دعا کا اثر تھا۔

تنقید کتب

گوئٹے کا فاؤسٹ

گوئٹے جرمنی کا مشہور فلسفی شاعر ہے جس کا ذکر علامہ اقبال نے بھی اپنی مشہور نظم غالب میں اس طرح کیا ہے :کہ

آہ تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے ۔۔۔ گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

ویمر ملک جرمنی کا ایک مقام ہے جہاں گوئٹے مدفون ہے۔ گوئٹے کے کمالِ فن کا تمام یورپ معترف ہے۔ اور اُس کی تصنیف فاؤسٹ وہ شاہکار ہے جس نے جرمنی میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ گوئٹے کی ایک اور مشہور تصنیف "سلامِ مغرب" بھی ہے۔ علامہ اقبال نے اسی نظم کے جواب میں "پیامِ مشرق" لکھا ہے۔

اب ڈاکٹر عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی۔ نے گوئٹے کے مشہور ڈراما فاؤسٹ کا ترجمہ اردو زبان میں کر کے اردو داں پبلک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس قسم کے مغربی جواہر پاروں سے زبانِ اُردو کو آراستہ کرنا آپ ہی جیسے ممتاز اہلِ قلم کا کام ہے۔ اس ترجمہ کو دیکھ کر شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کی وہ دیرینہ تمنا پوری ہوتی نظر آتی ہے جس کا ذکر مولانا مرحوم نے ان الفاظ میں کیا ہے :-

"..... اربابِ زمانہ نے متفق اللفظ کہہ دیا کہ اُردو زبان مضامین عاشقانہ ہی کہہ سکتی ہے۔ اُسے ہر ایک مضمون کے ادا کرنے کی طاقت اور لیاقت بالکل نہیں اور یہ ایک بڑا داغ ہے جو ہماری قومی زبان کے دامن پر لگا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اسے کون دھوئے اور کیونکر دھوئے؟ ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے جو کشورِ علم میں مشرقی اور مغربی دونوں دریاؤں کے کناروں پر قابض ہو گئے ہیں۔ ان کی ہمت آبیاری کرے گی، دونوں کناروں سے پانی لائیگی اور اس داغ کو نہ فقط دھوئیگی بلکہ قوم کے دامن کو موتیوں سے بھر دیگی۔"

یہ ترجمہ ہر اُردو زبان کے قدر دانوں کی لائبریری میں رہنا چاہیئے۔ قیمت فی جلد غیر مجلد تین روپیہ آٹھ آنہ (۸/۳ ؏) اور مجلد چار روپیہ ہے۔ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہے۔

ورڈسورتھ اور اُس کی شاعری

مصنفہ میر حسن صاحب مدیر مجلۂ عثمانیہ منتخب معتمد بزم اُردو کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن
لکھائی چھپائی معمولی۔ کاغذ سمی تقطیع چھوٹی ۳۰×۲۰ صفحات ۱۸۴ قیمت عہ ملنے کا پتہ بی بی الاوہ نمبر ۳۲۰ حیدرآباد دکن

جامعۂ عثمانیہ کی بدولت حیدرآباد اور اس کے متعلقات میں خوش فکر اور نوجوان انشاپردازوں کی ایک ایسی اُلوالعزم جماعت پیدا ہوگئی ہے جو ہر وقت اردو ادب کی توسیع و ترقی کی فکر میں منہمک ہے اسی جماعت میں کتاب زیر نظر کے فاضل مصنف میر حسن صاحب بھی ہیں۔

اب تک شعرائے اردو شعر و سخن میں عربی و فارسی اساتذہ کے کلام کا تتبع کرتے رہے تھے ۔مگر میر انیس و مرزا دبیر نے اپنے گراں بہا مرثیوں میں رنگ بدل دیا اور تغزل کو چھوڑ کر فطرت نگاری اور واقعہ بندی اختیار کی۔ غدر ۱۸۵۷ء تک تو اُردو شاعری میں وہی پرانی شان تغزل باقی رہی لیکن اس کے بعد جب ہندوستان میں انگریزوں کا تسلط پوری طرح قائم ہوگیا تو اُردو ادب بھی انگریزی ادبیات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اس زمانہ میں انگریزی شاعری عروج پر تھی اور اُس پر رومانیت کا رنگ غالب تھا۔ اسی زمانے میں آزاد و حالی نے اردو شاعری کی اصلاح اور اس میں فطری لطافت و دلکشی پیدا کرنے کا بیڑا اُٹھا لیا۔ چنانچہ لاہور میں زیر سرپرستی شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد "مشاعرہ" کے بجائے "مناظمہ" کی بنا ڈالی گئی، جس میں مصرعہ طرح کے بجائے کوئی موضوع خاص تجویز کر دیا جاتا تھا۔ غرض اس طرح ہندوستان میں نیچرل شاعری کی بنیاد پڑی۔

کتاب زیر نظر کے مقدمے میں مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم۔اے۔ ایل ایل۔بی مددگار پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ کا یہ قول قابل توجہ ہے:-

> "جدید اردو شاعری کے نصب العین کی پیدائش میں ورڈسورتھ کی شاعری کے اثر کو کافی دخل ہے یہ چیز شاید ابھی یقین کے ساتھ نہ کہی جاسکے کہ حالی کو لاہور بکڈپو کی ملازمت کے دوران میں انگریزی کے کس طرح کے ترجموں سے واسطہ رہا لیکن داخلی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ انھوں نے ورڈسورتھ کی شاعری، اس کے شاعرانہ نصب العین اور اصلاح شاعری کی تجویز سے کسی نہ کسی طرح واقفیت حاصل کر لی تھی۔ ان کا قطعہ "شعر سے خطاب" درحقیقت اسی اثر کا آئینہ دار ہے۔ اس کے علاوہ فطرت پرستی کا جو زور شور ہماری شاعری میں غدر کے بعد شروع ہوا وہ اگر ورڈسورتھ کے براہ راست اثر سے نہ بھی ہو تاہم اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ خود انگریزی شاعری میں فطرت کا یہ اعلیٰ تخیل

ورڈسورتھ کے بعد ہی پیدا ہوا۔"

اس اقتباس میں مولانا حالی کے بارہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے خواہ ہم متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن
یہ سچ ہے کہ موجودہ انگریزی شاعری کا اعلیٰ تخیل ورڈسورتھ کی فطرت پرستی کا ضرور رہین منت ہے۔ ورڈسو
ہی پہلا انگریز شاعر ہے جس نے حسنِ فطرت کی عقیدتمندانہ پرستش کی جس نے خیالات کی گہرائی اور بیان
صفائی کے ذریعہ سے مناظر فطرت کی ہو بہو تصویر کھینچی اور جس نے مظاہر کائنات کو ہمیشہ گہرے روحانی رنگ
پیش کیا۔ اسی وجہ سے وہ "مولود الفطرت" کہلاتا ہے۔

انگریزی کی کورانہ تقلید فی زمانہ فیشن بنتی چلی جاتی ہے لیکن اس اندھا دھند سے اردو میں وہ لطف
وخوبی پیدا نہیں ہو سکتی جو انگریزی شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اس بے راہ روی کو روکنے کے لئے ضروری
کہ انگریزی شاعروں کے متعلق اردو زبان میں معلومات فراہم کی جائے اور ان کے عمدہ کلام کا صحیح ترجمہ پیش ک
الحمدللہ کہ اس میدان میں میر حسن صاحب نے ایک مبارک قدم بڑھایا ہے۔ کتاب زیر ریویو میر
ورڈسورتھ کے سوانح حیات کے علاوہ اس کی شاعری پر بھی ایک فاضلانہ نظر ڈالی گئی ہے اور ورڈسورتھ کی
ایک عمدہ تصویر بھی دی گئی ہے۔ دیباچہ میں یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید اردو شاعری نے ورڈ
کے کیا کیا اثرات قبول کئے۔ اور مقابلہ یا توضیح کے لئے بعض شعرائے اردو مثلاً اقبال۔ چکبست۔ جوش۔ تلوک
محروم وغیرہ کی نظمیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ ورڈسورتھ کی بہت سی نظموں کا اردو ترجمہ بھی دیدیا گیا ہے۔ نمونہ کے طو
ایک نظم کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

"اگر جوانی میں میرا دل بالکل پاک وصاف تھا
اگر دنیا کے روبرو آکر بھی میں اپنی متوسط خوشیوں پر
قانع رہا کرتا تھا، اگر خدا اور قدرت کے ساتھ میں
ہم کلام تھا اور چھوٹی چھوٹی مخاصمتوں اور معمولی
معمولی خواہشوں سے منزہ رہا کرتا تھا تو یہ سب
تمہاری ہی عنایتیں تھیں۔ اگر ان خوفناک ایام
میں جبکہ بڑی بڑی امیدیں بگڑ بگڑ کر افسردگیوں کے
دامن میں پناہ لیتی تھیں۔
اگر جہالت اور نا انصافی کے سبب اچھے آدمیوں
کو ہر طرف شکستیں ہوتی تھیں اور لوگوں کو اس پر

خوشیاں مناتے ہوے دیکھتا تھا.........

(غرض) کسی پست سے پست اور بری حالت

میں اگر میں نے ہمت نہ ہاری بلکہ ایک رومانی سے

زیادہ ایسا محکم یقین اور کامل اعتماد رکھا جو کبھی

نہیں ٹوٹ سکتا تھا.

تمام مصیبتوں میں میری تسلی، اور میری زندگی کی

ساری مسرت یہ سب تمہاری عنایتیں تھیں

اے ہوا کے تھپیڑو! اور اے آواز کرنیوالے

فوارو! یہ صرف تمہاری عنایتیں ہیں

لے پہاڑو! یہ تمہاری ہی ہیں، اے فطرت!!

تو نے میری عالی معتقدات کو غذا پہونچائی ہے.

اور تجھ ہی میں میں اپنے اس مضطرب دل کے لئے

ایک لازوال انبساط اور خالص جذبہ پاتا ہوں" (دی پریلیوڈ)

قابل مصنف نے لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی وجہ سے اس "نظم منثور" میں ورڈسورتھ کی شاعرانہ روح کی بہت کم جھلک نظر آتی ہے۔

اس کتاب کی عبارت فاضلانہ ہے جس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی ہو سکتا ہے:۔

"ورڈسورتھ جامعہ کیمبرج میں ماہ اکتوبر ۱۷۸۷ء میں داخل ہوا، اس وقت اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں تھی لیکن اس نے چند ہی روز بعد محسوس کیا کہ جامعاتی تعلیم اس کی افتاد طبیعت کے خلاف تھی۔ وہاں کا اخلاقی اور ذہنی ماحول گندا اور جامد تھا، طلبا کے بیشتر اوقات بے فائدہ اور لایعنی مشاغل میں صرف ہوتے تھے، اور درسی کتابیں اس کے ذاتی مذاق کے خلاف تھیں۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر ورڈسورتھ کا بیشتر وقت تنہائی اور خاموشی میں گزرنے لگا جن میں اُس نے مقام اور ماحول کے مضر اور غیر مفید اثرات کے اندفاع کی ممکنہ کوشش کی۔ بسا اوقات ہنگامۂ دہر کی شورشوں اور جانستانیوں سے اکتا کر خلوت کدۂ سکون کی تلاش میں آبادی، عمارتوں اور باغوں کو چھوڑ کر کھلے میدانوں اور سرسبز دلکشا وادیوں میں دُور دُور تک نکل کر فطرت کے حیات بخش اور دلفریب نظاروں کے مطالعہ اور مشاہدے سے حظ و انبساط حاصل کرتا تھا۔"

اس کی عبارت میں جابجا "دکنیت" کا رنگ بھی نظر آتا ہے چنانچہ اکثر الفاظ اور محاورے ایسے استعمال ہوگئے ہیں جو شمالی ہند میں مروج نہیں مثلاً :۔

صفحہ ۶ سطر ۵ میری بوڑھی اُستانی متانت کے ساتھ میرے بازو بازو چلتی تھی۔ یہاں "بازو بازو" بمعنی "برابر برابر" استعمال کیا ہے۔

۷ ۱۲ "مصنفات" بمعنی "تصانیف" استعمال کیا گیا ہے۔

۲۶ ۱۸ کوئی قابل ذکر رقمی فائدہ نہیں ہوا۔ یہاں "رقمی" کا لفظ بمعنی "مالی" استعمال کیا ہے۔

۳۰ ۶ تھیٹر کے نظمانے غیر نفع بخش قرار دیکر تمثیل کرنے سے انکار کردیا۔ نظما بجائے "منتظمین" اور کھیلنے کے بجائے "تمثیل کرنا" استعمال کیا گیا ہے۔

۴۰ ۳ جن کی وجہ سے قاری ورڈسورتھ کے مقصد اصلی تک پہنچنے میں دقت محسوس کرتا ہے اگرچہ اخبار بینوں کے لئے "قارئین کرام" کی اصطلاح رائج ہے لیکن "قاری" بصیغہ واحد صرف قرآن خواں یا تجوید کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۵۰ نظم یہاں نرگس کی جمع "نرگسوں" اور "نرگسین" لکھی ہے جو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

" ۱۵ "تمام مکتبوں (Schools) کا سخت مخالف تھا" یہاں ترجمہ غلط ہے۔ مکتبوں کے بجائے "مذہبوں" چاہیئے، جیسے "مذہب حنفی" "مذہب حنبلی" یہ سب "اسکول" ہیں

۸۶ ۳ "ایک خلوت گزیں گیت گاتی ہے"۔ خلوت گزیں گیت کی ترکیب عجیب ہے۔

۱۰۰ ۲ "وہ جونک جمع کرکے اپنے مصارف زندگی کی پابجائی کرتا تھا" یہ پابجائی کیا چیز ہے؟

۱۳۰ ۱۶ ورڈسورتھ ایک انشا پرداز اور سیاس کی حیثیت سے" یہاں سیاست داں کے بجائے سیاس کا لفظ نہ صرف ثقیل بلکہ غیر مانوس ہے۔

۱۵۲ ۶ "اس نکتہ چیں نے ایک عرصہ دراز تک جائز اور ناجائز طریقہ سے انتہائی دشمنی اور تعصب سے کام لیکر ورڈسورتھ کا پیچھا اٹھایا" "پیچھا اٹھایا" کوئی محاورہ نہیں "پیچھا لینا" چاہیئے بلکہ یہ بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اسی خیال کو کسی اور طرح ادا کیا جا سکتا تھا "پیچھے پڑگیا" زیادہ اچھا ہوتا۔

۱۶۰ آخری اس کا ایک طویل سلسلہ ساحل ساحل چلا گیا تھا۔ یہاں ساحل ساحل غلط ہے۔ ساحل کے متوازی یا برابر برابر ہونا چاہیئے۔

کتاب کے مقدمہ میں بھی "عالمی علوم وفنون" اور "وفا شعارانہ تاریخ" کے فقرے تشریح طلب ہیں۔

بہر حال قابل مصنف نے نہایت محنت اور دماغ سوزی سے کام لیکر یہ کتاب مرتب کی ہے۔ اردو داں پبلک خصوصاً شعرا حضرات کو اس کی قدر کرنا چاہیئے۔

روح لطافت

مصنفہ مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (علیگ) وکیل جودھپور، لکھائی چھپائی اچھی۔ کاغذ سفید معمولی چھوٹی تقطیع ۲۰×۳۰ صفحات ۲۴۰ - قیمت عہ شائقین مصنف صاحب سے طلب کریں۔

یہ کتاب مرزا عظیم بیگ چغتائی کے چند فسانوں کا مجموعہ ہے، جس میں ایک سنجیدہ افسانہ "مہارانی کا خواب" اور سات مزاحیہ قصے ہیں۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی دنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، مسٹر رشید احمد صدیقی۔ پطرس۔ ملا رموزی۔ اور بہت سے دیگر مزاحیہ نگاروں کی طرح آپ کے مضامین بھی اردو رسالوں میں چھپا کرتے ہیں۔ ادبی دنیا میں مرزا صاحب کی شہرت سب سے زیادہ اُس وقت ہوئی جب آپ نے "قرآن اور پردہ" کے نام سے ایک دلچسپ اور پُر از دلائل کتاب لکھی۔ اس کے بعد آپ کے دیگر سنجیدہ اور مزاحیہ مضامین مختلف اردو رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ اپنی چلبلی طبیعت اور خداداد قابلیت کی بدولت آپ نے زمانۂ حال کے مصنفین میں ایک خاص جگہ حاصل کر لی ہے۔

جب کسی فسانہ میں مرزا صاحب "پٹتے" ہیں تو "مناظر زد و کوب" کو اس خوبصورتی اور بیساختگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ ناظرین ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جاتے ہیں۔ مجموعہ زیر نظر میں آپ دو فسانوں کے اندر خوب پٹے ہیں۔ چند بار "حیلہ کشتی" میں اور متعدد مرتبہ فسانہ "کھرپا بہادر" میں۔ مرزا صاحب کے قلم ظرافت رقم سے بعض اوقات بیساختہ پن کے ساختہ اس قسم کے فقرے اور جملے نکل جاتے ہیں جن کو پڑھکر صاحب ذوق حضرات گھنٹوں محظوظ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً:-

مرزا صاحب کو پان اور پان کھانے والوں سے سخت نفرت ہے۔ چنانچہ "ممتحن کا پان" نامی افسانے میں ایک صاحب کی نسبت لکھتے ہیں: "ریل چلی تو میں اس فکر میں تھا کہ اب ضرور یہ اپنی ڈبیا سے نکال کر پان کھائیں گے کیونکہ ان کے منہ کی رفتار سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پان اب ختم ہونیوالا ہے۔"

اس عبارت میں "منہ کی رفتار" کا جملہ خوب ہے۔

اسی طرح فسانہ "یہ کس کی تصویر ہے؟" میں جہاں مرزا صاحب کی بیوی کے دل میں جذبات غیظ و غضب بھڑک رہے ہیں وہاں آپ لکھتے ہیں کہ "خانم کے یہاں اس وقت کبابوں کی دوکان لگی ہوئی تھی" کباب دل کی دوکان بہت ہی خوب ہے۔

کھرپا بہادر" میں کوتوال صاحب نے جو مرزا صاحب کو چلو سے "گیت مار" دی تو لکھتے ہیں کہ:-

"کوتوال صاحب نے چپکے سے ایک مُکا میرے رسید کیا جیسے کوئی چپ کر کسی کو لٹھ دے۔"

اِسی قسم کی دلچسپ اور پسندیدہ ترکیبیں کتاب میں بکثرت پائی جاتی ہیں جن کا لطف اس کتاب کے پڑھنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے. لیکن بعض اوقات مرزا صاحب کچھ ایسی بولی بولنے لگتے ہیں جس سے شمالی ہند کے کان آشنا نہیں، مثلاً۔

فسانہ "ممتحن کا پان" صفحہ ۶۶ میں لکھتے ہیں۔ "میں نے نہایت بے کلی سے دیکھا" یہاں بےکلی کا لفظ بیقراری و اضطراب کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

" "کھرپا بہادر" صفحہ ۱۶۷ سطر ۵۔ "جھپا مار کے بھاگا"۔ جھپا غالباً "جھپٹا" کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

" " ۱۶۸ ۷ "گٹھا ہوا بدن، سینہ آگے کو بھرا ہوا" شمالی ہند میں بھرا ہوا سینہ کہیں نہیں ہوتا۔

" " " ۱۱ "مجھ سری کا ہٹا کٹا"۔ "مجھ سا" یا "مجھ جیسا" مراد ہے۔

" " ۱۸۰ ۳ "میرے پیر بھاری تھے"۔ مردوں کا پیر بھاری نہیں ہوتا۔ حاملہ عورت کا پیر بھاری ہوتا ہے۔

اسی طرح بعض جگہ نحوی ترکیبوں میں بھی سقم رہ گئے ہیں، اور بعض مقامات میں واو عطف کا غلط ستعمال ہوا ہے۔ مگر یہ معمولی خامیاں ہیں جو امید ہے آئندہ اڈیشن میں دُور کر دی جائیں گی۔ کتاب رحال دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ ہم کو خاص طور پر "ٹیلیفون" میں خوب لطف آیا۔ واقعی یہ فسانہ چا لکھا ہے۔

نیرنگ

(مصنفہ این۔ آر۔ کے۔ بیبے) یہ تیرہ افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں موجودہ زمانہ کے ہندوستانی لمانوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہر افسانہ بجائے خود ایک داستان عبرت رقع نصیحت ہے۔ اور ان افسانوں کے افراد حقیقت حال کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ زندگی کے روزمرہ حات کی صحیح و دلکش تصویریں کھینچی گئی ہیں جن کی وجہ سے افسانوں میں حقیقت کا لطف پیدا ہو گیا ہے کے کیرکٹر قدرتی طریقہ پر چلتے پھرتے اور کام کرتے نظر آتے ہیں۔ چونکہ ان افسانوں کی لکھنے والی ایک زی تعلیم یافتہ مسلم خاتون ہیں اس سے وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان مردوں و عورتوں اور نیم مغربی حرزِ رہائش م فوٹو کھینچنے میں خوب کامیاب ہوئی ہیں۔ نیرنگ کیا بلحاظ زبان کیا بہ لحاظ پلاٹ و خیالات و جذبات

صفِ اول کی تصانیف میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ جس پر ہم اس کی لائق مصنفہ کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ ذیل میں چند اقتباسات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:۔

افسانہ جستجوئے مسرت میں اس طرح جذبات کا اظہار کیا گیا ہے

"کیا دل کے اس شکستہ ایوان خاوری میں کوئی طلسمی جوہر کوئی حقیقی سکون ایسا مل سکتا ہے۔ جو آنکھوں کو روح کو اور دل کو کیف دے سکے؟ کیا ہم اپنی لاانتہا کوششوں کے بعد بھی یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ آفتاب و ماہتاب کے محور، سمندروں کے مدوجزر اور خشکیوں کے تہ خانوں میں کسی جگہ بھی حقیقی خوشی کی نایاب شے کہاں نہاں ہے؟ اے کاش ہم اُسے پا سکتے!"

ہندوستان میں فرقۂ اناث کی موجودہ حالت کا صحیح نقشہ الفاظ ذیل میں کھینچا ہے:۔

"آہ اس ہندوستان کی سرزمین پر چشم فلک نے کیا کیا ظلم نہیں دیکھے جو غریب عورتوں پر ٹوٹے ہونگے اُن کے پیدا ہونے کے بعد سوائے مردوں کی محکومیت کے کسی دوسرے آزاد طریقہ سے رہنا کبھی گوارا نہیں کیا گیا۔ ہاں اسی سرزمین پر وہ ایک عضو معطّل درشئے باطل ہی کی طرح زندگی بسر کرتی ہیں۔ آہ سوسائٹی کی یہ ظالمانہ رسمیں اور مردوں کی یہ خودغرضیاں اور ناانصافیاں کیسی حوصلہ شکن، کیسی ستم آفریں اور ناقابل عفو ہیں۔"

انسانی زندگی کا معیار مصنفہ نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

"وہ (انسان) نہ محض فرشتہ ہونے کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہے اور نہ شیطانی گمراہیوں میں گھرنے کے لئے۔ اُسے دنیا کے اسٹیج پر انسانیت کے بلند اور اعلیٰ معیار اور اخلاقی فرائض کو پیش نظر رکھکر کھڑا ہونا چاہیئے۔ ہمارے گلے میں فرائض انسانی کی ایک زبردست زنجیر ڈالی گئی ہے جس میں وزن ہے اور سختی ہے اور پابندیاں ہیں۔ لیکن وزن کے ساتھ طاقت ہے، سختی کے ساتھ راحت اور پابندیوں کے ساتھ روحانی طمانیت اور سرور۔"

زن و شوہر کے تعلقات کی جو دلآویز تصویر کھینچی گئی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو:۔

"عورت کے لئے محبت قدرت کی طرف سے ایک بہترین عطیہ ہے، وہ تو بہرحال محبت کرےگی مگر موتی کے لئے قدرداں چاہیئے۔ اسکی آب نااہلوں کو محظوظ نہیں کر سکتی جب شوہر و بیوی دونوں یک دل ہوں، دونوں اپنے اپنے فرائض زندگی بحسن و خوبی ادا کریں تب ہی زندگی کا حقیقی مزہ ہے۔ ہاں وہ پاک مقدس زندگی جو شان خداوندی کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی اور جس کا بدل دنیا میں کوئی نہیں، آج اگر اس کا عشر عشیر بھی دلوں پر اپنا نورانی و پاکیزہ سایہ ڈالے تو زندگی زندگی نہیں قلبی راحت اور علوی

کامرانیوں کا مخزن بیکراں بن سکتی ہے۔"

عورت کے حسن فطرت کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچا گیا ہے:-

"بادی النظر میں یہ بات مافوق الطبیعات ہستیوں کی بلند پروازی نہ سمجھی جا سکتی ہو مگر احساس زندگی اور سیرت کا سب سے گہرا اور باوقوف طبقہ زندگی کے تمام سطحی تخیلوں کو الٹ کر اس یقین پر کامل مضبوطی کے ساتھ قائم ہے کہ عورت کی باصفات ذات محبت اور اخلاق کی کیسی زبردست حامل ہے اس میں جو کچھ تخلیقی مادہ ہے وہ اُسی واقعی محبت سے وابستہ ہے بلکہ صرف یہی محبت اس کی تکمیل مسرت کی قوت رکھتی ہے۔ اس کی زندگی کی ہر ابتدا اور انتہا اس کے حسن فطرت کے ذوق اور کمال کی مظہر ہے۔"

غرض تمام کتاب ایک آئینہ خانہ ہے جس میں جابجا زمانہ حاضرہ کی انگریزی تعلیم یافتہ خواتین کے جذبات نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ زندگی کے اکثر نفیس و نازک ترین پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے افسانے مشعل ہدایت بن جاتے ہیں۔ ہر افسانہ بجائے خود دلچسپ و دلکش ہے۔ کتابت و طباعت بھی دیدہ زیب ہی قیمت عہر/ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

علم اکسیر عرف رہنمائے کیمیا گراں

مولفہ خاندانی معالج ویدرتن سنتوش کمار حکیم حاذق مستند طبیہ کالج لاہور مالک سورج کانتی آیورویدک اینڈ یونانی دواخانہ کرتارپور ضلع جالندھر۔ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ۔ تقطیع چھوٹی ۲۰×۳۰

صفحات ۱۲۰۔ قیمت غالباً عہ

مشرق کی پرانی بیماریوں میں توہمات، جنتر منتر اور کیمیا گری یہ ایسی مہلک اور متعدی بیماریاں ہیں کہ ان سے غالباً تا قیامت نجات پانا مشکل ہے چنانچہ یہاں کے ہزاروں آدمی ہمیشہ ایسی جڑی بوٹیوں یا نسخوں کی تلاش میں رہتے ہیں جن کے ذریعہ ادنیٰ دھاتیں اعلیٰ دھاتوں یعنی چاندی سونے میں تبدیل ہو جائیں اور نہایت جانفشانی اور صرف کثیر سے نسخوں کے اجزا بہم پہونچاتے ہیں مگر جب تجربہ کرتے ہیں تو ہمیشہ "ایک آنچ کی کسر" رہ جاتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے حکیم سنتوش کمار صاحب نے متذکرہ بالا کتاب ایک نادر تحفہ تیار کیا ہے جس میں فن کیمیا گری اور رسائن سازی پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ کتاب میں نظری طور پر (۱) ارواح (۲) انفاس (۳) اجسام (۴) سب سے بحث کی گئی ہو بلکہ سونا اور چاندی بنانے کے مختلف نسخے بھی درج ہیں۔ پرانی کتابوں سے سونا چاندی بنانے کے منقولہ نسخے جو اس کتاب

بس درج ہیں وہ بہت دلچسپ ہیں

بہر حال یہ کتاب عام دلچسپی کی نہیں ہے اور اس کی زبان بھی مبتدیوں کے لئے مشکل ہے مگر فن کیمیا گری یا کشتہ سازی کے شایقین کے لئے اس کا مطالعہ باعثِ دلچسپی ہو سکتا ہے۔

عربی کا ویر درشن

مندرجہ بالا کتاب منشی مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل لیکچرار ہندو یونیورسٹی بنارس کی تصنیف لطیف ہے۔ آپ نے ہندی داں پبلک کو عربی سیارگانِ ادب کے لوامع سے منور کرنے کے لئے ان کے کلام کا ترجمہ ہندی میں چھاپا ہے۔ شروع میں عربی نظم کی مختصر تاریخ ہے پھر مختلف مضامین کے متعلق عربی شعرا کے کلام کا ترجمہ ہے۔ آپ کی سعی مستحق شکریہ ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت مجلد عہ ۱۲ غیر مجلد عہ۔ شایقین عالم فاضل بک ڈپو لنکا بنارس سے طلب فرمائیں۔

میری ایران یاترا

یہ بھی مذکورہ بالا مصنف کا سفرنامۂ ایران ہے۔ اس کو آپ نے اس طرح سے لکھا ہے کہ کتاب مفید معلومات کا ذخیرہ اور اُن لوگوں کے لئے جو ہندوستان سے ایران جائیں گائڈ بن گئی ہے۔ ریلوں جہازوں اور موٹر لاریوں کی آمد ورفت کے اوقات و کرایہ و نیز اُن ہندو صاحبان کے قیام کے لئے جو ایران جائیں ہندو دھرم شالہ اور مندروں کی تفصیل بھی دیدی ہے۔ جابجا فوٹو بھی ہیں۔ یہ کتاب بھی قابل مصنف نے ہندی زبان میں تصنیف کی ہے، لیکن اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ایران کی سیاحت کا لطف ہندی والوں کی بہ نسبت فارسی خواں حضرات زیادہ حاصل کر سکتے ہیں اگر یہ کتاب اردو میں بھی طبع ہو جاتی تو نہایت اچھا ہوتا۔ بہر حال کتاب ہر طرح قابل قدر ہے۔ قیمت مجلد ۶؍ غیر مجلد عہ منیجر عالم فاضل بک ڈپو لنکا بنارس سٹی سے مل سکتی ہے۔

پارہ ہائے جگر

(نتیجۂ فکر جناب جگرؔ بریلوی بی اے)

جان اُن پر نثار کرتا ہوں — مرزن اے زندگی کہ مرتا ہوں
شوق نے کردیا ہے دیوانہ — ذرّے ذرّے کو سجدہ کرتا ہوں
دل میں دیتا ہوں دعوتیں غم کو — اپنا پیمانہ آپ بھرتا ہوں
تیری رحمت سے نااُمید نہیں — اپنی محرومیوں سے ڈرتا ہوں
لا رہا ہوں اُنھیں تصوّر میں — اپنے خاکہ میں رنگ بھرتا ہوں
آج قابو نہیں رہا دل پر — ہوک اُٹھتی ہے نالہ کرتا ہوں

کیا کہوں زندگی کا حال جگرؔ
جبر سہتا ہوں ضبط کرتا ہوں

زندگی اک ادائے ہستی ہے — میرا ہونا ہی خود پرستی ہے
دل پرستی مآلِ ہستی ہے — خود پرستی خدا پرستی ہے
دل ہے وہ بارگاہِ جلوۂ عشق — جس میں دنیائے حسن بستی ہے
اُس بلندی پر آج پہونچا ہوں — جس طرف دیکھتا ہوں پستی ہے
آج چھایا ہوا ہوں عالم پر — آج دل آشنائے مستی ہے
دردِ سر کچھ ہے کچھ ہے غلبۂ خواب — موت کیا ہے خمارِ ہستی ہے
اک نفس پر ہے کاروبارِ حیات — آدمی کی بھی کوئی ہستی ہے

غیب کیا اور کیا شہود جگرؔ
سب اسیرِ نمودِ ہستی ہے

حالِ زارِ وطن

(از جناب فروغ علوی کاکوروی)

کیسی تباہیوں میں اب مادرِ وطن ہے — کس برہمی کو پہونچی اپنی یہ انجمن ہے
کیسی خزاں ہے جس سے پامال یہ چمن ہے — دوزخ نظیر کیسی یہ جنتِ عدن ہے
بتلاؤں کیا کہ کیا ہے حالِ زبوں ہمارا
بس رنگ لا رہا ہے بختِ نگوں ہمارا

علم و کمال اپنا سب ہم سے جا چکا ہے — مال و منال اپنا، ادبار کھا چکا ہے
تدبیر کا خزانہ سودا لٹا چکا ہے — تقدیر کا ستارہ گردش میں آ چکا ہے
منجدھار میں پھنسی ہے کشتی مرے وطن کی
نکبت یہ آستیں ہے بستی مرے وطن کی

وہ اتحاد جس سے امیدِ ارتقا تھی — وہ انتظام جس پر خود منحصر بقا تھی
وہ اعتماد جس کی وحدت ہی انتہا تھی — وہ اعتبار بیشک، اِک چیز بے بہا تھی
مدت ہوئی یہ ساماں سب لٹ گیا ہمارا
بے ساز و برگ ہے اب یہ قافلہ ہمارا

رگ رگ میں بیکلی ہے اور دل میں اک جلن ہے — اک آگ سی لگی ہے شعلوں میں تن بدن ہے
ہاں اے فروغ کوئی حدِ غم و محن ہے — اور اس پہ ضبط اپنا آفت کا نیش زن ہے
ہر دم بس اک طرح کی گویا لگن لگی ہے
اِک پھانس ہے کہ دل میں رہ رہ کے چبھ رہی ہے

صبح کا گیت

از جناب محمود اسرائیلی

تاروں کی اوجھل ہے سنگت گلشن کی بدلی ہے رنگت
پورب سے بھڑکی ہے آگ
سونے والے جلدی جاگ

کوئل بولی، تیتر بولے کلیوں نے اپنے منھ کھولے
بلبل نے چھیڑا ہے راگ
سونے والے جلدی جاگ

سب پھولوں نے دامن کھولے اور شبنم کے موتی رولے
تیرے بھی جاگیں گے بھاگ
سونے والے جلدی جاگ

تو نے کھیت اپنا جوتا ہے؟ پھر کیوں غفلت میں سوتا ہے
بھیڑیں چر جائیں گی ساگ
سونے والے جلدی جاگ

تیرا گلشن اب پھولا ہے پھل سے ہر بوٹا جھولا ہے
گلچیں کو ہے تجھ سے لاگ
سونے والے جلدی جاگ

بھارت ہی ہے تیری ماتا غیروں سے کیسا تیرا ناتا
اپنی ڈفلی اپنا راگ
سونے والے جلدی جاگ

سوتے سوتے مر جائے گا سچ کہتا ہوں پچھتائے گا
کاٹے گا غفلت کا ناگ
سونے والے جلدی جاگ

سکوتِ شام

(از جناب مولوی عبد الرب صاحب بی اے ایل ایل بی)

کٹا دن جستجو میں شام کی منزل نظر آئی
شبِ خاموش، یعنی لیلیِ محمل نظر آئی

فراغت ہو گئی دنیا کو روزانہ مشاغل سے
مسافر کو ہوئی ڈھارس کہ وہ منزل نظر آئی

پرندوں نے کیا رُخ اپنے اپنے آشیانوں کا
اگرچہ وسعتِ صحرا ابھی دریا دل نظر آئی

کھڑے ہو کر لبِ دریا جو دیکھا شام کا منظر
تو اک دنیائے خاموشی لبِ ساحل نظر آئی

نظر جس سمت اُٹھتی ہے خموشی ہی خموشی ہے
یہ حیرت ہے کہ نبضِ شوق بھی رک رک کے چلتی ہے

شفق کی لالہ کاری دہر کو رنگیں بناتی ہے
کہ سطحِ نیلگوں پر چادرِ گلگوں بچھاتی ہے

خوشی ہوتی ہے پیدا رنج و غم کافور ہوتے ہیں
رواقِ نیلگوں سے یہ پری جب مسکراتی ہے

اُسی کی زلفِ شبگوں دُرفشاں ہے صورتِ شبنم
یہی آغوشِ گلشن میں گلوں کو بھی ہنساتی ہے

عروسِ شام کو قدرت نے دی گو سانولی صورت
ردائے سُرخ لیکن دوش پر کیا خوب بھاتی ہے

انھیں رنگینیوں کو دیکھ کر دل محوِ راحت ہے
عجب سامانِ راحت ہے عجب فیضانِ قدرت ہے

کوئی سرشار ہے تو کوئی مستِ کیف منظر ہے
عجب ساقی، عجب میکش عجب دورِ ساغر ہے

درختوں سے ہے ظاہر اُن کی مخموری و مدہوشی
کوئی حیران و مضطر ہے کوئی خاموش و ششدر ہے

ہوا کے نرم جھونکے سب سے ہم آغوش ہوتے ہیں
نہ وہ تکلیف تیزی ہے نہ دن کی بادِ صرصر ہے

ادھر ڈوبا ہوا سورج اِدھر ٹھیرا ہوا دریا
نگاہِ شوق میں گویا شفق گوں ایک چادر ہے

مئے گلرنگ کا ہے دور اس دم بزمِ فطرت میں
وکیل خستہ جاں پی لے اگر ہو تیری قسمت میں

تارے

(حضرت فرحت کانپوری بی۔اے)

چرخ پہ چھٹکے کیسے تارے بھولے بھولے پیارے پیارے
دل میں چمک آنکھوں میں شرارے تارے یا کہ جواہر پارے
کیسے اچھے کتنے پیارے

قائم ہے اک بزم فلک پر بچھی ہے اک نورانی چادر
رات ہے گویا تختِ رواں پر کالا رنگ، جڑاؤ زیور
دیکھو تم بھی آنکھ اٹھا کر، سامنے ہے وہ نور کا منظر بکھرے ہوئے ہیں لعل اور گوہر تارے یا کہ جواہر پارے
کیسے اچھے کتنے پیارے

چھوٹے چھوٹے تارے چمکے پھول کھلے گلزارِ ارم کے
مظہر ہیں یہ حسنِ صنم کے موتی ہیں دریائے کرم کے
بچے کیسے پیارے پیارے اچھل رہے ہیں شوق کے مارے
چرخ ہے اونچا جس سے ہارے توڑ لیں ورنہ پھول یہ سارے
توڑ کے رکھ لیں جیب کے اندر خوشی میں موئے ہیں جامے سے باہر ہائے رے یہ نورانی پیکر تارے یا کہ جواہر پارے
کیسے اچھے کتنے پیارے

اُن کی ادائیں چرخ بریں پر — اُنکی شعاعیں روئے زمیں پر

خال ہوں جیسے روئے حسیں پر — ایک کہیں پر ایک کہیں پر

چمکو چمکو چھوٹے تارو — کھیلو بھر فضا میں پیارو

ڈوبو، اُچھلو، موجیں مارو — آؤ آؤ دیکھو یارو،

کیسی ہے نورانی محفل چرخ کی یہ لاثانی محفل — پیارا وقت سہانی محفل تارے یا کہ جواہر پارے

کیسے اچھے کتنے پیارے

آئی رات، اندھیرا چھایا — تاریکی سے جی گھبرایا

بڑھ گیا جب ظلمت کا سایا — ہر تارا اک مشعل لایا

چرخ سے نور کی کرنیں آئیں — اپنی ادا پر خود اترائیں

دھندلی دھندلی شمعیں لائیں — گمراہوں نے راہیں پائیں

رحمت یہ نورانی محفل چرخ کی یہ لاثانی محفل — پیارا وقت سہانی محفل تارے یا کہ جواہر پارے

کیسے اچھے کتنے پیارے

لطفِ سخن

(انتخاب مشاعرہ انجمن ادب اُردو۔ غازی آباد)

(محمد اظہار الحسن صاحب اظہر)

وعدہ گر مجھ سے تو غیروں سے وفا کرتے ہیں — آپ کیا جانیے کیا کہتے ہیں کیا کرتے ہیں

دل کے ہمراہ گئی زندگی کہتے تھے جسے — اب تو ہم پر ہے یہ تہمت کہ جیا کرتے ہیں

(مہاراج بہادر صاحب برق دہلوی۔ بی۔اے)

مجھ سے سہواً بھی خطا ہو تو لرز جاتا ہوں — خونِ انصاف جو کرتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں

حسن اور عشق میں قائم ہے مراتب کا لحاظ — وہ جفا کرتے ہیں ہم شکرِ جفا کرتے ہیں

(ابوالتہذیب سید عین الحسن صاحب تجری امروہوی)

قہر ہو ظلم ہو یا مہر و وفا ہو کچھ ہو — ہم بہر حال ترا شکر ادا کرتے ہیں

مختصر حال ہے یہ عشق کے بیماروں کا — فرقتِ یار میں مر مر کے جیا کرتے ہیں

(سید غلام احمد صاحب جلی امروہوی)

دُرِ شہوار کو اشکوں سے بھلا کیا نسبت — یہ وہ موتی ہیں جو [illegible]

(خورشید علی صاحب خورشید)

زندگی میں نہ کیا قید سے آزاد ہمیں — بعد مرنے کے [illegible]

نیم جاں، خستہ جگر، آبلہ پا، دشت نورد — عشق میں [illegible]

(حکیم رضوان احمد صاحب مفتون)

بعد مرنے ہی کے مل جائے کہیں منزلِ یار — [illegible]

کوئی طاعت پہ ہے نازاں تو عبادت پہ کوئی — ہم گنہگار تو [illegible] کرتے ہیں

(پیارے لال صاحب رونق دہلوی)

کیا تصوّر ہے کہ تصویر خیالی رکھکر دل کے آئینہ میں دیدار خدا کرتے ہیں

ہم بناتے ہیں جو گلدستہ مضمون رونق پھول گلزار حقیقت کے چنا کرتے ہیں

(شیام لال صاحب سحر دہلوی)

کس سے ملنے کو یہ بیتاب ہوئے باد صبا غنچۂ گل بن کے جو آغوش کو وا کرتے ہیں

خلق کہتی ہے جسے مرحلۂ عشق و فنا دل کو اس راہ میں ہم قبلہ نما کرتے ہیں

(شاہد حسین صاحب شاہد)

شاذ و نادر کبھی ایسا بھی ہوا کرتا ہے اُن کے بازو پہ مرے اشک گرا کرتے ہیں

(چندی پرشاد صاحب شیدا دہلوی)

روح کو قید تمنا سے رہا کرتے ہیں دل سے لذات دوعالم کو فنا کرتے ہیں

زنگ عصیاں ہی سے ہوتا ہے ظہور رحمت بخشنے والے کی بخشش پہ خطا کرتے ہیں

(مبارک علیخاں صاحب صرصر میرٹھی)

جیتے جی کوئی کسی کا نہیں ہوتا صرصر بعد مرنے کے سب افسوس کیا کرتے ہیں

(حکیم عبد الغنی صاحب غنی)

دیکھنے والے کہیں آپ کو رسوا نہ کریں آپ میت پہ مری روتے ہیں کیا کرتے ہیں

وہ رگ جاں سے بھی نزدیک ہیں سچ ہے مگر پاس آداب سے ہم دور رہا کرتے ہیں

(ظہیر الدین صاحب ظہیر نگہروی)

اف ری نیرنگی الفت یہ فریب وعدہ ہم محالات کو بھی مان لیا کرتے ہیں

ہم فقط وعدۂ دیدار پہ قرباں ہیں ظہیر جن کو دیدار میسر ہے وہ کیا کرتے ہیں

(چندر بھان صاحب کیفی دہلوی)

حشر میں دیکھنی ہے شان کریمی اس کی اس لئے دیدہ و دانستہ خطا کرتے ہیں

موج مے لے گئی کیفی کو حقیقت کی طرف پہلے پی لیتے ہیں پھر یاد خدا کرتے ہیں

(سید مظہر حسن صاحب مظہر امروہوی)

ہجر میں کب ترے بیمار قضا کرتے ہیں آخری فرض محبت کا ادا کرتے ہیں

نیا سال اور ہمارے فرائض

اس نمبر کے ساتھ رسالہ زمانہ کی زندگی کا تیسواں (۳۰) سال ختم ہو رہا ہے۔ جنوری ۱۹۳۳ء نمبر سے اس کی نئی جلد شروع ہوگی، گو ہم عام کساد بازاری کی وجہ سے جس کا اثر اس سال رسالہ کی آمدنی پر بھی پڑا ہے زمانہ کے حجم میں خاطر خواہ اضافہ نہ کر سکے تاہم گزشتہ بارہ مہینوں میں انتیس (۲۹) تصاویر کے علاوہ خالص مضامین کے سات سو چھتیس (۷۳۶) صفحات ہدیۂ ناظرین کئے گئے ہیں، اور سابق کی طرح اس سال بھی کئی ایسے مضامین شائع ہوئے ہیں جن کا جواب موجودہ رسائل اردو میں مشکل ہی سے ملیگا۔ ناظرین رسالہ کے لئے یہ بات مسرت بخش ہونا چاہیے کہ جس بلند معیار کو مدنظر رکھکر فروری ۱۹۰۳ء میں رسالہ زمانہ جاری کیا گیا تھا، تیس سال کے اتفاقات و حادثات کے باوجود آج بھی وہی معیار ہمارے پیش نظر ہے۔ اس دوران میں کارکنان رسالہ کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ زمانہ میں صرف وہی مضامین شائع کئے جائیں جو اردو لٹریچر میں مستقل جگہ پانے کے مستحق سمجھے جا سکیں، اور اس کے صفحات ہر طرح کے علمی مباحث اور موضوعات کے لئے وقف رہیں۔ اس سال خاص طور پر کئی اہم مضامین اردو میں پہلی دفعہ شائع ہوئے ہیں، شستہ ظرافت کے بھی دو ایک نمونے پیش کئے گئے اور تنقید کتب کا سلسلہ بھی اپنی امتیازی شان و خصوصیت کے ساتھ قائم ہے۔ بہرحال یہاں پر کسی مفصل تبصرہ کی گنجائش نہیں ہے، لیکن ناظرین رسالہ یہ سنکر خوش ہونگے کہ ہمارے بعض احباب اس سال کے کئی مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا بندوبست کر رہے ہیں۔ رسالہ کے بہت سے مضامین نظم و نثر عام طور پر اخباری دنیا میں نقل ہوتے رہتے ہیں، بعض معزز معاصرین زمانہ کے مضامین کو اپنے صفحات میں حوالہ کے ساتھ درج کر کے ہماری عزت افزائی کرتے ہیں، لیکن اکثر پرچوں میں رسالہ کے اقتباسات بلا حوالہ ہی شائع ہوا کرتے ہیں۔ ان سب باتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ دور ترقی میں بھی زمانہ زبان و ادب کی مفید خدمت انجام دے رہا ہے۔ اور ملک کو اس وقت بھی ہماری خدمات کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ تیس سال پہلے تھی۔ یہی خیال ہماری حوصلہ افزائی کا باعث ہے۔ یہی لحاظ ہمارے عزم و ہمت کو قائم و برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اسی خیال کے سہارے پر کارکنان زمانہ سال نو کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اسی کے بھروسے پر ہم اپنے معزز ناظرین سے نہ صرف یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ آئندہ بھی رسالہ پر اپنی سرپرستی

بلکہ اس بات کی بھی اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس کی توسیع اشاعت کی بھی کوشش فرمائیں، اور اگر زیادہ نہیں تو اپنے علم دوست احباب میں سے کم سے کم ایک ایک دو دو اصحاب کو اس کا خریدار بنا کر ہماری ہمت افزائی کریں۔

افسوس کی بات ہے کہ تیس سال کی مسلسل خدمات کے بعد زمانہ کی مالی حالت ایسی قابل اطمینان نہیں ہوئی کہ جس کی بدولت کارکنان زمانہ اس کے مستقبل سے بیفکر ہو جائیں۔ ابتدائی نقصانات سے تو بعض دیگر ذرایع کی مدد سے بہت کچھ گلوخلاصی ہو گئی ہے لیکن تھوڑا سا بار اب بھی باقی ہے جس کی وجہ سے توسیع اشاعت کے بغیر نہ رسالہ کے حجم ہی میں کوئی معتد بہ اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ اس کی آیندہ زندگی کے متعلق ہی بیفکری ہو سکتی ہے۔ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے قدردان حضرات اپنے ادبی خادموں کی مالی مشکلات کا رفع کرنا اور ان کے مستقبل کا انتظام کرنا بھی اپنے فرائض میں داخل سمجھتے ہیں، لیکن اردو کے شائقین کی حالت دوسری ہے، نہ عوام ہی کسی اعلیٰ پیمانہ پر اردو ادب کی سرپرستی کرنے کو مستعد ہیں اور نہ خواص ہی ضرورت و استطاعت کے بموجب صرفِ زر کرنے کو تیار ہیں۔ ایسی صورت میں صدہا رسالوں کے اجرا اور ہزارہا مشاعروں اور ادبی مجلسوں کے انعقاد کے باوجود بھی اردو کو وہ ترقی نہیں ہو رہی ہے جو اس کا حق ہے۔ تفننِ طبع کے لئے زبانی جان دینے والے اصحاب کی کمی نہیں ہے لیکن ادبی کوششوں کی مالی امداد کا خیال ایک بڑی حد تک مفقود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک ملک کا کوئی رسالہ اس قابل نہیں ہے جس کی نسبت یہ کہا جا سکے کہ وہ اپنے قدرشناسوں کی بدولت اپنے پروپرائٹر یا ایڈیٹر کے بعد بھی اپنی پوری شان کے ساتھ شائع ہوتا رہیگا۔ خیر یہ پرانا دکھڑا ہے اس وقت مزید تفصیلات کی نہ فرصت ہے اور نہ ضرورت۔

یہاں پر ہمارا مدعا صرف یہ ہے کہ کارکنان و ناظرین دونوں اپنے اپنے فرائض یکساں مستعدی سے ادا کریں جبھی اس خدمت کا سلسلہ استقلال اور ترقی کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے۔ رسالہ کا معیار قائم رکھنے کی جو ذمہ داری ہم پر ہے اس کو ہم بخوشی قبول کرتے ہیں اور زمانہ کے مقاصد اعلیٰ کو پیش نظر رکھنا ہمارا اولین فرض ہے مگر رسالہ کے اخراجات پورا کرنے کی ذمہ داری قدرشناسانِ رسالہ پر ہے، اس کی تدبیر توسیع اشاعت ہے جس کے متعلق ہم پورے زور کے ساتھ اپنے ناظرین کو یاد دہانی کر رہے ہیں۔ ہندی ادب کی روز افزوں ترقی کا یہی راز ہے کہ اس کا ہر ہی خواہ عمدہ رسالوں اور کتابوں کی خریداری اپنا فرض سمجھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک ہی کتاب کا اردو ایڈیشن تو سالہا سال میں بھی ختم نہیں ہوتا لیکن ہندی ایڈیشن بہت جلد ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے۔ قدردانانِ اردو کو بھی اگر اس زبان کی ترقی کی پرواہ ہے،

یہی طریقہ امداد اختیار کرنا پڑیگا. بہرحال ناظرین زمانہ سے استدعا ہے کہ وہ اس ضرورت کو محسوس کرکے اپنا حق ادا کریں، زمانہ کے لئے اس سال ایک ایک وو دو نیا خریدار بہم پہونچانا کوئی مشکل بات نہیں ہے. صرف ذراسی توجہ کی ضرورت ہے۔

خدا کرے ہماری یہ درخواست بیکار نہ جائے اور خیر خواہانِ رسالہ اپنے علم دوست اور ذی استطاعت احباب کو اس کا سرپرست بنا کر ہم کو شکر گذار بنائیں۔

ناظرین زمانہ کو نیا سال مبارک ہو۔

(پشتِ صفحہ پر منیجر کا ضروری نوٹس ملاحظہ ہو)

یسوع مسیح صلیب پر

یہ تصویر یورپ کے مایۂ ناز مصور "ایل گریکو" کا ایک شاہکار ہے۔ تصویر میں صلیب کے گرد پاکباز عورتیں اور سینٹ جیروم کھڑے ہوئے ہیں۔ فرشتے رومال ہاتھوں میں لئے یسوع کے خونچکاں دست و بازو کا خون صاف کر رہے ہیں۔ تصویر پر جس قدر بے بسی اور بیکسی برس رہی ہے اور قدیم رومیوں کی لرزہ براندام کرنے والی وحشیانہ سزاؤں کا جو منظر خونیں وہ پیش کر رہی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ "ایل گریکو" جس کا یہ شاہکار ہے جزیرہ کریٹ کا ایک یونانی الاصل باشندہ تھا جو ۱۵۴۱ء کے قریب بمقام کینڈیا پیدا ہوا تھا۔ اس کا اصلی نام ڈومنیکو تھیوٹوکاپولی تھا۔ اس نے فنِ نقاشی کی ابتدائی مشق شہر وینس میں کی۔ جہاں سے وہ روما میں آکر اقامت گزیں ہوا۔ اپنے فن میں اس نے اس قدر کمال حاصل کر لیا تھا کہ اس نے خود اپنی ایک تصویر اپنے ہاتھوں بنائی جسے دیکھکر روما کے بڑے بڑے اساتذۂ فن دنگ رہ گئے۔ روما سے چلکر وہ ۱۵۷۷ء کے درمیان اسپین پہونچا اور شہر طلیطلہ میں جو [illegible] رہنے لگا یہیں اس نے اپنی یہ تصویر بنائی جو فنی زمانہ فن مصوری کا اعلیٰ نمونہ شمار کی جاتی ہے۔ اسپین والوں نے اس کو "ایل گریکو" کا خطاب دیا جسکے معنی "یونانی" ہیں۔ وہ عرصہ تک اسپین میں رہا۔ عیش و نشاط کا شوق اس کی طبیعت پر اس قدر غالب تھا کہ جب وہ کھانا کھانے بیٹھتا تو اس کے سامنے ایک [illegible] رباب جب مصروفِ رقص و سرود ہوتا تو لقمہ حلق سے اترتا ۔ ۔ ۔ اپریل ۱۶۱۴ء کو بمقام طلیطلہ خود [illegible] اس کی ایک تصویر "اصطباغ" نامی بھی بہت مشہور ہے۔

خریدارانِ زمانہ کی خدمت میں ضروری اطلاع

جن صاحبوں کی خریداری ماہ جنوری سے شروع ہوتی ہے اُن کا حساب اس نمبر کے ساتھ ختم ہوگیا ہے، او
اب آئندہ سال کی قیمت واجب الوصول ہوگئی ہے۔ لہذا گزارش ہے کہ ایسے صاحبان اس نمبر کے پہونچنے ک
بعد ایک ہفتہ کے اندر زمانہ کا سالانہ چندہ مبلغ پانچروپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں، ورنہ جنوری ۱۹۲۳ء
کا رسالہ سالانہ قیمت کے لئے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ (V.P.P.) ارسال ہوگا۔

قیمت طلب (ویلیوپے ایبل V.P.P.) پیکٹ میں پانچ آنے کا صرفہ ہوتا ہے، کیونکہ اب ہر ویلیو پے ایبل رجسٹر
شدہ بھیجا جاتا ہے اور دو آنہ فیس منی آرڈر کے علاوہ تین آنہ رجسٹری فیس بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے منی آرڈ
سے قیمت بھیجنے والے اصحاب کو تین آنہ کی کفایت ہوگی۔

یہ بھی خیال رہے کہ ویلیو پے ایبل پیکٹ ایک ہفتہ سے زائد ڈاک خانہ میں امانت نہیں رکھا جاسک
ہے اس لئے استدعا ہے کہ جو خریدار صاحبان منی آرڈر کے ذریعہ قیمت نہ بھیجیں وہ براہ مہربانی جنوری نمبر کا
قیمت طلب پیکٹ ڈاک خانہ میں پڑا نہ رہنے دیں بلکہ اُسے فوراً وصول فرمالیں۔

منی آرڈر بھیجنے والے اصحاب کوپن میں اپنا پورا نام وپتہ (اور جہانتک ممکن ہو) اپنا نمبر خریداری صا
وخوشخط تحریر فرمائیں تاکہ رجسٹر میں رقم رسالہ کا صحیح اندراج ہوسکے۔

جن صاحبوں کو آئندہ خریداری جاری رکھنا منظور نہ ہو وہ براہ کرم اس نمبر کے پہونچنے کے بعد فوراً
ہی اطلاع دے دیں تاکہ اُن کی خدمت میں آئندہ رسالہ نہ بھیجا جائے اور وہ قیمت طلب (V.P.P.)
پیکٹ کی واپسی کی زحمت سے اور دفتر ہذا مزید نقصان سے محفوظ رہے۔

جنوری سنہ ۱۹۲۳ء کا رسالہ وسط ماہ جنوری تک شائع ہوجائیگا۔

منیجر

اصلی جرمن آٹومیٹک الارم پستول
کے لئے دھوکہ بازوں سے پرہیز کریں۔ تمام ہندوستان
میں صرف ہمارے پاس مل سکتا ہے اسکی صداقت
اعلان ہے کہ ایک ہفتہ تک اس پستول کو سب اشتہار
ایک ایک لفظ آزمائیں اگر ذرہ برابر فرق ہو تو ہم اپنے خرچ سے واپس لینے کو تیار ہیں۔ یہ پستول جیسا کہ بلاک سے ظاہر ہے
پانچ انچ لمبا اور چار اونس وزندار ہے جو بستر اور جیب میں با آسانی آسکتا ہے۔ درحقیقت یہ اس قدر خوفناک ہے کہ دیکھتے ہی
دہشت طاری ہو جاتی ہے اسمیں ہر وقت دس وار کارتوس ایک ساتھ رکھے جاتے ہیں ضرورت پر صرف گھوڑا دبانے سے یکے
بعد دیگرے کارتوس اس زور سے چلتا ہے کہ جس سے چور۔ ڈاکو۔ بدمعاش اور درندے پرندے کا کلیجہ دہل جاتا ہے یہ ممکن نہیں
کہ پستول کی بناوٹ اور اس کی آواز سے ایک سکنڈ ٹکنے سے کوئی دشمن کھڑا ہو جائے۔ یعنی صرف ایک آواز سے چور ڈاکو
وغیرہ اور بڑے سے بڑے خونخوار جانور بھی بھاگ جاتے ہیں۔ یورپ اور ہندوستان کے بڑے بڑے سینما میں یہی پستول
استعمال کیا جاتا ہے۔ جنگل یا کھیتوں میں یا ہمراہ زر نقد لیکر سفر کرنے والوں کو درحقیقت جان کا ساتھ دینے والا ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے ہتھیار
بنانے والوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ یہ پستول درحقیقت جان بچانے والا ہے۔
قیمت سات روپیہ (مَعہ) محصول آٹھ آنہ (۸) پستول کے ہمراہ ۳۰ کارتوس مفت اکسٹرا ۵۰ کارتوس کی قیمت ایک روپیہ عہ
اے۔ ایچ۔ اینڈ کو۔ پوسٹ بکس ۵۰۰۱ بمبئی نمبر ۹
A.H. & Co; Post Box 5001 Bombay. 9.
اصل مال ہونے کی سب سے بڑی تصدیق یہ ہے کہ گورنمنٹ نے صرف بنگال اور برہما کے لئے لائسنس لگا دیا ہے بقیہ تمام ہندوستان میں تمام مقامات پر بلا لائسنس رکھ سکتے ہیں۔

سیرت محمد علی
شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی
سیرت کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ صحیح اندازہ کر سکیں گے کہ محمد علی کا دل اسلامی جذبات سے کس قدر لبریز تھا۔ اور قوم وملک کے لئے اس نے کیا خدمات انجام دیں۔ تمام حالات آپ سیرت میں پڑھیں۔
۲۰×۲۶/۸ کے سائز پر تقریباً ۶۰۰ صفحات، کتابت وطباعت نہایت عمدہ۔ متعدد فوٹو
قیمت تین روپیے
مکتبۂ جامعہ میں اردو کی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہر وقت موجود رہتا ہے
مکتبہ جامعہ دہلی
سری ولبھ پرنٹر بھیروال پریس کانپور
دیا نراین نگم ایڈیٹر و پبلشر